# علیگڈھ منتھلی

جلد ۲ | جنوری ۱۹۰۴ عیسوی | نمبر ۱

## سالِ نو

خوشی کی تلاش و تکلیف سے گریز انسان کا اصولِ زندگی ہے۔ اِسی اصول کے موافق انسان ہر ناگوار شے کو اپنے سامنے سے ہٹاتا ہے۔ اور دل خوش کُن چیزوں کو اپنے پیشِ نظر رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اِسی بنا بر گذشتہ ناگواریاں ہم جلد بھُول جاتے ہیں۔ اور پچھلی خوبیاں دیر تک ہماری یاد میں تازہ رہتی ہیں۔ اِسی اصول پر ہم گذرے ہوئے زمانے کو حسرت کے ساتھ یاد کرتے ہیں۔ اور موجودہ وقت کی شکایت کرتے ہیں۔ کیونکہ زمانۂ ماضی کے بدنما داغ بسبب دوری کے ہماری نظر سے چھپ جاتے ہیں اور اُسکے خوشنما منظر نگاہ تخیّل سے ہمکو زیادہ دل آویز معلوم ہوتے ہیں۔ گو ہم اپنی موجودہ حالت سے خوش نہیں رہتے مگر ہماری طبیعت کی ایک دوسری خاصیت یعنی آیندہ کی اُمّید ہماری طبیعتوں کو پژمردہ نہیں ہونے دیتی۔ وہ ہمارے دِلوں کو اُبھارتی ہے۔ اُس میں نئے ولولے پیدا کرتی ہے اور آیندہ کوشش کے لئے ہمکو آمادہ کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سال کے ختم پر ہم خوش ہوتے ہیں اور سالِ نو

کی آمد میں خوشیاں مناتے ہیں۔ ہر قوم میں نوروز کا دن بڑی خوشی کا دن سمجھا جاتا ہے۔ تاتاری لوگ اس دن خوانِ یغما چنتے اور صلائے عام دیتے۔ ایرانیوں میں نوروز کا روز بڑی خوشی کا دن سمجھا جاتا تھا۔ ہندوستان کے شاہانِ مغلیہ بھی اس دن بڑے جشن کرتے اور اپنی داد و دہش سے لوگوں کو مالا مال کرتے تھے۔ انگریزوں میں بھی نیو ایرز ڈے بڑی خوشی کا دن گنا جاتا ہے۔ آپس میں ایک دوسرے کو مبارکباد دیتے ہیں۔ تحفہ تحائف بھیجتے ہیں۔ اور خوشیاں مناتے ہیں۔ ہمکو بھی خوشی ہے کہ علیگڈھ منتھلی کی عمر کا پہلا سال بخیریت گذر گیا اور سالِ نو کی آمد نئی اُمیدوں سے ہمارے دلوں کو خوش کرتی ہے۔ سالِ گذشتہ میں خریداروں کی تعداد ابتدا میں کم رہی اور آخر سال تک چارسو سے نہ بڑھی اور چونکہ ہر کام کی ابتدا میں اخراجات عموماً زیادہ ہوتے ہیں۔ اِسلئے ہماری آمد و خرچ میں چنداں تفاوت نہیں رہا۔ اور اسوقت ہم کچھ زیادہ بچت نہیں دکھا سکتے۔ مگر آیندہ کی اُمید ہمارے دل کو بڑھاتی ہے۔ اور ہم کو توقع ہوتی ہے کہ ہمارا منتھلی اپنے معاونوں کی توجہ سے "حکمت طلب و بزرگی آموز + تا به نگرند روزت از روز" کا مصداق ہوگا۔ ہمکو اُمید ہے کہ سالِ حال میں اُس کی اشاعت کو ترقی ہوگی اور اُسکے اخراجات میں بالمقابلہ کمی۔ سال حال کے لئے منتھلی محکمۂ ڈاک میں رجسٹری ہوگیا ہے۔ اسلئے محصولِ ڈاک تقریباً نصف دینا پڑیگا۔ اولڈ بوائز اور جنرل پبلک اسکی طرف زیادہ توجہ کریگی۔ اور خریداروں کی تعداد بڑھیگی۔ موجودہ طلبائے کالج بھی اپنی بے توجہی کو کم کرینگے۔ اور مسٹر کارنا موجودہ اڈیٹر منتھلی کو شکایت کا موقعہ نہ دینگے۔ خوش قسمتی سے ہمارے خریدار عموماً سابق طلبائے کالج اور اعلےٰ درجے کے تعلیم یافتہ لوگ ہیں جن سے ہمکو علاوہ مالی مدد کے بہت کچھ قلمی امداد بھی ملتی ہے۔ ہمکو اسید ہے کہ ہمارے اہلِ قلم دوست اپنی قلمی امداد کو بڑھائینگے نئے اہلِ قلم میدان میں آئینگے۔ اور منتھلی کے ذریعے سے زورِ طبع دکھلائینگے۔ پُرانے پچھیت اپنی پختگی تحریر اور تجربہ سے پبلک کو مستفید کرینگے اور سالِ حال میں منتھلی کا مرتبہ کئی سیڑھی بلند ہو جائیگا۔ پرانے لوگوں کا اب خاتمہ ہوتا جاتا ہے جو کچھ آیندہ اُمید جن ہیں وہ زیادہ تر نئے تعلیم یافتہ لوگوں سے ہیں۔

اور خدا کے فضل سے اُن کی تعداد میں روز افزوں ترقی ہے - اُن کی دسترس میں معلومات کے وسیع خزانے ہیں - اُن میں سے ہر ایک کا فرض ہے کہ اُن خزانوں میں سے دُرِ مکنوں نکالیں اور اُن قیمتی موتیوں سے منتظمی کے صفحوں کو مزین کریں - ہر شخص معلومات کے ریزے جا بجا سے جمع کرے اور منتظمی کے دستر خوان پر اُن کو عمدہ شکل میں چُن کر یاران نکتہ داں کو صلاے عام دے - اس سے نہ صرف منتظمی کی گرم بازاری ہوگی بلکہ پبلک کی عام واقفیت کو بہت ترقی ہوگی میری کمائی سے تم اور تمھاری سے میں متمتع ہونگا - جو لوگ کہ انگریزی زبان میں اپنے خیالات کو عمدگی سے ظاہر کر سکتے ہیں وہ اُسکو اختیار کریں - مگر غیر زبان پر پوری دسترس ہونا ہر ملک و ہر زمانے میں معدودے چند کا حصہ رہا ہے - عموماً لوگ اپنے خیالات کو اپنی ہی زبان میں عمدگی سے ظاہر کیا کرتے ہیں - اس لئے ہمارے انگریزی خوانوں کو اُردو زبان میں مضمون لکھنا عار نہ سمجھنا چاہیئے - ملک کی زبان جو ہے وہی رہیگی انگریزی کبھی اُس کی جگہ نہیں لے سکتی - یہ ممکن ہے کہ انگریزی الفاظ اور بہت سے ہماری زبان میں ملجائیں مگر وہ اُردو کی توسیع ہوگی نہ اُسکا استیصال - ہمکو اپنی زبان کی درستی اور توسیع میں کوشش کرنی چاہیئے اور اُسکو ہر علم و فن کی تصنیفات سے مالا مال کرنا چاہیئے - سر سید نے اُردو زبان کو بہت کچھ ترقی دی اب ہم پس ماندوں کا فرض ہے کہ اُسکو تکمیل کو پہونچائیں -

ہم آخر میں اپنے اُن معاونوں کا شکر کرتے ہیں جنھوں نے کہ اپنے عمدہ مضامین سے منتظمی کی امداد کی اور اُمید کرتے ہیں کہ وہ آیندہ بھی اپنی قلمی امداد جاری رکھینگے -

ہم نے وعدہ کیا تھا کہ سال گذشتہ کی آمد و خرچ کا حساب ہم اس مہینے میں شائع کرینگے - مگر بدقسمتی سے باوجود تاکید مزید کے مشن پریس کانپور سے حصۂ انگریزی کی چھپائی کے آخر چند ماہ کے بل وصول نہیں ہوئے اسلئے ابھی ہمارا حساب مکمل نہو سکا - مگر انشاء اللہ ماہ آیندہ میں ہم آمد و خرچ کا حساب ضرور شائع کر سکینگے -

ولایت حسین آنریری منیجر علیگڈھ منتظمی -

# "ہدیہ سعدیہ" اور "پھولوں کا شکریہ"

میرزا اسعد الدین صاحب رؤسائے کشمیر میں ایک لائق مہذب اور روشن خیال جنٹلمین ہیں۔ محمڈن کالج کے بڑے مداح اور دلدادہ ہیں۔ شہر سے دور باغ صدربل میں ان کا نشیمن عزلت ہے۔ وفور عنایت سے اُنھوں نے دو گلدستے اپنے باغ سے مع ایک نظم رنگین کے مجھے بھیجے۔ اُن گلدستوں کا شکریہ بھی نظم میں ادا کیا گیا۔ اس خط و کتابت کی ایک نقل ارسال خدمت ہے۔ میرزا صاحب کا فارسی کلام اعلےٰ پایہ کا ہے۔ اُردو میں شعر کم کہتے ہیں مگر ذیل کی نظم سے معلوم ہوگا کہ طبع موزوں ہر رنگ میں اپنا جلوہ دکھاتی ہے۔

## "ہدیہ سعدیہ"

اے مخلص صادق و وفادار — فرخندہ منش خجستہ اطوار
الطاف تو با من ست بیحد — اشفاق تو بر من ست بسیار
گلہائے علوم غربی کا — تو عطر ہے۔ کالج اُس کا عطار
ہے طبع میں موج کی روانی — یا ابر بہار ہے گہر بار
کالج پہ اگر ہے فخر تجھکو — اسکو بھی ہے فخر تجھپہ صد بار
کالج کے لئے تری سپیچیں — ہیں قصۂ عندلیب و گلزار
قومی نظمیں تری وہ دلکش — ق — برجستہ وہ آبدار اشعار
کالج کے لئے ہوئے ہیں ثابت — چرخ نام آوری کے سیّار
یہ خوبی بخت ہے ہماری — طالب ہوا آپ کا جو دربار
گو وصل میں ہجر کی ہے صورت — ہوں آپکی خیر کا طلبگار
ہوں گوشہ نشین شہر سے دور — گلزار میں عندلیب بیمار

ہمدرد مرا دلِ حزیں ہے — یا بلبلِ دردمند غمخوار
جب غنچۂ دل نہ ہو شگفتہ — گلزار ہے دشت - اور گل خار
دل خوش نہیں پر چمن ہے خوش رنگ — پھولوں سے لدے ہوئے ہیں اشجار
ہیں جھیلوں کے آئینے چپ و راست — ہے مدِ نظر فضائے کہسار
شاخوں پہ طیور ہیں غزل خواں — طنبور نوازیوں پہ تیار
سنکر یہ نوائے صبحگاہی — آجاتے ہیں وجد میں سب اشجار
کہتے ہیں زبانِ حال سے یوں — ہیں قدرتِ حق کے یہ سب آثار
ہُو کا عالم ہے ہُو - ھُوَاللّٰہ — بیرنگ کا رنگ ہے نمودار
ناظر کو بلائیے چمن میں — بلبل کو دکھائیے یہ گلزار
گلدستے بنا کے بھیجتا ہوں — بلبل کی طرف سفیرِ گلزار
لکھیو بلبل سے فصلِ گل ہے — گلزار و بہار ہیں طلبگار
گلدستے نہیں - ہیں پیکِ گلشن — بلبل کے حضور میں ملے بار
بے عیب ہے بے خطا خطائی — نافرماں عفو کا طلبگار
نالاں ہے تطاولِ خزاں سے — نرگس گریاں بہ چشمِ بیمار
ہے حسن گلاب قابلِ دید — ہے گل کے یہ کارواں کا سالار
رونق ہے چمن کی مارسل نیل — بانکا ترچھا حسین طرحدار
داؤدی ہے موسمِ خزاں کا — قاصد خوش لہجہ نغز گفتار
ہے ان میں گلِ ولایتی ایک — جسکے سر پہ ہے سُرخ دستار
ہے حلۂ سرخ میں قزلباش — نشے میں خوشی کے مست و سرشار
آتا ہے چمن کا ڈیپوٹیشن — خیر مقدم کو رہیے تیار
شیریں نفسی میں فرد ہیں سب — یہ پیکِ ختن سفیرِ فرخار

تاکید فضول ہے کہ بلبل
خود گل کی ہے جان سے خریدار

ناظر مجھے شعر سے غرض کیا
اک جذبۂ شوق کا ہے اظہار

کچھ آپ کہیں تو میں سنونگا
ہوں آپکی نظم کا خریدار

اس فن کا نہیں ہے مدعی سعد
ہیں اہل کمال اسکے حقدار

لکھی ہے یہ نظم ارتجالاً
دل پر ہے مرے ہجوم افکار

راقم آثم سعدالدین احمد
از باغ صدر بل کشمیر

# "پھولوں کا شکریہ"

اے میرے معظم و مکرم
ہم مشرب و ہم صفیر و ہمدم

اے گلبن گلشن معانی
اے بلبل باغ خوش بیانی

پہونچے گلدستہائے خوشرنگ
غنچہ کی طرح کھلا دل تنگ

گلدان ہیں یہ بشکل مرغ طیار
بلبل گویا ہیں گل یہ منقار

ہے لطف چمن مرے مکاں میں
ہے رنگ بہار کا خزاں میں

کیا تحفۂ دوست دلربا ہے
کیا ہدیۂ سعد جانفزا ہے

پھولوں کو ہوں میز پر سجاتا
پھولا نہیں جامے میں سماتا

پھولوں کا یہ دلفریب منظر
ناظر کو ہے ملک جم سے بہتر

ہے حسن و جمال کی یہ تصویر
ہے جلوۂ یار کی یہ تنویر

شاہد معنی حجاب میں ہے
کاتب پنہاں کتاب میں ہے

اس روپ میں ہے وہی سجیلا
اس رنگ میں ہے وہی رنگیلا

گل گفت سحر گہاں بہ گوشم ‎ ‎ من جلوۂ حسن گل فروشم
این رنگِ من از رخِ نگاریست ‎ ‎ بویم ز شمیمِ زلفِ یاریست
در ہر رگِ من دو دیدہ تارے۔ ‎ ‎ در پردہ نشستہ پردہ وارے
یک خندہ ام از لبِ نکوئے ‎ ‎ یک شعشعہ ام ز تابِ روئے

بر حسن و جمالِ گل چو دیدم
از شوق نوائے بر کشیدم

اے گل۔ اے شاہدِ دل آرا ‎ ‎ اے دشت و چمن کے محفل آرا
تو زینتِ گلشنِ جہاں ہے ‎ ‎ تو رونقِ روضۂ جناں ہے
ہیں بزمِ چمن میں راگ تیرے ‎ ‎ گاتی ہے صبا سہاگ تیرے
بادل ترے سر پہ جھومتے ہیں ‎ ‎ چھینٹے ترے پاؤں چومتے ہیں
شبنم ترا پیرہن ہے دھوتی ‎ ‎ کرتی ہے نثار سر پہ موتی
ہے صحنِ چمن میں راج تیرا ‎ ‎ زیبندہ ہے سر پہ تاج تیرا
درباں ترا سروِ جویباری ‎ ‎ سقا ترا ابرِ نوبہاری
شمشاد ہے چوبدار تیرا ‎ ‎ خیمہ نخلِ چنار تیرا
ہے بطنِ زمین ترا خزانہ ‎ ‎ سبزہ ہے ترا فراش خانہ
نرگس ساقی ہے مست و مخمور ‎ ‎ میخانہ ترا ہے شاخِ انگور
رنگیں تری فوج کی ہے وردی ‎ ‎ عنابی گلابی لاجوردی
سبزانِ چمن نقیب تیرے ‎ ‎ چاؤش ہیں عندلیب تیرے
کہسار میں دشت میں چمن میں ‎ ‎ نسریں میں سمن میں نسترن میں
جلوہ ترے رخ کا سو بسو ہے ‎ ‎ پھیلی ترے گیسوؤں کی بو ہے

گلزار میں ہے نسیم تیری ٭ کہسار میں ہے شمیم تیری۔

اے بزمِ جہاں سجانیوالے
اے حسنِ ازل دکھانے والے

اے زینتِ دشت و فخرِ گلشن
اے پاک سرشت پاک دامن

کاش۔ اے گلِ خوش نفس نکورو
ہوتی ناظر میں تیری خو بو

معصوم تو اور پر گنہ میں
تو سرخرو اور روسیہ میں

ہے گرد سے تیرا پاک دامن
عصیاں سے ہے میرا چاک دامن

تو غیروں کے دل لبھانیوالا
میں خویشوں کی جان کھانیوالا

زینت تجھ سے چمن میں بن میں
وحشت مجھ سے ہر انجمن میں

جنگل میں ہے تیرے دم سے منگل
محفل میں مرے قدم سے ہلچل

ہے موجِ صبا میں تیرا آنا
اور روشِ ہوا پہ تیرا جانا

تم آئے چمن میں مسکراتے
اور جاؤ گے ہنستے کھلکھلاتے

ہم آئے تھے کشمکش میں پڑ کر
اور جائینگے ایڑیاں رگڑ کر

چوں دیدہ بہ حسنِ گل گمارم
از زشتیِ خویش عار دارم

نے برگِ گلم نہ سروِ بستاں
"مارا بچہ کار کشت دہقاں"

احقر ناظر از سرینگر۔

# محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس

یہ ہفت دہ سالہ نوجوان ہفتاد سالہ معمر بزرگ ہو، لیکن اب جبکہ اُسنے عالمِ صباوت سے سنِ رُشد میں قدم رکھا ہے ہمکو توقع ہے۔ اور کیسا ستم ہوگا اگر یہ توقع پوری نہوئی۔ کہ نوعمری کا کھیل کود سنِ تمیز کی متانت اور دُور بینی سے مبدّل ہو جائیگا؛ اور سیر و تماشے کا شوق، محنت اور کام کرنے کی عادت کے لئے جگہ خالی کریگا۔

آج کانفرنس مسلمانوں کی سب سے بڑی، اور سب سے عالیشان آرگنیزیشن (جمعیت) ہے؛ اور ہر سال کے آخری مہینوں میں ہمارے بحیثیت قومی جسم کے ہر رگ و ریشے میں خون دوڑنے لگتا ہے اور کانفرنس جیسے داعی کی دعوت پر ہندوستان کے ہر گوشے سے صدا اے لبیک بلند ہوتی ہی۔ برف کی گیند کیطرح جو برف سے ڈھکی زمین پر لڑکانے سے خود بخود بڑھتی چلی جاتی ہے، ہماری کانفرس بھی علی گڈہ سے سترہ برس ہوئے ایک زبردست، دُوربین، اور محبِ قوم کے ہاتھ سے (جو آہ! اب ہم میں نہیں ہے) لڑکائی گئی، اُدھر سے اِدھر اِدھر سے اُدھر پھری اور بحمد اللہ اِسوقت وہ ایسا جسیم گولہ ہے جو معترضین کے دِل وہلانے کے لئے کافی ہے۔ مگر اِس گولے سے صرف دِل وہلانے کا کام لیا جائیگا، یا فوجِ جہالت کی صف شکنی بھی کیجائیگی؟

آئیے کانفرنس کی شان و شوکت پر نظر ڈالیں؛ کون سوا ہماری کانفرنس اور انڈین نیشنل کانگریس کے ایسے وقیع اور با اثر، لائق اور جوشیلے، مشہور اور تجربہ کار، اہلِ علم اور اہلِ الرّاے پریسیڈنٹوں کا دعویٰ کرسکتا ہے؟ اگر ایک صف میں دادا بھائی نوروجی، ڈبلیو سی بنرجی۔ مسٹر رحمت اللہ سیانی، رومیش چندر دت، اور لال موہن گھوش وغیرہ ہیں، تو ذرا دوسری طرف بھی نظر اُٹھائیے؛ اِس صف میں کیا مجمعِ مشاہیر و محبانِ وطن کھڑا ہے!

آنریبل نواب عماد الملک سید حسن بلگرامی، آنریبل مولوی محمد شاہ دین، آنریبل ہز ہائنس سر آغاخان، آنریبل مسٹر جسٹس سید امیر علی وغیرہ، اور ہماری صف میں جو سب سے آخر ہیں، وہ

اِدھر بھی ہیں اور اُدھر بھی ہیں اور اسیطرح شرکاے جلسہ کا خیال کر لیجیے۔

مرحوم ملک الشعراے انگلستان، ٹینی سن، کے انتقال پر قدرشناسانِ سخن کی رائے تھی کہ چونکہ اُس جیسا جانشین ملک میں نہیں لہذا بجائے اسکے کہ ایک تیسرے درجے کا شخص اس عہدے کی ذلت کرے، یہ مناسب ہے کہ یہ عہدہ آیندہ سے توڑ دیا جائے اور کسی کو ملک الشعراء کا خطاب نہ ملے۔ بعینہ یہی حالت کانفرنس کے پریسیڈنٹوں کی ہوتی نظر آتی ہے۔ یکے بعد دیگرے کچھ ایسے عُلوم وعام کے پریسیڈنٹ کانفرنس کو نصیب ہوئے کہ اب متجسس نگاہ اس وسیع ملک کے کونے کھُدرے میں بھی جاتی ہے تو پچھلے تین چار پریسیڈنٹوں کا ہمسر جانشین نہیں پاتی اب نواب محسن الملک ساغو اص بھی ہیں خوف ہے اس گوہر کی تلاش ہیں بےنیلِ مرام رہیگا پس اگر پریسیڈنٹوں کی قابلیت پر کانفرنس کا قیام شرط ہے؛ تو ہماری راے ہے کہ ۱۹۰۳ء کی کانفرنس کے بعد کانفرنس ہمیشہ کے لئے بند کردینی چاہیے۔ اور اسکے مزار پر یہ کتبہ لکھدینا چاہیے کہ "مرحوم نے بڑی کامیابی سے زندگی گذاری۔ اور اُسکا آخری وقت اُسکی عمر کا شیریں ترین حصہ تھا"

مگر کیا یہ نہیں ہوسکتا کہ بجاے کانفرنس کی موت کے اُسکی زندگی کا نیا دورہ شروع ہو، اور اس صحیفے کا نیا ورق پلٹا جائے؟ کیا یہ ممکن نہیں کہ اس تیتری کی خاک سے جو اپنے خوشنما پر دکھاتی پھرتی تھی اور جسے کام کرنیکا نہ شوق تھا نہ پروا تھی، ایک شہد کی مکھی پیدا ہو جو محنت کی زندگی شروع کرے، جسے کام کی دُھن ہو اور جسے اپنے بدنما پر دکھانیکی نہ خواہش ہو نہ ضرورت؟

کانفرنس اپنا ایک فرض منصبی بہ طرزِ احسن پورا کرچکی۔ پبلک کے خیالات متعلق تعلیم وضروریات زمانہ درست کرنا اور جمہور کو اپنی طرف مائل کرنا، یہ دونوں باتیں حاصل ہوچکی ہیں۔ اب تعلیم کی ضرورت سب کے نزدیک مسلّم ہے؛ اب ہر باپ اپنے بیٹے کو پڑھانا چاہتا ہے، اب ہر شخص تعلیم نسواں کو ضروری سمجھتا ہے؛ لیکن یہ توقع کرتا ہے

کہ کانفرنس اُسکا کچھ انتظام کریگی۔

سترہ برس سے کہا جاتا ہے کہ کانفرنس کا کام صرف قوم کو مشورہ دینا ہے، اور قوم کا کام اُس پر عمل کرنا، کیا اٹھارویں سال بھی یہی کہا جائیگا؟ ہم وست بستہ التجا کرتے ہیں کہ ۱۹۰۴ء سے تو یہ نہ کہا جائے۔ چاہیے جو کچھ اور کہا جائے مگر یہ نہ کہا جائے۔ اگر وہ ہزار دو ہزار تعلیم یافتہ، ذی اثر، قوم کے ہمدرد، صاحب مقدرت حضرات جو کانفرنس میں شریک ہوتے ہیں۔ آج بھی، کل کلکتہ اور پرسوں مدراس میں جمع ہوکر قوم کو مشورہ دینے کے لئے بنائے گئے ہیں، اور کروڑہا جاہل، مفلس، غافل، یا چند امیر مگر بے پروا مسلمان اُن مشوروں پر عمل کرنے کے لئے؛ تو ہم مسلمانوں کی ترقی کا کوئی دل خوش کُن خواب بھی نہیں دیکھ سکتے؛ اور ہمارے نزدیک اُن کی بدقسمت قسمت کا فیصلہ کبھی کا ہوچکا۔

شاید سو کے قریب رزولیوشن پاس ہوچکے ہیں، اگر کارکنانِ کانفرنس کے سمعِ مُبارک پر گراں نہ گذرے تو یہ کہنا چاہیئے کہ کافی تعداد پاس ہو چکی ہے۔

ایک صنعت و حرفت کی تعلیم کا رزولیوشن رکھا گیا تھا، وہ بھی بمبئی میں پاس ہوگیا۔

ہم ڈرتے ڈرتے یہ کہتے ہیں کہ کیا آیندہ سے یہ مناسب نہوگا کہ رزولیوشنوں کا پاس کرنا بند کردیا جائے اور ہر سال ممبر جمع ہوکر یہ دیکھا کریں کہ اُنھوں نے پچھلے رزولیوشنوں پر کسقدر عمل کیا اور آیندہ اُنھیں پر عمل کرنے کی کیا تدابیر کرنی چاہئیں۔

ہمیں اس تجویز سے بہت کچھ توقع ہے کہ کانفرنس کے کانسٹیٹیوشن میں ترمیم کیجائیگی مگر ساتھ ہی یہ اُمید بھی ہے کہ اِن ترمیمات کا انتظار نہ کیا جائیگا۔ اور کم سے کم چند رزولیوشنوں پر تو فوراً عمل کرنیکی کوشش کردیجائیگی خواجہ غلام الثقلین صاحب صیغۂ اصلاحِ تمدن اور مولانا شبلی، لٹریری سیکشن میں قابلِ تحسین کوشش کر رہے ہیں؛ مگر کیا منشی محبوب عالم صاحب کا صنعت و حرفت کا رزولیوشن بھی اور رزولیوشنوں کی طرح کانفرنس کی رپورٹ کے صفحات کو زینت دیگا۔ اور شیخ عبداللہ صاحب، شوکت علی صاحب، اور مولوی بشیرالدین صاحب

کیا ہماری بدنصیب لڑکیوں کی تعلیم کا مسئلہ، آپکی پُرجوش اسپیچوں، البشیر اور مس نصیر الدین حیدر تیموریہ کے مضامین، نصاب تعلیم نسواں کی تجویز، نصاب کمیٹی کے قیام، مس سوسی سہراب جی کی دلدوز اپیل، اور مسٹر ہاریسین کی اسکیم کی مخالفت سے اس سال بھی آگے نہ بڑھیگا کیا ۱۹۰۷ء کے بارہ مہینوں میں آپ کی کوششوں سے کہیں ایک بھی معقول مدرسۂ نسواں قائم نہ ہوگا؟ کیا اس سال بھی اسلامی مدرسوں کی نگرانی اور استحکام کا کام رنگ رنگیلا کر چلیگا، کیا اس سال بھی۔ مگر سے

خیال خاطر احباب چاہیئے ہر دم۔
انیسؔ ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو۔[1]

(سجاد حیدر)

# ہمارے اُردو اخبارات

*

کیسے افسوس کی بات ہے کہ اس زمانے میں جبکہ تمام جہان میں اخباروں کی وقعت کیجاتی ہے ہمارے اُردو اخبارات محض بے اثر اور بے حقیقت ہوتے ہیں۔ اوّل تو اُردو اخبارات کے پڑھنے والوں کی تعداد بوجہ قومی اور مذہبی تعصب کے کم ہے اور ہوتی جاتی ہے۔ ہندوؤں نے اپنے جُدا اخبار ہندی میں۔ بنگالیوں نے بنگالی میں۔ مرہٹوں نے مرہٹی زبان میں جاری کر دیئے ہیں۔ اور ہر سال ایسے جدید پرچوں کا نمبر بڑھتا رہتا ہے۔ پھر اُس پر یہ کہ مسلمانوں میں جو لوگ انگریزی زبان سے واقف ہیں وہ اُردو اخبارات سے دلچسپی نہیں رکھتے۔ ان تمام وجوہ سے ہمارے اُردو اخبارات کا دائرہ بہت ہی محدود اور غایت درجہ تنگ ہوگیا ہے۔

باوجود ان مشکلات کے جس غفلت اور لاپروائی کے ساتھ ہمارے اخبار چلائے جا رہے ہیں؟

---

[1] - بمبئی کانفرنس کے پریسیڈنٹ کا ایڈریس ایسی غیر معمولی اور غیر متوقع مباحث سے پُر تھا کہ اُس پر بالکل ریویو نہیں کیا گیا۔ اسپر ایک علٰحدہ مضمون درکار ہے۔ س۔ ح۔

نہایت حیرت انگیز اور افسوسناک ہے۔ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ جو لوگ ہندوستان میں محض بیکار اور بے مصرف ہوتے ہیں وہ ایک اخبار یا رسالہ نکالکر چار پیسے کمانے لگتے ہیں۔ ایسے لوگ جو اس کام کو اور اُسکی اہمیت کو مطلقاً نہیں جانتے بجائے اسکے کہ قوم اور ملک کی واسطے مفید ہوں اُلٹے نقصان دہ ہوتے ہیں۔ اور یہ خیال کچھ غلط نہیں ہے۔ فی الحقیقت ہمارے اُردو اخبارات کے اڈیٹر اکثر ایسے لوگ ہوتے ہیں جنکو عام واقفیت تو درکنار خود اپنی قوم کی ضرورت اور پالیسی کی خبر نہیں ہوتی۔ اُن لوگوں نے اپنے اخبارات کو ژٹل قافیوں کا مجموعہ بنا رکھا ہے۔ ایک آدھ پھٹے ٹوٹے مضمون جنکا نہ سر نہ پیر پانچ چھ مبتذل روایتیں جنکی سند ندارد اور ایک لمبی چوڑی فہرست ہفت اقلیم کی خبروں کی۔ اِس کے سوا اگر کچھ ہوتا ہے تو وہ دل خوش کُن اور مرغوب الطبع دوائیوں کے اِشتہارات ہیں جنسے صفحے کے صفحے رنگے ہوئے ہوتے ہیں۔ اور جنکی بدولت حجم اخبار اور اُسکا ظاہری وقار بڑھجاتا ہے۔ مایۂ من جنس ست برای من بس ست۔

برخلاف اسکے یورپ میں اخبارات ایک اچھی خاصی قوت سمجھے جاتے ہیں۔ صدر اعظم انگلستان مسٹر گلاڈسٹون کا قول تھا کہ جبتک صبح اُٹھکر میں ٹائمس اخبار نہیں دیکھ لیتا اُسوقت تک مُجھپر خوف اور دہشت طاری رہتی ہے۔ یورپ میں جو عمدہ اثر اخباروں کا وہاں کے نظم و نسق سلطنت اور اُمورات باہمی پر پڑتا ہے اُسکا کسی مفید سے مفید قانون کا نہیں ہوتا۔ اور اس پیشے کو وُہی لوگ اختیار کرتے ہیں جنکو خدا نے روشن دل اور غیر معمولی دماغ عطا کیا ہو۔ ؎

سخن گفتن و بکرِ جاں سُفتن ست ٭ نہ ہرکس سزای سخن گفتن ست

اور اگر کوئی ناقابل شخص داخلِ زمرۂ اخبار نویسی ہوگیا تو پبلک اوپینین (جمہور کی رای) اُسکو قبول نہیں کرتی۔

افسوس ہے کہ ہندوستان میں جمہور کی رای کوئی چیز نہیں۔ ورنہ ہزاروں خرابیاں جو ہم پاتے ہیں رفع ہو جاتیں۔ جب ہماری سوسائٹی میں اخبار بینی کا شوق کمیاب ہے تو اخبار کی اچھائی اور بُرائی کا ذکر ہی کیا۔ اور اُن کے نفع اور ضرر کی بحث ہی فضول ہے۔

مگر میں اس مضمون میں یہ ظاہر کرنا چاہتا ہوں کہ ایک مفید اخبار میں کیا صفات لازمی اور ضروری ہیں۔ تاکہ ناظرینِ اخبارات اُردو کی اصلاح اور ترقی میں کوشش کرکے وہ قومی ضرورت پوری کریں جسکے لئے تمام ملک رو رہا ہے۔

اوّلاً۔ اخبار کا منیجر باوقعت اور صاحب ثروت ہونا چاہیئے۔ تاکہ خاص حالتوں میں جو اخبار کے لئے غیر معمولی نہیں ہیں وہ تمام اخراجات کا بہ نفسِ خود متحمل ہو سکے۔

دُوم۔ ایڈیٹر ایسا شخص ہونا چاہیئے جسمیں علمی مذاق اور فنِ انشا کے علاوہ عام معلومات بھی پائی جائیں۔ جسکی رائے صائب ہو۔ جو ملکی اور قومی معاملات سے بخوبی واقف ہو۔ اور اُنسے دلچسپی رکھتا ہو۔ جو اخبار کی پالیسی سے ٹھیک آگاہ ہو اور اُس سے سرِمُو تجاوز کرنا گناہِ عظیم جانتا ہو۔ جو پختگی رائے کے ساتھ ساتھ اعتدال اور نرمی کو فروگذاشت نکرے۔ جو تنگدلی کے عیب سے پاک اور تعصباتِ بیجا سے آزاد ہو۔ جو باوجود آزادمنشی کے خلیق۔ نیک نیت۔ سچا اور خوش صحبت ہو۔

سوُم۔ ہر اخبار کی ایک خاص اور مستقل پالیسی ہونی چاہیئے۔ اور تمام مضمون اُسی پالیسی کے موافق چھپنے چاہئیں۔ یہ بہت بڑا عیب اُردو اخبارات میں ہے کہ اُن کی پالیسی کچھ نہیں ہوتی۔ مضموں نگار نے جو کچھ اناپ شناپ لکھکر بھیجدیا چھپگیا۔ خود اڈیٹر کے پاس گرہ کی عقل مفقود ہو جاتی ہے۔ ؎

درپسِ آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند ۔ آنچہ اُستادِ ازل گفت ہماں میگویم

اگر کبھی اڈیٹوریل زبردست لکھنا ہوا تو دو چار نامہ نگاروں کی رایوں کو خلاصتہً بلالحاظ تناقض و تضدید ایک جگہ جمع کردیا۔ اس شرمناک طریقے کے بجاے ایڈیٹر کا کام ہے کہ واقعات کی جانچ تول کرے اور جو منطقی نتیجہ اُن سے نکلتا ہو اُسکو عام ملکی اور سوشل حالت سے مطابق کرکے نہایت سنجیدہ اور گتھے ہوئے الفاظ میں پبلک کے سامنے پیش کرے۔

مضامینِ غیر کے چھاپنے میں غایت درجہ احتیاط واجب ہے۔ مضمون قابل اشاعت

کی پہچان ہر شخص میں ممکن نہیں۔ لیکن جس اڈیٹر میں امتیاز مضامین کا سچا مذاق نہیں وہ حقیقت میں ناقابل ہے۔ اور اخبار کا بارِ گراں اُٹھانے کے لائق نہیں۔ عمدہ اڈیٹر وہ ہے کہ جو کھرے کھوسٹے کی شناخت رکھتا ہو اور جسکو کوڑے میں سے موتی چُن نکالنے کا ڈھب خداداد حاصل ہو۔

چہارم۔ اخبار کے نامہ نگاروں سے اڈیٹر کو واقفیت ہونا چاہیئے۔ اُن کے ساتھ دوستانہ خط و کتابت جاری رکھنی چاہیئے۔ اور اُن کے حالات اور دیگر ذرائع سے بھی با خبر ہونا چاہیئے۔ تاکہ اخبار کے چلانے میں سہولت ہو اور جو مضمون شائع ہوں اُن پر وثوق اور اعتماد یقینی ہو۔

پنجم۔ ہر اخبار کے متعلق ایک لائبریری ہونی چاہیئے جس میں تاریخ کی کتابیں جمع کیجائیں اور سوشل اور تمدنی حالات کا ذخیرہ معتدبہ ہر وقت موجود رہے۔

علاوہ اسکے علم الاعداد ( اسٹیٹسٹکس ) کے متعلق رسالہ اور سرکاری رپورٹیں بھی دفتر اشاعت میں کافی طور پر مہیا ہونی چاہئیں۔

ششم۔ ہر اخبار کے کارکناں میں دو تین عمدہ انگریزی داں شخص ضروری ہیں جو انگریزی اخبارات اور رسائل کو پڑھکر مضامینِ مفیدہ کا اقتباس کیا کریں۔ یہ لازمی نہیں ہے کہ یہ کارکن صاحبان دار الاشاعت میں مقیم ہوں کیونکہ عموماً اخبارات اُردو ایسے بڑے اسٹاف کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ لیکن اڈیٹر بہ آسانی ایسے دوست مختلف مقامات پر پیدا کر سکتا ہے جو انگریزی اخبارات کو پڑھکر اُن کا انتخاب اُسکے پاس بھیجتے رہیں اور اس قسم کے نامہ نگاروں کی ویسی ہی قدر ہونی چاہیئے جیسی کہ خود اپنے مضامین لکھنے والوں کی ہوتی ہے۔

باقی آئندہ۔

# گوشت خوری
# کا
# جواز یا عدم جواز

گوشت خوری کا مسئلہ بھی آجکل دُنیا میں بحث طلب ہوگیا ہے جوں جوں تہذیب اور علم کی روشنی پھیلتی جاتی ہے اور ہر بات میں چھان بین ہوتی جاتی ہے اُتنا ہی اس مسئلہ پر آزادانہ روشنی ڈالنے کی کوشش کیجاتی ہے، اسکے دو مدِ مقابل زبردست گروہ ہیں ایک وہ جو گوشت خوری کو ایک ظالمانہ فعل اور زمانۂ وسطیٰ کی جہالت کی یادگار حرکت سمجھتے ہیں اور بالکل جائز نہیں رکھتے، دوسرے وہ لوگ ہیں جو اسکو جائز رکھتے ہیں۔ اسپر مباحثے کے بہت سے طریقے ہیں، بعض مذہبی پیرایہ میں اس مسئلے پر گفتگو کرتے ہیں، اور فریقین مذہبی دلائل پیش کرتے ہیں، ایک فریق کہتا ہے کہ یہ حرکت چونکہ شقاوتِ قلب اور سخت خود غرضی پر مبنی ہے اسلئے خدای حلیم اور رحیم کی مرضی کے بالکل خلاف ہے، دوسرا کہتا ہے کہ اسمیں کوئی بات مرضیِ الٰہی کے خلاف نہیں ہے جبکہ درندوں وغیرہ کا فعل گوشت خوری خالقِ اکبر کی مرضی کے بالکل موافق ہے کیونکہ اگر خدا کے علم و رحم کے خلاف یہ حرکت ہوتی تو درندوں کو نباتات خور بنا دیتا، پھر انسان کی گوشت خوری کا خدا کی مرضی پر کوئی اچھا یا بُرا اثر نہیں پڑسکتا۔ بعض فطرتی پیرایہ میں اسپر مباحثہ کرتے ہیں، اور اسپر غور کرتے ہیں کہ آیا انسان کی بناوٹ غیر گوشت خور قسم کی ہے یا اسکے برعکس، غیر گوشت خور اسکو بندر کی نسل یا بندر کے مشابہ کہتے ہوئے یہ دلیل لاتے ہیں کہ اس سلسلے میں زیادہ تر وہ مخلوق ہے جنکے پھاڑ کھانے کے قابل ناخن نہیں بنائے گئے۔ اور اس لحاظ سے انسان فطرتاً غیر گوشت خور ہے، فریقِ دُوم یعنی گوشت خور کہتے ہیں کہ انسان کے مُنہ میں ایک سلسلہ ایسے دانتوں کا موجود ہے جنکو گوشت خور مخلوق استعمال کرتی ہے اور جنکو کیلے کہتے ہیں، اس لحاظ سے انسان فطرتاً گوشت خور مخلوق میں شمار ہونے کے قابل ہے۔ غرض کہ دونو فریق اپنے اپنے موافق زور لگا رہے ہیں، نظر

بحالاتِ موجودہ غیر گوشت خور فریق زیادہ کامیاب ہو رہا ہے، ہمارے مُلک میں اسکی سربراہی
آریہ پارٹی کے ہاتھ میں ہے اور یورپ میں ویجیٹیرین سوسیٹی اسکی سپورٹر ہے، وہاں روز بروز گوشت
خوری سے تنفر بڑھتا جاتا ہے اور لوگ نباتات خور سوسیٹی میں شامل ہوتے چلے جاتے ہیں، یورپ
میں تارک اللحم سوسیٹی کے کلب قائم ہیں ہوٹلیں ہیں، وہاں گوشت خور فریق بھی اُن جانوروں کے
ساتھ ہمدردی کرنے لگا ہے جو انسانی ضرورت سے ہلاک کئے جاتے ہیں۔ پروں، یا ہڈی حاصل
کرنے کی غرض سے جانوروں کے مارنے سے، اور کثرت سے جانوروں کے ذبح کرنے سے ایک
قسم کی نفرت ظاہر ہونے لگی ہے اسکی غایت غرض یہ ہے کہ کوئی مخلوق نہ ستائی جائے۔ ہم یہاں
زیادہ تر اس پہلو پر بحث کرینگے کہ آیا یہ بات کہ کوئی جاندار نہ ستایا جائے ممکن ہے یا نہیں، اور کیا
ہم فطرتاً جان ستانے میں مجبور ہیں یا مختار۔ جہانتک غور کیا جاتا ہے انسان اگر اُسکو دنیا میں اپنی حیات
منظور ہے دوسری جانوں کو ستانے میں بالکل فطرتاً مجبور ہے، اگر ہم تارک اللحم بھی ہو جائیں
پھر بھی ہم اُس نہایت باریک حیوانی مخلوق کی جان لینے سے محفوظ نہیں رہ سکتے جو کہ ہماری نظروں
سے پوشیدہ ہوا میں اُڑتے پھرتے ہیں، اور بلا ارادہ ہمارے سانس کے راستے ہمارے پیٹ
میں اُتر جاتے ہیں، اور ہمارے پاؤں کے نیچے کُچل جاتے ہیں، ہم پانی وغیرہ سیّال چیزوں کی ہمراہ
کتنے کیڑے ہلاک کر دیتے ہیں، اسکا شمار ہمکو معلوم نہیں، اِس جانوں کے ضائع کرنے کے انسداد
کا طریقہ ظاہراً فہم انسانی سے خارج ہے ۔ سب سے زیادہ مشکل یہ ہے کہ جسقدر نباتاتی غذا
مادرِ زمین پیدا کرتی ہے وہ موجودہ بنی نوع انسان کا پُورا نہیں ڈال سکتی، اب تو یہ امر بحث طلب ہے کہ
انسانی نسل کی رفتارِ ترقی کی اگر یہی حالت رہی تو پانسو برس کے بعد موجودہ اشیاء نباتی اور
حیوانی بھی جو بطور خورش کے استعمال میں آتی ہیں انسانی غذا کو بالکل کافی نہیں ہونگی اور ہم مجبور
ہونگے کہ کوئی اور قسم غذا کی بھی اپنے واسطے تجویز کریں۔ اب بھی دنیا کے بہت سے حصے ہیں
جہاں صرف نباتاتی غذا پر بسر کرنا محال ہے مثلاً عرب کا ایک وسیع حصہ یا وسطِ ایشیا کے
میدان یا افریقہ اور یورپ کے بعض قطعات جہاں کے باشندے نباتاتی غذا کے لئے بالکل دوسرے

ممالک کے محتاج ہیں اور جہاں کی زمین میں روئیدگی کی مطلق قابلیت نہیں، اگر یہ لوگ تارک اللحم ہوجائیں تو انکی زندگی محال ہوجائے۔ گوشت خوری بُرا سمجھنے کی بڑی وجہ صرف یہ ہے کہ اس طریقے میں ایک جان کے فائدے کیواسطے دوسری جان ستائی جاتی ہے، جان کا ستانا یا جان کا مارنا ہی صرف گوشت خوری میں ایک فعل ہے جو ظالمانہ حرکت کہی جاتی ہے اور مرتکب کی شقاوتِ قلب کو ظاہر کرتی ہے، صرف یہی ایک نظارہ ہے جو ایک ہمدرد مخلوق کی آنکھ کو بھلا نہیں معلوم ہوتا۔ اب دیکھنا یہ ہے کیا ترکِ استعمالِ گوشت کے بعد بھی ہم ایسی ہتیا (رُوح کو اذیت پہونچانا) سے بچ سکتے ہیں؟ کیا اُسکے بعد کہ ہم گوشت خوری ترک کردیں ہمکو جان ستانے کی ضرورت لاحق نہ ہوگی؟ ان سوالوں کے تصفیہ کیواسطے اوّل ہمکو یہ فیصلہ کرنا چاہیئے کہ جانور یا ذی رُوح کسکو کہتے ہیں؟ اور وہ کونسی مجموعہ صفات ہیں جو ہر ایک ذی رُوح یا جاندار میں بطور قاعدہ کلیہ کے پائی جاتی ہیں؟ جس سے اُنپر ذی رُوح یا جاندار ہونے کا اطلاق ہو۔ ہم یہاں رُوح کے باریک اور پوشیدہ مسئلے سے بحث نہیں کرینگے بلکہ ہم چند ظاہری نشان بیان کرینگے۔ چند خاص صفات ہیں جنکو ہم غور کرنے سے ہر ایک ذی رُوح میں موجود پاتے ہیں یعنی پیدایش، بچپن، لڑکپن، جوانی، بڑھاپا اور موت۔ دُنیا میں کوئی جاندار ان صفات سے مُستثنا نہیں ہے۔ جیسی یہ صفات انسان میں موجود ہیں ویسی ہی شیر میں، ویسی ہی ہاتھی میں، اور ویسی ہی چیونٹی میں، وقس علیٰ ہذا، اس سے یہ قاعدہ کلیہ سمجھ میں آتا ہے کہ جس مخلوق میں یہ صفات موجود ہونگی وُہی جاندار یا ذی رُوح کہلائے جانے کی مستحق ہوگی۔

جبکہ ہم جیو ہتیا (رُوح کے ستانے کے گناہ) کے باعث گوشت کھانا چھوڑدیں تو صرف نباتات باقی رہ جاتے ہیں جنکو ہم اپنی غذا کے طور پر استعمال کرنا چاہتے ہیں، لیکن انصاف یہ ہے کہ قبل نباتات خوری شروع کرنے کے ہمکو ضرور اسپر غور کرنا چاہیئے کہ ویجیٹیرین ہوجانے کی شکل میں تو ہم رُوح کے ستانے یا جان کے ہلاک کرنے کے مرتکب نہ ہونگے، اسکے واسطے ہم کو نباتات کی حالت پر غور کرنا چاہیئے اور دیکھنا چاہیئے کہ اس حصّہ مخلوق میں تو کوئی ایسی مخفی شے نہیں ہے

جسمیں مذکورہ صفات پیدایش سے موت تک موجود ہوں؟ ہمکو حیرت ہوتی ہے جبکہ ہم نہ کسی مخفی شے میں بلکہ خود نباتات میں بھی مذکورۂ بالا صفات کا سلسلہ پاتے ہیں جنکو ہم ذی روح یا جاندار ہونے کی دلیل بیان کرچکے ہیں، تمام نباتات کی پیدایش مثل حیوانات کے بذریعہ تخم کے ہے، اُن میں بھی جوانی بڑھاپا اور موت ویسی ہی واقع ہوتی ہے جیسی حیوانات میں، خواہ تم کتنی ہی حفاظت کرو لیکن کوئی نباتات مثل حیوانات کے حدِ معین سے زائد زندہ نہیں رہتی۔ نباتات بھی مثل حیوانات کے جان کنی کی تکلیف کا اظہار اپنے مرجھانے کی صورت میں کرتے ہیں گو وہ مثل کیڑوں کے مرنے کی تکلیف کا اظہار اپنے نطق سے یا اپنی آنکھوں سے نہیں کرسکتے۔ لیکن مرجھانا اور خشک ہوجانا ایسی زبردست علامتیں ہیں جن سے ہم اُنکی تکلیف کو معلوم کرسکتے ہیں۔ عالمانِ نیچرل سائنس نے یہ تسلیم کرلیا ہے کہ نباتات بھی مثل حیوانات کے ذی روح ہیں، اُن میں اور حیوانات میں صرف ساکن اور متحرک کا فرق ہے، نباتات بھی غذا کے ایسے ہی محتاج ہیں جیسے حیوانات، نباتات جبکہ اُنکو اُن کی مرغوب غذا ملتی ہے ویسی ہی رغبت سے اپنی جڑوں اور باریک ریشوں کے ذریعے سے چوس لیتے ہیں جیسے حیوانات۔ ذرا پانی یا کھات میں کمی کیجائے نباتات کی نشو و نما میں فرق واقع ہوجاتا ہے۔ یہ بات اب تفصیل ہوگئی ہے کہ نباتات بھی امراض میں مبتلا ہوتے ہیں، اُن میں بھی قریبًا ویسے ہی امراض کا سلسلہ پایا جاتا ہے جیسا کہ حیوانات میں، چنانچہ امریکہ کے ایک شہر میں نباتات کے معالجات کا ایک بہت بڑا اشفاخانہ کھل گیا ہے، چھوٹی موٹے علاج تو سہارنپور کے بٹانیکل گارڈن میں بھی ہوتے ہیں۔ عالمانِ علم الحیوان نے بذریعہ کیمسٹری بیاتنک دریافت کرلیا ہے کہ نباتات اور حیوانات دونوں کی خلقت ایک ہی مادے سے ہے، عند التحقیقات معلوم ہوا ہے کہ نباتات اور حیوانات کے مادے میں صرف نائٹروجن گیس کا فرق ہے جو اول الذکر میں نہیں ہے یعنی نباتات کا مادہ صرف کاربن، آکسیجن اور ہیڈروجن سے مرکب ہے اور حیوانات کے مادے میں ان تینوں گیسوں کے ساتھ ہی نائٹروجن بھی ہے۔ اِس تمام تحقیقات سے ثابت ہوا کہ نباتات بھی مادہ روحانی سے خالی نہیں ہیں، جس سے لازمی نتیجہ ہے کہ باوجود دیکھنے

ہو جانے کے ہم مارو ح کے ستانے یا جان کے مارنے کے اپنی غذا طلیار ہی نہیں کر سکتے۔ جسکو دوسرے الفاظ میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ یہ امر ممکن ہی نہیں کہ انسان جیو ہتیا (جان کے مارنے) سے بچ سکے، انسان کو اس مسئلے میں نیچر نے مجبور کر رکھا ہے، پس ایسی حالت میں ہمکو گوشت خوری کو "ہتیا" یا "ظالمانہ فعل" وغیرہ الفاظ سے تعبیر کرنا نہیں چاہیئے، بلکہ سمجھنا چاہیئے کہ گوشت خوری بھی انسان کی ایک صنفِ غذا ہے جیسے درندے گزندے جانوروں کے مارنے میں کوئی ہرج نہیں ہے اسیطرح گوشت خوری بھی کوئی نفرت انگیز فعل نہیں ہے، اور جان ستانے سے اجتناب منجملہ سب سے ناقابلِ عمل مسئلوں کے ایک مسئلہ ہے جو الفاظ میں تو بہت پیارا ہے لیکن اُسپر عمل نہ ابتدائی زمانہ سے ہوا اور نہ ایسا ہونا ممکن ہے پھر ایسے محال فعل کی عملی صورت میں لانے کی کوشش سے سوائے وقت ضائع کرنے کے اور کچھ حاصل نہیں ہے۔

(محمد موسیٰ خاں)

از دتاولی ضلع علی گڈھ۔

# یونیورسٹیز بل کی چند تجاویز پر ایک نظر

*

گو لارڈ کرزن نے اپنے عہدِ حکومت میں رفاہِ عام کے سینکڑوں کام کیئے اور اپنا وقت اور اپنی توجہ پوری طرح پبلک کی خدمت اور رعایا کی بہبودی کے متعلق تجاویز سوچنے اور اُن پر حتی الوسع عمل کرنے پر لگائے رکھی۔ مگر ہندوستان کی تعلیم کی طرف متوجہ ہونا میرے خیال میں ان کے نہ صرف رعایا پرور بلکہ نہایت اعلےٰ درجے کے مدبّر ہونے پر دلالت کرتا ہے اور برسوں تک اُن کے نام کو ہندوستان میں زندہ رکھیگا۔

ریلوے کانفرنس کے قائم کرنے سے بیشک سفر میں ہمکو مزید سہولتیں ملیں۔ پولیس کمیشن

نے ہم کو ہمارے جان و مال کی مزید حفاظت کی اُمید دلائی۔ تجارت۔ صنعت و حرفت۔ زراعت اور کاروباری زندگی کے دیگر شعبوں میں ترقی کے وسائل بہم پہونچانے کی تدبیروں پر غور کیا گیا۔ لیکن اگر ہندوستان کے باشندوں کو ایک جسم تصور کر لیا جائے تو یہ تمام تجاویز اسی کی بہتری اور اسی کی زیب و زینت کے لئے تھیں۔ لارڈ کرزن کا مسئلۂ تعلیم کیطرف متوجہ ہونا گویا اسی جسم کی روح اور اسکی جان کی بہتری پر متوجہ ہونا تھا۔ اور اس لئے ہم اُن کی اُن تجاویز کو جو ہندوستانیوں کی تعلیم سے متعلق ہوں خاص طور پر اہمیت اور وقعت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ کیونکہ اسی مسئلہ پر ہماری آیندہ زندگی۔ ہماری ذلت۔ اور ہماری عزت۔ ہمارے آرام اور ہماری تکالیف۔ ہماری نعائم اور ہماری مصائب۔ الغرض ہماری قسمت کا دارومدار ہے ظاہر ہے کہ اگر یہ تجاویز مفید ہیں تو یہی ہماری قومی ترقی اور اگر مضر ہیں تو یہی ہمارے قومی تنزل کا باعث ہونگی۔ اسلئے اس مضمون کے شروع کرنے سے پہلے اگر میں خریداران ہنتھلی سے خاص طور پر توجہ اور غور کی درخواست کروں تو چنداں بیجا نہ ہوگا۔

مگر بدقسمتی سے پولٹیکل مسائل پر غور کرنے والی جماعت دو ایسے فرقوں میں منقسم ہے جو بالکل متضاد اور مخالف خیالات رکھتے ہیں۔ ایک گروہ گورنمنٹ کی ہر ایک تجویز کو نہایت شبہہ اور خدشہ کی نظروں سے دیکھتا ہے۔ اُن کے نزدیک گورنمنٹ کی پیش کردہ تجاویز خواہ وہ فی الحقیقت مفید ہوں یا مضر کسی ایسی پولٹیکل غایت پر مبنی ہوتی ہیں جنکا منشا ہندوستان و غریب و انگلستان کو امیر بنانیکا ہے۔ دوسرا گروہ گورنمنٹ کی تجاویز پر جائز یا ناجائز نکتہ چینی کی نگاہ اُٹھانا مذہب پالیٹکس میں بمنزلہ کفر سمجھتا ہے۔ اُن کے نزدیک گورنمنٹ کا کام حکومت کرنا اور رعایا کا محکوم اور ہر حالت میں مطیع رہنا ہی ہے۔ گورنمنٹ کچھ ہی فیصلہ کرے وہ اُس پر آمنّا و صدّقنا کے سوا دوسرا لفظ کہنا سیکھے ہی نہیں۔ یہ دونوں گروہ متعصب ہیں۔ وہ کسی تجویز پر نظرِ انصاف اور ایمانداری کے ساتھ غور نہیں کرتے۔ میری پالیسی ہمیشہ سے وُہی رہی ہے جو ایک باخبر اور تہذیب یافتہ رعایائے گورنمنٹ کی ہونی چاہیئے

تعلیم کے مسئلے کو میں تمام پولیٹیکل۔ سوشل اور ایک حد تک مذہبی مسئلوں کا جزو سمجھتا ہوں۔ اسلیئے میں اسکو ہرگز کوئی پولیٹیکل مسئلہ خیال نہیں کرتا۔ بلکہ میں اسکو اپنی بقا اور اپنی فنا کا مسئلہ سمجھتا ہوں یعنی مسئلۂ حیات۔

یونیورسٹیز بل پر بحث کرتے ہوئے فطرتاً شملے کی ایجوکیشنل کانفرنس در سنہ ۱۹۰۲ء کی یونیورسٹیز کمیشن کا خیال آتا ہے اور یہ گمان ہوتا ہے کہ سنہ ۱۹۰۴ء کا یونیورسٹیز بل اُس غور و پرداخت کا نتیجہ ہے جو کانفرنس اور کمیشن نے کی۔ شملے کی ایجوکیشنل کانفرنس کو ایک حد تک سرکاری یا گورنمنٹ کی کانفرنس کہا جا سکتا ہے کیونکہ اسمیں ایک بھی غیر سرکاری ممبر نہیں تھا۔ اور اسلیئے ہندوستان کی تعلیم پر جو کچھ بھی بحث کی گئی ہوگی وہ ایک حد تک یکطرفہ تھی۔ یہی وجہ تھی کہ عام طور پر کانفرنس کے انعقاد اور اُس کی کارروائی پر پبلک کو وثوق اور بھروسہ نہیں ہوا جو عموماً اس قسم کے معاملوں میں گورنمنٹ کے طرزِ عمل پر ہوا کرتا ہے۔ بنگالی اخبار اتنے لمبے چوڑے مضامین میں اور اُن کے مقرروں اور اسپیکروں نے طول طویل تقریروں میں گورنمنٹ کے اس طرزِ عمل پر اظہارِ ناراضگی کیا۔ اسکے بعد یونیورسٹی کمیشن کے تقرر کا اعلان ہوا۔ اوّل تو کمیشن کے ممبروں کی تعداد اور اُنکی ذاتیات پر ہی بہت کچھ ناپسندیدگی ظاہر کی گئی۔ مگر جب سنہ ۱۹۰۲ء کے اخیر میں اسکی رپورٹ شائع ہوئی تو دفعتاً ملک کے اس سرے سے اُس سرے تک مخالفت اور ناراضگی کا شور مچگیا۔ اور اگر کمیشن کی بعض مجوزہ اصلاحیں فی الحقیقت ضرر رساں نہ ہوتیں تو اس پرجوش اور قریب قریب بالاتفاق مخالفت سے یہی گماں ہوتا کہ ملک اس کمیشن کی مخالفت پر پہلے ہی سے تُلا ہوا بیٹھا تھا۔ الغرض کانفرنس اور کمیشن دونوں نے مایوس کیا اور ملک میں ایک معقول تعداد ایسے لوگوں کی پیدا کر دی جو تعلیم کے بارے میں لارڈ کرزن کی پالیسی کو خوف اور خدشہ سے دیکھنے لگے۔ اب یونیورسٹیوں اور تعلیم ہندوستان کی اصلاح پر لارڈ کرزن کی مستعدی کا تیسرا منظر یونیورسٹیز بل کی صورت میں ظاہر ہوا ہے۔ اور اگرچہ نہ کانفرنس اور نہ کمیشن کسی نے کوئی عملی کارروائی کرسکا

دعویٰ نہیں کیا بلکہ اُن کے قائم ہونیکا منشا محض موجودہ حالت کی تحقیق اور اُسکی کمزوریاں دریافت کرنا تھا۔ تاہم کانفرنس و کمیشن کو بوجہ تقدم موجودہ بل کا سبب قرار دیا گیا ہے اور یہ خیال کیا جاتا ہے کہ کانفرنس اور کمیشن نے جو کچھ تجویز کیا ہے اُسکو یہ بل پورا کریگا۔ ہمارے خیال میں اس سے بڑھ کر کوئی استدلالِ غیر منطقی نہیں ہوسکتا کہ محض تقدم کی وجہ سے ایک امر کو دوسرے کا سبب اصلی قرار دیدیا جاوے۔ کانفرنس اور کمیشن کا منشا جیسا کہ میں ابھی تحریر کرچکا ہوں مروجہ طرزِ تعلیم کی حالت کو دیکھنا تھا۔ کمیشن اگرچہ گورنمنٹ نے مقرر کی تھی مگر اسکو کوئی عملی یا اگزکٹو اختیارات نہیں دیے گئے تھے۔ انکا کام ہندوستان کی تعلیمی مشینری کو دیکھنا۔ اسکے کمزور مقامات کی دیکھ بھال کرنا۔ اور اسکے لئے مناسب اصلاحیں پیش کرنا تھا۔ ان اصلاحوں پر عمل کرانا گورنمنٹ کا کام تھا۔ یا یوں سمجھیے کہ تعلیم ہندوستان مثل ایک مریض کی ہے۔ کمیشن اور کانفرنس نے محض تشخیص کی اور نسخہ تجویز کیا۔ اب دوا کا بنیا مریض کا اور اُسکا پلانا اسکے سرپرست یا ولی کا کام ہے نہ کہ ڈاکٹر کا۔

اسلئے سب سے اول اس امر کا خیال رکھنا چاہیے کہ کانفرنس و کمیشن کی مجوزہ اصلاحیں ضرور نہیں ہے کہ اُن تغیرات اور تبدیلیوں کا باعث اور سبب قرار دیجائیں جو یونیورسٹیز بل میں پیش کیگئی ہیں۔ گورنمنٹ کا منشا طرزِ تعلیم کی اصلاح اور معیار تعلیم کا ارفع کرنا ہے۔ یونیورسٹیز بل اس اصلاح اور ارتفاع کا وسیلہ بنایا جاتا ہے۔ اسلئے ہمکو کانفرنس و کمیشن کی کارروائی سے کچھ غرض نہیں۔ ہم کو یہ دیکھنا ہے کہ آیا یہ بل درحقیقت اس غایت کو پورا کریگا جو گورنمنٹ اور ہماری دونوں کے مدِ نظر ہے۔ آیا اس سے تعلیم کا اصلی منشا پورا ہوگا اور ہم وہ نتائج حاصل کرسکینگے جو آجتک ہم باوجود اپنی متواتر کوششوں کے حاصل نہیں کرسکے۔

بل کا مقصد بقول اُسکے مجوز آنریبل مسٹر ریلے کے یہ ہے کہ "برٹش انڈیا کی یونیورسٹیوں کو مضبوط کرے۔ تاکہ آئندہ زمانے میں وہ اس قابل ہوجائیں کہ علم کی ترقی کی معاونت کریں اور نوعمروں کی نہایت اعلیٰ اغراض کو ترقی دیں، وہ نوعمر جو اُن کی نگہداشت میں اُن کے

سپرد کیے گئے ہیں"۔ بل کا مقصد جو آنریبل سٹر ریلے کے ان جملوں سے ظاہر ہوتا ہے فی الحقیقت قابل تعریف ہے اور میرے خیال میں کسی شخص کو جو تعلیمی معاملوں میں کچھ بھی دلچسپی رکھتا ہے اس سے اختلاف نہیں ہو سکتا کہ جہاں تک بل کے منشا اور غرض سے تعلق ہے یہ الفاظ ضرور اُمید دلانے والے ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ بل ترقی علم کی معاونت اور نوعمروں کی نہایت اعلیٰ اغراض کو ترقی دینے کا ذریعہ بتایا جاتا ہے کہاں تک اس منشا کو پورا کر سکتا ہے۔ اور یہ کہ اگر یہ بل پاس ہو گیا تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا واقعی ہماری یونیورسٹیاں مضبوط ہو جائیں گی۔

بل کی متفرق دفعات میں سب سے زیادہ اہم اور غور طلب وہ ہیں جن میں کالجوں کے یونیورسٹیوں کے ساتھ تعلق اور قطع تعلق کے شرائط بیان کیے گئے ہیں۔ مثلاً ایک کالج کے کسی یونیورسٹی کے ساتھ ملحق کیے جانے کے لیے اُسکا مندرجۂ ذیل سوالات کے جواب سے سنڈیکیٹ کو اطمینان دلانا ضروری ہوگا۔

(۱) کالج کے منتظمین کون لوگ ہیں۔

(۲) کالج کے سٹاف پر کون لوگ ہیں۔ آیا وہ اپنے فرائض منصبی کو کماحقہٗ ادا کر سکتے ہیں۔

(۳) ممبران سٹاف کو کیا تنخواہیں ملتی ہیں۔

(۴) کالج کی مالی حالت کیسی ہے۔ اور اسکے اخراجات کسطرح پورے ہوتے ہیں۔

(۵) کالج کے متعلق کوئی بورڈنگ ہوس یا ہاسٹل اس قسم کا ہے جس میں طلبا کالج کی بود و باش کا انتظام ہو۔

(۶) کالج کی عمارت کس قسم کی ہے۔ آیا وہ ایک تعلیمی درسگاہ کے شایاں ہے۔

(۷) طلبا کالج سے کیا فیس لیجاتی ہے۔

ان سب سوالوں سے اتنا پتہ تو ضرور چلتا ہے کہ گورنمنٹ کا منشا تعلیم کو محدود کرنیکا ہے گورنمنٹ نہیں چاہتی کہ تعلیم کو تجارت کے ساتھ مخلوط کر کے کسی مالی منفعت کی گنجایش رہنے دیجائے۔ بعض کالج ہندوستان میں ایسے بھی ہیں جو چند اشخاص کی منفردہ کوششوں سے

قائم ہوئے اور انھیں کے برتے پر چل رہے ہیں۔ اور جنکا منشا سوا اسکے اور کچھ نہیں کہ اچھے اور بڑے بڑے کالجوں کی اعلیٰ تعلیم کے مقابلے میں سستی اور امتحان پاس کرانیوالی تعلیم دیکر روپیہ کمایا جائے۔ جہاں تک ہم خیال کرتے ہیں کالجوں کے الحاق کے لئے اتنی شرائط کے وضع کرنے سے گورنمنٹ کا منشا اس قسم کی سستی اور بازاری یا تجارتی تعلیم کو بند کرنا ہے۔ ہمکو گورنمنٹ کی خواہش کے مستحسن اور اسکی نیک نیتی میں کوئی کلام نہیں۔ مگر ہم اتنا ضرور کہینگے کہ اس منشا کے پورے کرنے کیلئے گورنمنٹ اپنی حد سے ضرور تجاوز کر گئی ہے۔ ہمکو اس سے کچھ تعرض نہیں کہ سنڈیکیٹ کسی کالج کو حقِ الحاق عطا کرنے سے پہلے اسکی منتظم جماعت، اسکے اسٹاف کی قابلیت، ایک حد تک کالج کی مالی حالت وغیرہ وغیرہ امور کی نسبت اپنا اطمینان کرے۔ مگر ہم نہیں سمجھ سکتے کہ اسٹاف کی تنخواہ کو کسی کالج کی عمدگی یا ابتری سے کیا تعلق ہے۔ ہندوستان ایک غریب ملک ہی مگر اسی مغربی تعلیم کی بدولت حبُّ الوطنی کچھ نہ کچھ ضرور پائی جاتی ہے۔ بعض علم دوست اور وطن دوست محبِ قوم اب اسی قسم کے پیدا ہو چلے ہیں جو آزیری طور پر یا ایک خفیف سے معاوضہ پر اپنی زندگی اپنے قومی کالجوں کی خدمت میں صرف کرنے کے لئے طیار ہیں۔ اب اگر کوئی شخص فی الحقیقت قابل ہو۔ اور محض حبُّ الوطنی کے خیال سے کسی کالج میں نہایت قلیل معاوضہ پر کام کرنے کے لئے راضی ہو جائے، تو کیا سنڈیکیٹ اس کالج کو حقِ الحاق عطا نہ کریگی۔ اسلئے اسٹاف کی تنخواہ کے بارے میں جو شرط لگائی گئی ہے۔ ہم اسکی نہایت زور سے مخالفت کرتے ہیں۔

کالج کے متعلق بورڈنگ ہوس کی جو شرط ہے ہم ہندوستان کی موجودہ حالت کا خیال کرکے اسکو بھی نہ صرف غیر ضروری بلکہ نہایت مضر اور ضرر رسان خیال کرتے ہیں۔ بورڈنگ ہوس کا قائم کرنا اور اسکا چلانا کوئی آسان بات نہیں۔ نواب محسن الملک بہادر نے یونیورسٹی کمیشن کے روبرو شہادت دیتے وقت بورڈنگ ہوس کی مشکلات اور دقتوں کو نہایت عمدہ پیرایہ میں بیان کیا تھا۔ اسلئے میں اُن تمام وجوہ کو بتفصیل بیان کرنا مناسب خیال

نہیں کرتا۔ صرف اِتنا کہدینا کافی ہے کہ بورڈنگ ہوس کے قائم کرنے سے ذمّہ واریاں اسقدر بڑھ جاتی ہیں جو تعلیم کی ذمّہ داریوں سے کہیں زیادہ ہیں۔ کالج میں کسی لڑکے کو داخل کرنا ہمیں محض اُس کی عقلی تربیت کا ذمّہ دار بناتا ہے۔ مگر جب ہم اُسکے لئے ایک بورڈنگ ہوس قائم کرتے ہیں اور اسکو اس میں داخل کرتے ہیں تو اسکے معنی یہ ہیں کہ ہم پوری طرح اُس کی زندگی کے محافظ اور ٹرسٹی ہوگئے ہیں۔ ہم اسکی اخلاقی۔ دماغی جسمی۔ الغرض ہر ایک قسم کی تربیت اور نشو کے ذمّہ دار ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ یہ کام محض دماغی تربیت سے کہیں زیادہ مشکل اور پیچیدہ ہے۔ گورنمنٹ اگر کالجوں میں بورڈنگ ہوس قائم کرنے پر اصرار کیا تو سوائے اسکے اور کچھ نتیجہ نہ ہوگا کہ اسی قسم کے بورڈنگ ہوس قائم ہوجائینگے جیسے کہ آجکل درجۂ سوم کے بنگیائی کالج۔ نہ اُن میں کسی قسم کی تربیت کا انتظام ہوگا نہ کوئی نگرانی۔ بورڈنگ ہوس اچھے خاصے شیطان کے درسگاہ ہوجائینگے جہاں لڑکے پروفیسری کیا کرینگے۔

کالجوں کی عمارت کے متعلق کچھ کہنا ہم غیر ضروری سمجھتے ہیں۔ ہمکو تعجب صرف اس امر کا ہے کہ آنریبل مسٹر ریلیے نے کالج کی عمارت اور اُس کی ظاہری شان کا تو خیال کیا مگر کالج کے مقام و محل کی نسبت کوئی شرط نہیں لگائی گئی۔ کلکتہ اور ہندوستان کے بعض دیگر شہروں میں کچھ کالج شہر کے ایسے مقامات پر دیکھنے میں آتے ہیں جہاں ایک تعلیمی درسگاہ ہونے کا گمان بھی نہیں گذر سکتا۔ تاہم ہم کو اُمّید ہے کہ سنڈیکیٹ کالج کو فرمانِ الحاق نافذ کرنے سے پیشتر کالج کے مقام اور جگہ کا بھی خیال رکھا کریگی۔

فیس کا مسئلہ نہایت غور طلب ہے۔ بل میں فیسوں کے متعلق کوئی خاص ہدایت نہیں کیگئی اور خیال کیا جاتا ہے کہ یہ غالبًا اس مخالفت کا نتیجہ ہے جو عام طور پر پبلک نے ٹیوشن فیس کے متعلق یونیورسٹی کمیشن کی مجوزہ اصلاحوں سے کی تھی۔ بل میں کوئی دفعہ ایسی نہیں جس سے یہ خیال ہوسکے کہ گورنمنٹ کا منشا نرخ تعلیم کو بالا کرنے سے ہے تاہم یہ الفاظ کہ سنڈیکیٹ کو استفسار کے ایسے اختیارات حاصل ہونے چاہئیں جس سے وہ تعلیم کی قیمت گھٹ جانے اور اور کالجوں

کو نقصان پہونچانے کے معاملے خود طے کر سکے" ضرور کسی حد تک خوف دلانے والے ہیں۔
سنڈیکیٹ کے اکثر ممبر سرکاری اور کچھ گورنمنٹ اور ایڈڈ کالجوں کے اعلیٰ پروفیسر ہونگے۔
وہ کالج جو بڑے بڑے چندوں اور گورنمنٹ کی امداد سے قائم کیے جاتے ہیں انکو چنداں نقصان
نہ پہنچیگا۔ مگر سنڈیکیٹ کو ان اختیارات کے ملنے سے ہمارے خیال میں آیندہ چھوٹے چھوٹے قومی
درسگاہوں کا قائم ہونا قطعاً بند ہو جائیگا۔ اس قسم کے مدرسے یا کالج اکثر چندوں اور قوم کی
فیاضی کے بھروسے پر قائم ہوتے ہیں۔ شروع شروع میں انکا کوئی سرمایہ ہوتا ہے اور نہ وہ گروہ
طلبا میں سے کسیکو اپنی طرف متوجہ کر سکتے ہیں۔ جبتک کہ فیس نہایت قلیل نہ رکھی جائے۔ دُور
کیوں جائیے۔ اسلامیہ کالج لاہور کو دیکھیے۔ میں سوال کرتا ہوں کہ جس روز یہ کالج قائم ہوا تھا
انجمن حمایت اسلام لاہور کے پاس کیا سرمایہ تھا۔ فیس جو ایف۔ اے کے طلبا سے ابتک لیجاتی
ہے وہ گورنمنٹ کالج کی فیس کا صرف چوتھا حصہ ہے۔ کالج کے قائم ہونیکے وقت سے آجتک کالج
محض قوم کی فیاضی پر چل رہا ہے۔ اور باوجود اسکے آج نہ کوئی مسلمان اور نہ خود گورنمنٹ اسلامیہ
کالج لاہور کے فوائد سے انکار کر سکتی ہے۔ میں نہیں خیال کرتا کہ وہ سنڈیکیٹ جو اس بل کے
پاس ہونے کے بعد قائم ہوگی آیندہ کسی ایسے کالج کو حقوق الحاق عطا کریگی جو اسلامیہ کالج لاہور
کی ایسی حالتوں میں قائم ہوا ہو۔ پس فیس کے متعلق سنڈیکیٹ کو مختار کُل کرنا بھی میرے خیال
میں ہمیشہ مفید اور بے خطر ثابت نہ ہوگا۔ بہتر یہ ہے کہ ہندوستان کی حالت کا خیال کر کے فیس
کے معاملے کو بالکل علحدہ کر دیا جائے۔ بقول معزز ہمعصر آبزرور کے اگر کوئی کالج سنڈیکیٹ
کی تمام شرائط کو جو کالج کے سٹاف، اسکی مالی حالت، اسکے منتظم جماعت وغیرہ وغیرہ کے متعلق
ہوں۔ کما حقہٗ پورا کر دے۔ تو پھر میں نہیں خیال کر سکتا کہ سنڈیکیٹ کن مصلحتوں کی بنا پر اس
کالج کو ایک خاص ٹیوشن فیس مقرر کرنے پر مجبور کرنیکی مجاز ہو سکتی ہے۔ جو کچھ کہ یونیورسٹی بل کا منشا ہے
وہ امور متذکرۂ بالا میں آگیا۔ فیس کا مسئلہ کسی کالج کی عمدگی یا بہتری سے بالکل علحدہ ہے۔ اسلئے
ہم نہایت زور کے ساتھ یونیورسٹی بل کی اُس دفعہ کی مخالفت کرتے ہیں جو فیس کے مقرر کرنیکے

بارے میں سنڈیکیٹ کو اختیار دیتی ہے۔

بل کی دیگر دفعات جو قابلِ غور ہیں سینٹ اور سنڈیکیٹ کی ترکیب - ان کے طرزِ عمل اور ان کے اختیارات کی بابت ہیں - چونکہ یہ ایک حد تک ٹکنکل اور عوام کے لئے دلچسپی سے خالی ہیں اسلئے ہم اُن کے متعلق زیادہ تفصیل کے ساتھ بحث کرنا غیر ضروری خیال کرتے ہیں - البتہ دو ایک جزوی امور میں اپنی راے کے اظہار کو ضروری سمجھتے ہیں - اوّلاً سنڈیکیٹ کے ممبروں کی تعداد نہایت کم تجویز کیگئی ہے - بل کے مسودہ کے مطابق ہر ایک یونیورسٹی کی مجلس انتظامیہ سنڈیکیٹ ہوگی - ہر ایک امر کا فیصلہ سنڈیکیٹ کیا کریگی - ایسی حالت میں کسی طرح مناسب معلوم نہیں ہوتا کہ کل یونیورسٹی کا سیاہ و سفید صرف دس یا بارہ آدمیوں کے ہاتھ میں دیدیا جائے اور پھر بسا اوقات یونیورسٹی کے مختلف شعبوں کی پوری نگرانی اور ان میں عملی کارروائی کے لئے بہت سی سب کمیٹیوں کی ضرورت ہوگی - اسلئے گو ہم بھی سنڈیکیٹ کو دوسری سینٹ بنانے کے مخالف ہیں تاہم مجوزہ تعداد کو کافی خیال نہیں کرتے - دُوم سینٹ کے ممبروں کی میعاد ممبری جو پانچ برس تجویز کیگئی ہے یہ بھی نہ صرف غیر ضروری بلکہ ایک حد تک ضرر رساں ثابت ہوگی - مانا کہ پانچ برس کی قید سے بہت سے لوگوں کو اپنی قابلیت اور لیاقت کے اظہار کا موقعہ ملیگا تاہم یہ خیال رکھنا چاہئیے کہ یہ محدود میعاد بھی بعض حالتوں میں قابلیت اور لیاقت کے پُورے اظہار کی مانع ہوگی مزید براں اس سے فیلوشپ کے اعزاز میں بھی ضرور کمی ہوجائیگی - زیادہ مناسب یہ تھا کہ بجاے پانچ برس کی قید لگانے کے ممبروں پر سینٹ کے اکثر جلسوں میں شامل ہونا یا یونیورسٹی کی بہتری کے لئے کسی خاص عملی کام کا کرنا فرض کردیا جاتا - سوم ہمکو یہ دیکھکر نہایت افسوس ہوا کہ بمبئی - کلکتہ اور مدراس کے تعلیم یافتوں کو جو اختیار اپنے ریپریزنٹیٹو منتخب کرنیکا دیا گیا ہے اس سے الہ آباد اور پنجاب کی یونیورسٹیاں محروم کیگئی ہیں - ہماری تو یہ راے ہے کہ یونیورسٹی کے اصلی خیرخواہ اور سچے ایس اسکے تعلیم یافتہ ہی ہیں - اس لئے ہم چاہتے ہیں کہ سینٹ پر زیادہ تعداد یونیورسٹی کے گریجوئیٹس کی ہی ہونی چاہیئے - اوّل تو پرانی یونیورسٹیوں میں جو تعداد گریجوئیٹ ممبران سینٹ

کی مقرر کی گئی ہے، وہ ناکافی ہے اور اسپر بیچارے الہ آباد اور پنجاب کے تعلیم یافتوں کو اس سے بھی محروم کر دیا گیا۔ یہ عین ناانصافی اور بیجا طرفداری کی مثال ہے۔ اور ہم اُمید کرتے ہیں کہ حضور وسیرائے اور ممبران کونسل بل کے اس نقص کو ضرور رفع کر دینگے۔

اب اخیر میں ہم بل پر بحیثیت مجموعی ایک نظر ڈالنا چاہتے ہیں۔ اور اسپر اپنے مضمون کو ختم کر دینگے۔

۱ — بل کی مختلف دفعات کو بغور دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ گورنمنٹ کا منشا تعلیم کو اپنی نگرانی اور براہِ راست اپنے ماتحت رکھنے کا ہے۔ سنڈیکیٹ کے ممبروں کی تعداد۔ اسمیں اکس آفیشیو (سرکاری)، اور نامزدہ گورنمنٹ کے ممبروں کی کثرت۔ سنڈیکیٹ کے اختیارات کی وسعت اور سینیٹ کے اختیارات میں کمی۔ الغرض یہ تمام باتیں ظاہر کرتی ہیں کہ تعلیم کے ڈیپارٹمنٹ کو بھی مثل دیگر اُمور رفاہ عام کے گورنمنٹ اپنے حیطۂ تصرف میں لانا چاہتی ہے۔ بظاہر اس طرز عمل کے مفید اور مستحسن ثابت ہونے میں ہمکو کوئی شبہہ نہیں مگر ہمکو اس میں ضرور شبہہ ہے کہ پبلک اسپر اپنا وثوق اور اطمینان ظاہر کریگی۔

۲ — گو یونیورسٹی کمیشن کی رپورٹ میں قومی یونیورسٹیوں کے خیال کو پسند نہیں کیا گیا تھا۔ یونیورسٹی بل اس مسئلہ پر بالکل خاموش ہے اسلئے مناسب یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس مسئلہ پر ہم بھی سکوت اختیار کریں۔

۳ — گو یہ کہا جائیگا کہ ہم اس شخص سے زیادہ عقل نہیں رکھتے جسنے تمام رات یوسف اور زلیخا کا قصہ سنا اور صبح کو یہ سوال کیا کہ یوسف مرد تھی یا عورت تھا، تاہم اس بل کو پڑھنے کے بعد ہم یہ سوال کئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ آخر وہ مقصد جسپر اس بل کو اُٹھایا گیا ہے کسطرح پورا ہوگا۔ انگریزی میں ایک مثل ہے کہ تم گھوڑے کو چشمہ تک لیجا سکتے ہو مگر تم اس بات کے ذمہ دار نہیں ہو سکتے کہ وہ پانی ضرور پیئے۔ ہم پوچھتے ہیں کہ سب کچھ تو ہوا۔ کالجوں کو چینٹ قیود سے جکڑ دیا۔ سینیٹ کی اصلاح کر دی۔ سنڈیکیٹ کو محدود کر دیا۔ مگر اس ترقی علم کی

مُعاونت کا کیا اہتمام کیا گیا جو بل کا مقصد بیان کیا گیا تھا - ہندوستان میں اشاعتِ علم کے لیے کیا سہولتیں دی گئیں - تحقیقِ علم - غور و پرداخت - اور وہ چیز جسکو انگریزی میں ریسرچ کہا جاتا ہے - اسکے لیے کیا انتظام کیا گیا ہے - طلبا کو حصولِ تعلیم اور منتہیوں کو تحقیق کے لیے کیا اُمیدیں دلائی گئی ہیں - تعلیم یافتوں کی کسطرح حوصلہ افزائی کیجائیگی - کیا اس بل کے پاس ہونے اور اُسپر عملدرامد ہوجانے سے ہمارے آیندہ تعلیم یافتہ زیادہ لائق اور زیادہ خوش قسمت ہوجائینگے ہم بل کو مُفید تسلیم کرلیتے ہیں - مگر آنریبل ممبر یہ بتائیں کہ وہ جو اسکو "معیار تعلیم کے ارتفاع" اور "نوعمروں کی اعلیٰ اغراض کا ترقی دینے والا" بتاتے ہیں وہ کسطرح ہوگا - ہم تعلیم یافتوں کی بدقسمت جماعت اسی کی خواہشمند ہے - اگر اس بل نے واقعی ہماری اغراض کو ترقی دی - اور ہماری آیندہ نسلوں کو زیادہ خوش قسمت بنا دیا تو ہم سمجھینگے کہ واقعی بل ہمارے لیے نعمت اور لارڈ کرزن اور آنریبل ممبر دونوں ہمارے محسن - اور ع - گر یہ نہیں تو بابا یہ سب کہانیاں ہیں -

## نالۂ یتیم

(لبرل)

کل شام کو ایک غریب لڑکا
روتا ہوا راستے میں دیکھا

پاس اُسکے گیا کہا یہ اُس سے
کیوں خیر ہے کسلیئے ہے روتا

بسکی بھی بندھی اگرچہ لیکن
رُک رُک کے یہ بھولا بھالا بولا

ہمجولیوں میں تھا کھیلتا میں
ناحق مجھے ایک نے ہے مارا

فریاد کروں میں کس سے جاکر
دُکھڑا جو کوئی بھی ماں سے رویا

کہتی ہے فلک کو آہ بھر کر
کہتی ہے کدھر ہے مرنے والا

آتا یہ نہیں سمجھ میں میری
کہتا ہوں بتا کہاں ہے بابا

میں جاکے ابھی گلے لپٹ کر
روکر یہ کہونگا حال سارا

یہ سُنکے مری بلائیں لیکر
کہتی ہے کہ ہاں نہ اتنا گھبرا

گھر پر وہ حکیم کے گئے تھے
کہتی ہے یہی وہ روز لیکن
میں رو ٹھتا تھا کبھی مگر اب
معصوم کی دلخراش باتیں
یاد آ گیا وہ یتیم مجھکو
گدڑی میں چھپا ہوا تھا یہ لعل
پایا اُسے میر نے جو بیکس
سودا لگے گود یوں کھلانے
دلی میں ملے گلے کے تعویذ
تھی شامِ اودھ بہت ہی دلکش
وہ دہلی و لکھنؤ کا دربار
اس دُرِ یتیم کو بصد شوق
"اَلنَّاسُ عَلیٰ" یہ مثل ہے مشہور
محفل نہ تھی ایسی کوئی جس میں
گذری اسیطرح خوب کچھ روز
گُل ہو گئے سب چراغِ دہلی
باقی نہ رہا ظفر نہ اختر
یہ سچ ہے کہ ہینے اُن سی بہتر
وہ ورد کہاں سے ہوگا لیکن
آتش ترے آبدار مضمون
مومن ترا دلفریب انداز

اب آدھی ہی دُور ہو نگے بیٹا
بابا نہیں آتے ہیں کروں کیا
خود رُوٹھ گئے ہیں مجھسے بابا
سُنتے ہی کلیجہ مُنہ کو آیا
ہے جسکا وطن دکن میں سوتا
تھی ریختہ بادۂ مُصفا
کس پیار سے لاکے گھر میں پالا
ہر سمت ہوا اسیکا چرچا
باندھا گیا لکھنؤ میں چلا
چمکا وہیں جاکے یہ ستارا
جو ساغرِ دورِ آخری تھا
دُرجِ شرفِ سخن میں رکھا
چھوٹے سے بڑا ہر اک تھا شیدا
ہوتا نہ ہو ذکرِ خیر اس کا
پھر رنگِ زمانہ آہ بدلا
ماتم ہوا لکھنؤ میں برپا
جاتا رہا تھا جو اک سہارا
اک قوم کو حکمراں سے پایا
جسکا نہیں ذوق ہم کو بھولا
غالب وہ ترا بلند پایا
انشا ترا بانکپن نرالا

شستہ وہ ترا کلام ناسخ — پُر درد بیاں انیس تیرا
سب خواب وخیال ہوگئے آہ — تھا ان میں نہ جیسے کوئی پیدا
ای میرے یتیم پیاری اُردو — از بہرِ خدا نہ اتنا گھبرا
گو اُٹھ گئے سب بزرگ تیرے — یاد اُن کی ہے پر دلوں میں تازہ
خوشبو بھی کہیں چلی ہے جاتی — پھولوں کا عرق کھینچے تو غم کیا
اُڑ جائے جو بھاپ بنکے پانی — کیا فکر وہ ابر ہو کے گھر آیا
ہاں ای گلِ باغِ خوشنوائی — خوشبو سے ہو باغِ ہند مہکا
تسخیر سے اُسکو رام کرلے — ہے غول جو دیوناگری کا
کیوں اُسکا لگا ہے دانت تجھپر — حیرت ہے کہ کیوں ہر اک سے بگڑا
بھاشا نے دیا ہے شیر تجھکو — اس ہند میں جب جنم لیا تھا
زنار نہیں ہے اور نہ چوٹی — کیا اتنی سی بات پر ہے جھگڑا
ہاں شیر وشکر کیطرح گھل مل — چسکا ترا ہند کو پڑیگا
دلکش ہوں بہت ترے مضامیں — شیریں ہو بہت کلام تیرا
پاکیزہ ہوں سب ترے خیالات — اور طرزِ ادا ہو صاف ستھرا
گہنا وُہی جو کہ دل سے نکلے — اور دل میں بھرا ہو جوش سچا
اوصاف یہ وہ ہیں جنکے باعث — ڈنکا ترا ہند میں بجیگا
بس بس یہ دعا کر اب خدا سے — ہوں قوم میں فخرِ قوم پیدا
ہو جنکا کلام گنجِ حکمت — جو شعر ہو صدق میں ہو ڈوبا

نواب امیر دیکھئے داغ
حالی رہیں دیر تک خدایا

نواب علی نیوتنوی - از بڑودہ کالج

| | | | | | |
|---|---|---|---|---|---|
| | | College, Lashkur .. | 25 | 0 | 0 |
| Dec. | 18th. | Md. Shibli, Jonesganj ... | 5 | 0 | 0 |
| " | " | Md. Excise Darogha, Umballa city ... | 4 | 0 | 0 |
| " | " | Asaf Husain, Bahsar, Meerut District .. ... | 4 | 0 | 0 |
| " | " | Ali Muhammad, Forest Department, Chaunha Division ... | 4 | 0 | 0 |
| " | 19th. | Mirza Md. Jafir, Zurkhana | 1 | 0 | 0 |
| " | " | Misle-uddin, Magistrate, P. O., Basai . | 8 | 0 | 0 |
| " | " | M. Abdul Karim, B. A., Inspector of Schools, Chittong .. | 10 | 0 | 0 |
| " | " | Syed Nazrul Bakir, Mianshah. . | 27 | 0 | 0 |
| " | " | Habib Ahmed, P. W. O., Saugor, | 8 | 10 | 0 |
| " | " | S. Muhammad Abid, Pleader, Rai Bareilly | 24 | 11 | 0 |
| " | " | Shaukat Ali, Esq., Asst. Opium Agent, Etawah ... | 16 | 0 | 0 |
| | | Total .. | 1,920 | 5 | 0 |
| | | GRAND TOTAL | 18,121 | 3 | 0 |

| | | | Rs | A. | P. |
|---|---|---|---|---|---|
| Dec. | 14th. | Md. Mir Habeeb ullah, Amratsar | 5 | 0 | 0 |
| " | " | Mrs. Musaffi Khan, Kalala . | 9 | 0 | 0 |
| " | 15th. | Md. Nisar ullah, Badaun . | 5 | 0 | 0 |
| " | " | S Fakrul Hasan .. ... | 4 | 0 | 0 |
| " | " | Md. Hasan Zamabi, Jamalpur | 25 | 0 | 0 |
| " | 16th. | Md. Azim, Pleader, Judges Court Ghazipur . | 18 | 0 | 0 |
| " | " | Karam Elahi Sufi, Teacher, Gujrat | 5 | 0 | 0 |
| " | " | Syed Akbar Husain, Gorakhpur. | 8 | 0 | 0 |
| " | " | S Muhammad Musa Kazim, Jaunpur . | 3 | 0 | 0 |
| " | " | Azim-uddin Ahmed, Etawah | 12 | 0 | 0 |
| " | " | Jata-ullah Khan, Lalpur Punjab, | 19 | 0 | 0 |
| " | " | Rukan-uddin, Clerk, Umballa . | 25 | 0 | 0 |
| " | " | Mir Nazir Hyder, Ufzal Gunj . | 25 | 0 | 0 |
| " | " | Md. Sajjad Husain, Pleader, Moradabad . .. | 25 | 0 | 0 |
| | | Total . | 1,423 | 1 | 0 |
| | | GRAND TOTAL | 17,844 | 4 | 0 |
| Dec | 17th. | Muhammad Saifuzzaman Khan, Vakil Darbhangar Estate ... | 5 | 0 | 0 |
| " | " | Mrs. Asgar Hosain Katra Meer Faiz Lucknow .. ... | 7 | 0 | 0 |
| " | " | Saidar Hosain Pensioner Amin Jaunpur City .. . | 16 | 0 | 0 |
| " | " | Syed Saghir Hosain, Lal Bagh, No. 5, Lucknow .. | 10 | 0 | 0 |
| " | " | Md. Azim-ulla Khan, Saugor City | 10 | 0 | 0 |
| " | " | Nazir Ahmad Manhna, Allahabad city .. . .. | 10 | 0 | 0 |
| " | " | Munsif Asat Zaman, Purani Munsifi, Pilibhit ... | 100 | 0 | 0 |
| Dec. | 18th. | Khalifa Syed Muhammad Salim. | 135 | 0 | 0 |
| " | " | M. D. Siddiq, Matihari Railway Station .. ... | 2 | 0 | 0 |
| " | " | Kutbul Main, Kanongo, Gaya .. | 5 | 0 | 0 |
| " | " | M. Md. Naim, Pleader, Azamgarh .. | 10 | 0 | 0 |
| " | " | Md. Rafi-ullah, Pleader, Gazipur, | 25 | 0 | 0 |
| " | " | Md. Alaul Hasan, Deputy Collector, Katra, Allahabad ... | 25 | 0 | 0 |
| " | " | Aziz-uddin, B A. Class, Vety. | | | |

| | | | | | |
|---|---|---|---|---|---|
| Dec. | 10th. | Dr. M. Nazir Ahmud, Delhi | 100 | 0 | 0 |
| " | " | S. M. Atiq, Shadiabad | 4 | 0 | 0 |
| " | " | H. K. Jaffery, Agra | 20 | 0 | 0 |
| " | " | Md. Husain, Munsif, Etawah | 15 | 0 | 0 |
| " | " | S. Md. Mustun, Saristadar, Nizamiah Dig | 5 | 0 | 0 |
| " | " | Md. Jaleel-ur-Rahman' Bijnore, | 10 | 0 | 0 |
| " | " | Wallee Muhammad Hanffy, Bangalore | 10 | 0 | 0 |
| " | 11th. | Md. Mustafa Ali, Sadar Kanungo Karpal | 25 | 0 | 0 |
| " | " | S. Md. Ibn Ibrahim, Professor, Agra College | 5 | 0 | 0 |
| " | " | Md. Ussaf, Camp Clerk to Excise Commissariat, Lahore | 12 | 0 | 0 |
| " | " | Hajee Muhammad, Post Master, Jagadhre | 18 | 0 | 0 |
| " | 12th. | Ali Akbar, Sub Post Master, Mustung | 9 | 14 | 0 |
| " | " | Nazir Yar Khan, Lucknow | 5 | 0 | 0 |
| " | " | Syed Tufail Ahmud, Fatehpur | 15 | 0 | 0 |
| " | " | Md. Shams-ud-din, Naib Tahsildar | 5 | 0 | 0 |
| " | 14th. | M. A. Hamid, Inspector of Salt, | 10 | 0 | 0 |
| " | " | Md. Arfaz Husain, Assistant Magistrate, G. P. | 4 | 0 | 0 |
| " | " | Jan Muhammad, J. J., Dkhan | 5 | 0 | 0 |
| " | " | Md. Nawal Khan, Clerk, Punjab Battary | 1 | 0 | 0 |
| " | " | Zaya Muhammad, Badaun | 11 | 0 | 0 |
| " | " | S. Abdul Gani, Tahsildar, Sambalpur | 25 | 0 | 0 |
| " | " | Mrs. M. H. Bilgrami, Sikundrabad | 25 | 0 | 0 |
| " | " | Ali Muhammad, Clerk, Forest Department | 2 | 0 | 0 |
| " | " | Ameer-uddin, Lucknow | 9 | 0 | 0 |
| " | " | M. Azam Shah, Chitli Kabar, Delhi | 25 | 0 | 0 |
| " | " | R. B. Muhammad Barkat Ali Khan, Lahore | 49 | 0 | 0 |
| " | " | S. Ahmed, Girdawar | 20 | 0 | 0 |
| " | " | Hiba Ahmed, Bahadur Gunj | 13 | 0 | 0 |
| " | " | Abdul Latif Khan, Tahsildar Nawal Gunj | 10 | 0 | 0 |
| " | " | Ali Muhammad, Forest Dept. | 2 | 0 | 0 |
| " | " | Jamal Ahmed, Hydrabad Decan, | 12 | 0 | 0 |

| | | | | | |
|---|---|---|---|---|---|
| Nov. | 5th | M. Nisar Ahmud, Vakil, Patiala State .. ... | 25 | 0 | 0 |
| " | " | Ghulam-ul-Hasain, of Panipat .. | 25 | 0 | 0 |
| " | " | Md Ala-ul-Hasan, Deputy Collector, Allahabad . ... | 25 | 0 | 0 |
| " | " | Malik Muhammad Khan, Rais Karnal .. ... | 25 | 0 | 0 |
| " | " | Md Faiz-ud-din, Vakil, Bijnore, | 20 | 0 | 0 |
| " | 7th. | Mazharul Huq, Excise Inspector, Agra . ... | 6 | 0 | 0 |
| " | " | Nazir Ahmud, Kazipura, Benares, | 10 | 0 | 0 |
| " | " | S Atta-ullah, Pleader, Gujrat Punjab ... | 25 | 0 | 0 |
| " | " | Sajjad Nabi, Kanungo, Shahpur, | 25 | 0 | 0 |
| " | " | Kazi Muhammad Abdul Aziz, Sultanpur | 2 | 0 | 0 |
| " | " | Syed Wajid Ali, Pleader, Rai Bareilly . | 3 | 15 | 0 |
| " | " | Nisar Fatima, Daughter of H Md. Akbar Meerut | 24 | 12 | 0 |
| " | " | Ahmud-ud-din, Darogha, Hissar, | 10 | 0 | 0 |
| " | " | Mrs. Mustaq Husain, Badaun .. | 19 | 0 | 0 |
| " | " | Syed Misbah-ul-Osman, Tahsildar, Pach Marhi . | 25 | 0 | 0 |
| " | " | Md Falih-ud-din, Sadar Munsarim, Bhopal .. .. | 25 | 0 | 0 |
| " | " | Elahi Bux Khan, Jagirdar, Saharanpur .. ... | 25 | 0 | 0 |
| " | 8th. | Abdul Ghafur, Pleader, Zamania Ghazipur .. .. | 9 | 14 | 0 |
| " | " | S. Mustaq Husain, Assitant Secratary, Badaun ... ... | 9 | 0 | 0 |
| " | " | Syed Omrao Ali, Jaora . | 24 | 12 | 0 |
| " | " | Syed Intizar Ali Abbasi, Khairapur .. . | 20 | 0 | 0 |
| " | " | Md. Azim, Barrister-at-Law . | 5 | 0 | 0 |
| " | " | S. Haider Karer Jafri, Agra ... | 22 | 0 | 0 |
| " | 9th. | Wife of S Ahmud Husain, Dehra Dun . . | 25 | 0 | 0 |
| " | " | Ali Husain, Secretary Islamia School, Bahraich .. . | 9 | 0 | 0 |
| Dec. | 9th. | S. Baqar Husain, Sahib ... | 2 | 0 | 0 |
| " | " | Rahmat Ali, Hospital Assistant, Ludhiana . .. | 24 | 12 | 0 |
| " | " | S. Altaf Husain, Amin, Jalalabad, | 8 | 0 | 0 |
| " | " | Ali Muhammad, Sub-Engineer, Gurdaspur ... ... | 2 | 0 | 0 |

Others speakers were:- Tafaldar Husain, Zahur Ahmad, Muhammad Mahmud. Result : for the motion 17 ; 07 against.

Nov. 2nd. "Eloquence is the art of deception."
Proposer, Muhammad Hamid. Opposer, Ghulam Hosain.
Other speakers :—Saghir Ali, Ghulam Rasool, Abdul Ghani. The proposition was carried by a large majority.

Nov. 7th. "The education of Indian women ought to be æsthetical rather than liberal."
Proposer, Tafaldar Husain. Opposer Muhammad Hamid.
Other speakers:—Baquar Husain, Mr. Gardner-Brown, Muhammad Husain. Motion lost by 10 votes.

---

## The One Rupee Fund.

| | | | Rs. | A. | P. |
|---|---|---|---|---|---|
| Acknowledged in November 23rd | | .. | 16,200 | 14 | 0 |
| Nov. | 26th | A. J. B. c/o Muhammad Husain Munsif, Etawah ... | 10 | 0 | 0 |
| " | 27th. | Nabi Bux, Clerk, Revenue Commissioner's Office, Quetta .. | 25 | 0 | 0 |
| " | " | Md. Husain, Deputy Magistrate, Meerut ... .. | 25 | 0 | 0 |
| " | " | S. M. H. Rizvi, 2nd Magistrate, Jhalrapatan .. | 51 | 0 | 0 |
| " | " | Miss Nasir-uddin Hyder, Kachhi Gudda Ufzalganj .. . | 22 | 15 | 0 |
| " | " | Amir Beg, Police Inspector .. | 11 | 13 | 0 |
| " | 28th. | Miss Nasir-uddin Hyder, Kachhi Gudda .. ... | 24 | 13 | 0 |
| " | 30th. | Mir Gulam Shabbir, Sub-Divisional Office, Aligarh .. | 20 | 0 | 0 |
| " | " | Tassadduq Ali Beg, Hasanpur, Muradabad ... ... | 25 | 0 | 0 |
| " | " | Hafiz Kutub-uddin, Chauk, Lucknow ... . | 5 | 0 | 0 |
| Dec. | 4th. | Md. Ismail, Sehara, District, Bijnore ... ... | 10 | 0 | 0 |
| " | " | Md. Alif Din, Pleader, Rawal Pindi ... .. | 18 | 0 | 0 |
| " | 5th. | Niaz Ahmud Sahib, Allahabad ... | 10 | 0 | 0 |
| " | " | Md. Khan, Sub Post Master, Lucknow ... ... | 13 | 10 | 0 |

so. Not infrequently members of the English Staff take part in their debates. Nawab Mohsin-ul-Mulk Bahadur is ready to encourage every good speaker The students of the College take pride in honoring him who gives them the pleasure of listening to an unpretentious and sensible speech. But it appears that the members have scarcely turned to account these advantages. If our self-sufficiency does not stand in our way we may take note of the progress the Bengalees have made in this art Some share of the blame for neglecting to improve speaking, should naturally fall on our students' shoulders But I cannot fail to mention another important reason which has contributed to this result Every institution of the College offers prizes to those who achieve success in furthering its objects. But the Union did not reward its speakers in a way which could awaken a sense of emulation in them. A prize is awarded every year to one of our best speakers but it goes without saying that one prize is too little for an important institution like the Union. It is therefore, very gratifying to learn that the members have founded another speaking prize in honour of Mr Tipping. The other prize known as the Cox Speaking Prize has been made subject to the condition that in awarding the prize special regard will be had that the recipient of the honour must have taken part in a fair number of the debates held in the year for which the prize is to be awarded We heartily welcome both the measure and trust they will produce a keen competition

After a well earned enjoyment of more than three month's rest the House met on the 24th of October. The meeting was by no means an ordinary one as it was the visit of Mr. Muhammad Nasir, B.A., B.L., of Lucknow and Mr Imtiaz Ali of Fyzabad which had brought us together. Before the distinguished visitors arrived, a vote of condolence was passed on the death of the late Moulvi Bahadur Ali, B. A., LL. B., conveying the sympathy of the house to the bereaved family Many articles have appeared in the Press eulogising the work of Moulvi Bahadur Ali, but I do not know if any thing like the passage given below has been written—contributed to an Urdu Paper. It runs as follows :—

"Moulvi Bahadur Ali did not belong to that School of thought which holds that the observance of the Eastern forms of Islam can be substituted by work done for the improvement of the material condition of its votaries"

The following is a list of debates ;—

Oct. 24th "The Muslims of India are past all cure." Proposer, Ghulam Hosain. Opposer, Muhammad Hamid.

dant means, become a practical farmer? There is the Cawnpore Agricultural School, there are model farms like the Aligarh Dairy Farm. There are right and wrong ways of draining land and manuring it There are certain crops suited to certain types of soil. The cultivator goes on in the old way, heedless of change or improvement, and whose duty is it to lead him forward? There *must* be *room* for improvement of agricultural methods Why should not our young zemindar make it his life's study? It is a wide field of labour; for besides the land, there is the breed of cattle to improve, and the sheep, not to mention the care of the village homes which should be the master's chief concern.

So with the other two arts, Weaving and Building, the upper classes must learn to encourage them and respect them and the best means of doing so is by engaging in them. How little do people care for the beautiful Indian carpets and the art of making them It is sad, as Lord Curzon said the other day, to notice that buyers prefer the flaring products of Brussels to the tasteful designs of Agra looms.

However, to conclude, I would say in the matter of the choice of a profession, try to see how the times are shaping, do not fear to strike out on a new path and above all impress on your sons that remedy which Carlyle, the much-quoted, the beloved of B. A.'s advocated for all evils both in men and states: "Work, work—more work!"

J R GORNAH.

---

## Union Notes.

( *From a Correspondent.* )

That most of the members are not making strides in the art of speaking can hardly be disputed. The 20th century has dawned upon us we see that in civilised countries there is activity and improvement in every walk of life Surely it does not befit us to remain contented with the standard of speaking reached nearly half a decade ago. The past history of the Union has been a record of progress. There is nothing which has not undergone a wholesome change. But there has been no appreciable improvement in speaking. The subject has from time to time attracted the attention of not a few of our capable men and they have striven to cultivate the taste of the house for good and sensible speech-making The improvement has, however, never been followed up. The Union people are so circumstanced that they can improve in speaking to a very great extent if they have the will to do

Education is to equip him for life by teaching him to be (1) happy in himself (2) a good citizen (3) an honest and useful producer. Money-making must not be his object; for in the highest type of work there is an element of unselfishness; and let it be remembered that, so far in the world's course, the work that has been done best has been paid worst. There must be a high aim and a joy in capable achieving, and no craving for quick results; and there must be the pride and dignity of labour.

Fortunately for us, all honest work is now-a-days accepted as good and fitting, and in this respect we are wiser than our fathers were; have we not in England an earl who is a coal-merchant, a countess who serves in her own milliner's shop, and a lord who sells milk and butter? and what is more, is not each of these efficient and successful? Seventy years ago this would have been impossible There was no calling for the Englishman of the upper classes, except the commissioned ranks of the Army or Navy, the Church, and perhaps the Bar. To such a degree had we forgotten the grand tradition of the Teutonic races that a man is far from being dishonoured when he plies a hand-trade. We are remembering now, and so are the Germans; and has not their Emperor, an expert in many directions himself, made each of his sons learn a trade?

Well, in these advancing days, India cannot too much advance along the new lines of science and commerce. No country can afford to stand still, and if we look along the line of future development we must see that besides a supply of Government servants and lawyers, India will require Engineers, Electricians, Chemists, Manufacturers and Physicians. Will the supply be forthcoming? Do the students who have the opportunity of going to learn in Europe turn their attention to the real demands of the future? Why do they trouble to go to England to read for an ordinary degree or to get called to the Bar? Are there no schools of Electric Engineering, or of Mines? Are there no new sciences, no new methods to be brought by your sons across the Indian Ocean?

And for the old arts, the oldest that the world contains and the noblest, what are we doing to quicken them? I mean Agriculture, Weaving and Building. They *must* endure; men must be fed, and clothed and housed; and the wish to improve the means of accomplishing these ends must come from the people themselves. A higher standard will be reached when the people require that standard, for their own comfort and happiness sake and not for the gain of money. For instance, why should not a young zemindar, of indepen-

clean water is thrown about carelessly when it soaks into the ground before our eyes and disappears from view, we are satisfied that it has been well disposed of; but we forget that when it soaks into the soil it either sinks deeper and ultimately reaches our high level well, thus polluting the water, or if it lie on clay, then it remains there and the soil around any house standing on this clay ultimately becomes saturated, like a sponge, with sewage and gives out unwholesome gases, as we have said above.

(d) PROPER MEANS FOR THE DISPOSAL OF EXERETARY AND REFUSE MATTERS. There are very few matters which affect the health so much and about which our countrymen are more careless than this question. It appears still to be the rule to put closets in any corner more or less out of the way without due precaution being taken to ensure their cleanliness, drainage and ventilation. Servants are proverbially neglectful as to the cleanliness of these places, and, the closets are usually in a chronic state of stuffiness, gloom and filth. All sorts of debris and refuse, solid and fluid, thrown in the proximity makes the place still more offensive.

Carelessness in the *slop water* is another matter which requires consideration. The nuisance liable to occur from this source stands second only in offensiveness to that arising from improperly constructed and ill-kept privies. We have already shown how it is liable to affect our health most seriously.

The day's *dust* is put aside in the house to be carried away by the sweeper. Dustmen collecting the dust through streets and in the houses scatter a vast amount of refuse which materially pollutes the atmosphere.

SAHABZADA S. KHAN. M.B. C.H.B.

---

## Letters to Parents No. VIII.

DEAR NAWAB SAHIB,

The subject of this, my last letter, is to be the choice of a profession or as I would prefer to call it, the choice of work. For in the word profession there always seems to me to be a lurking idea of more show than merit, high dignity and high pay perhaps, but a certain pretence and unsoundness; while there is no mistaking the honest simplicity and stern manliness of the English word work.

Every man is put into the world to work: there is no need to argue about that.

other as in the diagram. Bore a hole of about ½ inch diameter in the bottom of A. B. and C. and close these holes loosely with washed flannel. Now put into a about 7 or 8 inches of fine charcoal (preferably animal charcoal), into B about 6 inches of white sand and into C. about 6 inches of gravel, and the filter is complete Cover the mouths with gauze ; now fill A with water, this will gradually sink through the charcoal and will drip into B and from there into C and lastly into D which is the receiver of the filtered water. This filter will require to be cleaned every now and again. The charcoal is cleaned by heating it in a shovel over a fire, whereas sand and gravel are washed in water.

A. Charcoal.

B. Sand.

C. Gravel

D. Filtered water.

(c) SUITABLE LOCALITY FOR BUILDING OF HOUSES.

*SOIL.* Is both an air carrier and a water carrier, and it contains a great variety of inorganic and organic matter. When organic matter oxidises, *carbonic acid gas* is given off and this gas is found in all porous soils. Other poisonous gases may also be found in the soil depending upon circumstances and surroundings. Our houses act as suckers to the ground on which they are built, specially at night, for at night, the external temperature falls, the air of the rooms being warm rushes out and its place is taken by the warmer air which is sucked up from the earth In this way any gas such as carbonic acid gas or marsh gas may be drawn up from the soil below our habitation, and replace the pure air. Foul air from cesspools has been sucked up from great distances. This is shown by the sudden appearance of cholera or typhoid at a place where its occurence can be accounted for in no other way.

We have already seen that water is found everywhere underground. At some places it is found not far from the surface, at others at great depths. The greater the depth at which water is found, the more healthy is the site for building purposes. Clay soil forms an impermeable stratum, for water lies over it not far from the surface, and rising up through the porous soil renders the surface moist and wet. Houses built on clay, therefore, without suitable precautions being taken, are invariably damp and unhealthy.

*Imperfect drainage* is another source of foul soil. Great carelessness is shown in our country about this matter. Un-

as in burial grounds, or where there are salt mines. Salts may also be found in water which is used in certain trade processes, this water ultimately reaching the rivers and polluting them.

(c) *Suspended matters.* 1st. *In-organic matter* particles which are incapable of being dissolved by water remain suspended in it especially when it is in motion. Any foreign body can thus be suspended.

2nd. *Organic matter.* This is of two kinds, *vegetable* and *animal.* The former may be acquired from peaty soil or dried leaves falling into water.

*Animal matter.* Dead animal matter may be found if water comes through regions where such matter is abundant, e.g. grave yards, dung and manure heaps, &c.

A great many varieties of small living animals are found in water when viewed under a microscope. Besides these microbes are also found which are obtained either from the atmosphere or from specific pollutions of rivers flowing into towns.

(d) Gases. A great many gases are soluble in water and these may be carried long distances and then produce harmful effects.

The Hygienic side of this question is the *proper control of the water supply* of a community. We now see how important it is that the water supply of a town or village should be under control and as pure as possible. Unfortunately most of our towns have no system of water works. We therefore proceed to give a few suggestions regarding the methods of purification of water to lessen the dangers of its contamination.

1.—*Drinking water should be boiled* Boiling of water removes temporary hardness, drives off gases, in some measure precipitates suspended matters and kills animal parasites in it. But it has its disadvantages, (I) It cannot be done on a large scale, (II) it is inefficient, as it does not remove dissolved matter, and does not kill all microbes. (III) As air is driven off along with other gases boiled water is not palatable. To aerate water it should be allowed to drip gently from a height of two or three feet.

2.—*Water should be filtered.* Filtration removes every kind of contamination. It holds back suspended matters, removes salts and kills microbes by the process of exidation. Filtration is apt to be abused as much as anything else. but if care is taken it is the best process for purifying water

To make a serviceable household filter take three beakers (A.B.C.) place them on a wooden rack one above the

earth it carries these impurities with it; when received by the rivers it carries the impurities into them.

2.—If we follow the rain-water as it soaks through the ground we find that after a certain depth it stops. This is because there is a layer of earth which does not allow it to get lower down. Now if this layer is too near the surface, water is not pure because the layer is full of impurities. Hence, when we dig a well and get water at a few feet from the surface, this is really a *high water well*, and the water is not at all fit to drink as it is none else than the overflow from our streets which has soaked into the ground and has carried with it all sorts of impurities, possibly even germs of disease. If we consider that the water in these wells comes from burial grounds and refuse heaps, can we then doubt its impurity?

If, leaving this high water well, we continue digging, we ultimately come upon water once more, and this we find to be very pure. It has slowly leaked through several strata and in this way has been purified by this process of percolation. This is what we term an *artesian well*. The chief disadvantage of these wells is that they are not easily and cheaply made.

3.—Springs are really artesian wells that have come to the surface spontaneously. The water is therefore pure, but the quantity is not generally sufficient to supply the wants of a large community.

4.—Lakes are formed by a number of springs. They are sometimes connected with snow mountains. They also contain pure water, and can supply a large community.

5.—Rivers get their water from snow and other mountains, from lakes and from washed-down rain. The water of rivers is untrustworthy, specially of those rivers which come through populated districts. They carry disease for long distances, and great epidemics of *cholera* and *typhoid* often arise from carelessly using river water for drinking purposes.

Let us now look at those injurious things that we find in water.

(a) *Excessive hardness.* When spring water passes through hills and other chalky districts, it gets mixed with lime. A certain quantity of lime may be dissolved in water, thus producing in it excessive hardness. This can be removed by boiling.

(b) *Saline constituents.* Salts of different kinds are derived from the soil through which water happens to pass, specially where there is a great deal of nitrogenous matter

*Summary.* The most suitable air is that which comes fresh from open uninhabited spaces, or which is specially prepared before it is sent into a room for ventilation. It contains the greatest amount of oxygen and the least amount of $Co_2$*. It is free from other irritating gases and particles, and almost free from microbes.

The sources of contamination are respiration, combustion, pollution by sewage emanations, marshes, grave yards, trade processes and manufactures.

To ensure fresh supply of air the following considerations are necessary :—

Good locality for houses (see later).

Good ventilation.

Proximity to sea or a situation at a moderately high altitude.

(b) GOOD WATER.

Next to air *Water* is the chief necessary of life. It is essential for the maintenance of health and even of a life.

(1) It is an essential part of our food and forms a large proportion of the tissues of the body.

(2) It is used as a means of securing personal cleanliness.

(3) It is used for cooking and washing purposes.

(4) It is used to clean streets and in manufacturing processes.

We are at present, concerned only with drinking water, for its purity is essential to our health ; its impurity may lead to certain specific complaints such as *cholera* or *typhoid*, or to other dangerous diseases as for instance *dysentery*.

Let us first mention the sources of water supply.

(1) We all know that the sea is the main source. From the sea the sun's rays evaporate water (which by the way evaporates at all temperatures) in the form of clouds which again descends in the form of rain. This rain-water falling upon the ground either soaks into it until it meets with an impermeable stratum such as clay or hard rock, or it flows away on the surface and is carried back to the sea through streams and rivers.

It is agreed on all hands that rain-water is the purest. Still as we have found fault with our atmosphere, rain-water, which passes through this atmosphere, must get its share of impurities, specially the first portion of it. Then again it is not easy to secure or store rain-water and keep it free from contamination. As soon as it reaches the ground the water gets blended with impurities. When it soaks into the

---

* Chemical formula for Carbonic acid Gas.

lost some of the property which makes it valuable to animal life, and has gained in addition something which is decidedly poisonous to that life. Upon further investigation it is found that only a certain proportion of carbonic acid gas in air is injurious hence in the ventilation of school rooms, public halls etc. it is important to adopt such means as may bring this gas within that limit

*Combustion* is another source of the production of carbonic acid gas in air Hence, care should always be taken not to have stoves or too many lights burning in a poorly ventilated room. Besides carbonic acid gas there are other and still more poisonous gases found sometimes in the air. These are often derived from bad localities, cesspools, marshes or wherever organic matter is decaying Hence such localities are not suited for human abode

The irritating fumes from workshops, factories, &c are also injurious to life Certain trade processes dealing in organic matter, hides, preserving, &c give off offensive effluvia The localities where such trades and trade processes are carried on are unhealthy

*Microbes* We have seen that our food is liable to be contaminated with organisms through the agency of air Hence we can get these organisms directly into our system if the air that we breathe contains them. Disease germs can thus be conveyed to long distances, thus spreading widely their ill effects The Hygienic side of the question turns upon *Ventilation* Comfort as well as health is very much influenced by the way in which our houses are ventilated. The finest mansions are often in this respect the worst arranged, and there are indeed very few houses of any kind the occupants of which have not to complain of draughts or stuffiness, disagreeable heat or foul smells, all due to the fact that the room is allowed to be over-crowded, and that the air of the room is not changed sufficiently often The amount of air required for an adult so that the atmosphere may be kept perfectly free from any odour is not less than 3,000 cubic feet per hour and this fact alone shows that in crowded localities or even in good-sized but ill-constructed rooms, the problem of proper and effectual ventilation is one not readily solved. In the absence of special mechanical contrivance the air of a room is changed by means of the windows the chimneys and any chinks created by imperfectly fitted doors. When windows and doors are closed the atmosphere gets impure. This becomes worse at night and specially during winter when people foolishly over-crowd rooms and burn lights and stoves in poorly ventilated rooms.

secondly that he himself should receive proper medical care and nursing. Then, again, if a man has children he is morally bound to provide for their physical and mental wants in order that they may become useful members of the community to which they belong, and may thus help in its further progress and check its deterioration. We often forget that sanitation has a direct effect both upon bodily health and social progress. By securing healthy surroundings the mind of the individual is improved, his ideals in life become higher, his social scale is raised, and the progress of the generation is secured. Leaving this fact out of account, however, there can be no doubt (for statistics are to hand) that where sanitation has been adopted on a scientific basis, there the death rate is gradually being lowered, the specific diseases are becoming scarce, and life is prolonged in the individual, as well as rendered more valuable to the community. We here repeat what we have said above that ignorance has a great deal to do with sickly lives and early deaths, but surely the disinclination and want of will to act in accordance with our knowledge has still more to do with the presence of disease and premature decay.

(a) Good Air.

"AIR". Dr. De Chaumant truly says that "we may abstain for a time from food, if we have reason to believe that its condition is objectionable; we may for a short time and at the cost of great suffering abstain from drink of any kind, if we have reason to apprehend danger in that direction; but we are bound to breathe the air as we find it, under pain of death itself."

It is therefore apparent that air is the most essential need of our life, and as we cannot dispense with it for more than three or four minutes at a time, there must be either something highly vital in it, or there must be something very poisonous in our constitution which collects and is apt to choke us if not carried away through the medium of this "breathing air". On investigation we find this to be perfectly true. The normal constituents of air are two gases viz. *oxygen* and nitrogen. We require a great deal of oxygen for the conservation of bodily energy, and it is supplied to a large extent by air. On the other hand our bodily requirements involve work in which process carbonic acid gas is given off and this gas is poisonous to our system and must be eliminated at once. Its elimination is also effected by means of this same breathing air. That is to say, air as it is breathed in gives oxygen to our system and receives carbonic acid gas from it before it is breathed out. It is now easily seen that air which has been once breathed in, has

# Essentials of Health II.

## Good Hygiene.

We now come to a very important subject viz. Hygiene. It is a vast subject; its consideration may indeed take us far afield beyond the space at our disposal, but as it is very little understood or appreciated by the public we venture to consider it in some detail.

By hygiene we mean *sanitary conditions aiming at the general health of individuals* As long as man lived in a primitive state, his requirements being few, and his mind being undeveloped, his life was devoted mainly towards satisfying his animal appetites, and defending himself from his visible enemies. Human life at that remote period was cheap; that is to say, it was of no value to any one but to the being himself. As time advanced man came to be something more than a mere animal; his intellectual capacities developed, and the complex social and moral problems of intelligent existence presented themselves for his consideration. Communities were organised; different trades and professions resulted and man began to live not only as an individual, but as a member of a family, tribe, race and nation and hence his life became of value to others Unfortunately as the life of the individual rose in value the disease causing agencies multiplied, the enemies of man increased. On the other hand this intellectual advancement enabled him to deal advantageously for his own interests with these enemies; he began to discover the nature and origin not only of the enemies with whom he had long been familiar, but with those which were peculiar to the new condition under which he now lived. And as one of the results of his study of these insidious foes, the theory and practice of sanitation arose Thus it is that in order that we may live together and take our share in the division of labour, grow strong in everything, in body, in mind, as individuals and as a community, that we may advance our trade and commerce and keep abreast of the foremost thinkers and men of science, we must be vigilant with regard to proper means of sanitation. If we have formed ourselves into a community it is the bounden duty of each one of us to keep in view the health of the whole. A man in a town acquires an infectious disease; it is in the interest of the whole population of the town that the community (because of the worth of his life, as well as because of the danger of spreading disease) should take care of him and should see first that he was separated from everyone to whom he could communicate infection, and

(2) Indian capitalists may not come forward to take them over even if they are successful and if you persist in limiting your sales to Indians, Government may have to carry them on indefinitely and in that case your particular object of directing the people of India into new branches of production will not be realised.

(3) The industries may, in certain cases, flourish as long as they are governed by an official board which will control but not hamper the business manager, but they are very likely to come to grief when taken over by an Indian Company, of which the Directors will probably know nothing of commercial methods.

As, then, there are so many chances of the scheme failing, better far, would say my prudent statesmen, leave the money in the pockets of the people, made their taxation as light as is consistent with a decently efficient administration and the defence of the country and trust them to make a better use of their small savings than Government can. The points on the other side upon which I would lay stress are—

(1) That the increased income accruing to each family from a reduction in taxation is so small that there is no likelihood of its being saved for investment.

(2) That the dependence of the people upon one industry, viz., agriculture, is so serious an evil that it is to the interest of the people to bear a comparatively heavy taxation in this generation that their children may enter into possession of a better industrial organisation; as a father or husband may find it wise to pay heavy premiums on insuring his life to leave his children better off than himself.

(3) That the Government in India is the only body with the intelligence and the resources necessary for conducting these industrial experiments. In other words that the Government should use its power to compel the people to save and to invest their savings wisely.

These are some of the arguments on each side; what, then, should the Viceroy do with a surplus?

T. MORISON.

discretion? The directors may leave the manager too much freedom and he may cease to work honestly when freed from proper supervision; or the directors may interfere too much and not wisely, and then again the business may fail. When the business has failed it will be a warning to other Indians *not* to touch such forms of industry instead of the encouragment we wish it to be. But the opposite case, the success of an Indian company or capitalists, especially of a man of that locality, would be a greater encouragement to his fellow countrymen than the prosperity of all the factories of Cawnpore. Every man of his Muhalla would want to go and do the same; and if the industry were concerned with some produce with which he was familiar, he would think himself as capable of succeeding. I do not think this is the case with industries managed by Englishmen, they have not often proved an encouragement to Indians There are a few industries which Indians have been tempted to adopt because of the success achieved by Englishmen and these exceptions are instructive as they show us the cases in which success may be expected in the future Indians have taken to the manufacture of indigo——too late in the day indeed to make much money out of it—and tea. These are agricultural industries; these have been taken up by Indians, without very long hesitation, because agricultural operations are familiar to them. The other exception to my statement that Indians have not followed the commercial examples set by Englishmen is to be found in Bombay, where many Indian capitalists direct manufacturing industries of considerable complexity. The reason of that is that Bombay is a trading town, the commercial spirit pervades everything, a familiarity with commercial methods is inevitable for everybody. But that is just the thing that we want elsewere, it is the thing we cannot make universal all over India, till India is covered with large manufacturing towns. At present there is nobody to copy, nobody to learn trade methods from in 99 per cent. of the area of India and therefore we must I fear begin slowly and laboriously to teach a man here and a man there in the hope that his neighbours may copy him.

Now the arguments of the cautions statesman who would say that Governments should not meddle with trade are very weighty and worthy of consideration; they might be summed up thus :—

(1) In experimenting in industrial enterprises Government is bound to make many mistakes, many of the industries it wishes to plant will not take root and the money expended on them will be lost.

vate capitalist. If, after a fair trial, it was not found possible to make it pay, the concern would have to be abandoned, the machinery sold for old iron and the business manager dismissed. Now in this I have to point out two things; I postulate that the Government should bear all the loss and the public take all the gains; and therefore it is inevitable that taxation should be kept up in order to meet the constant drain from unsuccessful experiments. The second point is perhaps more important; a going concern which had been proved to be paying would be snapped up by an English company at the first opportunity; for there are in India a fair number of keen Englishmen of business who would not let such a chance slip; the Indian public on the other hand are very shy of investing in untried methods of production and slow to hear commercial news. But notwithstanding these facts I should recommend that these experimental concerns were handed over to Indians only and not to Englishmen. I do not say this because I believe, what is so often said in Congress newspapers, that the establishment of industries by Englishmen is no advantage to the country; on the contrary I believe that an Englishman who opens a new spring of wealth in the country benefits the people of India to as great an extent as himself. The railway companies, for instance, primarily give employment to a large number of labourers, foremen, clerks, ticket collectors, engine drivers and guards for whom a new source of livelihood is opened and after their wages have been paid the balance, if any, is profit of the share-holders; the tea industry is another example; it has supported for the last 30 years on ever increasing number of Indian labourers overseers and managers but it has paid next to no dividend in the last decade to the capitalist who embarked his money in the trade. But though I believe the English-owned industry is beneficial to the country as far as concerns those immediately employed, its value as an example and encouragement to Indians is small. The real object of those experimental concerns is to diffuse among the people a familiarity with new industries and encourage them to undertake similar ventures themselves, so that after a while Indians should undertake these forms of production as readily as they now undertake agricultural operations. And here again I must point out how slow and disappointing progress in this direction must be. Let us assume it proved that oil-crushing in Ballia or sugar-refining in Shahjehanpur can be made to pay; how long shall we have to wait before an Indian company or individual Indian capitalist comes forward to buy the concern? Or having bought it can we be sure that the company will manage it with

a surplus is the employment of that surplus in such a way as to ameliorate the condition of future generations, to improve the productiveness of industry in India, to bring about a state of things in which each working man will be able to make more and earn more than he can at present.

Now this is obviously a very complicated and difficult question and many clever men will honestly arrive at very different conclusions. Some people think that the solution of this problem cannot be found by any Government; the production of wealth depends upon the dealings of the people with each other, upon the intelligence, strenuousness and skill of the labourers and on the resourcefulness and enterprise of business managers; these are matters beyond the reach of any administration.

How small of all that human hearts endure
The part that kings and laws can make or cure.

There are others, of whom I am one, who believe that Government should make experiments in increasing the productiveness of industry, although many of these experiments will be failures and the greatest difficulties of all can never be removed by Government agency.

The direction in which the Government might I think with advantage attempt to stimulate new industries is that of industries with which the people are already familiar, that is to say the agricultural industries; for some generations at least it will not be possible to start those industries which have reached a high degree of complexity and perfection in Europe and which are altogether alien to the existing occupations of the people. But there are industries such as oil-crushing, sugar refining, paper-making, jute-weaving and others in which the raw produce of agriculture is worked up and which the common folk already in some measure understand. The way in which I conceive the Government might start these industries is as follows; let us take as an example the crushing of oil seeds. The Government would select one or two centres in which oil seeds were produced abundantly and allot a certain sum, let us say 5 lakhs, for the initial capital. A good business manager would be brought out from a manufacturing town in Europe or America and be placed in charge of the concern, he would advise as to the machinery to be imported and engage workmen and foremen, buy the raw material and find the markets for his produce. Oil seeds would be crushed and oil cakes and oil manufactured under his direction, and if in the course of 5 or 10 years he had succeeded in making the industry pay the interest on the capital invested, the whole concern, in working order, should be sold to a private company, or pri-

annually; estimating as we should the effect upon each family the remission would work out at half a rupee or 8 annas a year saved to each family, or according to the ordinary method of calculating income and expenditure in India: less than 3 paisa a month. Now I do not say this to show that the remission of taxation would not be an appreciable benefit to the poor, but only to point out this very exiguous sum would probably not be saved. The problem for statesmen, as I have said, is to mitigate the poverty of India and the only point I am considering at present is whether the money so saved from the tax gatherer would be accumulated, whether, in the language of English politicians, it would fructify in the pockets of the people. The very smallness of amount saved seems to me to negative that view; each family would to the extent of eight annas have more to spend and would to that extent be better off, but I cannot believe that the accumulation of capital, the increase in the resources of the country, would be forwarded by such a remission of taxation

This brings me to the second alternative which I want to consider and that is the wisdom of continuing the existing taxation and devoting the surplus to the development of the resources of the country And from this point of view the sum which we have to consider is a large one What was only 8 annas per family throughout India is 2 crores of rupees to devote to a useful purpose and with such a sum annually much can be done.

But if taxation is not reduced, I wish to acknowledge quite frankly the dangerous possibilities whice such a situation presents. The alternatives of spending are almost endless and with the multiplicity of good causes needing money there is a great danger of the special object of reducing the poverty of the country being forgotten. There is for instance the tempting alternative of spending money upon education I quite agree that the moral and intellectual welfare of the people should be an object of solicitude to the Government. We ought all to desire that the enjoyment of art and literature should be more widely diffused among the people; that a larger number than at present should have an opportunity of leading the rich and interesting lives which at present only a few can enjoy; the creation of a refined and elevated society in the land is an end to which we should all work, it is the ultimate goal of all progress. But there is in my opinion an antecedent condition and that is the increase of well being among the masses and until that is secured we have no right to lay any unnecessary burden upon them; the only excuse which justifies us in continuing taxation which yields

v. Christian College, lost by 1 goal to 2
v. N.-W Railway Team won by 1 goal to 0.
v. The Volunteers drawn, no score
v. The Chiefs' College drawn, 1 goal all.
v. The Police School, Phillor, won by 2 goals to 0.

The cricket eleven defeated Christ Church Cawnpore, very easily on December 5th Our total was 154 for four wickets (Abid Husain 52, Muhammad Akram 50, not out) while they scored 74 in two complete innings

On December 10th and 11th we were defeated by the Ajmere Railway Works by five wickets. In neither innings did the College accomplish much in the batting line, but the bowling and fielding on both sides were excellent Salamuddin made 12 for Aligarh in each innings.

The Team went to Agra on December 15, and defeated the Gymkhana by 9 wickets, Said Muhammad Khan scoring 86 for us

---

## What should the Viceroy do with a surplus ?

*Paper read by Mr Morison before the Graduates' Literary Society.*

The point which I wish to propose to you for consideration to night is what in the present condition of India would be the wisest course to adopt, supposing it were found that, under the existing scheme of taxation, the revenues of the country showed a surplus over expenditure. The alternative on the one hand is simple enough ; reduce taxation, *i e.* diminish the revenue and keep the expenses of the country upon the same scale as before This is the course recommended in most organs of the Congress party and it is generally believed to be supported by the reflexion that India is a poor country, and therefore the burden of taxation ought to be lightened wherever possible. I say the reflexion that India is a poor country is *supposed* to support the policy of reducing taxation, but I am not convinced that it is not an argument for the contrary view

India being, as compared with England France or America, a poor country, the object of statesmanship should be to lift her out of this condition of poverty. And I am not convinced that the remission of a small fraction of taxation would have that effect. Let us supposing that revenue to the extent of 2 crores of rupees annually were remitted ; this revenue is collected from over 20 crores of people so that the remission per head is equivalent to one-tenth of a rupee

Saeed-uzzaman Khan on being appointed 8th grade clerk in the Commissariat Department at Calcutta on a salary of Rs. 30 per month has contributed Rs. 3 to the funds of the College Employment Agency.

Mrs. Morison invited all those who had collected money for the Duty to a garden party on the 8th December and a very pleasant evening was spent. After games had been enjoyed there was some acting by Professor A Kadir Khan and Syed Ain-ud-din followed by a short speech from Mr. Morison, who said ;—" Mrs Morison and I are very glad to see you here and we are highly pleased at having once again to celebrate a highly successful year The Duty is becoming a very important organization, and year by year its deputations are going further afield. You have now made its fame known in many provinces, and with it the fame of the College too. This is an aspect of life in Aligarh of which we have reason to be proud. "The Indian People " noticed it with envy and wished that other students would do the like And this collection of money reveals the existence of a great force which would be sufficient, if we were all more energetic and whole-hearted, to complete the College but that end can only be accomplished and the Duty Collections can only be successful as long as the College retains its good name. I think that the servants of the Duty are inclined to think too much of the importance of collecting money and too little of that other object which is really more important, namely that every servant of the Duty, when he goes outside the College should so speak and so behave as to win admiration for the College, to make its students respected and to do away with all suspicions and ill thoughts entertained against it ; to be before the public a model of what we all want the Aligarh boy to be. We cannot unfortunately publish the good work done in that way in statistical tables, but it is still the greatest object of the Duty and one I care most about. If I had a means of testing the work done in this way and the genuine love for the College from which the task was undertaken, I should like to have a particular party for those students to take them into an inner room and to give them very special entertainment of their own." Mr. Morison, in conclusion, stated that he was about to hand over the work of keeper of the Duty to Mr. Gardner Brown, but that he intended to remain a zealous servant of the " Anjuman Al Fazl."

The College games have been vigorously pursued during the past month. The Football Team went to Lahore and played four matches with the following results :—

# The Aligarh Monthly.

December, 1903.

## College Notes.

There is no very momentous news to break the calm end of the year 1903, and consequently little to record in the pages.

The College is closed, at the time of writing, until January 2nd for the combined Eid and Christmas holidays and nearly everyone has gone away; only Editors and those whom approaching examinations threaten, are tied to the dull desk. But there is this one consolation: absent ones are not making holiday only but also "copy" for us who sit and mark their doings.

H. H the Nawab Bahadur of Murshedabad has presented a copy of Dr Walsh's History of Murshedabad to the College Library. The book is full of detail and beautifully illustrated, and will appeal strongly to all Mohammadans and lovers of history.

Promises of money to promote the scheme for a School of Arabic have been received from the following:—

(1) Rs. 100 Syed Razak Sahib, Gorakhpur.
(2) Rs. 100 Asghar Ali Sahib, Deputy Commissioner Muzaffargarh.
(3) Rs. 500 a year for two years from Mahommad Muzam-il-ullah Khan Sahib.

The second amount is promised on condition that the remaining amount (Rs. 4,900) is subscribed. All promises of donations will be notified in the "Monthly."

# علی گڈھ منتھلی

| جلد ۲ | فروری سنہ ۱۹۰۴ عیسوی | نمبر ۲ |
|---|---|---|


## اُردو ادب میں فنِ تنقید کی کمی

سفرنی خیالات کے تلاطم سے ہندوستان کی مختلف زبانیں اور اُن کے علوم جسطرح کایا پلٹ ہوگئے ہیں وہ تاریخ تمدن کا ایک دلچسپ اور معرکۃ الآرا واقعہ ہے - بنگالی - گجراتی - مرہٹی سے قطع نظر کرکے صرف زبانِ اُردو کی ترقی پر غور کی نظر ڈالی جائے تو بھی حیرت ہوتی ہے - ادب اُردو جس سُرعت اور خوبصورتی سے انقلاب پذیر ہو رہا ہے - جس تعجب انگیز ہمہ گیری کے ساتھ نظم اُردو یکرنگی سے اپنا دامن چھوڑاتی جاتی ہے یا فسانہ نگاری جنوں اور پریوں کے خلاف قیاس مُزخرفات - طلسمی قلعوں کی بعید از قیاس صورت اور ماہیت - ہیرونکی دُور از فہم مصیبتوں - اور پیر سبزپوش کی غیبی تائیدوں کی ملاوٹ سے پاک ہوتی جاتی ہے اس سے آج طفلِ مکتب کی نگاہ بھی ناآشنا نہیں ہے - صفحاتِ تاریخ

محض جنگ و جدل کے میدان و رہبرانِ نبرد آزما کے گھوڑوں کی جولانگاہ بنے رہنے کی بجاے
قوم کی تمدنی ترقی اور اُسکے کمال و زوال کی سچی تصویر بنے جاتے ہیں۔ مضامین نویسی لفظوں اور
اصطلاحوں کی بھول بھلیّوں اور اُن کی ناگوار اُلجھنوں سے نکلکر رموزِ فطرت اور علمی و عملی زندگی کے
مسائل حل کرنے کی صورت اختیار کرتی جاتی ہے۔ غرض ادبِ اردو کی جس شاخ کو دیکھیے اُس سے
اِس سچے اُصول کی تائید ہوتی ہے کہ "دماغِ انسانی کے ساتھ ساتھ قلم کی جولانگاہ بھی وسیع ہوتی جاتی ہے"
اِس عام ترقی کو دیکھتے ہوئے آسانی کیساتھ یہ بات ذہن نشین ہوسکتی ہے کہ اُردو کے لیے یہ زمانہ
شباب کا زمانہ ہے۔ طفولیت کا کچاپن اور بے رخی دُور ہوگئی ہے اور شباب کا جوبن بہار پر آرہا ہے۔ لیکن
جسقدر یہ انقلاب حیرت انگیز اور تعجب خیز ہے اُسیقدر ادبِ اردو کی حالت نازک اور محتاجِ احتیاط ہے
اِسکی حالت نازک اور محتاجِ احتیاط ہے اسلئے کہ اسوقت تک اسمیں ایک زبردست قوت کی کمی ہے جو
اسکو ہوشیاری اور سلامت روی کے ساتھ ترقی کے رستے پر چلاسکے۔ اِس زبردست قوت سے
میری مُراد فنِ تنقید سے ہے۔ بادی النظر میں تعجب معلوم ہوتا ہے کہ کسطرح مغربی خیالات اور مغربی
اصنافِ کلام کے اختیار کرتے وقت اِس نہایت لازمی صنف سے بے اعتنائی کیگئی۔ زبانِ انگریزی جسکی اشاعت
ادبِ اُردو کی ترقی کا اصلی سبب ہوئی ہے۔ اس میں تنقید کا فن نہایت درجہ ضروری اور باوقعت خیال
کیا جاتا ہے۔ اِسمیں شبہہ نہیں کہ اکثر اوقات مغرب کے اہلِ تصنیف نقادانِ سخن کی رائے زنی پر چیں بہ جبیں
ہوتے ہیں کبھی انھیں "دخل در معقول" "خدائی فوجدار" اور "آپ کون ؟ خواہ مخواہ" کی صلواتیں سُناتے
اور کبھی یہ کہکر کہ حضرات صیرفیانِ سخن خود ایسی تصانیف پیدا کرنے سے عاجز ہیں اُن کی حقِ راے زنی
کو کمزور کرنا چاہتے ہیں۔ تاہم اہلِ تصنیف کی اِس نرالی منطق کو عام شائقینِ علم تسلیم نہیں کرتے۔ وہ ہمیشہ
نقادانِ سخن کو اِس بات کا حق دیتے ہیں کہ وہ اُن کی خاطر مُصنفین کی محنت کی قدر و قیمت کا اندازہ
کریں۔ اور وہ اُن کی تصانیف کی حُسن و خوبی اور زشتی و بدی کو جانچیں۔ خوبی و زشتی کا معیار کسی طرح پر
قائم ہو۔ خواہ وہ نقاد کی سلامتی مذاق کا نتیجہ ہو یا کسی اعلےٰ رتبہ کی تصنیف کا نمونہ اسکا باعث ہو۔
اِس سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا کہ پبلک کا مذاق درست کرنے اور عوام اہلِ تصنیف کی بیجا آزادیوں

اور مُنہ زوریوں کے روکنے کیلئے معیار کا ہونا نہایت ضروری ہے۔ تنقید کے وجود سے یہ لازم نہیں آتا کہ مصنفوں کی اوپچ اور ایجاد پر قیود لگا کر ادب کو تر و تازہ اور فرحت بخش خیالات سے محروم کیا جائے۔ بلکہ تنقید بوسیدہ خیالات کے اظہار اور چبائے ہوئے نوالوں کے نگلنے کو اس سختی کے ساتھ روکتی ہے جسطرح کہ ناگوار بدلگامیوں و نامناسب منہ زوریوں کو۔

مذکورۂ بالا تمہید سے میرا مقصد یہ ہے کہ ایسی وقت میں جبکہ زبانِ اُردو نئی نئی خیالات کا مخزن بنتی اور نئے نئے پیرایوں پر حاوی ہوتی جاتی ہے نہایت ضروری ہے کہ اس میں فنِ تنقید کو بھی ترقی دیجائے۔ نقادوں کی ایک جماعت پیدا ہو جو اُردو کی اٹھتی جوانی میں اُسے پوری احتیاط اور عاقبت اندیشی سے ترقی کے میدان میں بڑھائے چلیں۔ اور اُسکی اُمنگوں۔ حوصلوں اور شورشوں کو سہولت کے ساتھ جادۂ اعتدال سے گزرنے دیں۔ اور اُسکی تربیت کریں۔ ورنہ ہمارے علمِ ادب کی حالت اُس جہاز کی حالت کے مشابہ ہوگی جو ہوا کے زور اور پانی کے بہاؤ سے آگے تو بڑھتا جائے مگر کپتان کی ہدایت اور رہنمائی سے محروم ہو۔

اُردو کے زمانۂ طفولیت میں فنِ تنقید کے عدم وجود سے جو نقصان ہوا اور اُردو دانوں کو پہونچا اُسکا نتیجہ اسوقت تک ہم بھگت رہے ہیں۔ ایک غیر محسوس غلطی سے نظمِ اُردو کسی قدر تنگ اور پامال روش پر کئی سو برس تک چلتی رہی۔ اِس میں شبہ نہیں کہ اس خاص روش کے اِستحکام اور آراستگی میں ایک وقت خاص تک ترقی ہوتی رہی۔ کانٹے اور جھاڑیاں صاف کر کے خوشنما پھولدار درخت اُسکے کنارے لگائے گئے۔ خوشنوا بلبلیں کبھی اپنی نغمہ سنجیوں سے ہمارے شعرا کے دلوں میں سرور و انبساط کی موجیں پیدا کرتیں اور کبھی اپنے جانگداز نالوں سے اُن کے نازک دلوں پر چرکے لگایا کیں کبھی کوئی صاف و شفاف نہر بھی اُن پودوں میں چھوڑ دیگئی۔ وہیں ایک رندِ سیاہ مست مئے کہنہ کے نشے میں سرشار ہر ایک چیز میں اپنے خیالی معشوق کی تصویر دیکھتا نظر آیا۔

مگر ایک زمانۂ دراز یوں ہی گذر گیا پر نہ وہ روش بدلی نہ اُسکے سامانِ آرایش میں کچھ ترقی ہوئی نہر کا پانی ساکن ہو کر گندہ ہو گیا۔ اور اُس سے گھن آنے لگی۔ عاشق کی بیتابی نے بناوٹ کی

وضع اختیار کر لی اور معشوق کے ناز و انداز میں چھچھورا پن کی جھلک پائی جانے لگی۔ مگر تنقید کا پہرہ دار نہ تھا کہ لوگوں کو اس روش پر چلنے سے منع کرتا۔ آتش۔ ناسخ۔ نصیر و مومن۔ شہیدی و ذوق لکیر کے فقیر۔ آنکھیں بند کر کے اسی روش پر چلا کئے۔ اور بزعم خود یہ سمجھا کئے کہ اس سے بہتر کیا ہو سکتا ہے۔ لسان الغیب غالب مرحوم کے سر اس ایجاد کا سہرا رہا کہ انھوں نے اسکی برابر میں ایک نئی روش کی طرح ڈالی۔ بلبلوں کو نئی نئی نواسنجیاں سکھائیں۔ پرانی شراب کو نئی صراحیوں میں بھرا۔ بوسیدہ پھول جو اپنی یکرنگی سے سرور نظر کی بجائے اس کی وحشت کا سبب ہو گئے تھے اُن کی جگہ خوش رنگ اور خوشبودار پھول لگائے۔ اس روش کو سب نے پسند کیا مگر ایک عرصے تک کسی کو اتنی جرأت نہ ہوئی کہ اس پر قدم رکھتا۔

اُن کے شاگرد خواجہ حالی نے اُستاد کے رنگ سے جدا ہو کر ایک نئے طرز کی بنیاد ڈالی۔ اِنکے مخالفین ان کی علٰحدگی یا جدت کو اُن کے نقص کمال پر محمول کرتے ہیں۔ مگر اُن کا یہ وہم ہمارے قومی شاعر کے لئے کسیطرح بھی موجب عار نہیں ہونا چاہیئے۔ اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ حضرت حالی قدما کے رنگ میں بوجہ نقص کمال کے چمک نہیں سکتے تھے۔ اور انکی علٰحدگی کا اصلی سبب ان کی ناقابلیت تھی نہ کہ غمخواری قوم۔ تو اس صورت میں بھی تعریف کے مستحق حالی ہی ہونگے کیونکہ اُنھوں نے ایک ایسے طرز کو اختیار کیا جو اُن سے بہتر لیاقت کے شعرا کے طرز سے زیادہ مقبول اور دلچسپ تھا اور اگر شاعری کے لئے مفید ہونا گناہ نہ تصور کیا جائے تو قوم کے لئے مفید بھی تھا۔ دلدادگانِ طرزِ قدیم جن کا وجود بجز شعرائے طرزِ قدیم کے عنقا ہے اپنی یکرنگی اور یکصدائی سے ارباب تمیز کی پریشانی کا باعث ہو گئے تھے کہ حالی نے کچھ عرصے کے لئے طبیعتوں کو ایک نئے طرز سے آشنا کر دیا۔ اور اسی میں ان کی مقبولیت کا راز مخفی ہے۔ اگر حالی بھی ذوق و مومن اور آتش و ناسخ کے قدم بقدم چلنے پر قناعت کرتے تو آجکل کی نکتہ چیں نگاہیں ان کے کلام کو بھی ایک بے مصرف اور پریشان کن مجموعہ خیالات سمجھتیں۔

لیکن جب میں حالی کے طرزِ جدید اور پیرایہ لطیف کی تعریف کرتا ہوں تو مجھے اس خیال کے

اظہار میں بھی تکلف نہیں کرنا چاہئے کہ ان کی شاعری ایک عارضی ضرورت کے پورا کرنے کے لئے ظہور میں آئی ہے اور خواہ وہ کتنی ہی دیر زندہ رہے آخر عارضی ہے۔ جبتک یہ ضرورت قائم ہے یعنی جبتک مسلمانانِ ہند پر جہالت اور افلاس کی گھٹا چھا رہی ہے اُسوقت تک ممکن ہے کہ قومی شاعری کی آندھیاں اِن کے اُڑانیکو چلا کریں مگر جب یہ اہم اور عظیم الشان ضرورت پوری ہوجائیگی۔ جب علم و اقبال کا آفتاب پھر مسلمانوں کے سر پر چمکنا شروع ہوگا تو حضرتِ حالی کی قومی شاعری مشاہیر کی اعلیٰ کوششوں کی معزز فہرست میں نام لکھا کر رہجائیگی۔ متجسس نگاہیں ادبارِ رفتہ کی سچی اور دردناک تصویر دیکھنے کے لئے مسدس کی ورق گردانی کریں تو کریں اور شاید اِس مساعدتِ روزگار پر جسے ہماری آیندہ نسلیں دیکھینگی شکریے کے چار آنسو بھی بہالیں مگر قومی مرثیے لکھنے کا نہ اُنھیں خیال ہی آسکتا اور نہ وہ اسکی ضرورت ہی محسوس کرینگے۔

میں یہ کہہ چکا ہوں کہ آغاز نظم اُردو میں تنقیدِ کلام کے موجود نہ ہونے سے ادب اُردو کو جو نقصان پہونچ چکا ہے اُسکا خمیازہ ہم ابتک بھگت رہے ہیں۔ ایک زمانہ گذرنے پر غالب اور حالی نے ذوقِ سلیم کی مدد سے اپنے معاصرین کی غلطی کو پالیا اور اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ جہاں طرزِ قدیم کے دواوین کو دیمک چاٹ رہی ہے وہاں کلامِ حالی کو اہلِ مذاق شوق کے ہاتھوں لیتے اور مسرت کی نظروں سے پڑھتے ہیں۔ مگر حالی کی اس مقبولیت نے نوجوان شعرا کو بڑا دھوکا دیا۔ جسطرح طرزِ قدیم کی پیروی سے بہت سے شعرا نے خودکشی کو جائز رکھا اسیطرح نوجوان شعرا کے ایک کثیر حصے نے منظوم نثریں لکھ لکھ کر اپنے تئیں اور قومی شاعری کو بدنام کرنا شروع کردیا۔ بعض قابل اور اکثر ناقابل لوگ طرزِ حالی کا مُنہ چڑانے لگے۔ پُرانی شاعری کے ہیرو "معشوق" کی جگہ مُردہ یا نیم جاں "قوم" نے لے لی۔ اِدہر انگریزی تعلیم یافتوں کی طرف سے عشقیہ شاعری کی تحقیر و تذلیل کی آوازیں آنے لگیں۔ اُدھر قومی شاعری کا جنون بڑھتا گیا۔ کچھ وہ لوگ جنھیں فطرت سے ملکہ شاعری عطا کیا گیا تھا اور ایک بڑی تعداد اُن بزرگوں کی جو زمانے کی آواز میں آواز ملا دینا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ قوم کی مرثیہ گوئی کرنے لگے۔ اخباروں۔ رسالوں۔ انجمنوں اور کانفرنسوں میں قومی

شاعری کی وہ ڈونڈی کہ عشقیہ شاعری کے دفترِ بے معنی کو اسکے آگے منہ چھپا لینا پڑا۔ تھوڑے ہی عرصے میں اس نئے طرز نے بھی وہ دلچسپی اور مقبولیت کھو دی جو ایک سچے شاعر کی اتفاقیہ موجودگی سے اُسے حاصل ہو گئی تھی۔ نو تعلیم یافتہ لوگ جو چند روز پہلے طرزِ قدیم کا نام سُنکر بگڑتے تھے اب طرزِ جدید سے بیزار ہونے لگے۔ قومی شاعری اختیار کرنا مذاق کے خون کرنیکا مُرادف قرار دیا جانے لگا۔ پُرانی عشقیہ شاعری کے برخلاف جو کچھ بھی کہا جائے ایک اعتراض اس پر وارد نہیں ہوسکتا کہ نظم کا مضمون نثر میں بھی اسی خوبی کے ساتھ ادا ہو سکتا ہے۔ مگر جو اتبینِ حالی کی شاعری کا بڑا حصہ ایسا ہے جو بہ نسبت نظم کے نثر میں زیادہ چُست اور پُر اثر ہو سکتا ہے۔ جب حالی کے شاگردِ رشید جناب ناظر میں ہم یہ تنزل اِسقدر واضح پاتے ہیں تو دوسرے قوم کے دُکھڑا رونیوالوں کی جو حالت ہوگی وہ ظاہر ہے۔ ناظر کی نظم موسومہ بہ "تحفۂ اخوان" جو ٹامسن کی تقلید میں موسموں کے تغیر و تبدل پر لکھی گئی ہے یا "تاج گنج" اور "جوگی" کا انکی قومی نظموں سے مقابلہ کرنے پر افسوس ہوتا ہے کہ اُنھوں نے ناحق قومی شاعری اختیار کی۔ اِن کے جگانے سے قوم تو جاگنے سے رہی اُلٹی اُن کی شاعری کی رُوح سوتی جاتی ہے۔

فنِ تنقید کسی شایستہ صورت میں موجود ہوتا تو یقین ہے کہ اُردو لٹریچر اس طرح عشقیہ شاعری اور قومی شاعری کی دباؤں کا شکار نہ بن جاتا۔ نہ اس کی حالت ایسی قابلِ رحم ہوتی کہ وہ اعلیٰ شاعری کے نمونے پیش کرتے وقت مسدسِ حالی اور ایک شاعر کے بہتر اور دوسرے کے ستر شعروں پر کفایت کرتا جسطرح یہ بات نہایت آسان تھی کہ طرزِ قدیم کی بیکرخی اور اُس میں تصنع یا بناوٹ کی ترقی روکی جاتی اسیطرح یہ بھی ممکن تھا کہ قومی شاعری کے تنگ دائرے اور اُسکی عارضی حیثیت سے شائقینِ سخن کو خبر دیجاتی۔ مگر افسوس وہ ہوا۔ نہ یہ ہوا۔ اور چند ہی روز میں شاگردانِ حالی کا کلام بھی ایسا ہی "اَن نیچرل" یعنی بناوٹ سے بھرا ہوا معلوم ہونے لگا جیسا پیروانِ میر و سودا کا۔ قومی نظم کے اِس زوال کے وقت آسمانِ شاعری پر ایک نیا ستارہ طلوع ہوا۔

مخزن نے اپنی پیدایش کیساتھ ہی اقبال کو منتظر نظروں کے سامنے لاکر کھڑا کر دیا۔ اُس نے

آتے ہی ایشیا کے اصلی شاعرانہ خیالات کو مغربی اسلوب بیان میں کچھ اسطرح ادا کیا کہ سب عش عش کر اٹھے کہیں تصوف کی گتھیاں سلجھائیں کہیں فطرت کی ظاہری صورت سے اسکا راز نہاں آشکارا کیا تخیل کی نگاہ جس چیز پر ڈالی اُسی بالکل نئی اور پہلے سے بڑھکر پیاری صورت عطا کر دی۔ تاثیر کی کیفیت یہ اکثر ایک ایک مصرعہ ایک ایک لفظ شاعر کی گلخنِ طبع کا شرارہ معلوم ہوتا ہے ع۔ سالیکہ نکوست از بہارش پیداست۔ اقبال کی شاعری میں بھی سے وہ باتیں پائی جاتی ہیں جنسے اُنکے طرز کی دائمی مقبولیت کا پتہ چلتا ہے۔ شعرائے اُردو کی لمبی فہرست میں ایک مرزا غالب ایسے شاعر ہیں جنکے کلام کو بلحاظ جذبات محسوسات کلام اقبال پر ترجیح دیجا سکتی ہے۔ اور اسلئے کچھ بیجا نہو گا کہ ہم اقبال کو مرزا کا شاگردِ روحانی قرار دیں۔

کلام اقبال پر بعض جائز اعتراض بھی ہو سکتے ہیں۔ اکثر اِن کی مشکل پسندی کے سامنے غالب کی مشکل پسندی سہل معلوم ہوتی ہے۔ کسی سیدھی سادی مشین میں بہت سارے غیر ضروری کیل پرزے لگا دیے جائیں تو انجان دیکھنے والے چکر میں آجائینگے اور مشین کو نہایت پیچیدہ اور فہم سے بالاتر سمجھینگے اِسی طرح بعض اوقات استعاروں اور تشبیہوں کی اعتدال سے بڑھکر بھرتی اُن کے اشعار کو معمّا یا چیستاں بنا دیتی ہے بعض وقت تصوّف اور فلسفے کی نمایش۔ استعارات کے رنگ و روغن سے بلکہ جنھیں اضافات سے بڑی مدد ملتی ہے معمولی سے مضمون کو بالکل بیگانہ اور دُور از قیاس صورت عطا کر دیتی ہے کہیں کہیں زبان کی غلطیاں بھی اہلِ زبان کی نظر میں کھٹکتی ہیں۔ اس سے بھی کچھ بڑھکر کبھی کبھی مضمون کی چُستی کے مقابلے میں طرزِ بیان پھُسپھُسا معلوم ہوتا ہے اور یہ زبان پر پُوری قدرت نہ ہونیکا لازمی نتیجہ ہے۔

چونکہ اقبال کی شاعری کی بُنیاد بلحاظِ استحکام حقائقِ فطرت پر اور بلحاظِ وسعت ساری کائنات پر پڑی ہے اسلئے وہ کبھی طبیعتوں کو اِس طرح پریشان نہیں کریگی جسطرح کہ محدود موضوع اور کمزور بُنیاد کی شاعری۔ اِس صورت میں یہ نہ صرف بہترین وقعت کے لائق ہے بلکہ اس امر کو بھی ناممکن کر دیتی ہے کہ نیم شاعر یا متشاعر آئیں کامیاب ہو سکیں۔ مگر کتنا قابلِ عبرت نظارہ ہے کہ بعض نوجوان تعلیم یافتہ

جنھیں شاعری کے سوا کسی چیز میں فراہی نہیں آتا مگر اتنی لیاقت نہیں کہ نثر کو نظم کر سکیں وہ تقلید اقبال کی ہوس میں خود کشی کو جائز رکھتے ہیں - وہ نظمِ اقبال کو اُسے وغیرہ ندائیہ الفاظ اور مشکل ترکیبوں میں محدود سمجھتے ہیں - دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ ایک قالب بنا کر کھڑا کر دیتے ہیں جسکے ظاہری نقوش اور اعضا، تو قریب قریب مثل اقبال کے کلام کے ہوتے ہیں مگر اُس میں نہ وہ جان ہوتی ہے نہ وہ روح - ایسی حالت میں سخت ضرورت معلوم ہوتی ہے کہ نقادانِ سخن کچھ مدد کریں ورنہ ہمیں ڈر ہے کہ ایک زندہ شاعر کے گرد بہت سے حسرت نصیب شعرا کی لاشیں نہ نظر آنے لگیں -

یہانتک تو میں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اُردو نظم کو عدم تنقید سے ایسا نقصان پہونچا کہ اُسکا بہت بڑا حصہ بیکار ہو گیا - نظم کے بعد بلحاظ کثرت اور مقبولیت کے فسانہ نویسی کا نمبر آتا ہے اسلئے اگر اسکے متعلق بھی کچھ لکھا جائے تو شاید بیجا نہ ہوگا -

ابتدا میں اُردو فسانہ نویسی مثل اور زبانوں کے بے سروپا قصّوں کہانیوں میں محدود تھی - انسان و پری فرشتے اور شیطان سب کو بلا تکلف قصّے میں جگہ ملتی تھی - اور وہ قصّے کے بنانے میں مدد کرتے تھے - اس ابتدائی حالت سے نکلی تو شاعری کی طرح یہ بھی قوم سے دست و گریباں ہو گئی - سر سید مرحوم کو مسلمانان ہند میں قومیت کا خیال پیدا کرنے میں لٹریچر سے جو مدد ملی اسکی بہترین مثال مسدس حالی اور شرر کے افسانوں میں پائی جائیگی - حالی نے موجودہ درد ناک اور حسرت خیز حالت کو رو رو کر بیان کیا اور ضرور تھا کہ باہمی مصیبت اور عام تنزل کا علم مسلمانوں کو ایک دوسرے سے قریب تر کھینچتا - شرر نے اقبال گذشتہ کے واقعات کو کچھ ایسے دلپذیر طریقے میں بیان کیا کہ جس نے سُنا اُسی میں ایک تازہ ہمت اور جوش پیدا ہوا - اسوقت تک شرر کی اس بیش بہا خدمت قومی کی داد دینے کو بہت کم لوگ تیار ہیں - اور عام لوگ اسکے فسانوں کو صرف فسانوں کی حیثیت سے دیکھتے ہیں - مگر زمانۂ حال کی فسانہ نویسی کا ریویو نگار اور مسلمانوں کی بیداری کا مؤرخ 'ملک العزیز اور ورجنا' 'منصور اور موہنا' اور 'زیاد و حلاوہ' کی مصنف کی اُس خدمت کو نظر انداز نہیں کریگا جو اُس نے سر سید

کے عظیم الشان کو پورا کرنے میں کی ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ شرر کے افسانوں نے مسدس اور اُس کی اُمت سے کہیں بڑھکر اس مقصد کو پورا کیا ہے۔

مگر ہمیں تو اس پر بھی یہ شکایت ہے کہ کیوں شرر کے فسانوں پر تنقیدیں نہ لکھی گئیں۔ بلحاظ ایک فن کے شرر کی فسانہ نویسی پر بھی بہت کچھ کہا جا سکتا تھا۔ جذباتِ دلی کی وہ سچی تصویریں جو بعض انگریزی فسانوں میں ہم دیکھتے ہیں اس میں قریباً معدوم ہیں۔ مناظرِ قدرت کا بیان محض افراط کی حد تک پہونچ گیا ہے۔ مکالمے کی کثرت ادنےٰ درجے کے ناولوں سے بھی بڑھی ہوئی ہے۔ اور مصنف بہت کم اپنی رائے کا اظہار یا کسی خاص اُصولِ فطرت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ فسانوں کے اشخاص بہت معمولی خصوصیتوں میں ایک دوسرے سے امتیاز رکھتے ہیں........

میری غرض کسی خاص مصنف پر تنقید لکھنا نہیں ہے۔ مگر عام طور پر عدم تنقید پر بحث کرتے ہوئے اس سے بالکل علیحدہ بھی نہیں رہا جاتا۔ جب اول درجے کی تصنیفات نقصوں سے بری نہیں ہیں تو چھوٹے درجے کے فسانوں میں جسقدر اصلاح کی ضرورت ہے ظاہر ہے۔

فسانوں کے متعلق لاکھ بات کی ایک بات تو یہ ہے کہ ایک نہایت قلیل مقدار کو مستثنےٰ کرکے وہ کسی اُصول کو مدِ نظر رکھ کر نہیں لکھے جاتے جس کسی کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوتی ہے کہ کوئی قصہ لکھئے وہ بغیر اس خیال کے کہ اس سے ملک کا کون سا مقصد سوائے تضیعِ اوقات کے پورا ہوگا لکھنا شروع کر دیتا ہے۔ جب مغربی فسانہ نویسی پر غور کرتے ہیں۔ اور یہ دیکھتے ہیں کہ وہاں پر قیدخانوں کی اصلاح۔ مزدوروں کی بہتری۔ غلاموں کی آزادی۔ اور ہر قسم کی ملکی۔ مذہبی۔ اخلاقی اصلاحیں ایک حد تک فسانہ نویسی کی ممنون ہیں تو اردو فسانہ نویسی ایک بالکل بے مصرف اور لغو مشغلہ معلوم ہوتی ہے۔ پنجاب میں ایک نوجوان فسانہ نویس ہیں۔ اُن کی سب سے بڑی تعریف اس بات میں ہے کہ وہ تعداد تصنیفات کے لحاظ سے چھوٹی سی عمر میں بڑے بڑے کہنہ مشق مصنفوں سے بازی لیگئے ہیں یعنی اسوقت تک قریباً ڈیڑھ سو فسانے اُن کے قلم سے نکلکر ملک میں شائع ہو چکے ہیں۔ پنجاب گورنمنٹ نے حال ہی میں اُن کو ڈیڑھ سو روپیہ یعنی ایک روپیہ فی کتاب علمی خدمات کے

عوض دیا ہے۔ گورنمنٹ کی فیاضی کی جسقدر تعریف کیجائے بجا ہے۔ مگر اس سے کس کو انکار ہو سکتا ہے کہ وہ نہایت بے موقعہ ظاہر ہوئی ہے۔ مصنف مذکور کے فسانے اس قابل بھی نہیں کہ کوئی بامذاق آدمی ایک لحظے کے لئے اُنھیں پڑھ سکے۔ اُن سے لغو تر۔ بے سروپا اور بے لطف فسانے دُنیا کی کسی زبان میں نہیں لکھے گئے ہونگے۔ نقشہ۔ مکالمہ۔ خصوصیت۔ نتیجہ۔ غرض کسی لحاظ سے بھی ان ڈیڑھ سو فسانوں میں سے کوئی اس قابل نہیں کہ اُس کی کچھ تعریف کیجائے۔ اِس کے علاوہ زبان اس حد تک غلط کہ اہل پنجاب کی اُردو کی آدھی غلطیاں نہایت آسانی سے اِن مصنف صاحب کی کوششوں کی طرف منسوب ہو سکتی ہیں۔ مگر ان ساری باتوں کا وجود کیوں ہے؟ جہاں تک میں غور کرتا ہوں محض عدم تنقید کی وجہ ہے۔ اُردو خواں دُنیا میں تھوڑے سے شائستہ مذاق کے نقاد پیدا ہو جائیں پھر کسیکو نہ ایسے فسانے لکھنے کی جُرأت ہو نہ تعلیم یافتہ لوگ ایسے لچر ناولوں کے خریدنے میں روپیہ ضائع کریں اور نہ سرکار دولتمدار اپنی فیاضی کو بے جا طور پر ظاہر کرے۔

عام شکایت سُنی جاتی ہے کہ اہل کمال کی قدر دانی جیسی ہونی چاہیئے نہیں ہوتی۔ بڑے سے بڑے مصنف کے لئے یہ امر محال ہے کہ وہ صرف اپنی تصنیفات کی مدد سے اسباب معیشت بہم پہونچا سکے۔ اسکا الزام کبھی رؤسا کے سر تھوپا جاتا ہے کہ وہ اہل علم کی قدر نہیں کرتے۔ کبھی پبلک کو کوسا جاتا ہے کہ وہ عمدہ تصانیف کی قدر نہیں کرتی۔ رؤسا کی سرپرستی سے لٹریچر کی جو مٹی خوار ہوتی ہے اُس کی نسبت میں بہت کم لکھنا چاہتا ہوں۔

کوئی لٹریچر زندہ اور آزاد نہیں رہ سکتا جس کی زندگی چند افرادِ قوم کی مرضی پر ہو۔ اس صورت میں اُسکے لئے بہت بڑا ڈر یہ ہوتا ہے کہ اُس میں خوشامدانہ حصے بڑھنا لازمی ہو جاتا ہے۔ اور سرپرستوں کے خاص مذاق کی پیروی کرنا اُس پر فرض ہو جاتا ہے۔ رہی یہ بات کہ عام پبلک عمدہ تصانیف کی قدر نہیں کرتی۔ اِس کی ایک وجہ تو ظاہر ہے کہ کثیر حصۂ ملک جاہل اور بیعلم ہے مگر اسکا کیا سبب ہے کہ پڑھے لکھے لوگ بھی اس طرف توجہ نہیں کرتے۔ میری ناچیز رائے میں ایک بہت بڑا سبب اس بے توجہی کا عمدہ تصانیف کی طرف سے ناواقفیت ہے۔ کوئی ذریعہ

اِس امر کا موجود نہیں ہے کہ تعلیم یافتہ حصّۂ ملک کو اُن کی خبر دیجائے۔ سینکڑوں کتابیں آئے دن لکھی جاتی ہیں۔ کسی نئی کتاب کی نسبت صحیح کیفیت دریافت کرنا مشکل ہے۔ یوں بجائے خود ہر ایک نئی کتاب کو جسکا اشتہار نظر سے گذرے خریدنا اور پڑھکر اسے قائم کرنا ماوشما کا کام نہیں ہے۔ اِسکے لئے گنجِ قارون اور عمرِ خضر کی ضرورت ہے۔ بقول شخصے ؎

عشق کا لطف تو جب ہے کہ مجھے دے ڈالیں ٭ زندگی اپنی خضر بخت سکندر اپنا۔

ممالکِ مغرب میں اس خبر رسانی کا بہترین ذریعہ اخبارات ہیں۔ وہ نئی کتابوں پر نہایت غور اور نظرِ انصاف سے تنقیدیں لکھتے ہیں۔ کتاب کی بہت سی خوبیاں جو سرسری نظر سے دیکھنے پر پردۂ ناواقفیت میں رہتیں نقاد کی محنت سے نمایاں ہوجاتی ہیں۔ بہت سے نقص جو مصنف کی چالاکی سے اچھی طرح نظر نہیں آتے تھے اب صاف نظر کے سامنے آجاتے ہیں۔ اخبار کے ناظرین تنقید پڑھتے کے ساتھ ہی فیصلہ کرلیتے ہیں کہ یہ کتاب خریدنے کے لائق ہے یا نہیں۔ یہاں پر یہ سوال پوچھا جائیگا کہ اُردو اخبارات بھی اِس معاملے میں ملک کی وُہی خدمت کر رہے ہیں یا نہیں۔ افسوس کے ساتھ جواب دیا جائیگا کہ ہرگز نہیں۔ کیسی ہی ادنےٰ درجے کی تصنیف ہو جب مصنف اُسکی ایک جلد دفترِ اخبار میں ریویو کی غرض سے بھیجتا ہے۔ تو ایڈیٹر صاحب کی نیک طبیعت کم فرصتی یا غفلت۔ اُن کو اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ وہ کتاب کو غور سے پڑھیں۔ اُسکی خوبیوں پر روشنی ڈالیں۔ اور اُسکے عیوب کی پردہ دری کریں۔ وہ اِس فرض سے سبکدوش ہونیکا بہترین ذریعہ یہی خیال کرتے ہیں کہ عموماً کتاب کو "مفید۔ دلچسپ اور سستا" بتادیں۔ مگر افسوس اُن کے یہ الفاظ ناظرینِ اخبار کو کتاب زیرِ تنقید کی اصلیت کیطرف سے کیسا دھوکا دیتے ہیں۔ بسا اوقات اُنھیں کتاب خرید کر اپنی خوش اعتقادی پر پچھتانا پڑتا ہے اور پھر وہ اسکا عوض یوں لیتے ہیں کہ جب ایڈیٹر صاحب کسی واقعی مفید اور دلچسپ کتاب کو مفید اور دلچسپ بتائیں تو وہ مصلحت اسی میں سمجھتے ہیں کہ ایڈیٹر کے لفظوں پر اعتبار نہ کریں۔

اس طرزِ عمل سے ظاہر ہے کہ بعض وقت نہ صرف نالائق مصنف (گو مجھے مصنف کے ساتھ

نالائق لکھتے ہوئے ڈر لگتا ہے) کی قدر افزائی ہوتی ہے اور اُسکو لٹریچر کے خراب کرنیکا موقعہ ملتا ہے بلا اعلےٰ رتبہ کے اہل تصنیف بھی خسارہ میں رہتے ہیں۔ کوئی پانچ برس گذرے ہیں۔ رفاہِ عام پریس لاہور نے پروفیسر آزاد کی کتاب "دربار اکبری" (جسے مولوی ممتاز علی صاحب نے بصد مشکل مصنف کے دستِ جنوں سے بچایا تھا) شائع کی۔ اس کتاب کی نسبت جب یہ کہدیا جائے کہ وہ کئی حیثیتوں سے آزاد کی بہترین تصانیف ہے تو اس سے یہ مراد ہے کہ وہ ادب اُردو میں اپنا نظیر نہیں رکھتی۔ مگر کسقدر تعجب اور افسوس کی بات ہے کہ پانچ برس میں اسکا صرف ایک ایڈیشن طبع ہو ہندوستان میں اسکی کُل نو سو جلدیں فروخت ہوں اور اگر ریاستِ نظامِ دکن مدد نہ کرے تو پہلا ایڈیشن بھی ختم نہ ہو

میں اوپر کہہ چکا ہوں کہ ان نقصوں کا سبب ایک بہت بڑی حد تک عدمِ تنقید ہی۔ میں یہی لکھ چکا ہوں کہ فنِ تنقید کو ترقی دینا اور اسکو ملک کے علم ادب کے لئے بمنزلہ ایک مشیر اور صلاح کار کے برتنا اخبارات اور علمی رسالوں کا کام ہے۔ جہانتک میں جانتا ہوں اس وقت تک صرف ایک اخبار "تالیف واشاعتِ لاہور" اس کام کے لئے مخصوص ہے۔ مگر ابتک اس میں بھی کسی اعلیٰ درجہ کی تصنیف پر ریویو نہیں چھپا۔ تاہم وہ بعض تازہ تصنیفات کی نسبت سچی راے کا اظہار کر رہا ہی لیکن نہ تو تالیف واشاعت سب لوگوں کی نظروں سے گذرتا ہے۔ نہ وہ اکیلا اس اہم خدمت کو انجام دیسکتا ہے۔ اسکا قابلِ اطمینان طور پر پورا کرنا اُسی صورت میں ممکن ہے کہ اُردو کے مشہور اخبار اور رسالے تنقید کے لئے خاص انتظام کریں۔ اسکے لئے روپیہ خرچ کریں۔ ایڈیٹوریل اسٹاف میں خاص شخص مقرر کریں اور ملک کے لائق لوگوں سے اس کام میں مدد لیں۔ ورنہ اس شباب میں ادب اُردو کی حالت ایسی بگڑیگی کہ پھر بنائے نہ بنیگی۔ ع۔

۔ بر رسولاں بلاغ باشد و بس۔

حاجی محمد خاں۔ مدرسۃ العلوم علیگڈھ۔

---

# دُنیا میں بدی کیوں ہے؟

خیرہٗ و شرہٗ من جانب اللہ۔ تمام مذاہب حقیقی اور الہامی نے دُنیا میں نیکی و بدی کے ہونیکا باعث اِنہی الفاظ میں بیان کیا ہے اور نہایت صفائی کے ساتھ اقرار اس امر کا کیا ہے کہ جو کچھ بُرائی یا بھلائی دُنیا میں ہے اُن سب کا پیدا کرنے والا خدا ہے۔ ایسے صاف اقرار کے بعد نیکی و بدی کے وجود کے سبب کی نسبت ہمکو کچھ شک یا دقت نہونی چاہیئے۔ لیکن یہ وُہی مسئلہ ہے جس میں ہر مذہب کے لوگوں کا اختلاف رائے ہے۔ عقلمند۔ مذہب کے پابند لوگ سمجھتے ہیں کہ اگرچہ خدا بسبب خود نیک ہونے کے بدی کو پیدا کرنا نہ چاہتا ہوگا لیکن کسی مصلحت کیواسطے اُسنے اُسکو پیدا کیا ہے۔ متعصب دیندار لوگوں سے جو عقل کو زیادہ کار آمد شے مذہبی معاملات میں نہیں سمجھتے جب اِس مسئلہ نیکی و بدی کے وجود کے پیدا کرنے والے کی بابت سوال کیا جاتا ہے تو بسبب اسکے کہ خدا کو بدی کا پیدا کرنیوالا کہنے کو دل نہیں چاہتا اِس بارہ میں اپنی بالکل بے علمی ظاہر کرتے ہیں یا مشکل کو حل کرنے کیواسطے بدی کا موجود ہونا شیطان کے سر تھوپتے ہیں۔ اِس مضمون میں اگر چند پہلو سے بحث کیجائے اور مختلف خیال اہل الرائے کے اس بارہ میں بیان کئے جائیں تو واقفیتِ عام کے لحاظ سے دلچسپی سے خالی نہوگا۔

۱۔ تناسخ کا مسئلہ ہے کہ انسان کو دُنیا میں مختلف قسم کے تجربے حاصل کرنیکی غرض سے پیدا کیا گیا ہی اُسکی طبیعت میں میلان نیکی و بدی دونوں کی طرف رکھا گیا ہے۔ جب انسان بوجہ میلان بدی کے بدی کرتا ہے تو دوسرے جنم میں سزا اُسکی پاتا ہے یہان تک کہ بدی کا تجربہ حاصل کرتے کرتے اور نیکی کی طرف رجوع ہوتے ہوتے اُسپر ہزارہا برس گذر جاتے ہیں۔ اِس اثنا میں وہ بار بار مرتا ہے اور انسان کے رُوپ میں پیدا ہوتا رہتا ہے۔ یہان تک کہ اُسکی رُوح بدی کی کثافت سے پاک اور نیکی سے بہرہ مند ہوجاتی ہے۔ اِس طرح جب رُوح بالکل پاک ہوچکتی ہے تو انسان کامل ہوجاتا ہے۔ اُسکو اِسکے بعد دنیا کے تجربے کی ضرورت

نہیں رہتی اور اُسکا بار بار جنم لینا موقوف ہوجاتا ہے اور وہ اس سے بکنٹ یعنی بہشت میں جاتا ہے
یہ مسئلہ صحیح ہو یا غلط لیکن اسمیں اس بات کا کہ بدی کیوں پیدا کی گئی ہے صاف الفاظ میں جواب
دیا گیا ہے اور وہ یہ ہے کہ بدی کا پیدا کیا جانا لازمی ہے اسواسطے کہ انسان کو اُسکا تجربہ کرایا جائے
اور اُسکی فطرت کو جو اِس تجربے کے بغیر ناکامل رہ جاتی کامل کیا جائے۔

۲ — زرتشت کے مذہب کے موافق دُنیا میں دو اُصول یا فرشتے پیدا کئے گئے ہیں ایک آرمزد
یعنی اُصول یا فرشتہ روشنی و نیکی کا اور دوسرا اہرمن یعنی اُصول یا فرشتہ تاریکی و بدی کا۔
ان دونوں اُصولوں یا فرشتوں میں غلبہ پانے کیواسطے ہمیشہ جدو جہد رہتی ہے۔ دُنیا
کی موجودہ حالت نیکی و بدی کی اس جدو جہد کا نتیجہ ہے۔ کبھی آرمزد یعنی اُصول نیکی غالب
ہوتا ہے اور کبھی اہرمن یا اُصولِ بدی لیکن آخر میں اُصول نیکی غالب ہوگا اور اُصولِ بدی
دُنیا سے ناپید ہوجائیگا۔

۳ — تصوف۔ جو کتبِ مقدسہ کے باطنی معنی اور مغز پر نظر کرتا ہے اُسکا عقیدہ ہے
کہ دُنیا میں بُرائی کوئی چیز نہیں ہے۔ بلکہ جو چیز ہمکو بُری معلوم ہوتی ہے وہ ہمارے لئے
عین مفید اور بہتر ہے۔ اگر ہمکو دُنیا میں بدی معلوم ہو تو یہ ہماری جہالت کا سبب ہے
جبتک ہماری آنکھوں پر پردہ جہالت پڑا ہوا ہے اُسوقت تک ہمکو چیزیں نیک
و بد معلوم ہوتی ہیں۔ جب یہ پردہ اُٹھ جائیگا تو ہمکو ہر چیز نیک اور مفید معلوم ہوگی۔
خدا کا تعلق چونکہ مخلوقات کیساتھ پدری تعلق سے بدرجہا زیادہ ہے اور چونکہ خدا نہ
فقط ہر چیز پر قادر ہے بلکہ نیک اور رحیم بھی ہے اسلئے تصوف کا یہ مسئلہ کہ خدا نے اپنی
خلقت کیواسطے کوئی چیز بد نہیں پیدا کی نہایت قابل غور ہے۔ آگے چلکر ہم دیکھینگے کہ یہ
مسئلہ سائنس اور انسان کے عام تجربہ کے ساتھ کہانتک موافق ہے۔

۴ — دہریہ فلسفہ جسکا موجد عموماً ڈیوڈ ہیوم خیال کیا جاتا ہے اِس بات کا قائل ہے کہ اشیا
میں ہم جو ایک تعلق علت و معلول ہونے کا سمجھتے ہیں وہ تعلق درحقیقت اُن میں نہیں ہے

بلکہ ایک چیز کے کرنے سے ایک تاثیر یا حس پیدا ہوتی ہے اور ہم اُس چیز کو اُس تاثیر یا حس کا معلول سمجھتے ہیں۔ حالانکہ تاثیر یا حس ایک عارضی حالت ہے جو بیشک کسی چیز سے پیدا ہوتی ہے لیکن خود اُس میں اور اُس چیز میں کوئی نسبت نہیں ہے جس سے ہم کہہ سکیں کہ وہ چیز اُسکا باعث ہوئی ہے۔ مثلاً لکڑی جلانے سے آگ نکلتی ہے۔ جب ہم نے لکڑی کو جلایا تو آگ نکلی۔ اِس سے ہم کو یہ خیال بلکہ یقین ہوا کہ آگ کا باعث لکڑی ہے۔ لیکن لکڑی کی کوئی بھی صفت یعنی طول و عرض و موٹائی یا سختی وغیرہ آگ میں نہیں پائی جاتی۔ آگ اگرچہ لکڑی سے نکلتی ہے لیکن اُسکی صفات یعنی جلن۔ شرارہ وغیرہ لکڑی کی مذکورۂ بالا صفات سے بالکل مختلف ہیں۔ اِسیطرح زخم کو تلوار سے کچھ نسبت نہیں ہے۔ اگرچہ زخم تلوار سے لگایا گیا ہو۔ اسیطرح اور سب تاثیروں اور حسوں کا حال ہے۔ اِس مسئلے کے موافق کوئی چیز کسی اثر یا حس کا باعث یا معلول نہیں قرار پا سکتی۔

۵ — زمانۂ جہالت اور وحشی ہونے کی حالت میں انسان پیٹ بھرنے کیواسطے جانوروں کو پکڑ لیتا تھا اور غالباً اُن کو کچا کھا جاتا تھا۔ پیٹ کا بھرنا تقاضائے فطرت تھا۔ دن میں آفتاب سے روشنی پاتا تھا لیکن رات کو بھوتوں کیطرح تاریکی میں دبک جاتا تھا۔ آج ہم خیال بھی نہیں کر سکتے کہ انسان بغیر روشنی کے کیونکر گذارہ کرتا ہوگا۔ لیکن غالباً اُسکی پہلی حالت جنگلی جانوروں کی سی رہی ہے۔ ایک مدت بعد جب انسان نے دو پتھروں کو آپس میں رگڑا تو اُن میں سے شرارہ آگ کا نمودار ہوا۔ اب آیندہ انسان کے تاریکی میں دبکنے کی ضرورت نہ رہی۔ جب آفتاب اپنی دن بھر کی مسافت طے کرکے شام کو چھپ جاتا ہے تو انسان اُسکی جگہ رات کو ایکدوسرا چھوٹا سا آفتاب یعنی چراغ روشن کر لیتا ہے جسوقت چاہتا ہے آگ جلا کر اندھیرے میں اُجالا کر لیتا ہے۔ آگ کی ماہیت ظاہر ہونے اور اُسکے پتھر سے نکلنے نے کسقدر فرق انسان کی زندگی میں کر دیا۔ آگ کی مدد سے انسان بجائے کچا گوشت کھانے کے شکار کو بھونکر کھانے لگا۔ اور رفتہ رفتہ

پکاکر۔ آگ پہلی چیز ہے جسنے انسان کی زندگی حیوان کی زندگی سے جُدا کردی۔ لیکن بجاے یہ فائدے اُٹھانے کے اگر انسان آگ کے شرارے کو دیکھکر ڈر جاتا اور خیال کرتا کہ یہ کوئی مُضر چیز ہے جو مجکو نقصان پہونچائیگی تو وہ کسقدر حماقت کرتا۔ اپنے خوف و جہالت کی وجہ سے آگ کے فوائد سے وہ محروم رہتا۔ غالباً ہزاروں برس انسان آگ سے نفقط کھانے پکاتا اور اشیاء کو گرم کرتا رہا۔ اُسکو خیال بھی نہ تھا کہ آگ سے کچھ اور فوائد بھی حاصل ہوسکتے ہیں۔ مدّت دراز نہیں گذری کہ انسان کو آگ کا ایک اور بڑا فائدہ معلوم ہوا۔ وہ یہ کہ اُسکے ذریعے سے سٹیم یعنی بھاپ بنانے لگا جسکی طاقت سے ریل گاڑی و دُخانی جہاز اور ہزاروں دوسری کلیں چلتی ہیں۔ پہلے جو کام آدمی ہاتھوں سے ہفتوں اور مہینوں میں کرتے تھے وہ گھنٹوں اور دنوں میں ہونے لگے۔ سفر اور اُسکی صعوبت کچھ چیز نہ رہی۔ اور کلیں ایسی سُرعت سے کام کرنے لگیں کہ دستکار کاریگر اُنکے آگے عاجز و ناچار ہوگئے۔ پس کسقدر فرق عظیم انسان کی زندگی و آسایش میں محض اس ایجاد کے ہونے سے ہوا۔ ناظرین باقی اشیا و ایجادات کو اسی پر قیاس کرسکتے ہیں۔ اب اگر کوئی یہ کہے یا پہلے کہتا کہ آگ بُری چیز ہے اور وہ ہاتھ کو جلا دیتی ہے تو کیا اُسکی جہالت اور حماقت نہیں؟۔ آگ بیشک اُسکے خواص کی ناواقفیت کے سبب نقصان کرتی ہے۔ لیکن اگر ہم اُن خواص سے واقفیت رکھتے ہیں تو وہ ہماری ہو کر خدمت کو طیار رہے۔ کیا اس بحث سے تصوف کے مسئلے کی تصدیق نہیں ہوتی کہ جہالت کے باعث اشیاء بد معلوم ہوتی ہیں ورنہ سب اچھی اور مفید ہیں؟۔ اگرچہ معلوم ہوتا ہے کہ تصوف کا دعوےٰ یہ ہے کہ پردہ اُٹھنے سے اشیا کو انسان نہ فقط اُن کی تاثیروں سے بلکہ اپنی آنکھوں سے اچھا دیکھتا اور پاتا ہے لیکن ہم اس پردے کو جہالت اور بے علمی کا پردہ سمجھتے ہیں۔ اگر آگ نقصان کرتی ہے تو ہماری ناواقفیت اور بے احتیاطی کی وجہ سے اور جب ہم اُسکے خواص سے واقف ہوجاتے ہیں اور علم کے ساتھ اُس سے کام لیتے ہیں

توبجائے نقصان کے فائدے کا باعث ہوتی ہے۔ آگ سے روشنی کا کام لینے اور سٹیم بناکر کلیں چلانے کی ہمکو پہلے ذرا بھی خبر و اُمید نہ تھی۔ اسیطرح اگر کوئی اور نئی ایجاد آگ کے فوائد کے متعلق معلوم ہوجائے جس سے مذکورہ بالا فائدوں سے بھی زیادہ فوائد دُنیا کو پہنچیں تو بعید از قیاس نہیں۔ بالکل ممکن ہے کہ کوئی اور ایجاد ایسی ہو جس سے آگ کے نقصان بہت ہی کم ہو جائیں۔

۶ — دُنیا میں ایسی چیز تو کوئی نظر نہیں آتی جو بُری ہی بُری ہو اور جس میں کچھ بھی فائدہ کسی طرح کا نہو۔ ہمیشہ یہی دیکھا جاتا ہے کہ اگر کوئی چیز ایک طرح پر نقصان پہونچاتی ہے تو دوسری طرح پر فائدہ بھی دیتی ہے۔ اور فائدہ پہونچانا ہی اُسکی پیدائش کا مقصدِ اصلی ہے۔ اسلئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اشیا نسبتاً بُری ہیں نہ اصلاً۔ اکثر دیکھا جاتا ہے کہ جو چیز ایک آدمی کی خوراک ہے وہ دوسرے کے لئے زہر کا کام دیتی ہے۔ ببول پر ہاتھ مارنے سے کانٹا ہمکو چبھتا ہے لیکن اُسکا چبھنا ہی ببول کی حفاظت کا باعث ہوتا ہے۔ نیز ہزاروں فائدے اِن کانٹوں سے ادویات کی شکل میں انسان اور جانوروں کو پہونچتے ہیں جو خود ببول سے حاصل نہیں ہوسکتے۔ اصل یہ ہے کہ ہر چیز اپنے موقعہ اور طبیعت کے موافق ہونے پر فائدہ دیتی ہے۔ اور اُسکے برعکس نقصان نیز ہر نعمت کے حاصل کرنے کے لئے ایک تکلیف بھی اُٹھانی ضرور ہے تاکہ انسان اُس نعمت کی قدر کرے۔ انسان پر تکلیف و محنت کا اثر بسبب اپنی ناگواری کے۔ خوش گوار اثرات کی نسبت زیادہ دیرپا ہوتا ہے۔ اور کانٹے سے ایذا اُٹھانا پھول کی قیمت کو بڑھاتا ہے۔ اور حقیقت میں کانٹے کا چبھنا ہی پھول کے حاصل ہونیکا باعث ہوا ہے۔ ایسی صورت میں ہم کانٹے کو بُری چیز کیونکر کہہ سکتے ہیں۔

۷ — اگر ایک چیز سے ہمیشہ نیک یا بد نتیجے پیدا ہوا کرتے تو ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے کہ وہ چیز اچھی یا بُری ہے۔ لیکن اگر اُس سے ایک وقت میں ایک اچھی تاثیر ظاہر ہو اور دوسرے وقت میں بُری۔ تو ایسی حالت میں ہم اُسکو نیک جانیں یا بد؟ سنکھیا ایک حالت میں باعث شفا کا

ہوتا ہے اور دوسری میں ہلاکت کا۔ اب چونکہ ہر دو تاثیریں سنکھیے سے ظاہر ا پیدا ہوئی ہیں اسواسطے اُسکو محض مفید یا مضر خیال نہیں کر سکتے۔ اِس سے ظاہر ہے کہ محض مضر کوئی چیز نہیں۔ بلکہ ناواقفیت یا بُرے استعمال سے مضر ہو جاتی ہے۔ سنکھیے کو طبیب حسب ضرورت استعمال کرنے سے اچھے نتایج پیدا کر سکتا ہے۔ اور عطائی ناواقف آدمی بُرے۔ پس بہت سے نیک یا بد نتایج استعمالِ اشیا پر موقوف ہیں۔ اب ہی یہ بات کہ جس چیز سے ذرا بھی نقصان پہونچ سکتا ہے اُسکو خدا نے پیدا ہی کیوں کیا؟ پیدا اسواسطے کیا کہ اُس سے بہتر رستہ اُس چیز سے فائدہ پہونچانیکا نہ تھا۔ جب ہمکو سنکھیا کے مناسب استعمال سے بہت سے فائدے حاصل ہو سکتے ہیں تو کیا اس خیال سے کہ کبھی کبھی سنکھیا ضرر بھی کرتا ہے اُسکے فوائد سے محروم رکھا جائے؟ کون نہیں جانتا کہ سٹیم سے بعض وقت کلیں وغیرہ پھٹ جاتی ہیں۔ ریل گاڑیوں میں تصادم ہو جاتا ہے اور بہت مال اور جانیں تلف ہو جاتی ہیں لیکن کیا نقصان کا خوف ہمکو سٹیم کے فائدوں سے روک سکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ ایسے حوادث کبھی کبھی ہماری غلطی سے واقع ہو جاتے ہیں جن کے رفع کرنے کی ہمکو کوشش کرنی چاہیے۔ پس بہترین طریقہ جو اشیا سے فائدہ اُٹھانے اور اُن کے ضرر سے بچنے کا ہو سکتا تھا وہ خدا نے انسان کو بتلایا۔ اشیا کا اُسنے میلان نفع رسانی کی طرف رکھا اور انسان کو اُن سے فائدہ پانے کا علم اور ضرر سے بچنے کی قدرت دی۔ اسکے سوا چیزوں کا مضر ہونا بھی ہمارے لئے تعلیم و نصیحت سے خالی نہیں۔ کانٹے کی ایذا کا خیال ہمکو خواہ مخواہ پھولوں میں ہاتھ ڈالنے سے روکتا ہے اور پھولوں کی حفاظت کا باعث ہوتا ہے۔ اگر بچپن وغیرہ میں ہمکو آگ سے جل جانیکا تجربہ حاصل نہ ہوتا تو ممکن ہے کہ ہم زیادہ نقصان اُس سے کسیوقت اُٹھاتے۔ پس موجودہ انتظام عالم کا بہترین ہے۔ اور اس سے بہتر ہو نہیں سکتا۔

۸ — خدا چونکہ نہ فقط رحمٰن و رحیم ہے۔ بلکہ قادر بھی ہے۔ پس اپنی مخلوقات کیواسطے اُس نے محض بد چیز کیوں پیدا کی ہوگی؟ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ اشیا مضر یا بد کیوں پائی جاتی ہیں

اور بتایا ہے کہ وہ فی نفسہٖ بُری نہیں ہیں بلکہ غلط استعمال کرنے یا اُنکی تاثیرات وصفات کو درست طور پر نہ سمجھنے سے وہ ہمکو بُری معلوم ہوتی ہیں - اب ہم یہ بیان کرنا چاہتے ہیں کہ خدا چونکہ نیک اور قیام ہے - اسواسطے ضرور ہے کہ کوئی چیز بد اور ضرر رساں بھی ہو - نیکی اور بھلائی کو ہم تب ہی سمجھ سکتے ہیں جب کسی بد اور بُری چیز سے ہم واقف ہوں - اشیا صرف متضاد ہونے سے پہچانی جاتی ہیں - یعنی نیک سے بد اور بد سے نیک کا امتیاز ہوتا ہے - جبتک کسی شے کی ان متضاد صفات کا ہمکو علم نہو تو ہم اُسکو نہ نیک جان سکتے ہیں نہ بد - ہمارا علم اُسکے متعلق کچھ بھی نہیں ہوتا پس اسواسطے کہ انسان کو صفاتِ نیکِ الٰہی کی خبر ہو ضرور ہوا کہ خدا بدی کو بھی پیدا کرے - پھر جو چیز کہ بد ہے خدا نے اُس سے بچنے کے لئے ایک عادت گناہ سے بچنے اور نیکی کی طرف رجوع کرنے کی ہماری فطرت میں پیدا کر دی ہے - شہوات کے غلبے سے انسان گناہ کرتا تو ہے لیکن بد سے بد انسان بھی گناہ کرتے ہی فوراً پچھتاتا ہے - گناہ کر کے پچھتانا اور نیکی کی طرف رجوع کرنا بدرجہا بہتر ہے اِس سے کہ انسان گناہ کرنا جانتا ہی نہو - ایسی حالت میں بوجہ گناہ سے ناواقف ہونے کے انسان نیک ہونے پر مجبور ہوتا - اور بسبب نہ جاننے گناہ یا بدی کے وہ نیکی کی اصلی قدر نہیں کر سکتا تھا اور اُسکی نیکی کسی وقعت کے لائق نہوتی ؟ جس چیز کیواسطے ہم نے کبھی کوشش نہ کی ہو اور نہ تکلیف اُٹھائی ہو اُسکے کرنے میں نہ ہمکو مزا آ سکتا ہے اور نہ دوسروں کی تعریف کے ہم مستحق ہو سکتے ہیں - بے شک آزمایش اور امتحان ناگوار چیزیں ہیں اور آزمایش میں انسان پاک نہیں نکل سکتا - لیکن اگر انسان بے گناہ ہوتا اور آزمایش میں صاف نکل سکتا تو پھر خدا غفور و رحیم کسطرح کہلاتا - جب ایک شخص نے گناہ ہی نہیں کیا تو پھر اُسکو بخشش کی کیا ضرورت ہے ؟

۹ -- انسان کے دل کو خدا نے ایسا بنایا ہے کہ بعض وقت نہایت کمزور ثابت ہوتا ہے - اور بعض وقت نہایت مضبوط - شہوات اور نفسِ امارہ اگرچہ اُسکو حیوانیت کی طرف کھینچ رہے ہیں لیکن اُسکے دل کو عالمِ بالا کی طرف کشش ہے - جہاں انسان دس مرتبہ نفس سے

سبب گناہ کرتا ہے تو وہاں کم از کم ایکدفعہ عقل کے سمجھانے کو مان لیتا ہے۔ رفتہ رفتہ نفس کے پنجے سے بری اور عقل و دل کی رہبری میں آجاتا ہے۔ جب دل ایکدفعہ درحقیقت مضبوطی اور کمال حاصل کرلیتا ہے پھر خود اپنے نفسانی وجود سے بھاگنا چاہتا ہے۔ اُسکو معلوم ہے کہ اُسکی اصل عالم ارواح ہے۔ اور وہیں اُسکو حقیقی خوشی حاصل ہوسکتی ہے۔ پس کیا یہ نفع کہ دل و عقل جہاں کی بدی کے تجربہ سے اپنی اصلیت کی طرف رجوع کریں اسقدر بڑا نہیں کہ اُس کے حاصل کرنے کیواسطے بدی کو جہان میں پیدا کیا جائے۔ انسان کے دل کا کامل ہوجانا کچھ کم نفع نہیں ہے۔ اور یہ نفع فقط بدی ہی کے موجود ہونے سے حاصل ہوسکتا ہے۔

(خواجہ علی محمد از انبالہ)

# جدید تعلیم کی طرف سے معذرت

کس نیاموخت علم تیر از من ؎ کہ مرا عاقبت نشانہ نہ کرد

ہمارے دوست سید اکرام عالم بی۔ اے۔ نے دسمبر کے عصر جدید میں تعلیم جدید کے عیوب پر ایک نہایت عجیب مضمون لکھا ہے۔ اگرچہ عصر جدید میں اس قسم کے انوکھے اور بھی بعض مضامین شائع ہوئے ہیں جنکے دلائل میں ایک خاص قسم کی لاجک (منطق) سے کام لیا گیا ہے لیکن یہ مضمون بالتخصیص تعجب خیز اسوجہ سے ہمکو معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک ایسے گریجوایٹ کے قلم سے نکلا ہے جسنے چار سال تک مدرسۃ العلوم علیگڈھ میں تعلیم پائی ہے۔ شہرت اور قبولیت عام حاصل کرنے کا شوق کم و بیش بنی نوعِ انسان کی ہر فرد میں پایا جاتا ہے اور یہی سریع الہیجان مادہ اکثر اوقات اقوام عالم میں نہایت عظیم الشان کاموں کی تحریک کا باعث ہوا ہے جسکی نسبت لسان القوم مولٰنا حالی نے نہایت لطیف پیرایہ میں اسطرح فرمایا ہے ؎

یہی طالبِ شہرت و نام لاکھوں ؎ بنا دیتے ہیں قوم کے کام لاکھوں

لیکن طلبِ شہرت اُسی حد تک غیر مذموم ہے کہ جہانتک وہ قومی مقاصد اور اغراض کی راہ

میں روڑا نہ اٹکائے۔ ورنہ ایسی شہرت سے گمنامی اور ایسی نام آوری سے بدنامی ہزار درجہ بہتر ہے۔ اگر تھوڑی دیر کیواسطے یہ مان لیا جائے کہ جو بدنما تصویر تعلیم جدید کی ذیعلم مضمون نگار نے پیش کی وہی اُسکا صحیح اور اصلی مرقعہ ہے تو تقریباً تیس ۳۰ سال سے جو کوشش سید احمد خاں مرحوم اور دیگر مُصلحانِ قوم نے مسلمانوں کی بہبودی اور ترقی کیواسطے کی ہے وہ اُن کے حق میں سخت مضرت رساں اور نقصان دہ ثابت ہوگی اور یہ لوگ جو آجتک مُحبّانِ قوم کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں اعدای قوم کے لقب سے مخاطب ہونے کے لائق قرار پائینگے۔ اور اگرچہ سرکاری مدارس کو بند کرنا ہمارے قبضۂ اختیار سے باہر ہے۔ لیکن مدرسۃ العلوم علیگڈھ۔ اسلامیہ کالج لاہور اور مسلمانوں کے اور کالج اور اسکولوں کو فوراً بند کرنا ہمارا قومی فرض ہوگا۔ منجملہ اُن کی ایک امپور سٹیٹ ہائی اسکول بھی بند کرنا پڑیگا جس میں ہمارے دوست سید اکرام عالم سکنڈ ماسٹر ہیں۔ اور بجائے اِن کالجوں اور اسکولوں کے قومی سرمایہ سے کچھہ سماع خانہ کچھہ فارسی عربی کے پرانی قسم کے مدرسے جنمیں سے۔

طریق ترجمہ اتبک وہی ہو اُوٹ پٹانگ ✣ پڑھیں جو لڑکے تو ہل ہل کے اور پکار پکار
سماں وہ جسمیں کھچا کھچ بھرے ہوئے لڑکے ✣ ہے جیلخانے کی مانند تنگ و تیرہ و تار

اور چند امام باڑے قائم کئے جائیں تب ذی علم مضمون نگار کے معیار کے مطابق مسلمانوں کا تنزل اور ادبار دُور ہو اور وہ ترقی اور عروج کے اعلٰے منازل پر چڑھتے نظر آئیں سچ ہے۔ ع فکرِ ہرکس بقدرِ ہمتِ اوست۔ ہمارے دوست سید اکرام عالم جس شاخ پر خود بیٹھے ہوئے ہیں اُسی کے کاٹنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اُن کو یاد رکھنا چاہیئے کہ اگر وہ شاخ کٹکر گر پڑی تو وہ خود بھی بغیر چوٹ کھائے ہوئے نہیں رہ سکتے۔ جو شاعرانہ الزام اُنھوں نے تعلیم جدید پر لگائے ہیں اگر وہ صحیح ہوں تو ہمارے دوست کو بھی اپنا دامن بغیر دھبّے کے چھٹانا مشکل پڑ جائیگا۔ ع۔ میری رُسوائی ہوئی تو کسکی رسوائی ہوئی۔ اِسقدر تمہید کے بعد ہم اصل مضمون کی طرف توجہ کرتے ہیں۔ یہ امر خاص طور پر قابلِ لحاظ ہے کہ ذی علم مضمون نگار نے اپنے مضمون کی سُرخی "جدید تعلیم کا ناقص اثر"

قائم کی ہے لیکن فوراً ہی اُنھوں نے تعلیم کے ساتھ نئی تہذیب کو (جس سے غالباً اُن کی مراد مغربی طرزِ معاشرت ہے) مخلوط کر دیا ہے گویا جدید تعلیم اور مغربی طرزِ معاشرت اُن کے خیال میں مُرادف الفاظ ہیں حالانکہ جدید تعلیم اور مغربی طرزِ معاشرت دو بالکل جُداگانہ چیزیں ہیں۔ نہ یہ الفاظ مُرادف ہیں۔ اور نہ اِن دونوں میں لازم و ملزوم کی نسبت ہے اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اہل قلم بات کی پیچ میں اپنے موضوع کو چھوڑ کر دوسری چیز کو ثابت کرنا شروع کر دیتے ہیں اور آخر میں اُن غلط قضیوں سے اپنے حسبِ منشا نتیجہ نکال کر رکھ دیتے ہیں۔ بہرحال ہمارے ذیعلم دوست نے بزعمِ خود جو معترضیں جدید تعلیم کیطرف منسوب کی ہیں اُن میں سے ہر ایک پر جداگانہ ہم بحث کرینگے اور تعصب اور مبالغے کے باٹوں کو اُن کی میزانِ عدل سے اُتار کر انصاف کے ہاتھوں سے ترازو اُٹھا کر برابر تولنے کی کوشش کرینگے۔

**اسراف** باوجود پُرانی سوسائٹی کے اسرافِ بیجا سے آگاہی کے اِدّعا کرکے ذی علم مضمون نگار کا نئی تعلیم پر اسراف کا الزام لگانا نہایت حیرت انگیز ہے۔ نئی تعلیم یافتہ لوگوں پر ہمارے دوست قیمتی پوشاک پہننے۔ مکان میں عمدہ فرنیچر رکھنے اور سکنڈ اور فرسٹ کلاسوں میں سفر کرنیکا الزام لگاتے ہیں۔ اور اِنہی اخراجات کو اسراف سے تعبیر کرتے ہیں۔ کسیقدر بیش قیمت لیکن مضبوط پوشاک پہننا۔ دو چار میز کرسیاں خرید کر مکان میں رکھ لینا یا ایک دو خوشنا لیمپ اور گلدستے لگا لینا ہرگز کسی قوم کے افلاس اور تباہی کا باعث نہیں ہو سکتے۔ جسقدر کہ ہمارے خاندانوں میں شادی اور غمی کی تقریبیں اور بدعت اور باطل پرستی کے جلوے افلاس پیدا کرتے ہیں۔ ایک متوسط حیثیت کا جدید تعلیم یافتہ نوجوان تمام عمر میں اپنی آوٹ فٹ (                    ) درست کرنے میں جسقدر روپیہ صرف کرتا ہے اُس سے کئی گنا زیادہ ایک غریب آدمی کی بیٹی کی شادی۔ بیٹے کے ختنے۔ پوتے کی بسم اللہ اور نواسے کے عقیقے میں قرض لیکر صرف کر دیا جاتا ہے۔ بڑے پیر صاحب کی گیارہویں۔ شب برات کا حلوہ۔ شیخ جلال بخاری کے کونڈے۔ مولود کی محفلیں اور محرم کی مجالس اسپر مستزاد ہیں۔ اور یہ مصارف عموماً ہر خاندان میں عالم گیر مرض کیطرح

پائے جاتے ہیں جنکا کچھ انسداد تعلیم جدید اور نئی تہذیب نے کیا ہے اور ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ اخراجات کا بار جو کچھ نئی تعلیم یافتہ نوجوان پر پڑتا ہے وہ محض خاندان کی اُن دیرینہ مراسم کے ادا کرنے میں پڑتا ہے نہ اپنے کوٹ پتلون اور کف کالر کے درست رکھنے میں۔ جو کچھ خرابی باقی ہے وہ پُرانی قیود کی پابندی کا نتیجہ ہے نہ کہ جدید طرزِ معاشرت اختیار کرنے کا۔ پس ہمارے دوست کو چاہیئے کہ بجائے زمانے کی رفتار کے خلاف چلنے کی صلاح اور سمندر کے بہاؤ کے خلاف چڑھنے کا مشورہ دینے کے پُرانی مراسم کو ترک کرانے میں اپنے معزز دوست اور عصرِ جدید کے قابل اڈیٹر خواجہ غلام الثقلین صاحب بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی۔ وکیل ہائی کورٹ سکرٹری صیغۂ اصلاح تمدن محمدن ایجوکیشنل کانفرنس وغیرہ کا ہاتھ بٹائیں۔ قطع نظر اِسکے ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ مخمل یا بنارس کی کمخواب کے انگرکھوں اور چغوں کامدار اور لیس دار ٹوپیوں اور کشمیری شالوں اور جامہ واروں سے نئی تعلیم یافتہ نوجوانوں کے کشمیرے۔ سرج اور ٹوئل کسطرح زیادہ قیمتی ہو سکتے ہیں۔ یا ایک کمرے کو دری۔ چاندنی۔ جاجم اور قالین کے بجائے میز کرسی سے آراستہ کرنمیں کیوں زیادہ صرف ہوسکتا ہے۔ غالباً باریک شبنم یا ململ کے آٹھ کرتے بمشکل اتنے دنوں کو کفایت کرینگے جتنے عرصے کیلئے ٹوئل کے چار قمیص بہ آسانی کافی ہو سکتے ہیں حالانکہ باعتبار قیمت کے غالباً شبنم اور ململ ٹوئل سے زیادہ گراں ہوتی ہے اسیطرح چکن یا ریشم کا انگرکھا زیادہ دامونمیں تیار ہوتا ہے بہ نسبت ڈبل زین یا ہوم اسپن کے کوٹ اور شیروانی کی اور بہ اعتبار مضبوطی کے وہ کسیطرح اِن کے ہم پلہ نہیں ہو سکتے۔ پھر ہم نہیں سمجھ سکتے کہ نئی تعلیم نے کونسے جدید مصارف بڑھا دیے ہیں۔ جنکے ہمارے دوست اِسقدر شاکی نظر آتے ہیں۔ ہاں اگر کچھ جدید تعلیم نے کیا ہے تو وہ یہ ہے کہ رقص و سرود کی مجلسوں کو جو باستثنائے معدودے چند کے پُرانے زمانے کے نوجوانوں کے لوازمِ زندگی میں داخل تھیں کم کرا دیا ہے۔ بٹیر بازی۔ مُرغ بازی بلبل بازی۔ کبوتر بازی۔ پتنگ بازی۔ وغیرہ مخربِ اخلاق تفریحوں کو روک دیا ہے۔ اگر ہمارے دوست کے خیال میں اِن امور کو روک کر سکنڈ کلاس میں سال میں ایک دو مرتبہ سفر کرنا اسراف میں داخل ہے تو ضرور جدید تعلیم اسراف پھیلانے کی گنہگار ہے۔ البتہ جو کچھ نقص ہے وہ پُرانی طرزِ معاشرت

کے باقی رہنے کا ہے اُسکو مٹانے کی کوشش کرنا چاہیے۔ بجاے اسکے کہ جو عمدہ خصائل مثل صاف کپڑے پہننے ۔ روز غسل کرنے ۔ مکان کو صاف رکھنے کے جدید تعلیم نے ہمکو سکھائے ہیں اُن کو مٹانے کی کوشش کیجائے ۔ آپ سمجھتے ہیں کہ تیس چالیس روپیہ ماہوار پانیوالا ایک ریلوے گارڈ زیادہ صفائی ۔ نفاست ، اور فارغ البالی کے ساتھ بسر کرتا ہے بہ نسبت ایک بڑے گاؤں کے ہندوستانی زمیندار کے ۔ پس کیا وجہ ہے کہ مغربی طرزِ معاشرت کے ساتھ ایک گارڈ تیس چالیس روپیہ میں عمدہ طور سے بسر کر سکے اور اُسکو کوئی مُسرف نہ کہے ۔ اور ہندوستان کے جدید تعلیم یافتہ نوجوان اُسی قسم کا طرزِ معاشرت اختیار کرنے کے جرم میں اسراف کے قصور وار ٹھیرائے جائیں ۔ سچ ہے جب کسی کے بُرے دن آتے ہیں تو اُسکی اچھی باتیں بھی لوگوں کو بُری معلوم ہوتی ہیں ۔

**پُرانی سوسائٹی سے مغائرت** ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ پُرانی سوسائٹی سے ذی علم مضمون نگار کی کیا مراد ہے ۔ اگر اس سے درحقیقت اُن کی مُراد پُرانے فیشن کے نوجوانوں کی ایسی سوسائٹی اور مجالس ہیں جنکا ہم اوپر ذکر کرچکے ہیں اور عام طور پر پُرانے طرز معاشرت کے نوجوان اسی رنگ میں رنگے ہوتے ہیں ۔ تو ہم بآوازِ بلند کہتے ہیں کہ تعلیم جدید نے ایسے مخرب اخلاق سوسائٹی سے ضرور مغائرت پیدا کردی ہے اور ہم اس مغائرت اور علیحدگی کو اپنے حق میں خدا کی رحمت خیال کرتے ہیں جو ایسی مغائرت سے متنفر ہیں وہ شوق سے جائیں پُرانی سوسائٹی میں رسوخ اور باریابی اُن کو مُبارک ہو ہمارا تو ایسی پُرانی سوسائٹی کو دُور ہی سے سلام ہے ۔ رہے ہمارے اور قوم کے بزرگ اور روشن خیال حضرات سو کوئی ایمانداری کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ نیو لائٹ نے کبھی اُن کی خدمت میں حاضری کو سواے سعادتِ دارین کے دوسری نگاہ سے دیکھا ہو جسکی شہادت ندوۃ العلما کے جلسے اور اُسکی رُکنِ رکین مولنا شاہ سلیمان اور لکھنؤ کے جناب مجتہد صاحب قبلہ دے سکتے ہیں ۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ بزرگوں اور نئی عمر کے لڑکوں کا زیادہ اختلاط اور میل جول نہ مناسب ہے اور نہ ہوسکتا ہے ۔ اور یوں تو نئی تعلیم یافتہ نوجوانوں کے لیڈر اور مقتدا خود پُرانے زمانے کے بزرگ ہیں جنکے ہاتھوں میں اسوقت تمام قومی کاموں کی پرداخت اور تعلیم جدید کی اشاعت ہے جس میں نئی تعلیم یافتہ بجز انکے اتباع

سے کچھ نہیں کرتے۔ اسپر بھی پرانی سوسائٹی سے منافرت کا الزام لگانا سوائے ہٹ دھرمی اور ادعا فہمند کے اور کیا ہو سکتا ہے۔

**خود بینی اور تکبر** ذی علم مضمون نگار کو خود یہ بات تسلیم ہے کہ تکبر اور خود بینی یا اسی قسم کی اور خراب عادات نیم پڑھی یعنی ادھوری تعلیم کے لوگوں میں پائے جاتے ہیں۔ پھر تعجب ہے کہ وہ بجائے تعلیم کی کمی کو پورا کرنے کی صلاح دینے کے تعلیم جدید پر کیوں متکبر اور خود بیں بنانے کا بیجا الزام لگاتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ خودداری اور خود بینی میں امتیاز کرنا ذرا دشوار کام ہے۔ اور یہ بہت ممکن ہے کہ بعض اوقات نئی عمر کے نوجوان خودداری کے حدود سے تجاوز کر کے خود بینی کے احاطے میں قدم رکھ دیتے ہوں لیکن ہر ایک معقول آدمی غالباً اس بات کو تسلیم کریگا کہ نوکروں سے مذاق کرنے محلے کے رذیل لونڈوں کی صحبت میں بیٹھنے اور بازاروں میں چہل اور مذاق کرتے پھرنے سے خود بینی بھی ایک گونہ قابلِ ترجیح ہے۔ قطع نظر اسکے یہ امر مسلم ہے کہ اس قسم کی خفیف عادات کا ظہور کم عمر کے طالبعلموں سے ہوتا ہے۔ پس بچوں کی بات کو بتنگڑ بنا کر اس کی وجہ سے جدید تعلیم پر ایک بدنما داغ لگا دینا نہایت شرمناک بات ہے۔

**شراب خوری** اس قسم کا ناپاک الزام خاصکر نئی تعلیم یافتہ مسلمانوں پر بغیر علم اعداد سے ثابت کئے ہوئے لگانا ضرور غیر قابلِ معافی دلیری اور جسارت کا کام ہے۔ کوئی شخص اس بات کو ثابت نہیں کرسکتا کہ شراب خوری کی ناپاک عادت جدید تعلیم یافتہ مسلمانوں میں پرانے فیشن کے لوگوں سے زیادہ پائی جاتی ہے۔ اصل یہ ہے کہ اس قسم کی خرابیاں مذہبی تعلیم کے فقدان سے پیدا ہوتی ہیں نہ کہ جدید تعلیم کی ترویج سے۔ ورنہ اسکے یہ معنی ہونگے کہ جدید تعلیم کا اثر قرآنِ پاک کی آسمانی تعلیم پر غالب آجاتا ہے نعوذ باللہ من ذٰلک۔ مذہبی تعلیم کا نہ ہونا ہمیشہ مناہی کی کثرت کا باعث ہوتا ہے۔ اس زمانے میں خاصکر مسلمانوں کو مذہبی تعلیم کے ضروری اجزا کو پھیلانے کی سخت ضرورت ہے اور بجائے چند پرانے خیالات کے لوگوں کو خوش کرنے اور اپنا گرویدہ بنانے کے لالچ میں انگریزی تعلیم کی عیب جوئی کرنے کی جسکا روکنا سمندر کے بہاؤ کا روکنا ہے ہر دردمند مسلمان کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنے اہل قوم کو مذہبی

تعلیم کے پھیلانے اور خاصکر بچوں کیواسطے اُسکی پابندی لازمی کرانیکی کوشش کرے ورنہ یوں تو شہر انجوری کاالزام خلفائے عباسیہ کے ہر حکمران پر جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں سے بیس گُنا زیادہ لگایا جا سکتا ہے لیکن ایسے الزام ہمیشہ بجائے کسی قسم کی اصلاح پیدا کرنیکے منافرت اور مخالفت کا باعث ہوتے ہیں

**نوکری کو تمام پیشوں پر فضیلت دینا**

ہمکو خواہ مخواہ ذی علم مضمون نگار کی ہر بات کو رد کرنا اور محض مخالفت کی غرض سے اختلاف کرنا منظور نہیں ہے۔ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ یہ عیب ضرور ایک حد تک جدید تعلیم یافتہ مسلمانوں میں بالتخصیص پایا جاتا ہے لیکن اُسکی بڑی وجہ مسلمانوں میں سرمایہ کی کمی اور باہمی نفاق ہے۔ علاوہ اِسکے مسلمان عرصۂ دراز تک حکمران اور نوکری پیشہ قوم رہنے کیوجہ سے فطرتاً تجارت سے اجنبی ہوگئے ہیں لیکن ابھی مسلمانوں کو اپنے تنزل کا احساس کئے ہوئے کے دن ہوئے ہیں رفتہ رفتہ یہ تمام خرابیاں دُور ہو جائینگی۔ صنعتی اسکول بنانے اور تجارت کی طرف ترغیب دینے کی آوازیں بلند ہو چلی ہیں۔ اور ہمیشہ ہر بڑا کام رفتہ رفتہ ہوتا ہے۔ رُوم ایک روز میں تعمیر نہیں ہوگیا تھا۔ مصرعہ۔ بہ مطلب میرسد جویای کام آہستہ آہستہ۔ ہمارے دوست کا یہ الزام گو ایک گونہ صحیح ضرور ہے مگر مسلمانونکیواسطے اسکے قبل از وقت ہونمیں شبہ نہیں ہو سکتا۔

**دیگر ممالک کی ساختہ اشیا کا استعمال**

یہ محض اقتضائے زمانہ ہے اور فطرتِ انسانی کا خاصہ ہے کہ ہر نئی چیز اُسکو بھلی معلوم ہوتی ہے۔ کُلُّ جَدِیْدٍ لَذِیْذٌ عرب کی پُرانی ضرب المثل ہے۔ جدید یا قدیم تعلیم کو اس سے کچھ تعلق نہیں جن لوگوں نے انگریزی کی الف۔ بے بھی نہیں پڑھی وہ انگریزی دانوں سے زیادہ ولایتی اشیا کے گرویدہ پائے جاتے ہیں۔ یہانتک کہ مسجدوں اور خانقاہونکی آرایش بھی انگلینڈ اور جرمن کے کارخانوں سے کیجاتی ہے۔ جب ہندوستان کی تجارت کو ترقی ہو گی اور ہر قسم کی عمدہ اشیا یہاں بھی جاپان کی طرح تیار ہونے لگینگی تو بجائے اسکے کہ ہم دوسرے ملکوں کی اشیا کا استعمال کریں دوسرے ملک والے ہمارے ملک سے مال لیجائینگے۔

**قبل از وقت پولیٹیکل آزادی کی خواہش**

شکر ہے کہ عموماً مسلمان اِس الزام سے بری ہیں اور جسقدر پولیٹیکل تحریک مسلمانوں میں پیدا کرنے کی کوشش کیگئی ہے اُسکی نسبت بجائے قبل از وقت ہونے کے بعد از وقت

کتنا زیادہ موزوں ہوگا۔ لیکن یہ پولیٹیکل حقوق کی حفاظت ہے۔ نہ طلب آزادی۔ البتہ یہ الزام ایک حد تک حامیانِ کانگریس پر لگایا جاسکتا ہے۔ جسکے جوابدہ وہ خود ہیں۔ خال خال مسلمان جو اُن کے ہمصفیر ہوں وہ اَلشَّاذُّ کَالْمَعْدُوْمِ کا حکم رکھتے ہیں۔

**آزادیِ مستورات** یہ اعتراض ایک حد تک ضرور درست ہے ہم تسلیم کرتے ہیں کہ بعض ناتجربہ کار جوشیلے نوجوانوں کے سر میں یہ سودائے خام پیدا ہو چلا ہے لیکن خود نیولائٹ ہی نے انکی سختی کیساتھ مخالفت شروع کردی ہے۔ آنریبل جسٹس بدرالدین طیب جی صاحب کے ایڈریس سے عام ناخوشی اسکا بیّن ثبوت ہے امید ہے کہ تجربہ اس خام خیالی کو جلد رفع کردیگا۔

**ہندو مسلمانوں کا باہمی اختلاف** اس معاملے میں ضرور ہمکو ذی علم مضمون نگار سے پورا اتفاق ہے اسمیں کچھ شبہ نہیں کہ جدید تعلیم اس مخالفت کی بالکل ذمہ دار ہے۔ ہمارے بزرگوں میں مابین اہلِ ہنود اور اہلِ اسلام کے جو برادرانہ تعلقات اور یگانگت پائی جاتی تھی وہ آج بالکل مفقود ہے۔ پرانی ایک ہندوستان کی ضرب المثل تھی کہ ہندو مسلمانوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے لیکن جب سے چولی دامن والے انگرکھے کی جگہ کوٹ پتلون کا استعمال شروع ہوا نہ وہ چولی دامن رہا اور نہ وہ ساتھ۔ ع۔ میں دامن ہی نہیں رکھتا جو اُلجھے خار دامن سے۔ آج بھی اُن دیہات میں جہاں انگریزی تعلیم کا اثر نہیں پہونچا ہے ہندو مسلمانوں میں وہی بھائی چارے کی پرانے تعلقات قائم ہیں۔ تعلیم یافتہ اہلِ اسلام اور اہلِ ہنود کا فرض ہے کہ وہ اس بدنما دھبے کو اپنے دامنِ تہذیب سے چھپانیکی کوشش کریں۔

**نئی تعلیم کا اثر مذہب پر** یہ ایک نہایت غور طلب مسئلہ ہے کہ آیا ہندوستان کے نوجوانوں کے مذہب سے بے پروائی کا باعث تعلیم جدید ہے یا اپنے مذہب کی تعلیم سے بے بہرہ رہنا۔ میرے خیال میں آخر الذکر سبب اس بے پروائی کا زیادہ ذمہ دار ہے۔ اسوقت ہم زیادہ تر اپنے مذہب اسلام سے بحث کرتے ہیں اسواسطے کہ دوسرے مذاہب کے حالات سے ہمکو بہت کم واقفیت ہے اور نہ ہم کو یہ معلوم ہے کہ جسطرح مسلمانوں کے یہاں نئی تعلیم یافتہ گروہ پر آئے دن کفر اور الحاد کے فتوے لگا کر اب چلتا ہے اور وہ روزمرّہ دائرۂ اسلام سے خارج کئے جاتے ہیں ایسا اور قوموں میں بھی ہوتا ہے یا نہیں۔ رہے

مسلمان تو اُن کی بابت پھر ہم یہی کہینگے کہ انکا مذہب ہمارے خیال میں ایسا بودا اور کمزور نہیں ہے کہ جدید تعلیم کے مقابلے میں نہ ٹھہر سکے۔ اور اگر فی الواقع وہ ایسا ہی ہے (نعوذ باللہ من ذالک) تو ایک طالب حق کیواسطے اُسکا چھوڑ دینا ہی اچھا ہے۔ فطرت انسان کا یہ عام اُصول ہے کہ وہ اپنے قصور کو دوسروں کی طرف منسوب کرکے اپنی برئیت چاہتی ہے۔ مسلمان خود تو اپنی اولاد کو مذہبی تعلیم نہیں دیتے اور الزام رکھتے ہیں تعلیم جدید پر۔ جو نوجوان انگریزی نہیں پڑھتے اور اُن کی تعداد انگریزی پڑھنے والوں سے بہت زیادہ ہے اُن کی مذہبی حالت اِسقدر ناگفتہ بہ ہے کہ انگریزی خواں اُن سے ہزار درجہ بہتر ہیں۔ اِس سے زیادہ اور کیا شرم کی بات ہو سکتی ہے کہ گورنمنٹ ممالک متحدہ اسبات کی اجازت دیدے کہ تم اُستاد نوکر رکھکر سرکاری اسکولوں میں متعین کردو کہ وہ تمھاری اولاد کو مذہبی تعلیم دیں اور تمام ممالک متحدہ میں کسی شہر کے مسلمانوں کی حمیت اسلام اسبات کی مقتضی نہ ہو کہ وہ روشن خیال گورنمنٹ کی اِس مہربانی سے فائدہ اُٹھائیں۔ جب ہماری اپنی یہ حالت ہے تو آج کس منہ سے ہم مذہب کا نام لیتے ہیں۔ سہ

کعبہ کس منہ سے جاؤگے غالب ؛ شرم تمکو مگر نہیں آتی۔

**تندرستی پر** نہایت ناشکر گزاری اور ہٹ دھرمی ہے کہ جدید تعلیم پر تندرستی کے خراب کرنے کا الزام لگایا جائے۔ حالانکہ تندرستی کے قائم رکھنے کا جسقدر عمدہ انتظام تعلیم جدید کے ساتھ کیا جاتا ہے اُسکا عشر عشیر بھی پرانے طرز کی تعلیم میں موجود نہ تھا۔ اسکولوں اور کالجوں کے واسطے پر فضا اور صحت بخش مناظر تجویز کئے جاتے ہیں۔ طلبا کی تعلیم اور بود و باش کے مکانات کشادہ ہوادار اور موسموں کے خراب اثر سے محفوظ رکھنے والے ہوتے ہیں۔ ورزشوں اور کھیلوں کی طرف تعلیم سے کم توجہ نہیں کیجاتی۔ پھر اگر خود ہم ورزشوں میں شریک نہوں اور دن رات کمرے میں پڑے رہیں اور اپنے کو کتاب کا کیڑا بناکر اپنے ہاتھوں اپنے پیر میں کلھاڑی ماریں تو اِس میں جدید تعلیم کا کیا قصور ہے ورنہ عام طور پر انگریزی خواں طلبا جو تعلیم کے ساتھ ورزش جسمانی کا بھی پورا خیال رکھتے ہیں اُن کی تندرستی ہمیشہ قابل رشک ہوتی ہے۔

اُردو کی بیخ کنی اسکا الزام مذہبی تعصب پر ہے نہ کہ انگریزی تعلیم پر۔ ورنہ آجکل جسقدر انگریزی خواں مسلمان اُردو کی ترقی اور اصلاح میں مصروف ہیں پرانے زمانے کے تعلیم یافتہ اُسکا عشر عشیر بھی نہیں کرتے۔ مخزن کسکی گود میں پرورش پاتا ہے۔ اُردوی معلی کی آبیاری کون کرتا ہے۔ علی گڈھ منتھلی کو نشو و نما کس نے دیا ہے۔ عصر جدید کسکے ہاتھوں میں ہے۔ اور انجمن ترقی اُردو کا چشمہ کہاں سے نکلا ہے اسپر بھی اگر انگریزی خواں پبلک پر اُردو کی بیخکنی کا الزام لگایا جائے تو مجبوری ہے۔

---

یہ مختصر جواب ہے ذی علم مضمون نگار کے مبالغہ آمیز اور بیجا الزامات کا۔ ہمکو اس سے انکار نہیں کہ کل انگریزی خواں نوجوان اُن عیوب سے جنکی طرف قابل معترض نے اشارہ کیا ہے بری نہیں ضرور ایسے بھی "بدنام کنندۂ نکو نامی چند" موجود ہیں جنکو دیکھکر اس قسم کے خیالات پیدا ہو سکتے ہیں لیکن سیاہ بھیڑیں کونسے گلے میں نہیں ہوتی ہیں۔ کونسی ایسی جماعت ہے جس میں خراب افراد موجود نہیں۔ البتہ اُن کی وجہ سے تمام جماعت پر بُرائی کا حکم لگا دینا نہایت نازیبا ہے۔

جیسا کہ ہم شروع میں بیان کر چکے ہیں ہمکو زیادہ تر تعجب اس بات کا ہے کہ یہ مضمون سید اکرام عالم صاحب کے قلم سے نکلا ہے جو مدرسۃ العلوم کے گریجوایٹ اور مسلمانوں کی حالت سے واقفیت کا ادعا کرنے والوں میں ہیں۔ سب جانتے ہیں کہ اسوقت تک مسلمان انگریزی تعلیم میں اپنی معاصر قوموں سے کسقدر پیچھے ہیں۔ جو نہ جانتے ہوں وہ سید محمود مرحوم اور پروفیسر عبدالقادر خاں کے تیار کیے ہوئے حسرت اور مصیبت کے نقشے فوراً آنکھیں کھول کر دیکھیں اور اپنی قوم کی تباہی پر آنسو بہائیں۔ ؎

پستی کا کوئی حد سے گذرنا دیکھے ✣ اسلام کا گر کر نہ اُبھرنا دیکھے
مانے نہ کبھی کہ مد ہے ہر جزر کے ساتھ ✣ دریا کا ہمارے جو اُترنا دیکھے

پس جبکہ ہماری تعلیم کی یہ حالت ہے اور ہماری قوم میں اب تک بہت سے ایسے بزرگ موجود ہیں جو اسوقت تک انگریزی کے نام سے بھڑکتے ہیں تو انگریزی تعلیم کا ایسا بھیانک اور ڈراؤنا مرقعہ کھینچ کر اُن کو دکھانا اور اُونگھتے کو ٹھیلتے کا بہانہ پیدا کرنا کم از کم ایک نادان دوست کے سوا

کسی دوسرے کا کام نہیں ہوسکتا۔ جو دانا دشمن سے بھی ہزار درجہ بدتر ہے ؎

ہر کس از دستِ غیر نالہ کند ❊ سعدی از دستِ خویشتن فریاد

# کیا مسلمانوں کو کسی پولیٹکل (ریڈیکل) ایسوسی ایشن کی ضرورت ہے

---

دسمبر کے "علی گڈھ منتھلی" میں سید غلام جیلانی صاحب کا ایک مضمون مندرجۂ بالا عنوان پر میں نے نہایت تعجب و افسوس کے ساتھ دیکھا۔ اس سے پیشتر چودھری خوشی محمد خاں صاحب کے ایک بھرتی کے مضمون میں اس مسئلے پر بھی کچھ ریمارک میری نظر سے گذرے تھے لیکن چونکہ وہ مضمون محض منتھلی کے صفحے پر کرنے اور بمصداق حکم حاکم مرگِ مفاجات کے اڈیٹر کی فرمایش پورا کرنے کی غرض سے لکھا گیا تھا اسواسطے اُسپر کوئی اعتراض کرنے یا جواب دینے کا موقعہ نہ تھا۔ یکم اپریل کو کسقدر مضحکہ خیز مضامین شائع ہوتے ہیں مگر اُنپر کسی قسم کی دار و گیر نہیں کیجاتی۔ البتہ سید غلام جیلانی صاحب کی تحریر بحیثیت ایک مستقل مضمون کے پبلک کے سامنے پیش کیگئی ہے۔ اسواسطے اب موقعہ ہے کہ اُسکے ہر پہلو پر کامل غور اور تنقید کیجائے۔

مندرجۂ بالا عنوان اسقدر اہم اور پیچیدہ ہے کہ اُسپر محض تفریحِ طبع یا تھوڑی دیر وقت بہلانے کی غرض سے خامہ فرسائی کرنا یا ایسے وزنی ٹاپک کو "خوش باش کہ وقتِ ما خوش کردی" کی نظر سے دیکھنا نہایت افسوسناک واقعہ ہے۔ جس مسئلے پر قوم کی بہبودی اور فلاح کا دار و مدار ہو جسکے حل ہونے پر اُسکی تمام آیندہ اُمیدیں منحصر ہیں۔ اُسکو بازیچۂ اطفال بنالینا ایک درمندی خواہ قوم کی ذات سے از بس بعید ہے۔ ؎

دوستوں سے ہنسے وہ صدمے اُٹھائے جان پر ❊ دل سے دشمن کی عداوت کا گلہ جاتا رہا

مولوی صاحب کا مضمون شروع سے آخر تک دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے مجوزہ پولیٹکل ایسوسی ایشن کی نسبت اُن کی واقفیت چودھری خوشی محمد خاں صاحب کے مضمون

(اگر اُسکو مضمون کہا جا سکے) سے شروع ہو کر اُسی پر ختم ہو گئی ہے اور اُنھوں نے اُس سے پیشتر کبھی اِس مسئلے کے متعلق کوئی بسیط مضمون نہیں دیکھا۔ لیکن ایسی ناواقفیت کی حالت میں ایسے اہم مضمون پر قلم اُٹھانا بڑی جرأت اور دلیری کا کام ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ مولوی صاحب نے مسلمانوں کے مجوزہ پولیٹکل ایسوسی ایشن کو (جسکو وہ نہایت غلطی سے نواب وقار الملک بہادر مولوی مشتاق حسین صاحب کی ایسوسی ایشن خیال فرماتے ہیں) انڈین نیشنل کانگریس کا عکسِ مجسّم خیال فرمایا ہے۔ اور وہ ایسوسی ایشن کا مقصد اور موضوع کانگریس کیطرح گورنمنٹ کی ہر کارروائی پر جا و بیجا گستاخانہ حملہ آوری اور عوام الناس میں اجیٹیشن پھیلانا خیال فرماتے ہیں۔ اگر مولوی صاحب موصوف نے ایسوسی ایشن کی تحریرات اور اُسکے نظامِ کاروائی کو ملاحظہ فرمایا ہوتا تو غالبًا اُن جیسے ذی شعور بزرگ کے قلم سے ایسا مضمون نہ نکلتا۔ مضمونِ ہذا میں ہم زیادہ تر محمڈن پولیٹکل ایسوسی ایشن کے مطبوعہ اعلان سے اقتباس کرینگے۔ تاکہ پبلک کو بجای ہماری ذاتی رای کے خود ایسوسی ایشن کے بانیان کی رای اور اُسکے مقاصد اُنھیں کے بیانات سے معلوم ہو جائیں۔ یہ خیال ہرگز صحیح نہیں ہے کہ مسلمانوں کی پولیٹکل ایسوسی ایشن کانگریس کا اِتباع کرنا یا اُسکے اُصول پر چلنا چاہتی ہے۔ بلکہ بانیانِ ایسوسی ایشن نے مختلف موقعوں پر نہایت وضاحت کے ساتھ اس خیال کی تردید کی ہے۔

مولوی سید غلام حیدر صاحب اپنے مضمون میں ایسوسی ایشن کے مقاصد اور اغراض دریافت کرنا چاہتے ہیں۔ لہذا ہم مولوی صاحب کی اطلاع کیواسطے ایسوسی ایشن کے مطبوعہ نوٹس سے اُن کے سوال کا جواب دیتے ہیں ــ " ہندوستان میں ہم مسلمانوں کی حالت ایک عرصۂ دراز سے کیا بمقابلہ خود ہماری گذشتہ حالت کے اور کیا بمقابلہ ہماری معاصر قوموں کے روز بروز رُو بہ تنزل ہے اور جو برکات اور فوائد کہ اِس ملک میں برٹش حکومت سے دوسری قوموں کو پہونچ رہے ہیں اُن سے مسلمانوں کو بہت ہی کم حصہ ملتا ہے۔ چنانچہ ملازمت سرکاری کے تمام صیغوں اور دفاتر میں ہماری تعداد روز بروز کم ہوتی جاتی ہے۔ صوبوں کی کونسلہای قانونی اور گورنمنٹ آف انڈیا کی قانونی کونسلو

میں ہماری ممبروں کا داخل ہونا بھی دشوار اور ناممکن کے قریب ہوگیا ہے - اور جہاں ہمارے دوسرے بھائی ہندو اپنے انتخاب سے اپنے قائم مقام اُن کونسلوں میں بھیجتے ہیں وہاں ہمکو بلا استثنا ہر ایک صوبہ میں محض گورنمنٹ کی مہربانی پر بھروسا کرنا پڑتا ہے اور اگرچہ ہم گورنمنٹ کے بیحد شکرگزار ہیں کہ اُسنے حتی الامکان میزانِ حقوق کے دونوں پلوں کو برابر رکھنے کی غرض سے بسا اوقات مسلمان ممبروں کو بھی اپنے قانونی اختیار سے اپنی قانونی کونسلوں میں جگہ دی لیکن اُن میں سے باستثنار معدودے چند کسیکو بھی قوم نے اپنا صحیح قائم مقام تسلیم نہیں کیا اور نہ اُنھوں نے اِس قائم مقامی کے فرائض کو صحیح طور پر انجام دیا معہذا بہت بڑا فرق ہے اس میں کہ ایک قوم اپنے قائم مقاموں کو خود منتخب کرے اور دوسری قوم کو ایسا موقعہ نہ ملے - ایک اپنے قوتِ بازو سے اپنی روزی پیدا کرتا ہے اور دوسرے کی گذر ہے بادر رحمدل قوم کی خیرات اور مہربانی پر سے -

فرق ست میانِ آنکہ یارش در بر ؛ با آنکہ دو چشمِ انتظارش بر در

یہ وجوہ ہیں جنکی بنا پر پولیٹیکل ایسوسی ایشن قائم کرنیکا خیال پیدا ہوا ہے چنانچہ آگے چلکر اعلان مذکور میں لکھا ہے کہ " اگر ہمنے بہت جلد اپنے کو اِس گرداب ہلاکت سے بچانیکی معقول تدابیر اختیار نہ کیں تو اِس ملک کی تاریخ میں مسلمانوں کی عظمت اور اُن کے حقوق صرف تاریخی واقعہ رہجائیگا اور برٹش گورنمنٹ بھی باوجود اپنے بے انتہا عاقلانہ اور عادلانہ اُصولِ حکمرانی کے اپنی مسلمان رعایا کی اِس تباہی کو نہ روک سکیگی - مندرجۂ بالا اقتباس سے صاف ظاہر ہے کہ محمڈن پولیٹیکل ایسوسی ایشن کا مقصد اور موضوع غیر قوموں کے مقابلے میں مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت اور گورنمنٹ کی خدمت میں مودبانہ عرضِ حال کرنا ہے نہ کہ گورنمنٹ پر بیجا اعتراض کرنا اور اُسکی ہر ایک کارروائی پر بے ایمانی اور دغابازی کا الزام لگانا - مسلمان خود قریب دو صدی تک ہندوستان کی حکمرانی کا تجربہ کرچکے ہیں وہ مختلف المذاہب اقوام پر حکومت کرنے اور ہندوستان جیسے ملک میں امن قائم رکھنے کی دشواریوں سے واقف ہیں - ابدالی اور دُرّانی کے حملے اور مرہٹوں اور سکھوں کی خونریزیاں ابھی تک اُن کو یاد ہیں اسلئے وہ ہندوستان کے فوجی اخراجات پر گورنمنٹ کو مسرف اور فضول خرچ نہیں کہہ سکتے -

مسلمان یہ بھی جانتے ہیں کہ گورنمنٹ اپنی رعایا کیواسطے بنی اسرائیل کیطرح آسمان سے من و سلویٰ منگا سکتی۔ نہ گورنمنٹ کے ہاتھ میں موسیٰ کا عصا ہے جسکے ذریعے سے وہ پہاڑ چیر کر ملک کی خشک سالی کو رفع کردے اسلئے قحط کا مضحکہ خیز الزام مسلمان گورنمنٹ کی گردن پر نہیں رکھ سکتے۔ البتہ جن دلخراش دشواریوں کا برٹش مسلمان رعایا کو اپنی ہمعصر قوموں سے آئے دن مقابلہ کرنا پڑتا ہے یا جو نقصانات کسی حاکم کی غلط فہمی سے بعض اوقات ہوجاتے ہیں جنکا ٹھیک اندازہ حضور نظام کی رعایا کسیطرح نہیں کر سکتی انکا رفع کرنا مسلمانوں کا فرض ہے اور اسی غرض کو ادا کرنیکی غرض سے مسلمان پولیٹیکل ایسوسی ایشن قائم کرتے ہیں۔

یہ ضرورت ہے اور یہ امر ہے جسکے لئے صرف نواب وقار الملک بہادر ہی نہیں بلکہ برٹش انڈیا کے کل تعلیم یافتہ آزادی پسند مصلحانِ قوم کھڑے ہوئے ہیں۔ پبلک ایجیٹیشن پھیلانا اور عوام الناس کو پولیٹیکل معاملات میں شریک کرنا ضرور خطرناک ہے اسیواسطے ایسوسی ایشن نے پبلک ایجیٹیشن کو روکنے کی غرض سے ہر ضلع سے زیادہ سے زیادہ ۱۲ تعلیم یافتہ تجربہ کار اور سلیم الطبع ذی وجاہت لوگوں کو جن پر پبلک کا اعتماد ہو انجمن کی ممبری کیواسطے منتخب کیا جانا تجویز کیا ہے اور یہ تقلید ہے سید احمد خاں مرحوم کی جسکی تفصیل بیانِ انجمن کی ہی زبان میں ہم بیان کرتے ہیں " آنریبل سر سید احمد خاں مرحوم و مغفور جو ہم سب سے زیادہ زمانے کی نبض کو پہچانتے تھے باوجودیکہ مدرستہ العلوم مسلمانانِ علیگڈھ اور محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس انھیں کی ایجاد اور انھیں کے ہاتھوں میں تھی اور جسقدر کوشش کہ مسلمانوں کی تعلیم کے متعلق اُن سے ممکن تھی اُسکو وہ کامیابی کے ساتھ عمل میں لا رہے تھے انھوں نے بھی حسب تجربہ سمجھا کہ تا تریاق از عراق آوردہ شود مار گزیدہ مُردہ شود۔ زمانے نے اگر ہمکو پولیٹیکل درجے سے گرادیا تو اُسکے بعد نہ اپنی ترقی تعلیم ہی کا جوش ہم میں باقی رہیگا اور نہ اُسوقت تعلیم کی ترقی سے کچھ کام بن سکیگا تو اب سے دس برس پہلے خود اُن کو یہ فکر پیدا ہوئی کہ تعلیمی ترقی کی کوشش کے ساتھ ہی ہمکو اپنے پولیٹیکل حقوق کی حفاظت کی تدابیر بھی اختیار کرنی چاہئیں۔ اور ۱۸۹۳ء میں خود اُن کی تحریک سے ایک ایسوسی ایشن قائم ہوئی جسکا نام تھا محمڈن اینگلو اورینٹل ڈیفنس ایسوسی ایشن آف اپر انڈیا

اس ایسوسی ایشن کا مقصد یہی تھا کہ دوسری ہمعصر قوموں کے مقابلے میں اپنے پولیٹکل حقوق کی حفاظت باقاعدہ عمل میں لائی جائے۔ اور اگر آج سیّد احمد خاں مرحوم و مغفور زندہ ہوتے تو سب سے زیادہ وہ اس اہم مقصد کے حصول میں کوشش اور سرگرمی کرتے ہوئے پائے جاتے۔ مگر جہاں اور بہت سی بدقسمتیاں ہیں از انجملہ جناب سیّد صاحب مرحوم و مغفور کا ہم میں سے اُٹھ جانا بھی ہے اور اُن کے انتقال کے بعد ہی سے مسلمانوں کو تیر باران حوادثِ زمانہ سے بہت کچھ نقصان برداشت کرنا پڑا ہے" مذکورہ بالا اقتباس ایسوسی ایشن کے مقاصد کو نہایت وضاحت کے ساتھ بیان کرتا ہے تاہم امید ہے کہ اِسکے بعد جناب مولوی غلام جبار صاحب کو ایسوسی ایشن کے اغراض اور موضوع کے متعلق کوئی شبہہ باقی نہ رہیگا۔ اور آیندہ وہ اُسکے اُصول کو نیشنل کانگریس کے اُصول سے مخلوط نہ کرینگے۔ جناب مولوی صاحب کا یہ خیال بالکل درست ہے کہ مسلمان بہ اعتبار تعلیم صنعت و حرفت اور مالی حالت کے ہندوستان کی دیگر اقوام سے بہت پیچھے ہیں۔ یہ بھی سچ ہے کہ مسلمانوں کو محمڈن یونیورسٹی کی سخت ضرورت ہے اور ہر ایک مسلمان کو حتّی المقدور اُسکے قیام کیواسطے سعی کرنا لازمی ہے لیکن پولیٹکل اور تمدّنی طور پر جو نقصان کہ مسلمانوں کو پہونچا ہے اور پہونچ رہا ہے اُس سے مسلمانوں کو محفوظ رکھنے کی غرض سے اس اُمید میں خاموش بیٹھے رہنا ٹھیک نہیں کہ آیندہ جب ہماری قوم تعلیم میں کافی طور پر ترقی کریگی تو مذکورہ بالا نقصانوں کا تدارک خود بخود عمل میں آجائیگا۔

تعلیم منجملہ اُن بہت سی اخلاقی قوتوں کے ہے جو لوگوں کو قومی ضرورتوں پر غور کرنے اور اُن کے مہیا کرنے پر آمادہ کرتی ہے۔ قطع نظر اسکے تعلیم اور محمڈن یونیورسٹی کا قیام ایک دیر طلب کام ہے اور اس اعلیٰ مقصد کے حاصل ہونے تک ہم ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھ نہیں سکتے اگر اُسوقت کا انتظار کرینگے تو ہم بعض اُمور میں اُسیقدر کھو بیٹھینگے جسقدر کہ ہمکو دوسری باتوں میں فائدہ حاصل ہوگا۔ ہم تعلیم کی قدر و منزلت گھٹانے کی کوشش نہیں کرتے۔ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ تعلیم ہماری سب سے بڑی ضرورت ہے اسی کے ساتھ اس امر سے بھی ہم بخوبی واقف ہیں کہ تعلیم صرف ایک وسیلہ ہے مقصد کے حاصل کرنیکا۔ پس اس وسیلے اور ذریعے کے حصول کی کوشش میں اصل مقصد کو ہاتھ سے کھو بیٹھنا نہایت نادانی ہوگی

زمانہ کسی قوم کیواسطے اپنی رفتار میں کمی نہیں کرتا اور نہ اقوام عالم ترقی کی دوڑ میں کسی خاص قوم کی تیاری کا انتظار کرتی ہیں - زمانہ تیزی کے ساتھ گذر رہا ہے اور مبارک ہیں وہ قومیں جو اُسکی پیشانی کے بال پکڑکر مستعدی کے ساتھ اپنے کام میں مصروف ہو جاتی ہیں -

جیساکہ آنریبل جسٹس بدرالدین طیب جی صاحب نے گذشتہ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے پریسیڈنشل ایڈریس میں فرمایا ہے - تعلیم بذاتِ خود ایک بڑا وسیع میدان ہے اگر ہم اُس مسئلے پر غور کریں جو تعلیم کے تمام شعبوں سے تعلق رکھتا ہے تو مارل - سوشل - پولٹیکل - اور جسمانی تعلیم اُسکے ضمن میں شامل رہیگی -

پس تعلیم ہی کو اپنا مقصدِ اصلی قرار دیکر ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہماری پولیٹکل ایسوسی ایشن تعلیم کے احاطے سے خارج نہیں ہے اور یہ ظاہر ہے کہ منجملہ تعلیم کے بہت سے شعبوں کے ایک ضروری اور اہم برانچ کو چھوڑ دینا بڑی ناعاقبت اندیشی کا کام ہوگا - اس موقعہ پر بیجا نہوگا اگر ہم اُس روشن خیال مدبّر کی بیش بہا راے کو اپنے قول کی تائید میں پیش کریں جسکا نام نامی ابھی ہم بطور گذشتہ کانفرنس کے میر مجلس کے لیچکے ہیں -

آنریبل جسٹس بدرالدین طیب جی صاحب فرماتے ہیں کہ "جب ایسے پولٹیکل معاملات پیش آئیں جو صرف مسلمانوں کی جماعت سے تعلق رکھتے ہیں تو اُسوقت یہ صرف جائز اور مناسب ہی نہیں بلکہ ہمارا عین فرض ہے کہ اپنی فریاد بہ حیثیت جداگانہ جماعت کے (گورنمنٹ کے حضور میں) پہونچائیں -

مولوی سید غلام جبار صاحب کے اس خیال سے ہمکو پورا اتفاق ہے کہ "مسلمان بہ نظر اپنی حالت اور حیثیت کے گورنمنٹ کی عنایت اور مہربانی کے بہت محتاج ہیں" لیکن یہ خیال کرنا کہ کسی قوم کا اپنے جائز حقوق کو گورنمنٹ سے مودّبانہ طلب کرنا یا کسی حاکم کی راے اور تجویز پر معتدل اور معقول نکتہ چینی کرنا گورنمنٹ کی ناراضا مندی کا باعث ہوگا برٹش گورنمنٹ اور انگلش نیشن کی سخت توہین کرنا ہے - ہماری گورنمنٹ کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ ہروقت رعایا کے جائز حقوق ادا کرنے اور اُن کے معروضات سُننے کو آمادہ رہتی ہے اور جو معقول نکتہ چینی گورنمنٹ کی کسی کارروائی پر

کیجاتی ہے اُسکو گورنمنٹ دلی شکرگزاری کے ساتھ منظور کرتی ہے۔ پس کوئی وجہ نہیں کہ پولیٹیکل ایسوسی ایشن کے قائم کرنے سے مسلمان گورنمنٹ کی عنایت اور مہربانی سے محروم ہوجائیں برخلاف اسکے ایک بڑا ذریعہ برٹش گورنمنٹ کی برکات سے مستفیض ہونے اور گورنمنٹ کی خدمتگزاری کا ثابت ہوگی۔ رُوس کی رعایا کو اس قسم کے اندیشے اور شکوک ظاہر کرنا غیر مناسب نہوگا لیکن برٹش رعایا کے دلوں میں اس قسم کے تنگ خیالات کو جگہ نہونی چاہیے۔ مولوی صاحب کا مسلمانوں کے پولیٹیکل ایسوسی ایشن کے متعلق بحث کرتے ہوئے نیشنل کانگریس کی کارگزاریوں کا حال دریافت کرنا بالکل ایک غیر متعلقہ واقعہ ہے جسکا ایک وکیل کے قلم سے نکلنا ضرور تعجب خیز ہے۔ اوّل تو جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں۔ ہماری ایسوسی ایشن اور نیشنل کانگریس کے مقاصد میں زمین آسمان کا فرق ہے اور اسلئے دونوں کے دوائر کوشش علحدہ اور جداگانہ ہیں۔ وہ ہندوستان کی عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لینے کے مدعی ہیں۔ ہم بحیثیت وفادار رعایا کے صرف اپنے جائز حقوق کی حفاظت چاہتے ہیں۔ پس کانگریس کی کامیابی یا ناکامیابی ہمارے ایسوسی ایشن کیواسطے کوئی نظیر نہیں ہوسکتی یہ ضروری نہیں کہ اگر کانگریس والے ہندوستان جیسے ملک کی عنانِ حکومت حاصل کرنے میں کامیاب نہوں تو غریب مسلمان بھی بحیثیت رعایا کے اپنے جائز حقوق سے محروم رکھے جائیں ؎

کیا فرض ہے کہ سبکو ملے ایک ہی جواب۔ آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہِ طور کی۔

علاوہ اسکے ہم یہ بھی تحقیق کے ساتھ نہیں کہہ سکتے کہ کانگریس کو اپنے مقاصد میں بالکل ناکامی حاصل ہوئی۔ بلکہ کانگریس کی بدولت ہندو مسلمانوں کے علی الرغم بہت سے حقوق اور فوائد حاصل کر چکے ہیں جنکی تفصیل کیواسطے مولوی صاحب کانگریس کی پچھلی رپورٹیں ملاحظہ کرنے کی تکلیف گوارا فرمائیں۔ بہت دن تک ہندوستان کی مسلمان رعایا نے اپنے کو پولیٹیکل پلیٹ فارم سے علحدہ رکھا لیکن اس نہ مداخلت کرنے کی پالیسی نے اُن کو وہی نقصانات پہونچائے جو آنریبل ایسٹ انڈیا کمپنی کے ممتاز گورنر مسٹر جان شور کو اس پالیسی کے اختیار کرنے سے پہونچے تھے۔ دوسری معاصر قوموں نے ہمارے حقوق کو پامال کر دیا اور کرتی جاتی ہیں۔ ۱۸۔ اپریل سنہ۱۹۰۱ء کا مشہور رزولیوشن

خاصکر ہمارے صوبے کے مسلمانوں کو اچھی طرح یاد ہے۔ جوڈیشل لائن میں ہم لوگوں کی تعداد نہ صرف قابلِ افسوس بلکہ لائقِ شرم ہے۔

اضعافِ قانون کی کونسلوں اور میونسپل بورڈس میں ہماری بے بسی اور لاچاری اظہر من الشمس ہے ایسی حالت میں مسلمانوں کے پولیٹیکل درجے کے قائم رکھنے کا ایک نہایت اہم اور ضروری مسئلہ ہے اور قوم کی موت اور زندگی بالکل اسپر منحصر ہے اب یہ قوم کو اختیار ہے کہ سہ۔

یا کرے کوشش کہ مُردہ قوم میں پڑ جائے جاں ٭ اور دکھائے خلق کو اس آنکھ سے اُٹھتا دھواں
یا رہے دُنیا میں جھنگوں اور پشوں کی طرح ٭ جنکا ہے دُنیا میں ہونا اور نہ ہونا ایکساں
قسمتوں کی آزمائش کا زمانہ ہو چکا
ہے بس اب یاں ہمتوں اور غیرتوں کا امتحاں

محمد یعقوب شاہجہاں پور۔ ۱۲۔ جنوری ۱۹۰۴ء۔

## کتب جدید الطبع موجودہ کان الفرض مدرسۃ العلوم علیگڈھ

| نام کتاب | قیمت مجلد |
| --- | --- |
| **تفسیر القرآن جلد اوّل** مصنفہ سرسید احمد خاں مرحوم۔ اس جلد میں سورۂ فاتحہ۔ اور سورۂ بقر کی تفسیر ہے اور ذیل کے مضامین نہایت محققانہ طریقہ سے لکھے گئے ہیں۔ دُعا اور اُسکے قبول ہونیکی حقیقت۔ حروف مقطعات کی تحقیق۔ مسئلہ جبر و اختیار۔ وحی الہام کی حقیقت نبوت کی حقیقت۔ اعجاز القرآن جنت و دوزخ کی حقیقت۔ ملائکہ کی حقیقت۔ شیطان۔ قصۂ آدم۔ قصۂ موسیٰ۔ معجزہ دلیلِ نبوت ہے یا نہیں۔ جبرئیل و میکائیل کی حقیقت۔ ناسخ و منسوخ کی بحث۔ سمتِ قبلہ کی حقیقت مذہبی احکام کی قسمیں۔ قصاص پر بحث۔ مسئلہ وصیت۔ روزوں پر بحث۔ جہاد کی حقیقت۔ حج کی حقیقت مسئلہ طلاق پر بحث۔ مسئلہ ربا کی تحقیق۔ طبع جدید مطبوعہ مفید عام پریس آگرہ۔ | |
| کاغذ سفید جلد طلائی۔ پشتہ پر سونیکے حروف سے تفسیر کا نام۔ | سے ۸ر |
| 〃 〃 〃 سادہ۔ | ۶ر ۱۲ر |

(مطبوعہ ریاض ہند پریس علیگڈہ)

| | | | | | |
|---|---|---|---|---|---|
| „ | „ | Barkat Ali, Munsif, Batala | 25 | 0 | 0 |
| „ | „ | M. Badr-ul-Husan, Munsif, Kunda . | 5 | 0 | 0 |
| „ | „ | Md. Amim-ul-laq, Vakil, Gazipur | 5 | 0 | 0 |
| „ | 13th | Risaldar Major Ali Md Khan, Faizabad | 25 | 0 | 0 |
| „ | 15th | Shafi-ud-din, Biskhan | 7 | 14 | 0 |
| „ | „ | Hiba Ahmed | 1 | 0 | 0 |
| „ | „ | S Lutf Husain Morar . | 14 | 8 | 0 |
| „ | 18th | Sajjad Husain, Mukhtar, Etawah | 50 | 0 | 0 |
| | | Total . | 1,079 | 5 | 0 |
| | | Previously Acknowledged . | 18,121 | 3 | 0 |
| | | Grand Total Rs | 19,200 | 8 | 0 |

J R CORNAH

# One Rupee Fund.

| | | | Rs. | A. | P. |
|---|---|---|---|---|---|
| Dec. | 29th | S Haider Karar Jaffri, Agra ... | 16 | 0 | 0 |
| " | | Munshi Asaf Zaman, Pili Bhit .. | 200 | 0 | 0 |
| " | | Khalifa S. Md. Salim, Patiala State. | 46 | 8 | 0 |
| " | | Sahiaworthia, 6 Wellesly Street, Calcutta ... | 10 | 0 | 0 |
| " | | S Mukhtar Ahmed ... ... | 1 | 0 | 0 |
| " | | Hasan Raza, Court Inspector, Benares | 22 | 0 | 0 |
| " | | Mirza Wasi Haider, Fatehgarh | 2 | 0 | 0 |
| " | | Shakir Ali Khan, Vakil, Bikaner State | 25 | 0 | 0 |
| " | | Md. Syed Hasan, Moradabad ... | 25 | 0 | 0 |
| " | | H. A S Abdullah ... | 18 | 0 | 0 |
| " | | Nazar Husain Khan, Gonda ... | 25 | 0 | 0 |
| " | | Md. Husain Khan, Pleader, Etah, ... | 7 | 0 | 0 |
| " | | Mohib-ul-lah Khan, Etah | 6 | 14 | 0 |
| " | | Barkat Ali Munsiff, Batia ... | 24 | 12 | 0 |
| " | | Md. Beg, Amin, Canal Deptt. | 1 | 15 | 0 |
| " | | Ellahi Bux, Nurpur ... | 2 | 0 | 0 |
| " | | Md. Husain, Bilgrami ... ... | 15 | 0 | 0 |
| " | | Fakir Mohammad, Morar | 11 | 13 | 0 |
| " | | Mohammed Ali, Morar ... | 98 | 0 | 0 |
| " | | S. Alaf Husain, ... ... | 45 | 0 | 0 |
| " | | Shah Itrat Husian, Jagdispur ... | 17 | 0 | 0 |
| " | | S. Jafar Tayar, Bilgrampur ... | 3 | 0 | 0 |
| " | | Md. Sajjad, Belgrampur ... | 5 | 0 | 0 |
| " | | S. M. Ghulam Jafar, Ufzal Gunj ... | 5 | 8 | 0 |
| " | | Jamal-ud-din, Comnsr, Benaras ... | 10 | 0 | 0 |
| " | | Tassaduq Ali Beg, Hasanpur ... | 11 | 0 | 0 |
| " | | Akhtar Naiz Khan, Lucknow | 1 | 0 | 0 |
| " | | Miss Nissar-ud-din Hyder, Kachhi Gudda ... ... .. | 0 | 5 | 0 |
| " | | M. Ibrahim Azam Shah, Post Master, | 23 | 0 | 0 |
| " | | Miss Nasir-ud-din Hyder ... | 24 | 12 | 0 |
| Jan. | 2nd | Hafiz Salamat-ul-lah, Bahrampur | 37 | 8 | 0 |
| " | | Basharat Ali, Sub-Inspector, Cawnpore | 16 | 0 | 0 |
| " | | Jawad Ali, Baneras ... ... | 4 | 0 | 0 |
| " | 4th | M. Asaf Zaman, Pili Bhit ... | 100 | 0 | 0 |
| " | " | Md. Ali Dullah, Entrance Calss, Gujrat | 8 | 0 | 0 |
| " | " | Shah Itrat Husain, Jagdispur ... | 8 | 0 | 0 |
| " | " | Miss J. Ahmed Budar, Husainabad ... | 8 | 0 | 0 |
| " | 6th | Hakim Md. Niaz-ud-din, Jaipur ... | 15 | 0 | 0 |
| " | 11th | Abdul Kayum, Saharanpur ... | 21 | 0 | 0 |
| " | " | S. Md. Ather, Naib Tahsildar, Bara Banki ... ... ... | 25 | 0 | 0 |

The sun laughed joyously back from thousands of sabres, and revealed the complete army that through the long night had toiled through the forest, each battalion thinking itself alone.

An involuntary cheer broke from every lip—a cheer that rent the very air, and every man grasped his sabre with stronger grip and firmer determination to win.

Oh, my brother reformers, you think you are alone in the weary struggle against monster evils in India and hearts are sad, and eyes dim with peering through the thick shadows; but some morn, some glad sweet morn, who can say how soon, we shall merge into the light of Eternal Day, and find unsuspected Flanks on our right and left and rear.

Here as I have been sitting in this Conference I have been seeing visions, been dreaming dreams—Golden dreams in which India, the land of infinite pathos, infinite need, will rise out of the sleep of ages to its divine God-given possibilities, flinging aside impatiently the shackles that bind it and taking its place amongst the mighty ones, the strong ones, of the earth!

I have been seeing a fairer vision, still a vision that almost brings the tears to my eyes, for oh, we have waited for it so long, and prayed for it so long, and feared lest our hopes should find fruition too late . a vision of woman sitting crowned as Ruskin says, "Queen of her husband, of her sons, Queen of the mystery of the world beyond which bows itself, and will for ever bow before the myrtle crown, the stainless sceptre of womanhood" A vision in which

* She sets herself to man like perfect music unto
noble words;

And so these twain upon the skirts of Time,
Sit side by side, full summed in all their powers,
Dispensing harvest, sowing the To-be,
Self-reverent each and reverencing each,
Distinct in individualities,
But like each other even as those who love,
Then comes the statelier Eden back to men.
Then reign the world's great bridals, chaste and calm
Then springs the crowning race of humankind.
May these things be"!
Oh did I say it was a *dream*?

S. SOHRABJI.

for our girls who shall say? I only know it can be fraught with nought but good, and that the broadening influences will go far towards educating the Indian daughters of the Empire.

And now in conclusion, my brothers, let me urge *action* —It is the indispensable requisite of development.

It is no earthly use having theories if we are not going to knit their ravelled ends into actualities.

Let us rise bravely to the duties and responsibilities of our day and generation. There is desperate need for haste. The women of this generation (like ourselves) will have passed into eternity in the next, and how can we face God if we have done nothing towards their amelioration.

Have I drawn a very dark picture of the Zenana?—I think not too dark There are grand and noble exceptions that stand out in golden relief against the dark back ground of generalties, but their very brightness makes the shadows apparent, and yet I would not have you discouraged, or despairing at thought of the difficulties I believe the outlook of the future is most encouraging. I believe this very Conference to be an indication of its hopefulness. The word "opportunity" is blazoned over the door-way of the coming year—But remember opportunity means *obligation* Does that alarm you? Let it not, for obligation is really *potentiality*. The very need brings with it the capacity to meet it. Rise up, my brothers, in God's name and work—and God give you a strong arm and stout heart. With courage as your watchword, and Faith your guiding star, go forth and may God Almighty go with you. The battle will be long and hard, but remember, and be strong in the fact you are not alone. There are hundreds in awakened India who are with you. We read of a commander in the Civil War in America who was ordered to make an immediate advance on on the enemy. Through the thick brushwool be bent forward leading as he thought a forlorn hope. How could his little battalion do aught against so vast a force? But on the men pressed.

"Their's not to question why
Their's but to do, and die."

Through the long brushwood all that dark night they travelled, despairing, but obedient,—and in the early opal tinted dawn, as they broke from the thick forest lo! from the right and left, and from behind emerged troop after troop.

"The Woman's Friend" published in Urdu and Hindi.
"The Sugrivani" „ at Rutlam.
"The Stri Bodh" in Guzerathi.

are some of the papers you might use—Doubtless, there are some more, but I confess there is a paucity of vernacular literature, and that is what makes me plead for an English education as well as a Vernacular one for women Which of us can gauge the influence of the written thoughts of great Western minds upon our lives. Blot out of your life all that your English education has given you, and see what you have left

Besides, we must advance with the age—English is going to be a universal language—Here in India at any rate—It certainly is the unifying factor in this Conference, where some are Guzerathi and some Urdu speaking gentlemen.

Then it is very desirable that the literature of a land where woman is held in such reverence, honoured, loved confided in, should flood the East where she is not thus honoured.

What treasures of thought are poured at the feet of the English-speaking man or woman in India any one of you can testify.

I hold in my hand the papers of a league lately founded in Edinburgh called "The League of the Empire" which has for its object the bringing together of the daughters of the Empire all the world over, in ties of closest friendship by means of correspondence. You write to the Secretary, Mrs. Haldane—10 Randolph Crescent, Edinburgh, and she will obtain for you a correspondent in the British Isles or Canada, or indeed in any part of the Empire, who will correspond with you regularly, giving accounts of such customs and habits, such places and people in her part of the world as she thinks will interest you and you in your turn tell her of Indian ways and Indian peoples, and in fine all you can about your land. Several of the girls in the school in Poona have gladly sent in their names and carry on an enthusiastic correspondence with the girls across the sea—their fellow subjects—who are bound by political ties as well as those of humanity to regard them as sisters.

Who can tell where this will end ?—This beautiful comradeship that is being established between the daughters of the East and West. What vistas are being opened up

I have devoted more than half my life to education, and studied its systems to the exclusion of everything else, and I have come to the conclusion that rightly understood it is the *ideal* means of education, and as nearly perfect as anything human can be Since the great Teacher uttered those words of divine tenderness that have proved the charter of liberty for children for 1900 years, I believe no greater have come "ringing down the centuries" than Frobel's, "Come let us live with our children"

Do not imagine that the early stage in your girls' education is beneath your notice. There is not period of a child's life so "big with fate" as the first ten or twelve years. "When ought the training of a child to begin ?" asked one of Oliver Weldon Holmes. "With its grandmother," answered Holmes promptly. So you see friends, we are a good way behind hand, and have to make up for lost time "To cure, is the cry of the *past, to prevent,* the divine whisper of to-day."

Let us have no mistakes to regret, no wrong teaching to undo. And indeed when we consider how short the school-life of a Muhammadan child is we cannot afford to waste any time in mistakes I believe the Kindergarten to be, not only the most effective method, but the *only* one that can be called educative Other methods, are not only non-educational but anti-educational And Froebel's is the only rational because the only natural system.

Then I would advocate the establishment of home classes for older girls and women—Let several families combine and ask a thoroughly well qualified English or Indian lady to teach them from two to three hours daily—Let examinations be held and prizes offered in such towns by way of encouragement. The course prescribed by a Committee or Association might include Domestic Economy, Hygiene, Physiology. If you, gentlemen, encourage your wives and daughters by showing your interest in the results of the examinations, etc., I am certain it will act as an additional incentive to them to learn.

Next, the home classes might meet quarterly in some private drawing room for lectures on "Ambulance," The education and care of little children," "Women in other lands"—and what not ?

Might we not introduce more literature into our homes —Magazines and periodicals would broaden the outlook of those who are able to see so little of the outside world.

I do not recommend any sweeping change I do not think we are ready for it yet, but I believe that you must begin straight away to educate your girls.

Hardly a month ago I was pleading with a Muhammadan father to send his little ten-years old daughter back to school. "She is so clever!" I urged as an additional reason for her continuing her studies. "That is just it," cried he in alarm. "It is because she is so clever, and we do not know what harm she may do with the knowledge she acquires!" It was useless to argue with such a man - It was as ridiculous, as some one remarked, as saying, "It were better for a man to have no legs to walk with because his legs might some day lead him into a ditch!". "We do not know what harm she may do with the knowledge she acquires!"—Gentlemen, is not that the sentiment which is at the root of all your dislike to Female Education?

Ah it is not *knowledge* but *ignorance* you have need to fear—Shakespeare says:

"Ignorance is the curse of God—

Knowledge the wing wherewith we fly to heaven." Yes, it is the powerful wing on which we take our flight sunwards, heavenwards, Godwards, and who is there will dare to deny to women this golden pinion?

Now comes the question, "*How* shall we educate our girls?"

Let us at the onset guard against the mistake of addressing ourselves to the intellect exclusively True education is kaleidoscopic in its aim.

We cannot thwart nature—If we would educate truly we must do so in conformity to her eternal laws—Any attempt to develop one side of human nature at the expense of the rest must be either grotesque or tragical and not improbably both.

The education, therefore, will consist in the development of the whole nature—spiritual, physical, mental, moral, social, political.

"How are we to obtain such an education for our girls?" you ask, and I answer unhesitatingly.—Establish through the length and breadth of this land well-equipped, well conducted Kindergartens—Carry Froebel's principles into your primary and secondary schools, for in its scope the system reaches from the cradle to the university.

Remember "a nation rises no higher than its mothers." Do you think this too strong a statement? Hear a still stronger.

"All the trophies of the ages,
Are from mother-love impearled.
For the hand that rocks the cradle,
Is the hand that rocks *the world*"

Indeed, you are checking your own flight when you do not educate the women. Trying to mount so to speak *on one wing.*

For
"The woman's cause is man's: they rise or sink.
Together, dwarfed or godlike, bond or free;
If she be small, slight natured, miserable, how
shall men grow"?

I am aware that I am no herald of a new truth. For the past quarter of a century Female Education has been the topic of essays, discussions, pamphlets. But iteration is next inspiration, and I wish to add my voice to the many that urge insistently and eternally "Do noble deeds, don't dream them all day long."

Again looking at things from an altruistic point of view, think how we are robbing the world of the ministry of woman—ministry that can only be performed by her.

Ah! would that you could see the noble wowen I have seen in the West, walking white-robed and spotless through the world, brightening sad lives, lifting heavy burdens, taking their place in the world of the wronged, of the oppressed, of outcast babes, and of lives lost in ways unutterably worse than death Women at whose coming sorrow and darkness and sin take flight, at whose advent the desolate look up in hope; the drunkard hangs his head abashed and wishes he were a nobler man Ah, if you could see these angel ministers, as I have, telling of hope and comfort to the captives in prison. Women in short who wield over fallen lives a power purer than the air of heaven, stronger than the seas of earth! And if you could turn your gaze homewards again and contrast our women's cramped and dwarfed lives bounded only by the narrow horizon of the Zenana with these, you would feel as I do, that the world—our sad world of India, is the poorer because our women have never been trained to do the work in that surely God has sent them here to do—that women of other lands have to come to do because these have not realised what their divine mission on earth is!

is bound up in it Indeed, there can be no national progress so long as this evil exists

"The foundation of a state is the education of its youth," says Dionysius—I would go a step further and say "The foundation of a state is the education of its *women*." Mr. A. O. Hume in a letter to Mr Malabari said:

"Nations in the long run always get precisely as good a Government as they deserve, and no nominal political enfranchisement will in practice prove more than a change of evil unless such an advance has simultaneously or antecedently been made along those other lines as shall render the country qualified to assimilate its improved political status.

"Political reformers of all shades of opinion should never forget that unless the elevation of the female element of the nation proceeds *pari passu* (with an equal pace) with their work, all their labour for the political enfranchisement of the country will prove vain."

But there are are nearer issues at stake than political and national.

Dr. Duncan at the Madras Convocation in 1891 said "If there be any truth in the belief that intellectual endowments take more after the mother than the father the question becomes all the more serious The child of parents possessing well developed bodies and minds begins life with faculties and capacities, which in proper conditions and in due course grow up to the maturity of manhood or womanhood. Not so with the offspring of a mother whose faculties are infantile and undeveloped. The mental development of the child is speedily arrested, the faculties retaining to the last the inherent weakness of their maternal source, a weakness which will prevent them from ever growing into a vigorous maturity. Do men gather grapes of thorns, or figs of thistles? Can the plenitude of intellect and moral power be reaped as an inheritance from a mother, perhaps a child-mother, whose faculties have lain dormant, or if at all roused to activity, have been arrested in their development almost at the outset? For the sake of posterity," said he in conclusion, "I entreat you to do what you can to remove one of the greatest blots on your social system."

**Oh, the pity that other nations have to entreat us to give to our women what is their birthright! Think too my friends how posterity will rise up to curse us because we have deliberately fettered it by leaving half this generation uneducated!**

Poor little untrained mother, poor little untrained children! Little blurred human scrawls blotted all over with other people's mistakes! Methinks the very angels of God must cease their worship to weep over you!

Oh, you father, are you not primarily responsible for the fact that when your little son, that son who was the apple of your eye, lay a-dying—his little fevered hands beating wildly on the coverlet, the curly head tossing restlessly to and fro on the pillow, she whose divine mission it was to alleviate the suffering knew positively nothing of the remedies that a school-girl would fly to almost instinctively in the West.

Nay, moreover, was it not due to her ignorant mistakes in carrying out the doctor's orders that the medicines proved ineffective, and that the disease baffled the best medical skill.

It was an old Greek philosopher who said: "There is only one good, namely knowledge, and only one evil, namely Ignorance" -and how great an evil this is I leave you to say.

What grander duty can a woman have than to prompt man to noble action, and yet were it not unchivalrous you would be obliged to confess, that some of the actions you most regret in life have been due to the influence of the women folk who live on a lower plane morally and intellectually than yourself, and to gain whose approbation you sank your ideals, violated your principles, repudiated your vows—in short, were untrue to your better nature

You complain that you are helpless to effect reform in your community, because of the opposition of the women, and everyone here is aware that the greatest strangler of all reform in India is the old grand-mother—well, are you not raising another set of opposers in the new generation by neglecting to educate your girls Is reform never to begin? Are we to perpetuate an evil that makes India a by-word with other nations.

Bear with me, my brothers, I am not speaking as an outsider. I am pleading for my sisters, the gentlest, meekest, most neglected in the civilized world, save those in China. They cannot plead for themselves, and I am here to do it for them in the name of womanhood.

It is not a personal question, but a national one and you have no right to decide it personally. The national progress

consulted, her opinion asked, her sympathy sought for. Yet all the time she is miserably conscious she has no advice to offer, no help to give, even should it be sought. The untrained, uneducated mind is just awakened enough to know this and the result is a dumb, resentful, but utterly futile protest against her fate. I have given only the negative side of the picture. There is the positive one, the one that makes the Zenana the last place a man would turn to in order to find rest and quiet The Zenana with its petty jealousies, petty strifes ceaseless gossip, unending turmoil. These are the things that rob a man of his respect for women in India.

But you shall not blame her, gentlemen! Given the same chances as the Western, the Oriental woman has proved herself indisputably her equal in every womanly virtue. Treat her like a doll and she behaves like a doll and is only a degree less inane: treat her like a spoilt child and she behaves like a spoilt child and renders your life a burden; but treat her like a good and noble *woman* (with all that means) and she behaves like one, and verily there is no more beautiful thing on this side Paradise—I've heard it said! No! No! you shall not blame her for that dark Zenana where the light of knowledge cannot penetrate—for your own hands have drawn the blinds, your own fingers locked the prison doors where woman has been incarcerated for centuries. Nor must you blame her that her judgment has been dwarfed, her decision weakened, her powers of perception blinded through the long years.

Nor yet again that she is a bundle of superstition, and that her life is spent in terror of evil spirits and satanic influences generally *She* is not to be blamed when you turn homeward at eventide after a hard day of toil that instead of finding a counsellor and friend you are yourself made the recipient of a long list of petty, not to say frivolous, complaints.

When instead of seeing your little children being trained and nurtured with all the tender care that such delicate human plants need, you find the child-mother has less idea of their management than the servant she keeps to look after them. That she either spoils them by over-indulgence, or crushes their spirit by undue severity. That all your efforts at disciplining them are rendered futile by the fact that she teaches them deception in order to avoid the pain of seeing them punished.

What joy so great that her smile of pleasure will not render it tenfold more joyous? What care so heavy that the mere recital of it to her will not lighten? And ever somehow those clear far-seeing eyes, far-seeing, because of their very purity, will see a way out of the difficulty—be it never so dark. And all unconsciously the great strong man of toil shapes his opinions, guides his motives, lives his life under the searching gaze of those prayer-lit eyes.

Surely 'twas she who sat as model for the word painter Otway's inimitable portrait.

"O woman! lovely woman! nature made thee
To temper man; we had been brutes without you
Angels are painted fair to look like you:
There's in you all that we believe of heaven:
Amazing brightness, purity, and truth.
Eternal joy, and everlasting love."

'Tis to the same unfailing counsellor, stalwart sons, and gentle daughters turn in their hours of perplexity She wears no royal diadem upon that broad calm brow, save that which God placed there when He make her a mother. She holds no royal sceptre in her soft strong hand save that of Love and yet no monarch ever held greater sway over his subjects than she in that small realm named "home!" Oh happy vision! One turns from it with tear-filled eyes to the Zananas of India. Significant is it that there is no word in any of the Indian languages to correspond to the grand old Anglo-Saxon "home." The Zenana with its many inmates all herded together like sheep can hardly be called a home. There is the shrinking little mother whose individuality has long ago been merged in that of others, whose spirit has long ago been crushed by a tyrannizing mother in-law.

'Tis to their grand-mother rather than to her her sons turn in their difficulties. And what wonder? Was she not scolded and sometimes even struck in their presence. They never ask her opinion on a subject, and she would never dream of forming one. And she does not complain—She accepts the inevitable submissively—and when she is mother-in-law in her son's homes she will treat their wives as she has been dealt with—and verily there in no tyrant like the one who has herself been tyrannized over.

With regard to her husband she is perhaps not so quiescent. Deep down in her heart there is a wistful longing, never expressed, but always there, that she might be

dominion, is he ascending into the higher sphere of being, and claiming relationship with Deity." Thus, the great Gladstone.—The Western treats woman as his guide, counsellor, friend; the savage treats her as you would expect one in whom the animal nature predominates to do; the native of India gives to woman a place midway between these two extremes. But, my brothers, if India would take her place in the van-guard of civilization she must put woman in the place God meant her to occupy Ability to read is one great distinction between human beings and brutes The wisest dog cannot be taught a single letter; whereas a little child can be taught to read fluently, and yet we are confronted with the fact that in a population of 60 millions of Muhammadans only 4,000 girls attend school!

Gentlemen, I say this a crying shame that Muhammadan women are thus kept in ignorance and treated like the lower instead of the higher creation.

It is a menace to civilization and makes the Western world scoff, and justly, at our Oriental philosophy, our Oriental schools and our Universities and Colleges.

Every graduate of our Universities is under a solemn vow to promote the cause of Education, and is a traitor to it when he keeps his women illiterate.

Why, when the century is resonant with notes of advance, all swelling the grand march of Progress that the heirs of the civilization of twenty centuries are playing on the organ of time, it seems to me the deepest sounding note is that of Education generally, and Female Education in particular.

Who makes the *home* in any land? *Woman* of course! No wonder, no wonder, then, that India presents the pathetic spectacle of a country without home! She has palaces and houses, and alas hovels, but no homes!

Would you know how poor that leaves you?

Then peep into the humblest Western home— sunlit and heaven-blessed where reigns that white-souled being who bears the sacred name of mother

What is it makes the toil-tired bread-winner of the family tread so joyously as he sees the light stream forth from his cottage 'Tis surely that behind the curtained window is the sharer of his joys and sorrows—that counseller and friend to whose angel ministry he owes the noblest moments of his life.

(Junior) 1. Tie between Gholam Akbar, Masud-ul-Hasan.

8 Hurdles.
1. Abdus Sattar, 2. Syed Hosain.

9 Quarter mile
(Senior) 1. Syed Hosain, 2. Muhamman Akram, B.A.
(Junior) 1. Idris 2. Rahmat-ullah

10. Pudding the Weight,
1. Masud Hosain, 26 feet 9½ ins. 2. Nawab Hosain.

11. 220 yards (under 12).
1. Azim-uddin, 2. Ismail.

12. Open Handicap—220 yards.
1 Abdul Wahid, 2. Mahmud ul-Hasan.

13. One mile.
1. Aziz-ul-Hasan, 2. Abdus Sattar.

Mr. J. C. Rees was starter, and Mr. Cornah and the other members of the English staff were judges. The marks for the medals were given as follows :—

| Events | | 1st | 2nd | 3rd |
|---|---|---|---|---|
| 100 yards | ... | 7 | 4 | 2 |
| Hurdle | ... | 7 | 4 | 2 |
| Quarter | ... | 8 | 5 | 3 |
| Half mile | ... | 7 | 4 | 3 |
| Mile | ... | 9 | 6 | 3 |
| Cricket Ball | ... | 4 | 2 | 1 |
| High Jump, Long Jump, Pole Jump, Putting the Weight | ... | 5 | 3 | 1 |

It is to be hoped that the Athletic Team chosen for the University Tournament will make themselves as fit as possible and will not trust to luck.

J. H. T.

## Female Education.

"When we are seeking to ascertain the measure of the conception when any given race has formed of our nature, there is, perhaps, no single test so effective as the position which it assigns to women. For, as the law of force is the law of the brute creation, so, in proportion as he is under the yoke of that law, does man approximate to the brute ; and in proportion, on the other hand, as he has escaped from its

Unfortunately for him he was disqualified for a "post entry," there being a rule prohibiting such entries. The Hurdle Race was good; Sattar and Syed Hosain coming over each flight together, the former finally winning by about three feet. Aziz-ul-Hosain won the mile race in very fair style, though his time was not good.

This vear the prizes included a gold medal, presented by Mr. Pape, for the best all round performance in open events, and a silver medal, given by the College, for the best junior (under 16). The first was won by Syed Hosain and the second by Idris.

The prizes were handed to the winners at the close of the sports by Mrs. Woodwright, who was heartily cheered for her kindness.

The list of events and the names of the first and second in each event are given below.

1. Throwing the Cricket Ball
   1. Masud Hosain .. 90 yards 2 feet 11 ins.
   2. Ashfaque Hosain 90 yards 1 foot.

2. Pole Jump.
   1. Aziz-ul-Hasan, 2. Muhammad Akram (II Year).
   7 feet 5 inches.

3. Junior Half Mile.
   1. Idris, 2. Rahat-ullah.

4. Long Jump (a) Senior.
   1. Syed Hosain, 2. Abdus Sattar. 18 feet 7 ins.
   (b). Junior, 1. Idris 2. Gholam Akbar. 14 feet 8 ins.
   (c). Under 12 1. Ismail, 2. Sikandar Hyat. 9 feet 8 ins.

5. Half Mile.
   1 Syed Hosain, 2. Aziz-ul-Hasan.
   Ali Raza did this distance in 2 mins. 16 secs., Syed being 15 yards behind.

6. Hundred yards,
   (Senior) 1. Syed Hosain, 2. Abdus Sattar.
   (Junior) 1. Idris, 2. Rahat-ullah.
   (Under 12) 1. Azim-uddin, 2. Ismail.

7. High Jump.
   (Senior) 1. Ashfaque Hosain.
   2. Tie between, Aziz-ul-Hasan, Zahir-ul-Hasan.
   4 feet 10 inches.

Elphinstone College by 13 runs. The Parsees were beaten by 197 runs; our chief scorers being Razak, 63, Masood 49 and Ahsan 83 Shafgat in the two innings took 16 wickets at an average cost of 5 runs.

We drew with the Hindoos, both sides scoring heavily. Ali Hasan scored 113 and Masood 77.

In the Test Match, six Aligarh representatives were played, and in all four innings proved themselves chief scorers for their sides.

The final match was played against Mr. Ashton's XI, which we won by 10 wickets. Ahsan played a fine innings of 104.

News from Agra comes to say that the College is doing excellently in the Tournament, full particulars of which will be given in our next number

---

The Manager of the "Monthly" sends us a financial statement for the year 1903 showing a debit balance of about 50 Rs. To facilitate the keeping of accounts, we intend in future to make all subscriptions terminate in December each year.

---

At a meeting of the College Trustees held on January 31st, Nawab Bahadur Syed Husain Belgrami was elected President, and Messrs. S. Abdul Kadir, Lahore S. Abdullah, Aligarh, Syed Ali Imam, Patna, Trustees

---

## Athletic Sports

The Annual Athletic Sports of the College and School were held on Friday and Saturday, January 8th and 9th. It was an unfortunate date, so far as training and good performances were concerned, as the College and School had only opened four days previously after the Christmas holidays. But the Sports could not be put off, because the University Tournament had been fixed for January 25th and the following days, and our team for the Tournament was to be chosen from the winners in the Sports.

Owing to this reason and to the general carelessness over training there were no very brilliant performances. The best race was the Senior half mile, in which Ali Raza won easily in the good time of 2 mins. 16 secs.

gives a scheme for the proposed School. The letter is a strong plea for a means of a liberal education; and if Arabic is to be a classically studied language—and it will be a reproach to India if the beauty and value of Arabic is to be thrust aside in the rush of these material, matter-of-fact days—now is the opportunity for Aligarh to offer a fit and ready store-house for a literature which the world cannot afford to lose.

---

There may be some Old Boys who would like to hear of an appointment vacant in Somaliland. Colonel Swayne, Consul General of the Protectorate asks for the services of a Muhammadan, as District Officer at Berbera on a salary of £200 a year Candidates should be experienced in magisterial and judicial work.

---

The Siddons Union Club is appealing for money to allow of an extension of the Club building which is indeed sorely needed. M. Ghulam Jabbar has already given Rs 500 and has promised Rs 500 more. Other smaller amounts have been collected, and well-wishers of the Union have now an opportunity of turning their zeal to a practical account.

---

The College heard with much regret of the death of Lord Stanley of Alderley, and a meeting representative of the Trustees, staff and students passed a vote of condolence on the occasion. Lord Stanley was the first President of the Aligarh Association, which was represented at the funeral by Major S. Ali Hasan.

---

Mr. T. W. Arnold has accepted an appointment in London and will leave India in March. He is coming to Aligarh on his way to Bombay at the end of this month. His departure will mean a loss to the Muhammadans of Northen India, but it is to be hoped that he will be able to come out again even if only as a cold-weather visitor.

---

The MacDonnell House is now finished and will be occupied from March 1st.

---

Our Cricket team did very well in Bombay during the Conference week and the succeeding days, though the first match ended unfavourably when we were beaten by the

making and of the general interest created by the Conferen Such feelings were, be said, a sign of progress; for suc gathering would have been impossible twenty years a He touched hopefully too on the growing wish for a Muha madan University.

---

Great enthusiasm prevailed in discussing the question female education; and in this number we print, with M Sorabji's permission, the eloquent appeal she made to t Conference on this subject.

---

A proposal by Mr T. W. Arnold whose presence a zealous work at the Conference was most welcome to many friends, was carried, arranging that a Commit representing all the provinces of India should be elected reorganise the constitution of the Conference.

---

Mr. Arnold also, supported by Mr. Gardner Brown, sp on the subject of a Muslim University; which propo brought forward by Mr. S. Abdulla and Nawab Mohsi Mulk was warmly received.

---

Much interest was aroused in the Kindergarten metho education and also in the display given by the blind boys

---

Visitors from Aligarh owe many thanks for the court and hospitality they met with in Bombay. Mr Kazi Ka uddin the Joint Honorary Secretary, the President and son Mr. Fiaz Tyabji and Nawabzada Nasrullah Kha staunch friend of our College are among those who made visit such a pleasant one.

---

With much pleasure we announce that the Nawal Bahalwalpur has granted Rs. 2,000 yearly to the Colleg commemoration of his investiture.

---

Nawab Fiaz Ali Khan has promised Rs. 500 for the thering of a School of Arabic learning.

---

Mr. Gardner Brown has written a circular letter on subject, which goes into the question very thoroughly

# The Aligarh Monthly.

February, 1904.


## College Notes.

It is only necessary to refer briefly to the Educational Conference which was held at Bombay during the last week of December. The opening day found a good gathering of Delegates, and though at subsequent meetings there was at times only a thin audience, the greatest zeal and fervour for the cause of Muhammadan progress was always evident. Critics may cry out for results, and year by year ask "What have you done?" but no one can deny that there is a fervent desire for progress existing, and the strong point of these yearly gatherings is that they quicken and spread this desire, and bring together a very considerable number of people, whose minds and views must necessarily be enlarged, and who take back to their distant homes a little store of new ideas and new aspirations, which are bound to be scattered broad-cast, like the sower's seed, and some of which will in due season bring forth an appreciable harvest.

At the opening ceremony, Lord Lamington, the Governor of Bombay, made a short speech full of kind encouragement, after H. H. the Agha Khan had opened the proceedings and the Hon'ble Mr. Justice Badruddin Tyabji had been elected President.

---

H. H. the Agha Khan spoke of the widespread sympathy that existed with regard to the efforts Muhammadans were

# Mr. MURRAY'S UNIVERSITY ANNUALS

## LITERATURE.

SHAKESPERE AND HIS PREDECESSORS IN THE ENGLISH DRAMA. By F. S. BOAS, Professor of English Literature Queen's College, Belfast. Crown 8vo, 6s

THE JACOBEAN POETS. By EDMUND GOSSE. Crown 8vo, 3s. 6d.

OUTLINES OF ENGLISH LITERATURE By WILLIAM RENTON With illustrative Diagrams Crown 8vo, 3s. 6d.

THE ENGLISH NOVEL from its Origin to Sir W. Scott. By WALTER RALEIGH. Professor of English Literature. University College, Liverpool Crown 8vo. 3s 6d

FRENCH LITERATURE By H G KEENE, Wadham College, Oxford: Fellow of the University of Calcutta. Crown 8vo, 3s.

LATIN LITERATURE By J. W MACKAIL, Balliol College, Oxford. Crown 8vo. 3s. 6d

## HISTORY and ECONOMICS.

HISTORY OF RELIGION A Sketch of Primitive Beliefs and Practices, and of the Origin and Character of the Great Systems. By ALLEN MENZIES, D. D, Professor of Biblical Criticism in the University of St. Andrews Crown 8vo. 5s.

ENGLISH COLONIZATION AND EMPIRE By A CALDECOTT, M.A (Camb. and Lond), sometime Fellow and Dean of St. John's College, Cambridge, University Extension Lecturer under the Cambridge Syndicate, Professor of Logic and Philosophy at King's College, London With Maps and Plans. Crown 8vo, 3s. 6d. With a New Chapter, bringing the work entirely up to date, by F.A. KIRKPATRICK, M A, University Extension Lecturer.

THE RISE OF THE BRITISH DOMINION IN INDIA, from the early days of the East Indian Company to the Conquest of the Panjab. By Sir ALFRED LYALL, K.C B With Coloured Maps. Crown 8vo, 4s. 6d.

THE FRENCH REVOLUTION. By C. E. MALLET, Balliol College Oxford. Crown 8vo, 3s. 6d.

GREECE IN THE AGE OF PERICLES By A. J GRANT, King's College, Cambridge, and Staff Lecturer in History to the University of Cambridge. With Illustrations. Crown 8vo, 3s. 6d.

THE USE AND ABUSE OF MONEY. By W. CUNNINGHAM, D.D., Fellow of Trinity College, Cambridge, Professor of Economic Science, King's College, London. Crown 8vo, 3s.

# علیگڈھ منتھلی

| جلد ۲ | مارچ سنہ ۱۹۰۴ء | نمبر ۳ |
|---|---|---|


## مسٹر آرنلڈ کی رخصت ہندوستان سے

مسٹر آرنلڈ جو سات سال تک مدرسۃ العلوم علیگڈھ میں پروفیسر رہے اور اب تین سال سے گورنمنٹ کالج لاہور میں پروفیسر فلاسفی اور پرنسپل اورینٹل کالج لاہور تھے۔ انڈیا آفس میں اسسٹنٹ لائبریرین مقرر ہوکر ولایت تشریف لے گئے۔ ہمارے کالج میں قیام کے زمانہ میں جو ہردل عزیزی کہ مسٹر آرنلڈ کو حاصل رہی بہت کم پروفیسروں کو نصیب ہوئی ہے۔ یہاں سے جانے کے بعد بھی مسٹر آرنلڈ کو اس کالج سے بالخصوص اور مسلمانوں سے بالعموم بہت دلچسپی رہی اور معلوم ہوتا تھا کہ گویا وہ ابتک اسی کالج کے اسٹاف کے پرجوش ممبر ہیں۔ ایسی حالت میں یہ ممکن نہ تھا کہ مسٹر آرنلڈ اپنے علی گڈھ کے دوستوں سے ملے بغیر ہندوستان چھوڑتے۔ ۲۵ فروری کو مع اپنی میم صاحبہ و دختر نیک اختر کے علیگڈھ تشریف لائے اور دو روز قیام کیا۔ اُنکے قیام کے زمانہ میں طلباء کالج کیطرف سے ایڈریس۔ ٹرسٹیان کالج کی طرف سے ڈنر و گارڈن پارٹی۔ انجمن الفرض کیجانب سے ایوننگ پارٹی اور ایڈریس دیا گیا۔ اور ان ہی موقعوں میں سے ایک میں مولوی حالی نے ایک الوداعی نظم پڑھی جو ہدیۂ ناظرین ہے

(ھدیۃ المحب الی الحبیب)

| | |
|---|---|
| دوست [illegible] بھی تھا عجب نعمت ہی یہاں | ہو نہیں سکتا بدل اک دوست کا سارا جہاں |

دوست اور بھائی ہیں دونوں قوتِ بازو مگر
دوست گر بھائی نہو تو اُس میں کچھ نقصان نہیں
دوست کے ملنے میں ہی جو لطف ظاہر ہی مگر
ہجر میں جیتے ہیں اُس کے وصل کی امید پر
آنکھ سے اوجھل نہیں ہوتا کبھی اُس کا خیال
اُس کی رخصت سے قلق ہوتا ہی گو دل کو مگر
چپ کھڑا ہی کوئی۔ ہی بڑھ کر گلے ملتا کوئی
ہی یہہ گو غم کا سماں۔ لیکن مبارک ہی وہ غم

جب کروگے وزن پلہ دوست کا ہوگا گراں
گر نہ بھائی دوست ہو بدخواہ ہی وہ بے گماں
ہی بچھڑنے میں بھی اُسکے اک عجب لذت نہاں
اس لیئے مہجور بھی رہتے ہیں اُسکے شادماں
دوستوں کے سامنے ہی وہ رہے جاکر جہاں
یاد رہتا ہی سدا وہ وقت رخصت کا سماں
ایک کا اُمڈا ہی دل۔ ہیں ایک کے آنسو رواں
جس سے ظاہر ہوں محبت اور صداقت کے نشاں

جسم سے انسان کے ہو جان رخصت جس طرح
ل کے پردیسی چلے پردیسیوں سے اس طرح

آج ہم اُس دوست سے افسوس ہی ہوتے ہیں جدا
قوم کا ایک اینگلوسکسن یہ دلسے خیرخواہ
دین کا پکا مسیحی۔ پر مسلمانوں کا دوست
جبکہ ہم کو دی گئی تھی یہہ خبر قرآن میں
دین جس کا غیر اور بیگانہ جسکی نسل و قوم
خیرخواہی میں ہماری اُس نے سب یکبارگی
جس قدر یہاں پیش آئیں ہمکو قومی مشکلات
کر دکھایا اُس نے وہ جو حکم تھا انجیل میں
ہی جدائی شاق اُس کی پر نہیں جب اختیار
ٹھان لی ہی اُس نے گو ہم سے جدائی کی مگر

دوستی پر جس کی ہم کو فخر کرنا ہی بجا
ہند کی ایک خستہ و درماندہ شکستہ قوم کا
جس نے ہم کو وہ زمانہ یاد پھر دلوا دیا
"پاؤگے عیسائیوں کو دوست تم سب سے سوا"
ملک جس کا دُور ہم سے اور زباں نا آشنا
تفرقے یہہ عارضی دل سے دیئے اپنے مٹا
حاضر و غائب ہمارا اُن میں ساتھ اُسنے دیا
"تم پرایوں کا بھی اپنوں کی طرح چاہو بھلا"
ہی وُہی مرضی ہماری جو کہ ہی اُس کی رضا
ہم تو جب جانیں ہمارے دلسے ہو جائے جدا

مائدہ آیت ۸۵ -

قصہ کوتہ۔ ہم سے اب چھٹتا ہے پیارا آرنل
فخر سے ہم جس کو کہتے تھے "ہمارا آرنل"

کہتے ہیں دُوری میں ہو جاتی ہے اکثر یاد کم ۔۔۔ پر کریں گے اُس کو دُوری میں زیادہ یاد ہم
ہند میں رہتی تھی کثرت سے اُسکے ملنے کی اُمید ۔۔۔ اس لیئے اُس کی جُدائی کا بار رہتا تھا غم
پر یہ ظاہر ہے اب اُس کی یاد ہے اُس کا بدل ۔۔۔ اس لیئے یہ پھانس اب کھٹکا کریگی دمبدم
ایسے غمخواروں کو کوئی کس طرح دل سے بھلائے ۔۔۔ آکے جو پردیس میں کھاتے ہیں بیگانوں کا غم
زندگی ہے جب تلک باقی نہ بھولیں گے کبھی ۔۔۔ آرنل کے مارسین کے بِک کے احسانات ہم
مرحلے دشوار جو یہاں ہم کو پیش آتے رہے ۔۔۔ وہ رہے ہمدم ہمارے ہر جگہ اور ہمقدم
جن جوانمردوں کے یہ برتاؤ ہوں غیروں کیساتھ ۔۔۔ کیوں نہو قوم اُن کی عالم کی نظر میں محترم
ہندیوں سے یہ ہیں گر اخلاق انگلش قوم کے ۔۔۔ تو یہ سمجھو بک گئے ہات اُنکے ہندی بے درم
جس علم کی ہے دلوں میں خلق کے بوڑی گڑی ۔۔۔ تاقیامت سرنگوں وہ ہو نہیں سکتا عَلَم
ہے محبت ہی کہ وحشی جس سے ہو جاتے ہیں رام ۔۔۔ جسکے آگے گردنیں ٹیڑھوں کی ہو جاتی ہیں خم

جو ہری ناسوروں کو بھر دیتا وہ مرہم ہے یہی
جس سے جن تسخیر ہوتے ہیں وہ خاتم ہے یہی

ہے محبت کی کہانی میں بھی کیا دل بستگی ۔۔۔ ختم پھر ہوتی نہیں یہ داستاں جب چھڑ گئی
آرنل کی مہر والفت کے بیاں نے یک قلم ۔۔۔ یاد سے عظمت بھلادی اُسکے علم و فضل کی
ذکر اُس کا۔ ہو تو جس میں علم کا اُس کے بیاں ۔۔۔ حدِ ناقص ہے۔ نہ قیدِ فصل ہو جس میں لگی
علم میں جو اُس کا درجہ ہے وہ ہو کیونکر بیاں ۔۔۔ مونھ ہے چھوٹا فی المثل اور بات ہے یارو بڑی
کارنامہ اُس کا ہے جو دعوت اسلام ہے ۔۔۔ اُس کے علم و فضل پر برہان کافی ہے یہی
مشرق و مغرب میں صدیوں تک رہیگی یادگار ۔۔۔ اُس نے جو تاریخ پر ڈالی ہے آکر روشنی
دعوتِ اسلام تھا ایک ایسا لاینحل سوال ۔۔۔ جسکی اصلیت پہ تھی ظلمت پہ ظلمت چھا رہی

ہو رہے تھے سب مسیحی بدگماں اسلام سے — جبر پر سمجھے ہوئے تھے جو بنا اسلام کی
دونو فرقوں کے دلونمیں تھا بڑھا یہانتک غبار — ہوگئی تھی بیچ میں دیوار ایک گویا کھڑی
ایک مدت تک رہا تاریخ پر پردہ پڑا — شاہد حق نے نہ جلوہ اپنا دکھلایا کبھی
سب سے پہلے خود مسلمانوں کو لازم تھا کہ وہ — جبکے الزام سے اسلام کو کرتے بری
پھر مناسب تھا مسیحی کرتے اس عقدہ کو حل — جن کی کوشش سے ہیں نکلی غلطیاں اکثر دبی
پر نہ کوئی کرسکا سر یہ مہم جز آرنل — نام پر گویا اسی کے فتح تھی اس کی لکھی

اُسنے جو لکھا اُسے منوا دیا بے چون و چند
مذہب و تاریخ دونو اُسکے ہیں احسانمند

توڑنے والی تھی یہ تصنیف ہمت کی کمر — کامیابی غیر ممکن اُس میں آتی تھی نظر
تھی مصنف کو ضرورت اُسمیں جس سامان کی — جستجو میں اُس کی طے کرنے تھے اُسکو بحر و بر
ڈھونڈنے تھے اُسکو شرق اور غرب کے وہ واقعات — جنسے تھی تاریخ ساکت اور مورخ بے خبر
مشکلوں کا تھا اُسے ہر ہر قدم پر سامنا — ایک مشکل سے تھی مشکل دوسری دشوارتر
قافلہ کا کھوج وہاں اُس کو لگانا تھا جہاں — نقش پا تھے اور نہ آواز درا تھی راہبر
مشکلیں اس کام کی کرنی بیاں اور نظم میں — سمجھو ایسی ہی مثال اس کی بس اے اہل نظر
جیسے اک گونگا اشاروں سے شب تاریک میں — سامنے لوگوں کے دے لکچر طبیعیات پر
جز مصنف دردسے اُسکے کوئی واقف نہیں — جھیلتے ہیں جو یہ کڑیاں کچھ اُنھیں کو ہی خبر
آرنل کا مذہبی دنیا پہ جو احسان ہے — ہو نہیں سکتا ادا شکر اُسکا قصہ مختصر
اب دعا یہ ہے کہ پردیسی مسافر خیر سے — برکتوں کے سایہ ہی سایہ میں سب جا پہونچیں گھر
آرنل مس آرنل مسز آرنل سب کے لیئے — یہ سفر فتح و ظفر کا ہو وسیلہ سر بسر

آرنل سے فتح علمی جو ہوئی ہے آشکار
ہوں فتوحات آشکار اُس سے ایسے بیشمار

# علی گڈھ منتھلی اور اُسکا آمد و خرچ بابتہ سال گذشتہ

کالج میگزین کو مسٹر بیک مرحوم کی تجویز کی موافق پچاس روپئے ماہوار بطور امداد کالج فنڈ سے ملا کرتے تھے۔ سنہ ۱۹۰۱ء میں جب انسٹیٹیوٹ گزٹ دوبارہ جاری ہوا اور اُسکو کالج کی طرف سے سو روپئے ماہوار مد خرچ ملنا تجویز ہوا تو کالج میگزین کی امداد بند ہوگئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سنہ ۱۹۰۲ء کے آخر تک کالج میگزین ایک ہزار روپیہ کا مقروض ہوگیا۔ یہہ حالت دیکھکر مسٹر مارلیسن پرنسپل کالج نے حکم دیا کہ کالج میگزین بند کردیا جاے۔ چونکہ کالج کے ہواخواہوں کو کالج کے کسی انسٹیٹیوشن کا بند ہونا گوارہ نہیں پروفیسر عبدالقادر خاں اور سید سجاد حیدر بی۔ اے میرے پاس آئے اور کہا کہ میں اُنکا شریک ہوجاؤں اور ہم تینوں اپنی ذمہ داری پر کالج میگزین کی جاری رہنے کی پرنسپل صاحب سے اجازت لیں۔ مسٹر ٹننگ سے جب اس خیال کو ظاہر کیا گیا تو وہ بھی ہمارے شریک حال ہوگئے اور مسٹر مارلیسن کے سامنے یہہ تجویز پیش ہونے پر اُنھوں نے بھی اس شرکت میں اپنی آمادگی ظاہر کی۔ اور قرار پایا کہ قرضہ سابقہ کی ذمہ داری سے بچنے کے لیئے کالج میگزین کا نام بدلکر علی گڈھ منتھلی رکھا جائے اور آیندہ کالج سے اُسکے چلانے کے لیئے کسی قسم کی مالی امداد نہ لی جائے۔ اگر اس میں کچھ نقصان ہو تو شرکا اُسکو برداشت کریں اور اگر فائدہ ہو تو اُس سے اُس قرضہ کو ادا کریں جو کالج میگزین مرحوم کے ذمہ بورڈنگ ہوس کا ہی۔ ہمکو اُمید تھی کہ ہم اپنی کوشش اور کفایت شعاری سے سال کے آخر میں کچھ بچت دکھا سکیں گے۔ مگر افسوس ہی کہ ہماری توقع کے خلاف ہوا۔ اور سال گذشتہ میں بجاے فائدہ کے علی گڈھ منتھلی کو (۱۲۰۰ روپئے) کا نقصان اُٹھانا پڑا۔ مگر دنیا بامید قائم ہمکو اُمید ہی کہ سال موجودہ میں وہ کمی نہ صرف پوری ہوگی بلکہ کچھ بچت ہوگی جس سے ہم کالج میگزین مرحوم کے قرضہ کا کوئی حصہ ادا کرسکیں گے۔ سال گذشتہ کے نقصان کے بڑے سبب چار تھے۔ اول یہہ کہ حصہ انگریزی کی چھپائی کا نرخ بہت گراں تھا ہمکو ۸ صفحے کی چھپائی کے ۵ روپئے یعنی تقریباً ۱۰ روپئے فی صفحہ دینا پڑتا تھا اور اُس کی وجہ سے ہمکو کرائسٹ چرچ مشن پریس کانپور کو جہاں انگریزی حصہ چھپتا تھا اور جنوری و فروری کا حصہ اُردو بھی وہیں چھپا تھا ۱۱۰۰ روپئے یعنی اپنی سال کی آمدنی کا نصف سے زیادہ حصہ دینا پڑا سال موجودہ کے لیئے ہم نے اس نرخ چھپائی میں ۱۰ فیصدی کی کمی کرائی ہی جس کی وجہ سے ہمارے اخراجات میں ساٹھ یا ستر (۶۵ یا ۷۰) روپئے سال کی کمی ہوگی دوسری وجہ نقصان

کی یہ ہوئی کہ سال گذشتہ ہر مہینہ میں چار پانچ صفحے ون پی فنڈ کے چندہ دہندوں کی فہرست کے ہوتے تھے جسکے معنی یہ ہیں کہ آٹھ یا دس روپئے ماہوار یا سال میں تقریباً ۱۰۰ روپئے ون پی فنڈ کے نذر ہوئے۔ مگر اس سال ہم اس فہرست کی چھپائی کی اصلی لاگت وصول کرینگے۔ تیسری وجہ زیادتی صرف کی یہ ہوئی کہ کالج میگزین میں عموماً صرف ۱۲ صفحے انگریزی کے اور ۲۴ صفحے اُردو کے ہوتے تھے اور علی گڈھ منتھلی میں عموماً ۴۴ صفحے انگریزی کے اور ۲۳ صفحے اُردو کے چھپتے رہے اور بعض اوقات اُس سے کم وبیش بھی ہوا۔ مگر یہ زائد صرف ہمکو ناگوار نہیں کیونکہ اسکا نفع انھیں لوگوں کو پہنچا کہ جنسے ہم منتھلی کی قیمت وصول کرتے ہیں اور ایسے زائد صرف کو ہم آئندہ بھی روکنا نہیں چاہتے۔ چوتھا صرف جس میں آئندہ کمی ہوگی وہ محصول ڈاک ہے سال گذشتہ میں منتھلی محکمہ ڈاک میں جسٹری نہیں ہوا تھا اور اس سال رجسٹری ہو جانے کے باعث ہمکو محصول ڈاک نصف دینا پڑیگا غرضکہ سال گذشتہ کا آمد و خرچ حسب ذیل ہے اور سال حال کے لیئے اچھی امید ہے۔

## تفصیل آمد و خرچ علی گڈھ منتھلی بابت ۱۹۰۳ء

| آمد | رقم | خرچ | رقم |
|---|---|---|---|
| چندہ وصول از خریداران | [illegible] | چھپائی حصہ انگریزی جسمیں چھپائی حصہ اردو بابت جنوری و فروری بھی شامل ہے اور کرائسٹ چرچ مشن پریس کانپور کو ادا کی گئی ہے۔ | [illegible] |
| قیمت اشتہارات | [illegible] | چھپائی حصہ اُردو بابت دس ماہ جو ریاض ہند پریس علی گڈھ کو ادا کی گئی | [illegible] |
| نقصانات بابت ۱۹۰۳ء | [illegible] | محصول ڈاک | [illegible] |
| | | انعام مضمون نگاروں کو | [illegible] |
| | | تنخواہ عملہ | [illegible] |
| | | دفتری کو بابت جزو بندی و ٹائٹل پیج جمانے و ترشوائی | [illegible] |
| | | متفرقات جس میں محصول ریل حصہ انگریزی از کانپور و سائر خرچ شامل ہے۔ | [illegible] |
| | | قرضہ ایسے خریداروں کا جو جنوری ۱۹۰۳ء کے بعد خریدار ہوئے اور چندہ ۱۹۰۴ء کے کچھ حصہ تک باقی رہیگا۔ | [illegible] |
| میزان | ۱۶۸۶ [illegible] | | [illegible] |

سال گذشتہ کے متعلق جو عام اعتراض کہ سنا گیا ہی وہ یہ ہی کہ علی گڈھ منتھلی کی کوئی خاص پالیسی نہیں۔ اور ہم مانتے ہیں کہ مثل عصر جدید یا مخزن یا اُردوے معلیٰ کے ہمارا مقصد خاص نہیں معلوم ہوتا اس میں عمومیت زیادہ ہی۔ مگر پھر بھی یہ کہنا صحیح نہیں ہی کہ ہمارا کوئی مقصد نہیں ہی۔ ہمارا سب سے پہلا مقصد وہ ہی جو کالج میگزین مرحوم کا تھا اور جو ہر ایک کالج میگزین کا ہوتا ہی یعنی سابق طلبار کالج اور عام پبلک کو کالج کے حالات سے اطلاع دینا اور کالج کی موجودہ اور گذشتہ نسلوں کے درمیان تعلق قائم رکھنا۔ اور حصّہ انگریزی سے عموماً یہ مقصد پورا کیا جاتا ہی۔ ہمارا دوسرا مقصد جیسا کہ ہمنے ماہ جنوری گذشتہ میں لکھا تھا واقفیت عامہ کو ترقی دینا ہی۔ ہم لکھ چکے ہیں "کہ ہر شخص معلومات کے ریزے جا بجا سے جمع کرے اور اُنکو عمدہ شکل میں منتھلی کی دسترخوان پر چن کر یاران نکتہ داں کو صلاے عام دے اور اس طور پر تمہاری کمائی سے میں اور میری سے تم متمتع ہوں"۔ پس یہی ہمارا دوسرا مقصد ہی۔ اور اسکا دائرہ بہت وسیع ہی۔ ہم نہیں کہتے کہ ہم سال گذشتہ میں اپنے مقاصد میں بہت کامیاب ہوئے۔ مگر ہماری کوشش یہی ہی۔

ہم نے دسمبر گذشتہ کے پرچہ میں مجموعی طور سے اپنے مضمون نگاروں کا شکر کیا تھا اب ہم خصوصیت کے ساتھ اُن محسنوں کا ذکر کرتے ہیں کہ جنھوں نے سال گذشتہ میں ایک بار سے زیادہ اپنے مضامین سے علی گڈھ منتھلی کی عزت افزائی کی اور ہم اُن کو بموجب مقدار امداد کے جو اُنسے حاصل ہوئی ہی نمبر دیتے ہیں۔ اس معیار سے ہم سب سے اول مولوی محمد اختر صاحب کا نام لینگے جنھوں نے پردہ اور عورتوں کی آزادی کے متعلق نہایت قابلیت اور وسعت نظر کے ساتھ متعدد مضامین لکھے۔ اس میں شک نہیں کہ بعض صاحبوں کو اس قسم کے مضامین کا علی گڈھ منتھلی میں چھپنا ناگوار ہوا۔ مگر مضمون نگار کی قابلیت کی عموماً لوگوں نے داد دی اور زمانہ حال کے اکثر آزاد خیال نوجوانوں میں وہ مضامین نہایت مقبول ہوئے۔ اور بعض کے خیالات میں اُن مضامین نے تبدیلی پیدا کی۔ مولوی محمد اختر صاحب کے بعد ہمارے محسنوں میں چودہری خوشی محمد خاں صاحب کا نمبر ہی انھوں نے بھی چند بار اپنے مضامین اور نظم سے علی گڈھ منتھلی کی امداد کی۔ اُنکے مضمون موسوم بہ قومی امراض نے ملک میں ہلچل ڈالدی اور موافق اور مخالف مضامین کا سلسلہ اسوقت تک ختم نہیں ہوا ہی۔ چودہری صاحب کے بعد ہمارے نزدیک ہمارے نئے پہلوان حاجی محمد خاں کا نمبر ہی۔ انھوں نے بھی ایک بار سے زیادہ ہماری امداد کی۔ اور اُنکا

مضمون اردو زبان پنجاب میں بڑی شورش کا باعث ہوا۔ ہمکو خوشی ہی کہ علی گدہ منتھلی نے کم ازکم ایک مضمون نگار ضرور پیدا کر دیا۔ حاجی صاحب نے علی گدہ منتھلی ہی میں مضمون نگاری شروع کی اور چونکہ طبیعت قابل تھی اب وہ ہمارے عمدہ مضمون نگاروں میں سے ایک ہو گئے ہیں۔ حاجی صاحب کے بعد مجکو مولوی غلام بھیک صاحب بی۔اے نیرنگ کا شکریہ کے ساتھ ذکر کرنا چاہیئے۔ وہ حاجی محمد خاں کی طرح نئے لکھنے والوں میں نہیں ہیں اُنکے نام سے پبلک بخوبی واقف ہی۔ اُنکی تحریر پختہ اور رائے صائب ہی۔ اُنکے مضامین نے منتھلی کے ذریعہ سے ملک میں کوئی خاص ہل چل نہیں ڈالی۔ مگر ہم مشکور ہیں کہ اُنھوں نے منتھلی کیطرف متعدد بار توجہ کی۔ پانچویں نمبر پر حاجی محمد موسیٰ خاں صاحب رئیس دتاولی۔ سید فضل الحسن حسرت موہانی۔ ماسٹر نواب علی صاحب ایم اے۔ مولوی ظفر علی صاحب بی۔اے۔ مولوی غلام جبار صاحب وکیل ہائی کورٹ حیدرآباد کے نام نامی ہیں۔ انھوں نے سال میں دو بار اپنے مضامین سے علی گدہ منتھلی کی عزت افزائی کی اور ہم اُن کی اس توجہ کے ممنون ہیں۔ نمبر ۶ پر وہ سب بزرگ ہیں جنھوں نے کہ سال گذشتہ میں صرف ایک بار علیگدہ منتھلی کو اپنے اعلےٰ مضامین سے عزت دی اور ہمکو اُمید ہی کہ اس سال وہ اپنی قلمی امداد کو بڑہائینگے۔ اس زمرہ میں شیخ عبد القادر صاحب بی۔اے۔ اڈیٹر پنجاب آبزرور منشی محبوب عالم صاحب اڈیٹر پیسہ اخبار۔ مولوی حبیب الرحمٰن خانصاحب رئیس بھیکن پور۔ مولوی محمد عزیز مرزا صاحب بی۔اے صدر تعلقہ دار بیڑ۔ مولوی نظام الدین حسن صاحب ڈپٹی کمشنر آیت محال۔ خان بہادر مولوی خدا بخش خاں صاحب رئیس پٹنہ۔ صفی الدولہ حسام الملک نواب سید علی حسن خاں صاحب۔ شیخ حامد علی صاحب صدیقی سہارنپوری۔ مولوی حبیب اللہ خاں صاحب تحصیلدار ہاترس۔ بالخصوص ذکر کے قابل ہیں جن کے عمدہ مضامین سے علیگدہ منتھلی کی عزت ہوئی۔ ہمکو اُمید ہی کہ ہمارے عنایت فرما سال حال میں بھی اپنی قلمی امداد کو جاری رکھینگے اور علیگدہ منتھلی کی ترقی میں کوشاں رہینگے۔ اپنے محسنوں کا ذکر کرتے ہوئے ہمکو افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہی کہ جسقدر قلمی امداد منتھلی کو کالج کے بیرونی ہواخواہوں سے ملتی ہی اُسکا نصف بھی اندرونی دوست ہمارے لیئے نہیں کرتے۔ کالج ایک علمی جگہہ ہی۔ علیگدہ مسلمانوں کا مدینۃ العلم بنا ہوا ہی مگر افسوس ہی کہ ایک ماہواری رسالہ کے لیئے بھی اس مدینۃ العلم سے باوجود تقاضوں اور ترغیبوں کے اسقدر مضامین دستیاب نہیں ہوتے کہ بیرونی امداد سے ہم مستغنی ہو جائیں۔ ہمکو خوشی ہی کہ ہمارے بیرونی دوستوں کو علیگدہ منتھلی کی

ترقی کا ہر وقت خیال ہی۔ اور مولوی محمد اختر صاحب نے حیدرآباد سے ہمکو اس باب میں مطول خط لکھا ہی۔ جو ہم ذیل میں چھاپتے ہیں اور دوسرے ہوا خواہوں کو اُنکی تجاویز پر اظہار رائے کا موقع دیتے ہیں۔

ولایت حسین آنریری منیجر

# نقل خط مولوی محمد اختر صاحب از حیدرآباد دکن

مکرمی! تسلیم

جنوری کے "منتقلی" کا خیر مقدم و شکریہ کہتا ہوں اور اُن آرزوں کے پورا ہونے کی دعا مانگتا ہوں جو آپنے نئے تعلیم یافتوں سے ظاہر کی ہیں۔ لیکن ساتھ ہی دو چار باتیں بطور مشورہ کہنے کی معافی چاہتا ہوں

گذشتہ سال کی نسبت:-

(۱) مضامین کی ایک فہرست چھاپکر خریداروں کے پاس بھیجی جائے تاکہ جلد کے ساتھ مجلد کی جاسکے۔ صفحات مسلسل نہونے کیوجہ سے فہرست کا بننا مشکل ہی مگر اُس کی صورت یہہ ہی کہ ہر نمبر کی علیحدہ علیحدہ فہرست بنائی جائے اور مضمون کے سامنے اُسی نمبر کے صفحے اور نام مضمون نگار لکھا جائے۔

(۲) "منتقلی" کے گذشتہ سال پر ریویو کیا جائے جس میں اُسکی مالی اور لٹریری دونوں پہلوؤں پر بحث ہو۔ اور جو جو مشکلات پیش آئی ہوں اُنکو صاف صاف پبلک کے سامنے بیان کیا جائے تاکہ اُسکے معاونین کو اُسکی نسبت غور کرنیکا موقع ملے اور پبلک میں سے جس شخص نے جو مدد دی ہو اُسکا شکریہ ادا کیا جائے تاکہ آئندہ سال میں رسالہ کو مدد دینے کا خیال ترقی پذیر ہو۔

آئندہ سال یعنی ۱۹۱۰ء کی نسبت:-

(۱) رسالہ کے صفحات مسلسل رکھے جائیں۔ اُردو کے علیحدہ اور انگریزی کے علیحدہ۔ بہ نسبت گذشتہ سال کے لکھائی چھپائی کا عمدہ انتظام ہونا چاہیئے۔ یا تو رسالہ کو تراشا نہ جائے اور اگر تراشا جائے تو ایک سائز پر تاکہ جلد بندی کے وقت دقت نہ پڑے۔ اور اگر ممکن ہو تو اُردو کا حصہ بھی ٹائپ میں چھپوایا جائے۔

(۲) یہ تو رسالہ کی ظاہری شکل و صورت کے متعلق تھا مگر اسکے ساتھ اُسکی لٹریری حالت بھی توجہ و اصلاح کی

سخت محتاج ہو۔ ابھی تک میرے خیال میں "منتقلی" کی کوئی خاص غرض نہیں معلوم ہوتی۔ چند مختصر سے صفحات دنیا بھر کے اغراض کو اپنے دامن عاطفت میں نہیں لے سکتے۔ لہذا اس بات کی ضرورت ہو کہ چند عمدہ پمفلٹ کم سے کم ایک سال کے لیئے تجویز کیئے جاویں اور نئے تعلیم یافتوں کو اُنپر طبع آزمائی کا موقع دیا جائے۔ زیادہ ضرورت اس بات کی ہو کہ "منتقلی" کو کالج کی شان کے مطابق بنایا جاے۔ آپ نے انگلستان اور یورپ کے وہ خاص خاص سالے دیکھے ہوں گے جو ہی قسم کے انسٹیٹیوشنوں سے نکلتے ہیں کہ وہ کس شان کے ہوتے ہیں۔ جہاں اتنے بڑے بڑے علما اور نیم علمار کا اس کثرت سے مجمع ہو اگر وہاں ایک چھوٹے سے رسالہ کی بھی علمی سرپرستی نہو سکے تو نہایت حیرت کی بات ہو۔

(۴) لیکن اس زمانہ میں یہ سرپرستی مفت نہیں حاصل ہوتی۔ دنیا دار المعاوضہ ہو۔ پچھلے زمانہ میں شاید علم کی تجارت نہوتی ہو تو نہوتی ہو۔ لیکن اب تو علم تجارت کے ذریعے سے بڑہتا ہو۔ اور آجکل علم سے بڑہ کر دنیا میں کوئی چیز اپنی قیمت نہیں پیدا کرتی۔ یورپ کے تمام اخبار اور رسالے اصول معاوضہ پر چل رہے ہیں۔ اور اس لیئے جس دماغ سوزی اور کاوش و تحقیقات کی روح اُنکے مضامین میں ہوتی ہو وہ ہندوستان کے کسی اخبار اور رسالے کو نصیب نہیں۔ جنوری کے "منتقلی" سے یہ معلوم ہوا ہو کہ رسالہ کے چار سو خریدار ہیں۔ شاید زمرۂ خریداران میں وُہی اشخاص شمار کیئے گئے ہونگے جن کی طرف سے قیمت وصول ہو گئی ہو گی یا وصول ہونے کی اُمید ہو گی۔ لہذا میری راے میں اس رقمیت میں سے ابھی کسی امور خیر میں کچھ روپیہ صرف کرنے کے بجائے اسبات کی سخت ضرورت ہو کہ انعام یا قیمت کے ذریعہ سے "منتقلی" کے لیئے اعلے درجہ کے مضمون حاصل کیئے جائیں اور اس طرح پر اہل قلم اور پبلک کی نظروں اور قلوب کو اُسکی طرف کھینچا جائے۔ جسکا لازمی نتیجہ یہ ہو گا کہ اُسکی مالی حالت میں اُسکی کثرت اشاعت سے ضرور ترقی ہو گی اور یہ انعام یا قیمت اکارت نہیں جائیگی۔ میں خیال کرتا ہوں کہ جہاں اتنا بڑا مجمع علما و نیم علما رہتا ہو جیساکہ مدرستہ العلوم کے احاطہ میں رہتا ہو وہاں ترغیبات علمی کا پیدا نہونا یا پیدا کرانے کی کوشش نکرنا یا اُسکا سرسبز نہونا ایک سخت حیرت اور مایوسی کی بات ہو۔ جس کے اسباب اتنی دور شاید میں نہ سمجھتا ہوں۔

(۴) مضامین کی نسبت میری یہہ رائے ہی خصوصاً اُردو حصہ کی نسبت اور جیسا کہ خود آپنے بھی تعلیم یافتوں کو اپنی مادری زبان میں لکھنے کی ترغیب دلائی ہی۔ اور حقیقت بھی یہی ہی کہ سوائے پولٹیکل مضامین کے مسلمانونکو اور دوسرے مضامین انگریزی میں لکھنے کی ضرورت بھی نہیں ہی اسلیئے کہ انگریزی زبان ہمارے بوسیدہ خیالات اور کجمج زبان کی محتاج نہیں ہی۔ بلکہ اُردو زبان اس بات کی سخت محتاج ہی کہ مغرب کے علمی خزانوں سے اُسکی تہی دستی رفع کیجائے۔ اور ابھی ہمارے تعلیم یافتہ اُصول تدریج سے یہیں تک ترقی پذیر بھی ہوئے ہیں کہ وہ صرف عمدہ ترجمے کر سکیں اگرچہ ایسا نکرتے ہوں۔ مگر ضرورت اسی بات کی ہی کہ انگریزی سے اعلیٰ درجہ کے علمی مضامین ترجمے ہوا کریں جس سے اُردو خواں پبلک کو "منتخل" کے ذریعہ سے کچھ نئی علمی معلومات حاصل ہوا کرے۔ اور میں یہہ کہنے کی معافی چاہتا ہوں کہ منتخل کی گذشتہ ایک سالہ حیات نے اس کوچہ میں بالکل قدم نہیں رکھا۔ بکل کا ترجمہ ہونا شروع ہوا تھا کہ وہ بھی رہ گیا۔ اس سے یہہ مقصد نہیں کہ رسالہ میں کتابوں کے ترجمے کیئے جایا کریں۔ بلکہ ہزاروں آرٹکل انگریزی موقت الشیوع پرچوں میں مختلف سبجکٹوں پر ایسے شائع ہوتے ہیں جنکی ضرورت اہل ملک کو نہایت ہوتی ہی۔ آیندہ سے آپ نئے تعلیم یافتوں سے التجا کیجیئے کہ وہ اسطرف متوجہ ہوں۔ اسلیئے کہ آج کل اُنکا مذاق ایسا بگڑتا چلا ہی کہ وہ پھر مردہ جسموں میں روح ڈال رہے ہیں۔ اور شاعری وہ بھی ایشیائی اور مہملات کے پیچھے پڑے ہوے ہیں۔ اور مدرسۃ العلوم کے احاطہ کو اسکا رزمگاہ بنا رکھا ہی۔

(۵) اسکے دوسرے کوچہ میں سوشیل مضامین کے حصہ کو زیادہ وسعت ہونی چاہیئے۔ کیونکہ ملک کو اس بات کے سمجھانے کی بھی ضرورت ہی کہ انسان جہاں اور ہزارہا علمی مباحث پر گفتگو اور غور و فکر کرتا ہی وہاں اُسکو اپنے اُصول زندگی پر بھی گہری نظر ڈالنے کی ضرورت ہی۔ کیونکہ اس زندگی میں ہر قسم کے بیج بوئے جاتے ہیں اور جب تک کہ اس طرف غور و فکر اور بحث و مباحثہ کا عادی نہ بنایا جائے اُسوقت تک پرانی باتوں کی سختی سے اعتقاد جما رہتا ہی۔ اور کچھ عقل سے کام لینے کی جرأت نہیں پیدا ہوتی۔ بایں وجوہات یہ سبجکٹ بھی نہایت ضروری ہی الغرض ان چند باتوں کو پیش نظر رکھا جائے تو علی گڈھ منتخل ہر طرح سے علیگڈھ کا رسالہ کہلانیکا مستحق ہو سکتا ہی۔ اسلیئے کہ علیگڈھ آج ہندوستان میں "مدینۃ العلم" اور رہنماے علم تسلیم کیا جاتا ہی۔ اور حقیقت میں ہی بھی۔ لہذا

اُس سرچشمہ سے جو کوئی نالی یا نُول بہے وہ ویسی ہی شیریں اور فرحت بخش روح ہونی چاہیئے۔ تاکہ لوگوں کو اصل تک پہونچنے کی ترغیب دے۔

میں خیال کرتا ہوں کہ اگر "منتقل" کے اور لائق ناظرین بھی اپنے اس قومی رسالہ کی ترقی دینے پر فکر کریں اور میری تجاویز اور آرزوئیں بھی اُنکی نظروں سے گذریں تو شاید کوئی ایسی سبیل نکل آوے کہ یہہ رسالہ زیادہ مفید ہو سکے۔ اور ہم پر فرض ہی کہ ہم اُسکے اسباب ترقی پر غور کریں۔

اس خط کو "منتقل" میں چھاپ دیجیے۔ تاکہ اور ہمدردانِ رسالہ کو بھی غور و فکر کرنیکا موقع ملے۔

راقم

محمد اختر۔ حیدرآباد دکن

# محل خانہ اور ریویو نگاری کا ایجاد

اگر ہم بنظر غور دیکھیں اور کج رائی کو دخل ندیں تو غالباً ہمکو ماننا پڑیگا کہ فن ریویو نویسی کا تخم پہلے سرزمین عرب میں بویا گیا اور وہاں کے فلاسفروں اور محققوں نے اُسے ایجاد کیا۔ اہل عرب اسے اپنی اصطلاح میں نظر ثانی اور انتقاد بھی کہتے ہیں۔ یہ خاطر فداری ہمارا شعار نہیں اور نہ اس خیال سے ہمیں جنبہ داری کا استحقاق حاصل ہو کہ اہل عرب ہمارے قدیمی بزرگ ہیں مگر یہ بھی عرض کیئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ اُنہوں نے اس فن کو اوج کمال تک پہنچایا تھا اور اسکا ثبوت اُنکے اعلےٰ ذخائر سے پایا جاتا ہی۔

دین اسلام کے ابتدائی زمانہ میں فلسفہ کو بھی بہت دخل تھا۔ جب عرب کے فاضلوں اور ادیبوں نے یونانی علوم سے چراغ شوق روشن کرنا شروع کیا اور اپنی مادری زبان میں اُنکی تصانیف کے ترجمے کرنے لگے اُس وقت یونانی فلسفہ نے زیادہ مداخلت کی عرب کے دقیقہ سنج اور نکتہ رس ادیبوں نے یہہ دیکھکر کہ "ایں گل دیگر شگفت" نظر ثانی یا انتقاد لکھنا شروع کیا جو بالکل ریویو کے ہم معنی تھا۔

اس بحث سے یہہ نتیجہ پیدا ہوا کہ ایک نہایت ہی کارآمد۔ پرمغز۔ حد درجہ مفید۔ علم کلام ہات آگیا۔ دلائل عقلی اور فلسفی سے عقائد مسلمہ کو ثابت کردینا اسی کو علم کلام کہتے ہیں۔ مختصر یہہ ہی کہ انتقاد نویسی کے جوش میں

انھیں ایک ایسا گوہر شب چراغ ہات آگیا جس کی روشنی نے سطح عام پر ضیا افگنی کی جس سے ممالک غیر کے مہذب لوگوں نے بھی اپنے اپنے چراغ روشن کیئے گو اس میں شک نہیں کہ اب گیاس کی روشنی کے آگے عرب کے روغن زیتون کی روشنی بالکل مات ہے۔

بلکہ ہسٹری آف سیویلیزیشن کے اوراق سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ممالک یورپ اور امریکہ کے ادبار کے زمانہ میں وہاں بھی ویسے ہی دریدہ دہن۔ اور فضول گو مصنف و مؤلف تھے جیسے کہ ایشیا میں۔ مگر چونکہ یہ مانی ہوئی بات ہے کہ زمانہ خود اصلاح کن ہے اسیلئے انقلاب روزگار سے بعد کو وہاں ایسے بھی مصنف و مؤلف پیدا ہو گئے جنکے وجود نے لچر اور لغو تصنیفات کا دفتر پارینہ بالکل گاؤخورد کر دیا۔ لارڈ بیکن پہلا شخص ہے جسکے سر پر افضلیت کا تاج رکھا گیا۔ اُنکے بعد سر والٹر اسکاٹ نے انجمن آرائی کی پھر فخر روزگار لارڈ مکالے نے ڈنکے کی چوٹ پر بڑے بڑے فلاطون زمان۔ جید استادوں اور ادیبوں کے دانت کھٹے کر دیئے۔ انکے بعد پھر تو راستہ کھل گیا اور بہت سے وسیع الخیال۔ مشہور آفاق فاضل و متکلم۔ اور سحر پرداز مضمون نگار پیدا ہونے لگے۔

سچ تو یہ ہے کہ یورپ اور امریکہ بھی کس قیامت کی جگہ ہے جہاں صرف ریویو نگاری کے لیئے بڑے بڑے مشہور اور نامی رسالے جاری ہیں جنکے نام زبان زد خاص و عام ہیں۔ اُن میں نہایت آزادی اور وسعت خیال کیساتھ برابر مباحثے ہوا کرتے ہیں اور اس میں شک نہیں کہ وہ رسالے اپنے فرائض نہایت نیک نیتی کیساتھ انجام دیتے ہیں

لفظ ریویو ایک لاطینی لفظ ہے جو انگریزی اور اہل یورپ کی زبانوں پر برابر مستعمل ہے۔ اب ہندوستان پر بھی اسکا پرتو پڑا ہے مگر نہایت افسوس ہے کہ بہت ہی بے عنوانی کے ساتھ اسکا رواج شروع ہو گیا ہے۔ ہم ریویو اور ریمارک وغیرہ میں بھی کچھ امتیاز نہیں کرتے اور جلی حرفوں میں لفظ ریویو لکھکر اس کی مٹی خراب کرتے ہیں جس میں عام طور پر خالص ایشیائی طرز کی ہاد خوانی اور مدحت سرائی ہوتی ہے۔ حالانکہ یورپ اور امریکہ میں ایسا نہیں ہوتا وہ فرائض ریویو نویسی سے آگاہ ہیں۔ وہ ہر تصنیف کو نہایت تعمق کی نگاہ سے دیکھتے اور اکثر اسپر کتاب کی کتاب لکھ جاتے ہیں جس سے بیحد فائدے مترتب ہوتے ہیں۔

ریویو نویسی کا مقصد یہ ہے کہ اُسکے ذریعے سے مصنف یا مؤلف کی تمام لغزشیں دُور کر دیجائیں یا جو کمی ہے وہ پوری کر دیجائے یا دوسرے لفظوں میں یوں کہو کہ مصنف کے ادھورے یا ناقص بیان کو مکمل کر دیا جائے۔

مگر دیکھا جاے تو یہہ فن نہایت ہی مشکل ہی۔ انسانی کمال کا انحصار دو باتوں پر ہی۔ ایک تو پیدائشی طور سے اکتساب علوم کے لیئے اُنکی طبیعت موزوں ہو۔ دوسرے تحصیل علوم وفنون کے بعد اُسنے اُنکی تحقیق وتدقیق میں بھی ایک عمر بسر کی ہو اور اُس میں کمال حاصل کیا ہو۔ اسمیں شک نہیں کہ طبعی قابلیت کو اکتساب علوم میں بڑا دخل ہی اور یہہ ممکن ہی کہ ایک شخص کئی علوم میں دخل رکھتا ہو مگر اُن سب میں کمال پیدا کرنا محالات سے ہی۔ ایسی حالت میں علم تواریخ میں اگر ایک جدید تصنیف ریویو کے لیئے پیش کیجائے تو وہ شخص جسے صرف علم کمسٹری میں دستگاہ ہی اور علم تاریخ سے بے بہرہ ہی کیا اُسپر ٹھیک ریمارک دیسکتا ہی؟۔ ہرگز نہیں۔ اسی طرح اگر علم ریاضی کے عالم کو علم الٰہیات کی کوئی کتاب ریویو کے لیئے دیجائے تو وہ اُسکے محاسن و معائب بیان کرسکتا ہی؟۔ حاشا نہیں۔ غرض ریویو نگاری نہایت دشوار کام ہی اور اسکے لیئے وسیع معلومات اور اعلیٰ درجہ کے ذاتی تجربہ کے ساتھ نیک نفسی کی بھی ضرورت ہی۔

اب اگر ہم اُردو علم ادب پر ایک بسیط نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں اس میں زیادہ حصہ نظم کا معلوم ہوتا ہی بادی النظر میں یہہ امر قابل اعتراض نہیں کیونکہ ادب کے اسٹیج پر پھر بھی ایک قسم کی سرگرمی اور چہل پہل معلوم ہوتی ہی۔ مگر تمام فوائد اور بہبودیوں پر نظر رکھکر یہہ کہنا پڑتا ہی کہ آج کل عام طور پر جسقدر مصنفوں کی آوازیں بلند ہیں اُنسے ہمارا کوئی مطلب نہیں نکلتا بلکہ اکثر فوت ہوجاتا ہی۔ چونکہ ایسے حضرات زیادہ تر زمرۂ شعرا میں داخل ہیں اُنھوں نے بجائے اسکے کہ گنجینہ علم ادب کو ترقی دیں اور دُرشاہوار مضامین سے اُسکی آب و تاب بڑھائیں اپنے کمزور دماغ ناصاف اور ناشائستہ دلوں کے مبالغہ آمیز خیالات۔ ناشائستہ مضامین اور فضول اشتیاق کے ساتھ نظم ونثر کی سڑی گلی ہڈیوں پر اور بھی ستم کیا ہی۔ اور مصنفین کامل العیار کے اعلےٰ درجہ کے مذاق اور نمونوں کی مٹی خراب کی ہی

ہندوستان میں کوئی دوسرا غالب۔ کوئی دوسرا ذوق۔ کوئی دوسرا آتش۔ کوئی دوسرا انیس نہیں پیدا ہوا مگر خدا رکھے ایسے غزل سراؤں کی کہیں تعداد بڑھ گئی جو اپنی خامئ نظم اور یاوہ گوئیوں کے ساتھ اپنی عمر کے اس سرے سے اُس سرے تک پہونچ گئے اور حصول مطلب کچھ خاک نہوا۔ شاذ سے کوئی بحث نہیں۔ ہمارے موجودہ شعرا جن میں بہت سے محاسن علوم سے مالامال ہیں اُنکی زبانیں یا اُنکا کلام فطرتی رنگ سے بالکل معرا ہی

اور ان میں وہ عذوبت۔ وہ شیرینی۔ وہ فصاحت و لطافت اور وہ جوش قلب نہیں پایا جاتا جو ایک طبع دل پسند کے لیئے لازمی ہی۔

گذشتہ چند سال سے اُردو پریس میں ایک ہل چل پڑی ہوئی ہی مگر قوت ایجاد بالکل پیرانہ سالی کیحالت میں ہی۔ ہاں ممالک غیر کے باسی اور نقلی نمونے البتہ پہلو دباتے جاتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ابھی شاہانِ نظم و نثر دونوں پستی کی حالت میں ہیں۔ کریٹیسزم یعنی فن تنقید نے بھی یہ سمجھکر کہ نقارخانہ میں طوطی کی آواز کون سنتا ہی اپنی زبان اور کان دونوں بند کر لیئے اور اُسنے اپنے کچھ بھی فرائض انجام نہ دیئے۔ مگر ساتھ اسکے ایک امر یہ بھی قابل لحاظ ہی کہ ہمارے بعض بزدل مصنفین عام طور پر نکتہ چینی کے نام سے لرزتے ہیں۔ پھر اُن کی ہمتیں کیونکر متقاضی ہو سکتی ہیں کہ وہ اپنی تصنیفوں کو جنھیں وہ اپنے زعم میں بیاض گل سے بھی زیادہ رنگین اور لطیف سمجھتے ہیں اہل تنقید کی خدمت میں تقاریظ کے لیئے پیش کریں جنکی معدومیت کی وجہ سے اکثر مصنفوں کی اُجلی شہرت بالکل دبجاتی یا مفقود ہو جاتی ہی۔

فن تنقید ابھی تک گہوارہ میں ہی۔ مصنفین اسکے سایہ سے بھاگتے ہیں۔ مگر وہ یہ نہیں سمجھتے کہ یہی وہ شے ہی جس سے ایک مصنف یا مؤلف کے تمام محاسن۔ اُنکی بلند نظری۔ عالی دماغی اور کمال کا اندازہ ہو جاتا ہی اور تصنیفات و تالیفات میں جو عیوب یا کوتاہیاں رہجاتی ہیں اُن کی کامل اصلاح اور تکمیل ہو جاتی ہی۔ مجھے بعض وقت حیرت ہوتی ہی جب میں یہ دیکھتا ہوں کہ اکثر تصنیفیں جنکی ہستی تار عنکبوت سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی اُنکی شہرتوں نے زمانہ کو گھیر لیا ہی اور اکثر وہ تصنیفیں جو پایۂ بلند رکھتی ہیں حجاب ناکامی میں مستور ہیں۔ بظاہر اسکی یہی وجہ معلوم ہوتی ہی کہ اہل تنقید نے ایسی تصنیفوں کی طرف بالکل رخ نہ کیا۔ اُنکو اُنکے حال پر چھوڑا۔ اور اُنکے محاسن و معائب نہایت آزادی کے ساتھ پبلک کے سامنے پیش نہ کیئے۔ یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ تصنیفات کی جب ہی قدر ہوتی ہی جب کشادہ دلی اور نیک نفسی سے اُنپر رائے زنی کیجائے۔ تیغ کے جوہر اُسی وقت کھُلتے ہیں جب وہ سان پر چڑہائی جاتی ہی۔ اصلی و نقلی طلا میں جب ہی فرق معلوم ہوتا ہی جب وہ کسوٹی پر کسا جاتا ہی۔ مگر یہ اہل تنقید کا قصور نہیں اُن کم ہمت اور بزدل مصنفوں کا قصور ہی جو بازاری واہ واہ اور تحسینِ ناشناس کو اپنے کمال کا معیار سمجھتے ہیں اور اپنی تصنیفات کو اہل تنقید کے آگے پیش کرتے ہچکچاتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ انکی تصنیفات کی ہٹی

خراب ہوجائیگی مگر وہ یہ نہیں خیال کرتے کہ اگر ان میں محاسن ہیں تو اہل کمال اور جوہر شناسوں کی نظروں میں خصوصیت کے ساتھ اُنکی وقعت و منزلت اور دوبالا ہوجائیگی۔ میں اس مقام پر اس مضمون کے متعلق کچھ بحث کرنا نہیں چاہتا اثنا سخن میں یہ بات بھی موںہ سے نکل گئی جس کی چنداں ضرورت نہ تھی۔

مجھے اس امر کے بیان کرنے کی بھی ضرورت ہی کہ جہاں اور چیزوں میں فیشن کو دخل ہو وہاں علم ادب میں بھی ایک خاص فیشن ہی۔ اردو ادب کا اسٹیج جسے فی الحال مکتب طفلان سے تعبیر کرنا چاہیئے ابھی سے درسگاہ شہرت سمجھا جانے لگا۔ مگر جس طرح مشاطہ کسی بوڑہی سن رسیدہ عورت کو تاش تمامی اور بادلے کی زرق برق پوشاکیں پہناکر۔ اُسکی صورت پر غازہ ملکر اور خوب بنا سنوار کے اچھی خاصی عروس دلربا بنا دیتی ہی حالانکہ اُسکے چہرہ کی اصلی جھریاں نہیں مٹتیں اور خزاں رسیدہ صورت میں نقش و نگار ضعیفی آئینہ کی طرح نمایاں ہوتے ہیں۔ اسی طرح اُردو علم ادب کے اسٹیج نے کثرت سے ایسی تصنیفیں پیش کی ہیں جنکے ظاہری جمال نے حسن کے حریص اور طماع ناظرین کو بہت کچھ اپنا دالہ و شیفتہ بنا لیا ہی مگر یہ یاد رہے کہ اسٹیج ایسی ناقص صورتوں اور اُن مصنوعی شہرتوں کا جو بعض ناقابل مصنفوں کو حاصل ہیں ضرور ذمہ دار ہی۔ بہت کم ایسی تصنیفیں ہیں جو مضامین کے اعتبار سے سنجیدہ اور متین ہیں اور افسانہ کے دائرہ میں بہت ہی کم ایسے ناول ہیں جو ملک کے مذاق صحیح اور قدر و وقعت کے لائق ہیں جنسے نکتہ سنج بخوبی واقف ہیں۔ قصہ کی حیثیت سے بھی اکثر بے لطف ہیں۔ زبان اور طرز ادا بھی بالکل حسن سے خالی ہی اور اکثروں کے مضامین تو کسی حسین خودسر کی زلف پریشاں کی طرح بالکل اُلجھے ہوتے ہیں۔ اُنکے پہلو غیر فطرتی اور مبالغہ آمیز جن میں آمد کا نام نہیں بالکل آورد ہی آورد پائی جاتی ہی۔

مرقعے جو کھینچے جاتے ہیں اُن میں وہ گہرا رنگ بھرا جاتا ہی جو اُنھیں بدروپ۔ بھونڈا اور بھدا بنا دیتا ہی حالانکہ اگر اصلی مصور اُنھیں پر صرف دو ایک جگہ اپنے موقلم سے ہلکے ہلکے رنگ چڑہا دیتا تو وہی تصویریں فوراً بول اُٹھتیں۔ واقعات و اسباب بجائے اسکے کہ نیچر یا اپنے ذاتی تجربہ و واقفیت سے حاصل کیئے جائیں بعض اوقات محض اپنے قیاس اور عقل آرائیوں سے پیدا کیئے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہی کہ اکثر تاریخیں بھی بے سرپا ہوتی ہیں کیونکہ اکثر مصنفوں کی لاعلمی یا شوق رنگ آمیزی اُنپر بالکل پانی پھیر دیتا ہی۔ پھر جو پہلو کہ داستانوں کی افزائش حسن کے لیئے اختیار کیئے جاتے ہیں وہ بھی اکثر دور ازکار اور مضحک ہوتے ہیں۔

انگریزی نثر میں افسانوں کی دو قسمیں ہوتی ہیں۔ ایک تو رومانس جسکے لیئے قدیم یا جدید تاریخوں سے اسباب فراہم کیئے جاتے ہیں۔ انمیں مناسبت ہو یا غیر مناسبت۔ خیالی ہوں یا وضعی۔ دوسرے ناول جنمیں پرائوٹ زندگی۔ رسم و رواج اور سوسائٹی کی سچی تصویریں اُتاری جائیں۔ مولوی سید علی سجاد صاحب کا ناول محل خانہ دوسری قسم میں شمار کیا جاتا ہے۔ جسمیں ہماری خانگی طرز معاشرت اور سوسائٹی کا نہایت کامیابی کے ساتھ چربا اُتارا گیا ہے۔ انکی دونوں کتابیں نئی نویلی اور محل خانہ نہایت دلچسپ اور نتیجہ خیز کتابیں ہیں جنھیں ہر طبقہ کے لوگ بہ کمال رغبت پسند کرینگے۔ محل خانہ نے موجودہ تعلیم یافتہ لوگوں پر ایک خاص اثر ڈالا ہے مصنف کی ذہانت و طباعی خداداد ہے۔ مصنف نے زبان کے سحر سے مضامین کی خوب خوب قلعہ بندیاں کی ہیں۔ جملے صاف ستھرے۔ لغزش کا کہیں نام نہیں۔ جسنے خود بینی نہیں ظاہر ہوتی۔ بہر کمال سادگی اور فصاحت کے ساتھ ہلکی ظرافت کی چاشنی بھی ہے جو متانت سے بالکل دست و گریباں ہے۔

حق تو یہ ہے کہ محل خانہ کے تمام کیرکٹر نہایت خوبی کے ساتھ دکھائے گئے ہیں اور ختتام کتاب تک بیحد لطافت کیساتھ قائم ہیں۔ مصنف نے مستورات کی وہ جیتی جاگتی تصویریں اُتاری ہیں کہ ہر شخص کا کام نہیں اور یہ اُن تمام کیرکٹروں کو نظر انصاف سے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن میں کسقدر اصلی رنگ بھرے ہیں اور مناسبت کا وہ سلسلہ قائم رکھا ہے کہ کہیں بے ربط نہیں ہونے پاتا اور کہا جا سکتا ہے کہ اُنھوں نے ہر ہر قدم پر اسکاٹ کا تتبع کیا ہے۔ مصنف نے فطرت کے دائرہ میں اپنے مضامین کو بہکنے نہ دیا اور نہ وہ حسن و عشق کی بھرمار ہے جو یقین کے درجہ سے تجاوز کر جاتی ہے۔ عقل آرا۔ اسکاٹ کی ربقہ یہودی لڑکی سے بہت مشابہ ہے۔ ربقہ نہایت خوبصورت اور دلنواز لڑکی ہے اور اعلے درجہ کے کیرکٹر سے آراستہ ہے۔ مصنف محل خانہ نے بھی ایک مقابل کی تصویر نہایت ہی کامیابی کیساتھ کھینچی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اگر ہم ایک پہلو سے مصنف محل خانہ کا اسکاٹ سے مقابلہ کریں تو غالباً ناموزوں نہوگا۔ اسکاٹ جب کسی بیان یا منظر کا نقش ناظرین کے دلوں پر بٹھانا چاہتا ہے تو اُسکو اکثر اپنے پلاٹ کا ہوش نہیں رہتا۔ اُسکے اکثر پلاٹ الفاظ مہمل و پچر سے تعبیر کیئے گئے ہیں مگر مصنف محل خانہ اپنے پلاٹ کو کروٹ بدلنے نہیں دیتے اور وہ افسانہ کی تمام کڑیوں کو ایک ہی مسلسل زنجیر میں جکڑے ہوئے ہیں اُنکے افسانہ کی دو دھاریں ہیں جو بعض وقت پہلو بہ پہلو بہتی ہیں اور بعض وقت دوسری طرف ہو کر بہنے لگتی ہیں۔ غرض

ایک سمت عقل آرا کو گھر کی بدنامی اور ساس سسروں کا خیال ہے اور دوسری جانب اپنے شوہر کا پاس ہے۔

محل خانہ میں شاعرانہ عنصر کا بھی اثر پایا جاتا ہے جو اپنی جگہ صد درجہ لطف دے رہا ہے اور جہاں یہ رنگ دکھایا ہے وہاں عورتوں کی وہی زبان بھی اختیار کی ہے جو اُسکے شایاں تھی اور اثر کو کم نہیں ہونے دیا بلکہ اور بڑھا دیا ہے۔ (دیکھو باغ کا سماں) مصنف نے اکثر مرقعے ایسے کھینچے ہیں کہ مشہور اردو ناول نگار تو ایک طرف شاید انگریزی ناول نویسوں سے بھی اُس ذائقہ کے ساتھ اُنکا جواب نہیں ہو سکتا۔ (دیکھو لوریاں اور بچہ کے تماشے) حرماں نصیب عقل آرا کی وفات کا سین تو ایسا نیچرل ہے کہ آجتک مرنے کا ایسا کامل فوٹو کسی انگریزی ناول میں بھی میری نظر سے نہیں گذرا۔ اُسے پڑھ کر دردمند انسان اپنے آپے میں نہیں رہ سکتا۔ مصنف نے جس سادگی آمیز شاعرانہ قوت سے کام لیا ہے وہ صرف کتاب کے دیکھنے سے معلوم ہو سکتا ہے۔ کیا جانی کے بہلاتے وقت بیمار زار و نزار عقل آرا کا یہ کہنا بھول سکتا ہے۔

"اُے جانی۔ تم جیتے رہنا۔ ایسا نہو کہ ایسے تماشے دکھا کے ہمکو دغا دو۔ پھر ایک آہ سرد بھر کر کہنے لگی۔ یہاں اپنی ہی اُمید نہیں کچھ دن اور دنیا کی ہوا کھا رہی ہوں۔ خیر تمھیں کو اللہ جلائے کہ مجھ موئی کی نشانی تو رہے۔ افسوس۔ کوئی دل کی حسرت بھی نکالنے نہ پائی۔"

یا بستر مرگ پر اُسکا اپنے شوہر سے یہ کہنا دل سے نکل سکتا ہے۔ "جب میں گور کنارے آلگی تب تم نے آکر خبر لی۔"

پھر مغلانی اور اختر بیگم کی لڑائیاں۔ دُلھن دولہا والوں کی گفتگو۔ حجرۂ عروس۔ چوتھی اور زچہ خانہ کا سماں۔ اگر بہ نظر غور دیکھا جائے تو شروع کے باب جو خاص رسم و رواج کے متعلق ہیں میرے نزدیک کامل آرٹ یا صنعت کے نمونے ہیں۔ میں صلاح دونگا کہ ناظرین اُن ابواب اور اُنکی مشکلات کو بہ نظر انصاف ملاحظہ فرمائیں اور زبان کو ملحوظ رکھکر اُن نمونوں کا موازنہ کریں۔ وہ ابواب جنکا میں ذکر کر رہا ہوں اُن کی پوری بھول بھلیاں کی مثال ہے۔ مگر مصنف نے اپنی قوت فکری اور طلاقت لسانی کے ساتھ پیچیدہ واقعات کو ایسے طور سے آپس میں دست و گریباں رکھا ہے کہ بیساختہ دل پھڑک جاتا ہے اور پڑھ کر فن ناول نویسی کی داد دینے کو بھی چاہتا ہے۔

اس امر میں زیادہ خوض و فکر کی ضرورت نہیں کہ مصنف میں قوت خیالیہ اور قوت بیانیہ دونوں موجود ہیں۔ قوت بیانیہ یا قوت مرقع نگاری میں انھیں پوری دستگاہ ہی۔ قوت خیالیہ بھی اعلے درجہ کی ہی اور وہی سمجھ سکتا ہی جو اس مخصوص ناول کی پیچیدگیوں سے واقف ہو۔ اور انھیں مشکلات کی وجہ سے بعض مقام پر کچھ لفظی اختلافات پیدا ہو گئے ہیں جنکو ہمارے فاضل ریویو نگار مولوی سید رضا علی صاحب رضوی۔ بی۔ اے نے علیگڈھ منتھلی مطبوعہ ماہ اکتوبر میں نہایت شد و مد کے ساتھ بیان کیا ہی۔ اسمیں شک نہیں کہ قابل ریویو نگار نے حق ریویو نویسی کامل طور پر ادا کیا ہی۔ مگر ذرا غور سے دیکھا جائے تو وہ اختلافات نہیں ہیں بلکہ اکثر چھاپہ کی غلطیاں معلوم ہوتی ہیں مثلاً دسویں باب میں پچھلے پہر دلہن رخصت ہوئی۔ اور پھر فوراً بارہ تیرہ سطروں کے بعد یہ لکھا ہی کہ آٹھ بجے رات کو براتیوں کے ساتھ دولہا اپنے گھر پہونچا۔ سرسری نظر سے دیکھنے والا بھی فوراً سمجھ سکتا ہی کہ جب صبح کی رخصتی ہی تو پھر یہ کیونکر ممکن تھا کہ آٹھ بجے رات کو برات پہونچتی لامحالہ صبح کا وقت ہی اور یہ چھاپہ کی غلطی ہی اور حقیقتاً ایسا ہی معلوم ہوتا ہی جیسا کہ کتاب میں دو ایک جگہ اور بھی ہی۔ صفحہ ۸۰ اور ۴۰۱ میں اختر بیگم کی جگہ راضیہ بیگم۔ ۲۰۳ میں راضیہ بیگم کی جگہ اختر بیگم۔ تو کیا ایسی حالت میں کتاب کی ناقابل لحاظ غلطیاں بھی مصنف کی طرف منسوب کیجا سکتی ہیں۔ پھر ہمارے قابل ریویو نگار تحریر فرماتے ہیں۔ "دولہ جب دلہن کو اپنے مکان لیکر آیا اور دولہ کی بہنوں نے دروازہ بند کیا تو اختر بیگم نے اُن سب کو پانچ روپیہ دروازہ کھولنے کے دیئے۔ اِسپر ایک عورت نے کہا کہ "پانچ روپیہ میں سات آٹھ بہنیں۔ ایک ایک روپیہ بھی تو نہ پڑیگا"۔ مگر شادی ہو جانے کے بعد خورشید مرزا کی بہنوں کا کچھ تذکرہ نہیں اور زیادہ تعجب کی بات یہ ہی کہ عقل آرا نے میاں کو جب خط لکھا تو خورشید مرزا کو خرچ حیدر مرزا اور اختر بیگم کے پاس بھیجنے کی اُن لفظوں میں فہمایش کی۔ "جو کچھ تم بھیجو گے آخر وہ کہاں جائیگا سب اسی گھر میں رہیگا۔ خدا رکھے ہر طرح تمہارے ہی کام آئیگا۔ کوئی اُن (اختر بیگم) کی دوسری اولاد تو ہی نہیں کہ وہ اُسے دیدینگی"۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ ان دونوں بیانات کی آپس میں کس طرح تطبیق ہو سکتی ہی مگر دولہ کی بہن یا بہنوں کا ہونا ثابت ہی کیونکہ مصنف ایک اور جگہہ کہتے ہیں۔ "دولہ کی بہن۔ بھائی کے سہرے پر آنچل ڈال کے ساتھ ہو لیں"۔ ایک مقام پر چوتھی کے تذکرہ میں لکھا ہی کہ چھوٹی نند قمر النسا کو بھی دولہ کے پاس بٹھا دیا۔ ہر دو اختلافات مندرجہ بالا نہایت صریح اور ایسے صاف ہیں کہ جو شخص محل خانہ پر ایک سرسری نظر ڈالیگا

اُس کی نگاہوں میں کھٹک جائینگے۔ یہاں تک ہمارے قابل ریویونگار کا بیان تھا۔ میرے نزدیک اس مقام پر بھی تامل سے کام لینا تھا کیونکہ جب مصنف نے یہ لکھدیا کہ خورشید مرزا کی سات آٹھ بہنیں تھیں اور پھر شادی کے بعد کچھ اُنکا تذکرہ نہ کیا اور عقل آرا نے جو اپنے شوہر خورشید مرزا کو خط لکھا اُس میں بھی اسی بات کا اشارہ کیا ہے کہ اس گھر میں سوائے تمہارے اور کوئی نہیں تو اس تواتر بیان سے صاف ظاہر ہے کہ یہ سب حقیقی بہنیں نہیں تھیں۔ کیا ممیری۔ خلیری۔ چچیری نہیں ہوتیں۔ میرے خیال میں اس کی توضیح کی چنداں ضرورت نہ تھی کہ کوئی چچیری تھیں۔ دوسری خلیری۔ تیسری ممیری وغیرہ وغیرہ۔

عاقلوں کے لیئے بعض موقع پر ایک اشارہ کافی ہوتا ہے اور الفاظ کے پہلو پر بھی نظر کرنے سے فوراً مفہوم سمجھ میں آجاتا ہے۔ مگر بہتر تھا کہ قابل مصنف محل خانہ ان چھوٹی چھوٹی باتوں کی بھی صراحت کردیتے تاکہ آسانی سمجھ میں آجاتیں۔ آگے چلکر ہمارے فاضل ریویونگار تحریر فرماتے ہیں کہ "عقل آرا کے صرف ایک ہی بھائی تھا جو عقل آرا کی شادی کے وقت چھوٹا تھا پھر ممتاز دُلہن عقل آرا کی بھاوج کس طرح تھیں" یہاں بھی اُسی غلط فہمی کا دہوکا ہوتا ہے۔ کیوں کہ قابل ریویونگار نے اتنا نہ سمجھا کہ جب عقل آرا کا ایک ہی بھائی تھا اور وہ چھوٹا تھا تو ممتاز دلہن بھی کوئی رشتے ناتے کی بھاوج ہونگی اور یہ ایک نہایت موٹی سی بات تھی جسے ہمارے ریویونگار نے نظر غائر سے ملاحظہ نفرمایا۔ پھر ہمارے فاضل ریویونگار یوں رقم طراز ہیں۔

"دولہ کی خالہ کا نام زہرہ بیگم تھا۔ ریت رسم کے معاملہ میں زہرہ بیگم نے عقل آرا کے میکہ والوں کو بڑی مدد دی تھی مگر چھبیسویں باب میں دفعتہً زہرہ بیگم بجائے عالیہ بیگم آجاتی ہیں۔ زہرہ بیگم کا اخیر ناول تک کہیں تذکرہ نہیں عالیہ بیگم کا اکثر جگہہ تذکرہ ہے اور ایک جگہہ صاف طور سے بتایا گیا ہے کہ عالیہ بیگم عقل آرا کی ساس تھیں۔ یہ فدا حل طلب مسئلہ ہے کہ عالیہ بیگم نے زہرہ بیگم کا قالب کب سے لیا۔ مسئلہ تناسخ کی رو سے مرنے کے بعد قالب بدلتا ہے مگر قابل مصنف محل خانہ نے جیتے جاگتے آدمیوں کی نسبت اس مسئلہ کو ثابت کر دکھایا۔"

اس مقام پر بھی لائق ریویونگار نے نہایت معمولی اور سرسری نظر سے کام لیا۔ زہرہ بیگم حقیقی خالہ نہیں معلوم ہوتیں رشتہ کی معلوم ہوتی ہیں اور یہ بھی ظاہر ہے کہ شادی کے بعد پھر وہ نہ آئیں۔ عالیہ بیگم ایک دوسری عورت تھیں۔ اختر بیگم سے رسم دوستانہ تھا اور اختر بیگم انھیں بہن کہتی تھیں جیسا کہ اکثر جگہہ کتاب سے ظاہر ہے پھر

کیا موئنہ بولی بہن ہونے کے اعتبار سے وہ عقل آرا کی خلیا ساس نہیں کہی جاسکتیں میرے خیال میں فاضل ریویو نگار نے مسئلہ تناسخ خود ثابت کیا کہ عایا بیگم کو زہرہ بیگم کا فرضی قالب بناکر اُس میں قم باذنی کی صدا سے نئی روح پھونکی ہے۔ مگر سچ تو یہ ہے کہ اختلاف بیان جو حقیقتاً اختلاف بیان نہیں ہے اُنکی جانب ہمارے فاضل ریویو نگار کے ذہن نے کامل طور پر انتقال نہیں کیا۔

آگے چلکر ہمارے فاضل ریویو نگار یوں تحریر فرماتے ہیں۔ "بیسویں باب میں لائق مصنف نے ایک اور دو قعہ بیان کرکے تخالف بیانات کو تکمیل کے درجہ پر پہنچایا ہے عقل آرا اپنے میکہ میں تھیں۔ سب لوگ بیٹھے باتیں کر رہی تھے۔ عقل آرا کی چھوٹی بہن حشمت آرا بھی موجود تھیں کہ اتنے میں دورسے ایک ماما نظر آئی۔ حشمت آرا اٹھ کر کمرہ کے اندر چلی گئیں۔ اُس پر مصنف نے ایک نوٹ دیا ہے۔ بن بیاہی بیٹیاں ہر ایک کے سامنے نہیں ہوتیں۔ مگر لطف یہ ہے کہ اگلے باب میں جو نوواردماما میں رضیہ بیگم سے گفتگو کر رہی تھیں تو اُس گفتگو میں حشمت آرا بھی شریک ہیں"۔ شاید یہ عرض کرنا ناموزوں نہوگا کہ مصنف محل خانہ نے تخالف بیانات کی تکمیل نہ کی بلکہ ہمارے فاضل ریویو نگار نے مغایرت نظر کی تکمیل کی۔ اصل کتاب کی عبارت یہ ہے "حشمت آرا اپنی بہن عقل آرا سے کہہ رہی تھیں کہ "رہنے آپ کو یہی رہ گیا ہے۔ شام قریب ہونے آئی ہے۔ افضل بیگم آپ سے ملنے آتی ہوں گی"۔ یہی ذکر تھا کہ دور سے مہری نظر آئی۔ حشمت آرا جلدی سے اُٹھ کر کمرہ کے اندر چلی گئیں"۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ فٹ نوٹ کا افضل بیگم کی طرف اشارہ ہے نہ کہ مہری کی طرف۔ کیونکہ حشمت آرا واقف تھی کہ افضل بیگم آتی ہیں اور یہ سمجھکر کہ یہ مہری اُنکی مہری ہے اور سواری بھی آتی ہی ہوگی چھپنے کے لیئے کمرہ کے اندر چلی گئی۔ ایکی کوئی ضرورت نہ تھی کہ جب سواری آلیتی اور اُترلیتی اُسوقت وہ اُنسے پردہ کرتی۔ پھر اصل کتاب میں صرف لفظ "مہری" اور فاضل ریویو نگار کی عبارت میں "ایک ماما نظر آئی"۔ اسنے بھی جو معنوی اختلافات پیدا کردیئے ہیں وہ ظاہر ہیں غرض یہ ایسی نکتہ چینیاں ہیں جنھیں ایک منصف مزاج کرنیک (نکتہ چیں) بخوبی سمجھ سکتا ہے۔ مگر چونکہ ہمارے فاضل ریویو نگار نے غائر نظر سے محل خانہ پر ریویو فرمایا ہے اسلیئے ضروری تھا کہ وہ نقطہ نقطہ کی فروگذاشت کو بھی قلمبند فرماتے اور خوب بال کی کھال کھینچتے۔

دسویں باب میں مصنف محل خانہ نے دس بارہ سطروں میں شُہدوں کی گفتگو لکھی ہے اور کسوقت جب برات

دولہ کے گھر جاتی ہے۔ اسے بھی ہمارے فاضل ریویونگار نے بے محل بتایا ہے۔ اس مختصر گفتگو سے مصنف محل خانہ کو ظاہر اپنڈت رتن ناتھ کی تقلید منظور نہیں معلوم ہوتی بلکہ یہ دکھانا مقصود تھا کہ لکھنؤ میں ایسے موقعوں پر بھی یہ باتیں ہوا کرتی ہیں اور اُس آزادمنش فرقہ کا کوئی مونہہ نہیں بند کرسکتا کیونکہ وہ لوگ انہیں دنوں کے منتظر رہتے ہیں۔ فاضل ریویونگار غالباً کبھی لکھنؤ کی شادیوں میں شریک نہیں ہوئے اور نہ وہاں کے واقعات سے واقف ہیں۔ خیر یہ تو شادی تھی ہمارے زندہ دل لکھنؤ کے شہدے مرنے پر مُردوں کا بھی پیچھا نہیں چھوڑتے مگر عقل آرا کے دفن کے وقت فاضل مصنف محل خانہ نے اُسی گروہ سے عمداً احتراز کیا ہے تاکہ واقعہ بالکل خلاف قیاس نہ سمجھا جائے کیونکہ برات کے موقع پر شہدوں کا ذکر ہو چکا ہے۔ مگر جو اخلاقی نتیجہ اُن کی تقریر سے ظاہر ہوا ہے وہ خالی از لطف نہیں اور جس چیز کو ہمارے فاضل ریویونگار ناموزوں بتاتے ہیں اُسے میں حالات شہر نظر کرکے اپنے مقام پر حسین سمجھتا ہوں۔

پھر ہمارے فاضل ریویونگار یوں ارشاد فرماتے ہیں"۔ ایک اور بات جو مصنف نے بغیر ثبوت فرض کرلی ہے اور جسکو وہ اپنے ناظرین سے بھی فرض کرایا چاہتے ہیں عقل آرا کا تعلیم یافتہ ہونا ہے۔ کسی موقع اور کسی بات سے تشریح نہیں ہوتا کہ راضیہ بیگم خود تعلیم یافتہ تھیں۔ اُنکے خاوند بھی مرچکے تھے پھر عقل آرا کی تعلیم کا کون محرک ہوا"۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ فاضل ریویونگار عقل آرا کی تعلیمی حیثیت کا کس قسم کا ثبوت چاہتے ہیں۔ کیا اُس کی نسبت اسقدر بیان کرنا کافی نہ تھا کہ وہ تعلیم یافتہ تھی پھر اسکا ثبوت اُسکے خطوں سے ظاہر ہے جو اُسنے اپنے شوہر خورشید مرزا کو لکھے تھے علاوہ اسکے ماں باپ اُسکے تعلیم یافتہ ہونے کی شہادت دیتا ہے۔ اگر راضیہ بیگم خود تعلیم یافتہ نہ تھیں اور اُنکے شوہر نے بھی انتقال کیا تھا تو باشد۔ کیا جن کی مائیں یا باپ جاہل ناخواندہ۔ غیر تعلیم یافتہ ہوتے یا مرجاتے ہیں اُن کی اولاد کی تعلیم و تربیت نہیں ہوتی۔ فاضل ریویونگار کے نزدیک شاید اس کی اشد ضرورت تھی کہ عقل آرا کے پاس ہر وقت کتابیں کھلی رہتیں اور ابتدائی تعلیم کی مکمل ہسٹری بھی بیان کردیجاتی اُسوقت انھیں تشفی ہوتی۔ مگر اصل تو یہ ہے کہ اُسے اپنے گھر کے دہندوں اور بیماری سے کب فرصت ملی کہ تہذیب نسواں کی خریدار بنتی۔

جہاں فاضل مصنف محل خانہ نے ساس بہوؤں کے نفاق کی وجہیں لکھی ہیں اُن کی نسبت ایک مقام پر ہمارے فاضل ریویونگار نے یہ بھی تحریر فرمایا ہے۔" نفاق کی وجہیں چھوٹی چھوٹی باتیں ہوتی ہیں جو ساس بہوؤں

کی بدمزاجی سے عمل میں آتی ہیں۔ خاوند کو چاہیئے کہ اپنی بیوی کو لیکر علیحدہ ہو جائے نہ ساس ہو ایک جگہ رہینگی نہ انکو لڑائی کے موقعے ملینگے۔" اس میں شک نہیں کہ یہ صائب رائے بہت ہی غور و فکر کا نتیجہ ہی مگر میں یہ کہتا ہوں کہ جب یہی اصلاح کا پہلو ہی تو پھر شرافت اختیار حاصل ہی۔ مقصود اصلی تو یہ ہی کہ گھر میں دلی یگانگت اور اتحاد قائم رہے۔ پھوٹ نہ ہونے پائے اور اصلاح کی وہ صورتیں قائم کیجائیں کہ ساس بہوؤں۔ ماں بیٹوں میں حتی الوسع مفارقت نہو۔ اور جب یہ ہوا کہ "بخشو بی بلی طوطا لنڈورا ہی ہو کر رہیگا"۔ تو پھر اصلاح کی صورت ہی کونسی نکلی۔ مجھے اس موقع پر آفت نصیب عقل آرا کے یہ الفاظ نہیں بھولتے "جی ہاں جب ہی نباہ ہوتا ہی۔ پرایا دل ہات میں لینا ہنسی ٹھٹھا نہیں۔ لوہے کے چنے ہیں۔ جب ہر طرح سے آدمی اپنے اوپر جبر کریگا جب ہی ساس پر اثر بھی ہوگا۔"

اختتام ریویو پر ہمارے فاضل ریویونگار نے اس امر پر بہت زور دیا ہی کہ جس طرح مراۃ العروس میں اصغری کا کیرکٹر قابل الزام ہی اسی طرح محل خانہ کے تمام کیرکٹروں میں صرف ایک کیرکٹر لائق اعتراض ہی اور وہ عقل آرا ہی اور اس کی وجہ یہ بیان کی گئی ہی کہ ان دونوں سے تمامی عمر کوئی غلطی نہیں ہوئی۔ دونوں انسانی کمزوریوں سے مبرا ہیں دونوں سراپا صفات حسنہ کی رب النوع ہیں۔ فاضل ریویونگار کے یہ الفاظ ہیں۔ "الزام تو درکنار عمر بھر عقل آرا نے کوئی کام ایسا نہیں کیا کہ الزام کا نام بھی آسکے۔ مانا کہ وہ ذکی الطبع تھی۔ ذہین تھی۔ راستی پسند تھی۔ فرض کیا کہ وہ دیوان غنی پڑہی ہوئی تھی بلکہ عرفی و خاقانی و ابوالفضل کا مطالعہ بطور تفریح کیا کرتی تھی مگر کیا اسکے یہ معنی ہیں کہ جذبات انسانی اُسکے دل میں راہ ہی نہ پاتے تھے۔ ساس کو جواب ندیا ہوتا مگر یہ تو ممکن تھا کہ وہ کسی سے شکایت کرتی۔ مگر معلوم ہوتا ہی کہ عقل آرا فرشتہ تھی۔ سب امتحانوں میں پوری اتری۔ شاید بعض طبائع اسے تسلیم کریں کہ ایسا آدمی ہونا ممکن ہی مگر عقل یہ کہتی ہی کہ عقل آرا کا وجود صفحہ کاغذ پر ممکن تھا صفحہ ہستی پر ممکن نہیں۔"

ہم اُن فرضی الفاظ سے قطع نظر کر کے جن میں ہمارے فاضل ریویونگار نے شاعرانہ انداز کا ایک جلوہ دکھایا ہی۔ مذکورہ بالا نکتہ چینی کو تھوڑی دیر کے لیئے مانے لیتے ہیں۔ مگر جب ہم ایسی عورت کا شیکسپیر کی بعض عورتوں کے ساتھ مقابلہ کرتے ہیں تو انھیں بھی اصغری اور عقل آرا کی طرح فرشتہ خو اور برگزیدہ پاتے ہیں

اس میں شک نہیں کہ عقل آرا دوسری دنیا کی عورت معلوم ہوتی ہے۔ خالص۔ پاک نفس۔ سراپا عشق و محبت اُس میں اخلاق و نیکیاں کوٹ کوٹ کر بھری ہیں۔ اُس کی خوبیاں صد درجہ مسرت بخش اور فسوں طراز ہیں۔ وہ اپنی طرز رفتار سے بتا رہی ہے کہ ایک مسلمان عورت کو کیا ہونا چاہیئے اور کیا کرنا چاہیئے۔ اُسکے انداز صاف صاف کہہ رہے ہیں کہ ہر شریف عورت کے لیئے اطاعت و فرمانبرداری اعلےٰ ترین جوہر ہے۔ وہ تمام عزیزوں دوستوں اور کنبہ کے لوگونکو ایک ہی رشتۂ الفت میں باندھنا چاہتی ہے۔ وہ جانتی ہے نیکی کیا ہے اور کیونکر نیک سلوک کرنا چاہیئے۔ وہ ہمکو ہماری سوسائٹی کے فرائض سکھاتی ہے اور پردہ پردہ میں بتا رہی ہے کہ ہمیں اپنے سوشل قانون کی حفاظت کرنی چاہیئے۔ وہ مثل انگریزی لیڈیوں کے بننا نہیں چاہتی۔ وہ ہوائے آزادی میں گلگشت کرنا اور پولیٹکس میں غوطے لگانا نہیں پسند کرتی۔ وہ کوئی درباری بیگم نہیں۔ وہ اطالیہ کے تماشہ گاہ کی عورت نہیں۔ وہ ہندوستان کی عورت ہے۔ پاکدامن۔ سادہ مزاج۔ شائستہ۔ حیا اور حسین حسن ذاتی کے ساتھ وہ صفتیں بھی موجود ہیں جو ایک شریف اور تعلیم یافتہ خاتون میں ہونی چاہئیں۔ وہ بڑی فی کی فرایس اور قدرتی ہمدردی سے آشنا ہے۔ وہ اپنے اوصاف کی روشنی میں چلتی پھرتی ہے اور دلوں کی سطح پر نور ڈالتی جاتی ہے۔ اُسنے اطاعت اور فرمانبرداری کی کوئی حد نہیں قائم کی۔ یہ سب اوصاف ہمیں آئینہ کی طرح نمایاں ہیں۔ قابل مصنف محل خانہ نے اُسکے عیوب پر شاید یہ سمجھکر نظر کی کہ اُس کی تمام اصلی خوبیوں کی مستحکم عمارت باد مخالف کے ایک ہی تھپیڑے سے کہیں زمین پر نہ آ رہے یا ایک ملکے مس سے برگ لجالو کی طرح اُسکے اوصاف کی تمام پتیاں کملا نہ جائیں۔ مگر نہیں ایسا نہیں۔ اُسکی زندگی کے تاریک اور منور پہلو دونوں نظر آتے ہیں اور عقل آرا کا نقش صفحۂ ہستی پر پھر بھی قائم ہے مگر ہمارے فاضل ریویونگار کی نکتہ چینی کا وجود بالکل معدوم اور اُنکے اعتراض کا نیم جان تیلا ابھی دم راہیٔ ملک بقا ہوا چاہتا ہے۔ کیا ہمارے فاضل ریویونگار نے نظر غائر پر بھی صفحہ ۱۳۱ نہیں ملاحظہ فرمایا جہاں عقل آرا کن تیوروں میں کہہ رہی ہے "اماجان! جی۔ میں تو آہی رہی تھی۔ آپ تو بیکار خفا ہوتی ہیں"۔

پھر صفحہ ۱۶۰ بھی غالباً فروگذاشت ہو گیا۔

"عقل آرا۔ خالہ جان! بھلا جو خط آنے اور جانے کی روادار نہیں وہ مجھکو جانے دیتیں۔ ماموں جان کے لڑکے کا بیاہ ہوا تھا انہیں اُنھوں نے بلوا بھیجا تھا۔ انھوں نے وہ بہپٹ مچائی کہ آخر کو مجھے جانے نہ دیا"۔

پھر صفحہ ۲۰۱ بھی ملاحظہ سے نہ گذرا۔ جہاں عقل آرا اپنے شوہر سے ساس کی درپردہ یوں شکایت کر رہی ہے۔
"پھر ان باتوں کا غم کاہے کا۔ ایسے نشتر تو روز دیئے جاتے ہیں۔ شاید تم نے آج ہی یہ باتیں سُنیں یہاں تو مدت سے سُنتے سُنتے مساوات ہوگئی۔"

اب صفحہ ۲۰۵ پر بھی ہمارے فاضل ریویونگار نے اپنی نظر نہ دوڑائی۔ عقل آرا ساس کو ان الفاظ میں جواب دیتی ہے
"آپ بیکار اتنا غصہ کرتی ہیں۔ کسی کو بدی کرنے سے کیا کام۔ اگر آپ کو میرے اوپر شک ہے تو ایک تو میں کہیں آتی جاتی نہیں اور دوسرے کہیں آؤں جاؤنگی بھی تو میں اپنے گھر کی بدی کیا کسی اور سے کرونگی۔"

شاید صفحہ ۲۰۰ کی بھی سیر نہ فرمائی۔ فرزانہ خانم ایک مغلانی کو ساس نے جواب دیا عقل آرا اُسے تنہائی میں یوں سمجھا رہی ہے۔
"وہ ایسی ہی آندھی ہیں۔ جسوقت غصہ آتا ہے۔ ایر کی سُنیں نہ پیر کی۔ آنکھ بند کرلیتی ہیں۔ مونھ کھولدیتی ہیں جو کچھ جی میں آتا ہے بکنے لگتی ہیں۔ آگے پیچھے کی کچھ خبر ہی نہیں رکھتیں۔ یہ سب اُنکی نادانی کی باتیں ہیں۔ تم تو عقلمند ہو تمھیں اُن کی باتوں کا بُرا نہ ماننا چاہیئے۔"

لیجئے۔ اب ہمارے فاضل ریویونگار کا یہ دلیرانہ اعتراض کہ "ساس کو جواب دیا ہوتا مگر یہ تو ممکن تھا کہ وہ کسی سے شکایت کرتی" کدھر تشریف لیگیا۔ غالباً یہ اب اُسی شہر خموشاں کی سیر میں مصروف ہوگا جہاں ہمارے فاضل ریویونگار نے عقل آرا کے زبردستی بھیجنے کا مصمم ارادہ کرلیا تھا بلکہ ایک گونہ اسے قبل از وقت روانہ فرما ہی چکے تھے۔ ہمارے نزدیک ایسی بے بنیاد نکتہ چینیاں صرف ناانصافی پر محمول نہیں ہوتیں بلکہ بعض اوقات ریویو کی قدر و منزلت کھو دیتی ہیں ایسی حالت میں کہا جاسکتا ہے کہ جسقدر ابتک نکتہ چینیاں کی گئیں اُن میں ایک بھی انصافانہ قابل گرفت نہیں۔ بقول شخصے ع "میں الزام اُنکو دیتا تھا قصور اپنا نکل آیا"

میں فاضل ریویونگار کی ان باتوں کے ساتھ ضرور متفق ہوں کہ محل خانہ میں جا بے سین۔ زمانہ کی قید کسی مقام پر موسم کا ذکر (گو انگریزوں کی اندھی تقلید سہی) راضیہ بیگم اور اختر بیگم کی خاندانی کیفیتیں۔ عالیہ بیگم اور حیدری خانم کے مزید حالات اگر بیان کیئے جاتے تو خالی از لطف نہ ہوتا۔ پہلوؤں میں نیا لطیفہ بھی اگر نکال ڈالا جاتا تو بہتر تھا۔ نہ اس خیال سے کہ وہ بعید از قیاس ہے کیونکہ اسی قسم کے اکثر لطیفے لکھنؤ میں پیش آچکے ہیں بلکہ اس نظر سے کہ

بیخ و محن کا اثر اور رقت وسوز وگداز کا جاں خراش عالم کیسقدر سکون بیجا کے ساتھ مبدل ہو جاتا ہی۔ اشعار کی نسبت بھی میری رائے ہی کہ جو کتابیں تعلیم نسوان کے متعلق ہوں اُن میں نہ تو سرخی اور نہ دوران دل میں تحریر کیئے جائیں بلکہ اُنسے بالکل قطع نظر کرنی چاہیئے۔ بقول فاضل ریویو نگار حیدری خانم کا کچھ اور حال سُننے کو دل مشتاق تھا۔ اسمیں شک نہیں انکی رفتار ہی نرالی ہی کبھی ساس کی تشفی تو کبھی بہو کی دلدہی کرتی ہیں۔ کسی مقام پر روتے کو ہنسا رہی ہیں کسی مقام پر سنجیدگی اور متانت کی تصویر بنجاتی ہیں۔ کبھی اپنی جادو بھری تقریر سے ایسا محو کر لیتی ہیں کہ اُنکے پاس سے ہٹنے کو جی نہیں چاہتا۔ اُنھوں نے ساس بہوؤں کے برتاؤ پر جو حکیمانہ گفتگو کی ہی اُسے اخلاق و ادب کا دستور العمل کہنا چاہیئے۔ اُنکے لطیفے۔ اُنکے روزمرے۔ اُنکی شیریں زبانی اور زمزمہ سنجیوں سے دل پھڑک جاتا ہی۔ غرض اُن کی ہمہ رنگ طبیعت نے عجب عجب گل کھلائے ہیں بلکہ ہر باب میں خواہ مخواہ یہی جی چاہتا ہی کہ تھوڑا سا بھی حیدری خانم کا بھی ذکر ہوتا تو اچھا تھا۔

گو میرے مضمون کو طوالت ہو گئی ہی مگر میں کتاب پر ریویو کی زبان کے متعلق بھی کچھ عرض کیا چاہتا ہوں فاضل ریویو نگار یوں تحریر فرماتے ہیں۔

"گو زبان کی عمدگی میں کوئی کلام نہیں مگر بعض جگہ بیگمات کا روزمرہ بیان کرنے میں مصنف نے غیر معروف ضرب الامثال اور معقولے ٹھونس ٹھونس کے بھرے ہیں۔ بیگمات کی زبان لکھنے میں آمد شرط ہی۔ مگر چند مقامات پر صاف نظر آتا ہی کہ مصنف بیگمات کی زبان سعی و کوشش سے لکھ رہے ہیں۔ زندہ مصنفین کی تصنیفات کا مقابلہ مناسب نہیں معلوم ہوتا مگر چونکہ زبان کی خوبی کسی کتاب کی عمدگی کا بذات خود معیار نہیں اس لیئے یہ کہنا بیجا نہو گا کہ منازل السائرہ کی زبان محل خانہ سے کہیں اچھی ہی۔ منازل السائرہ کی بڑی تعریف یہ ہی کہ کسی صفحہ سے اس بات کا پتہ نہیں چلتا کہ مصنف نے لفظوں یا جملوں یا فقروں کی ذرا بھی جستجو کی ہو۔ ایسا معلوم ہوتا ہی کہ مولوی عبدالرشید صاحب نے جو کچھ لکھا ہی وہ اُنکی زبان کی نوک پر تھا۔"

ہمارے فاضل ریویو نگار نے گو زبان کی حیثیت سے بھی محل خانہ کو مان لیا ہی پھر بھی منازل السائرہ کی زبان کو ترجیح دی ہی۔ اس مقام پر بحث کرنا گویا زبان دہلی و لکھنؤ کی دبی دبائی آگ پھر بھڑکانا ہی۔ مگر اختصاراً کچھ عرض کیئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ظاہر ہی کہ دونوں شہروں کی زبانوں میں بہ حیثیت محاورات بہت کچھ اختلاف ہے

اور یہ مانی ہوئی بات ہے۔ ساتھ ہی اسکے جب تک کوئی شخص ایک زمانہ دراز تک وہاں کی سوسائٹیوں میں نہ رہا ہو اور زبان و محاورات پر اُسے کامل عبور نہو ہرگز اس امر کا فیصلہ نہیں کر سکتا کہ بہ حیثیت زبان یہ اچھی ہے یا وہ اچھی ہے۔ کیونکہ تصنیفات کو اُسی شہر کی زبان کے اعتبار سے دیکھنا چاہیئے۔

فاضل ریویو نگار کا یہ فقرہ کہ "منازل السائرہ کی زبان محل خانہ سے کہیں اچھی ہے" اسکے در پردہ یہی معنی ہیں کہ دہلی کی زبان لکھنؤ کی زبان سے اچھی ہے۔ اگر یہ لکھتے کہ منازل السائرہ میں روانی زیادہ ہے تو اور بات تھی جیسا کہ اُنکے اس فقرہ سے مترشح ہے "مولوی عبدالرشید صاحب نے جو کچھ لکھا ہے وہ اُنکی زبان کی نوک پر تھا"

مجھے منازل السائرہ کی زبان کے متعلق کچھ بحث کرنیکا حق حاصل نہیں ہے کیونکہ دہلی کی زبان سے میں بالکل نابلد ہوں اُسپر بیگماتی زبان جو اور بھی مشکل ہے۔ مگر میں اتنا ضرور عرض کرونگا کہ جنکے کان زیادہ تر دہلی کی زبان سے آشنا ہیں اُنھیں محل خانہ کی زمزمہ سنجی بھلی نہ معلوم ہوگی۔ اسی طرح جو زبان لکھنؤ کے چٹخارہ کے دلدادہ ہیں انھیں مرآۃ العروس یا منازل السائرہ کی نغمہ پردازی زیادہ خوش نہ آئیگی علاوہ اسکے نابلد سخن ہونے کے سبب ایک کے دوسرے کے محاورات اکثر غیر مانوس معلوم ہونگے۔ فاضل ریویو نگار نے بغیر سمجھے بوجھے ایک نہایت ہی عاجلانہ اور بیباک ریمارک پیش کر دیا کہ مصنف محل خانہ نے بعض جگہ غیر معروف ضرب الامثال اور متروک شہر لفظ ٹھونس کے بھر دیئے ہیں۔ قصور معاف یہ فقرہ بالکل لاعلمی پر دلالت کرتا ہے اور یہ رائے وہ ظاہر کر سکتا ہے جسنے بیگمات لکھنؤ کی سوسائٹی میں اپنی عمر کا کچھ حصہ بھی صرف کیا ہو۔ اصل تو یہ ہے کہ یہاں اپنی ہی زبان کے لکھنے میں مشکل پڑ جاتی ہے نہ کہ غیر زبان میں لکھنا اور پھر خاص بیگماتی زبان میں اور وہ بھی ۲۲ یا ۲۳ جزو کی کتاب۔ فاضل ریویو نگار جن الفاظ اور مقولوں کو غیر مانوس فرماتے ہیں اُنسے وہ محض ناآشنا ہیں اور وہ سب بیگمات لکھنؤ کی زبانوں پر ہیں اور انسان جب تک لکھنؤ میں زندگی بسر نہ کرے اُسے وہ الفاظ و امثال معلوم نہیں ہو سکتے بلکہ اسپر بھی مشکل سے معلوم ہونگے کیونکہ وہ بیگمات کے روزمرے ہیں۔ قابل ایڈیٹر اودھ اخبار نے زبان کے باب میں کیا خوب ریمارک کیا ہے کہ "بہت سے محاورات ایسے استعمال کیئے ہیں جو بیرونی مقامات کے حضرات کے سننے میں پہلے پہل آئے ہونگے"۔ قابل ریویو نگار کو مندرجۂ بالا جملہ سے ضرور تشفی ہوئی ہوگی کہ جن الفاظ اور مقولوں کو وہ غیر مانوس ارشاد فرماتے ہیں انھیں وہی شخص سمجھ سکتا ہے جو زبان داں ہے اور لکھنؤ کا رہنے والا ہے۔ رہی افراط و تفریط

یا قابل ریویونگار کی زبان ہیں (ٹھونس ٹھونس) وہ بھی بقول اُنکے بعض جگہہ ہے۔ اب اس ضخامت کی کتاب کو ملاحظہ فرمائیے اور وہ بھی بیگماتی زبان ہیں اُسپر صرف بعض جگہہ آورد کا پایا جانا۔ یہ نکتہ چینی کسقدر سخت ہے اور اُنہی کے لیئے زیبا ہے جو لکھنؤ کی بیگماتی زبان میں کامل دستگاہ رکھتا ہو۔ اب میں یہہ عرض کرتا ہوں کہ مستورات لکھنؤ کے تین طبقے ہیں۔ اعلےٰ۔ ادنےٰ۔ اور متوسط۔ اول الذکر طبقہ کا کیا کہنا۔ گو باعتبار رفتار زمانہ اُنکی زبان میں بھی تغیر ہوتا جاتا ہے اور جو محاورات اور مقولے ہملوگ بڑی بوڑہیوں سے سُنتے آتے تھے وہ مفقود ہوتے جاتے ہیں مگر پھر بھی اُس طبقہ کی زبان کی دنیا دوسری ہے۔ اس صبح کی شام ہی نرالی ہے۔ اور جسے فاضل ریویونگار بعض الفاظ ٹھونس ٹھونس'' سے تعبیر فرماتے ہیں اُسے میں اپنی زبان میں زبان کا دڑیڑا کہتا ہوں۔ محلات کے بھی طبائع مختلف ہیں مگر اُن میں زیادہ تر زندہ دل اور خوش مزاج عورتیں ایسی ہیں جو بے مثل کہے کوئی بات نہیں کرتیں۔ بات بات پر اشعار۔ لطیفے۔ محاورے۔ وہ لچھے دار گفتگو۔ وہ مثلوں اور کہاوتوں کی بھرمار۔ کہ لعظمت اللہ۔ جسے سنکر انسان کے ہوش دنگ ہوجاتے ہیں۔ قابل مصنف محل خانہ نے جو کچھ لکھا ہے وہ اُنہیں کی زبان سے لکھا ہے اور سمیں شک نہیں کہ اپنے کمال کا مرقع پیش کیا ہے۔ ایک مقام پر جہاں بُری کتابوں کے پڑہنے کے اثر کو عقل آرا کی زبان سے بیان کیا ہے اُسے بیگماتی زبان میں اس طرح نباہا ہے کہ اُنہیں کا کام تھا بلکہ اُس مضمون کو عورت بھی اُس طرح نہیں بیان کر سکتی میں یہہ بھی دیکھتا ہوں کہ بعض مقام پر مصنف نے بہت ہات روک کر لکھا ہے کہ زیادہ اغراق یا (ٹھونس ٹھونس) نہ پایا جائے۔ مثلاً جہاں لڑائیوں کا سین یا عقل آرا کی وفات کے بعد بینیہ مضامین ہیں۔ حالانکہ عورتیں اُس سے کہیں زیادہ لکھ جاتی ہیں مگر میرے خیال میں مصنف نے بہت اچھا کیا کیونکہ طبیعتیں مختلف ہوتی ہیں اور اکثر ناآشنا زبان اُن مضامین کو تصنع بیجا نب محمول کرتے۔

مندرجۂ بالا اُمور کے بعد میں یہہ عرض کرونگا کہ جب المحاکمہ بین الفریقین کی نوبت آتی ہے اور جب و مماثل کی تصنیفوں پر رائے زنی کی ضرورت ہوتی ہے تو بڑے بڑے محققین جنکو اُن دونوں باتوں پر عبور ہوتا ہے اکثر سپر انداختہ ہوجاتے ہیں۔ اسکا سبب یہی ہے کہ اُن میں decision of character قوت فیصلہ کا فطرتی مادہ نہیں ہوتا اور اگر ہوتا بھی ہے تو کم۔ جسکی وجہ سے وہ ایک مشکل امر کے محاکمہ میں پس و پیش کرتے ہیں۔ ہر شخص کا کام نہیں کہ وہ ثالث بالخیر بنجائے اور اپنی رائے کی قدر و منزلت کھو دے کیونکہ اسکے لیئے

وسیع معلومات۔ اعلیٰ درجہ کی قابلیت اور ذاتی تجربہ کی اشد ضرورت ہوتی ہے۔

ہمیں نہایت حیرت ہے کہ ایک شخص جسے خاک دہلی یا عظیم آباد سے تعلق ہو وہ ہماری زبان پر اسقدر حاوی ہے کہ آج ہم مجبورانہ مگر منصفانہ اُسکی ثناخوانی اور کمال کی قدر کر رہے ہیں اور اُس کی عدیم المثال تصنیف کا کوئی مقابل نمونہ ہمارے پیش نظر نہیں مگر یہ بات فطرتی ہے ہر شخص کا حصہ نہیں ؎

خدا کی دین کا موسیٰ سے پوچھیئے احوال  کہ آگ لینے کو جائیں پیمبری ملجائے

میں نے مانا کہ مولانا نذیر احمد صاحب یا مولوی عبدالرشید صاحب بھی اپنے اپنے رنگ میں اُستاد بے بدل ہیں مگر دہلی زبان سے اتنا ضرور عرض کرونگا کہ اگر اُنہوں نے اپنی زبان میں لکھا تو کیا کمال کیا۔ کمال جب تھا جب وہ بیری زبان میں اس فصاحت و جامعیت کیساتھ دریا بہاتے جس کی بیش بہا نظیر مولوی سیّد علی سجاد صاحب نے پیش کی ہے۔ حق تو یوں ہے کہ لوگ برسوں خاک چھانتے ہیں۔ شاعری اور شاعری میں عمریں صرف کرتے ہیں مگر کسی نتیجہ خیز کتاب کا لکھنا تو درکنار اُن کی زبان اور اُنکے محاورات تک درست نہیں ہوتے مگر وہ شخص جو فطرتی دل و دماغ لایا ہے اور سوسائٹی کے رنگ میں تھوڑے ہی دنوں کے لیئے شرابور ہو جاتا ہے وہ ایسا کچھ کر جاتا ہے کہ بڑے بڑے اہل زبان اُسکا مونھ دیکھکر رہجاتے ہیں۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ محل خانہ کی زمین دوسری اور اُسکا آسمان ہی دوسرا ہے۔ فاضل مصنف نے اپنی کتاب میں شاعری اور مصوری دونوں سے کام لیا ہے۔ شاعری اس حیثیت سے کہ جس مشکل کوچہ میں اُنھوں نے قدم ڈالا ہے وہ مردوں کے احاطہ قدرت سے باہر ہے۔ اس زبان پر اُسی کو عبور ہو سکتا ہے جو بیگمات لکھنؤ کی سوسائٹی اُنکی کامل خو بو اور رگ و ریشہ سے واقف ہو۔ بلکہ میں انصافانہ یہاں تک کہتا ہوں کہ اس کامل واقفیت پر بھی اس سلاست فصاحت کیساتھ ہرگز نہیں لکھ سکتا کیونکہ واقفیت اور شئے اور اداے مطلب اور شئے ہے۔ اس کتاب نے مجھے اسقدر حیرت میں ڈالدیا کہ میں دعوی کے ساتھ کہتا ہوں کہ اگر لکھنؤ کی کوئی خاندانی تعلیم یافتہ خاتون بھی اس طرز کی کتاب لکھنا چاہے تو اس روانی و شستگی اور رسم رواج کی پیچیدگیوں کے ساتھ اداے مطلب بمشکل ہونگے حالانکہ اُسکی خاص زبان ہے اور باور نہو تو کوئی آزما دیکھے۔

اب رہی مصوری اُسے میں نے اس نظر سے کہا کہ جو کچھ مصنف محل خانہ نے لکھا ہے اسکا ہو بہو نقشہ کھینچ دیا ہے

اور بعض مرقعے جنکا میں اوپر ذکر کر چکا ہوں بالکل صنعت کے نمونے ہیں۔ اسمیں شک نہیں کہ یہ کتاب زبان لکھنؤ کا ایک فصیح البیان اُستاد۔ مصطلحات اور محاورات کا ایک گنجینہ اور اخلاق و آداب کا قیمتی دستور العمل ہی۔ مجھے امید ہی کہ قابل مصنف محل خانہ اپنی نادر تصنیفوں سے اہل ملک خصوصاً طبقہ اناث کو ضرور فائدہ پہنچاتی رہینگے اور اپنے گلگون خیال کو ہندوستان ہی کے دائرہ میں محدود رکھینگے ممالک غیر کی سیر کرنے دینگے کیونکہ یہی سہل مضامین جنکا کہنا بعید دشوار ہی کچھ دنوں بعد ہماری تاریخ سوسائٹی کے طلائی اوراق سمجھے جائینگے

آخر میں میں اپنے فاضل ریویو نگار مولوی سید علی رضا صاحب رضوی۔ بی۔ اے۔ کی اس محققانہ رائے کے ساتھ ضرور اتفاق کرتا ہوں کہ مصنف محل خانہ کو اجتہاد کا درجہ دینا چاہیئے۔ اور اسمیں شک نہیں کہ اُن کی وسیع معلومات کی نظر مولوی نذیر احمد صاحب سے بدرجہا بڑہی ہوئی ہی۔

ختم مضمون سے پہلے اس امر کے اظہار کرنے کی بھی ضرورت ہی کہ یوروپین مذاق کے موافق بھی محل خانہ حد درجہ پسندیدہ ہی اور جیسا کہ باگھوٹ نے اسکاٹ کے بارہ میں یہہ رائے زنی کی ہی کہ "اُسے وہ قوت حاصل ہی کہ حیرت انگیز آسانی و روانی کے ساتھ وہ زندگی کے حالات اور روزمرہ کے خیالات کو درج کر دیتا ہی" میرے نزدیک یہی قوت مصنف محل خانہ کو بھی حاصل ہی۔ فرقہ اناث کے ناول نویسوں میں مس جارج ایلیٹ اور مس ناسن بھی انگلستان میں اپنی باتوں کے لیئے مشہور ہیں۔ بااینہمہ میرے خیال میں ہندوستانی مصنفوں کا۔ وکٹر ہیوگیو۔ یا ڈکنس۔ الیگزنڈر ڈیوس یا اور کامیاب فرنچ ناول نگاروں سے مقابلہ کرنا کچھ اوپری سا معلوم ہوتا ہی کیونکہ مشرقی اور مغربی طرز معاشرت اور اُسکے اسباب بالکل جداگانہ ہیں۔ علاوہ اسکے انگلستان کے اعلےٰ درجے کے ناولوں میں بھی وہی معائب کثرت سے پائے جاتے ہیں جنکا الزام ہندوستانی ناول نویسوں کو دیا جاتا ہی۔ ہندوستان کا اعلےٰ درجہ کا ناول نگار مسگی ٹلیور یا ایمہ وڈہورس کا مرقع نہیں کھینچ سکتا اسیطرح مسیس مٹرلوپ یہاں کے حال و مثال کا چربہ نہیں اُتار سکتیں۔

اس میں شک نہیں کہ ہندوستان کی ناول نویسی بالکل کم عمری کی حالت میں ہی اور اللہ رکھے اگر دنیا ابھی ناولسٹ میں بھی تو ہمیں کیا کامل تشفی ہو سکتی ہی کیونکہ سوا پانچ چار ناولوں کے ہندوستان کے تمام ناول نہایت ہی ادنیٰ کمزور۔ غیر دلچسپ ڈرامہ ٹک ناٹک میں جتنے اخلاقی نتایج۔ زندگی اور سوسائٹی کے خیالات کچھ بھی

نہیں معلوم ہوتے۔ مگر جہاں یہ ہے وہاں یہ بھی ہے کہ ہندوستان کے ناول اسپین کے نقلی یا خیالی ناولوں کی طرح بد ذائقہ بھی نہیں اور نہ فرانس کے ملکی ناولوں کی طرح میٹھے اور بے نمک ہیں۔ انگلنڈ میں اب ایک نیا انقلاب پیدا ہوا ہے کہ وہاں کے افسانوں کی روحی طاقت پولیٹکل اور ایرش مضامین سے بڑہائی جاتی ہے جس کی وجہ سے مس بڑولوپ اور دوسرے درجہ کے ناول نگاروں نے بڑی کامیابی اور شہرت تامہ حاصل کی ہے مگر شکر ہے ہندوستان کے ناولوں میں ابھی تک پولیٹکس کا خمیر نہیں دیا گیا اور جسدن یہ ہو چلی بس اسی دن سمجھئے کہ یہ نیل کا ماٹ بھی بگڑا اور پھر رنگ میں بھنگ ہو گیا۔

م۔ا۔بی۔اے۔

# قوم کی زندگی اور موت پر اعیان قوم کا اثر

## از مولوی سید محمد ضامن صاحب ضامن کنتوری

۱۹ ویں صدی عیسوی کے بہت بڑے مشہور فرنچ ناولسٹ اور ادیب وکٹر ہیگو نے ناول کی صورت میں اسپین کے عروج و زوال کا ایک فلسفیانہ تاریخی مرقع کھینچا ہے۔ اور یہ دکھلایا ہے کہ دولت اسپین جو تمام یورپ میں سب سے زیادہ قوی اور امریکہ کی کانوں کی بدولت سب سے زیادہ متمول سلطنت تھی اُسنے ۱۷ ویں صدی عیسوی کے آخر میں کیونکر انحطاط کیا۔ مصنف نے اس ناول "روی بلاس" کے مقدمہ میں قوموں کے عروج و زوال پر ایک فلسفیانہ بحث کی ہے۔

۲۳۔ اکتوبر ۱۹۰۳ء کے اخبار "وطن" نے کسی عربی اخبار سے اس مقدمہ کو اُردو میں چھاپا تھا۔ مصنف نے معلومات اور شہادتوں کی بنا پر قوموں کے نیست و نابود ہو جانے۔ اور سب سے پہلے اعیان و اشراف کے گروہ میں تنزل کے آثار شروع ہونے اور پھر تمام قوم میں مرض متعدی کی طرح اُسکے پھیلنے کی جو تصویر کھینچی ہے وہ ہو بہو ہماری قوم پر صادق آتی ہے۔ اور آج بھی یہی نقشہ ہندوستان کے مردہ امرا اور رؤسا کی در و دیوار پر نظر آتا ہے اور وہ ہیں کہ چونکنے کا نام نہیں لیتے۔ اگرچہ بڑے بڑے سحر بیانوں نے صور پھونک پھونک کر انکو جگانے کی کوشش کی لیکن ان منادوں کا کام ہے کہ جب تک یہ متوالے ہوش میں نہ آئیں اپنی آواز بند نہ کریں۔

فرنچ مصنف کے خیالات کی صداقت نے میرے دل میں یہ گدگدی پیدا کی کہ اگر انکو نظم کا جامہ پہنایا جاسے تو ہماری قوم جو شاعری پر مٹی ہوئی ہے شاید اس چٹخارہ میں اسکو زیادہ مطالعہ کرے اور ان ناصحانہ خیالات کو اشاعت کا زیادہ موقع ملے۔

لہذا میں نے اپنے دوست مولوی سید محمد ضامن صاحب ضامن کنتوری سے فرمائش کی کہ وہ ان خیالات کو نظم کر دیں چنانچہ ہمارے دوست نے جس فصاحت و بلاغت سے وکٹر ہیگو کو اُردو زبان میں گویا کیا ہے وہ اُنکی قادر کلامی کی ایک اعلیٰ نظیر ہے۔ اور "منتخلی" کے ناظرین کیلیے شائع کیجاتی ہے۔ محمد اختر حیدر آبادی

پوچھی جو ایک طبیب سے وجہ زوال قوم — فرمایا چند ہیں سبب ارتحال قوم
پھیلا مرض تنزل و ادبار کا جہاں — ہر لحظہ کچھ سے کچھ نظر آتا ہی حال قوم
ہوتی ہی برہمی شرفا کے گروہ میں — پہلے یہ بنتے ہیں سبب اختلال قوم
پاتا ہی اک فریق خطاب "مقتدر ہیں" — ظاہر میں جو ہی مہر سپہر جلال قوم
باقی "متعدین" کا پاتے ہیں سب لقب — اس طرح گھٹتی ہی کشش اتصال قوم
جس خاندان میں پہلے حکومت کا زور تھا — اب وہ ہی مثل قالب بے دہ وبال قوم
عمال بے سیاست و قانون بے عمل — ہوتے ہیں طرح ریز جدال و قتال قوم
باہم شروع ہوتی ہیں در پردہ سازشیں — ہوتا ہی زنگ آئینۂ حال قال قوم
وجہ بقائے قوم ہیں جتنے اہم امور — جاتا نہیں ہی خواب میں اُن پر خیال قوم
باتیں حقیر جو ہیں نظر آتی ہیں اہم — کہلاتے ہیں عیوب و نقائص کمال قوم
ہوتی ہیں غازہ کش جو حماقت مآبیاں — شام ملال بنتی ہی صبح جمال قوم
ہوتا ہی زندگی کا غم و غصہ پر مدار — رہتا ہی زر نہ زور نہ مال و منال قوم
محسوس ہونے لگتے ہیں آثار ضعف پھر — بنتی ہی یاس آئینہ دار مآل قوم
رہتا ہی ہر بشر کو قیامت کا انتظار — کٹتے ہیں اس خیال میں سب ماہ و سال قوم
فردا کا خوف دیتا ہی دل کو کبھی الم — اعمال قوم بنتے ہیں وجہ ملال قوم
اپنوں سے برتی جاتی ہی بیگانگی کی رسم — پڑتی ہی ہر طرح سے بُری نرد فال قوم
ایک ایک کرکے مٹتا ہی نام آوروں کا نام — اعیان قوم بنتے ہیں گرد نعال قوم

ازبس کہ سر ہی ہر مرض قوم کا محل
آتا ہی سب سے پہلے شریفوں ہی میں خلل

ڈالو امیر قوم کی حالت پہ گر نظر — شہوت پرستیوں کا محل ہوگا اُس کا گھر
دکھلائی دینگے شاہ کے جتنے مقربین — سب ہوں گے بے حیا و بد اخلاق و بے ہنر

سرعت سے کر رہے ہیں جو طے راہ انحطاط
ظاہر میں گو دکھاتے ہیں جاہ و جلال و فر

اوقات تلخ وقت ہی تنگ اپنے حرص سے
یہ فکر ہے کہ جمع ہو جلدی سے مال و زر

جیسے بنے مراتب عالی کریں حصول
جس وقت تک ہے حالت موجودہ کا اثر

عبرت کے بدلے دیکھ کے افلاس قوم کا
ہوتی ہے جمع مال کی فکر اُن کو بیشتر

سرمایہ جمع کرتے ہیں لوٹ اور کھسوٹ سے
خوش ہو کے تاپتے ہیں گھر اوروں کا پھونک کر

اُنکی بلا سے خاک میں ملجائے ملک و قوم
کرتی ہے اپنی فکر عزیزوں سے بے خبر

بہر حصول ثروت و اعزاز و مال و جاہ
دیدیتے ہیں یہ جان بھی کچھ کام نکلے گر

علم و عمل کے بدلے تمسخر میں ہے غلو
ان کا کمال سب ہی ظرافت پہ منحصر

بدگوئی و خوشامد و اخلاق ظاہری
ہر معرکہ میں ان کے ہیں شمشیر اور سپر

گر ملک میں بھڑکتی ہے بدنظمیوں کی آگ
خس پوش کرکے اور بھی کرتے ہیں شعلہ ور

بھولے ہوئے فضائل انسانیت کو ہیں
خوئے درندگی میں ہیں مشاق سب مگر

خود بینی و غرور ہی شان مقر ہیں
خلقت کی شرم جنکو نہ خالق کا کوئی ڈر

ہیں صاحب مناصب و جاگیر ملک میں
یہ لوگ جو کہ حرص کے بندے ہیں سربسر

لیکن جہاں یہ منصب و اعزاز کھو گیا
پھر ایک ایک ان میں سے شیطان ہو گیا

یوں ہر طرف سے ہوتی ہے مایوس قوم جب
اصلاح حال کی اُسے ہوتی ہے فکر تب

اپنے سے اُس گروہ کو کر دیتی ہے جُدا
حاصل تھا ملک میں شرفا کا جسے لقب

ارکان سمجھے جاتے تھے جسکے بزرگ قوم
اونچا تھا عام لوگوں سے جنکا حسب نسب

ہوتا باہم ہے قطع تعلق جب اس طرح
شرم و حیا کے دل پہ اُٹھاتے ہیں وہ تعب

خانہ نشین ہوتے ہیں دُنیا کو چھوڑ کر
اُن کو زمانہ دیتا ہے عزلت کا درس جب

اصلاح حال قوم سے کرتے ہیں وہ گریز
مجبور ہیں کہ آپ ہی بدست و پا ہیں سب

گو ہات پاؤں مارتی ہے قوم اُدھر اُدھر — بسمل ہے اُنہیں اُٹھنے کی طاقت کہاں ہے اب
سمجھا ہے رنج سعی عبث ۔ وقت ٹل گیا — آخر ہے روز عیش ۔ فلاکت کی آئی شب
جو کام کرنے والے تھے اُنکا یہ حال ہے — ہموار راہ بھی ہے اُنہیں سوجھتی کُڈھب
سمجھے ہیں اکل و شرب کو دارو درد دل — فرصت ہے اُنکو نفس پرستی سے اپنی کب

دنیا و دیں سے کھو چکا ہے اُنکو یہ خیال
عیش آج کر لو کس کو خبر کیا ہو کل کو حال

جب ہو گیا یہ حال امیران قوم کا — ایسا خیال اُن کے دلوں میں سما گیا
پھر کہیئے کس کو فکر ہو بہبود قوم کی — اُن کو خواہشات سے فرصت نہیں ذرا
صحت کی کیا اُمید ہو ایسے مریض کو — جس کا طبیب آپ مرض میں ہو مبتلا
بحر ہوس میں آپ ہی ڈوبا ہوا ہو جو — کیوں کر بنے جہاز کا اوروں کے ناخدا
افسوس! جو ستون تھے عمارات قوم کے — بے طرح اُن کو عیش پرستی سے گُھن لگا
جو مال صرف ہوتا تھا کار رفاہ میں — وہ اب فضول خرچیوں میں دیتے ہیں لٹا
ہیں عورتوں کے واسطے زیور خریدتے — کرتے تھے جمع فوج کی خاطر جو اسلحہ
ارسال ہوتے ہیں کہیں تحفے نئے نئے — شادی کی دہوم ہے کہیں دعوت کی ہے ثنا
طرہ یہ ہے کہ ان کے سرانجام کے لیئے — لیتے ہیں سود کاٹ کے ساہو سے روپیا
برباد کرکے دولت و املاک اس طرح — لاتے ہیں سر پہ ہاتوں سے افلاس کی بلا
اب وہ ضیافتیں ہیں نہ شادی نہ دہوم دہام — جز قرض خواہ کوئی مصاحب نہیں رہا
جو ملے میں راکھ دل میں ہے گرد الم بھری — دولت کے ساتھ ساتھ دہواں بھی تو اُڑ گیا

ہے ان کس دوست کی نہ سہارا حبیب کا
سچ کہتے ہیں نہیں کوئی ساتھی غریب کا

دار فنا ہے دہر بھی عبرت کا ہے مقام — دیکھو کہ سیر زیست سے ہے اب یہ مستہام

ہی پاس نہ زر نہ یار اور نہ غمگسار — آتا نہیں ہی صنعت و حرفت کا کوئی کام
محتاج ہو کے قوت کو پھرتا ہی در بدر — اوباش دوست اور رفیق اُسکے ہیں عوام
ہونے لگا ہی اسکا اب اُن لوگوں میں شمار — جنسے کبھی ہوا بھی نہ تھا پہلے ہم کلام
جیسے محل سراؤں میں اُسکے تھے خدمتی — اب میل جول اس کا انھیں لوگوں سے ہی عام
ذلت کی پڑ گئی ہی جو عزت کے بعد خو — ہنستا ہی اُسپہ گر کسی منعم کا لیجے نام
ادبار کی اُسے نہیں رہتی ہی کوئی فکر — اقبال کا اُسے نہیں رہتا خیال خام
بنتا ہی فیلسوف مشیخت دکھانے کو — پھر کر ہر ایک سمت سے مایوس و بے مرام
ہیں بدمعاش ویسے ہی اُسکے بھی ہمنشیں — اوباش جیسے ہوتے ہیں سلطاں کے ایڈیکام
اُن کا رئیس وہ ہی۔ یہ اُن کا رئیس ہی — دکھلائے کیوں نہ اپنا انھیں عظم و احتشام
اُسنے بڑا ہوا جو حسب اور نسب میں ہی — سنجیدہ و دلیر ہی یہ۔ وہ دنی و خام
کرتا ہی آپ چوری نہ ہی بھیک مانگتا — پر ساتھیوں سے لیتا ہی اپنے یہ سارے کام
تدبیریں اُن کو ہی یہ سکھاتا نئی نئی — لاتے ہیں جو وہ لیتا ہی انمیں سے خود سہام
اوصاف سیر چشمی و بیباکی و غرور — باقی ہیں اُس کی ذات میں اب بھی برائے نام

ان کے سوا نسب ہی بچاتا ہی وہ جسے
اور دوسرا ہی نام چھپاتا ہی وہ جسے

القصہ قوم کی جب ہی ممکن ہی زندگی — اصلاح جب کریں امرا اپنے حال کی
سردار قوم اور رعایا کے درمیاں — ہر ملک ہر زمانہ میں ہیں واسطہ یہی
گر بادشاہ سر ہی تو جسم اُس کا قوم ہی — اور اس گروہ کو ہی جگہہ قلب کی ملی
صحت کی ہی دلیل اگر قلب ہو صحیح — بیمار دل ہوا تو علامت ہی موت کی
گر قوم جسم ہی تو یہ لوگ انکی جان ہیں — مردہ ہی جسم جان جب اُس سے نکل گئی
مختار دیہہ ہوں کہ امیران شہر ہوں — اُن کی ہی سب سے پہلے ہی اصلاح لازمی

ہر چند ہیں شمار میں تھوڑے عوام سے — لیکن بڑھے ہوئے اہمیت میں ہیں یہی

بس خواب مرگ قوم نہیں لوگوں کا خواب ہی
جاگے نہ یہ تو قوم کی مٹی خراب ہی

ضامن۔ حیدر آباد دکن۔



(مطبوعہ ریاض ہند پریس علی گڑھ)

(3) A student must know four European languages if he is to read his authorities in the original

The objection to English History is not so strong and I am inclined to think that if for Indian students Modern History could be confined to England it might be a useful subject of study; the extraneous knowledge which it postulates is of course considerable *viz.* (1) The history of Greece and Rome, without which no European history is intelligible, (2) Christian dogma; (3) contemporary European History, and (4) sufficient familiarity with Latin to be able to decipher old laws, decrees and ancient documents generally.

I have omitted all consideration of the post-graduate study of *English*, not because I think that English Literature is not beneficial, on the contrary I think that English books should be constantly in the hands of our graduates and English thoughts should be continuously occupying their minds, but I cannot discover in English Literature a subject of study. As a linguistic exercise merely English is of very little value, in fact any such study means Anglo-Saxon, and a smattering of Persian and Gothic roots And as literature, it is too vast, too complete to be adequately studied. English Literature is a reflection of the thoughts, the hopes, the fears, the joys, the sorrows of the English people for more than 300 years, it is their life, reflected from a mirror that fixed every apparition as it passed, the study of English Literature is a thousand studies, it is history or philosophy, or religion or Christian theology in a hundred forms, or it is satire or folly, or vice or jollity but it is not one thing nor is there one definite subject, poetry is of course the group which most easily detaches itself from the rest of English Literature, and that is why poetry always figures so largely in courses of "Literature" but is the one subject above all others which eludes analysis and study, in the case of most classical languages the study of poetry generally means the study of speech and words, *i e*, a linguistic study.

Let our students in the future learn English as thoroughly as possible, let it become a medium for their thoughts and the passport for them to become citizens of that intellectual cosmopolis in which the best thoughts of Europe and America are current; but what we *need* is the spirit of the West whether the subject of study be old or new; what we are *threatened* with is a conservative oriental spirit applied to the acquisition of European learning.

T. MORISON.

in which these branches of learning developed in Europe, in which they are still chiefly studied at the Universities by students. The classical Tripos for instance contains two parts; the first deals with language and literature and the second with such advanced branches of classical study as the student selects, a critical study of Plato and Aristotle, with the assistance of modern comparative methods, forms as good an education in philosophy as can be attempted within the necessary limits of a student's time and the study of Greek and Roman History is conducted in such a way as not only to be an introduction to General History but also to suggest comparisons which illustrate modern politics.

But I confess I do not understand how these subjects can be taught, as it were, in the air, divorced from the people out of which they sprang. All Philosophy and all History cannot be mastered by any one man in a lifetime and therefore hardly commend themselves as subjects to be mastered by students in two or three years, we must select some school of philosophy, some period of history as an introduction to philosophic reasoning and historical method; we must make the young scholar study a part exhaustively so that he may thence infer the whole, and it is most obvious and natural to begin with that history and that philosophy with which he is most akin and for the understanding of which he requires the least extraneous information. As the English boy is already reading Plato and Thucydides, Greek philosophy and Greek history form his natural introduction to those subjects, and the Aligarh student should similarly study them as different aspects of Arab culture.

But here my objector will interpose; "Then why not English Philosophy and English History, for we have learned English for the B.A.

For the reason that in order to study either the one or other so much extraneous knowledge is required which the Indian student has not got and which it is unnecessary that the majority should have. There is of course no such thing as English Philosophy, but only European philosophic speculation which is known and esteemed in Western Europe and which is written in German, French, English and Latin. This philosophy cannot be the object matter of student's education because (1) it is too vast (2) it is impossible to isolate one school of thought for the rise of one set of ideas in France profoundly modified the opinions of a previously existing school of thought in England.

are known and obtainable in India are either in manuscript or lithographed, and generally badly edited; the printing presses of Egypt and Syria and Europe on the other hand have enriched the world with editions of Arabic authors which are almost unknown in India; we need a careful collection from all these sources so as to get together for scholars as representative a library of Arabic Literature as possible; in addition to that we need the dictionaries, lexicons, concordances and books of reference generally which have been compiled, mostly in Europe, and as in the case of science we need the reports and journals of learned societies

If such a School so equipped and endowed were actually attached to the Aligarh College, a real beginning would have been made to the creation of Muhammadan University. We should then be in a position to discharge one of the most important functions of a University, *viz.*, the advancement of knowledge in at least one of its branches: among a certain set of scholars we should have established a claim to respect and honour; we should have begun to pass beyond the state of the High School which aims only at imparting and examining upon matters of common knowledge and advanced a small step into the area of Academic or University scholarship.

But I conceive that here some of my readers will have begun to differ from me; they will say that upon the Arts side they want an English education, something as definitely and wholly European as Science. To this I can only reply that there is no such thing, they want something, which as far as I know, does not exist An education in the Arts in Europe means an education in the Greek and Roman classics, and if Muhammadans want an education in the Arts, such as Englishmen or Germans receive, they must take up Latin and Greek. This is I suppose wholly out of the question and no one seriously contemplates it. What I imagine is meant is a further study of the subjects of the B. A Examination, *i.e.* Philosophy, Economics, or History Now these subjects would I conceive necessarily form part of the group of studies which would occupy the Arabic School History for instance would be the history of the growth and expansion of the Arab Empire, the Crusades, and the Caliphate of Bagdad; and it would inevitably include a study of the later Muhammadan kingdoms in Persia, Afghanistan and India. Philosophy would be taught in connection with (1) the Greek philosophy from which the Arabs borrowed (2) Arab philosophic speculation (3) Modern criticism thereon, and comparison of ancient and modern philosophic systems. This of course is the method

be necessary to send them to Europe for training The staff necessary for the Arabic School would be, I think--

One European Director.
Two Arab Professors
One Professor from Persia
Two or three Indian Maulvis.

They would give instruction in post-graduate courses of study, that is to say, their pupils would in general be graduates; at any rate it is essential to the scheme that their pupils should have read so much English as to enable them to understand the genius the spirit of the West They must have acquired the essentially European spirit of inquiry and research they must be eager to test facts and theories, not content to reproduce the learning of bygone worthies, they must have such a knowledge of European languages as to be able to avail themselves of the labours of European scholars, and an acquaintance with European history and European civilization for comparative study.

Upon the analogy of the Greek and Latin classics, which are still the main branch of English University teaching, the study of Arabic would be divided into the following groups (1) Language, which includes the study of the Arabic classical authors and composition in Arabic, and (2) Philology or the comparative study of allied languages (3) Archeology (4) Religion, religious thought and philosophy (5) History If the study of Greek and Latin upon these lines has trained the intellects of the great majority of English statesmen and formed the prevailing tone of English society, and is still the chief subject matter of education all over Europe, it is hardly credible that the scientific study of Arabic is incapable of serving a similar purpose for at least that portion of the Muhammadan community which desires a training in the arts. But besides teaching pupils, the school of Arabic studies which I contemplate would do something for advancing the boundaries of knowledge; it would edit and publish hitherto unprinted texts and the results of original research, compile catalogues of libraries, a work, the value of which to scholarship is hardly apprehended in India, and enrich Urdu Literature with works of history and biography.

No place can become a home of learning without a good library, but it is particularly necessary to insist upon it in this connection because there is not in the whole of India a scholar's library of Arabic books The few Arabic books that

higher work. A young Englishman who is perhaps bracketed with Dr. Zia-ud-din in the Tripos will probably be elected a Fellow of his College, and thus be given an opportunity of making a more profound study of the subject of his choice. Before his Fellowship, which is tenable for 7 years, expires, he will probably be offered the chance of doing some teaching work in his College and it is not until his Fellowship terminates and his College decides to re-elect him that he receives the final seal of approval as a teacher. It is from among the Fellows so approved that the University Professors are selected

For the higher work which we attempt we must not be satisfied with qualifications lower than these. Our Professors upon the science side must not only have stood high in the Tripos examinations, they must also have studied, in Germany and France, as well as in England, after they have passed beyond the area of examinations As a practical example Dr. Zia-ud-din ought not, after passing his final examination at Cambridge this spring, to return immediately to India, but he should increase his knowledge by study in a University town either in England or Germany. And such as his attainments would then be in pure mathematics should be the attainments of our Professors of Physics and Chemistry. The strength of the whole science staff would then be these three Professors and three Assistant Professors who had received their training in India. Aligarh would then be in a position to teach the Intermediate and B Sc courses thoroughly and take on a few pupils in post-graduate studies in such a manner as to stimulate a real enthusiasm for scientific knowledge and possibly to make contributions to science It would be over sanguine to expect from such a small body of men any notable discoveries or to hope that they would invent any practical applications of science for the development of the material resources of the country ; but we should at least have planted a small seedling of the tree of knowledge which spreads and broadens in such wondrous ways when once it has struck root.

Such then I conceive to be our duty as regards science. Upon the Arts side the difficulties are not so great, the end is probably more nearly within our reach It may shortly become possible for us to equip and provide for an Arabic School which would, upon the Arts side, be equiponderant with such provision for teaching science as I have just described, and though I contemplate that here too the bulk of our Professors would be Indians and Muhammadans it would not, I imagine,

only half a mile from the University Library which contained a complete record of the scientific work done in Europe and America.

We cannot in Aligarh, for many years to come, think of an equipment so perfect, but we must bear in mind that if we are ever to have a moderately efficient science side we need (1) two laboratories and (2) the College must subscribe to scientific societies and receive their reports and publications and take in journals dealing with pure and applied mathematics, physics and chemistry.

There remains the all important question of the staff, and here I must insist upon an important principle which is constantly neglected in regard to Indian education. The men who are to take the higher teaching and to stimulate their pupils must not be overburdened with routine work, all their energies must not be expended in taking heavy classes for the Intermediate Examination, this is in reality High School work and the abilities needed for it are those of the teacher, not of the Professor. The science staff that I contemplate must be *in addition* to that which we at present possess if we are ever to have really good scientific teaching and create a scientific atmosphere in which original contributions to science will be possible. I hold the opinion very strongly that all our science Professors should be Indians and preferably Muhammadans. Dr. Zia-ud-din will of course come to the minds of my readers as an illustration of the type of man we should require to fill these posts. A capacity for scientific work is naturally indispensable but it would be of no use to us without adequate training, now this training at present cannot be had in India. Dr Zia-ud-din wrote to me after he had been a year in Cambridge saying: "I thought when I was in India I knew something of mathematics, but I now realise that I was a mere beginner, I wish I had not taken up the advanced course at Cambridge but read for the first part of the Tripos, for I see that there are many boys who leave English Schools with a better knowledge of mathematics than I got in India." I think that Dr Zia-ud-din modestly under-estimated his own attainments, but his letter sufficiently shows that the training available in India is quite inadequate for the men who are to be Professors. Nor must it be supposed that in England the men who have taken a high place in the first and second parts of the Tripos are forthwith entrusted with University teaching, the Tripos is not the end of their education but a means of roughly sorting out those who have, and those who have not, the capacity for

Not two lines written yet! Upon my life, you can't finish the paper even if you sit till midnight. I have got an essay ready with me. You may read that in the society. So, you see I help you in your time of need; for a friend in need is a friend indeed. On your part, you have only to order a dishful of sweetmeat; because, you know, I am awfully hungry.

ZARIF.

## True Learning.

All of us love at times to dream of what the development that would be possible if the College in Aligarh were adequately endowed, to frame the courses of instruction that should be adopted if a pious benefactor put them within our reach. From among these pleasing fancies I wish to select those which have a paramount claim upon our attention and which are within the range of possibility although I cannot define the limits of time within which I hope to see them realised.

The first among these is the creation of a science side, and of this the first postulate is two well equipped laboratories, one for Physics and the other for Chemistry; in addition to the initial cost of these laboratories we need of course a sufficient income for their effective up-keep, this is an expenditure with which everybody is familiar, but it is not as generally recognised that in order to enable the staff to keep abreast of modern scientific discoveries the College must subscribe to and make accessible to the Professors and advanced students several scientific and technical journals and the proceedings of scientific societies. When I talked with Professor Forsyth, the greatest teacher of pure mathematics at Cambridge, upon the work which could be open to Dr. Zia-ud-din in India, he said to me very emphatically; "If you expect ever to do any original research, to do any scholarly work in mathematics, you must provide him with at least four mathematical journals (which he named); if your resources permit you might let him have access to many more, but these at least are indispensable." He then pointed to the books which entirely covered one side of a large room, and which must have amounted to nearly 2,000 vols., and told me that he found it necessary to have these, which were solely composed of mathematical journals and the proceedings of mathematical societies, always close to his hand, although he lived

(Reads)

Lord Curzon is good
All of us should
Praise him much
Never came such
A Viceroy,
He came to the college—
Acquire knowledge,
He told us all,
The great and the small,
Let us all say
Hip ! Hip ! Hurrah !

Hasan Excellent You are sure to be gazetted Poet Laureate of India one day But—

(Enter Wajid.)

Wajid I want to discuss with you, the question of the revival of Arabic learning The present scheme, in my opinion, is calculated to check our material progress. Our degenerate community stands in need of active and practical men rather them bookish grammarians and metaphysicians. I have written an elaborate manifesto against the scheme. (Reads)

The undersigned respectfully begs to draw the attention of his co-religionists to the fact that the proposed scheme for the revival of Arabic learning is likely to prove detrimental to the vitalest interests of the community. My reasons are as follows :

(Enter half-a-dozen friends.)

1st friend.—The war has been declared, at last, between Japan and Russia.

2nd friend.—Our sympathies are with Japan, the champion of Asia.

Hasan.—Quite so. But Japan has been very rash. She will have to repent in the long run. How long can a pigmy hold its own against a giant.

(Enter Haidar Ali )

Haidar Ali.—Have you finished your essay, Hasan ? The sun is almost setting I thought we could go out for a stroll. (Looks at the sheet of paper lying on the table) What !

(Enter a servant with a letter,) Hasan. What ! another letter ! (reads.)

Dear Hasan,

The Arnold Society will meet the day after to-morrow. I hope your paper is ready.

Your sincerely,

E F.

Dear me ! How can I accomplish all this task.

(Resumes writing )
" Yet its accidents are '— (Enter Shafi.)

*Shafi.* Excuse my interrupting you I have come on a very important business. Doctor Ross, the famous Oriental Scholar, has kindly promised to attend a meeting of the *Lajnatuladab* society. We have proposed to present him with an address of welcome. It is to be written in Arabic. As you are well versed in that language I hope you will kindly take the trouble of preparing a draft of the address. As you are busy at present I beg leave to depart. (exit).

Hasan resumes writing, " to all intents" -

(Enter Mohsin with a sheet of paper in his hand.)

Hasan (aside). This interruption is unbearable

Mohsin. I am a student of the first year class. I wish to make a speech in the coming debate. I have written out my speech and want to get it corrected Shall I read it ?

(Begins)

Social reform is a very important thing. A man without social reform is a building without foundation. Education is useless if a man is not possessed of social reform A man who has no social reform is dispised by everybody. Sir Syed possessed social reform and therefore he was able to found the M. A O. College. Social reform—

Hasan. Please leave the paper with me. I'm sorry I can't correct it at present. I am very busy. (Exit Mohsin.)
Hasan resumes writing— " and purposes "

(Enter Bashir.)

Bashir. Excuse my encroaching upon your time. I have composed a poem in praise of Lord Curzon. As your humble pupil I request you to correct it.

"Dear Hasan, I am dying of hunger. Let me have some sweetmeat and I'll pray for your health, wealth and long life," and he doesn't let me take rest until the demon of his appetite is appeased

Deuce take my friends! As I was making a round in the courts the other day Majid asked me to correct his translation, Hamid wanted me to explain his difficulties in philosophy, Said requested me to read with him 'Burke's reflections on the French Revolution How can I keep so many engagements and oblige so many friends, when I am so very busy? I have to write no less then half-a-dozen essays this week. And besides as a student of the M A. Class, I have to study history, political science, political economy, Persian and Arabic I doubt if I can go in for the M A. Examination this year I am at a loss what to do. My whole time is taken up by the untimely calls of my friends It is midnight now. I feel tired and sleepy Let me go to bed.

(He goes.)

---

SCENE II.

(Time, morning. Hasan writing an essay.)

"Life is the phenomenon of active motion"—

(Enter a servant with a letter )

Hasan (reads.)

Dear Hasan,

Have you got your paper ready? The Literary Society meets to-night at my house at 8-30 p.m.

Yours sincerely,

A. B

(Resumes writing.)

"What the essence of it is, nobody has yet been able to determine"—

(Enter a servant with a letter.)

Hasan (reads )

Dear Hasan,

The Historical Society will meet to-morrow. Please let me know your subject and oblige.

Your sincerely,

C. D.

## FINAL REMARKS.

A certain father of the Church said to one who asked of him rules for living : "Love, and then do what you like." An answer similar to this may be rightly given to those enquiring how to be healthy. "Understand, and then do what you think best." It may be possible for men in certain states of society to fulfil unconsciously most of the laws of health, which are, after all, exceedingly simple. Circumstances enforce upon them the creating of fresh air, the taking of sufficient exercise and natural rest ; these circumstances ensure quietude of mind. But this unconscious fulfilment of the laws of health is seldom possible, specially at the present day when an artificial mode of living contra, indicates and even interferes with that fulfilment We must either know or suffer. It is therefore our hope that the above statement of a few well-ascertained facts may have the result of awakening the interest of our readers, and may lead to a desire to be better acquainted with matters relating to their personal health. Such a knowledge must form a basis for much future work in the shape of enforcing sanitary laws, causing the adoption of measures to ensure public health, reduction of preventible disease, and the general progress of the community at large.

SAHABZADA S KHAN,
M B Ch. B.

——:o:——

## My Friends.

### SCENE I

(Time, midnight Hasan pacing to and fro in his room.)

Deuce take these friends! Friends! No! they aren't my friends. They are my plague They worry me from morning till midnight Foolish friends! I would rather have one wise enemy then a troop of these foolish friends I don't know why they take so much liberty with me One comes and makes away with any new books he may find on my table, without my permission, as if they were his own property ; another comes and appropriates to his own use any stamps or letter-paper he may find in my dispatch box But of all my enemy-friends Hardar Ali troubles one most. He makes away with my pencils, pens paper, pictures and coins; in short anything he lays his hands on. He comes to my room every day without fail and as soon as he enters the room, he points in a very coaxing way to his belly and says :

*mind in a sound body* was the highest good of the ancient world, so we moderns must acknowledge that perfect bodily health can only be attained, when the mind is calm, rational and enlightened.

After Exercise *rest* and *sleep* are also essential to physical well being. Even our *heart*, which is constantly doing work, takes a little rest between beats, and this momentary rest gives it strength. Incessant work is harmful and exhausting.

Rest may be *partial* or *general*.

*PARTIAL REST* is obtained by mere change of occupation. In this way the several organs of the body get rest by turns. Thus, after some severe mental work, if we engage in some light physical exercise, as for instance, walking, our brain will get rest and we shall feel refreshed both mentally and physically. Again if we have been engaged in abstruse mathematics or the study of philosophy or medical lore, recreation may be obtained by reading light literature, or writing an article which does not involve much thinking. Some minds are so constituted as to find recreation in dealing with difficult problems. Helps wrote his essays in the intervals of his business. Mr Balfour writes philosophy when he gets a little rest from public duties (though he seeks recreation also in golf and motoring). Lord Roberts finds recreation in hunting and cycling. Ellen Terry, in reading, driving and yachting. Marie Corellie in reading and in music.

Complete rest or sleep is also an essential of health. Sleep refreshes the mind and removes bodily fatigue. This is because assimilation is active, and as our system is doing little work oxidation is in abeyance; hence the quantity of carbonic acid gas evolved is not great, and this is easily eliminated. We have said that work produces heat, hence, during sleep, the temperature of the body tends to fall. This is the reason why people feel chilly on awakening. As there is little work done during sleep, it is apparent that digestion is apt to be interfered with if a man seeks repose soon after a heavy meal. Two hours therefore should always elapse between the last meal and sleep.

The amount of sleep required depends largely upon the age and personal tendencies of the individual. As a rule the amount of sleep necessary for a child 4 years old is 11 hours; 9 years old 10½ hours, for an adult 6 to 8 hours.

lifted straight up above his head, the result being that it wastes and remains fixed in that attitude forever afterwards.

Physical exercise in moderation must affect our health beneficially in the following ways :

(1) Heat is easily produced and this keeps the body temperature constant

(2) Muscles are used in the process, hence they become well developed

(3) Capacity of the lungs is increased so that they can take more air, *i.e.*, oxygen, and send out more carbonic acid gas which increases in quantity during the production of heat.

(4) Action of skin is increased, *i.e.*, more excretary products are expelled and the body temperature is better regulated.

(5) Circulation is improved That is, more nourishment is sent to the tissues and the body temperature is regulated.

(6) Heart's action is increased in frequency and force and the heart muscle is toned.

(7) Digestion is aided because more blood is sent to the digestive system and because the involuntary muscles are strengthened, and so act more powerfully

(8) More blood is sent to the brain which is consequently able to perform its function better

Just as physical exercise is essential for the development and tone of the body, so mental exercise is necessary for the development and vigour of the mind The development of the mental faculties is the standard of human civilization. Right thinking has solved many difficult problems of life and nature, has brought to light many wonders of the Universe, and has enabled us to utilise matter for an economic purpose.

The solution of social and moral problems must advance with the development of the mental faculties of man. We begin to understand our duty to man, as we think more rightly and see more clearly.

These are a few rudimentary examples of the result of our mental development But as there are still vast fields of unknown facts and undiscovered truths waiting for the mind of man to act upon, the further cultivation of mind must be one of our primary aims in life. And as the *sound*

climate as that of the Temperate Zone. Greater provision can be made for keeping the body warm than cold.

As our body temperature remains constant, climatic extremes are unfavourable to health. Great cold requires work to keep up body heat. This may be supplemented by food, clothing and by stoves, &c. Great heat excites the sweat glands, the activity of which help to keep the body cool. If long continued, this work with the heat generated, wastes the tissues and produces languor and emaciation.

Personal cleanliness is of great advantage to health. Bathing may raise or reduce the temperature of the body as desired. It also washes away all the waste material secreted by the pores of the skin, as well as the bacteria that live in the oily matter of the skin.

## IV. EXERCISE, REST AND SLEEP.

A well known Professor in the University of Edinburgh is in the habit of drawing on the black board an equilateral triangle on the first day of the session. "This" he says, "must represent your triangle of daily life. Eight hours should be given up to work, eight hours to recreation, and eight hours to sleep." We now proceed to consider this statement.

Exercise, both physical and mental, is essential to our health and so is rest and sleep after any kind of exercise. We have already seen that heat is essential to the life of the body; to produce it, we are required to do some work, it may be involuntary or voluntary. Involuntary work is performed within the body by most of our organs, specially those of circulation, respiration, digestion and excretion. Voluntary work consists in motion or locomotion or cogitation. If not excessive, all this work is healthy, it produces heat and it strengthens the organs that we use. Thus in those who take physical exercise the muscles of the body which are most used in the exercise become best developed, *e.g.*, in pedestrians, the muscles of the leg and thigh, in gymnasts, those of the arm and shoulders; in swimmers, the muscles of the trunk. On the other hand, if we allow, either willingly or unwillingly, a part of our body to remain idle, it gradually wastes; its supply of nutrition is cut off, and its function is in process of time entirely lost. A good example of an involuntary disuse is that of a child born deaf, who is therefore unavoidably dumb because he has not heard others speak. As an example of voluntary disuse may be mentioned the cause of a penitent Fakir who constantly and willingly keeps his arm

life; hence production of heat is inevitable. It is therefore necessary that we should be protected from the excessive external heat. Nature makes provision for this too. Our skin is covered with minute pores which can be seen by means of a strong magnifying glass. These are the openings of *sweat glands* and *sebacious glands*. The sweat glands excrete water and part of the refuse matter of the body. The sebacious glands secrete only matter of the body. Whenever the internal or external heat is above normal the sweat glands become proportionately active and secrete water which we commonly term perspiration. Evaporation at once follows and as evaporation always entails a lowering of the temperature, our body is cooled down to its normal heat. Sometimes the body temperature falls lower than this point, and it is then that those careless about their dress and surroundings are apt to catch a chill. Hence it is advisable to wear flannel next the skin at all temperatures. This protects one from cold and during hot weather, when one perspires freely, it does not allow the body surface to grow cool too quickly. It will now be apparent to those of our readers who have followed the above statements, how important it is to keep one's body clean in order that the pores with which the skin is furnished may remain open. The pores are apt to be blocked by the refuse matter that they excrete, and form the secretion of the sebacious glands which are close to them. Personal cleanliness is therefore necessary as a consideration of health if for no other reason.

Apart from this natural gift of perspiration, we have other artificial means by which to keep ourselves cool. With most of these our countrymen are familiar, and we therefore omit mention of them here.

We must also remember that the air we breathe out is hotter than the air we take in. That is to say, we can dispose of some heat through our lungs. Fat as food will be a disadvantage in hot weather, since its chief use is the production of heat; hence fat people always feel the unpleasant consequences of heat more than other people.

Excessive activity on the part of sweat glands means labour, and if the internal temperature of the body is high, as in fevers, all heat-producing matter is gradually consumed; the heat thus produced kills the cells of the body, hence they fail to perform their work. Exhaustion and emaciation is the result, and death follows.

*SUMMARY.*—The best climate for health is one which is a little below the surface temperature of the body such

in order to produce the 62° of heat required for the normal temperature of the human body. Nature makes provision for this, and furnishes Arctic animals with woolly hides which retain the body heat. Man cast off the hairy skin which nature allotted to him as soon as he learned to make an artifical skin (*i.e.* clothing) for himself. This had the double advantage of protecting him from cold when that was necessary, and of being taken off whenever required, *e.g.*, when the cold abated or when he went to warmer regions.

*Clothes* then save our system a great deal of work by retaining our body heat for a long time.

*Fire* is another means by which we protect ourselves from cold. We have either fireplaces or stoves which radiate heat and so warm the rooms in which we live.

Improved measures are now employed to heat our rooms by passing pipes of either hot air or steam into them.

Sometimes air is first heated and then sent into rooms to heat and ventilate them. By this method draughts are avoided and the temperature of the room can be regulated at will.

We have said that food produces heat. The greatest heat-producing food is fat. Hence in animals unprotected by woolly hides or feathers, fat is stored in large quantities. During cold weather therefore, such animals have plenty of fat or natural fuel to fall back upon for the necessary support of body heat. But storage of much fat is not easy to digest: hence storage of fat involves considerable strain to the digestion. Secondly, the parts where fat is stored become clogged and cannot perform their functions well, hence fat people are weak and more liable to disease than those whose muscles are fairly well developed. Therefore, only a certain amount of fat is useful to produce body heat.

*EXERCISE* is another method by which body heat may be produced. Thus, in cold weather a brisk walk usually makes one feel quite comfortable. In London, the cab and bus drivers, who are always sitting, often warm themselves during winter by violently swinging their arms backwards and forwards. We will take the subject of exercise as a means of health later on.

2. Again, let us suppose that the external temperature rises to 119° F. (a not unusual temperature during the hot season in India). In this case our own heat-producting will be at a disadvantage. But nutrition *must be* supplied for our body structure, and work *is* necessary for the continuation of

(8) Certain trade processes such as those of dyers, tanners, butchers, which are injurious to health, are allowed to go on without due precautions being taken to prevent their being productive of injury to the public welfare.

(9) Vegetables and fruits are thrown about and allowed to rot in the streets of the towns

(10) Stray animals, such as pariah dogs and cats, which are often carriers of disease, are allowed to roam or loiter at random.

(11) During times of festival, such as big *Nahans* due attention is not paid to the proper food and drinking water of the people attending these festivals

III. Suitable provision for Climatic changes

Climate depends upon—

(1) The distance from the equator

(2) The height above the sea

(3) The distance from the sea.

(4) The prevailing winds.

Climatic extremes are unfavourable to health. Why? Because, we being hot-blooded, our body temperature remains always the same irrespective of the temperature of our surroundings. The temperature of our body surface is normally 98·5° F This temperature is produced by the oxidation that takes place within our bodies, and is kept uniform all over the body by the circulation of blood. In short there is a fire within alway burning, the fuel being supplied by the food that we eat, and the air that we breathe. In order that food may be available for the production of heat it must be digested first and then carried to those parts (muscles, nervous system, &c.) where oxidation takes place Work is performed in the process of digestion and this in itself produces heat. Thus, under favourable climatic conditions, digestion will produce heat almost enough for the body requirement. The surplus products of digestion will therefore go to build up the structure of the body or to be stored as fat and sugar. If the climate is unfavourable, then our systems will have to do heavier work, there will be no surplus, and if the work is uninterrupted, exhaustion, emaciation, and possibly death, will ensue Let us illustrate this fact.

1. Suppose that temperature of our surroundings falls to 36°.F (*i e.,* a little above freezing point). It is apparent in this case that our system will have to do a great deal of work

*CONSTRUCTION.*—To avoid damp the foundation of a dwelling should be laid on concrete A thin outer wall should be built reaching the ground level leaving a space between it and the main wall. The outer wall should be plastered. It is important to put ventilating bricks at frequent intervals, just below the level of every floor, so that the joists and other woodwork of both floor and ceiling shall be preserved from damp rot. Fire grates and chimneys are the best ventilators.

It is well to remember that sunlight* (and therefore plenty of window space) is essential to health, and that the number of persons inhabiting or occupying a room should be in proportion to the amount of air space it contains. All paint should be varnished, the room is then easily cleaned, harmful ingredients of the paint are rendered harmless, and gases cannot escape in and out through brick walls.

Before we leave this important subject, let us mention the chief causes which either singly, or when combined, help to lower the health of our towns and to contribute to the prevalance of epidemics.

(1) That no thought is bestowed on the building of houses either as regards their situation or construction The houses are built in any way on any kind of soil, and sometimes in the proximity of burial grounds. They are set close together like a bee-hive ; they are poorly lighted and badly ventilated.

(2) The streets of our towns are narrow, dirty and are not aired.

(3) The water supply of towns in India is not in general very good.

(4) The drainage system is wanting, so that water stagnates and gives off unhealthy effluvia.

(5) People wash themselves, their clothes and their utensils close to their water supply which becomes in this way polluted

(6) Animals, such as horses and cows, are stalled close to the human dwellings and their excreta are not speedily and well disposed of.

(7) Dirty and stagnant water tanks are often found in the midst of populated districts. These become the breeding grounds of disease germs.

---

* Sunlight is essential to health is proved by the fact that many diseases which are peculiar to cold regions where the sun's rays are either totally absent or ineffectual, can be cured by advising the patients to go to warmer climates

and where possible to become a life member. In order to be able to take part in the games, the undergraduate must necessarily be a member of the Amalgamated Club

Of course there can be no limit to one's expenses, but while some men waste money over a certain thing, others can do the same thing very cheaply. The Indian is particularly warned about this specially when he gets rooms 'in College', and has to *furnish* them

Taking all these considerations into account, it is submitted that no Indian undergraduate at Cambridge ought to be allowed less than £300 a year

The tutor again is the most useful, and at the same time a person with a great deal of authority in the College. Most of the other needed information can be obtained from him, and he is always willing to help in any matters of difficulty. But he must never be worried with too many questions.

The rest the Indian must learn from his own experience, but he is particularly requested to read "The Fresher's Don't".

S. ISHRAT HUSAIN.

CHRIST'S COLLEGE,
CAMBRIDGE.

—— o ——

## Essentials to Health.

—— :o: ——

*A few hints on the situations and construction of houses.*—It is not always possible to get a situation such as we want. Still to those who are able to select a locality for their houses, the following hints may be serviceable :—

*SITUATION.*—The slope of a hill is the best situation, and trees should be close by, but not touching the walls of the house The principal rooms should face south and west, or south-east. When placed on a level ground the house should not be close to a water course of any kind Privies and cesspools should be as far away from the house as possible.

Ascertain that the water supply is good and abundant. Avoid houses that are built close together like a bee-hive. The width of the street should be double the height of the houses in it.

mination, but also the 'Littlego' or the 'The Previous' as it is officially called. Moreover such Indians have the further advantage that they can get their degrees after two instead of three years' residence.

The business of the tutor is also to help one on in his study, to recommend where necessary a 'private tutor', and to give permission to attend lectures. The choice of the subjects and the course of study is entirely left to the undergraduates Now it seems a pity that most Indians should take up law It would not so much matter if they merely *studied* law, and meant to be something besides lawyers in after life. No? They read law to be *practising* barristers. They still fail to see that there are other, and far more profitable avenues open to them But they have no spirit. There is no enterprise in them How long will it take to make them understand that there is no disgrace in being a 'business man?' Why only law? Everyone to be a lawyer? Besides Cambridge produces the very best doctors, engineers and electricians.

The tutor may again be asked to give an idea of the annual expenses at the University. But in the case of Indians he is likely to make a mistake. English parents allow their sons from £150 to £200 a year. But it must be understood that this is only for the academical year, and that for six months, *i.e.*, 'out of term,' the English undergraduate lives with his parents. According to this the Indian should be allowed about £400 annually But there are some expenses such as tutors and university fees which are enforced only during term.

Indian parents are always anxious to know from some authoritative source, the estimate of the expenses, for they do not wish to place themselves in the hands of their sons. The expenses entirely depend upon how one wishes to live, how numerous are one's friends, and whether one wishes to be very popular and free with them

Then again a great deal depends upon the social position of one's friends. There are 'sets' in the University and in the colleges, and within a few weeks after joining the undergraduate must choose a set, according to his desire. If he has decent friends, he must live according to their standard. He must have good rooms, and good furniture, but above all he must be a good host.

Besides, it is always useful to join some club or society,

One of our chief objects in coming over to England is to acquire a thorough knowledge of the English language, its pronunciation and accent. This, it is submitted, can only be, or best attained, by going to Oxford or Cambridge. It is at the University that the Indian has or can have most free social intercourse with Englishmen Besides, it is at the University that life-long friendships are made, it is from the University that most men get into the Indian Civil Service, it is to the Universities of Oxford and Cambridge, that the sons of the nobility of England are sent, and it is the University at the same time which provides both mental and physical training And here a word as to the part the Indians ought to take in out-door games They would find themselves very much more popular in their Colleges if they were chosen to play for the first or even the second Cricket, or Tennis, Football, or Hockey Teams. It is astonishing to hear from Indians sometimes that they *merely* come to England to study, to spend as little as possible of their parents' money, and to stay in England not a day longer than is absolutely necessary. The idea undoubtedly is good, but it is often carried to extremes. The result is that Indians sometimes refuse to take part in any games, they become unsociable, and seeing that they hardly take any exercise, it is doubtful if they keep healthy. What a mistake it is to take such a view ? The time can be and must be divided up between study and play

And now to proceed with our task of giving a few hints to those who are anxious to go to Cambridge.

No preference can be given to one College over the others, but it is suggested that it is always best *to join some College*, and whenever possible to live *in College*.

The tutors are always ready to furnish the rules of their Colleges, and a visit to them after an appointment can procure all the information as to fees—which are not very much—and as to studies Sometimes it is necessary to pass the 'Entrance Examination' before being admitted to a College, but the tutor may dispense with it. Everyone however has to pass the two or three parts of the 'Littlego' according as it is intended to take the ordinary or the honour's degree. This examination is rather difficult particularly for Indians, since one of the compulsory subjects is Latin, and those of us who contemplate going to Cambridge would do well to devote some of their time in India to the study of Latin. But Indians who have passed the B.A examination in the second division, or the Intermediate examination in the first division of any Indian University are excused not only the Entrance Exa-

Certain well-wishers of the "Monthly" suggest that we should publish this Magazine twice a month. The Editor, on whom the sole responsibility rests, and who is occasionally occupied with other than Editorial work, is sorry to have to decline the suggestion. What we require is more help in the way of literary contributions, which must, however, reach a satisfactory standard of merit. Contributions, of a kind, are sent in occasionally but the majority of them are not up to the standard.

——o.——

## Cambridge University.

It will take a generation to convince the Indians that a stay of three years or more in England is very advantageous. True that in some cases, the Indian youth suddenly taken away from under the supervision of his parents, abuses his freedom, becomes extravagant, takes to excessive drinking and goes, though rarely, even to the extent of marrying an English wife It is pleasing to see however that the conduct of a few is not as an example, and some bold, and far-seeing parents, in spite of various difficulties in the shape of the pessimistic views of their friends, send their sons for education to England.

Once this is decided upon several questions present themselves. Where is the Indian to live all the time or most of the time ? What must he do to make it easier for him to accomplish his object ? What are the difficulties of an Indian on his arrival in England ? The object of the present article is to give *one* of the various answers to the first question—where is the Indian to live all the time or most of the time. It is meant in a short space to give some information about Cambridge.

It would hardly be out of place to suggest here that parents should *try* to send their sons to an English University. Very often their excuse is that they cannot afford the expenses at Oxford or Cambridge Why should such Indians be sent to England at all ? An Indian University education is good enough for them. It is surely not the climate of England, but the people the Indian mixes with, the surroundings in which he is placed that do him good What is the use of living in the 'slums' of London for three years, and returning 'home' a qualified barrister. Qualified indeed to *practise*, but not able even to put together a few sentences of correct English.

Mr T. W. Arnold and Mrs. Arnold visited Aligarh at the end of last month to say good-bye to the College. Every one regretted that Mr. and Mrs. Morison were not here for the interesting occasion; but no effort was spared in honouring the visitors, whose names will ever be held in grateful remembrance in Aligarh.

——:o:——

Mr. and Mrs. Arnold arrived at 6 o'clock on the 25th and were received at the Railway Station by the Honorary Secretary and a large number of students At 4 p. m an address was read in the Strachey Hall by Mr. Aftab Ahmad Khan on behalf of the "Duty," to which Mr Arnold made a suitable reply. Later on, there was a Garden Party on the Cricket field, at which the Collector of Aligarh and Mrs Ingram, as well as the College Staff were present; and at 8-15 Nawab Mohsin o' Mulk entertained some friends at his own house to meet Mr. and Mrs. Arnold at dinner.

——:o:——

On the evening of the 26th dinner was served in the Strachey Hall to a considerable number of visitors, the Staff and College and School Students; and a most enjoyable evening was spent.

——:o:——

Mr. and Mrs Arnold left Aligarh on the afternoon of the 27th taking with them the hearty goodwill of all who are connected with the College.

——:o:——

The MacDonnell Boarding House is now in use. M. Aziz Baksh and M Saadat Ali Khan are the Sub-Proctors residing there; and the house is to be reserved for school boys only.

——:o:——

Owing to the B. A Examination being postponed till July 18th there will probably be even less accommodation available for new comers in the College than we anticipated.

——:o:——

Subscriptions to the Rupee Fund will, in future, be acknowledged in the Aligarh Institute Gazette and not in the Monthly.

# The Aligarh Monthly.

March 1904.

## College Notes.

—.o:—

The Inter-College Tournament which was held at Agra at the end of January resulted in a series of victories for Aligarh, and we heartily congratulate all the teams on their success.

—.o:—

A cricket match was played on February 23rd and 24th during the Fair Week against a team brought by Mr Rees. The game was interesting throughout and ended just on the point of time, in a victory for the visitors by 6 wickets. The chief scorers were C R. Alexander 100, J M.C Gannon 59, Mahomed Akram 49, Ishtaq Ahmad 49, not out, Said Muhammad Khan 30, and J. C Rees 24.

—:o:—

Chiefly owing to Examinations there is not much to record in the matter of other games, but we hear that in all probability a Hockey team is coming over from Agra in the course of a week or so

—.o.—

During the Easter holidays the Old Boys are to have their annual gathering at the College The dinner is fixed for April 2nd.

# Mr. MURRAY'S UNIVERSITY ANNUALS.

## LITERATURE.

SHAKESPERE AND HIS PREDECESSORS IN THE ENGLISH DRAMA. By F. S. Boas, Professor of English Literature, Queen's College, Belfast. Crown 8vo, 6s.

THE JACOBEAN POETS. By Edmund Gosse. Crown 8vo, 3s. 6d.

OUTLINES OF ENGLISH LITERATURE. By William Renton. With illustrative Diagrams. Crown 8vo. 3s. 6d.

THE ENGLISH NOVEL, from its Origin to Sir W. Scott. By Walter Raleigh, Professor of English Literature, University College, Liverpool. Crown 8vo. 3s. 6d.

FRENCH LITERATURE. By H. G. Keene, Wadham College, Oxford; Fellow of the University of Calcutta. Crown 8vo, 3s.

LATIN LITERATURE. By J. W. Mackail, Balliol College, Oxford. Crown 8vo, 3s. 6d.

## HISTORY and ECONOMICS.

HISTORY OF RELIGION. A Sketch of Primitive Beliefs and Practices, and of the Origin and Character of the Great Systems. By Allan Menzies, D.D., Professor of Biblical Criticism in the University of St Andrews. Crown 8vo 5s.

ENGLISH COLONIZATION AND EMPIRE. By A. Caldecott, M.A. (Camb. and Lond.), sometime Fellow and Dean of St John's College Cambridge; University Extension Lecturer under the Cambridge Syndicate; Professor of Logic and Philosophy at King's College, London. With Maps and Plans. Crown 8vo, 3s. 6d. With a New Chapter, bringing the work entirely up to date, by F. A. Kirkpatrick, M.A., University Extension Lecturer.

THE RISE OF THE BRITISH DOMINION IN INDIA, from the early days of the East Indian Company to the Conquest of the Panjab. By Sir Alfred Lyall, K.C.B. With Coloured Maps. Crown 8vo, 4s. 6d.

THE FRENCH REVOLUTION. By C. E. Mallet, Balliol College, Oxford. Crown 8vo, 3s. 6d.

GREECE IN THE AGE OF PERICLES. By A. J. Grant, King's College Cambridge, and Staff Lecturer in History to the University of Cambridge. With Illustrations. Crown 8vo 3s. 6d.

THE USE AND ABUSE OF MONEY. By W. Cunningham, D.D., Fellow of Trinity College, Cambridge; Professor of Economic Science, King's College, London. Crown 8vo, 3s.

# علی گڈھ منتھلی

| نمبر ۴ | اپریل سنہ ۱۹۰۴ع | جلد ۲ |
| --- | --- | --- |


## مجالس محرم

دوسروں کی خوشی سے خوش اور ان کی تکلیف سے ملول ہونا طبیعت انسانی کا خاصہ ہی اور اگر کہیں اسکے خلاف پایا جاوے تو سمجھنا چاہیئے کہ اصلی فطرت کسی دوسری قوت کے ذریعہ سے دبا دی گئی ہی اور ایسا انسان ایک اعلیٰ درجہ کی ملکوتی وصف سے محروم ہو گیا ہی۔ دوسروں کی شرکت سے ہمارے غم میں کمی اور ہمارے دل کو تسکین ہوتی ہی اور خوشی کے موقع پر یہ شرکت ہماری خوشی کو بڑہاتی ہی اسیوجہ سے تعزیت اور مبارکباد کا دستور دنیا میں قائم ہی اگرچہ محض اظہار ہمدردی بھی مصیبت زدہ شخص کو فائدہ دیتی ہی اور بہت سے موقعوں پر ہم بجز اظہار ہمدردی اور کچھ کر نہیں سکتے مگر بہترین ہمدردی یہ ہی کہ ہم اپنی شرکت کا عملی ثبوت دیں اور مصیبت زدہ شخص کی تکلیف رفع کرنے کی کوشش کریں۔ دنیا میں ایسے باہمت اشخاص بھی ہوتے ہیں کہ دوسروں کی رفع تکلیف کی کوشش میں اپنی جان تک کی پرواہ نہیں کرتے اور جلتی آگ میں کود کر اور گہرے پانی میں غوطہ لگا کر دوسروں کو بچا لاتے ہیں بعض ان میں سے اپنا راحت و عیش و آرام مال و دولت اپنے بنی نوع کی نفع رسانی میں صرف کرتے ہیں اور محسن قوم کا معزز لقب اور بقائے دوام کا دیرپا خلعت حاصل کرتے ہیں۔ مگر یہ اعلیٰ درجہ ہمدردی انسانی کا ہر شخص کو حاصل نہیں ہوتا عموماً ہماری ہمدردی قسم دوم کی ہوتی ہی اور اس کی کمی و بیشی تعلقات پر منحصر ہو جسقدر

جس کو جس سے تعلق ہی اُسیقدر اُسکے ساتھ ہمدردی ہی بعض اوقات ہمارا اظہار ہمدردی بحالت موجودہ اُس شخص کو جسکے ساتھ ہمدردی کی جاتی ہی کوئی نفع نہیں دیتا بلکہ ہمارا اظہار محض ایک تقاضاے فطرت یا اُن احسانات کا شکریہ ہوتا ہی جو بیشتر ہم حاصل کر چکے ہیں۔ مجالس محرم بھی اسی آخر قسم کی ہمدردی میں داخل ہیں۔

واقعہ کربلا ایک ایسا سانحہ جانکاہ ہی کہ فطرتاً انسان اُسکو سُنکر متاسف ہوتا ہی اور جب ہم اسبات کا خیال کرتے ہیں کہ رسول برحق کے ہم پر کسقدر احسانات ہیں اور اُسکے پیارے نواسہ کو خود اُسی کی قوم کے بعض اشقیا کے ہات سے کیا کیا اذیتیں پہونچیں تو ہماری ہمدردی بہت زیادہ جوش میں آتی ہی اور یالیتنے کنت معکم کی صدا بے اختیار زبان سے نکلتی ہی جب ہم دوسری قوموں کو دیکھتے ہیں کہ وہ اپنے محسنوں کے ساتھ کیسا سلوک کرتے ہیں اور ہمنے کیا کیا تو ہمکو اپنے سے شرم آتی ہی۔ گو ہندوؤں نے اظہار احسانمندی میں کسیقدر افراط کی اور برہمنوں کی بزرگداشت کو جنکے بزرگوں نے ابتداے زمانہ میں اُن کی رہنمائی کی تھی پرستش کے درجہ تک پہنچا دیا۔ گائے کو جسکے وجود سے وہ متمتع ہوتے تھے گؤ ماتا کا معزز لقب دیکر اُسکے جسم کو متبرک قرار دیدیا اور اس حسن سلوک کو جانداروں ہی تک محدود نہیں کیا بلکہ دریا اور درخت جنکے پانی اور سایہ سے اُنکو فائدہ پہنچتا تھا ایسی ہی عزت کے مستحق قرار پائے غرضکہ جب ہم ایک طرف حسن سلوک میں اسقدر غلو دیکھتے ہیں اور دوسری طرف پیغمبر کی وفات کے ۶۰ سال بعد ہی اس بیرحمی کا خیال کرتے ہیں تو ہمارے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں اور کہنا پڑتا ہی کہ اگر دوسروں نے افراط کی تو ہم نے تفریط اور اگر پیغمبر آخرالزماں عرب کے سوا کسی دوسری احسانمند قوم میں پیدا ہوتے تو اُنکی اولاد کیساتھ اُس سے بہتر سلوک ہوتا۔

گو یہ سچ ہی کہ جو کچھ ہونا تھا وہ ہو چکا اور اب ہمارا اظہار ہمدردی اُن بزرگوں کو کوئی نفع نہیں پہنچا سکتا اور ہماری مجالس عزا سے سوائے اسکے کہ ایک تاریخی واقعہ کی یاد قائم رہے اور اُس کی کیفیت سے قوت ہمدردی حرکت میں آئے اور ہمارے مغموم اور محزون ہونے سے ایک گونہ اظہار تشکر ہو اور ہل جزاء الاحسان الا الاحسان کا سبق اور احسان فراموشی سے نفرت پیدا ہو اور کوئی فائدہ مترتب نہیں۔ اگرچہ یہ فوائد خود قابل قدر ہیں اور اسلیئے مجالس عزا کو بالکل بے سود نہیں کہا جا سکتا مگر چونکہ ہر زمانہ کی ضرورتیں مختلف ہوتی ہیں ہمکو مناسب ہی کہ اپنی مجالس کو موجودہ ضرورتوں کے موافق بنائیں تاکہ ہم خرما و ہم ثواب

کے مصداق ہوں۔

واقعہ کربلا کے بعد ایک عرصہ تک ان مجالس عزا سے علاوہ دیگر فوائد کے ایک بڑا فائدہ یہ تھا کہ لوگ اس دردناک واقعہ کے حالات سُنکر جوش میں آتے تھے اور اہلبیت اطہار کی ہمدردی اور اعانت کیواسطے مستعد ہوجاتے تھے مگر امتداد زمانہ سے اب اُس ہمدردی کی ضرورت نہ رہی اسلئے من بکےٰ او ابکیٰ فوجبت لہ الجنۃ ہی صرف ہمارا مقصود نہیں ہونا چاہیئے بلکہ ایسے مضامین بیان ہونے چاہیئے کہ اُنسے ائمہ علیہم السلام کی عظمت کیساتھ ہمکو اُن کی تقلید کا خیال پیدا ہو اور ہم اُن کی پاکیزہ زندگی سے عمدہ سبق حاصل کریں لہذا نفس مضامین اور طرز بیان دونوں میں ترمیم کی ضرورت ہی ہمکو اُن مجالس میں زیادہ تر ایسے مضامین بیان کرنے چاہیئے کہ جنسے اس زمانہ کے لوگوں کی طبیعتوں پر عمدہ اثر ہو اور اخلاق حسنہ سیکھیں مثلاً امام علیہ السلام کا یزید کی بیعت سے اس بنا پر انکار کرنا کہ وہ فاسق وفاجر ہی اور امام کا اُسکی بیعت کرلینا اُسکے افعال قبیحہ کو رواج کی سند دینا ہی اور قول حق کے مقابلہ میں جان ومال کسی چیز کی پروانہ کرنا اس حق کی عمدہ مثال ہو بھوک اور پیاس کی شدت اعزا و اقربا کے صدمے پس ماندوں کی مصیبتوں کا خیال اور اسی طرح کے مختلف آلام میں بدحواس نہونا ثابت قدمی کی اعلیٰ مثال ہی۔ اُنکے رفقا کا باوجود امام کی اجازت اور اس علم کے کہ کامیابی کی کوئی اُمید نہیں ہی اور موت سامنے کھڑی ہی امام کی رفاقت کو نہ چھوڑنا اور اپنی جانوں کو اُنپر نثار کردینا وفاداری کا اعلیٰ نمونہ ہی۔ حرؒ ریاحی کا اپنے لشکر کو چھوڑکر امام کی رفاقت میں جان دینا دفو سمجھدی کی بہترین مثال ہی۔ جو شجاعت کہ امام اور اُنکے رفقا سے ظہور میں آئی اور جس بہادری سے کہ اُن بھوکے پیاسوں نے جام شہادت پیا مردانگی کا عمدہ سبق ہی۔ اسی طرح پر ائمہ علیہم السلام اور اُن کی ذریت اطہار کی پاکیزہ زندگی میں سے ہزاروں مثالیں صبر واستقلال۔ انسانی ہمدردی۔ ایثار علی النفس۔ عفو وترحم کی مل سکتی ہیں ہمکو چاہیئے کہ اُنکے اوصاف کی سرخیاں قائم کرکے مجالس لکھیں اور آخر میں کسیقدر مبکی مضامین کے بیان پر مجلس کا خاتمہ کریں۔ مصائب کے بیان میں سخت مضامین کو صراحتاً نہیں بیان کرنا چاہیئے بلکہ ایسے مضامین کی طرف صرف اشارہ کرنا کافی ہی۔ اہل بیت اطہار کی بیحرمتی یا شہدا علیہم السلام کے اجساد طاہر کی بیعزتی کے مضامین سے حتی المقدور اجتناب کرنا چاہیئے ان بزرگان کی دین کی بزرگی اس کی مانع ہی کہ ہم عام مجمعوں میں

ان مضامین کو بیان کریں۔ ایسے مضامین کے سُننے سے سامعین کے دلوں پر رقت ضرور طاری ہوتی ہے مگر اُسکے ساتھ ہی قساوت قلبی بھی ضرور پیدا ہوتی ہے۔ سخت مضامین کے چند بار سننے کے بعد طبیعت ایسی سخت ہو جاتی ہے کہ معمولی مضامین کا اُسپر کچھ اثر نہیں ہوتا۔ غرضکہ مصائب کی نسبت فضائل پر ہمکو زیادہ زور دینا چاہیئے اور فضائل کے بیان میں ہمکو اُن مافوق العادت خوبیوں کے بیان کرنے کی کوئی ضرورت نہیں جو عام انسانی دسترس سے باہر ہیں اور جنکی اتباع کی انسان کوشش ہی نہیں کر سکتا۔ وہ خوبیاں ائمہ کی ذات کے ساتھ مخصوص تھیں اُنکو آج کل کی طبیعتیں اگر محدثین کا مبالغہ نہ بھی خیال کریں تو بھی اُنکے بیان سے لوگوں کی ذات کو کوئی فائدہ حاصل نہیں ہو سکتا ہم چاہتے ہیں کہ ایسے مضامین بیان ہوں کہ اُنسے ائمہ کی عظمت کیساتھ لوگ اُنکے اتباع کی کوشش کریں۔ خلاف قیاس باتوں کی آمیزش سے طبیعت اُچاٹ ہو جاتی ہے اور اصلی باتوں کے سننے کی طرف بھی متوجہ نہیں رہتی۔ نظم کی چاشنی تو ان دوراز کار مبالغوں کو کچھ نباہ لیجاتی ہے مگر نثر میں تو وہ بہت ہی ناموزوں اور بُرے معلوم ہوتے ہیں۔

طرز بیان میں ہمکو اس بات کا خیال رکھنا چاہیئے کہ الفاظ ادائے مضمون کا آلہ ہیں مضمون کی ضرورت سے الفاظ استعمال ہونے چاہیئے۔ نہ کہ مضمون الفاظ کا تابع ہو اور الفاظ کی ضرورت سے مضمون پیدا کیا جائے۔ یہ بھی خیال رہنا چاہیئے کہ مجلس عزا ہی مجلس مشاعرہ نہیں ہے ضرورت سے زیادہ لفظی رعایتیں اور ضلع بندی خامی کی دلیل ہے اُنکی تعریف میں مجلس عزا کو مجلس مشاعرہ نہیں بنا دینا چاہیئے۔ سماں باندھنے کی غرض سے عراق کو ہندوستان یا لکھنؤ کا نمونہ نہ بنائیں بلکہ محل اور موقع کا ضرور لحاظ رکھیں ورنہ طبیعت مکدر ہو جاتی ہے اور اصل مقصد فوت ہو جاتا ہے۔ پڑھنے میں اپنے طرز ادا سے صورت کھینچنی چاہیئے مگر نہ اسقدر کہ نقالی کے درجہ کو پہنچ جائے۔ غرضکہ اس قسم کی بہت سی چھوٹی چھوٹی باتیں ہیں کہ جنمیں اصلاح کی ضرورت ہے اور ان اصلاحات سے یہ مجلس ہمارے لیئے باعث خیر و برکت ہو سکتی ہیں۔

ولایت حسین

## احیاء علوم عربیہ

سارے چمن میں نالۂ بلبل کی دھوم ہے
جاتا ہوں آج لیکے دل نوحہ گر کو میں

مسٹر جیرالڈ گارڈنر براؤن نے جب سے مدرسۃ العلوم علی گڈھ میں عربی کا جدید دار العلوم قائم کرنے کی بحث چھیڑی ہی اسوقت سے اس مسئلہ پر اسکیم مجوزہ کے موافق اور مخالف بہت سے مضامین شائع ہو چکے ہیں خود نواب محسن الملک بہادر کے پرزور قلم نے جولانگاہ خیال میں جوہر کمال دکہا کر داد قابلیت دی ہی۔ لیکن اسوقت تک فریقین نے علوم عربیہ کی اہمیت اور افضلیت تسلیم کر کے اور اُسکو علوم و فنون کے بیش بہا خزانوں سے مالامال مان کر بحث کی ہی۔ خاصکر مسلمان علوم عربیہ کی مدح سرائی میں ہمیشہ سے نہایت زور کے ساتھ رطب اللسان رہے ہیں اور صدیوں سے یورپ کو اپنا شاگرد اور اپنے خوان علوم کا ذلہ ربا کہکر جہالت کی تاریکی اور افلاس کی مصیبت میں دل خوش کرتے ہیں۔

ہم اسوقت مذہبی جوش اور خوش عقیدتی سے قطع نظر کر کے دیکھنا چاہتے ہیں کہ عربی میں کونسے بیش بہا خزانے پوشیدہ ہیں جو جدید دار العلوم کے ذریعہ سے ہملوگوں کو دستیاب ہونگے۔ مجوزان دار العلوم نے ابتک نئی تعلیم کا کورس پبلک میں پیش نہیں کیا جس سے یہ معلوم ہوتا کہ مجوزہ دار العلوم کا نظام تعلیم کیا ہوگا۔ غالبا جو طریقہ اور جو کتابیں اسوقت ہندوستان کے عربی مدارس میں رائج ہیں وہ نئی اسکیم سے خارج ہونگی اسلیئے کہ اگر انھیں علوم کا ترقی دینا منظور رہو تو کسی جدید دار العلوم کی ضرورت معلوم نہیں ہوتی۔ بہرصورت ہمیں اس رائے سے بالکل اختلاف ہی کہ عربی میں ایسے علوم موجود ہیں جنکی تعلیم ہمارے دماغوں میں روشنی دلوں میں صفائی، خیالات میں پاکیزگی، ارادوں میں بلندی اور طبیعتوں میں استقلال پیدا کریگی۔ ہم جہاں تک سمجھتے ہیں عرب ہمیشہ ایک نہایت جاہل اور وحشی قوم رہے ہیں شائستگی اور تہذیب سے اُنکو بہت کم حصہ ملا ہی لہذا اُنکی زبان میں علوم و فنون کے کسی عمدہ ذخیرہ کا موجود ہونا بالکل بعید از قیاس ہی۔ اسمیں شک نہیں کہ اسلام نے وحشی بدوؤں میں ضرور ایک نئی روح پھونک کر اُنکو ایک متفق اور پرجوش قوم بنا دیا تھا جس کی وجہ سے عربوں میں ایک وسیع سلطنت کی بنیاد پڑ گئی لیکن عرب کے ریگستانی بنجر زمین میں علوم و فنون کا نخل کبھی پورے طور پر بار آور نہیں ہوا۔ حضرت رسول مقبول صلے اللہ علیہ وسلم کا عہد مبارک مذہب کی اشاعت اور اسلام کی تدوین کا زمانہ تھا اور جناب سرور کائنات خود اُمّی تھے اُسوقت دنیوی علوم کے تعلیم و تعلم کا کسی کو خیال بھی نہ تھا۔ خلیفۂ اول اور خلیفۂ دوم رضی اللہ عنہم

کا زمانہ ملک گیری اور اسلام کے پولیٹیکل عروج کا وقت تھا اس زمانہ میں بھی اشاعت علوم کی طرف بہت
کم توجہ کی گئی یہاں تک کہ خود قرآن پاک جسپر مذہب اسلام کا دار و مدار ہے مرتب نہوا تو اور دنیوی علوم کس
شمار میں ہیں۔ بعد وفات خلیفۂ دوم کے مسلمانوں میں اسلامی جوش کم ہونا شروع ہوگیا خود غرضی پیدا ہوگئی
اور عربوں میں خانہ جنگی اور خونریزی کی عادت عود کر آئی مسلمانوں میں آتش فساد روشن ہوگئی جسکا سلسلہ
حضرت سیدالشہدا امام حسین رضی اللہ عنہ کی افسوسناک اور پر الم شہادت بلکہ خلفاے بنی امیہ کے عہد خلافت
تک برابر قائم رہا۔ ایسی حالت میں جبکہ رسول کا نواسہ تشنہ لب کربلا میں شہید کیا جاے۔ صحابہ کی ڈاڑھیاں
نوچی جائیں اور مسجد نبوی میں گھوڑوں کی لید ڈالی جائے علوم وفنون کی کیا خاک اشاعت اور تدوین ہوسکتی
ہی۔ البتہ خلفاے اسپین اور خلفاے عباسیہ کے عہد حکومت میں مسلمانوں میں علم کا چرچہ شروع ہوا۔ اس کو
خواہ اہل عجم کا فیضان صحبت سمجھو یا زمانہ کا اقتضا۔ اسوقت بھی اگرچہ علما نے فلسفہ اور طبعیات کی تعلیم کو
کفر کے فتووں کی بوچھار سے بہت کچھ روکنا چاہا اور بعض مشاہیر علوم فلسفہ وطبعیات پر ان متعصب علما کے
اثر سے طرح طرح کے ظلم اور جبر بھی ہوے لیکن خلفائے عہد کے ذاتی شوق کا یہ نتیجہ ہوا کہ فلسفہ۔ طبعیات اور
ریاضیات وغیرہ کی بہت سی کتابیں یونانی زبان سے عربی میں ترجمہ ہوگئیں۔ یہی کتابیں آج تک اہل عرب
کا مایۂ ناز ہیں اور انھیں کی نسبت کہا جاتا ہی کہ اُن میں علوم وفنون کے بیش بہا خزائن مدفون ہیں لیکن اُس
زمانہ کے علوم وفنون اور معلومات گو ازمنہ وسطہ کے واسطے مایۂ ناز ہوں اور جو کچھ اسوقت عربی میں موجود
تھا اُس زمانہ کی اور زبانوں میں نہو یا اُس زمانہ کے مسلمان اپنے وقت میں اہل یورپ کے استاد رہے ہوں آج
اُنکے علوم اُنکی تحقیقاتیں اُنکی معلومات اُنکے آلات زمانہ حال کی ترقی اور تحقیق کے مقابلہ میں کوئی ہستی
نہیں رکھتی۔ اُس زمانہ میں مسلمانوں کی تحقیقات بالکل نظام بطلیموسی پر مبنی تھی اُنکے نزدیک زمین اپنے محور
پر قائم تھی پانی پر ڈگمگانے کی وجہ سے قادر مطلق نے اُسکے چار طرف پہاڑوں کی میخیں ٹھونک دی تھیں
ع فرد کوفت بر دامنش میخ کوہ۔ آفتاب ہر صبح کو صرف ہماری زمین کو روشنی اور گرمی پہنچانے کے واسطے
خیمۂ شرق سے نکل کر دن بھر آسمان کا چکر لگا کر شام کو خوابگاہ مغرب میں مونھ چھپا لیتا تھا۔ آج نظام فیثاغورث
نے ان تمام خیالات کو باطل کر دیا ہی اسکول کا ایک ایک بچہ پرانے زمانہ کے ماہرین علوم سے زیادہ واقف ہی

یہ وہ ترقی کا زمانہ ہے کہ جس میں بقول مولینا حالی کے شام کی ایجاد صبح کو باسی ہو جاتی ہے اس زمانہ میں اُن مضحکہ خیز خیالات کو پڑہنے اور اُنپر غور کرنے سے بجز تضیع اوقات کے کیا حاصل ہو سکتا ہے کہ تقویم پارینہ بنا یدبکار۔ لٹریچر میں عربوں کے پاس سوائے نظم کے نثر میں کوئی عمدہ ذخیرہ نہیں ہے نظم شروع سے انکا مایۂ ناز رہی ہے اور آج تک مسلمان اسی پر فخر کرتے ہیں لیکن زمانہ جاہلیت کا تقریباً کل نظم کا ذخیرہ عربوں کی خانہ جنگیوں اور خونریزی کے قصص یا اونٹنی کی لمبی گردن اور کھجور کی خار دار شاخ کی تعریف اور توصیف سے پر ہے کسی قسم کے علمی مضامین کا اُس میں پتہ نہیں۔ پچھلے زمانہ کے کلام میں سوائے عیش پرست خلفا اور اُنکے مہ جبین معشوقوں کی تعریف اور شراب و کباب کی توصیف کے کیا رکھا ہے۔ ایسی گندہ اور بیکار نظم کو پڑہنے سے بجز تخریب اخلاق کے کیا فائدہ ہو سکتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ فن تاریخ میں عربوں نے بہت ترقی کی تھی۔ وہ تاریخیں بیشتر تو نہایت عمدہ دیباچوں اور حواشی کے اضافہ کے ساتھ یورپ کی زبانوں میں ترجمہ ہو گئی ہیں اُنکا مطالعہ اصل عربی کتابوں سے بہت زیادہ مفید ہے۔ مسلمانوں کے علوم و فنون میں ترقی کی یہ مختصر کیفیت ہے جسکو ہم اوپر بیان کر چکے ہیں اور مذہبی جوش کو برطرف رکھکر نہایت ایمانداری کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں کی تہذیب کسی زمانہ میں آج کی یورپ کی تہذیب اور شائستگی کے مقابلہ میں کوئی نسبت نہیں رکھتی اور مسلمانوں کے علوم و فنون کسی زمانہ میں ابتدائی درجہ سے آگے نہیں بڑہی البتہ سنسکرت کی نسبت یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ اُس میں علوم کے ایسے خزائن مدفون ہیں جو باوجود زمانہ حال کی حیرت انگیز ترقی کے اہل یورپ کی نگاہ فہم سے پوشیدہ ہیں اور جن کی تحصیل میں اہل یورپ نہایت مستعدی اور سرگرمی سے مصروف ہیں لیکن افسوس ہے کہ ہمارے ہموطن بھائی اہل ہنود نے ان علوم کی طرف بہت کم توجہ کی ہے ہم نہایت زور کے ساتھ اپنے بھائیوں کو صلاح دیتے ہیں کہ تمہارے گھروں میں جو خزانے دبے پڑے ہیں اُنکو نکالو خود بھی اُنسے مستفیض ہو اور ہمیں بھی اُنسے فائدہ حاصل کرنیمیں شریک کرو۔ برخلاف اسکے آج کل مسلمانوں میں بقول نواب عماد الملک بہادر کے ایک نیا مرض شائع ہو گیا ہے جسکو اسلاف پرستی کہتے ہیں۔ اکثر انگریزی داں نوجوان خصوصاً علیگڈھ کے طلبا اس میں بکثرت مبتلا ہیں اور اس مرض کی اشاعت کے بانی اول دو چار یورپین مورخ ہیں مگر زیادہ تر ہماری ہی گروہ کے بزرگوار ہیں

نام لیتے ہوئے میں ڈرتا ہوں مگر خیر جمع بہت ہی عجب نہیں کہ میرے بھی حامی اور مددگار یہاں بہت نکل آئینگے حضرات بڑے مزہ نہیں کے نواب محسن الملک بہادر ہیں اور دوسرے مولوی شبلی نعمانی ہیں۔ میرے قدیم کرمفرما مولانا حافظ نذیر احمد صاحب بھی اگرچہ کبھی کبھی اس کوچہ میں بھٹک نکلتے ہیں مگر وقت پر نہیں چوکتے کوئی بات بیدھڑک کہہ جاتے ہیں جو تریاق کا حکم رکھتی ہے۔ ان حضرات نے او دہم مچادی ہے آفت برپا کردی ہے کوئی مسلمانوں کی علمی دولت کو شمار کرتا ہے کوئی تمدنی خوبیاں گنا تا ہے کوئی ہمارے مدارس و یونیورسٹیوں کی فہرست تیار کرتا ہے کوئی ہماری یونانی کتابوں کے ترجموں کا حساب دیتا ہے کوئی اندلس کی حکومت کا زور دکھاتا ہے کوئی ہارون و رمامون کی شان دکھاتا ہے لیکن آجکل مسلمانوں کو اپنے اباؤاجداد کے کارنامے پڑھنے اور انکی ظاہری شان و شوکت کی دل خوش کن حکایات کو رٹنے سے سوائے نقصان کے کیا حاصل ہو سکتا ہے۔ اب ان باتوں کا وقت گزر گیا مسلمان اپنے بزرگوں کے حالات سے ناواقف نہیں ہیں بلکہ میری راے میں جسقدر خوبیاں ہمارے بزرگوں میں درحقیقت موجود تھیں ہم اُنسے کئی گنی زیادہ اپنی خوش عقیدتی سے اُنکی طرف منسوب کرتے ہیں ہمکو اب اُنکی تاریخ پڑھنے کی ضرورت نہیں ہے

ہمیں امید تھی کہ عربی تعلیم کا اسکیم پیش کرتے وقت مجوزان اسکیم سب سے پیشتر وہ کتابیں بتائینگے جنکی تعلیم منظور ہے اور جو آج کل ہمارے عربی مدارس میں نہیں پڑھائی جاتیں اور جن میں اہل یورپ نے علوم اور شائستگی کے چھپے ہوئے خزانے ڈھونڈ نکالے ہیں لیکن ہمکو نہایت تعجب اور ناامیدی ہوئی جب مسٹر گارڈنر براؤن کے مطبوعہ اسکیم میں اس سوال کا کہ کیا مضامین پڑھائے جائینگے؟ ہمکو یہ جواب ملا کہ "اسکے متعلق ناممکن ہے کہ میں قطعی جواب دوں" سے

بہت شور سنتے تھے پہلو میں دل کا　　　جو چیرا تو اک قطرۂ خون نکلا

اور پھر فوراً ہی ہماری تمام امیدوں اور اپنی بلند پروازیوں کو خاک میں ملا کر صاحب ممدوح نے یہ فرمایا کہ اگرچہ ابتدا میں وہی ایم۔ اے کا کورس جو الہ آباد یونیورسٹی میں مقرر ہے پڑھایا جائیگا" یا بایں شور شوری یا بایں بے نمکی۔ یہ امر کسقدر مضحکہ خیز ہے کہ مسٹر گارڈنر براؤن یا اُن کے مشیر ڈاکٹر اس مسلمانوں کو اپنے جدید اسکیم کی طرف ترغیب دینے کی غرض سے دو چار عربی کی ایسی کتابیں نہ بتا سکے جو مسلمانوں کی

موجودہ حالت کے درست کرنے میں مفید پائی جاتی یا جنکے مطالعہ کے بعد ہماری قوم کے عالم اُن کی خوبی مضامین کے معترف ہوکر مسٹر گارڈنر براؤن کی حمایت کرنیکو طیار ہوجاتے۔

چونکہ مسلمانوں کے پیغمبر ملک عرب میں پیدا ہوئے اور اُن کی زبان عربی ہونے کی وجہ سے قرآن پاک اُسی زبان میں نازل ہوا اسواسطے مسلمانوں کو عربی کے ساتھ ایک خاص قسم کی خوش اعتقادی اور اُنس پیدا ہوگیا ہے لیکن ہمارے خیال میں درصل مذہب اسلام کو عربی کے ساتھ کوئی خصوصیت نہیں ہے محض ایک اتفاق تھا کہ نبی آخرالزماں صلی اللہ علیہ وسلم کا ظہور ملک عرب میں ہوا اگر حضور سرور کائنات علیہ افضل الصلوٰۃ کسی اور ملک میں پیدا ہوتے تو اُسی ملک کی زبان میں قرآن نازل ہوتا اور وہی مسلمانوں کی مذہبی زبان ہوجاتی۔ لیکن اس مسئلہ پر بحث کرتے وقت مذہبی خوش اعتقادی سے فائدہ اٹھانا اور لوگوں کے مذہبی خیالات برانگیختہ کرنا نہایت شرمناک بات ہے۔ ہم اسوقت اپنی دنیوی ترقی کے ایک اہم مسئلہ پر بحث کر رہے ہیں اور مذہبی خیالات کو علیحدہ کرکے ہم نہایت ٹھنڈے دل سے کہہ سکتے ہیں کہ عربی زبان میں ہرگز اسقدر وسیع اور مکمل علوم اور شائستگی نہیں ہے جیسی کہ آج یورپ کی زبانوں میں پائی جاتی ہے۔ اگر تھوڑی دیر کے واسطے ہم اس امر کو تسلیم بھی کریں کہ ازمنہ وسطیٰ میں یورپ نے عربوں کے ترجموں سے کچھ فائدہ اُٹھایا تو اس سے عربی کی یورپ کے علوم پر فوقیت ثابت نہیں ہوسکتی کوئی صاحب فہم توڑے دار بندوق کو ہنری مارٹینر پر اور چھکڑا گاڑی کو لینڈو پر ترجیح نہیں دیسکتا۔ حقیقت میں مذہبی لگاؤ نے اس مسئلہ کو نہایت پیچیدہ کردیا ہے اور اسپر غور کرتے وقت مسلمانوں کو چاہیئے کہ مذہبی جوش میں آکر مجوزان سکیم کی چکنی چپڑی باتوں پر فریفتہ نہو جائیں بلکہ بنظر تعمق اصل معاملہ پر غور کرنیکے بعد رائے قائم کریں ؎

ما بروں را ننگریم و قال را   ما دروں را بنگریم و حال را

ریڈیکل

## ابتدائی تعلیم

اعلیٰ تعلیم کا انحصار بہت کچھ اُس طریقہ پر ہے جو بچوں کے ساتھ پڑھنا شروع کرنے کے وقت اختیار

کیا جائے۔ بالعموم ہمارے ملک میں بچوں کے سامنے علم کو ایک ایسے ناگوار طریقہ میں پیش کیا جاتا ہے کہ وہ اُنکے دل و دماغ پر ایک قسم کا بار ہوتا ہے۔ اسکا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بہت کم لڑکے اوپر تک پہنچ سکتے ہیں اور جو بالآخر پہنچتے ہیں انہیں بھی علم سے کوئی حقیقی دلچسپی نہیں ہوتی۔ شروع سے بجائے سمجھ کے زیادہ تر اُنکے حافظہ سے کام لیا جاتا ہے اسلیئے برسوں تک اُن مضامین سے جو وہ پڑھتے ہیں انہیں کوئی مناسبت نہیں ہوتی اور کوئی شئے اُن کی طبیعت بڑھانے والی نہیں ہوتی۔ اگر کسی بچہ سے کوئی سخت جسمانی کام لیا جائے تو اُسکے جسمانی قویٰ مضمحل ہو جاتے ہیں اور اُنکے اعضاء کا نشو و نما پوری طرح نہیں ہوتا۔ یہی حال اُن بچوں کا ہے جو بٹ پٹ کر اپنے دماغ میں ایسے مضامین اور ایسے الفاظ محفوظ رکھنے پر مجبور کیئے جاتے ہیں جو وہ بالکل نہیں سمجھتے اور بالآخر وہ کند ذہن اور بھدّے ہو جاتے ہیں۔ ایسے بچوں کی تعداد بالخصوص مسلمانوں میں زیادہ ہے جو بچپن میں فارسی کی کتابیں پڑھنے پر مجبور کیئے جاتے ہیں۔ قرآن شریف کی تعلیم کا وقت بلاشک وہی ہے مگر موجودہ طریقہ میں اسقدر ترمیم کی ضرورت ہے کہ الف۔ بے۔ پڑھانے کے بعد ایک وقت سہل اُردو اور ایک وقت قرآن شریف پڑھایا جائے۔ تاکہ بچہ کی طبیعت اُردو کی وجہ سے بڑھے۔ ساتھ ساتھ اُردو پڑھانے سے یہ بھی نفع ہے کہ قرآن شریف بھی جلد ختم ہو جاتا ہے کیونکہ بچہ میں حروف ملانے کی قوت ہو جاتی ہے۔ اردو حروف ملانے کے بعد چونکہ بچہ کو ایک بامعنی لفظ معلوم ہو جاتا ہے اور چند الفاظ ملانے کے بعد چونکہ اُسکے دماغ میں ایک مضمون آجاتا ہے اسلیئے قدرتی طور پر بچہ کو اور حروف اور الفاظ ملا کر مطلب نکالنے یا کوئی دلچسپ قصہ معلوم کرنے کی رغبت ہوتی ہے۔ دیسی مکاتب میں ایسا بھی ہوتا ہے کہ مذہبی جوش میں آکر والدین اپنے بچوں کو بلا امتیاز قرآن شریف کے حفظ کرنے کے لیئے سپرد کر دیتے ہیں جس سے کمزور طبیعتوں کے بچے غبی ہو جاتے ہیں اور تمام عمر کے لیئے پڑھنے لکھنے سے بھاگ نکلتے ہیں اسلیئے ضرورت ہے کہ قرآن شریف حفظ کرنے کے لیئے صرف اُن لوگوں کو منتخب کیا جائے جو حفظ کرنے کے زیادہ اہل ہوں۔

سب لڑکوں سے یکساں محنت لینے اور اُن کے دماغوں پر یکساں بار ڈالنے سے لڑکوں کی زیادہ تعداد بیکار ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دیسی مکاتب میں مدتوں تک پڑھنے پر بھی اکثر لڑکے قرآن شریف ختم نہیں کر سکتے اور اگر ختم کر لیتے ہیں تو بوجہ دلچسپی پیدا نہ ہونے کے آیندہ زندگی میں کبھی تلاوت نہیں کرتے اور اس

غفلت کیوجہ سے وہ اس تعلیم سے کچھ نفع نہیں اُٹھاتے۔

جن صاحبوں کو مسلمانوں کی تعلیم سے دلچسپی ہو وہ دیسی مکاتب کی طرف خاص توجہ کریں اُن کے نتائج کو دیکھیں کہ فیصدی کتنے بچے بالآخر پڑھ کر فارغ ہو جاتے ہیں اور کتنے مدت العمر کے لیئے بے مصرف ہو جاتے ہیں۔ اور اس بات کی کوشش کریں کہ علاوہ کلام پاک کے ایسی سہل کتابوں کا رواج ہو جو مذہبی واقفیت بڑہانے کے ساتھ کسی قدر دلچسپ بھی ہوں تاکہ ابتدا سے بچوں کو اپنے قوائے عقلی اور دماغی کو استعمال کرنے کی عادت ہو ورنہ اُنکے دماغ اُستادوں کی غفلت اور طریقہ تعلیم کے ناقص ہونے کی وجہ سے آگے چلکر اعلیٰ تعلیم سے قطعاً محروم رہجاتے ہیں۔

## رنج و راحت

طفیل احمد

۱۔ سقراط سے منقول ہے کہ خدا نے رنج و راحت دونوں کو ملا دینا چاہا لیکن چونکہ یہ متضاد اشیا ہیں اسلیے مل نہ سکیں۔ تب خدا نے ان دونوں کے سروں کو جوڑ دیا۔ سقراط کے خیال کا پچھلا حصہ ایک طرح سے قدما کے خیال کے موافق ہے اور نہایت خوبی کے ساتھ ظاہر کیا گیا ہے۔ قدما کے خیال کے موافق رنج و راحت یا خوشی اور تکلیف کا ایک دَور مقرر ہے کبھی ایک کا دَور شروع ہوتا ہے کبھی دوسرے کا۔ اس بات پر سوچنے سے ہمکو بچپن کے ایک تماشہ کا خیال آتا ہے جو لوگ میلوں وغیرہ کے موقع پر دکھلایا کرتے تھے وہ یہ کہ ایک چکر یا دائرہ چاروں طرف خانوں سے بھرا ہوا ہوتا تھا اور اُسکے ہر خانہ میں ایک تصویر ہوا کرتی تھی۔ یہ دائرہ بانس اور کاغذ کا بنا ہوا ہوتا تھا اور قندیل کے موافق چراغ سے روشن کیا جاتا تھا اور چراغ ہی کا دھواں اُس کی گردش کا باعث ہوتا تھا۔ بسبب گردش کے کبھی کوئی خوشرنگ تصویر جو بسبب تیز روشنی کے زیادہ خوبصورت معلوم ہوتی تھی سامنے آجاتی تھی جسکو دیکھکر دل مارے خوشی کے اُچھل پڑتا تھا اور کبھی دوسری تصویر جو بدشکل ہوتی تھی اور روشنی کی بھڑک میں زیادہ ہیبتناک معلوم ہوتی تھی سامنے آکر دل میں ایک سناٹا سا پیدا کر دیتی تھی۔ دائرہ کی اس گردش کو رنج و راحت کے دَور کے ساتھ عجیب نسبت ہے۔ دائرہ کی ان تصویروں کے موافق وقت کی گردش یا دَور میں

بھی دو تصویریں ہمیشہ موجود رہتی ہیں ایک تصویر خوشنما راحت کی ہی اور دوسری مہیب رنج و بلا کی۔ راحت کی تصویر کبھی اپنا جلوہ دکھاتی ہی۔ اس کی شکل ایسی مقبول اور دلپسند ہی کہ انسان کا دل اسیر فریفتہ ہو جاتا ہی اور خیال نہیں گذرتا کہ اُس کے ساتھ ہی رنج و تکلیف کی تپلی کا بھی ظہور ہونیوالا ہی جسکے دیکھنے کو کسی طرح دل نہیں چاہتا۔ اور جو بوجہ اپنے ناگوار ہونے کے مدت تک ہمارے سے ترک صحبت کرنا نہیں چاہتی دل مانے یا نہ مانے اس بلا سے بھی رفاقت کرنی پڑتی ہی۔ یہ کچھ ایسی ناگوار ہی کہ ہر لمحہ جو اُسکی صحبت میں گذرتا ہی سال معلوم ہوتا ہی اور زندگی کا ایک حصہ مجبوری اُسکے صدقہ کرنا پڑتا ہی۔

۲۔ انسان کا بہت دل چاہتا ہی کہ کوئی جمشیدی جام اُسکو حاصل ہوتا جو رنج کے اختتام اور خوشی کے آغاز سے اُسکو آگاہ کر دیا کرتا۔ ایسے جام کے نہونیکے سبب انسان کو آیندہ کے نیک و بد کی اطلاع نہیں ہوتی۔ پردہ غیب سے جو کچھ ظہور میں آتا ہی اُسی کو ہم دیکھ سکتے ہیں۔ وہ حد فاصل جو رنج کو راحت سے یا خوشی کو تکلیف سے جدا کرتی ہی نہایت باریک اور لطیف ہی۔ عین جبکہ ہم اپنے فرض کردہ راحت اور خوشی کی بہشت میں اپنے تئیں سمجھے بیٹھے ہیں رنج و تکلیف ہمکو آگھیرتے ہیں بلکہ خود ہماری راحت و خوشی اُنکا باعث ہو جاتی ہی۔ شراب خواروں کی حالت اسکا ایک نمونہ ہی۔ شراب پینے والے کو شراب یا تو سرور پر سرور دے رہی ہی اور مدت کے کملائے ہوئے دل کے غنچہ کو کھلا رہی ہی یا دفعتہً باعث کلفت کا ہو جاتی ہی۔ سر گرانی سیر گردانی۔ مدہوشی۔ بدمستی۔ بدتہذیبی۔ یاروں کی صحبت میں بدمزگی ہم جنسوں میں ندامت بے آبروئی یہ سب اور دوسرے ایسے ہی خراب نتیجے ایسے جلد پیدا ہو جاتے ہیں کہ یقین نہیں ہوتا کہ شراب جو ابھی ایسی خوشی دے رہی تھی ایسے متضاد اثر پیدا کر سکتی ہی۔ ایسے موقعوں پر حد فاصل رنج و راحت میں معلوم نہیں ہوتی۔ حقیقت میں ایک باریک خط راحت کو رنج سے اور تکلیف کو خوشی سے جدا کرتا ہی۔ ہمارے دیکھتے دیکھتے راحت رنج بنجاتی ہی اور رنج راحت۔ چونکہ وہ دائرہ جس میں یہ حرکت کرتے ہیں یا بقول سقراط وہ جگہہ جہاں انکے سرے ملے ہوے ہیں ہماری نظروں سے غائب ہی۔ اسواسطے ہم دیکھ نہیں سکتے کہ کب ایک ختم اور دوسرا شروع ہوتا ہی۔ اور یہ ہمارے لیئے اچھا ہی۔ لیکن جب ہم خوشی کو انتہا کے درجے پر

پہنچا ہوا پاویں تو سمجھ لینا چاہیئے کہ یہ اب پارے کی طرح اُڑنے والی ہو اور تکلیف اُسکی جگہہ جلد شروع ہوگی۔ لیکن اس میں یہ بڑی غلطی ہوتی ہو کہ انتہا کو ہم انتہا نہیں سمجھتے۔ کوتاہ نظری اسکا باعث ہو اور دل کی خواہش ہمکو دھوکے میں رکھتی ہو۔ دل نہیں چاہتا کہ سالہا سال کی تمنا جب حاصل ہو تو ہم اسی وقت سے اُسکا زوال سمجھیں اور اُس کی متضاد حالت یعنی تکلیف کا آغاز جانیں۔ خوشی کا زوال حقیقت میں اُسکے حاصل ہوتے ہی شروع ہوجاتا ہو اور یہی حالت رنج کی ہو۔ قدرت کاملہ کی یہ حکمت نہایت ہی مفید ہو کہ انسان کو رنج و راحت کا آغاز و اختتام دکھائی نہیں دیتا اگر دکھائی دیتا تو اُس کا ہر طرح سے نقصان تھا۔ اگر راحت کے دوسرے سرے کو انسان دیکھہ سکتا تو راحت کا بھی مزا اُسکو نہ آتا۔ وہ ہمیشہ اپنی نظر دوسرے سرے پر رکھتا اور افسوس کیا کرتا کہ کتنی جلدی یہ گذرنے والی ہو۔ اسی طرح اگر وہ اختتام رنج کو دیکھہ سکتا تو ہر وقت اُسکا خیال اسبات پر لگا رہتا کہ کب رنج ختم اور راحت شروع ہو۔ اس صورت میں وہ راحت کو اسقدر ضروری جانتا جس کا وہ مستحق نہیں۔ پس رنج و راحت کا پردۂ غیب میں انسان کی نظر سے چھپا رہنا ہی بہتر ہو۔

۳- رنج و راحت یا تکلیف و خوشی متضاد احساس کے نام ہیں جو اشیا سے ہمکو محسوس ہوتے ہیں اس احساس کا آلہ حواس خمسہ ہیں یعنی آنکھ۔ ناک۔ کان۔ زبان۔ وغیرہ اس احساس میں ہماری مدد کرتے ہیں۔ مثلاً خوشبو کے سونگھنے سے راحت کی اور بدبو کے سونگھنے سے تکلیف کی حس پیدا ہوتی ہو۔ رونے کی آواز سننے سے رنج کا اور راگ کے سننے سے خوشی کا احساس ہوتا ہو۔ نرم پھول کے چھونے سے راحت اور کانٹے کے چبھنے سے تکلیف معلوم ہوتی ہو۔ اسی طرح دولت خوشی کا اور افلاس تکلیف کا سبب ہیں از خود دولت و افلاس خوشی یا تکلیف نہیں ہیں۔ بلکہ اُنکے پیدا ہونیکا ذریعہ ہیں

۴- اوپر کے بیان سے ظاہر ہو کہ نہ انسان کو ہمیشہ راحت و خوشی حاصل ہو اور نہ سدا رنج و تکلیف کی گرداب میں اُسکو رہنا ہو۔ کبھی اُسکو راحت حاصل ہو اور کبھی رنج پس رنج و راحت کا دَور انسان کیواسطے نصیحت سے خالی نہیں۔ چونکہ ایک کے بعد دوسرا شروع ہونیوالا ہو تو انسان کو رنج و تکلیف کے وقت ہمت نہ ہارنی چاہیئے۔ اُسکو پورا یقین رکھنا چاہیئے کہ چند روز میں تکلیف ختم اور اُسکی جگہہ

خوشی شروع ہوگی۔ یہ خیال مصیبت میں انسان کی بڑی تقویت کا باعث ہوگا اور فلاح کی اُمید پر اُس کو مشکلیں آسان معلوم ہوں گی اور فرائض زندگی کو وہ باسانی ادا کر سکیگا۔ یورپ کے بعض شجاع مصیبت کی تاب نہ لاکر خودکشی کر لیتے ہیں۔ اپنے اس فعل سے وہ مشکل سے نکلنے کا ایک مختصر راستہ پیدا کرتے ہیں۔ یہ حرکت نہ فقط بنی نوع انسان کیواسطے مضر ہے بلکہ قانون قدرت کے بھی خلاف ہے۔ رنج و تکلیف اسواسطے پیدا نہیں کیئے گئے کہ انسان کی حیات کو ختم کر دیں بلکہ اسواسطے ہیں کہ اُسکو راحت کا زیادہ مستحق بناویں اور اُسکی تعلیم کا ذریعہ ہوں اس صورت میں خودکشی کا فعل ایسا ہی ہے جیسے کہ کوئی مریض سختی مرض سے تنگ آکر اپنے تئیں ہلاک کر ڈالے مریض اچھے بھی ہو جاتے ہیں اور مر بھی جاتے ہیں لیکن مرض کے ہونیسے یہ لازم نہیں آتا کہ مریض کو شفا ہو ہی گی نہیں۔ رنج کی حالت کی طرح راحت کیحالت بھی ہمیشہ نہیں رہتی۔ اسواسطے انسان اُسپر بھی بھروسہ کرے اور نہ اسکو مایۂ فخر و ناز ٹھہراوے بلکہ عجز و انکسار کیطرف رغبت کرے۔ پس ہر دو صورتیں انسان کا فائدہ ہے تکلیف کی حالت میں اس خیال کی بدولت انسان مایوس نہوگا اور راحت کیحالت میں وہ غرور سے بچا رہیگا۔

۵۔ جب ہمکو معلوم ہے کہ تکلیف اور خوشی کا دَور ہر انسان کی زندگی میں آتا ہے تو بہت مناسب ہے کہ ہم پہلے خوشی کے خواہاں نہ ہوں۔ اگر ہم پہلے خوشی کا مزہ چکھ لینگے تو پھر خوشی کے بعد تکلیف نہایت ہی ناقابل برداشت ہوگی۔ اسکے برعکس اگر پہلے سختیاں جھیلینگے تو اول تو طبیعت سختی اُٹھانے کی اسقدر عادی ہو جائیگی کہ پھر سختی کا احساس نہوگا۔ دوسرے تکلیف کے بعد خوشی کا مزہ دہ چند ہو جاتا ہے۔ جس شخص نے تکلیف نہیں اُٹھائی وہ آرام سے پورا لطف نہیں اُٹھاتا اور تکلیف کو برداشت کرنا بھی اُسپر شاق گذرتا ہے۔ چونکہ انسان جوانی میں بڑھاپے کی نسبت رنج و تکلیف زیادہ آسانی سے برداشت کر سکتا ہے۔ اسلیئے دقت اور تکلیف کے کام مثلاً تحصیل علم و کسب حرفت وغیرہ جوانی میں حاصل کرے تاکہ بڑھاپے میں ان سے فائدہ اُٹھاوے۔ بلیات ناگہانی البتہ ہر وقت میں نازل ہو سکتی ہیں۔ لیکن ان کے سوا اور بہت سی مشکلات ہیں جو انسان خود اپنے سر لیتا ہے اور انکا انسداد توانائی کی حالت میں بہتر ہو سکتا ہے

۶۔ اوپر کی بحث سے یہ بھی نتیجہ نکلتا ہے کہ انسان اپنی دنیاوی زندگی میں عاقبت کا سرمایہ بہم پہنچا دے اور اُسکے

واسطے کسیقدر راحت کو ترک کرنے اور تکلیف اُٹھانے کی ضرورت ہوتی ہی۔ ایثار اور نیکی کرنے میں البتہ
کسیقدر تکلیف ہوتی ہی خصوصاً جب ہمارے امکان میں ہو کہ دوسروں کو نقصان پہنچاکر اپنا فائدہ کریں
ایسی حالت میں ایثار علی النفس اور نیکی کرنا ذرا مشکل کام ہے۔ لیکن بعض صاحب تو آخرت اور آخروی زندگی
کو دہوکے کی ٹٹی سمجھتے ہیں۔ وہ مضمون کے اس حصّہ کو دیکھکر خیال کرینگے کہ جس آدمی نے اس جہان میں
لطف زندگی نہ اُٹھایا وہ یہاں بھی محروم رہا اور وہاں بھی۔ یہ خیال غلط ہی۔ بالفرض اگر آخرت نہ بھی ہو تب
بھی انسان نیکی کرنے سے اس جہان میں فائدہ سے محروم نہیں رہ سکتا۔ اول تو نیکی کرنے میں خود خوشی
ہی کسی اور خوشی کے حاصل ہونے کی اسکے واسطے ضرورت نہیں۔ نیکی اُن اشیا میں سے ہی جنکے کرنے
ہی میں اُنکا صلہ یعنی خوشی ہی۔ دوسرے جو لوگ کسی کام کو ایک اُمید پر کرتے ہیں تو وہ اُمید پوری ہو
یا نہو اُسکا مزہ اُنکو حاصل ہوجاتا ہی۔ خوشی امید کے پورا ہونے میں نہیں ہی بلکہ خود اُمید کے ہونے میں ہی۔
پس جب اُمید اُنکو ہی تو اُمید سے جسقدر خوشی حاصل ہوسکتی ہی اُس سے وہ محروم نہیں رہ سکتے۔

۷۔ ماسوا اسکے انسان کو خوشی کا اسقدر دلدادہ نہیں ہونا چاہیئے کہ اُسکے نہونے سے اُسکو تکلیف ہو اور
نہ رنج سے اسقدر متاثر ہونا چاہیئے کہ اُس کی وجہ سے وہ پریشان ہوجائے۔ غیر مستقل مزاج لوگ جو
خوشی یا رنج سے بہت متاثر ہوتے ہیں اُن کی مثال ویدر کاک یعنی مرغ بادنما کی سی ہی جو کبھی ہوا کے
جھونکے سے اس طرف اور کبھی اس طرف رخ پھیر لیتا ہی۔ ویدر کاک کا رُخ بدلنا ہوا کے رُخ بدلنے پر
موقوف ہی۔ اسی طرح غیر مستقل مزاج لوگوں کی زندگی اتفاقات اور حوادثات کی تابع ہوتی ہی ایسا
شخص مثل مرغ بادنما کے کوئی فعل بالارادہ نہیں کرتا بلکہ کبھی راحت اُسے خوشی کے چکر میں ڈالتی ہی اور
کبھی رنج اُسے تکلیف کے گرداب میں پھنساتا ہی۔ ......... اس میں شک نہیں کہ رنج و راحت
سے متاثر ہونا فطرت انسانی ہی۔ لیکن نہ اس درجہ تک کہ اُنکا گرویدہ ہوجاے۔ انسان کو ایسا کمزور
دل نہونا چاہیئے کہ خوشی کیحالت میں اُچھلتا پھرے اور رنج کی حالت میں سرنگوں ہوجائے بلکہ اس کے
خلاف انسان کو رنج و راحت سے حتی الوسع مستغنی ہونا چاہیئے۔ شاعر نے کیا خوب کہا ہی۔

## بیت

زرنج و راحت گیتی مشو خنداں مرنجاں دل　　که آئین جہاں گاہے چنیں گاہے چناں باشد

خواجہ علی محمد از انبالہ

## مدرستہ العلوم علی گڈہ میں اولڈ بوائز ڈنر

ایم-اے-او-کالج کے اولڈ بوائز کا ساتواں سالانہ ڈنر ۲-اپریل ۱۹۰۴ء کو بمقام علی گڈہ کیا گیا- قریب سات سو کے خطوط دعوت اولڈ بوائز کی خدمت میں بھیجے گئے تھے منجملہ اُنکے کم و بیش ایک سو اولڈ بوائز نے اپنے جواب سے ممنون فرمایا- اور باقی صاحبان کیجانب سے جواب خط تک بھی نہیں آیا- جن صاحبان نے خطوط دعوتی کے جوابات دیئے اُن میں سے بعض صاحبان نے اس بات کی معذرت کی کہ وہ علی گڈہ میں شریک دعوت نہیں ہو سکتے مگر وہ اپنے اپنے مقامات پر علی گڈہ کے پرانے طلبا اور دیگر معززین کو تاریخ مقررہ پر دعوت دینگے اور جلسہ منعقد کرینگے اور اُن جلسوں اور دعوتوں کی جو کاروائی ہوگی اُس کی کیفیت تحریر کر کے سکرٹری اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے پاس بھیجدینگے- ایسے جلسوں کی کیفیت جو دیگر مقامات میں تاریخ مقررہ پر منعقد کیئے گئے ہونگے جداگانہ آیندہ درج ہوگی-

جو کالج کے اولڈ بوائے شریک جلسہ منعقدہ علی گڈہ ہوے اُنکے اسماے گرامی مندرجہ ذیل ہیں-

(۱) مولوی سخاوت حسین صاحب بی-اے ہیڈ ماسٹر پیلی بھیت-

(۲) سید زین الدین صاحب ایم-اے ڈپٹی کلکٹر مین پوری-

(۳) مولوی مظہر الحق صاحب بی-اے انسپکٹر ابکاری متھرا-

(۴) حبیب اللہ خاں صاحب بی-اے تحصیلدار ہاترس-

(۵) زمان مہدی خاں صاحب بی-اے اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر امرتسر-

(۶) خواجہ غلام الثقلین صاحب بی اے ایل ایل بی وکیل میرٹھ-

(۷) مولوی ابو طالب صاحب بی-اے وکیل مین پوری-

(۸) سید حسن شاہ صاحب رئیس سردھنہ- (۹) مشتاق حسین صاحب کرٹری جنگی بدایوں

(۱۰) محمد یعقوب صاحب از شاہجہاں پور- (۱۱) مظفر علی خاں صاحب کرٹری جنگی تلہر-

(۱۲) مولوی جمال احمد صاحب رئیس کرٹا (۱۳) شیخ ظفر علی صاحب سکرٹری چنگی اٹاوہ

(۱۴) محمد شکور بخش صاحب بی۔ اے اسسٹنٹ سپرنڈنٹ سالٹ ڈپارٹمنٹ اٹاوہ

(۱۵) مرزا عطا حسین صاحب سب انسپکٹر (۱۶) محمود الحسن صاحب بی۔ اے ازلکھنؤ

(۱۷) سعید حسین صاحب از بریلی (۱۸) مسٹر آر۔ بی قادری صاحب بیرسٹرایٹ لا

(۱۹) صاحبزادہ آفتاب احمد خانصاحب بیرسٹرایٹ لا (۲۰) مولوی سراج الدین صاحب بی۔ اے وکیل

(۲۱) مولوی شمس الحسن صاحب بی۔ اے وکیل (۲۲) مولوی سمیع اللہ صاحب بی۔ اے وکیل

(۲۳) مولوی عبدالسلام صاحب بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی۔ وکیل

(۲۴) سرفراز خاں صاحب سب جسٹرار (۲۵) احسان حسین صاحب نائب ناظر

(۲۶) بابو گردہاری لال صاحب بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی۔ وکیل

(۲۷) بابو ابیکا چرن صاحب (۲۸) میر ولایت حسین صاحب بی۔ اے۔

(۲۹) سید عبدالباقی صاحب ایم۔ اے (۳۰) ماسٹر محمود حسین صاحب بی۔ اے

(۳۱) پروفیسر عبدالقادر خاں صاحب ایم۔ اے (۳۲) عبدالحمید صاحب بی۔ اے

(۳۳) سید ابو محمد صاحب بی۔ اے۔ (۳۴) سعادت علی خاں صاحب

(۳۵) شان الٰہی صاحب (۳۶) عبدالغفور صاحب (۳۷) عزیز الحسن صاحب

(۳۸) نعیم الدین خانصاحب (۳۹) قائم حسین صاحب (۴۰) سید انور علی صاحب

(۴۱) عبدالحکیم صاحب (۴۲) بابو کرشن گوپال صاحب وغیرہ

اسماء مذکورہ بالا سے یہ ظاہر ہی کہ بعض کالج کے طالب علموں کو اپنے کالج کی محبت بہت دور دراز مقامات سے کھینچکر لائی اور نیز یہ بھی ظاہر ہی کہ ہمارے اکثر اولڈ بوائز جو قرب و جوار کے مقامات میں رہتے ہیں مثلاً بدایوں۔ رامپور۔ بریلی و آگرہ و دہلی و میرٹھ گو اُنکے دلوں میں کالج کی محبت موجود بھی تھی لیکن بوجہ اپنی لاپرواہی و کاہلی ایک ایسے عمدہ موقع سے فائدہ حاصل کرنے سے قاصر رہے جبکہ وہ اپنے پرانے عزیز دوستوں سے ملکر لطف صحبت حاصل کر سکتے تھے اور نیز اپنے عزیز کالج کے در و دیوار کو

جسکے سایۂ عاطفت میں اُنہوں نے پرورش پائی تھی دیکھکر اپنے دل و دماغ کو دوبارہ تازگی پہنچا سکتے تھے۔ ہم بجز اسکے کچھ نہیں کہہ سکتے کہ ایسے لوگوں کی حالت پر ہمیں بہت افسوس معلوم ہوتا ہی جو بلا کسی خاص وجہ کے ایسے موقع کو ہات سے جانے دیتے ہیں۔

مہمانوں کے رہنے کا اور ریلوے اسٹیشن سے اُنکے خیر مقدم کا خاطر خواہ انتظام کیا گیا تھا۔ اور اُمید ہی کسی صاحب کو کھانے یا رہنے کے متعلق کوئی شکایت نہو گی۔ میر ولایت حسین صاحب و سید عبدالباقی صاحب کی امداد اس امر میں خاص طور پر قابل ذکر ہی۔ سب پراکٹر صاحبان و ہاوس مانیٹر صاحبان و فوڈ مانیٹر صاحبان کی خاص توجہ اور مدد کا شکریہ ادا کیا جاتا ہی۔

۲۔ اپریل ۱۹۰۳ء کو صبح ۸ ½ بجے پرنسپل ہال میں ایک جلسہ منعقد ہوا۔ ماسٹر سخاوت حسین صاحب بی اے جلسہ کے پریسیڈنٹ قرار پائے۔ پریسیڈنٹ کی اجازت سے سکرٹری نے اپنی رپورٹ پڑہی اور کالج کے پُرانے طلبار کی عدم توجہی اور معاملات کالج میں بے توجہی کی بہت زیادہ شکایت کی بعد ختم ہونے رپورٹ کے مولانا بہادر علی مرحوم سابق سکرٹری ایسوسی ایشن کی بے وقت وفات پر حبیب اللہ خانصاحب کی تحریک و سید زین الدین صاحب کی تائید سے تعزیت کا ووٹ پاس ہوا۔ اور سب حاضرین نے نہایت سخت اظہار افسوس کیا اُسکے بعد محمد یعقوب صاحب کی تحریک و سید ابو محمد صاحب کی تائید سے آنریبل جسٹس سید محمود صاحب مرحوم کی وفات پر تعزیت کا ووٹ پاس ہوا۔

رزولیوشن نمبر ۳ میر ولایت حسین صاحب نے پیش کیا اور اس کی عبارت مفصلۂ ذیل ہی۔

"ہماری اس ایسوسی ایشن کی ایک کارکن جماعت قائم کی جاوے اور ایسوسی ایشن کا ہر ممبر جو صرف سالانہ چندہ دینا منظور کرے وہ اُس کارکن جماعت کا ممبر تصور ہوگا۔ اور یہ کارکن جماعت ہماری ایسوسی ایشن کی سنڈیکیٹ کہلائیگی"۔ معزز محرک نے رزولیوشن پیش کرتے وقت فرمایا کہ اب وہ وقت آگیا کہ ہم اپنی قوت کو کسی عملی شکل میں ظاہر کریں۔ ابتک ہماری جو کچھ بھی قوت ہی وہ بالکل منتشر ہی اور اگر ہمکو کوئی کام کرنا ہو تو ہمارے لیئے مشکل ہی کہ ہم دو ہزار سے زیادہ اولڈ بوائز سے جنمیں سے بہت سوں کے پتے بھی ہمکو معلوم نہیں ہیں استمزاج کر کر کسی امر کا فیصلہ کریں اور اسوجہ سے ہماری

جماعت اپنی متفقہ قوت سے کوئی کام نہیں کرسکتی۔ اگر ہمارے پاس ایک کارکن جماعت جداگانہ ہوگی تو ہم اُس کے ذریعہ سے حسب ضرورت اور حسب خواہش ممبران اولڈ بوائز ایسو۔سی۔ایشن کسی مفید کام کی تکمیل کرسکینگے۔ مثلاً اسوقت علوم عربی کے دوبارہ زندکرنے کی تجویز جو ہمارے سامنے پیش ہی ہر اولڈ بوائے اُسکی نسبت کچھ نہ کچھ رائے رکھتا ہوگا۔ ہم اگرچاہیں کہ سب اولڈ بوائز کی متفقہ یا کثرت رائے سے اسبارہ میں ٹرسٹیوں کو کوئی صلاح ومشورہ دے سکیں تو یہ امر بالکل غیر ممکن ہی لیکن اگر ہمارے پاس ایک کارکُن جماعت موجود ہوگی تو اُنکے ذریعہ سے ہم یہ کام بہت اچھی طرح کرسکتے ہیں۔ سید ابو محمد صاحب نے اس رزولیوشن کی تائید کی۔ اسکے بعد خواجہ غلام الثقلین صاحب نے اعتراض کیا کہ جبکہ ہمارے پاس سنٹ ہی نہیں تو سنڈیکیٹ بنانے سے کیا فائدہ یہ ہمکو سب سے پہلے بتایا جاوے کہ اس سنڈیکیٹ کا کیا مقصد ہوگا۔ زمان مہدی خاں صاحب نے یہ اعتراض کیا کہ سنڈیکیٹ کے مقاصد اگر ایسے غیر محدود ہوں کہ اُس میں پولٹیکل معاملات بھی آسکتے ہوں تو سرکاری ملازم اس سنڈیکیٹ میں شریک نہ ہوسکینگے بلکہ اُنکو اولڈ بوائز ایسو۔سی۔ایشن سے بھی علیحدگی اختیار کرنی ہوگی۔

صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب نے فرمایا کہ اس سنڈیکیٹ کا قائم کرنا ہی ہماری ایسو۔سی۔ایشن کی اصلاح ہی۔ اسلیئے کہ ایسو۔سی۔ایشن کے متعلق بہت سے کام ہیں لیکن عملی طریقہ کوئی بھی نہیں۔ میر ولایت حسین صاحب نے فرمایا کہ بالفعل سنڈیکیٹ قائم ہوجانی چاہیئے اور پھر سنڈیکیٹ کے ممبر اس بات کو طے کرینگے کہ آیا پولٹیکل معاملات اُسکے مقاصد میں شامل ہوسکتے ہیں کہ نہیں۔ آخرکار بہت بحث کے بعد یہ رزولیوشن پاس ہوا اور مفصلہ ذیل حضرات نے اس کی ممبری قبول فرمائی۔

(۱) میر ولایت حسین صاحب (۲) مولوی سخاوت حسین صاحب بی اے (۳) صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب (۴) شیخ عبداللہ صاحب (۵) مسٹر آر۔بی۔قادری بیرسٹرایٹ لا (۶) مولوی مظہرالحق صاحب (۷) خواجہ غلام الثقلین صاحب (۸) محمد ہاشم صاحب بی۔اے دیوبندی (۹) سید ابو محمد صاحب بی۔اے (۱۰) زمان مہدی خاں صاحب بی۔اے (۱۱) جمال احمد صاحب کٹرا (۱۲) ماسٹر محمود حسین صاحب ایم۔اے۔او۔کالج (۱۳) مشتاق حسین صاحب بدایوں (۱۴) مظفر علی خانصاحب تلہر۔

(۱۵) پروفیسر عبدالقادر خاں صاحب ایم۔ اے۔ او کالج (۱۶) ظفر عمر صاحب ایم۔ اے۔ او کالج (۱۷) مولوی حبیب اللہ خانصاحب تحصیلدار ہاتھرس (۱۸) مولوی طفیل احمد صاحب سب جسٹرار مظفر نگر (۱۹) عبدالحمید صاحب ایم۔ اے۔ او کالج (۲۰) ماسٹر نعیم الدین صاحب ایم۔ اے۔ او کالج (۲۱) ماسٹر قائم حسین صاحب ایم۔ اے۔ او کالج (۲۲) سید ابوطالب صاحب وکیل مین پوری (۲۳) مولوی شکور بخش صاحب قادری سپرنڈنٹ محکمہ نمک (۲۴) سمیع اللہ خاں صاحب وکیل علی گڈہ (۲۵) سرفراز خاں صاحب سب جسٹرار علی گڈہ (۲۶) مولوی صفدر علی صاحب اسسٹنٹ انجنیر کانپور

حضرات مذکورۂ بالا میں سے مولوی مظہر الحق صاحب اور زمان مہدی خانصاحب اور مولوی صفدر علی صاحب نے اپنے چندہ کی بابت مبلغ صہ صہ روپئے ادا کردیئے۔ اسکے بعد رزولیوشن نمبر ۴ جس کی عبارت مفصلہ ذیل ہی پیش ہوا

"اولڈ بوائز ایسو سی ایشن کو اب سرسید میموریل فنڈ کی کامیابی و فراہمی کے لیئے کوئی اصلی اور قطعی کوشش کرنی چاہیے۔ کالج کے پرانے طالب علم تعطیلات یا رخصت کے زمانہ میں ایک ڈپوٹیشن اپنے ہمراہ لیکر ایسے مقامات پر جہاں کوئی جدید چندہ کرنا ہو یا پرانا چندہ وصول کرنا ہو جاویں" یہ رزولیوشن مسٹر شوکت علی صاحب بی۔ اے نے از مقام بہرایچ سکرٹری اولڈ بوائز ایسو سی ایشن کے پاس بغرض پیش کرنے کے بھیجا تھا سکرٹری نے اُسے پیش کیا اور عبدالقادر خاں صاحب نے اس کی تائید کی لیکن ممبروں نے اس خیال سے کہ نہ تو ایسا رزولیوشن ضروری ہی اور نہ قابل تعمیل ہی متفق الرائے نامنظور کیا مسٹر شوکت علی صاحب نے ایک اور رزولیوشن بھیجا تھا جسکا یہ مطلب تھا کہ ایم۔ اے۔ او کالج کے ٹرسٹیوں کو اولڈ بوائز کے اُس رزولیوشن پر توجہ دلائی جاوے جس میں یہ بات قرار پائی تھی کہ کالج ہر سال کسی قابل مسلمان گریجوئٹ کو انگلستان کی یونیورسٹیوں میں واسطے تکمیل تعلیم بھیجا کرے۔ ممبروں نے کہا کہ اس وقت کالج اپنے ایک قابل طالب علم کی جو انگلستان میں تعلیم پا رہا ہی امداد کررہا ہی اسلیئے کوئی مزید وظیفہ اس وقت ٹرسٹی کسی کو نہیں دے سکتے لہذا رزولیوشن پیش کرنے کی کوئی ضرورت نہیں

رزولیوشن نمبر ۵۔ اس رزولیوشن کو صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب نے بہ عبارت ذیل پیش کیا

"اس ایسو-سی-ایشن کی رائے میں ہمارے اولڈبوائز کو ایم-اے-او کالج کے متعلق ایک اولڈ بوائز لاج تعمیر کرانا چاہیئے اور اُس لاج کے مختلف کمرے مولانا بہادر علی مرحوم اور محمد داؤد مرحوم-اور شیخ عبدالرحمن مرحوم کے اسمارسے موسوم کیئے جاویں"۔ مولوی طفیل احمد صاحب نے اس کی تائید کی اور بالاتفاق پاس ہوا۔ مفصلہ ذیل حضرات نے اس لاج کی تعمیر کے لیئے رقوم ذیل دینے کا وعدہ فرمایا۔

(۱) صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب۔ صـ۵ (۲) حبیب اللہ خاں صاحب۔ عـ۵ (۳) طفیل احمد صاحب۔ عـ۵ (۴) زمان مھدی خاں صاحب۔ عـ۵ (۵) سید احسن شاہ صاحب- صہ نقد-

رزولیوشن نمبر۶- زمان مھدی خاں صاحب نے یہ رزولیوشن بہ عبارت ذیل پیش کیا-

"یہ ایسو-سی-ایشن ایم-اے-او کالج میں عربی تعلیم کے بارہ میں نواب محسن الملک بہادر کی مفصلہ ذیل رائے سے کلیتاً اتفاق کرتی ہے-

(۱) ہم ایسی عربی درسگاہ کے علیگڈھ میں قائم ہونے کی ضرورت نہیں دیکھتے جس میں صرف عربی کی تعلیم ہو-یا انگریزی بی-اے سے کم درجہ کی رکھی جاوے- نہ ہم سمجھتے ہیں کہ ایسی درس گاہ کے لیئے کافی طالب علم جمع ہوسکیں گے اور اگر اُسکے لیئے روپیہ قوم سے مانگا جاوے تو اُسے کالج کی ترقی اور یونیورسٹی بنانے کی اصلی تجویز کا بڑا مانع اور مزاحم اور قوت کا منتشر کرنے والا سمجھینگے-

(۲) ہم عربی کی تعلیم کو بحیثیت سکنڈ لنگویج کے اپنے کالج میں ترقی دینا پسند کرتے ہیں اور اُسے ضروری اور مفید سمجھتے ہیں اور اُسکے لیئے ہم مسٹر مارلین کی پہلی تجویز کو کہ "ایک ہندوستانی عالم اور ایک مصری بلایا جائے" پسند اور منظور کرچکے ہیں-

(۳) یورپین عربک پروفیسر کے بلانے کی بالفعل ہم کو استطاعت نہیں ہی- نہ جب تک انگلش ایجوکیشن کے لیئے اور دو یورپین پروفیسر اور قانون کی تعلیم کے لیئے ایک زائد پروفیسر رکھنے کے لیئے ہم مستقل آمدنی پیدا کرلیں-عربی تعلیم کے لیئے کوئی یورپین پروفیسر بلاسکتے یا بلانا پسند کرتے ہیں-

(۴) اگر گورنمنٹ اپنی مہربانی سے ایک یورپین پروفیسر اپنی طرف سے ہمارے کالج کو دے تو ہم نہایت شکر گذاری کے ساتھ منظور کرینگے- بشرطیکہ کسی قسم کی قید و شرط نہ لگائی جاوے اور ایم-اے کلاس کی

تعلیم ہمارے کالج میں صرف عربی پر محدود نہ کیجاے بلکہ دوسرے مضامین کے لیئے بھی ایم۔اے کی تعلیم کا دروازہ کھلا رہے اور عربی شل دیگر مضامین کے اختیاری ہو نہ جبری"۔

اس رزولیوشن کی صاحبزادہ آفتاب احمد خاں نے تائید کی اور نہایت فصاحت سے اس بات کو ثابت کیا کہ اسوقت ہم کسی ایسے طریقہ سے عربی تعلیم کو اپنے کالج میں داخل کرنا نہیں چاہتے جس سے ہماری موجودہ ضروریات پر بُرا اثر پڑے یعنی بالفاظ دیگر جو مغربی علوم وفنون کی تعلیم میں ہارج ہو۔ جہانتک نواب محسن الملک بہادر نے اپنی مذکورہ بالارائے میں عربی کا ہونا مناسب تسلیم کیا ہی۔ ہم سب اُس سے اتفاق کرتے ہیں۔ خواجہ غلام ثقلین صاحب نے بھی اسکی تائید کی اور رزولیوشن کی مفصلہ ذیل عبارت پیش کی جسکو جناب محرک و موئد صاحبان نے منظور کرلیا۔ وہ عبارت یہ ہی

"اس جلسہ کی راے میں نظر بحالات موجودہ مدرسۃ العلوم میں عربی کی تعلیم کو اس طور پر ترقی دینا جس کی وجہ سے انگریزی تعلیم سے توجہ کم ہوجاے یا اُن مدات آمدنی پر اثر پڑے جو اسوقت کالج کے لیئے مکمل رہی ہیں مناسب نہیں ہی۔ اور یہ جلسہ نہایت زور کے ساتھ سفارش کرتا ہی کہ اس معاملہ میں مرحوم سر سید نے جو اُصول مغربی تعلیم کے لیئے اپنے زمانہ میں قائم کیئے تھے اُن میں سر مو فرق نہ ہونا چاہیئے۔ اس جلسہ کے نزدیک بعد تکمیل تعلیم موجودہ مضامین کے سب سے زیادہ ضروری امر مسلمانوں کے لیئے یہ ہی کہ اُن کے لیئے سب سے اعلےٰ درجہ کی سائنٹفک تعلیم کا بندوبست کیا جاوے۔ نیز یہ جلسہ عام طور پر نواب محسن الملک بہادر کی مذکورہ بالارائے کی تائید کرتا ہی یہ رزولیوشن باتفاق راے کل حاضرین منظور ہوا۔

اسکے بعد ممبران نے سال آیندہ کے لیئے صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب کو سکرٹری ایسو۔سی ایشن مقرر کیا اور جلسہ برخاست ہوا۔

## دوسرا جلسہ

اس کے بعد تین بجے سہ پہر کو پرنسپل ہال میں جلسہ منعقد ہوا اور مولوی سخاوت حسین صاحب پریسیڈنٹ قرار پائے۔

نمبر ا۔ شیخ عبداللہ صاحب کی تحریک اور میر ولایت حسین صاحب کی تائید سے یہ منظور ہوا کہ دفتر کے

خرچ اور کلرک کی تنخواہ کے لیئے سکرٹری کو ما (تین سو) سالانہ تک کے خرچ کرنیکا اختیار ہوگا۔

**نمبر ۲۔** شیخ عبداللہ صاحب نے مفصلہ ذیل عبارت میں رزولیوشن پیش کیا۔

"یہ ایسو۔سی۔ایشن اپنے تجربہ اور مشاہدہ سے اس بات کا اقرار کرتی ہو کہ ایم۔اے۔او۔کالج کے طالب علموں کی طرف سے قومی معاملات میں بالعموم اور کالج کے معاملات میں بالخصوص جس دلچسپی اور ہمدردی کی توقع کیجاتی ہو اُسکا عشر عشیر بھی ہم اپنے پرانے طالب علموں میں نہیں پاتے۔ اس ایسو۔سی۔ایشن کو انعامی مضامین باغراض ذیل لکھوانے کیلیئے نوٹس دینا چاہیئے۔ انعامی مضمون میں مفصلہ ذیل امور پر بحث ہونی چاہیئے۔

(۱) کالج کے پرانے طالب علموں کی عدم توجہی اور محدود دلچسپی جو اُنسے قومی معاملات میں بالعموم اور کالج کے معاملات میں بالخصوص بیّن طور پر نمایاں ہی کن وجوہات پر مبنی ہی۔

(۲) اولڈ بوائز ایسو۔سی۔ایشن کو کیا ایسی تدابیر کام میں لانی چاہئیں جنسے اپنے پرانے طالبعلموں کے دلوں میں سچا قومی جوش اور اپنے کالج کے ساتھ پوری ہمدردی اور دلچسپی پیدا ہوسکے۔

(۳) ایم۔اے۔او کالج کے قیام کے زمانہ میں ہر طالب علم پر کس قسم کا اور کس طریقہ سے اثر ڈالا جائے کہ جس سے وہ باتیں جو کالج کے قیام کے زمانہ میں طالب علموں میں پائی جاتی ہیں بعد میں بھی باقی رہ سکیں۔

یہ ایسو۔سی۔ایشن بذریعہ اعلان کے مسلمانوں سے خواہ وہ کالج کے طالب علم ہوں یا غیر طالبعلم مذکورۂ بالا امور پر مضامین طلب کرے اور اُسکے لیئے تین انعام ایک صہ دوسرا صہ اور تیسرا صہ کا مقرر کیا جاوے۔ یہ مضمون سنوٗ صفحے سے زیادہ نہو اور یکم اگست ۱۹۰۲ء تک سکرٹری ایسو۔سی۔ایشن کے پاس پہنچ جاوے۔ ان مضامین میں سے جنکو ایسو۔سی۔ایشن مناسب سمجھے رسالہ کی صورت میں شائع کردے اور اُس کی ایک ایک کاپی ہر اولڈ بوائے کے پاس بھیجی جاوے۔"

زمان مہدی خانصاحب نے اس رزولیوشن کی تائید کی اور بالاتفاق پاس ہوا۔

**نمبر ۳۔** صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب نے مفصلۂ ذیل رزولیوشن پیش کیا اور بالاتفاق منظور ہوا۔ کہ

"اس ایسو۔سی۔ایشن کی خواہش ہے کہ ایسو۔سی۔ایشن کے ممبر سالانہ اجلاس کے موقع پر سال بھر کے عرصہ میں جو کچھ علمی کام اُنھوں نے ایسو۔سی۔ایشن کے مقاصد کی تکمیل میں کیا ہو اُسکی ایک تحریری رپورٹ بذات خود یا بذریعہ سکرٹری ایسو۔سی۔ایشن کے پیش کریں"۔

اسکے بعد ہر اولڈ بوائے موجودہ جلسہ نے اپنے ایم۔اے۔او کالج کی زندگی کے مختصر حالات نہایت دلچسپ پیرایہ میں بیان کیئے۔مسٹر آر۔بی قادری صاحب بیرسٹرایٹ لا نے اپنی زندگی کے حالات کے ضمن میں ایم۔اے۔او کالج ایسو۔سی۔ایشن واقع لنڈن کا بہت وضاحت کے ساتھ تذکرہ کیا۔

مولوی سمیع اللہ صاحب بی۔اے وکیل علیگڈہ نے فرمایا کہ "اگر کوئی علی گڈہ کا باشندہ مدرسۃ العلوم سے بی۔اے پاس کریگا تو وہ اُسکو ایک گولڈ میڈل اپنے پاس سے دیا کرینگے۔امسال شہر کا ایک مسلمان طالب علم بی۔اے کلاس میں پڑہتا ہو وہ اُسکو پاس ہونے پر ایک گولڈ میڈل دینگے۔اور آیندہ بھی جس سال کوئی مسلمان طالب علم بی۔اے پاس ہوگا اسکو گولڈ میڈل دینگے"۔

اسکے بعد جلسہ برخاست ہوا اور کالج کے ٹنیس لان پر اسٹاف کلب کی طرف سے پرانے طالبعلموں کو جن میں ہندو طلبا بھی شامل تھے ایوننگ پارٹی دی گئی۔اور نیز یونین کلب کے سامنے سب کا فوٹو لیا گیا۔ساڑے آٹھ بجے شام کو اسٹریچی ہال میں ڈنر ہوا جس میں کالج کے تمام موجودہ و پرانے طلباء و کالج و اسکول اسٹاف کے ممبر و شہر کے رؤسا اور اکثر ٹرسٹی صاحبان موجودہ علی گڈہ شریک تھے نیز مولوی بدل کریم صاحب پریسیڈنسی مجسٹریٹ کلکتہ و مسٹر صلاح الدین صاحب بیرسٹرایٹ لا خلف الرشید جناب خان بہادر مولوی خدابخش صاحب سابق چیف جسٹس ہائی کورٹ حیدرآباد جو اتفاق سے اس وقت علی گڈہ میں موجود تھے شریک دعوت ہوئے۔مسٹر ماریسن صاحب پرنسپل کالج نے کالج کے پرانے طلبا کا خیرمقدم کیا اور اُن کا جام صحت تجویز کیا اور فرمایا کہ میں اپنے تئیں بہت خوش قسمت سمجھتا ہوں کہ میں ایسے موقع پر کلکتہ سے یہاں آسکا اور اپنے عزیز پرانے طلبا کو دیکھکر بہت خوش ہوا۔ڈاکٹر ضیاءالدین کو جو امسال سر آئزک اسکالرشپ ملا ہے اسکا خصوصیت کیساتھ جناب پرنسپل صاحب نے تذکرہ کیا اور جملہ طلباء سے اپنے ایک عزیز بھائی اور قابل دوست کی کامیابی پر اظہار مسرت کیا۔اسکے بعد خواجہ غلام الثقلین

صاحب نے کالج اور ممبران اسٹاف کا جام صحت تجویز کیا اور مصطفٰے حسین صاحب و زمان مہدی خانصاحب و غلام حسین صاحب نے عمدہ اور مؤثر تقریریں فرمائیں۔ واحد حسین صاحب و آصف زماں صاحب نے نظمیں پڑہیں۔ سب سے اخیر میں جناب نواب محسن الملک بہادر نے قریب ایک گھنٹہ تک ایک ایسی پُرزور اور لاجواب تقریر کی جس سے تمام حاضرین جلسہ محظوظ اور مؤثر ہوئے۔ نواب صاحب نے اپنی تقریر میں اول تو اس بات پر زور دیا کہ گو مسٹر مارلیسن کے نزدیک ہمارے کالج کے اولڈ بوائز پر یہ الزام کہ وہ کالج سے دلچسپی نہیں رکھتے غلط ہی لیکن میرے نزدیک یہ الزام ایک حد تک صحیح و درست ہی اور جو کچھ ایم۔ اے۔ او کالج کے لڑکے کرتے ہیں وہ اسقدر کم ہی کہ نہونے کے برابر ہی۔ دوسری بات نواب صاحب کی تقریر میں نوٹس کے قابل یہ تھی کہ انہوں نے فرمایا کہ ہم لوگوں کا طریقہ کام کرنے کا ویسا ہی ہونا چاہئے جیسا کہ حمایت اسلام لاہور کا ہی۔ ہم اپنی کامیابی کے لیئے دوسروں کے محتاج ہیں اور ہر بات میں دوسروں کا سہارا چاہتے ہیں کہیں گورنمنٹ کی خوشامد کرتے ہیں کہیں کسی والی ریاست کی خوشامد کرتے ہیں کہ ہمکو مالی امداد ملے اور پھر بھی ہمکو بقدر اپنی ضروریات کے مالی امداد نہیں ملتی دیکھئے حمایت اسلام کیطرف کہ اُن لوگوں کو نہ کوئی گرانٹ ملتی ہی نہ اور کسی قسم کی مدد پھر بھی وہ اسوقت نوّے ہزار روپیہ سالانہ کا بجٹ پاس کر چکے ہیں اور یقین ہی کہ وہ اس روپیہ کو اپنی قوم سے چھوٹے چھوٹے چندوں کے ذریعہ سے فراہم کرلیں گے۔ ہم لوگ کاٹھ کی ٹانگوں پر کھڑے ہیں اور وہ اپنی ٹانگوں پر کھڑے ہیں۔ اسکی وجہ صرف یہی ہی کہ وہ لوگ سچے جوش اور سچی قومی ہمدردی کے ساتھ کام کرتے ہیں۔ نواب صاحب نے اپنی اسپیچ میں بھی فرمایا کہ میں افسوس کے ساتھ دیکھتا ہوں کہ ہمارے نئے طلبا میں وہ باتیں بھی نہیں پائی جاتیں جو پُرانے طلبا میں پائی جاتی ہیں۔ غرضیکہ نواب صاحب بہادر کی تقریر مجموعی طور پر نہایت اعلیٰ درجہ کی تھی۔

ابھی ڈنر ختم نہیں ہوا تھا کہ سہارنپور اور مرزاپور سے دو ارجنٹ تار آئے جنسے یہ معلوم ہوا کہ اُن مقامات پر بھی اُسی وقت میں کالج کے اولڈ بوائز ایک جگہہ پر جمع ہو کر شریک جلسہ دعوت ہیں

خاکسار عبداللہ

## ضمیمہ

منجملہ اور مقاصد کے سنڈیکیٹ جو حسب رزولیوشن نمبر ۳ قائم کی گئی اُسکے مفصلہ ذیل پانچ
مقاصد قرار دیئے گئے۔

(۱) طلباء سابق مدرستہ العلوم میں باہمی اتحاد اور قومیت کا خیال پیدا کرنا۔

(۲) مسلمانوں کو کالج کی طرف راغب کرنا اور اُس کی مدد خود کرنا اور قوم کو اُس کی امداد کی طرف
آمادہ کرنا۔

(۳) مسلمانوں میں تعلیم و تہذیب کی اشاعت کو ترقی دینا۔

(۴) علی گڈہ کالج کے طلباء کا معیار زندگی اعلےٰ اور شریفانہ رکھنا۔

(۵) مدرستہ العلوم کو ایک مجوزہ یونیورسٹی بنانے کی مسلسل کوشش جاری رکھنا۔

خاکسار۔ عبداللہ

# رپورٹ آنریری سکرٹری اولڈ بوائز ایسو۔سی۔ایشن

ایم۔اے۔او کالج اولڈ بوائز ایسو۔سی۔ایشن جسکو کالج کے چند سربرآوردہ پرانے طلباء
نے ۱۸۹۸ء میں بعد انتقال سرسید کے قایم کیا تھا آج ہم اُس کی ساتویں سالگرہ کے جلسہ میں جمع
ہوے ہیں۔ اس ایسو۔سی۔ایشن کا مقصد یہہ قرار دیا گیا تھا کہ کالج کے پُرانے طلباء کو اسکے معاملات
اور ترقی کی طرف ہمیشہ متوجہ رکھا جائے۔ اس موقع پر مجھے اس ایسو۔سی۔ایشن کے لیئے یہ کہنا کافی
ہی کہ یہ اب تک زندہ ہی یہ ایسو۔سی۔ایشن کبھی بہت کامیاب جماعت تصور نہیں کی گئی اور اس لاپرائی
اور کم توجہی سے جو کالج کے پرانے طالب علموں کی ایک بڑی تعداد کی طرف سے ظہور میں آرہی ہی اس
بات کا اندیشہ ہی کہ یہہ جماعت نہ کبھی کامیاب ہوگی اور نہ اسکو کسی قسم کی قوت حاصل ہوگی ۱۸۹۹ء
میں جبکہ اس ایسو۔سی۔ایشن کا دوسرا جلسہ منعقد ہوا تھا اسوقت مرحوم سکرٹری ایسو۔سی۔ایشن
مولوی بہادر علی صاحب نے جن کی وفات حسرت آیات نے ایسو۔سی۔ایشن کو اسقدر صدمہ اور ہم

سب لوگوں کو کمال درجہ رنج دیا ہی انہوں نے کالج کے پرانے طلبار کی دلچسپی کا مفصلہ ذیل الفاظ میں ذکر کیا تھا وہ الفاظ یہ ہیں "ایک ہزار جوابی کارڈ ان حضرات کے نام بھیجے گئے جنہوں نے کالج میں تعلیم پائی ہی یا جنکو کالج کے جلسوں سے دلچسپی ہی بجواب ان خطوط کے صرف ۴۰۹ صاحبوں نے دو حرفی جواب لکھنے کی تکلیف گوارا کی۔ ۱۰۰ صاحبوں نے بوجہ اشتغال امور متعلقہ کے عدیم الفرصتی کا اظہار کیا۔ ۸۳ صاحبوں نے آنے کا قصد ظاہر فرمایا۔ ۲۶ صاحبوں میں سے بعض نے اپنے آنیکی نسبت تذبذب ظاہر کیا اور بعض نے تعجب سے چند سوالات کئے۔ باقی ۱۴۰ صاحبوں نے دو حرفی جواب تک دینے کی تکلیف گوارا نہ کی۔ صرف اصحاب ذیل نے قدم رنجہ فرماکر اس جلسہ میں شرکت کی اور ایسوسی ایشن کو مرہون منت کیا۔

(۱) مسٹر سید شوکت علی بی۔ اے۔ (۲) مسٹر سید رضا علی بی۔ اے۔ (۳) مولوی سجاد حسین صاحب بی۔ اے۔ (۴) مولوی سید طفیل احمد صاحب۔ (۵) محمد حبیب اللہ خاں صاحب بی۔ اے۔ (۶) سید ابو طالب صاحب بی۔ اے۔ ایل ایل بی۔ (۷) چودھری خوشی محمد خاں صاحب بی۔ اے۔ (۸) افتخار عالم صاحب۔ (۹) مخدوم عالم صاحب۔ (۱۰) عبد الکریم خاں صاحب۔ (۱۱) سید شبیر حسین صاحب (۱۲) میرزا عطا حسین صاحب۔ (۱۳) صفی اللہ صاحب۔ (۱۴) سید اکرام علی صاحب۔ (۱۵) وجیہ الدین حیدر صاحب۔ (۱۶) ابوبکر خاں صاحب۔ (۱۷) غلام محمد خاں صاحب۔ (۱۸) محمد اختر صاحب (۱۹) شمس الحسن صاحب۔ (۲۰) محمد صالح خاں صاحب۔ (۲۱) سید علی ضامن صاحب۔ (۲۲) عبد الحمید صاحب (۲۳) سعادت علیخاں صاحب۔

اس مقام پر یہ سوال پیدا ہوتا ہی کہ جب اسقدر کوشش منجانب طلبار موجودہ و ممبران اسٹاف کیجاوے اور ایک ہزار سے زیادہ خطوط دعوت بھیجے جائیں۔ تو کیا وجہ ہی کہ ہماری کامیابی صرف دو فیصدی ہو۔ یعنی منجملہ ایک ہزار کے صرف بیس یا بائیس طلبار سابق دعوت کو قبول کریں اور شریک جلسہ ہوں کیا امتداد زمانہ نے ہمارے طالب علموں کے دلوں سے کالج کی محبت اور ہمدردی کا جوش محو کر دیا ہی۔ یہ امر بالکل قدرتی ہی کہ اکثر صاحبوں کو فاصلہ دور دراز سے آنے کی فرصت نہ ملے اور ایسی صورتمیں معذور

کا جواب آوے مگر یہ خیال نہایت تکلیف دہ ہی کہ وہ برتاؤ جو معمولی طور پر ہر ادنی و اعلی سے مرعی کہا جاتا ہی یعنی یہ کہ جواب خط کا دیا جاوے۔ وہ بھی اس صورت میں اکثر صاحبوں نے ترک کر دیا اور جبکہ بغرض سہولیت کے جوابی کارڈ بھی خط دعوت کے ساتھ لگا ہوا ہو اور نواب محسن الملک بہادر سکرٹری کالج ٹرسٹیان کی طرف سے شائع کیا گیا ہو۔ تو ایسی صورت میں بجز اسکے کہ کالج سے محبت اور قومی ہمدردی ایسے طلباء سابق کے دلوں میں بجھ گئی ہو۔ اور کیا نتیجہ نکل سکتا ہی۔ یہ بھی ظاہر ہی کہ جو اضلاع کہ مقام علی گڈہ سے بہت قریب ہیں اور وہاں پر اکثر طلباء سابق موجود ہیں انکے لئے عذر درازی فاصلہ کا نہیں ہو سکتا۔ اور چونکہ زمانہ تعطیلات کا تھا۔ یہ عذر کہ بوجہ امور متعلقہ سررشتہ ہاے سرکاری کے عدیم الفرصتی مانع تھی۔ ناقابل سموع ہی۔ عدم شرکت و عدم التفات کے وجوہات جو کچھ ہوں۔ اس سے یہ ضرور ظاہر ہی کہ اولڈ بوائز ایسو سی ایشن کو اپنے ممبروں سے کام لینے اور اپنے کامیاب ہونے کے لئے سخت کوشش کرنی ہی۔ اور جو ممبر کہ محبت کالج سے خالی ہو گئے ہیں اُن کو رفتہ رفتہ پھر کالج کی طرف متوجہ کرنا ہی

ہمارے مرحوم سکرٹری اسکے بعد اپنی زندگی میں ہر جلسہ میں اپنے دوستوں کی عدم توجہی کی وہ ہی پرانی حکایت بیان کرنے پر مجبور ہوئے اور مجھے اب انکے بعد اُس حکایت میں کمی بیشی کی کچھ گنجایش نہیں معلوم ہوتی تعداد حاضرین جلسہ جو کچھ سنہ ۹۹ء میں تھی اُس میں کوئی اضافہ نہیں ہوا وہی بزرگان جو سنہ ۹۹ء میں جلسہ میں تشریف لائے تھے وہ اسوقت بھی میرے سامنے موجود ہیں اور وہی ہر جلسہ میں ہمیشہ تشریف لاتے رہے ہیں ان تمام وجوہات سے یہ بات مترشح ہوتی ہی کہ ہمارے پرانے طالب علم ایسو سی ایشن کو ایک مستقل اور با اثر اور کامیاب جماعت بنانے کے لیئے آمادہ اور مستعد نہیں ہیں یا بالفاظ دیگر یوں کہنا چاہیئے کہ اکثر ہمارے پرانے طلباء کو کالج سے حقیقی دلچسپی اور محبت نہیں ہی۔ یہ ایک نہایت بڑا سخت الزام ہی ایک ایسے گروہ طالب علموں کے ذمہ جو اسوقت تک تمام ہندوستان کے کالج کے طالب علموں میں اس بات کی شہرت اور امتیاز رکھتے ہیں کہ انکو اُس درسگاہ سے جس میں انہوں نے تعلیم و تربیت پائی ہی نہایت سچی فرزندانہ محبت ہی۔ اس الزام کو عائد کرنے میں مجھے نہایت سخت تکلیف ہوتی ہی لیکن جو امر واقعی ہی اُس کے بیان کیئے بغیر رہ بھی نہیں سکتا اور نہ امر واقعی کے چھپانے سے کوئی خاص نفع متصور ہو سکتا ہی بلکہ جہانتک

ممکن ہو سکے ہمکو اپنے نقائص سے مطلع ہو کر ان کی اصلاح کرنی چاہیئے یہ الزام ایسا نہیں ہی کہ جسکے لیئے ہمارے کالج کے پُرانے طلباء تلافی نکر سکیں۔ تلافی کرنا اُنکے ہاتھ میں ہی اگر وہ چاہیں تو آج سب کے خیالات کو اپنی طرف سے عمدہ ثابت کر سکتے ہیں اور اپنے عزیز کالج کے ساتھ سچی ہمدردی اور محبت کے اظہار سے اس بات کو ثابت کر سکتے ہیں کہ جو کچھ ہماری نسبت عام لوگوں میں شہرت ہی وہ غلط اور بے بنیاد نہیں بلکہ اصلی واقعہ پر مبنی ہی لیکن یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہی کہ الزام مذکورہ بالا کے رفع کرنے کے لیئے اخبارات میں عمدہ اور جوشیلے مضامین لکھنے کی ضرورت نہیں اور نہ ایسے مضامین کی بنا پر خیالات میں کوئی تغیر پیدا ہو سکتا ہی اپنے عمل اور کام سے اس بات کو دکھانا لازمی ہی کہ ہمارے پُرانے طالب علموں کی نسبت جو عدم توجہی وکمی دلچسپی کا الزام لگایا جاتا ہی وہ بے اصل ہی۔

اس موقع پر مجھے اپنے کالج کے پُرانے طلباء کی نسبت ایک اور بات کے عرض کرنے کی بھی ضرورت معلوم ہوتی ہی اور وہ یہ ہی کہ جو طالب علم ڈیوٹی ڈیپوٹیشن کے متعلق سالانہ دورہ کرنے کی غرض سے مختلف شہروں اور قصبات میں جاتے ہیں وہ گو عام مسلمان کمیونٹی کی ہمدردی اور مدد کے مدّاح اور ممنون ہیں لیکن اکثر پُرانے طالب علموں کی سرد مہری کے شاکی ہیں یہ بات ڈیوٹی کے سرونٹس کے کان تک پہنچائی گئی ہی کہ بعض کالج کے پُرانے طالب علم کالج کی طرف سے لوگوں میں بدظنی پیدا کرنے کی بھی کوشش کرتے ہیں اور مختلف قسم کے الزامات کالج کے منتظمین اور انتظام پر لگاتے ہیں ایسے لوگوں سے کوئی وجہ نہیں کہ کالج فوراً اپنا تعلق قطع کیوں نکرے اور اُنکو اپنی فرزندی کے اعزاز سے محروم کیوں نہ کردے اور ایسو سی ایشن کو چاہیئے کہ متفق الرائے ایسے اشخاص کے حق میں نعرہ نفرین بلند کرے۔

اب ہمکو دیکھنا یہ ہی کہ ہم اس کالج کے لیئے کیا کر سکتے ہیں۔ ایسو سی ایشن نے اب تک بہت سے رزولیوشن پاس کیئے ہیں اگر اُنکی تعمیل ہمارے اولڈ بوائز کر سکیں تو وہی کالج کی خدمت متصوّر ہو سکتی ہی لیکن افسوس سے دیکھا جاتا ہی کہ کسی رزولیوشن کی پوری تعمیل اور پابندی نہیں کی گئی۔ آپ صاحب جانتے ہیں کہ ہندوستان میں چھ کروڑ مسلمان آباد ہیں منجملہ اُنکے اگر ہزار دو ہزار آدمی اس کالج میں تعلیم پاکر اپنے اپنے پیٹ پالنے کی فکر میں مصروف ہو جاویں اور اپنے دیگر ہم قوم لوگوں کا کچھ خیال نکریں تو ایسی حالت میں ہم اُس کالج کو ایک قومی ترقی

اور بہبودی کا ذریعہ تصور نہیں کر سکتے کیونکہ صرف ہزار دو ہزار آدمیوں کی حالت اچھی ہو جانے سے قومی ترقی یا تنزلی اور سرسبزی یا بیحالی پر کچھ بھی قابل لحاظ اثر نہیں پڑ سکتا۔ ایسی حالتیں مسلمانان ہند کو ایم۔اے۔او کالج کو اپنی قومی ترقی کا آلہ سمجھنے کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی۔ سر سید نے جب اس کالج کو قائم کیا تھا تو وہ اس بات کو جانتے تھے کہ میں ایک کالج میں چھ کروڑ مسلمانوں کو کسی حالت میں تعلیم نہیں دے سکتا۔ لیکن وہ اسکے ساتھ ہی یہ توقع رکھتے تھے جسکو انہوں نے بارہا اپنی تقریروں میں ظاہر کیا تھا کہ اس کالج کا ایک ایک طالب علم قومی کشتی کا ناخدا بنیگا اور اس طور پر قومی جہاز جو بھنور میں پھنس گیا ہے اسکو سب ملکر کنارہ تک پہنچا دینگے۔

میں افسوس سے اس بات کا ذکر کرنا چاہتا ہوں کہ باوجودیکہ اسوقت ہمارے طالب علموں میں سے ججی۔ ڈپٹی کلکٹری۔ منصفی۔ تحصیلداری کے عہدوں پر بکثرت آدمی پائے جاتے ہیں لیکن سچا قومی جوش جو سر سید اور انکے چند احباب کے دل میں موجزن تھا اسکا شمہ بھی کسی کے دل میں نہیں پایا جاتا۔ قومی کاموں میں مختلف طریقوں سے امداد پہنچائی جا سکتی ہے اگر کسی کے پاس روپیہ ہو تو روپیہ سے امداد کرے اور اگر کسیکو فرصت ہو تو وہ اپنا وقت دے اگر کوئی اپنی زبان یا اپنے قلم سے دوسروں پر اثر ڈال سکتا ہو تو اپنی زبان اور قلم سے دوسروں پر اثر ڈالے لیکن شرط یہ ہے کہ سب کام نہایت خلوص اور سچی قومی ہمدردی سے ہونے چاہئیں۔ اکثر مقامات پر ہمارے کالج کے سرآوردہ طالب علم مستقل طور پر یا عارضی طور پر مقیم ہیں اور وہ ایسی حالتیں ہیں کہ اگر چاہیں تو مسلمانوں کی مقامی حالت کو درست کرنیمیں بہت کچھ مدد دیسکتے ہیں کالج کے لیئے بیشمار دوست پیدا کر سکتے ہیں عام طور پر مسلمانوں کو زمانہ کی رفتار پر چلنے کے لیئے متوجہ کر سکتے ہیں لیکن ابتک ہم نے بانی کالج کی امیدوں کو اس بارے میں پورا نہیں کیا مجھے امید ہے کہ آیندہ ہمارے کالج کے پرانے طالب علم کسی سکرٹری ایسو۔سی۔ایشن کو ایسی مایوسانہ رپورٹ پڑھنے کا موقع نہ دینگے۔

گذشتہ سال کی کارروائی کے متعلق مجھے کچھ بہت زیادہ عرض کرنا نہیں ہے جسقدر رزولیوشن پاس ہوے انمیں سے کسی پر عمل نہیں ہوا۔ ایک فیصدی چندہ جسکی تجویز ایک عرصہ سے ہمارے کالج کے طالب علموں کے سامنے درپیش تھی اور جسکی عملی تدبیر حسب رزولیوشن ایسو۔سی۔ایشن ہذا مولوی بہادر علی مرحوم نے یہ کی تھی کہ جو پرانے طلبا رضامندی ظاہر کرتے تھے انکو ہر مہینہ کی یکم تاریخ کو چھپے ہوئے پوسٹ کارڈ بذریعہ ویلیوپے ایبل

پارسل کے بھیجکر چندہ وصول کر لیتے تھے۔ سالگذشتہ میں اس طریقہ سے قریب نوسو روپیہ کے جمع ہوا اور اسوقت بلیں مائیں پرانے طلبا سے زیادہ اس مد میں چندہ نہیں دیتے بعض صاحبان اسقدر مہربانی فرماتے ہیں کہ اول اپنی رضامندی ظاہر فرماکر پھر ویلیو پے ایبل کو واپس کر دیتے ہیں۔ دفتر سے مولوی بہادر علی مرحوم کے انتقال کے بعد بہت سے خطوط جاری کیئے گئے اور اپنے پرانے طلبا سے جو چندہ نہیں دیتے تھے دریافت کیا گیا کہ اگر وہ بہ تعمیل رزولیوشن ایسو۔ سی۔ ایشن ہذا کے اپنا ایک فیصدی دینا پسند فرماویں تو انکو پوسٹ کارڈ بھیجے جاویں۔ قریب پونے دو سو کے ایسے خطوط جاری ہوئے۔ صرف پانچ صاحبان نے رضامندی بذریعہ اپنے خطوط کے ظاہر کی اور باقیوں نے جواب نہیں دیا۔ ایک فیصدی چندہ کی نسبت بعض بزرگوں کی رائے ہی کہ یہ ایک نامناسب ٹیکس ہی جو کالج کی طرف سے لوگوں کے دلوں میں کشیدگی پیدا کرتا ہی۔

آپ صاحبان اس جلسہ یا کسی آیندہ جلسہ میں اس رزولیوشن پر نظر ثانی فرماکر اپنی رائے ظاہر فرماویں کہ اسکو قایم رکھا جاوے یا نہیں اور اگر قائم رکھا جاوے تو اسپر عمل کرنے کی سب سے بہتر کیا تدبیر ہو سکتی ہی ایک تدبیر جو سب سے مفید تھی یعنی سرکاری عہدہ داروں کی تنخواہ میں سے ایک فیصدی کٹکر خزانہ سرکار میں جمع ہونا وہ سرکار سے نامنظور ہو چکی ہی اور اب ہمکو اس بارہ میں تحریک کرنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ منجملہ ہزار ڈیڑھ ہزار طالب علموں کے اگر بیس مائیں نے ایک فیصدی دے بھی دیا تو اُس سے کوئی مفید نتیجہ نہیں نکل سکتا اور اُس میں سے بہت سا روپیہ دفتر کے اخراجات کے لیئے صرف ہو جاتا ہی اور بعد صرف ضروری کے بہت ہی قلیل رقم کالج کی امداد کے لیئے بچتی ہی۔

یہ سال جو آج اس سالانہ اجلاس پر ختم ہوتا ہی ایک حیثیت سے اس ایسو۔ سی۔ ایشن کے لیئے بہت ہی نامبارک ثابت ہوا ہی۔ اس سال ایسو۔ سی۔ ایشن کو ایک اسقدر بڑا صدمہ پہنچا ہی جس کی تلافی اب ناممکن معلوم ہوتی ہی مولانا بہادر علی مرحوم جو اس ایسو۔ سی۔ ایشن کے محض چلانے والے ہی نہیں بلکہ منجملہ اُسکے اصلی بانیوں کے ایک شخص تھے انکا ماہ ستمبر گذشتہ میں بمقتضائے الٰہی انتقال ہو گیا اور ہماری قوم کو بالعموم اور ہمارے کالج اور اس ایسو۔ سی۔ ایشن کو بالخصوص جو کچھ اُمیدیں ایک ایسے پر جوش سچے ہمدرد شخص سے وابستہ تھیں وہ سب یک قلم منقطع ہو گئیں اب ہم بجز اسکے کہ دست افسوس ملیں اور کچھ چارہ نہیں +

# ممیرا اور سچے موتیوں کا سفید سرمہ

جسکی جانچ اور تصدیق جناب نامی گرامی ڈاکٹر ڈبلیو ار کرانیٹر صاحب بہادر ایف۔ سی۔ ایس۔ ایل۔ آر۔ ایس۔ ایم فیلو آف دی انسٹیٹیوٹ آف کیمسٹری لندن نے کی اور معزز ڈاکٹروں اسسٹنٹ سرجن و ہسپتال اسسٹنٹ و نوابوں راجاؤں کے حکیموں اور گورنمنٹ کے معزز اور اعلی عہدہ داروں اور بڑے بڑے تعلقہ داروں اور انگریزی تعلیم یافتہ گریجوایٹوں کے سارٹیفکٹ بکثرت موجود ہیں جنکو بوقت فرمایش ہم خود بھیجینگے۔

ہم نے عمدہ اور خالص **ممیرہ** بڑی تلاش سے ہندوستان کے باہر سے منگوایا ہی

## ہمارے سرمہ کا امتحان اور اسمیں جلد کامیابی

پہلے آپ اپنی آنکھ کی نگاہ **ناپ** لیجیئے اُسکے بعد ہمارا سرمہ لگائیے دو ہفتہ میں آپ کی آنکھ کی روشنی بہت بڑھجائیگی اور آپ پر ثابت ہوجائیگا کہ اس تھوڑے عرصہ میں اس سرمہ نے کیا کیا فائدہ بخشا اور کسقدر نقصان دور کیئے

## ہمارے سرمہ کے فائدے

(۱) آنکھ کے جملہ امراض کو اکسیر ہی اور ہر طرح سے حافظ صحت چشم ہی (۲) کچھ دنوں متواتر لگانیسے عینک کی ضرورت نہیں رہتی (۳) آنکھ کی روشنی بہت بڑھتی ہی اور ضعف بینائی بہت جلد دفع کرتا ہی (۴) آنکھوں کا میل خوب صاف کرتا ہی جس سے آنکھ کی بیماریاں جلد دور ہوجاتی ہیں (۵) کمزور آنکھ کو بہت قوت دیتا ہی (۶) دہند (۷) غبار (۸) پانی و آنسو کا بہنا و ڈہلکہ (۹) سرخی (۱۰) سوزش (۱۱) کھجلی (۱۲) گوہانجی اور سبل (۱۳) آنکھوں کے سامنے کی تاریکی کو بہت جلد رفع کرتا ہی (۱۴) بہت لکھنے پڑھنے سے جو آنکھوں میں تکان اور درد ہونے لگتا ہی اُسکے لیئے نہایت مفید ہی (۱۵) جو لوگ **سوئی** میں تاگا نہیں ڈال سکتے وہ بہت جلد اپنا کام کرنے کے لائق ہوجاتے ہیں (۱۶) ناخونہ (۱۷) پربال (۱۸) جالا (۱۹) پھلی (۲۰) اور ابتدائی حالت موتیابند کو بھی مفید ہی طالب علموں و نوجوانوں و بڈہوں و عورتوں کو یکساں فائدہ دیتا ہی۔ **قیمت سفید سرمہ** فی تولہ تین روپیہ۔ **سیاہ سرمہ** بھی اسی قیمت کو ملتا ہی۔ محصولڈاک ذمہ خریدار ہی ایک روپیہ سے کم کی فرمایش کی تعمیل نہیں ہوتی ہی۔ آپ اپنا نام و پتہ و نام ڈاکخانہ بہت صاف لکھکر بھیجدیجیے۔ بذریعہ ویلوپی ایبل طلب کریجیئے۔ (نوٹ) وقت فرمایش نام اخبار بھی ضرور تحریر کیجیئے۔

المشتہر

**رام سرن نگم۔ کانپور نیا چوک**

SHAFI.—(rising and laughing,) yes, and meantime, what is our destiny ? (They adjourn to the Club.)

SHAFI.

——:o:——

## Correspondence.

——:o:——

To The EDITOR,

Aligarh Monthly.

Sir,

It seems to me that some fitting memorial of the work done by Mr Arnold should be set up in the College to serve as a reminder to future generations of the affection and esteem in which he is held As the Old Boys who know Mr. Arnold best, get separated from the College by distance, time and circumstances, their influence over the present boys must of necessity diminish ; and every generation needs to remind itself and is benefitted by continually reminding itself of the good men and true who belong to its past. Though, as yet we hardly count Mr Arnold altogether among the past, we would keep his memory fresh among us, and I would suggest a fund being started and some fitting memorial decided on.

I am Sir,

Yours etc,

P A.

[A very fitting idea Why not find out how much it would cost to get a good artist to paint Mr Arnold's portrait, for the Strachey Hall? Or a very useful memorial would be a good well for drinking water only, pucca, with masonry top and ornamental covering, and a good pump Such a well, in a good position, and of good design and workmanship would indeed be a beautiful memorial.—Ed.]

with the world. Our own incompetency is our great enemy It is a pity that we have been learning English so long with such disappointing results. We can't write a short letter in correct English. In speaking even, how often do we say. "Yes Sir" when we ought to say "No Sir"?

SHAFI.—If we are born dunces, surely we are not to blame.

RAFI.—Don't talk nonsense, man. Let us be practical. Are you engaged in any useful work now-a-days?

SHAFI.—No The thought of my being unemployed torments me It is a great interruption to my studies. As soon as I take up a book I become absent-minded. Any attempts to write articles and essays always end in failure

RAFI.—My case is the same. We are brothers in adversity. We both belong to that distinguished class of persons whom Mr. Raleigh has been pleased to call "Discontented B A's"

SHAFI.—Let us drop the subject? Let us talk of pleasant things. Have you finished "Thelma"?

RAFI.—Yes, I have. And "Lady Rose's Daughter" is the novel I am now reading. The style is pleasing and the plot is lovely

SHAFI.—Novel reading has a great fascination for me.

RAFI.—Indeed, it is mental luxury But the brain becomes unfit for hard and solid study. You went to the Club, you said? Any exciting telegram in the "Pioneer"?

SHAFI.—Oh yes! I forgot to tell you before Mr. Chamberlain has resigned his office.

RAFI.—Mr. Chamberlain resigned his office! It is startling news indeed.

SHAFI.—Let us see what view the papers take of the situation.

RAFI.—In my opinion he is destined to be prime Minister one day.

idea is that if we had acquired some useful branch of knowledge, we would not have been left in the lurch.

SHAFI.—Inded, we were great fools in the days when we read the "Idea of a University," believing that a liberal education was its own end We were quite deceived by the eloquence of Newman

RAFI.—But, Shafi, you know we are still young Why should we not take time by the forelock and acquire some useful education? To what profession are you naturally inclined? What profession do you think yourself fit for?

SHAFI.—To tell the truth, I am fit for nothing I cannot take to Engineering, you know I am terribly weak in mathematics I love journalism, but the difficulty is that it does not pay; and what is more, I cannot write correct English. Not being a scheming, intriguing fellow I don't thing I am meant for the law. I tried medicine you know, but I could not bear the sight of a dead body, to approach and dissect it was more horrible to me than death. In the Anatomical Hall, when the Students were learning the description of the Bones, I would murmer to myself:—" Now get you to my lady's chamber and tell her, Let her paint an inch thick, to this favour must she come, and moralise like Hamlet on the vanity of human glory.

RAFI.—This philosophising, I am sure, won't help you to secure employment Be wordly if you want to get on in the world.

SHAFI.—"But who would bear the whips and scorns of time, the oppressor's wrongs, the proud man's contumely, the law's delay, the insolence of office and the spurns, that patient merit of the unworthy takes, who would fardles bear, to sweat and groan under a weary life?"

RAFI.—Don't be so hard upon the world It is not so cruel to those who are clever and efficient among us. To them life is a thing of beauty and joy. It is only a muddle-headed lot of B. A's who are dissatisfied

"The fault is in yourselves, ye noblemen's sons and therefore ye deserve the greater blame, that commonly the meanest men's children come to be the wiser counsellors and greatest doers of the weighty affairs of this realm." So there is no doubt that the English schools were laying a good foundation, in the years between 1300 and 1500, and it was the Schools, not the Universities, that produced that rich crop of "doers of weighty affairs" in the spacious days of Queen Elizabeth.

J. R. C.

*( To be continued.)*

——:o:——

## Discontented B A's.

——:o.——

### A DIALOGUE.

RAFI.—(One of them, sitting alone in his room, a book lying open before him.) It took me fifteen long years to pass my B A Examination They were years of hard work and patient study, but all my labour has ended in smoke. The passing of the examination has not stood me in good stead. I cannot get Government employment, and besides—(Enter Shafi, another of them). Hullo! Shafi! You are coming from the Club, arén't you? You look terribly dejected. What is the matter?

SHAFI.—How can I help looking deected? I went to the College, to have a look at the Employment Agency Notice Board, but I was disappointed. Then I went to the Club and read very carefully each and every line of the Columns of "Wanted" in the papers; but dear Rafi, I am very, very sorry to say that nurses, Governesses, Khansahams and even dogs and plants are wanted, but we poor unfortunate B. A's. are not.

RAFI.—Why, yes! Nurses, governesses and so on are wanted because they are useful in their own ways; but as we are simple B. A's. we are good-for-nothing. My

ed their Colleges at Oxford or Cambridge, nor can it have been by any accident that they did so, while they put the schools in the towns, to which they themselves belonged.

A teacher of "Grammar Learning" came and settled in a litte town called Rotherham about 1430. This was the course of work there Grammar, Poetry, Rhetoric, Music, Writing and Arithmetic One of the pupils of this school became Lord Chancellor in 1474. In some places the Parish Priest was ordered to teach the children of his township and one rate of pay was we find "£10 a year for a clerk cunning in grammer." Nottingham have had a school since 1382 where a boy's education cost 8 pence a term. In one school—and we may infer that others were similarly provided—the hours of work were from 7 a m till 11 a. m and from 1 p. m. till 5 p. m. One half-day's holiday came in each week and there were ten days for holiday at Easter It was ordered that all conversation should be in Latin, and the Founder also prescribed. "I will that all my scholars shall at their "first Entrance into my school give 2 pence to a poore "scholler appointed by the Master, to keepe the schoole "cleane and to provide Rods" This last idea—a kind of medieval Caution money!—was probably due to the dearness of cane in those days. Birch-rods and not cane, were used until sugar became cheap, after which the cane held sway for many generations, till in our own times, so report says, the birch is coming back into favour. Certainly in those rougher days the rod was not spared, nor was its severity confined to the smaller schools Some lines written about 1500, say

> From Paul s I went to Eton, sent
> To learn straightways the Latin phrase,
> Where fifty-three stripes given to me,
> At once I had

It is to be noticed that many schools were looked on as feeders to the royal foundation at Eton; and at first the majority of the boys at Eton were not of the great and aristocratic families but sons of the more ambitious Middle Class English The great families kept aloof from book-learning, and despised "poore schollers" Comparing the capabilities of the nobles and Middle Classes Ascham spoke very plainly;

shines clearly all the time, the sense of the average Man who knows what he wants and is steadfast to follow it up.

The fathers of the Early English Church recognised that the training of the youth was one of the first steps to be taken in furthering the cause of their preaching. Each monastery that was founded became more or less a centre of learning We know of the Venerable Bede the father of English Prose, and an Archbishop of Canterbury is found writing a Latin Grammar Alfred the Great, we know, was full of zeal for Education his ideal was that every Englishman should be able to read his Bible in his mother tongue. So even in those half-barbarous times there was many a studious monk, translating and copying and thinking, and many a youth turned from the turmoil of the world to the peaceful shelter of the monastery. But there were no regular schools nor any demand for them

Book-learning did not pay nor did kings and governments, as a rule, in those rough times want scholars and penmen. The first colleges that grew up at Oxford and Cambridge were simply monastic institutions, for the few not for the many, and from these and other similar homes of learning came, such supply of ecclesiastics as was wanted Later on by the time of Edward III a change had come over the nation, in which now the Baron and the Knight were not the only important elements. The townsman, the merchantman, was growing richer, and the yeoman class too in the Shires, the class that had beaten the French Knights at Crecy and Poictiers, was flourishing on the profits of the growing wool-trade It was these men who now turned their attention to getting their sons educated It was they who saw that a litte book-learning would give their children a better start in life than they themselves had received ; and it must be owned, their object was a worldly one : they wanted to *get on*; so that up and down the land there sprang up schools, " guilds for young scholars " as they were often called ; and frequently the founders of Colleges at Oxford and Cambridge also started Schools in the country towns. Thus the public school at Winchester is connected with New College, Oxford ; Eton and King's Cambridge are similarly linked, and an old school at Ashburton owes its existence to the founder of Exeter, Oxford. And there are others, most of the founders of which were Bishops, who were also Statesmen and Kings' ministers—heads of the only class in the country that had, as yet,, paid any attention to learning at all. It is noticeable they group-

a large number of the small institutions are disaffiliated, the immediate and inevitable result will be to impair the efficiency of the good Colleges. Everyone of our big Colleges has already more pupils than its staff is able to cope with, and every one of them would be thrown into a state of disorganisation if large drafts of students from disaffiliated Coleges were added to the present number

But although I may not see eye to eye with the Government as to the future developments of their educational policy, I cordially support that policy in so far as it is defined in this Bill; and as the head of a private College which owes much to the sympathy and co operation of Government servants, I wish to express my regret at the acrimonious recrimination of Government, which has been imported into the discussion of University questions The abuse of Government is part, sometimes indeed the whole, of the equipment of Congress politicians · but the large and earnest body of Indians, who believe that education is the supreme need of their countrymen and who are labouring with unselfish devotion to diffuse its benefits will deplore the thoughtless language which is tending to alienate the symspathies of the official class from education '

—— o:——

## Old English Schools

——·o· ——

For those who here in the East are eagerly seeking after the way of Progress, it cannot be amiss to dwell upon some points in the early history of Education in England, and therefrom, if any man craves after hasty reform and sweeping measures, may be learnt a lesson in patience, and a knowledge that Time must shape his own ends at his own pace, and that Progress must occur quietly and unostentatiously rather than be heralded as a newcomer of gorgeous importance

England's history on the subject of Education is good for example and precept, not that any measure of perfection has yet been attained —far from it, is not the voice of the Passive Resister loud in the land ? but because amid the clouds of tyranny, bigotry and error, that dim the skies of the Past, the sound common sense of the English Middle Class

encouragement. Outside the Presidency towns, the Collector is still a great social power, and when I see the waste of money by which local *rajas* attempt to toady themselves into his favour, I cannot help being indignant at the officer who refrains from diverting this expenditure into fruitful channels. I should like to see the Commissioner co-operating openly and actively with the local governing body in bringing the Colleges in his division up to a higher pitch of efficiency. We all know that the best way to collect money for any public object is to get the Commissioner or Collector to take the chair at a meeting and public opinion would very strongly support any Government servant who used his official position to collect subscriptions for education. As the logical development of the policy indicated by this Bill, I ask the Government, in the first place, to rescind all existing circulars which forbid Government officers to take part in any public meeting in aid of a private College, and, in the second place, to recognise publicly that the founder or benefactor of any affiliated College has rendered a public service which the State will not be slow to honour. If the Government would give effect to this policy, the aided and unaided Colleges would not long remain inefficient, and now that affiliation and disaffiliation are the direct act of Government, I can see no reason for maintaining the old attitude of official indifference.

" I have got one more suggestion to offer regarding the policy to be pursued under this Act If the Government is not prepared to assist private Colleges by official countenance, then I beg to protest against any attempt at improving University education by the barren process of disaffiliating the inferior Colleges Even granting that the minor Colleges are very imperfect, I strongly deprecate anything like a general suppression of them. It is a curious mistake to hold, as some people do, that the existence of bad Colleges vitiates our whole University system . for , as a matter of fact, these Colleges hurt none but their own pupils ; no other College is prevented from doing good work by the fact that they are unsatisfactory ; the real need of our Indian Universities is not fewer bad Colleges, but more good ones, or to put the matter more accurately, it is the badness of our good Colleges and not the badness of the bad ones which is the capital defect of our educational system ; and consequently by far the most important problem for us to solve is how to find money for more teachers and libraries and better laboratory equipment in our big Colleges But if in pursuance of a mistaken policy

officers results, in practice, in depriving the deliberation of the Senate of any real value; the Senate becomes a chamber for registering the opinions of the Director of Public Instruction, mechanically worked through by the departmental vote; the eminent scholars and experienced educationalists in Government service are precluded from contributing anything of value to the debate; the Senate arrives at a foregone conclusion in order to take from the Director of Public Instruction the odium of an unwise or unpopular measure.

"The second point on which I would ask the Government to amplify the policy indicated in their Resolution is directly connected with the section of the Bill which deals with affiliation and disaffiliation. As soon as this provision becomes law, I submit that the Government will have undertaken a new responsibility with regard to aided and independent Colleges, and I venture to ask them to adopt a policy with regard to these institutions which seems to me to be a logical corollary from this section. As affiliation and disaffiliation are in future to be acts of Government, it follows that every institution which continues to be affiliated has the approbation of Government. I admit that as long as affiliation and disaffiliation were the acts of the University, it was open to an officer to doubt whether a local institution was approved of by Government or not, but that doubt is now resolved. If the Government has not disaffiliated a College, the Government presumably approves of it and desires that it should be as efficient as possible. Now what all Colleges, Government aided or unaided, want is more money, the heads and managers everywhere recognise their deficiencies in the matter of buildings, staff, library and laboratory equipment, but are helpless to remedy them for want of money. I, therefore, ask the Government expressly to permit their officers to give local bodies their countenance and assistance in raising funds for education. I wish that Government would go even further and inform local officers that they are expected to render such help to Schools and Colleges in their neighbourhood. It is right that Colleges, which are founded for the good of particular communities or a particular area, should be compelled to depend mainly upon their own exertions for finding the necessary funds, and I think that institutions which are thus founded and controlled by the people themselves have a particular virtue in infusing public spirit in their students; but none of these movements are yet strong, and Government should aid the weak beginnings by judicious

form in which the educational movement of the last three or four years was to culminate, I should have confessed to a great sense of disappointment I am certainly in favour of placing a maximum limit upon the number of Fellows and of transferring to the Statute Book certain regulations which have hitherto only been found in the Calendar ; but these are not changes which, however desirable, could very materially improve the character of University education, and if reform were to end here, I could only look upon the Bill as a piece of minor legislation about which it would be difficult to entertain any very strong feelings. The Government Resolution has dispelled any such fears, and I am now hopeful that the introduction of this Bill marks the beginning of a new era for education in India and that it is the preliminary to changes which will deal directly with education itself and not merely with its administrative machinery

"The discussion upon the amendments has dealt with all the main provisions of this Bill, but I should like to make a few remarks on certain aspects of the policy which is now being inaugurated, upon which the Resolution is silent or with regard to which I differ from the Government The Bill before us is in the main an enabling Bill, a measure to give power to the Universities to improve themselves; reform has not been imposed upon them from without, but an opportunity has been offered them of developing themselves from within ; hence the years immediately following the passage of this Bill, are of the utmost importance, as upon the public opinion then formed will depend the policy which the Universities will adopt. I feel very strongly that all men engaged in the work of education ought to exert themselves strenuously during this critical period to secure the general adoption of sounder views upon education and a truer conception of the value of learning. That is a task which can best be performed by persons who are not in Government employment, but I should like to secure the co-operation of the members of the Indian Educational Service, and in order to make this co-operation possible, I ask the Government to give their educational officers absolute freedom to speak and vote in the Senate according to their own convictions and release them from the obligation, expressed or understood, of voting on all occasions with the Government. As long as the suspicion exists that the members of the Educational Service are merely the mouthpieces on the Senate of the official policy, so long will they be powerless to influence public opinion. Further-more, the departmental expedient of controlling the opinions of its own

On March 28th the Nawab of Bahawalpur, who was passing through Aligarh, paid the College a private visit and inspected the Courts and grounds We are sorry His Highness could not have come at a time when the College might have given him a better reception

---

Qari Muhammad Safaraz Husain, whose lectures in the College last year will be remembered, has collected some of his writings in a little volume called "Islam," published in Naini Tal There is a simplicity and earnestness about his writings that commend them to all classes of readers. For instance, the essay on 'Religion or Fashion' on page 82, is full of practical sense and sound advice. The decrease of Religion and the increase of Fashion in our modern world are surely, and not slowly, working very great changes, and readers of these Essays will be encouraged to face the difficulties of the age if they borrow some of the writer's earnest zeal The book "Islam deserves a wide circulation

---

Sujjad Haider, B A, has left the College for Bagdad where he will take up, on probation, the work of Dragoman under Major Newmarch the British Resident of Turkish Arabia We hope to hear before long that Sajjad is permanently appointed and the College feel confident that he is entering on a prosperous and useful career.

---

Muhammad Akram Khan, B A, has been appointed an Extra Assistant Commissioner in the Central Provinces: his appointment awaits only the sanction of the Government of India. We wish him every success

---

S. Riza Ali, B A, is going to Saharanpur as Law Reader under Mr. L. G. Evans, Sessions Judge, who was formerly Sessions Judge in Aligarh.

---

The following was Mr. Morison's speech in the Council on the Universities Bill.—

The Government Resolution upon education, which appeared last Saturday, most profoundly affects the view which we take of this Bill, for now we have an assurance that this measure is not the end but the beginning of educational reform. If indeed this Bill had been the final measure of re-

and Ghulam Husain made suitable replies. Last, but chief of all the Nawab Mohsin-o-Mulk paid eloquent tribute to the occasion.

---

The great honour that Dr Zia-ud-din Ahmed has won for the College was marked by a holiday on April 2nd, on which day too the Old Boys gathered here. Everyone rejoices at Dr Zia-ud-din's success, our only regret is that these fresh honours will keep him all the longer from us and from Aligarh. We cannot do better than quote the remarks of the "Pioneer" of March 27th

'The last mail brings us news from Cambridge that Dr. Zia-ud-din Ahmed has been elected to Sir Isaac Newton's Studentship. This studentship is worth £200 a year for three years and next to the Smith's prize which is of a nominal money value, is the highest ambition of the mathematical student. Dr. Zia-ud-din was educated at Aligarh and the M. C. College of Allahabad and was awarded the State scholarship by the Syndicate of the Allahabad University in 1901. He was then an Assistant Professor of Mathematics at Aligarh and over 21 years of age; but the Syndicate recommended to the Government that this condition should not be insisted upon, as they were convinced that Dr. Zia-ud-din wished to go to Europe for the purposes of study only and would on his return devote himself to education in India. As required by the regulations under which the Isaac Newton Studentship is held Dr Zia-ud-din has declared his intention of taking up the study of certain astronomical problems and of devoting himself to the subject of Arabian astronomy. From the days of Delambre and Sedi Uot who wrote about 1820, no one seems to have approached the subject of Arabian astronomy from the scientific point of view. Since that time a number of manuscripts have been discovered and some of them translated, but the subject has not since been dealt with by scholars familiar with modern astronomical science; and though a good deal has been published regarding the results obtained by the Arabian astronomers no attention has been devoted to the methods and means employed by them.

---

On the evening of March 15th, Lord Ashburton who was paying a short visit to India, delivered a lecture in the Siddon's Union Club on the subject of "Navigation." He explained the use of the Compass and Sextant and showed how a ship finds her way from London to Bombay. The lecture was well attended and proved most interesting.

# The Aligarh Monthly.

April 1904

## COLLEGE NOTES

A month of hard examination work ends in the rest afforded by the Moharram and Easter holidays, at the close of which we are glad to welcome Mr Morison back to the College

The Old Boys too visited Aligarh at this time for their annual gathering and Dinner on April the 2nd.

Various meetings occupied the morning of April 2nd, a very fair number of Old Boys being present. At 5 o'clock the Old Boys' Association Committee gave a Garden Party at the Tennis Lawn, and at 8-30 there was dinner in the Strachey Hall Mr. Morison, who was welcomed on his return from Calcutta, greeted the Old Boys in encouraging terms. He said that work and long distances of necessity kept many Old Boys away, but in other towns, even in London, Old Boys' Day was being kept with enthusiasm. He then referred to the recent distinction gained by Dr. Zia-ud-din and prophesied still further honours for him.

For the Old Boys' Kwaja Ghulam-us-siqlain spoke very heartily, and for the present students Syed Mustafa Husain

# علیگڈھ منتھلی

| جلد ۲ | مئی ۱۹۰۴؁ عیسوی | نمبر ۵ |
|---|---|---|


## الاموۃ عند العرب

(نمبر ۱)

**تمہید** یورپ کے علما ہر روز نئی نئی علمی تحقیقات دُنیا کے سامنے پیش کرتے رہتے ہیں۔ اور ایسے ایسے مسائل پر روشنی ڈالتے ہیں، کہ جن کی تحقیقات سے ایک ایک نیا علمی دور شروع ہوتا ہے۔ اور دُنیا کے بڑے بڑے معتقدات کی کایا پلٹ جاتی ہے۔ جس سے یورپ کے رہنماؤں کو حکمت و تاریخ، اور معاشرت و مذاہب کی چھان بین میں بڑی مدد ملتی ہے۔ اور اسطرح اُنکی علمی حکومت کا دائرہ تمام دُنیا کو اپنے محیط میں داخل کرتا رہتا ہے۔ اور بالآخر اس سے وہ وہ سیاسی اور تجارتی فوائد اہلِ مغرب کو حاصل ہوتے ہیں، کہ اہلِ مشرق مُنہ دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ ایک زمانہ دراز سے یورپ کے مستشرقین کی تحقیقات کا سلسلہ، سرزمینِ مشرق، اور اُسکے باشندوں کے متعلق جاری ہے اور اُنھوں نے ایسی ایسی کھود کرید کی ہے، کہ خود مشرقی اُمتیں اُن اسرار سے نابلد تھیں، اور ہیں اور نہ اب اس بات کی کوشش کیجاتی ہے کہ مشرق کچھ اپنی نسبت سُنے، اور معلوم کرے۔ لیکن یورپ کے مستشرقین جس فیاضی سے ہماری تاریخ، ہماری معاشرت، ہماری دیانات، ہماری قدامت،

اور ہمارے نظامِ خانگی و سیاسی کے متعلق ہمارے صنادید، اور لٹریچر سے تحقیق کرتے ہیں، اُسکا جاننا ہمارے لئے نہایت ضرور ہی تاکہ ہماری بصیرت میں اضافہ اور کوریت میں کمی واقع ہو،

۱۹ ویں صدی عیسوی، جو دُنیا کے حق میں، علم و معارف، اور تہذیب و تمدن کی صدی گزری ہی، اُسنے دنیا کے سامنے جہاں نئی باتیں پیش کی ہیں، وہاں اُسنے پچھلے زمانے پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ اس صدی نے اپنی علمی یادگاروں میں، "تاریخ خاندان" کا ایک نیا مسئلہ ہم کو دیا ہی۔ سب سے پہلے ایک جرمنی عالم باکوفین نے ۱۸۶۱ء میں اس مسئلہ پر ایک کتاب شائع کی۔ اور تمام یورپ کے علما کی رایوں میں ایک انقلاب عظیم پیدا کردیا۔ اس عالم کی تحقیقات شائع ہونے سے پہلے یہ تسلیم کیا جاتا تھا، کہ "تاریخ خاندان" میں "اُبوۃ" کا دور سب سے پہلے ہوا ہے، اور خاندان کی گزشتہ اور موجودہ ساخت ایک ہی اصول "اُبوۃ" پر چلی آرہی ہی۔ جس سے یہ تسلیم کرنا پڑتا تھا کہ خاندان کی کوئی تاریخ ہی نہیں۔ اور یہ ایک ایسا غلط اعتقاد تھا، جو کائنات کے ناموسِ طبعی، اور نشو و نما کے اصول تدریجی سے بالکل خلاف تھا اسلئے کہ جسطرح دنیا اور مافیہا اصولِ نمو کے محکوم ہیں، اسی طرح انسان اور اُسکی عادات و خصائل بھی اصولِ تدریج کے محکوم ہیں۔

باکوفین کی کتاب شائع ہونے سے پہلے چند علما اور سیاحوں کو "تاریخ خاندان" کے بعض اجزا سے واقفیت تھی۔ اور اُن کو دنیا کی مختلف قوموں میں، نکاح شراکت، نکاح تعددِ ازواج، اور نکاح تعدد زوجات کا علم تھا۔ لیکن وہ ان تمام مراسم کو امور عجیبہ اور خوارقِ عاداتِ انسانی میں شمار کرتے تھے، اور اُن کو کسی تاریخی یا منطقی سلسلہ میں منسلک کرنے کی کوشش نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ ایک انگریز عالم تیلور نے اپنی تصنیف "تمدن کی بنیاد" میں ان تمام مسائل پر اسی طرح نظر ڈالی ہے۔

لیکن باکوفین نے اس تمام عجائب پرستی پر سے پردہ اُٹھایا، اور اُن کو فلسفیانہ اصول

تدریج میں داخل کیا۔ اور اسکے بعد سے اب جو علماء "تاریخ خاندان" پر کچھ تحقیقات کرتے ہیں، وہ اُن ہی اُصول پر چلتے ہیں جنکو باکوفین نے قائم کیا ہے۔ اور وہ یہ کہ دنیا میں سب سے پہلے "دور اموتہ" جاری رہا ہے۔ اور تمام گزشتہ آثار، اور اقوام متوحشہ کی زندگی کا مطالعہ جن کو موجودہ تمدن نے اپنے رنگ میں نہیں بگاڑا، اسی اُصول کا ثبوت دیتے ہیں۔

چنانچہ اُسنے جن نئے اُصول کی بنیاد ڈالی ہے وہ یہ ہیں کہ: —

(۱) قدیم انسان "نکاح مشارکت" کرتے تھے۔ اور کسی خاص مرد اور عورت کا جوڑا نہیں ہوتا تھا

(۲) ایسی صورت میں، جب باپ کا شخص کرنا مشکل ہوا، تو نسب ماں سے چلایا گیا۔ اور اسطرح ماں کو سوسائٹی میں فوقیت و برتری حاصل ہوئی، اور "اموتہ" کی بنیاد پڑی۔ اور دنیا کی تمام قدیم قوموں میں اسکا رواج ہوا، جس کا ثبوت اون کے قوانین و معاشرت سے ملتا ہے

(۳) جب والدین میں سے صرف ماں اولاد کی پیدا کرنے والی، اور ماخذ قرار دی گئی، تو قدما میں اُس کی نہایت عزت کی گئی، اور وُہی ربِ قبیلہ شمار کیگئی۔

(۴) اِس کے بعد رفتہ رفتہ اُن قدیم عادات نے صورت بدلی، اور "نکاح فردی" کی بنیاد پڑی، اور "دور ابوۃ" قائم ہوا، اور ایک بیوی ایک شوہر کے لئے مخصوص ہوئی اُسی ضمن میں اُن تمام نظاماتِ خانگی و قانونی اور معاشرتی کی بنیاد پڑی، جو آج "دور ابوۃ" کے لوازمات میں نظر آتے ہیں۔

یہ وہ نئی رائیں ہیں، جو اس جرمنی عالم نے "تاریخ خاندان" میں اپنی تحقیقات سے داخل کی ہیں۔ اور اُن کے ثبوت میں لاانتہا دلائل بیان کئے ہیں۔ اور قدیم قوموں، اور خصوصاً یونانیوں کی تصانیف سے اُن کے ثبوت دیے ہیں۔

باکوفین سے چار سال کے بعد ایک انگریز عالم اس میدان میں آیا، اور اُس نے اس تحقیقات میں کچھ اضافہ کیا، جس کا نام میک لی نن تھا۔ اس نے "نکاح خارجی" اور "نکاح داخلی" کے متعلق زیادہ کاوش سے تحقیقات کی، اور سب سے اول اسی عالم نے دنیا

کی مختلف قوموں میں "نکاح خارجی" کے رائج ہونیکا پتہ دیا۔

"تاریخ خاندان" کا ایک دوسرا مشہور مصنف ایک امریکن عالم مورگان ہے۔ اس نئی بحث کو علمی درجہ تک پہنچانے میں اُسکا وہی درجہ ہے، جو ڈارون کو مسئلہ ارتقا میں، اور مارکس کو علم الاقتصاد میں حاصل ہے۔

اس کی تصنیف کے بعد پھر یورپ کی مختلف زبانوں میں "تاریخ خاندان" پر سینکڑوں کتابیں لکھی گئیں۔ اسی قسم کا ایک مختصر سا رسالہ ہم کو صرف عربوں کی تاریخ خاندان کے متعلق ملا۔ اس کا مصنف ہالینڈ کی یونیورسٹی کا ایک مشہور مستشرق عالم جی ولکن ہے۔ اُسکا رسالہ دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے، کہ وہ مشرق اور مغرب کی اکثر زبانوں کا عالم و ماہر ہے، اور عرب کے لٹریچر پر نہایت تبحر سے عبور رکھتا ہے۔ اُس نے اپنے رسالہ میں، عرب جاہلیت کی تاریخ خاندان، اس کی ساخت، اُس کے تمدن، اور اُس کے قوانین معاشرت و سیاست کے متعلق وہ وہ نئی مباحث پیش کی ہیں، کہ جو لوگ سوشیل معاملات و مباحث سے دلچسپی رکھتے ہیں، اُن کو اُسکی اسٹڈی سے بہت زیادہ معلومات، اور انکشافات حاصل ہو سکتے ہیں۔ اور اسلئے یہ مضمون اُردو میں لکھا گیا ہے۔ ورنہ کہاں ہالینڈ کی زبان، اور کہاں اُسکا جامۂ جرمنی، اور کہاں جامۂ عربی، اور کہاں جامۂ ہندی۔ لیکن صرف اسی خیال سے کہ ہم کو اپنے نظاماتِ خانگی و سیاسی اور قانونی کی قدیم حالت سے جبتک کماحقہٗ تاریخی آگاہی حاصل نہو گی، اُسوقت تک ہماری سوسائٹی کے موجودہ تفاخر، اور توہماتِ بیجا کی بیخکنی دشوار ہے۔ لہذا ہم نے تاریخ کے اِس عجیب مسئلہ پر روشنی ڈالنا ضروری خیال کیا۔ اور قدامت و حداثت میں ایک تاریخی تعلق سے یہ دکھلانا چاہا ہے، کہ ہم کیا تھے، اور کیا ہیں، اور کیا ہونے اور بننے کے لئے ہم کو مستعد رہنا چاہیئے۔ اور تمسخر و تفاخر سے ہم کو کہاں تک بچنا چاہیئے۔

اسکے علاوہ ہمکو اس مضمون کے ذریعے سے یہ دکھلانا ہے، کہ آج دنیا کی زندہ تاریخ

میں جہاں ہر جگہ، اور ہر چیز، اور ہر قانون میں، "ابوۃ" کی جھلک نظر آتی ہے، اسی طرح دنیا میں سب سے پہلے، زندگی کے ہر مرحلہ میں "اموتہ" کا دور رہا ہے۔ اور عورت کو وہ شان حاصل رہی ہے کہ وہ ہر چیز کی مانند وسنشا رہی ہے۔ لیکن ایک نامعلوم سلسلہ اسباب سے دنیا نے اس طرح پلٹا کھایا ہے، کہ سب چیزیں، عورت سے مرد بن گئی ہیں۔ اور ہر ایک چیز میں "ابوۃ" کی شان نظر آتی ہے لیکن اقوام متوحشہ کی زندگی کا مطالعہ ایک ایسی کتاب ہے، کہ اُس میں قدیم سے قدیم، اور زمانۂ تاریخ سے پہلے کے آثار، اور انسان کی عادات وخصائل کی رفتار اور قدامت نہایت صفائی کے ساتھ، سلسلہ بسلسلہ زنجیر کی کڑیوں کیطرح مسلسل نظر آتی ہے، اور اس سے بہت سے انکشافات اور حداثت وقدامت کے علاقوں کا علم حاصل ہوتا ہے۔ لیکن مرد اس زمانے میں ایسا مغرور ہوگیا ہے کہ اُسکو کسی ایسی چیز، کسی ایسے آثار، اور کسی ایسے زمانہ پر نظر ڈالنا گوارا نہیں، جس سے اُسکی خیالی توہین، یا پس پائی ثابت ہوتی ہو، اور عورت کی برتری۔ اور یہی خیال عورت کے غلام بنانے کی خواہش پیدا ہونے کی جڑ ہے۔ اور اُسکی گزشتہ تاریخ کا معلوم نہونا، اُسکی طبعی ناقابلیت کے اعتقاد جمانے پر مجبور کرتا ہے۔

یہ مضمون، جسکا پہلا نمبر آج "منتعلی" میں شائع کیا جاتا ہے، اپنی نوعیت میں، زبان اُردو میں، بالکل نئی قسم کا ہے۔ بلکہ اس کی جدت سے یہانتک اندیشہ ہے، کہ بہت سی نظریں اسکو مُہملات وخرافات کے زمرہ میں شمار کرینگی۔ لیکن جن کی نظروں میں وقت پسندی، اور تحقیق طلبی ہے، وہ اسپر غور کریگے، اور اس مسئلہ کو اور وسیع کرینگے۔

اِس مضمون میں صرف عربوں کی "اموتہ" کا حال بیان کیا گیا ہے، جس میں تاریخی تسلسل کی وجہ سے ضمناً "نکاح متعہ" کا بھی ذکر آگیا ہے، اور جسکو جاہلیت واسلام دونوں زمانوں سے تعلق رہا ہے، اگرچہ اسلامی فرقوں میں سے ایک اسکو تسلیم کرتا ہو، اور دوسرا نہ مانتا ہو اس نمبر میں صرف چند ابتدائی مسائل "اموتہ" اور "متعہ" کا تاریخی بیان ہے۔

اور آئندہ نمبروں میں اقسام نکاح جاہلیت، اموتہ اور تشخیص پدر کے اصول، توریث، اخلاق مادری
انحصار قرابت بر مادر، انحصار وراثت بسلسلہ مادری، بطون و قبائل کے اندرونی و بیرونی
نکاح، اموتہ اور انساب، حریت و رقیت پر اموتہ کا اثر، قریب و بعید کے رشتہ داروں
میں ازدواج، نساء جاہلیت کی خود مختاری، اور اموتہ کے اور بہت سے قانونی و معاشرتی
پہلو اور لوازمات بیان کئے گئے ہیں، جو غور طلب، اور تحقیق پسند اشخاص کے لئے بڑی
رہنمائی کے مسائل ہیں- غرضکہ ہمارے خیال میں تاریخ کے اس پہلو پر اس سے پہلے اردو
میں کبھی کچھ نہیں لکھا گیا- اور اسی لئے ہم نے اس مضمون کو "منتھی" کے لئے پسند کیا ہے۔
جس کا پہلا نمبر آج شائع کیا جاتا ہے کہ:-

**"اُموتہ" کی تعریف** من جملہ اور بہت سے مسائل علمی کے، جن کی تحقیق میں آج کل علماء یورپ مشغول ہیں،
ایک مسئلہ "اُموتہ" بھی ہے- علماء کی اصطلاح میں لفظ "اموتہ" سے وہ رشتہ داری مراد لی جاتی ہے، جو ماں
کی طرف سے ہو- جس طرح "ابوۃ" سے باپ کی طرف کی رشتہ داری مراد لی جاتی ہے- یعنی "اموتہ" میں بچے
کی نسبت ماں کی طرف ہوتی ہے- اور "ابوۃ" میں باپ کی طرف- جو لوگ اس مسئلہ کی تحقیق میں مصروف
ہیں، اُن کے نزدیک یہ ثابت ہوا ہے کہ دنیا میں "اموتہ" کا دور "ابوۃ" سے پہلے ہوا ہے- لیکن اس
سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ "اموتہ" بہ اعتبار نوع کے بھی تاریخ خاندان میں متقدم ہے- بلکہ خاندان نے جب موجودہ
صورت اختیار کی ہے، اور اُس وقت سے تاریخ خاندان میں جتنی صورتیں جاری رہی ہیں، اُن میں سے "اُموتہ"
بھی ایک قسم ہے- قدیم تاریخ، سیاحوں کے بیان، اور موجودہ زمانہ کے علماء کی تحقیق سے یہ بھی ثابت
ہوا ہے کہ "اموتہ" دنیا کی تمام قوموں میں رائج رہی ہے- یہاں تک کہ کوئی ایسی قوم نہیں ملے گی جس میں
"اُموتہ" کے زندہ آثار نہ پائے جاتے ہوں- بعض قوموں میں "اموتہ" اسوقت تک موجود ہے،
بعض میں مفقود ہوتی جا رہی ہے، اور بعض سے کلیتہً نیست و نابود ہو کر، اُس کی جگہ "ابوۃ" یا اور
کوئی صورت خاندانی قائم ہو گئی ہے- لیکن "اموتہ" اپنے آثار ان قوموں میں بھی چھوڑ گئی ہے،
جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ "اموتہ" "ابوۃ" سے پہلے ان قوموں میں رائج تھی-

اس آرٹیکل میں ہم اس مسئلہ پر صرف اس حیثیت سے بحث کرینگے، کہ سامی قوموں (

میں عموماً اور عربوں میں خصوصاً "اُمومۃ" کی کیا کیفیت رہی ہے۔

مشہور مستشرق علامہ رابرٹسن اسمتھ کی کتاب "عربوں اور عہد عتیق میں حیوانات کی پرستش اور اُن کے خاندان" نے ہم کو اس بحث پر آمادہ کیا ہی۔ مصنف موصوف نے اپنی کتاب میں اُن تمام باتوں کو بیان کیا ہی، جو عرب میں رواج اُمومۃ کی اولیت پر دلیل ہو سکتی ہیں، لیکن اُس نے قصداً اس بحث کو نہیں چھیڑا ہی، بلکہ علی سبیل الاتفاق ذکر کر گیا ہے۔ لہٰذا ہم کو ضرورت معلوم ہوئی کہ ان عظیم الشان امور پر ایک خاص مشرح و مفصل بحث کیجائے۔ اور تاریخ خاندان میں جو کچھ نئی تحقیقات ہوئی ہے، اُس کا مقابلہ گزشتہ تحقیقات سے کیا جائے۔ اور اس مسئلہ کے حل کرنے میں اُن تمام دلائل سے کام لیا جائے جو مصنف مذکور سے چھوٹ گئے ہیں

"ٹوٹم ازم" | رابرٹسن اسمتھ کی کتاب مذکورۂ بالا کا موضوع اُس کے نام سے یہ ظاہر ہوتا ہے، کہ اُس میں سامی قوموں اور عربوں میں عبادت حیوانات اور "ٹوٹم ازم" ( ) کا رواج بیان کیا گیا ہی۔ لفظ "ٹوٹم ازم" شمالی امریکہ کے باشندوں سے لیا گیا ہے۔ اُن کی اصطلاح میں اس لفظ سے وہ حیوان مراد ہوتا ہے، جس کی ہر ایک قبیلہ علیحدہ علیحدہ پرستش کرتا ہی۔ اُسی کے نام پر اُس قبیلہ کا نام رکھا جاتا ہی۔ اور ہمیشہ اُسی کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ مثلاً: جن باشندگانِ امریکہ نے "دریائی کتا" کو اپنا "ٹوٹم" بنایا ہے، وہ اُس جانور کو ایک فرشتہ، یا اپنی حفاظت کرنیوالی روح، خیال کرتی ہیں۔ اُسی کے نام سے ہمیشہ پکارے جاتے ہیں۔ اور یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ ہم تمام دریائی کتوں کے رشتہ دار ہیں۔

عرب میں "ٹوٹم ازم" | اس خیال میں آجکل کچھ شبہہ نہیں کیا جاتا کہ عرب کے بہت سے قبیلے بعض حیوانات کے نام پر نامزد کئے گئے تھے۔ قبیلہ ہائے اسد (شیر)، کلب (کتا)، ظبیان (ہرن)، اوس (بھیڑیا)، ثور (بیل)، عقاب (گدھ)، اور بنو حمامہ (کبوتر)، وغیرہ اور اور بے شمار قبیلوں کے نام اس دعوی پر کافی دلیل ہو سکتے ہیں۔ لیکن علما انساب عرب کے خیال کے مطابق یہ الفاظ ابتداءً مشہور تاریخی

لوگوں کے نام تھے، جو رفتہ رفتہ اُن کے بزرگوں تک منتقل ہوئے۔ اور پھر ہر قبیلہ اُن ہی ناموں سے نامزد ہو گیا۔ مثلاً: بنو کلب نے اپنا نام ایک مشہور تاریخی شخص کلب بن وبرہ بن ثعلبہ جد قضاعہ کے نام پر نامزد کیا۔ مگر یہ بات آجکل علماء کے نزدیک پایہ تحقیق کو پہنچ گئی ہے کہ انساب عرب کی کتابیں تاریخی وقعت سے گری ہوئی ہیں۔ اسلئے کہ وہ اکثر ایسے مزخرفات سے بھری ہوئی ہیں، جن پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ مشہور مستشرق علامہ نول ڈیکی (        ) کہتا ہے کہ:—

"اب وقت آگیا ہے کہ علماء اُن طفلانہ رایوں کو پس پشت ڈالدیں، جو ہم کو اس خیال پر مجبور کرتی ہیں کہ محمد کلبی، اور اُس کے بیٹے ہشام، اور دوسرے مصنفین کی کتب انساب عرب، جن میں عرب کے قدیم اور جدید قبیلوں کی قرابت کا ذکر کیا گیا ہے، تزویر اور مزخرفات سے پاک ہیں۔ کیا یہ بات قرین عقل ہے کہ مثلاً ہم تمام قبائل بنی قیس کو، جو مسیح سے کچھ دنوں پہلے عرب کے وسطی شہروں میں آکر بسے تھے، صرف ایک شخص قیس کی طرف منسوب کردیں۔ جیسا کہ مصنفین مذکور خیال کرتے ہیں۔ ہم کہہ سکتے ہیں، کہ کوئی بڑا قبیلہ و شعبہ ایسا نہیں ہے جو اس شخص کو حقیقۃً جانتا ہو، جس کی طرف وہ منسوب کیا جاتا ہے"

رابرٹسن اسمتھ بھی اسی رائے کی تائید کرتا ہے۔ وہ اپنی کتاب مذکورۂ بالا میں لکھتا ہے کہ:—

"یہ بات تحقیق شدہ ہے کہ تمام قبائلِ عرب گزشتہ زمانہ میں کسی مشہور تاریخی شخص کے نام پر ملقب نہیں کیے جاتے تھے۔"

ممکن ہے کہ قبائل عرب کے ناموں کا بعض حیوانات کے ناموں پر رکھا جانا کسی دوسرے طریقے سے تعبیر کیا جا سکے۔ لیکن رابرٹسن اسمتھ کا یہ خیال ہے، کہ فی الاصل ان الفاظ میں مذہبی معنی موجود ہیں۔ اور اُن کو عبادتِ حیوانات سے تعلق ہے۔ جیسا کہ "ٹوٹم ازم" میں دیکھا جاتا ہے۔ اس پر اُسنے بہت سی دلیلیں بیان کی ہیں۔ من جملہ اُن کے ایک یہ ہے کہ عرب قبیلوں کا اپنے معبودوں کے نام پر موسوم ہونا کچھ شاذ و نادر نہیں ہے۔ کتنے ایسے شخص، بلکہ قبیلے موجود ہیں، جو اپنے معبودوں کے نام سے مشہور رہیں۔

مثلاً: بنو ہلال، بنو شمس، اور بنو بدر قبیلے اپنے اُن معبودوں (چاند اور سورج) کی طرف منسوب ہیں، جن کو وہ اسلام سے پہلے پوجتے تھے۔ اسی طرح بنو غنم، اور بنو نہم ہیں۔ یہ نام اُن قبیلوں کے معبودوں کے نام سے ماخوذ ہیں، جنکی وہ پرستش کیا کرتے تھے۔ بطریقِ قیاس اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جن حیوانات کی طرف بعض قبائل عرب منسوب ہیں، وہ درحقیقت اُن کے معبود تھے۔ اس پر یہ دلیل قوی موجود ہے کہ حمامہ (کبوتر)، اور ظبی (ہرن)، کعبہ کے خدا خیال کئے جاتے تھے۔ اور ان دونوں کے نام پر قبیلہ بنو حمام اور بنو ظبی کا نام رکھا گیا ہے۔ اور علیٰ ہذا بنو اسد، یغوث (بشکلِ شیر) بُت کیطرف منسوب ہیں۔ جسطرح بنو عقاب، نسر (بشکل کرگس)، بُت کیطرف۔ ان ہی دلائل کی بنا پر رابرٹسن اسمتھ بعض اُن علماء کی رائے کی صحت میں تمسک کرتا ہے، جو یہ کہتے ہیں کہ یغوث اور نسر سے خود سورج یا اُسکی اُن بعض صفتوں کیطرف رمزاً اشارہ ہے، جن کی عرب پرستش کیا کرتے تھے۔

**دورِ "اُمومتہ" میں اولاد اپنی ماں کے "ٹوٹم" کی پرستش کیا کرتی تھی**

رابرٹسن اسمتھ کے حوالہ سے ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ قبائلِ عرب زمانہ قدیم میں اپنا اپنا ایک ایک "ٹوٹم" رکھتے تھے۔ یعنی ہر ایک قبیلہ کسی نہ کسی پرندے یا چوپائے کی پرستش کرتا تھا۔ اور ان ہی معبودوں پر اپنا نام رکھتا تھا۔ لیکن اس "ٹوٹم" کی صفات میں سے ایک یہ صفت بھی تھی کہ وہ صرف عورت کی نسل میں منحصر رہتا تھا۔ یعنی بچہ اپنی ماں کے "ٹوٹم" کی عبادت کرنے پر مجبور تھا، نہ کہ باپ کے "ٹوٹم" کی۔ جیسا کہ امریکہ کی اُن قوموں میں جو زمانہ حال میں بھی "اُمومتہ" پر قائم ہیں، اس اُصول کا جاری ہونا بیان کیا جاتا ہے، اسی اصول نے رابرٹسن اسمتھ کو عرب میں بھی "اُمومتہ" کے رواج پر براہین قائم کرنے کی جرأت دلائی ہے۔ اب ہم "ٹوٹم ازم" کی بحث کو اس تشریح کے بعد ختم کرتے ہیں۔

**"نظامِ اُمومتہ" قائم ہونے کے اسباب**

آج کل علماء کا اس بات پر اتفاق ہے، کہ "اُمومتہ" کی بنیاد بچے کا باپ نہ معلوم ہونے پر پڑی۔ اور باپ کا نہ معلوم ہونا اس بات کا نتیجہ تھا کہ سوسائٹی کی بہت قدیم حالت میں "نکاحِ شرعی" رائج نہیں تھا۔ "نکاحِ شرعی"، "نکاحِ اشتراک" ( ) کے بہت زمانہ کے بعد پیدا ہوا ہے۔ اور "نکاح شرعی" کی بنیاد پڑنے سے پہلے دنیا کی تمام قوموں کی ہیئت

اجتماعی میں "نکاح اشتراک" جاری رہا ہو۔ کیونکہ تمدن کی ابتدائی حالت میں نکاح ایک وقتی اور غیر مقید شکل رکھتا تھا۔ یعنی عورت کسی مضبوط رشتہ شرعی سے، کسی مدتِ معینہ کے لئے، کسی مرد خاص کے ساتھ وابستہ نہیں ہوتی تھی۔ بلکہ اپنے قبیلے میں سے اگر آج زید کے ساتھ مجامعت کرتی تھی، تو کل عمرو کے ساتھ، اور پرسوں بکر کے ساتھ۔ اور علیٰ ہذا۔

اس اختلاط اور مجامعۃ مطلقہ کے بعد جو زنا سے بہت مشابہت رکھتا تھا: "نکاح شرعی" یا "نکاح فردی" (   ) کی صورت پیدا ہوئی، جو آجکل رائج ہے۔ لیکن بعض علماء، جن میں میکلینن سب سے پیش پیش ہے، یہ خیال کرتے ہیں کہ "اموتہ"، "تعددِ ازواج" (   ) کی اُس ابتدائی حالت سے پیدا ہوئی ہے، جبکہ وہ بالکل غیر مقید تھی۔ یعنی اُن چند لوگوں میں جو ایک عورت کے مالک ہوتے تھے، کوئی رشتہ قرابت نہیں ہوتا تھا۔ اس کے بعد اس شرط سے اس کا دائرہ تنگ ہوا، کہ ایک عورت صرف ایسے چند معین مردوں کے لئے مخصوص ہو، جو ایک کنبہ، یا ایک ماں کے بیٹے ہوں۔ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ تعددِ ازواج کی دونوں مذکورہ بالا صورتیں بعض قوموں میں رائج ہیں لیکن نکاح کی یہ صورت ایسی جلد جلد بدلتی رہی ہے، جس کی بنا پر یہ دریافت کرنا صحیح ہوسکتا ہے کہ یہ صورت کس جگہ حالتِ نمو میں دیکھی گئی ہے؟۔ لباک اور دوسرے علماء، "تعددِ ازواج" کو قلیل النمو اور اکثر و بیشتر عورتوں کی کمی کا نتیجہ خیال کرتے ہیں "نکاحِ فردی" کا وجود ظاہر ہونے سے پہلے، دنیا کی جن قوموں میں جس وقت "نکاح اشتراک" رائج تھا، اُسوقت اُن میں "اموتہ" بھی بلا شبہ تسلیم کی جاتی تھی۔ اب اس بات کی ضرورت ہے کہ عرب میں اُن آثار کی تلاش کیجائے جن سے یہ معلوم ہوسکے کہ آیا اُن میں "نکاح اشتراک" جاری تھا یا نہیں۔

**عرب میں "پالی انیڈری" یعنی "نکاح تعددِ ازواج"**

عرب جاہلیت کے سب سے پرانے حالات جو ہم تک پہنچے ہیں، اُن میں سے مشہور یونانی سیاح اسٹرابو (   سنہ ۶۴ ق۔م سے سنہ ۲۴ء تک) کے چشم دید حالات ہیں، جو اُس نے اپنے مشہور جغرافیہ میں عربوں کے نکاح کے متعلق بیان کئے ہیں۔ وہ لکھتا ہے کہ:۔

"عرب میں ملکیت مشترک ہی یعنی خاندان کے تمام ممبروں کے لئے مخصوص ہوتی ہی۔ ہر خاندان کا سب سے مُسن شخص اُسکا شیخ ہوتا ہی۔ تمام ارکانِ خاندان کی ایک مشترک بیوی ہوتی ہی۔ باری باری اُسکے پاس جاتے ہیں۔ جو شخص پہلے آگیا وہی مجاسعت کرتا ہی۔ اور خلوت گاہ کے دروازے پر نشانی کے طور پر اپنا عصا چھوڑ جاتا ہی۔ تاکہ دوسروں کو اُسکی خلوت کا حال معلوم ہوجائے لیکن رات کیوقت اُن میں سے صرف اُس مرد کو مجاسعت کا حق ہوتا ہی، جو عمر میں سب سے بڑا ہو۔"

اِس بیان سے ظاہر ہوتا ہی کہ عرب میں "تعدد ازدواج" قانونی صورت میں رائج تھا۔ لیکن اسٹرابو نے آگے چلکر جو کچھ بیان کیا ہے، اور جس سے خود اُس کی تردید ہوتی ہی، وہ اس رای کی صحت میں شک کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ عبارتِ مذکورۂ بالا کے بعد وہ لکھتا ہی کہ:—

"وہ (عرب) اپنی ماؤں سے مجاسعت کرتے ہیں۔ زانی کو موت کی سزا دیتے ہیں۔ زانی اُنکے نزدیک وہ شخص ہے، جو غیر قبیلے کی عورت سے جماع کرے۔"

یعنی ایک قبیلے کے مردوں کو اُسی قبیلے کی عورتوں سے بلا کسی قید و شرط کے جماع کرنا مباح تھا۔ جس سے یہ مستنبط ہوتا ہے، کہ عورت، عربوں میں، نہ کسی مرد خاص سے مخصوص ہوتی تھی، اور نہ کسی جماعت معین سے، بجز اس ایک تخصیص کے کہ جس عورت سے ارتباط کیا جائے، وہ ہم قبیلہ اور رشتہ دار ہو۔ اسٹرابو نے تھوڑی دور آگے چلکر جو کچھ بیان کیا ہی، اُس سے اس رای کی تائید ہوتی ہی۔ وہ لکھتا ہی کہ:—

"پانچ بھائی ایک بہن پر عاشق تھے۔ یہ عرب کے ایک امیر کی بیٹی تھی۔ ایک ایک بھائی باری باری اُسکے پاس آیا کرتا تھا۔ یہاں تک کہ وہ مرگئی۔ اور اس حیلے سے اُن کے پنجے سے چھوٹی۔"

اِس بیان سے ہماری رای کی تصدیق ہوتی ہی۔ اس لئے کہ اس واقعہ سے عربوں میں بمقابلہ تعدد ازدواج کے "نکاح اشتراک" کا کثرت سے رائج ہونا پایا جاتا ہی:

ایک لاتینی مصنف امی انس مارسی لی نس د

بیان کرتا ہے کہ:—

"عرب زمانہ جاہلیت میں ایسے دائمی نکاح کو جس میں عورت ایک خاص مرد سے زمانہ معین

تک وابستہ ہو، بالکل نہین جانتے تھے۔ اِس لئے کہ عرب "نکاح فوری" کو دوسرے اقسام نکاح پر ترجیح دیتے تھے۔" یہی مصنف پھر آگے چلکر لکھتا ہی کہ:۔

عرب (مرد) اپنی عمر بادیہ پیمائی اور نقل و حرکت میں گذارتے تھے۔ اور اُن کی عورتیں ایک وقت خاص کے لئے جس مرد سے چاہتی تھیں، مہر لیکر جماع کرتی تھیں۔ اور اس جماع کو نکاح سے مماثل بنانے کے لئے عورت (بھی) اپنے خاوند کو مہر کے طور پر نیزہ اور خیمہ دیتی تھی۔ تاکہ جس وقت خاوند کا دل چاہے عورت اُس خیمے میں آسکے۔"

متعہ | بیشک جس نکاح وقتی کا ذکر امی لنس مارسی لی لنس نے کیا ہی، وہ عرب میں ظہور اسلام سے پہلے رائج تھا۔ کیونکہ یہ بات سبکو معلوم ہے کہ شارع اسلام نے اس نکاح کو اپنے اصحاب کے لئے مباح رکھا تھا۔ اسلام میں یہ ازدواج "متعہ" یا "نکاح متعہ" کے نام سے نامزد ہی۔ اس نکاح کی یہ تعریف بیان کیگئی ہے کہ:۔

"متعہ" وہ نکاح ہی، جو ایک زمانۂ معینہ کے لئے منعقد کیا جائے، اور اُس مدت کے گزرنے کے بعد خود بخود ٹوٹ جائے۔"

متعہ کے تاریخی بیان میں بہت سے فوائد ہیں۔ خصوصًا ایک مورّخ کو زمانۂ جاہلیت اور زمانۂ اسلام کے تعلقات معلوم کرنے میں اس سے بہت کچھ مدد ملتی ہی۔ لہذا تاریخی بحث کو مکمل بنانے کے لئے اُسکا بیان کرنا ضرور ہے۔

قرآن میں متعہ کا ذکر | متعہ پر گفتگو کرنے، اور اُسپر غور و خوض کرنے سے پہلے اس بات کا جاننا ضروری ہے کہ قرآن اس مسئلہ میں کیا کہتا ہی۔ لہذا ہم سب سے پہلے قرآن کی اُن آیات پر نظر ڈالتے ہیں، جو صراحۃً یا اشارۃً، متعہ سے تعلق رکھتی ہیں۔ سورۂ نسا، جو ہجرت کے تیسرے اور پانچویں برس کے درمیان نازل ہوئی ہی، اُس کی ۲۴ ویں آیت میں مذکور ہے کہ:۔

| | |
|---|---|
| أُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ أَنْ | (جو عورتیں تم پر حرام کیگئی ہیں) اون کے علاوہ (سب عورتیں) تمھارے لئے حلال ہیں۔ بشرطیکہ اُن کو شہوت رانی کے لئے نہیں بلکہ قید نکاح میں لانے کی غرض |

| | |
|---|---|
| تبتغوا باموالکم محصنین غیر مسافحین فما استمتعتم به منهن فاٰتوهن اجورهن فریضة (سورهٔ نساء ۴- آیة ۲۴ | سے مہر کے بدلے نکاح کرنا چاہو۔ پھر جن عورتوں سے تم نے لطف صحبت اُٹھایا ہو اُن سے جو مہر ٹھیرا تھا اُن کے حوالہ کرو" |

متاخرین علماء اہل سنت کے نزدیک یہ آیۃ موجودہ مصطلح نکاح شرعی پر دلالت کرتی ہے۔ اور اس لئے وہ اپنی تفسیروں میں اس آیت کے لفظ "اُجور" کی تعبیر لفظ "مہور" سے کرتے ہیں۔ اکثر مفسرین قرآن کی یہی رای ہے لیکن بعض کی رای اس کے خلاف ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ آیت صریح "نکاح متعہ" پر دلالت کرتی ہے۔ مثلاً ابن عباسؓ سے منقول کیا جاتا ہے کہ اُنھوں نے "فما استمتعتم به منهن فاٰتوهن اجورهن" کی یہ تفسیر کی ہے کہ:—

"جن عورتوں سے تم نے ایک وقت معینہ تک فائدہ اُٹھایا ہو، اُن کا اجر اُن کو دیدو"

**حدیث میں متعہ کا ذکر** اس تفسیر سے یہ پایا جاتا ہے کہ آیت مذکورۂ بالا میں نکاح وقتی یا "نکاح متعہ" پر صاف اشارہ ہے۔ اگرچہ قرآن کی اور کسی آیت میں متعہ کا ذکر نہیں پایا جاتا، لیکن اس مسئلہ کے متعلق حدیثیں اس کثرت سے پائی جاتی ہیں جن سے اس بحث پر کافی روشنی پڑ سکتی ہے۔

اُن حدیثوں کا خلاصہ یہ ہے کہ شارع اسلام نے "نکاح متعہ" کو اپنے اصحاب کے لئے بیشک جائز رکھا تھا لیکن اس بات میں اختلاف ہے کہ یہ اجازت کس زمانہ میں ملی، اور آیا یہ اباحت منسوخ بھی ہوئی یا نہیں۔

اس مضمون کے پڑھنے والوں کو چاہیے کہ وہ اس مسئلہ میں اپنی اظہار رای کو احادیث مندرجۂ ذیل سے مستند کریں۔ اس مسئلہ کے متعلق سب سے اہم وہ حدیث ہے، جسکو سبرۃ الجہنی نے نقل کیا ہے۔ وہ بیان کرتا ہے کہ:

"رسول اللہ نے ہم کو متعہ کی اجازت دی۔ (جب کہ آپ ۸ سنہ ہجری میں مکہ فتح کرنے کے بعد وہیں قیام پذیر تھے)۔ میں اور ایک اور شخص قبیلہ بنی عامر کی ایک عورت کے پاس گئے، جو باکرہ اور دراز گردن تھی۔ ہم نے (نکاح کے لئے) اپنے آپ کو اُسکے سامنے پیش کیا۔ اُسنے پوچھا "کیا (مہر) دوگے؟" میں نے کہا "اپنی چادر"۔ علی ہذا میرے ساتھی نے بھی اپنی چادر کا نام لیا۔ گو میرے ساتھی کی چادر

سیری چادر سے عمدہ تھی، لیکن میں جوانی میں اُس سے بڑھا ہوا تھا۔ جب وہ میرے ساتھی کی چادر کو دیکھتی تو وہ اُسکو اچھی معلوم ہوتی۔ اور جب مجھے دیکھتی، تو میری جوانی سے متحیر رہ جاتی۔ بالآخر اُس نے (مجھ سے) کہا کہ تو اور تیری چادر مجھے کافی ہے۔ میں تین دن تک اُس کے ساتھ رہا۔ اُس کے بعد رسول اللہ نے فرمایا کہ جن کے پاس اس قسم کی عورتیں ہوں، اور وہ اُن سے فائدہ اُٹھا رہے ہوں، تو اُن کو ایسی عورتیں چھوڑ دینا چاہیئے۔" (مسلم۔ جلد ۱۔ صفحہ ۳۹۰۔)

لیکن اسی راوی نے جو ایک دوسری حدیث آنحضرتؐ سے نقل کی ہے وہ کلیتہً حدیث مذکورۂ بالا سے متناقض ہے۔ کیونکہ اس دوسری حدیث سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ شارعِ اسلام نے فتح مکہ کے دن متعہ کو حرام کیا، نہ کہ فتح مکہ کے بعد۔ جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ متعہ فتح مکہ سے پہلے ممنوع نہیں تھا سبرہؓ نے اس دوسری حدیث میں وقت کی بھی تعیین نہیں کی۔ وہ حدیث یہ ہے کہ: —

"اے لوگو! میں نے تم کو عورتوں سے متعہ کرنے کی اجازت دی تھی (لیکن) اب خدا نے قیامت تک اُسکو حرام کر دیا ہے۔ پس جن لوگوں کے پاس اس قسم کی عورتیں ہوں، اُن کو اُنھیں چھوڑ دینا چاہیئے۔ اور اُن کو جو کچھ دیا ہے وہ واپس لینا چاہیئے۔" (مسلم۔ جلد ۱۔ صفحہ ۳۹۰)

سلمہ جو رواۃ حدیث میں سے ایک مشہور شخص ہے، اُسکے بیان سے یہ مستنبط ہوتا ہے کہ نکاحِ متعہ "جنگِ اوطاس" کے دن حلال کیا گیا، یعنی بعد فتح مکہ۔ لیکن تین دن کے بعد آنحضرتؐ نے اُسکو ممنوع کر دیا۔ (مسلم۔ صفحہ ۳۹۶)۔

باقی حدیثوں سے، جن میں خصوصاً حضرت علیؑ کی روایت بھی شامل ہے، یہ ظاہر ہوتا ہے کہ متعہ، جنگ خیبر (۷ھ ہجری) میں فتح مکہ سے قبل منع کیا گیا (مسلم۔ صفحہ ۳۹۶)

مذکورۂ بالا بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ متعہ کی تحلیل و تحریم کا زمانہ معین کرنے میں تمام حدیثیں باہم متناقض ہیں۔ علماء اسلام نے اُن اقوالِ متباین، اور احادیث متناقض میں تطبیق دینے کی کوشش کی ہے۔ اُنھوں نے اس اختلاف کا فیصلہ اس طرح کیا ہے کہ: — شارعِ اسلام نے دو مرتبہ متعہ کی اجازت دی، اور دو مرتبہ ممانعت کی۔ اور آخری مرتبہ قیامت تک کے لئے ناجائز کر دیا

لیکن بعض حدیثیں اس رائے کے بھی خلاف ہیں۔ اس لئے کہ اُن میں خود شارعِ اسلام کا متعہ کو منع کرنے، اور اسکے احکام کا کچھ ذکر نہیں کیا گیا۔

مثلاً بعض احادیث میں جو عبداللہ ابن مسعود سے منقول ہیں، بیان کیا گیا ہے کہ آنحضرت نے جب بعض غزوات میں اپنے اصحاب کی نسبت یہ سُنا کہ وہ عورتوں کی کمی کی وجہ سے خصی ہونے کا ارادہ رکھتے ہیں، تو آپ نے اُن کو اس فعل سے منع کیا۔ اور اجازت دی کہ کپڑے، یا ایسی ہی کسی اور ادنیٰ شے کے معاوضہ میں ایک وقت خاص کیلئے عورتوں سے نکاح کرلیں۔ (مسلم صفحہ ۳۹۴-۹۵)

اس حدیث میں اسکا کچھ ذکر نہیں، کہ شارعِ اسلام نے اسکے بعد متعہ کی ممانعت بھی کی۔ بلکہ دوسری حدیثوں سے یہ مستنبط ہوتا ہے، کہ سب سے پہلے حضرت عمرؓ نے متعہ کی ممانعت کی۔ حدیث مندرجۂ ذیل سے جو خود اُن ہی کی طرف منسوب ہے، ثابت ہوتا ہے کہ وہ متعہ کے سخت دشمن تھے۔ وہ حدیث یہ ہے کہ:—

"اگر میرے سامنے کوئی ایسا مرد پیش کیا گیا جس نے ایک مانۂ معینہ کے لئے کسی عورت سے نکاح کیا ہو، تو میں اسکو سنگسار کرونگا۔" (کشاف۔ جلد ۱۔ صفحہ ۲۵۲)

جابر بن عبداللہ کے بیان سے بھی اس امر کی تائید ہوتی ہے۔ ایک حدیث میں مذکور ہے کہ جابر بن عبداللہ سے متعہ کی نسبت دریافت کیا گیا، تو اُنھوں نے جواب دیا کہ:—

"ہاں، ہم رسول اللہ اور ابوبکرؓ کے زمانہ میں مدتوں تک ایک مُٹھی پھل اور آٹے کے بدلے میں متعہ کیا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ عمرؓ نے منع کردیا۔" (مسلم صفحہ ۳۹۰)

اس بحث میں سب سے زیادہ اہم حدیث وہ ہے جو عبداللہ ابن عباس سے نقل کی گئی ہے۔ وہ یہ ہے کہ:—

"متعہ خدا کی ایک رحمت تھی، جو اُس نے اپنے بندوں پر نازل فرمائی تھی۔ اگر عمرؓ اسکو منع نہ کرتے، تو بجز شقی کے اور کوئی زنا نہ کرتا۔" (تفسیر قرطبی۔ سورۂ نساء)

بعض کا خیال ہے کہ وہ شخص متعہ کی ممانعت کو حضرت عمرؓ کی طرف منسوب کرتا ہے، جو خود آنحضرت کی ممانعت سے ناواقف ہے لیکن ابن عباس نے اسکا کچھ ذکر نہیں کیا۔ البتہ ایک حدیث

میں حضرت علیؓ کا وہ جواب منقول ہے جو انھوں نے ابن عباسؓ کو متعہ کی نسبت دیا تھا کہ:-

"ٹھیر اے ابن عباسؓ! خیبر کے دن رسول اللہؐ نے متعہ کی ممانعت کردی تھی" (مسلم صفحہ ۴۹)

بعض لوگوں نے بیان کیا ہے کہ ابن عباسؓ نے اپنے مرض الموت میں توبہ کی، اور متعہ کی حلت سے رجوع کیا۔ لیکن چونکہ اسپر کوئی دلیل قائم نہیں کیگئی، لہذا اِسکی تصدیق نہایت مشکل ہے۔

جو کچھ اوپر بیان کیا گیا ہے، اُس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ حدیثیں اس بارہ میں نہایت متناقض ہیں کہ شارع اسلام نے متعہ کو منسوخ کیا یا نہیں۔ اہل سنت اُس کے منسوخ ہونے پر اعتقاد رکھتے ہیں اُن کے استدلال کا ماخذ یا تو وہ حدیثیں ہیں، جو متعہ کی حرمت میں بیان کی گئی ہیں، اور یا سورہ نساء کی وہ ۲۴ ویں آیت ہے جس میں اُن کی رائے کے مطابق نسخِ استمتاع کا ذکر ہے، نہ کہ معمولی نکاح کا۔

بعض لوگ صرف قرآن ہی پر نسخ متعہ کی بنا رکھتے ہیں۔ اور سورۂ مومنون و معارج کی آیتوں سے استدلال کرتے ہیں، چنانچہ حضرت عائشہ رضؓ سے یہ آیات نقل کیگئی ہیں کہ:-

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ... وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ۔ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ۔

"ایمان والے مُراد کو پہنچ گئے ....... اور وہ جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ مگر اپنی بیبیوں، یا اپنی لونڈیوں سے کہ اس میں) اُن پر کچھ الزام نہیں لیکن جو اسکے علاوہ طلبگار ہوں تو وہی لوگ حد (شرع) سے باہر نکلے ہوئے ہیں۔"

{ مومنون۔ آیت ۵۔ ۶۔ ۷
{ معارج۔ آیت ۲۹۔ ۳۰۔ ۳۱

پس متعہ اس حکم کے مطابق کسی طرح جائز نہیں۔ اسلئے کہ "وہ نہ نکاح ہے، اور نہ ملک یمین" لیکن یہ ایسا دعویٰ ہے جسپر کوئی دلیل نہیں۔ بلا شبہ اس مقام پر حضرت عائشہ سے وہ غلطی واقع ہوئی ہے جس کو منطقی اصطلاح میں "دور" ( ) کہتے ہیں۔

**شیعوں کا استدلال حلت متعہ پر قرآن سے**

لیکن شیعہ، بخلاف اہل سنت کے، متعہ کو قرآن کی رو سے حلال اور

غیر منسوخ خیال کرتے ہیں۔ اور اُن حدیثوں کو جن میں متعہ کی منسوخیت کا ذکر ہے، عمرؓ کی طرف منسوب کرتے ہیں، نہ کہ شارعِ اسلام کی طرف۔

بعض مسلمانوں نے، شیعیت کیطرف، مامون کا میلان دیکھ کر اس رسم کو پھر دوبارہ زندہ کرنا چاہا تھا، لیکن اُن کو کامیابی نصیب نہیں ہوئی۔ اس لئے کہ جب قاضی یحییٰ بن اکثم کو اسکی اطلاع ہوئی، تو اُس نے مامون کو یہ سمجھایا کہ نصوصِ قرآنی، اور احادیثِ صحیحہ کی رو سے متعہ اور زنا میں کچھ فرق نہیں، اور سورۂ مومنون کی آیت (مذکورۂ بالا) پڑھ کر سنائی۔ چنانچہ مامون نے اپنی راے سے رجوع کیا، اور اُسی وقت حکم دیا کہ حرمتِ متعہ کی منادی کرا دیجائے۔ (ابن خلکان۔ ذکر یحییٰ ابن اکثم)

مذکورۂ بالا بیان سے ہمارے نزدیک یہ ثابت ہوتا ہے، کہ متعہ ایک ایسا وقتی نکاح ہے، جو مدتِ معینہ گزرنے کے بعد، بلا طلاقِ شرعی کے خود بخود فسخ ہو جاتا ہے۔ اور نیز یہ کہ مرد معاوضہ اُس تمتع کے جو وہ عورت سے حاصل کرتا ہے، اُسکو ہدیہ، یا مہر دیتا ہے۔ لیکن فرق اتنا ہے کہ نکاحِ متعہ میں ولی اور شہود نہیں ہوتے۔ (نووی بر مسلم۔ صفحہ ۳۹۶)

اس بات کو سب جانتے ہیں، کہ شیعہ آج تک نکاحِ متعہ کو اُس شخص کے لئے جائز قرار دیتے ہیں، جو دوسری قسم کا نکاح نہ کرنا چاہے۔

ابن عباسؓ سے، جو اِس مسئلہ میں شیعوں کے ملجا و ماوا ہیں، روایت کی گئی ہے، کہ جب اُن سے متعہ کی نسبت سوال کیا گیا تو اُنھوں نے جواب دیا کہ:-

"آنحضرتؐ صرف ضرورت کے وقت، متعہ کی اجازت دیتے تھے۔"

(بخاری مع شرح قسطلانی۔ جلد ۸۔ صفحہ ۳۰)

اور خصوصاً ابتدائے اسلام کے اُن متواتر غزوات میں جبکہ اسلامی فوج اپنی عورتوں کو اپنے ساتھ نہیں رکھتی تھی۔ جیسا کہ اکثر حدیثوں میں دیکھا جاتا ہے۔ لیکن ایک اور حدیث میں جسکی اسناد ابن عباسؓ تک پہنچتی ہے، مذکور ہے کہ عرب ابتداے اسلام میں جب کبھی کسی شہر میں اُترتے، تو متعہ کیطرف جھک پڑتے تھے۔ ہر شخص اپنے لئے ایک عورت مخصوص کر لیتا، اور جبتک اُس شہر میں رہتا، اُس عورت کے ساتھ رہتا

اور کوچ کیوقت تک اُس سے جماع کرتا۔ (ترمذی۔ جلد ا صفحہ ۱۴۳)

**عرب میں متعہ کا وجود زمانۂ حال میں** یہ رسم بہت قریب زمانہ تک عرب میں جاری رہی ہے۔ اس دعوی کی تائید میں ایک انگریز سیاح ہملٹن (                ) کا چشم دید بیان پیش کیا جاسکتا ہے۔ وہ اپنے سفرنامہ میں، جسکا نام "مشرقِ بلادِ ہند کی نئی روشنی" ہے، لکھتا ہے کہ:۔

"یمن کا سب سے بڑا شہر سنان ہے، جو مکہ سے پندرہ دن کے فاصلہ پر جانبِ شمال واقع ہے، اسکی اندرونی تجارت نہایت وسیع ہے۔ ہندوستان کا اکثر مال، جو مکہ جاتا ہے، یہیں سے ہوکر گزرتا ہے یہاں ہر ایک صنعت وتجارت کا علحدہ علحدہ بازار ہے۔ مسافر کی تمام ضروریات نہایت سہولت سے بازاریں دستیاب ہوتی ہیں۔ میں نے اکثر سڑکوں پر عورتوں کے دلال پھرتے ہوئے دیکھے ہیں۔ جس مسافر کا شہر میں کوئی ٹھکانا نہو وہ نہایت سہولت اور تھوڑے خرچ پر کسی عورت سے نکاح کرکے وہاں سکونت اختیار کرسکتا ہے۔ اسکی صورت یہ ہے کہ کسی عورت کو دیکھنے کے بعد، پسند کرے۔ اُسکی قیمت سے اُسکو خود تعجب ہوگا۔ ہفتہ، مہینہ، یا سال، غرضکہ جتنی مدت تک اُس کو عورت کے ساتھ رہنا منظور ہو، اُسکی تعیین کردے پھر عورت کے ہمراہ قاضی، یا حاکمِ شہر کے سامنے جاکر اُسکے رجسٹر میں اپنے دونوں کے نام، اور شرائطِ نکاح، جن پر فیصلہ ہوا ہے، درج کرادے۔ اِس کارروائی میں ایک شلنگ سے زیادہ خرچ نہیں ہوگا۔ پھر مرد قاضی کے سامنے، اپنا ہاتھ عورت کے ہاتھ میں دے، تاکہ نکاح پورا ہوجائے، اور اسی رسم کی بدولت مدتِ معینہ گزرنے تک نکاح شرعی خیال کیا جائے۔ یہ عورت ومرد اِس بارہ میں دونوں آزاد ہیں، کہ جسوقت جی چاہے، ایک دوسرے سے علحدہ ہوجائیں۔ اور یا مدتِ معینہ گزرنے پر پھر دوبارہ عقد کرلیں۔ لیکن اگر اِن دونوں میں سے ایک فریق انقضاءِ مدتِ معینہ سے پہلے دوسرے سے علحدہ ہونا چاہے، تو اُس پر لازم ہوگا کہ فریقِ ثانی کو وہ رقم واپس دے، جو اُسپر خرچ ہوئی ہو۔ یا شرائطِ انعقادِ نکاح کے مطابق اُسکے ساتھ رہے۔ اور اسکے بعد اسیطرح جب چاہے نکاح کرلے۔" (جلد ۲۔ صفحہ ۵۲۔ ۵۳۔)

**عرب جاہلیت میں متعہ کا وجود** ہم نے اوپر بیان کیا ہے کہ متعہ، بعینہٖ یا تو نکاح وقتی ہے، یا ایسا نکاح معینہ ہے جس کا ذکر امی نس مارسی لی نس نے کیا ہے۔ اور یہ ایک ایسی رسم تھی، جو عادۃً عرب جاہلیت میں رائج

تھی۔ اور شارعِ اسلام نے اپنے اصحاب کے لئے اُسکو جائز رکھا تھا۔ مگر بعض احادیث متعلق متعہ اس رائے کے خلاف ہیں۔ اور اس تناقض سے تعجب ہوتا ہے۔ اِس لئے کہ اگر نکاح متعہ اسلام سے پہلے عرب میں عادۃً رائج نہیں تھا، تو پھر ہمکو یہ معلوم کرنے میں سخت مشکل پیش آتی ہے کہ شارعِ اسلام کو نکاحِ متعہ تک کیسے رسائی ہو سکی۔ اگر قومِ عرب میں یہ رسم شائع نہ ہوتی، اور اُسکی طبیعتیں اس سے مانوس نہ ہوتیں، تو ایسی عورتوں کا وجود ملنا نہایت مشکل ہوتا، جو اپنے آپ کو چند درہم، یا ایک مٹھی آٹے یا ایک مٹھی پھل کے بدلے میں بیچ ڈالا کرتیں۔ حالانکہ ہم فی الواقع اسکے خلاف دیکھتے ہیں۔ جیسا کہ سبرۂ جہنی کی حدیث مذکورۂ بالا سے ثابت ہوتا ہے کہ عورت متعہ پر نہایت سہولت سے راضی ہو جاتی تھی، اور ایک شخص بھی اُسکی اس حرکت کو اجنبیہ کی نظر سے نہیں دیکھتا تھا۔

عرب جاہلیت میں شیوعِ متعہ پر یہ ایک ایسی قوی دلیل ہے، جس سے سوائے ہٹ دھرم کے اور کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا۔

راقم

(محمد اختر۔ حیدرآباد دکن۔)

# پارسیوں کے حالات

ہندوستان کی مجموعی آبادی میں اگرچہ پارسی آٹے میں نمک کیطرح ہیں لیکن جو نمایاں ترقی اس قوم نے ایک بیگانہ مُلک میں شیر و شکر ہو کر کی ہے اور کرتی جاتی ہے، دوسری ہندوستانی اقوام خاصکر مُسلمانوں کو اُن سے سبق حاصل کرنا چاہئے۔ قبل اسکے کہ اِس قوم کے حالات پر رائے زنی کیجائے سرسری طور سے اُن کے ہندوستان میں آباد ہونے کی کیفیت تحریر کیجاتی ہے۔

خلیفہ ثانی حضرت عمرؓ کے مبارک زمانے میں، جبکہ شام و روم میں تثلیث کی صلیب توحید کے علَم کے سامنے سرنگوں ہو رہی تھی، آتشکدۂ فارس مسلمانوں کے جلانے کیواسطے بھڑک اُٹھا، مگر اسلامی سیلاب قادسیہ کے مشہور میدان میں آناً فاناً ان شعلوں کو بجھا کر مدائن پہنچگیا۔ اور ساتھ ہی سال

میں نہاوند کے آخری سخت معرکہ میں، جو ۶۴۲ء میں واقع ہوا اور جس میں نسلِ ساسانی کا چراغ یزدگرد ثالث کے مرتے ہی گُل ہو گیا، ملکِ عجم خراسان تک نورِ اسلام سے منور ہو گیا۔ امن و امان قائم ہو گیا اور حقانیتِ اسلام نے وہ زور باندھا کہ پارسیوں کے خاندان بلا جبر و اکراہ مسلمان ہونا شروع ہو گئے۔ اِس بات کے ثبوت دینے کی اب چنداں ضرورت نہیں کہ اسلام محض بزورِ شمشیر نہیں پھیلا جسے منصف مزاج یورپین بھی اب قائل ہو گئے ہیں اور ہوتے جاتے ہیں۔ مسٹر براؤن جو آجکل انگلستان میں مشرقی علوم کے بڑے ماہر سمجھے جاتے ہیں، اپنی کتاب "لٹریری ہسٹری آف پرشیا" (تاریخ ادب فارسی) کے صفحہ (۲۰۰) کے آخر میں تحریر فرماتے ہیں کہ:—

"عموماً ایسا خیال کیا جاتا ہے کہ فاتحانِ اسلام بس دو ٹوک فیصلہ کرتے تھے، کہ یا تو قرآن مجید کو مانو، یا تلوار کے گھاٹ اُتر جاؤ۔ مگر حقیقۃً یہ بات نہیں۔ کیونکہ گبر و ترسا اور یہود ہر ایک کو مذہبی معاملہ میں بالکل آزادی تھی، ہاں صرف اُن سے جزیہ لیا جاتا تھا، جو ایک منصفانہ انتظام تھا۔ کیونکہ خلفا کی ذمی رعایا اس جزیہ دینے کے بعد تمام قومی خدمات اور صدقات سے، جو مسلمانوں پر فرض تھے، بری ہو جاتی تھی۔"

واقعی یہ اسلام کی سیدھی سادی۔ مگر سچی اور پر اثر تعلیم کا نتیجہ تھا کہ جس نے دلوں کو مسخر کر لیا تھا۔ تہذیب کا اعلیٰ نمونہ دکھا دیا تھا، اور دینی اور دُنیاوی ترقی کی راہیں بتا دی تھیں۔ یہی وہ ادائیں تھیں، جنھوں نے دلوں کو بیچین کر کے شیفتہ بنا لیا تھا۔ اور پھر لطف یہ کہ فاتح اور مفتوح ایک ہی رنگ میں رنگ گئے۔ یہانتک کہ اُنھیں مفتوحوں کی مدد سے ابو مسلم خراسانی نے بنی عباسؓ کی حمایت پر کمر باندھ کر بنی امیہ کو سن ہجری کی آخری صدی میں شکست فاش دیکر عجم ہی میں پایۂ تخت اسلام قائم کر دیا۔ اُسی زمانہ میں، جبکہ بنی عباسؓ اور بنی امیہ لڑ رہے تھے، جبکہ شخصی اغراض نے قومی ترقی کو خاک میں ملا رکھا تھا۔ عالمِ اسلام میں فتنہ و فساد کی آگ بھڑک رہی تھی، مسلمان مسلمان پر تلوار کھینچ رہے تھے، ذمیوں کے حقوق کی کون پرواہ کرتا تھا۔ اِسی پُر آشوب زمانے میں پارسیوں کی ایک قلیل جماعت جو خراسان کے پہاڑی حصے میں آباد تھی، اپنے وطنِ مالوف کو ۷۹۶ء میں خیرباد

لنگر ہندوستان کو براہ دریا روانہ ہوئی، اور خلیج کھمبات کے ایک چھوٹے سے جزیرہ ڈیو میں جو کاٹھیاواڑ کے جنوب میں واقع ہے جا اتر پڑی۔ لیکن وہاں کے باشندوں سے جنمیں سب ہندو ہی ہندو تھے تخالفِ مذہبی کے باعث اَن بن رہی اور سخت آفت کا سامنا رہا۔ یہانتک کہ ۱۹ ہی برس میں جلاوطنی کی دردناک مصیبت پھر اٹھانا پڑی۔ بیچارے اپنی غمزدہ اہل وعیال کو ساتھ لیکر باچشم گریاں ایک چھوٹے سے جہاز پر سوار ہو کر تن بہ تقدیر ایک سمت کو چل نکلے۔ اس سفر کا قصہ سندباد جہازی کی داستان سے کچھ کم نہیں۔ غرضکہ طرح طرح کی مصیبتیں جھیلتے ہوئے آخر کار سنہ ۷۱۶ء میں دمن سے پچیس میل جنوب کی طرف سنجان پہونچے۔ جہاز سے اُتر کر تاجروں کی حیثیت سے کچھ تحفہ تحائف لیکر وہاں کے حاکم جادوے رانا کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اور اپنا پُردرد قصّہ کہہ سنایا۔ رانا کو اُنکے حالِ زار پر کمال رحم آیا اور اپنے ملک میں آباد ہونے کی اجازت دی، مگر اس شرط سے کہ "گئو ماتا" کی پوجا کریں اور گئو ستر" (پیشاب) سے طہارت کرتے رہیں۔ اِس غریب شکستہ دل جماعت کو سوائے اسکے کہ قہرِ درویش بجانِ درویش، یہ ناگوار شرط منظور کریں ورنہ جزیرہ ڈیو کے واقعہ کیطرح پھر صعوباتِ سفر اختیار کریں، اور کیا چارہ تھا۔ چنانچہ بعد اِس قول وقرار کے جس میں اور بھی چند معاشرتی امور تھے مثلاً لباس اور زبان میں اپنے ہندو بھائیوں سے مشابہت پیدا کریں۔ شادی بیاہ کی رسمیں قریب قریب ہندوؤں کے بجالائیں، سنجان کا ایک ویران حصہ اُن کے آباد ہونے کیواسطے عطا ہوا جس کو اِس خانماں برباد جماعت نے کمال استقلال اور جفاکشی سے تھوڑے ہی عرصے میں ہرا بھرا باغ بنا دیا۔ پھر رانا کی اجازت سے سنہ ۷۲۱ء میں پہلا آتشکدہ اُس سرزمین میں تعمیر کیا جہاں اُس نورِ مطلق کا جلوہ شعلۂ جوّالہ کی شکل میں نمودار ہو کر اپنا جلال دکھلانے لگا۔ سچ ہے ؎

فرق گر ہے تو مراتب کا وگرنہ اے دوست
جا بجا ڈھونڈھتے ہیں گبر ومسلماں تجھکو

تقریباً ساڑھے چار سو برس تک پارسی آبادی کا مرکز سنجان ہی رہا اور وہیں سے جا بجا احاطۂ بمبئی میں اُن کے جرگے آباد ہوتے گئے۔ سنہ ۱۲۹۵ء میں، جبکہ علاؤالدین خلجی نے گجرات پر حملہ کیا تو سنجان کی ہندو ریاست نے خوب دادِ جوانمردی دی۔ اور ساتھ ہی پارسیوں نے بھی، جنھوں نے اِس پانچسو برس

کے عرصے میں کبھی ہتھیار نہیں اُٹھایا تھا، خوب جی توڑ کر مقابلہ کیا لیکن مسلمانوں کے پُرجوش حملوں کے سامنے کچھ پیش نہ گئی۔ سنجان فتح ہوگیا اور پارسی پھر خانہ بدوش ہوگئے۔ مگر اس واقعہ سے پارسیوں کا بہ لحاظِ آبادی کچھ زیادہ نقصان نہ ہوا۔ کیونکہ اتنی مدت میں جنوبی ہندوستان کی بڑی بڑی بندرگاہوں میں انکا قدم جم گیا تھا، ہاں سنجان کی مرکزی طاقت جو بلحاظ قدامت اور دینی وقعت کے مُسلّمہ تھی، جاتی رہی۔

سنجان کی تباہی کے بعد پارسیوں کی قوت نوساری میں جو آجکل مہاراجہ صاحب گائیکوار کی عملداری میں، پارسی آبادی کا ایک زرخیز، خوشقطع اور دلفریب چھوٹا سا شہر ہے، منتقل ہوگئی۔ اور یہیں پر پارسیوں نے محض کاشتکاری پر اکتفا کر کے تجارت کے دن دونے رات چوگنے پیشہ پر توجہ کی پھر تو یہ حال ہوا کہ ہندوستان کے مغربی ساحل کا ٹھیکہ انھیں کو ملگیا۔ ایک ایک پارسی کا گھر دولت سے بھر گیا اور رفتہ رفتہ ہمسایہ قوموں کے "قاضی الحاجات" بن بیٹھے۔

خوش قسمتی سے اسی زمانے میں مغربی سوداگروں نے ہندوستان کا رُخ کیا۔ تجارت کی گرم بازاری شروع ہوگئی، اور پارسیوں کی بن آئی۔ پرتگیزی دور میں پارسیوں نے نمایاں ترقی کی اور پھر جب ۱۶۶۸ء میں انگریزوں کو بمبئی مل گیا اور برٹش اقبال کا ستارہ چمکنے لگا، پارسیوں کے گویا پر لگ گئے۔ اِس دو سو برس کے عرصے میں ایک طرف تو انھیں مغربی سوداگروں نے، جو لطبر آ حیثیت سے ہندوستان میں آئے تھے، کوسِ لِمَنِ المُلک بجا دیا۔ اور دوسری طرف اس غریب الدیار ایرانی نژاد خانماں برباد جماعت نے جو مسافرانہ طور سے سرزمینِ ہند میں وارد ہوئی تھی، دولت وثروت کے دریا بہا دیئے۔ بیشک ؎

چراغے راکہ ایزد برفروزد کسے کو پف زند ریشش بسوزد

آج جو ترقی۔ فارغ البالی۔ قومی ہمدردی، اس قوم میں ہے، ہندوستان کی دوسری قوم میں کم پائی جاتی ہے۔ انگریزوں میں جو وقعت آجکل اس معاملہ فہم قوم کی ہے، دوسری کو کم نصیب ہے۔ اور واقعی یہ جماعت اس قابل ہے کہ اس کی قدر کیجائے۔ پہلے درجہ کی زمانہ شناس

راست معاملہ، جفاکش، باہمہ و بے ہمہ، قومی ہمدرد۔ جماعت کے انھیں اوصاف نے اسکو اس درجہ پر پہنچایا ہے کہ دیگر اقوام ہندوستان کو رشک کرنا چاہیئے۔

اِس گروہ میں تین خاص وصف ایسے ہیں جن کے باعث سے اسکو یہ عروج ہوا ہے۔ اوّل تو زمانہ شناسی، جسکا ثبوت مذکورہ بالا حالات سے مِلتا ہے۔ دوسرے اُصولِ تجارت کو سمجھنا۔ اور اَلْکَاسِبُ حَبِیْبُ اللہ کا مصداق ہونا۔ تیسرے۔ ہمدردی، جو شرفِ انسانی کی اعلیٰ صفت ہے جسکی تائید ذیل کی مثال سے ہوتی ہے۔

سنہ ۱۸۵۴ء میں اس جماعت کے سربرآوردہ لوگوں نے بمبئی میں جو آجکل پارسیوں کا دارالامان ہے، اس امر پر شوریٰ کیا کہ ایرانی زردشتیوں کی واجب الرحم حالت کی درستی کیونکر کیجائے۔ چنانچہ فوراً قومی فنڈ کھلگیا۔ فیاض پارسیوں نے دل کھولکر مدد دی۔ اور اُسی سال ایک ڈیپوٹیشن بحمایت سفیر برطانیہ ایران روانہ ہوا جس نے باوجود متواتر ناکامیابیوں کے ہمت نہ ہاری۔ اور اٹھارہ برس تک سرگرمی سے کوشش جاری رکھی، جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ مرحوم ناصرالدین شاہ ایران نے کمال انصاف پسندی سے پارسیوں کی ہمت اور ہمدردی کی تعریف کر کے یزد اور کرمان کی زردشتی رعایا سے بہت سے حکام کی بیجا زیادتیاں اُٹھادیں۔ اور مثل مسلمانوں کے اُن کو حقوق عطا کردیئے۔

اے اہل اسلام خوابِ غفلت سے بیدار ہو۔ تمہاری بھی ہندوستان میں وُہی حالت ہے، جو ان پارسیوں کی ایران میں ہوگئی تھی۔ صرف فرق یہ ہے کہ تمکو آزادی ہے۔ انصاف پسند اور تعرض نکرنیوالی گورنمنٹ برطانیہ کے زیر سایہ اگر کمرِ ہمت باندھو، بہت کچھ ترقی کرسکتے ہو جنگجوئی کا زمانہ گیا، اب معاملہ فہمی چاہیئے۔ اَلْکَاسِبُ حَبِیْبُ اللہ تمہارا لقب تھا۔ اب غیروں نے اس تمغہ کو چھین لیا ہے۔ انسانی ہمدردی قومی اخوت تمہارا ہی شعار تھا، مگر اب یہ حال ہے کہ آپس ہی میں ایک دوسرے کو نہیں دیکھ سکتے۔ کیا ہم اسپر بھی خیرالامم کہلانے کے مستحق ہیں۔ فَاعْتَبِرُوْا یَا اُولِی الْاَبْصَار۔ ہاں اے مسلمانو! اب مفاخرت کا زمانہ نہیں۔ پس اپنے سلفِ صالحین کی عظمت کی یاد اس لحاظ سے ہو کہ جوش و غیرت و لولہ محرکِ عمل ہوسکے، نہ کہ خشک تفاخر پیدا کرے۔ دیکھو یہ پارسی کون ہیں؟ انھیں کے

آبا و اجداد شہنشاہ کہلاتے تھے، انھیں کا دور دورہ تھا۔ انھیں کیواسطے (خدا بخشے) عرفی نے کتنا پُر درد شعر کہا ہے جس میں ان کی گذشتہ عظمت کا فوٹو کھینچ دیا ہے۔ کہتا ہے ؎

از نقش و نگارِ در و دیوارِ شکستہ　　آثار پدید است صنادیدِ عجم را

وہ شہنشاہ انھیں میں سے تھا جسکے دورانِ عدل میں ہمارے رسولِ برحق نے اپنے پیدا ہونے پر فخر کیا تھا۔ طاقِ کسریٰ۔ تاجِ کیانی انھیں کا تھا۔ مگر اب وہ گذشتہ جاہ و جلال ان کے کس کام کا ہے۔ سچ ہے۔ شعر ؎

گوہرے از زندگی از گُہرِ خویش گیر　　تا بکے این عزّ و ناز از اب و عم داشتن

راقم

نواب علی نیوتنوی۔ از بڑودہ کالج۔

# خازن الدولہ وضیاء السلطنة

خاندانِ قاچاریہ کے چشم و چراغ فتح علی شاہ قاچار کے حرم خانہ کی تاریخ اُن کے نورِ نظر شاہزادہ عضد الدولہ نے لکھی ہے۔ اس کتاب کے پڑھنے سے نہایت دلچسپ حالات ایک شاہی حرم کے آئین و ضبط و انتظام کے معلوم ہوتے ہیں۔ عموماً ایشیائی سلطنتوں کی نسبت بے اُصول و غیر منتظم ہونے کا گمان کیا جاتا ہے۔ لیکن ایسی زبردست شہادتیں ایسے گمان کو بدگمانی ثابت کرتی ہیں۔ بے اُصول سلاطین کا حرمخانہ سب سے زیادہ ابتری کی مثال ہونی چاہیے۔ جب ہم ایسے مشکل موقع کو آئین و ضوابط میں جکڑا ہوا پاتے ہیں تو دوسرے محکموں کے با اُصول و با اسلوب حالت میں ہونے کا قیاس شاید غلط نہ ٹھیرے۔ البتہ جو سلاطین خود لااُبالی تھے اُن کو ہم اعتراض سے نہیں بچا سکتے۔

* فتح علی شاہ قاچار۔ بانیِ سلطنتِ قاچاریہ آغا محمد خان کے بھتیجے اور جانشین تھے سنہ ۱۷۹۷ء میں تخت نشین ہوئے سنہ ۱۸۳۴ء میں رحلت کی۔ خود تعلیم یافتہ تھے۔ اور اہلِ کمال کی صحبت کے شائق۔ اُنکا جانشین اُنکا پوتا محمد شاہ ہوا۔ محمد شاہ کے بعد ناصر الدین سریر آرا ہوئے۔ ناصر الدین کی جگہ اب مظفر الدین شاہ فرمانروا ہیں۔

تاریخ مذکور کا ایک مقام ہم علی گڈہ منتقلی کے ناظرین کی دلچسپی کیواسطے ترجمہ کرتے ہیں - ایں زمانہ میں تعلیم نسواں کا زبانی چرچا ہم میں بہت ہو رہا ہے - اگرچہ نتیجہ شل اور بہت سی ہماری تجویزوں کے ہیچ ہے تاہم تعلیم نسواں سے یک گونہ دلچسپی ضرور ہو چلی ہے - دوسرے غلامی کا مسئلہ اکثر زیر بحث رہتا ہے اور اسکے نام کے ساتھ انواع و اقسام کے مصائب کا تصور ذہن کے سامنے آجاتا ہے جن کی نسبت گمان ہے کہ وہ اُن بیزبانوں پر نازل ہوتی تھیں - بیانِ آیندہ سے واضح ہوگا کہ اُس زمانہ میں تعلیم نسواں کی کیا حالت تھی - اور کنیزکیں کیسے صفات حاصل کرتی تھیں - اور کس راحت و قدر کے ساتھ اُن کی زندگی بسر ہوتی تھی -

# خازنُ الدولہ

خازن الدولہ منجملہ اُن مستورات کے تھی جنکا پایۂ اعتبار بلند تھا - مرحومہ مہد علیا (حرم محترم آقا محمد خاں) کی وفات کے بعد حضرت خاقانی (فتح علیشاہ) نے تمام بیگمات قاجاریہ وغیرہ کو ہدایت کی کہ بجائے مہد علیا کے حرمخانہ سلطنت میں تم منجملہ اپنے ایک کو مقتدا و رئیس منتخب کر لو تاکہ باقی تمام بیگمات اُسکی ہدایت پر کاربند رہیں - اور جو نقد و جنس مقرری مہد علیا کے ذریعے سے تمکو ملتا تھا وہ اُسکے ذریعے سے تمکو ملے - سب نے شورہ کرکے کہا کہ یہ ممکن نہیں کہ ہم اپنے ہم چشموں میں سے ایک کو رئیس بناکر اُس کی اطاعت کریں - البتہ اگر مہد علیا کی کنیزکوں میں سے کسیکو بجائے اُن کے مقرر کر دیا جائے تو بلحاظ احترام مرحومہ کے ہمکو اُس کی اطاعت میں کوئی دریغ نہو گا - اور حرمخانہ مبارک کا اختیار اُسکے ہاتھ میں ہیگا - گلبدن باجی کو مہد علیا کی کنیزوں میں سے انتخاب کرکے اِس منصب پر مقرر کیا - جو کچھ نقد و جنس و جواہر وغیرہ صندوقخانہ مبارک میں تھے وہ اُسکے تصرف میں دیے گئے - اور جو قانون عہد مہد علیا میں تھا، وہی رائج رہا - مواجب لباس - انعام بخشش جو کچھ جس کسیکو ملتا، اُسی کے توسط سے ملتا صندوقدار اُسکا خطاب ہوا - اُسکی مہر پر حسب ذیل شعر کندہ تھا ؎

معتبر در ممالک ایران ٭ قبض صندوقدار شاہجہان - اِس مہر کا اعتبار اس درجہ تھا،

کہ اگر کروڑ روپئے تجار وغیرہ سے طلب کئے جاتے تو وہ بے تردد حوالہ کر دیتے تھے۔ صندوقدار کے اقتدار کا یہ عالم تھا کہ کوئی عورت خواہ وہ حرم شاہی ہوتی، یا کوئی بڑھیا، یا کنیز، بغیر اُس کی اجازت کے نہ حرم سے باہر جا سکتی تھی، نہ اندر آسکتی تھی۔ جب کوئی عورت اندر آنا چاہتی تھی تو صندوقدار ایک بڑے یاقوت کی انگشتری اپنے خواجہ سرا آقا الماس کے ہاتھ بھیجدیتی تھی، جو اندر کی ڈیوڑھی میں آقا یعقوب گرجی کو دکھائی جاتی، وہ اُسکو دیکھکر دربانوں کو دکھاتا اور وہ فوراً جانے کی اجازت دیدیتے۔ جب کوئی باہر جانا چاہتی، تو صندوقدار کی زمرد کلاں کی انگشتری دکھائی جاتی۔ گرمیوں کے موسم میں، جبکہ اہلِ حرم مختلف ییلاقون (سرد مقامات) کو چلی جاتی تھیں، صندوقدار حرمخانہ میں موجود رہتی اور تمام انتظام اُن کے محلوں کی رکھتی۔ اُسکا انتظام عقل و دانائی اور خوبی دیکھکر خاقان مرحوم (فتحعلیشاہ) نے اُسکو بیگمات میں داخل کر لیا۔ اور خازن الدولہ کا لقب عطا کیا۔ شاہزادہ بہاء الدولہ اور سیف اللہ میرزا اُسکے بطن سے تھے۔ صندوقخانہ کے متعلق جسقدر عملہ* منشیوں اور کنیزوں کا خازن الدولہ کی ماتحتی میں تھا، اگر اُسکی تفصیل کیجائے تو ہزار صفحے بھی کافی نہونگے۔ میرزا مریم (جو صالح طہرانی کی اولاد سے تھی، جنکی یادگار مدرسہ و دیگر عمارات مشہور ہیں) خازن الدولہ کی متوفیہ (افسر خزانہ) تھی۔ میرزا پری سیما، میرزا افلاک نازا اور دیگر چند نفر اُسکی محرر تھیں۔ اگر نفرہای ہمایون میں حضرت خاقانی کسیکو خادمانِ حرم وغیرہ میں سے ایک انگشتری عنایت کرتے، یا کوئی اور چیز عطا ہوتی تو ضیاء السلطنۃ خازن الدولہ کو لکھ بھیجتی کہ فلاں ساعت میں فلاں جواہر فلاں خانم کو مرحمت ہوا۔ میرزا مریم اور باقی محرر اُسکو درج کاغذات کر لیتی تھیں، نقد و جنس جواہر وغیرہ جو خزانۂ حرم سے نکلتا، یا خزانہ میں جمع ہوتا، ناممکن تھا کہ خازن الدولہ کے دفتر میں درج نہو۔ خداوند تعالیٰ نے حافظہ اور ہوش اُس کو اتنا قوی دیا تھا کہ جس وقت جو چیز حضرت خاقانی طلب فرماتے، فوراً حاضر کرتی۔ جسقدر اشرفیاں اُسکے ہاتھ پر رکھدیجاتیں، یا سربمہر تھیلی دیتے تو وہ قیاس سے اُن کی مقدار بتادیتی تھی اور جب شمار ہوتا تو اُسکے اندازمیں دو سو تین سو اشرفیوں میں دو یا تین کا فرق نکلتا۔ جواہرات کو تھوڑے سے غور میں بخوبی

* - ایران میں منشی کو میرزا کہتے تھے۔

پرکھ لیتی تھی۔ اُسکا وزن اور اُسکی قیمت ایسی ٹھیک جانچ دیتی تھی، کہ اُستاد جوہری پرکھکر اور تولکر اُسکی جانچ کی تائیدکرتے۔ بغیر طلب بادشاہ کے حضور میں نہیں جاتی تھی۔ ہمہ وقت اپنے عملہ کے ساتھ صندوقخانہ کے محاسبہ اور اہلِ حرم کے کاروبار کے سرانجام میں مصروف رہتی تھی جشنِ نوروز سے دو مہینہ پیشتر ضرور تھا، کہ جشنِ مذکور کے متعلق کل خلعت تیار کرکے اور بقچوں میں باندھکر خسروخاں خواجہ سرا کے ہمراہ حضرت خاقانی کی ملاحظہ میں پیش کردیے جاتے۔ بقچہ پر سرنامہ میرزا مریم کے قلم کا ہوتا تھا۔ خلعت اس انتظام کے ساتھ روانہ کئے جاتے تھے کہ ہر صوبہ کے صدر مقام میں سب تحویلِ آفتاب میں پہنچ جائیں اور حاکمِ صوبہ وقتِ تحویل اُسی خلعت کو پہنے ہو۔

بعض بانوانِ حرمِ محترم ایسی تھیں کہ خازن الدولہ جب اُنکے یہاں جاتی، تو بے اجازت بیٹھ نہیں سکتی تھی۔ لیکن جب وہ اپنے دیوان خانہ میں ہوتی (جو مہدِ علیا کا محلِ نشیمن تھا)، تو اُس سے بالاتر کوئی بیگم نہیں بیٹھ سکتی تھی۔ اُس موقعہ پر تمام بیگیات نہایت ادب اور عاجزی سے عرضِ مطلب کرکے جواب حاصل کرتی تھیں۔ جس قدر نذر وغیرہ عیدِ نوروز یا دوسرے موقعوں پر دربار میں آتی، ممکن نہیں تھا کہ اُس میں سے آبِ لیمو کا ایک شیشہ یا تمباکو کا ایک کیسہ بدون اجازت وتقسیم وتعیین خازن الدولہ کے کوئی لے سکے۔ یہاں تک کہ شاہزادوں کو بھی وہی تقسیم کرتی تھی۔ جسکو وہ اپنی اصطلاح میں "بخشش" کہتے تھے، بادشاہ کا اُسپر اسقدر اعتبار تھا کہ وہ چاہتی تو خزانہ بخش دیتی لیکن باوجود اتنے اعتبار کے غالباً اُسنے دس تومان سے زائد نقد یا جنس بدون عرض واجازت شہریاری اور اندراج دفتر میرزا مریم کے کسیکو عطا نہ کی ہوگی۔

## ضیاء السلطنة

شاہ بیگم خانم ملقب بہ لقب ضیاء السلطنة حضرت خاقانی کی لختِ جگر تھی۔ اُس کی والدہ مریم خانم طائفۂ بنی اسرائیل سے تھی۔ مہدِ علیا نے اُسکو پرورش کیا تھا۔ وفات مہدِ علیا کے بعد اُنکا کل جواہرات واسبابِ تجمل ضیاء السلطنة کو عطا ہوا۔ اُسکا تمام کارخانہ (طویلہ فراش خانہ وغیرہ) دائرہ حرم خانہ سے

علیحدہ تھا۔ معزز معزز آدمی اُس کی سرکار میں ملازم تھے منجملہ اُن کے شعبان علیخان اُسکا وزیر اُس زمانہ کے سرداروں میں نہایت معزز تھا۔ خاقان مرحوم کو ضیاء السلطنۃ سے بیحد محبت تھی۔ تحریر و تقریر میں یگانۂ روزگار تھی بمقتضای اَلْاَسْمَآءُ تَنَزَّلُ مِنَ السَّمَآءِ (نام آسمان سے نازل ہوا کرتے ہیں) اُسکا لقب اُس کے حُسنِ بینظیر و جمال کا ایک نمونہ تھا۔ احکامِ خاقانی کے جو دستخط ہوتے تھے اُس کے قلم سے ہوتے تھے۔ خصوصًا محرمانہ نوشتے جن کسیکو لکھے جاتے تھے، اُس کے ہاتھ کے ہوتے۔ خطِ نسخ خوب لکھتی تھی کلام مجید۔ کتبِ دعیہ۔ اور زیارات کے متعدد نسخے اُس نے اپنے ہاتھ سے لکھے تھے۔ عمومًا اُسکے بھائی اُسکا احترام کرتے تھے۔ ولیعہد مرحوم نے اُس کی شان میں کہا تھا۔ ؎

اے ضیاءُ السلطنۃ رُوحی فداک　　صد گریباں کردم از ہجرِ تو چاک

خاقانِ مرحوم فرماتے ہیں۔ ؎

نورِ چشمِ من ضیاء السلطنۃ　　یک شبہ ہجرِ تو بر ما یک سنۃ

جشنِ میلادِ خاقانی کے موقعہ پر ہر سال بادشاہ۔ اہلِ حرم اور کل شاہزادے اور شاہزادیاں ضیاء السلطنۃ کے مہمان ہوتے تھے۔ ایک عمدہ جواہر ہر سال اس موقعہ پر ضیاء السلطنۃ کو مرحمت ہوتا تھا ایک رقمِ معین اُس کی تحویل میں رہتی تھی، جسکو شاہزادے وغیرہ بوقتِ ضرورت قرض لیکر صرف کرتے تھے۔ ہمیشہ سفر و حضر میں حاضر خدمتِ خاقانی رہتی تھی۔ جو قصائد و اشعار خاقانِ مرحوم کے ملاحظہ کے لیے لکھے جاتے تھے، اُن کو وہی سُناتی تھی۔ اگرچہ اُس کی سفارش و شفاعت بے شُبہہ قابلِ قبول تھی۔ لیکن وہ بمقتضای احتیاط کبھی کسی کی سفارش نہیں کرتی تھی۔ عہدِ خاقانِ مرحوم میں بہتسے لوگوں نے اُس کے نکاح کی تمنا کی لیکن اُسنے قبول نہیں کی۔ بعدِ رحلتِ خاقان ۳۷ برس کے سن میں حاجی میرزا مسعود وزیر خارجہ کے ساتھ اُس نے اپنی شادی کی۔ جس رات کہ وہ حرم خانہ سے رخصت ہوتی تھی۔ شاہنشاہ مرحوم محمد شاہ رخصت کرنے آئے تھے۔ تمام شاہزادے وزیر خارجہ کے مکان تک اظہارِ احترام کے لئے اُس کے ساتھ ساتھ گئے۔ جسوقت کہ مرحوم حاجی میرزا آقاسی اور میر مہدی امام جمعہ عقدِ نکاح کے واسطے آئے۔ تو خود ضیاء السلطنۃ نے پردے میں سے اُنکی مزاج پُرسی کی۔ حاجی میرزا نے یہ بھی کہا

کہ چونکہ تم کو عرفان کا دعویٰ ہے اور حاجی میرزا مسعود کی طرف سے وکیل بنکر آئے ہو۔ لہذا میرے وکیل میرزا نصر اللہ صدر الممالک ہونگے، جو سالک طریقت ہیں۔ صاحب طبع موزوں تھی۔ اور اشعار لطیف کہتی تھی۔

شروانی

بھیکن پور ضلع علیگڈہ۔ ۲۹۔ اپریل ۱۹۰۴ء

# سفر بغداد

## (کراچی تا بصرہ)

میں یہ نہ بتاؤنگا کہ میں کب، اور کیوں، اور کہاں سے روانہ ہوا؛ کیونکہ میرے دوست ان تمام باتوں سے واقف ہیں، اور جو مجھے نہیں جانتے انھیں بتانے کی ضرورت نہیں، صرف اتنا کہدینا کافی ہے کہ میں بغداد شریف جاتا ہوں، اور آجکل بصرہ کے اُس خوش سواد زنداں میں جسے عرف عام میں قرنطینہ کہتے ہیں، ہندوستان سے آنے کے جرم میں دس دن کی قید بھگت رہا ہوں۔ میں نے کیا دیکھا؟ اگر آپ تاریخی مقامات اور عمارات اور کھنڈروں کی تحقیقات کے عاشق ہیں تو میں نے کچھ بھی نہیں دیکھا، اگر آپ قوموں کی طرز معاشرت، رسم و رواج، طریق بود و باش کے حالات سے دلچسپی رکھتے ہیں، تو بھی میں نے بہت کم دیکھا ہے، اگر آپ کو مختلف ممالک کی طرز حکومت و طریقۂ سیاست میں شغف ہے، تو پھر میں عرض کرونگا کہ میں نے ابھی کچھ نہیں دیکھا، مگر ہاں اگر آپ قدرت کے مناظر سے دلچسپی رکھتے ہیں، تو میں نے بہت کچھ دیکھا ہے، میں نے دلربا حسین اور جانفزا مناظر دیکھے ہیں، لیکن بیان کرنیکی طاقت نہیں، لہذا خود ہی لطف اٹھاتا ہوں۔

تاہم اڈیٹر صاحب "علی گڈہ منتھلی" کے حکم کی تعمیل لازمی ہے۔

۲۶۔ مارچ ۱۹۰۴ء کو اپنے پیارے دوستوں سے، کچھ ارمان بھرے اور زیادہ تر حرماں بھرے دل کے ساتھ جدا ہوا، اور دوستوں نے جس عنایت اور محبت سے مجھے خیرباد کہا ہے، اُس کے

شکریہ کے بجائے شکایت کو دل چاہتا ہے، کیونکہ اُسنے جُدائی کے قلق کو اور صدگونہ کر دیا۔

کراچی پہونچتے پہونچتے مجھے احباب و اعزا کی کشش کئی اور شہروں میں بھی لگئی۔ ؎

چلا میں وادیٔ اُلفت میں راہ سوزن کی    قدم قدم پہ مجھے ڈوبنے کو چاہ ملے

آخر کار ۳-اپریل کو جہاز "کولا" پر کراچی سے روانہ ہوگیا، موسم نہایت خوشگوار تھا، اور سمندر کی جبیں پر ذرا بھی بل نہ تھا، اور اگرچہ یہ میرا پہلا سمندر کا سفر تھا، لیکن میں نہیں جانتا کہ سرگرانی، اور طبیعت کا متلانا کسے کہتے ہیں، اور اگر سفرِ سمندر ایسا ہی ہمیشہ ہوتا ہے، تو میں عمر بھر سفر کرنے کو طیار ہوں لیکن لوگ کہتے ہیں۔ مئی جون میں خلیج فارس کا مزاج برہم ہوتا ہے اور اُسوقت وہ کسی کی نہیں سُنتے۔

۵-اپریل کو ۲ بجے سہ پہر کے قریب مسقط پہونچے، اِس مقام کو دیکھکر طبیعت نہایت مکدر ہوئی پہاڑ ہی پہاڑ ہیں، جنپر درخت کیسا، سُوکھی گھاس کے ایک پتّے تک کا نشان نہیں، اور اُسپر حاکمِ مسقط کو دعویِ سلطانی ہے، میری رائے میں اگر وہ اپنے تئیں مالکِ دوزخِ مسقط کہیں تو نہایت مناسب ہے۔ شہر مسقط پہاڑوں سے گھرا ہے اور خود پہاڑ کی ڈھال پر واقع ہے۔ اور دُور سے تو خوشنما معلوم ہوتا ہے، پکّے اور کئی منزل کے مکان ہیں، جو سمندر کے کنارے تک چلے آئے ہیں۔ کراچی میں سردی تھی، اور آگے چلکر تو مجھے پُوری پُوری سردی ملی، مگر یہاں خیر سے ابھی سے وسط مئی کا لطف آ رہا تھا۔

میں نے چاہا کہ اُتر کے شہر دیکھ آؤں، مگر قرنطینہ کے ڈاکٹر نے کسیکو اجازت نہ دی، اور ہم مسقط کو دُور ہی سے ڈنڈوت کرکے ۶ بجے شام کو روانہ ہوگئے۔ مسقط کے بعد بوشہر تک سمندر ذرا خراب تھا، مگر میری طبیعت پھر بھی خراب نہیں ہوئی، ۸-اپریل کو ۸ بجے صبح بوشہر پہنچے، یہاں بھی اُترنے کی اجازت نہیں، دُوربین ہی سے شہر کو دیکھا، اور کچھ اچھا نہ پایا، (سُنا ہے۔ بوشہر کے انگور کھٹے ہوتے ہیں) مگر میں سمجھتا ہوں کہ آدھا بوشہر تو ہمارے جہاز کے گرد آگیا تھا، ایک صاحب مجسّم قرنطینہ پھرتے تھے یعنی اُن کی ٹوپی پر نہایت جلی قلم سے لکھا ہوا تھا "قرنطینہ" جسکے نیچے ایرانی نشانی یعنی شیر آگے کے پنجے میں شمشیر لیے کھڑا تھا، مگر صرف ایک کمی تھی، وہ یہ کہ خود "قرنطینہ" صاحب کی صورت ڈراؤنی نہ تھی۔ پھر بھی میں اُن سے ہمیشہ دس قدم کے فاصلے پر رہا۔ چار بجے شام کو اُنھیں بھی خیرباد کہا۔

۹-اپریل - ۷ بجے صبح، سبحان اللہ، سبحان اللہ - ہم کس خطّے میں جارہے ہیں، رات ہی بھر میں یہ کیا طلسم ہوگیا، جہاز کی دونوں جانب کیسا دلکش منظر ہے۔ دو طرفہ خرمے کے درختوں کی مسلسل قطاریں ہیں، اور اُن کے پیچھے اور نیچے گلاب اور نارنگی اور انار کے درخت ہیں، جو پھول اور پھل سے لدے ہوئے ہیں۔ اور جہاں تک نگاہ دُوربین کے ذریعے سے کام کرتی ہے، یہ مارے خوشی کے پاگل کردینے والا منظر سامنے ہے۔ اور میں حقیقت میں تھوڑی دیر کے لیے پاگل ہوگیا تھا- جہاز پر دوڑا دوڑا پھرتا ہوں، کبھی اِس طرف کے منظر کو دیکھتا ہوں اور کبھی اُس طرف کے۔

معلوم ہوا کہ ہمارا سفینہ سمندر چھوڑ کے دجلہ اور فرات کے مجموعہ پانی کے سینہ پر چل رہا ہے اور ایکطرف ساحل ترکی ہے، اور دوسری طرف ایرانی۔ دجلہ اور فرات کے نام نے میں عرض نہیں کر سکتا کہ میرے دل پر کیا اثر کیا۔ آہ! تو اب ہم اُن دریاؤں پر ہیں، جو اسلامی تاریخ، اسلامی فسانہ، اسلامی ادب، اسلامی شاعری کے ہر صفحے پر موجزن ہیں۔

دجلہ و فرات! دجلہ و فرات!! تو یوں لکھئے کہ ان منظروں میں سے گذرتے ہیں- اور اِن ساحلوں کو سیراب کرتے ہیں۔ میں نے سوائے کشمیر کہیں کسی دریا کا کنارہ اتنی دور تک ایسا سرسبز و شاداب نہیں دیکھا، اور اصل تو یہ ہے کہ جہلم کا کنارہ شاداب ہے اور بہت شاداب ہے، آخر ملک کشمیر ہے، لیکن دو طرفہ میدان نظر آتا ہے، اگرچہ سرسبز میدان ہے، یہاں اِس دریا کے کنارے سوائے گھنے، اونچے، اور سرسبز درختوں اور پھولوں کے آپ اور کچھ نہیں دیکھ سکتے ہاں اوپر آسمان ہے، نیچے پانی ہے، اور دائیں بائیں نظر کو یہ درخت روک رہے ہیں، اور یہ سلسلہ میں سُنتا ہوں کہ یہاں سے بغداد تک یعنی چار سو میل تک قائم ہے- آپ کا جہاز ان سبز پوش سبزیوں کے بیچ میں فاؤ سے (جہاں سے یہ سلسلہ شروع ہوا ہے) بغداد تک جائیگا۔ شاید کہ خُرمے کے درختوں کی اسقدر تعریف سُنکر زیرِ لب مُسکرائینگے؛ مگر یہ خیال رہے کہ یہ حجاز یا سوڈان کے خُرمے کے درخت نہیں ہیں، کہ چار پانچ ایک جگہ کھڑے ہیں اور گرد سینکڑوں میل تک ریت کا چٹیل میدان ہے۔ یہ عراقین کے نخلستان اور خرماستان ہیں، جنکے سایہ میں ہر قسم کے پھول اور پھل

لگے ہوئے ہیں اور دماغ کو معطر کر رہے ہیں۔

دو بجے ہم محمرہ پہنچے، یہ ایک چھوٹا سا مقام ہے، یہاں ایرانی سرحد ختم ہوئی ہے، اور یہاں سے دو طرفہ ساحلِ ترکی ہے۔

یہاں بھی وہی قرنطینہ "کولا" پر برٹش سفارت کے ایک جج ہز آنر بیز ورتھ نگٹ قسطنطنیہ سے بغداد تشریف لے جا رہے تھے، جو جہاز ہندوستان سے آتا ہے اُس کے مسافروں پر بصرہ میں ایک نہ دو، دس دن کا قرنطینہ ہوتا ہے۔ اس سے بچنے کے لئے یہ ترکیب لگی تھی کہ بغداد سے برٹش اسٹیم لانچ "نیئر ایسٹ" محمرہ بھیجدیا گیا تھا تاکہ وہ محمرہ سے اُس میں سوار ہو کے بصرہ جائیں اور کہیں کہ میں محمرہ سے آ رہا ہوں، تو اُن پر کوئی قرنطینہ نہ ہوگا۔ لیکن وقت یہ آن پڑی کہ محمرہ کے قرنطینہ کے افسروں نے کہا کہ اگر یہاں اُتر ینگے تو پانچ دن قرنطینہ میں رہنا ہوگا، آخر کار یہ ہوا کہ لانچ جہاز کے ساتھ ساتھ چلا، اور جب ایرانی سرحد سے نکل گئے تو ایک خالی مقام دیکھ کر چپکے سے جہاز ٹھہرا لیا گیا اور ہز آنر "نیئر ایسٹ" میں سوار ہوگئے، اور باقی ہم سب یوں ہی حسرت سے دیکھتے رہے۔

محمرہ سے بصرہ صرف کوئی تیس پینتیس میل کے فاصلے پر ہے، اور ذرا آگے بڑھتے ہی بصرہ کے مضافات شروع ہو جاتے ہیں، دریا کے کنارے درختوں کے جھنڈ وہی ہیں، پھول وہی ہیں، مگر اب ان میں اُمرائے بصرہ کے مکانات شروع ہو جاتے ہیں۔ اور ان قدرتی بیجان پھولوں میں انسانی زندہ پھول اور غنچے نظر آنے لگتے ہیں، یعنی حسین اور نہایت حسین یہودی۔ آرمینین۔ اور خال خال ترک۔ عورت۔ لڑکے اور لڑکیاں دوڑ دوڑ کے لبِ دریا ہمارے جہاز کو دیکھنے آتے ہیں، اور ہم دوڑ دوڑ کے عرشے کے کنارے اُن کو دیکھنے جاتے ہیں، کاش یہ سلسلہ لامتناہی ہوتا، مگر وہ تو ایک دو گھنٹے ہی میں جہاز بصرہ پہونچ گیا، اور وہاں سے سرکاری کشتیوں میں بٹھا کر ہم سب قرنطینہ پہنچائے گئے۔ (ع) زنداں کو چلے مچل مچل کر۔

مگر حق یہ ہے کہ ہمارا قید خانہ بُرا نہیں، اُس کے سامنے دریا کا منظر نہایت عمدہ ہے، اور رات دن کشتیوں کا تانتا بندھا رہتا ہے، یہاں گاڑی کا کام کشتی دیتی ہے، اسلئے کہ ہر وقت بادبانی،

اور غیر بادبانی اور دُخانی کشتیاں سامنے سے گذرتی ہیں، بعض یہودیوں کا جھُرمٹ اُن کشتیوں میں عُود بجاتا اور عربی گانے جنھیں ہم خاک نہیں سمجھے، گاتا سامنے سے گذرتا ہی، اور عجب پُر لطف سین ہوتا ہی۔

قرنطینہ کا مکان سیکنڈ کلاس والوں کے لئے خاصے آرام کا ہی، اور میں سوا اسکے کہ تنہا ہوں، نہایت آرام سے ہوں، موسم بے انتہا پیارا ہے، کھڑکی کے سامنے گلاب کا تختہ کھلا ہی اور مہک رہا ہی، اور اگر یہ صحیح ہے کہ ؎

بہشت آنجا کہ آزارے (ہائے، مار ڈالا کمبخت، کس زور سے کاٹا ہے، لکھنے میں مصروف ہونے کی وجہ سے ان کی بھنبھناہٹ کی آواز بھی تو نہیں سُنی، ورنہ یہ تو خبردار کر کے کاٹتے ہیں) نباشد + کسے را با کسے (ارے تیری ایسی کی تیسی، پسّو ہیں کہ قہر خدا کا، تمام کپڑوں کے اندر گھُس گئے، اور مارے دو وڑوں کے تمام جسم سُوج گیا، کارے (ارے تو بہ پھر پیٹھ میں کاٹا۔ اب بغیر اسکے کہ تمام کپڑے اُتار ڈالوں، پسّوؤں کا ملنا مشکل ہے، مچھر کو تو آسانی سے مار بھی سکتے ہیں، کل ڈاک جائیگی، مضمون ختم کرنا ضروری ہے، اور یہ کاٹ کاٹ کر بیتاب کئے دیتے ہیں) نباشد، تو یہ مقام بہشت (ہائے! ہائے!! کیسا کاٹتے ہیں، میں باز آیا اس بصرہ سے، اس شدت کے مچھر اور پسّو تو میں نے کہیں نہیں دیکھے) ہے۔

اور یہ خیال رہے کہ مارچ اور اپریل کے بصرہ کا ذکر کر رہا ہوں، ورنہ جون جولائی میں تو بصرہ کا نام لیتے ہوئے بھی زبان پر چھالا پڑتا ہے، رہا بغداد، تو وہ اس ولایت کا شملہ یا نینی تال یا کشمیر سمجھا جاتا ہی، کراچی سے یہاں تک جس شخص سے بغداد کا ذکر آتا ہی، مارے تعریف کے اُسکی زبان خشک ہوئی جاتی ہے، بغداد کا موسم یوں اچھا، میوے یوں اچھے، پانی یوں اچھا، غرضکہ ہر چیز اچھی ہی اچھی ہے۔

اور صاف تو یوں ہی کہ جگہ تو سب یہ اچھی ہیں، مگر دس دن کا قرنطینہ، خدا کسیکو اس مُصیبت میں نہ ڈالے۔ اب مجھے بھی یہ کہنے کا موقع مِل گیا کہ میں دس دن کی قید (غنیمت تھا کہ قید با مشقت نہ تھی) بھگت چکا ہوں، قسمت میں یہ بھی لکھا تھا۔

ابتک منظر ہی دیکھے، یا کسی آدمی سے بھی ملا؟ ہاں کیوں نہیں۔ کراچی سے جہاز پر بیٹھتے ہی مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ اب یا وہ تر واسطہ ایرانی، عرب، یہودی، ترک اور ارمینیوں سے ہوگا۔

جہاز پر میرے ہم کلاس تین صاحب تھے، ایک ایرانی، دو ارمنی، ایرانی صاحب کو اوّل تو میں انگریز سمجھا، باتیں کرنے سے خیال ہوا (چونکہ انگریزی ٹھیک نہیں بول سکتے تھے) کہ فرنچ ہیں۔ بعد میں معلوم ہوا کہ ایرانی ہیں۔ آقا محمد نمازی شیرازی نام ہے شنگھائی سے آرہے ہیں، اور وطن جارہے ہیں شنگھائی میں بہت بڑے تاجر ہیں۔ یہ سُنکے مجھے بہت خوشی ہوئی۔ حقیقت میں بعد بمبئی کے مسلمانوں کے اگر تجارت میں کوئی مسلمان قوم ہمت سے کام لیتی ہے۔ تو وہ ایرانیوں کی قوم ہے، ترکوں کا تو اس میں نام و نشان بھی نہیں، شیرازی صاحب اپنے ملک کے شیدا تھے، اور اُن کے خیالات سُننے کے لئے میں نے خواہ مخواہ ایران اور ایرانیوں پر اعتراضات کرنے شروع کئے، اور مجھے نہایت لُطف آتا تھا جب وہ سچے جوش و خروش سے اپنے ملک کی حمایت کرتے تھے۔

دونوں ارمنی بمبئی میں تجارت کرتے ہیں اور اپنے وطن بصرہ کو آرہے ہیں، جب وہ عربی میں باتیں کرتے تھے، تو مجھے مخالفین عربی بہت یاد آتے تھے، کہ کاش وہ انھیں دیکھیں اور بتائیں کہ عربی نے اثر کیا۔ تم ڈھایا، اچھے خاصے انگریز بنے ہوئے تھے۔

یہاں قوموں میں بہت مغالطہ ہوتا ہے۔ مسلمان۔ عیسائی اور یہودی عبا اور قبا بھی پہنتے ہیں اور بہتیرے کوٹ پتلون پہنتے ہیں، ترکی ٹوپی سب اوڑھتے ہیں، اور تو اور ناموں سے بھی تو پتا نہیں چلتا، کہ کون مسلم ہے اور کون غیر مسلم۔ میرے ساتھی ارمنی جو تھے، اُن کے نام تھے نصر اللہ مسیح۔ اور شکر اللہ صباغ یہاں ایک اور عجیب بات دیکھی، ہمارے ہاں تو انگریز عموماً اس بات کو پسند نہیں کرتے، کہ ہندوستانی انگریزی کپڑے پہنیں، اور خاصکر یہ کہ انگریزی ٹوپی اوڑھیں، یہاں ترک اس بات کے خواہشمند ہیں کہ سب اُن کی ٹوپی اوڑھیں۔ چنانچہ یہ دونوں ارمنی انگریزی ٹوپی اوڑھتے تھے، بصرہ پہونچتے ہی، ترکی ٹوپی پہننے لگے، میں نے پوچھا تو کہا، ہم ترکی رعایا ہیں، لہذا ہمیں یہاں ترکی ٹوپی اوڑھنی ضروری ہے۔

یہودی عموماً عبا و قبا پہنتے ہیں، اور عرب تو بالکل ہی۔ ترک سب یوروپین لباس پہنتے ہیں، اور اپنے تئیں یوروپین سمجھتے ہیں، یعنی عربوں، یہودیوں اور ارمنیوں سے بالاتر۔

مگر میں دیکھتا ہوں کہ یہاں سرکاری نوکر ارمنی زیادہ ہیں، اور ترک کم۔ اتبک مجھے پانچ چھ ترکی حکام

سے واسطہ پڑا ہی۔ اُن میں سوائے احمد بک کے جو بصرہ کے سول سرجن ہیں، باقی سب (یعنی ڈاکٹر قرنطینہ وہیڈ کلارک وغیرہ) گریک یا ارمنی ہیں۔

احمد بک نوعمر آدمی ہیں۔ ڈاکٹر کیسے ہیں یہ تو میں نہیں جانتا، مگر فیشنبل جنٹلمین بہت زیادہ ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہی کہ کپڑے ابھی پیرس سے سلوا کر منگوائے ہیں۔

اِس معاملے میں ہمارا کالج دب کے نہیں رہا۔ قیدِ تنہائی میں، بیٹھا بیٹھا دوستوں کی تصویریں اور گروپ جو ساتھ لایا ہوں، دیکھا کرتا ہوں، وہ دو ارمنی بھی جو ساتھ ہی قید میں آ رہے، اور تصویریں دیکھنے لگے۔ اور پوچھنے لگے، کیا یہ سب ہندوستانی ہیں، میں نے کہا، ہاں، تو اُنھیں یقین نہ آتا تھا، کیونکہ وہ تو بمبئی کے بوروں اور خوجوں کا لباس ہی ہندوستان کے مسلمانوں کا لباس سمجھتے تھے۔ مجھسے کہنے لگے کہ یہ تو ٹرک معلوم ہوتے ہیں، اور اُن میں سے دو ایک کی تصویر کی بہت تعریف کی۔ میں نے کہا یہ کیا ہیں، ہمارے کالج میں اِن سے بڑھ بڑھ کر ہیں۔

جن صاحبوں کی تعریف ہوئی ہی، میں اُن کے نام نہیں لکھنے کا، جب خدا لائیگا، تو بتاؤنگا، تی الحال سب دوست سمجھیں کہ اُنھیں کی تعریف ہوئی ہی۔

لوگ یقین نہ کرینگے، مگر مجھے سندباد صاحب سے بھی نیاز حاصل ہوا، اب تو نہایت معمر ہو گئے ہیں، اور جیسا سب جانتے ہیں، مدتِ مدید سے خانہ نشین ہیں، اور سیاحت ترک کر دی ہے۔

میں نے عرض کی کہ آپ سیاحت کو کیوں تشریف نہیں لیجاتے، فرمایا کہ اب سیاحت کا اور جہازرانی کا کیا لطف؛ دُخانی جہاز میں بصرہ سے بیٹھو، جہاں چاہو، چلے جاؤ۔ نہ خوف نہ خطرہ، نہ جہاز کی تباہی، نہ نئے نئے جزیروں کا ملنا۔

میں نے عرض کیا۔ آپ نہیں تو آپ کی قوم، جو جہازرانی میں سب کی اُستاد رہی ہی وہ تو کچھ کرے۔ یا تو عرب دُنیا بھر میں جہاز اور وہ بھی بادبانی جہاز لئے پھرتے تھے، یا اب بصرہ سے بمبئی تک بھی نہیں لے جا سکتے۔ اِسکو سنکر ایک آہ سرد بھری اور فرمایا "میاں تم ابھی بچے ہو، تم اِن باتوں کو کیا جانو" یہ خدائی کارخانے ہیں۔ ہر کسے پنج روزہ نوبتِ اوست۔ اب عرب وحشی اور جاہل ہیں، اب جو لوگ اُسکے اہل ہیں۔

اُن کے پاس یہ کام گیا" یہ فرمایا، اور اُس نورانی چہرے پر دو بڑے بڑے آنسو ڈھلکتے نظر آئے اور پھر وہ یکایک نظروں سے غائب ہو گئے۔

اِس تقریر کا مجھپر بھی بہت اثر ہوا، بڑی دیر تک میں خیال میں محو رہا، اور پھر میں نے سوچا تو دیکھا کہ اُنکا فرمانا صحیح تھا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ۞

{بقرہ ۱۹-۱اپریل سنہ ۱۹۰۶ء}

یلدرم

# اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کی کامیابی کے متعلق ایک خاص تجویز

اِس سال اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے سالانہ جلسے میں جسقدر اولڈ بوائز شریک ہوئے اُن سبکی یہ راے معلوم ہوئی کہ گو اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے قیام کو کئی سال کا عرصہ ہو چکا لیکن اسوقت تک کوئی معتدبہ نتیجہ اُسکے قیام سے ظاہر نہیں ہُوا، اور اُسکے مقاصد کے حصول میں کچھ کامیابی معلوم نہیں ہوتی۔ اِس راے سے غالبا ہر ایک کالج کے پُرانے طالب علم کو اتفاق ہوگا، اور میں اُسکو پُورے طور پر تسلیم کرتا ہوں، ایسی حالت میں یہ ضروری بات ہے کہ اِس ناکامیابی کے اسباب پر غور کیا جائے، اور جہانتک ممکن ہو اُن کے دُور کرنیکی کوشش کیجائے، جہاں تک میں سمجھ سکتا ہوں میرے خیال میں سب سے بڑا ایک سبب ہے۔ کسی ایسوسی ایشن کو دلخواہ کامیابی نہیں ہو سکتی، تاوقتیکہ اُس کے ممبران میں یکجہتی اور یگانگت نہ ہو۔ میری راے میں ہمارے کالج کے اولڈ بوائز میں ابتک اُس قسم کا اتفاق اور ہمخیالی اور یگانگت نہیں ہے جسکی ہمکو ضرورت ہے۔ یہ ضرور ہے کہ خاص خاص زمانہ کے ہمعصر طلبا میں دوستی اور بعض امور میں ایک حد تک ہمخیالی بھی ہے لیکن ایسے منتشر گروہوں سے مجموعی حالت پر بڑا اثر نہیں پڑ سکتا اور ہمارا مقصد اس سے حاصل نہیں ہو سکتا۔

یہ لازمی نہیں ہے کہ اولڈ بوائز ہر ایک امر میں متفق اور یکساں ہوں۔ نہ یہ ممکن ہے اور نہ ضروری

لیکن قومی ترقی کے لئے یہ ضروری ہے کہ چند اُصولی باتیں سب میں یکساں پائی جائیں اور ہر ایک ممبر اُن باتوں کو اپنے میں پیدا کرنے کیلئے خاص کوشش کرے۔ میرے خیال میں ہمارے اولڈ بوائز کو علاوہ مسلمان اور گورنمنٹ کی خیرخواہ رعایا ہونیکے حسبِ ذیل اُمور میں یکجہتی پیدا کرنی چاہیئے:۔

(۱) لباس جہانتک ممکن ہو، یکساں ہو۔

(۲) کالج کی ہر طرح سے خدمت کرنا اپنا فرض سمجھیں۔

(۳) ہندوستان میں جو اور قومیں آباد ہیں، اُن کے اور مسلمانوں کے درمیان جو تعلقات ہونے چاہئیں، اُن کے متعلق جہاں تک ہو سکے یکساں راے ہو۔

(۴) ہندوستان میں جو انگریز افسران ہیں، اُن کے ساتھ برتاؤ کا ایک خاص طریقہ ہو۔ اور اُسپر جہانتک ہو سکے کُل اولڈ بوائز کا عمل ہو۔

(۵) جس مقام پر ایک سے زیادہ اولڈ بوائز ہوں، وہ آپس میں برادرانہ طور پر ملیں۔

میرے خیال میں مذکورۂ بالا اُمور ایسے ہیں کہ انکا خیال عملاً ہر ایک اولڈ بوائے کو ہونا چاہیئے۔

اب میں مذکورۂ بالا اُمور کی نسبت اپنے مفہوم کو کسیقدر تفصیل کے ساتھ بیان کرنا مناسب سمجھتا ہوں۔

## لباس

میری راے میں جہانتک ممکن ہو، اولڈ بوائز کا لباس یکساں ہونا چاہیئے۔ اِس تجویز پر حسبِ ذیل اعتراضات ہو سکتے ہیں:۔

(۱) چونکہ کُل اولڈ بوائز مالی حالت اور درجہ کے لحاظ سے یکساں نہیں ہیں، اسلئے اِس تجویز پر عمل دُشوار ہے۔

(۲) چونکہ اولڈ بوائز ہندوستان کے مختلف حصّوں کے رہنے والے ہیں، اور مختلف حصّونکا لباس یکساں نہیں ہے، اسلئے اولڈ بوائز کا لباس یکساں ہونے میں عملی دِقت ہے۔

(۳) ایک ایسا لباس، جو سب اولڈ بوائز کے لئے مناسب ہو، تجویز ہونا نہایت مشکل ہے۔

اوّل الذکر اعتراض قابلِ غور ہے۔ کالج کے اولڈ بوائز مختلف حالتوں اور درجوں میں ہیں

کوئی جج ہے، کوئی بیرسٹر ہے، کوئی ڈپٹی ہے، کوئی تحصیلدار ہے، کوئی تھانہ دار ہے، کوئی پیشکار ہے، کوئی زمیندار ہے، کوئی سوداگر ہے، کوئی معمولی محرر و کلارک ہے، بعض ولایتی سوٹ بغیر گھر سے باہر نہیں نکلتے، اور بعض کرتہ اور پاجامہ پہنے دفتر میں کام کرتے ہیں۔ اگر ایک لباس تجویز کیا جائے، تو یا تو وہ اعلیٰ طبقے کے اولڈ بوائز کے پسند کے قابل نہ ہوگا، اور اگر اُن کی پسند کے قابل ہوگا، تو جو لوگ مالی حیثیت سے اُن کی برابر نہیں ہیں، وہ اُن کی استطاعت سے باہر ہوگا۔ یہ فی الحقیقت بڑی سخت عملی دقت ہے، لیکن عملی دقت یہ اسی وجہ سے ہے کہ ابتک ہم عام خیالات اور عام اعتبارات کے اثر میں دبے ہوئے ہیں، اور قومی یگانگت کے جوش نے ہمارے حوصلوں کو وسیع اور قوی نہیں کیا ہے۔ اگر قومی اخوت کوئی چیز ہے، اور اگر قومی اخوت افرادِ قوم کی حقیقی عظمت اور وقعت کی اصلی بنا ہے تو کیا وجہ ہے کہ ہم ظاہری شان اور دکھاوے کو ذریعۂ عظمت تصور کرکے اصلی مقصد کے حصول میں کچھ بھی دل پر ضبط اور جبر نہ کریں، اور اگر حقیقت میں دیکھا جائے، تو کوئی ضبط اور جبر کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ لباس کی قطع اور رنگ ایک ہونا چاہیے۔ کپڑے کی قسم اور قیمت ایک ہونا لازمی شرط نہیں ہے۔ فرض کیا جائے کہ جو لباس سید مرحوم کا تھا، وہ ہمارا قومی لباس قرار دیا جائے یعنی ترکی ٹوپی، ترکی تراش کا کوٹ، پتلون اور انگریزی جوتا۔ ایسی حالت میں ایک سوٹ نہایت اعلیٰ درجے کے ولایتی کپڑے کا بھی طیار ہو سکتا ہے، اور اُسی قطع کا سوٹ کانپور یا دھاری وال کے بنے ہوئے کپڑے کا بھی طیار ہو سکتا ہے، قطع اور رنگ ایک ہوگا، لیکن قیمت اور صرف میں بہت بڑا فرق ہو سکتا ہے۔ میری غرض یہ نہیں ہے کہ سب کم قیمت کپڑے کا سوٹ بنائیں، لیکن یہ ضرور ہے کہ سب ایک قطع کا بنائیں۔ اگر ایک اولڈ بوائے جج ہے تو اُسکے لیے لازمی نہیں ہے کہ وہ مارننگ سوٹ پہنکر کچہری میں اجلاس کرے۔ دوسرا اعتراض کہ اولڈ بوائز مختلف حصص ہندوستان کے باشندے ہیں، اور انکا مختلف لباس ہے، زیادہ اہم نہیں ہے، آجکل لباس میں کم یا زیادہ تبدیلی سب جگہ ہو رہی ہے، اور اگر اولڈ بوائز ارادہ کرلیں، تو ایک خاص لباس اختیار کرنے میں اس وجہ سے کچھ دقت نہیں ہو سکتی۔

تیسرا اعتراض کہ ایک لباس سب اولڈ بوائز کے لئے یکساں تجویز ہونا نہایت مشکل ہے، ایک حد تک صحیح ہے۔ لیکن ہماری قومی ترقی کی کونسی تجویز ایسی ہے جو نہایت مشکل نہیں ہے، اور مشکلات کے خوف سے ہم کب تک عمدہ تجاویز کو ملتوی رکھینگے۔ اب سوال یہ ہے کہ کونسا لباس تجویز ہونا چاہیئے۔ یہ وہ مسئلہ ہے جو سب اولڈ بوائز کی صلاح اور کثرت رائے کے ذریعے سے طے ہونا چاہیئے۔ لیکن اس موقعہ پر میں اپنی رائے ظاہر کردینا ضروری سمجھتا ہوں۔ میری رای میں سرسید مرحوم کی رہبری سے کام لینا چاہیئے، جو لباس اُنھوں نے بعد کامل غور کے تجویز کیا تھا، وہ مجموعی طور پر سب سے بہتر معلوم ہوتا ہے، اور اُسی کو ہمیں اپنا قومی لباس قرار دے لینا چاہیئے۔ ترکی ٹوپی، سیاہ رنگ کا ترکش کوٹ اور تپلون اور بوٹ، یہ وہ لباس ہے کہ تقریباً ہر ایک اولڈ بوائے اُسکو استعمال کرسکتا ہے، صرف اسقدر اس میں ترمیم کردیجائے، کہ جن اولڈ بوائز کو دفاتر میں یا اور موقعوں پر فرش پر بیٹھنا پڑتا ہے، وہ بجائے تپلون کے ڈھیلا پاجامہ استعمال کریں۔ ایک اور ترمیم یہ ہونی چاہیئے۔ کہ دھوپ کے وقت یا اور موقعوں پر اگر ضرورت ہو تو بجائے ترکی ٹوپی کے انگریزی ٹوپی کا استعمال کیا جاسکے۔ سرسید بھی دھوپ وغیرہ میں انگریزی ٹوپی کا استعمال کرتے تھے۔

## کالج کی خدمت کرنا اپنا فرض سمجھنا

یہ ایسی بات ہے کہ کسیکو اس سے انکار نہ ہوگا، اور ہر ایک اولڈ بوائے اسکو قبول کرنے پر طیار ہوگا لیکن یہ شکایت کیجاتی ہے کہ اسوقت تک عملاً اسکا بہت ہی کم ثبوت اولڈ بوائز نے دیا ہے۔

مجکو اس شکایت سے پورے طور پر اتفاق نہیں ہے، کیونکہ اس بات کو یاد رکھنا چاہیئے، کہ ہمارے کالج کی عمر ابھی بہت کم ہے، اور اولڈ بوائز ابھی اپنی زندگی کی مشکلات میں اسقدر پھنسے ہوئے ہیں کہ اُنکو پورے طور پر اس فرض کو ادا کرنے کا موقعہ بھی نہیں ملا ہے، تاہم یہ مجبوراً تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ بحالت موجودہ جسقدر ہم کرسکتے تھے، اُسقدر ہمنے نہیں کیا، اور میری رای میں اسکی وجہ یہی ہے کہ ہمارے آپس میں اس قسم کے تعلقات نہیں ہیں جو ایک دوسرے کو اس فرض کے ادا کرنے میں محرک ہوں اور

مددیں، اس غرض کے ادا کرنیکی ایک عملی صورت یہ تجویز کیگئی تھی کہ ہر ایک اولڈ بوائے اپنی آمدنی میں سے فی صدی عہ رکالج کو دے، چنانچہ اسکے متعلق کوشش کیجاتی ہے، اور کئی سال کی کوشش کے بعد یہ نتیجہ ہے کہ کئی سو اولڈ بوائز میں سے صرف پندرہ۱۵ یا بیس۲۰ ایسے ہیں، جو باقاعدہ طور سے ایک فیصدی ادا کرتے ہیں، ورنہ ہر مہینے ویلیو پے ایبل بھیجے جاتے ہیں، اور دوسرے ہفتے میں اکثر اُن میں سے واپس آتے ہیں، اور ڈاک کا خرچ الیسوسی ایشن کے ذمہ پڑتا ہے۔ اب یہ مسئلہ نہایت قابل غور ہے کہ کسطرح اولڈ بوائز سے کالج کی خدمت کرائی جائے، میں اُمید کرتا ہوں کہ اسکے متعلق اولڈ بوائز اپنی رائے سے الیسوسی ایشن کو معزز فرمائینگے۔

## ہندوستان میں جو اور قومیں آباد ہیں اُن کے اور مسلمانوں کے درمیان کیسے تعلقات ہونے چاہئیں۔

میرے خیال میں یہ ایک نہایت اہم مسئلہ ہے، اور ہماری قوم کی مجموعی حالت پر اور خود اولڈ بوائز کی منفرد حالت پر اسکا بہت کچھ اثر پڑتا ہے، اِس میں شک نہیں کہ ہندو اور مسلمان دونوں کو اِس ملک کی زندگی میں سخت دُشواریاں محض اسوجہ سے پیدا ہوتی ہیں، کہ دونوں کے دلوں میں ایک دوسرے کی طرف سے تعصّب بھرا ہوا ہے، اِن دُشواریوں کو رفع کرنے کے صرف دو طریقے ہیں، یا تو دونوں قوموں میں سے ایک قوم ہندوستان کو چھوڑ دے، یا یہ کہ تعصّب اگر رفع نہو سکے تو کم کیا جائے۔ اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہندو تعصب نہ کریں، تو اوّل بے تعصّبی کی ہم کو خود مثال قائم کرنی چاہیئے۔ اور میری ناچیز رائے میں اولڈ بوائز کی معمولی اوصاف میں یہ بھی ہو کہ وہ جہانتک ہو سکے، تعصب سے پاک ہوں۔ اور جو خراب نتائج تعصب کے ہیں، اُن میں اُنکا کچھ حصّہ نہو۔ غرضکہ اِن مسائل کے متعلق اولڈ بوائز کی ایک خاص اور صاف پالسی ہونی چاہیئے۔

## ہندوستان میں جو انگریز حاکم ہیں اُنکے ساتھ برتاؤ کا ایک خاص طریقہ ہونا اور اُسپر جہانتک ہوسکے کُل اولڈ بوائز کا عمل کرنا

اولڈ بوائز جب کالج چھوڑ کر دُنیا میں داخل ہوتے ہیں، تو اُنکو منجملہ اور دقتوں کے ایک یہ دقت بھی پیش آتی ہے، کہ انگریز حکام کا برتاؤ اُن کو پسند نہیں ہوتا۔ اُن کو اپنی عزت کا خیال ہوتا ہے، اسلئے و خوشامدانہ یا غلامانہ طریقے اختیار کر نہیں سکتے۔ اور بعض اوقات وہ کسیقدر اندازہ سے زیادہ آزا کی طرف بڑھ جاتے ہیں۔ اِن باتوں کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ حکام اُن کو پسند نہیں کرتے اور مغرور خیال کر اِس مسئلے کی نسبت ہم کو ایک خاص طریقہ اختیار کر لینا چاہیے۔ تاکہ کل اولڈ بوائز کو مدد اور ہو۔ مثلاً میری رای میں جو سولیں حکام ہیں، یا اور اعلےٰ افسرانِ گورنمنٹ ہیں، اُن کو سلام کرنا کسیطرح بیجا نہیں ہے، اور اسیطرح کی باتیں ہیں، جو قابلِ غور ہیں اور جنکے متعلق اولڈ بوائز کو یکساں طریقہ رکھنا چاہیے، تاکہ اُن کے اخلاق اور طریقوں کا مجموعی اثر پڑے۔

## جس مقام پر ایک سے زیادہ اولڈ بوائز ہوں اُنکا آپس میں ادرانہ برتاؤ

ظاہراً تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اِس سے سب اتفاق کرینگے لیکن عملاً اسپر کاربند ہونا آسان نہیں ہے مثلاً ایک مقام پر دو اولڈ بوائز ہیں، ایک جج ہے، اور دوسرا اہلمد، ایسی حالت میں جج صاحب کو اہلمد صاحب کے گھر پر جانا چاہیے یا نہیں۔ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ جج صاحب دل سے چاہتے ہیں کہ اپنے کالج فیلو سے ملیں، لیکن اُن کو یہ خیال کہ وہ اُس جگہ جج ہیں، اور جج ہو کر اگر وہ اہلمد کے گھر پر جائینگے، تو اُن کے درجہ کے خلاف ہوگا یا لوگ طرح طرح کی اُمیدیں اور خیالات اُن کے متعلق قائم کرینگے، ممکن ہو کہ اہلمد صاحب ہی اس دوستانہ برتاؤ سے ناجائز فائدہ اُٹھانا چاہیں یا یہ خوف لاحق ہو کہ ان سے کسی ہندو مخالف کو انکی شکایت کے لئے عمدہ مضمون ہاتھ آجائیگا

یہ مسئلہ آسان نہیں، اور عملی طور پر دشواریوں سے خالی نہیں ہے، لیکن پھر میں کہونگا کہ دشواریوں سے ڈرنے کا وقت نہیں ہے، بلکہ اپنے مقاصد مردانہ وار حاصل کرنیکا وقت ہے۔ اگر جج صاحب کالج کے سچے اولڈ بوائے ہونا چاہتے ہیں، تو اُن کو ضرور اہلمد صاحب سے کالج کے معاملات میں برادرانہ ملنا چاہیئے۔ ایک اپنے بھائی سے جو فیشل حالت میں کم رتبہ ہو، صداقت اور برابری کے ساتھ ملنے سے ہرگز درجہ میں فرق نہیں آتا، اگر کم رتبہ بھائی ایسے اخلاق سے ناجائز فائدہ اُٹھانا چاہے، تو وہ نہ صرف جج صاحب سے ملنے کے قابل بلکہ اولڈ بوائے رہنے کے بھی قابل نہیں ہے۔ میرا یقین ہے کہ جن اولڈ بوائز میں آفیشل رتبہ میں بڑے ہو کر اپنے سے کم رتبہ اولڈ بوائے سے کالج کے معاملات میں برابری کا برتاؤ کرنیکی ہمت اور دلیری ہوگی، اُن میں یہ قوت بھی ضرور ہوگی کہ اس قسم کے برتاؤ سے اپنے فرائضِ منصبی کو متاثر نہونے دیں۔ اور ایسی حالت میں انکے سچے برتاؤ کے کبھی خراب نتائج نہیں ہوسکتے، بلکہ ہمیشہ اُس سے ان کی حقیقی عظمت اور وقعت میں ترقی ہوگی۔

اس کا بڑا مقصد یہ ہے کہ غیر قوموں کے لوگوں کو یا ہماری ہی قوم کے باقیماندہ حصہ کو یہ معلوم ہو کہ جو اخوت کا رشتہ کالج کی تعلیم و تربیت پیدا کرتی ہے، وہ عارضی حالتوں سے منقطع نہیں ہوجاتا بلکہ اپنے موقعہ پر برابر پُر اثر اور موجود رہتا ہے۔

یہ جو کچھ اوپر میں نے لکھا ہے اسلئے لکھا ہے کہ ہمارے کالج کے اولڈ بوائز ان ضروری امور پر غور کریں اور اپنی رائے سے سکرٹری ایسوسی ایشن کو اطلاع دیں اور اس سال میں اسپر بحث ہو کر آئندہ سالانہ اجلاس میں ان امور کی نسبت کوئی قطعی فیصلہ کیا جائے۔ مجھکو اُمید ہے کہ اولڈ بوائز ضرور اس طرف توجہ فرمائینگے اور انکی توجہ اور فکر سے کوئی عمدہ نتیجہ پیدا ہوگا۔

-آفتاب احمد-

-آنریری سکرٹری اولڈ بوائز ایسوسی ایشن علیگڈھ-

# اِشتہارِ ترجمۂ کتبِ مجوزۂ انجمنِ ترقی اُردو

انجمنِ ترقی اُردو نے حسبِ ذیل کتابیں ترجمہ کے لئے انتخاب کی ہیں۔ جو صاحب کسی کتاب کا ترجمہ فرمانا چاہیں وہ اُس کے پہلے دس صفحے کا ترجمہ سکرٹری انجمن ترقی اُردو کے پاس ۳۰ رجون ۱۹۰۷ء تک روانہ فرمائیں۔ کمیٹی انتظامی جن صاحب کا ترجمہ بہتر خیال کریگی، اُن سے ساری کتاب کا ترجمہ کرائیگی۔ مترجمین کو معقول صلہ دیا جائیگا۔ کتابیں تھیکر کمپنی بمبئی سے مل سکتی ہیں۔

نامِ کتب مع تصریح قیمت۔

(۱) فلاسفی آف دی بیوٹیفل حصہ دوم یعنی فلسفۂ حسن مصنفہٗ ڈبلیو نائٹ صاحب ... للعہ

(۲) فلسفۂ اخلاق مصنفہٗ موریہیڈ صاحب ... ۱۲/ للعہ

(۳) فلسفۂ تاریخ مصنفہٗ ہیجل صاحب ..... ۱۲/ للعہ

شبلی نعمانی۔ سکرٹری انجمن ترقی اردو حیدرآباد دکن۔

# تفسیر القرآن جلد ہفتم

## مصنفہٗ ڈاکٹر سید احمد خاں مرحوم و مغفور

اِس جلد میں سورۂ کہف۔ سورۂ مریم اور سورۂ طٰہٰ کی تفسیر ہے اور قصۂ اصحاب الکہف والرقیم۔ سکندر ذوالقرنین۔ سدِ سکندری یاجوج و ماجوج۔ ولادتِ مسیح۔ عصائے موسوی فرعون اور اُسکے جادوگر۔ دریائے نیل سے بنی اسرائیل کا عبور اور لشکرِ فرعون کا اُس میں غرق ہونا وغیرہ وغیرہ مضامین پر محققانہ و فلسفیانہ بحث ہی۔ اور عمدہ کاغذ پر خوشخط و صحیح مطبع مفید عام آگرہ میں طبع کرایا گیا ہی تقطیع ۲۲ × ۲۹۔ اور قیمت بلا جلد ۱۲/ عہ ہے۔

ولایت حسین آنرری مینیجر ڈیپو بک ڈپو مدرسۃ العلوم علیگڈھ۔

(مطبوعہ ریاض ہند پریس علیگڈہ)

disappeared in no time once that conservatism and fatalism fastened their grip on him. Religion had placed music, sculpture, painting and other fine Arts under a ban, and thus the sense of the Sublime and the Beautiful lay dormant in the Saracenic mind for want of nourishment and culture. The Arabs had received the dry bones of speculative sciences from the Greeks, but they were not touched with that Grecian spirit of Love and Beauty which had inspired the literature and arts of Greece and which is the perennial source of high thoughts and chivalrous aims. Hence there are few works in the Arabic literature which may be ranked with the masterpieces of the literary world. Arab thinkers no doubt enriched the literature of the world. But they did not produce gems of universal lustre whose absence would leave the world in comparative darkness. In short the Saracenic civilization after many centuries of glory, began to decline owing to the causes that we have enumerated above. Baghdad had played out its *role*. It was but a shadow of its former self. It was in the last flicker of its glory when the Tartar deluge swept over the land and the last vestige of the great moral and intellectual fabric which the Saracens had reared disappeared leaving not a rack behind.

We have briefly surveyed the causes of the Saracenic rise and fall. Religion exalted them to fame and power, religion brought them down to the ground. The greatest experiment was tried in the world,—the experiment of taking civilization under the wings of religion—but it failed. And it has left the races on whom it was tried in a state of mental prostration. They have not recovered from the effects of the collision. In India the Mohamadans have a gleam of hope. Western influences are known to be the best curatives of the fatalism and conservatism of the East. If Mohamadans cherish any dreams for the future let them completely forget their nature. Let them discard the haunting sense of their traditional past. Let them resort to Western civilization for guidance and inspiration. They have to reopen the hidden recesses of the heart and mind which lie buried beneath the dust of ages. Then they can hope to enter into the polity of nations and work out some useful destiny.

R. M. G. HUSAIN.

left for the employment of their energies, and consequently their only duty was to mark, learn and inwardly digest what had been bequeathed to them. This was a fatal error. They fell to a dead level of thought and their creative powers were sacrificed to memory. The growth of new ideas and liberal opinions was stopped and men of greatest genius and talent fell a prey to intellectual subtleties of a very doubtful value. Intellectual conservatism was slowly taking its root among the Arabs which has ever since held the entire Musalman races in thraldom. Religious abuses were meanwhile assuming dangerous proportions. The pure and simple Monotheism of Islam was being woven into the greatest web that had ever enmeshed the human mind. Religious abuses sprang from the intense belief of the people. In their blind enthusiasm to imitate their spiritual leaders in their ways of life, the Arabs were unconsciously bartering away their independence and freedom of judgment. They created new dogmas from the sayings and doings of the pious men of old and placed themselves under their guidance. The dogmas speedily rose to the dignity of the articles of faith and every true believer was enjoined to follow them to the very letter. They entered into the minutest details of life. In private talk, in public business, in sleep, at times of food or innocent pleasure, in short even in the very mode of thought, the dogmas reigned supreme. The life of the Arab was bound with iron-cast rules whence there was no escape. Every formality of religion was observed with scrupulous care while the spirit of Islamic teachings was held in no account. Authority usurped the place of reason, and scepticism, which is the germ of all progress, was crushed beneath the dead weight of spiritual tyranny. Islam which had come in to the world to preach the freedom of thought and conscience was perverted by its votaries into a great instrument of intellectual oppression. Puritanic austerity prevailed in Saracenic life. Human life was divested of its charms in the eyes of the Arabs and their sense of enjoyment withered away under spiritual frost. A spirit of asceticism began to manifest itself in the ranks of the learned men, and a wave of pessimism swept over Saracenic society. Man began to preach that life was not worth living and that its pleasures and enjoyments were a delusion and a sham. Pious men retired into seclusion giving up every relation that bound them with the world. Such a spirit powerfully reacted on the Arab thought and produced that foul philosophy which dominates the Eastern mind. Fatalism began to console those who but a short time ago had shaken the world with the hopes and ambitions of their faith. The manliness of the Arab's character and his self-reliant spirit

tres of learning and culture sprang up at various places and thousands of students flocked there for the sake of knowledge. The Universities of Cordova and Baghdad, to mention only two out of many became the famous centres of education where knowledge was sought for its own sake and liberal funds were spent in the advancement of learning. The name of those two places will ever remain memorable in the history of civilization, for amid general darkness and superstition they were the centres of light and learning to the entire world and were continuing the task of the Grecian sages when Europe had relapsed into barbarism Students travelled long distances to come to them, suffered many hardships in the journeys and bore privation and hunger, but no adversity could damp their energies or extinguish the fire that burnt within them They learnt Poetry, Logic, Philosophy, Law, Grammar, Jurisprudence, Rhetoric, Chemistry, Medicine and other sciences in which the Arabs had carried on their researches The Caliphs and Sultans extended liberal patronage to men of letters and created munificent endowments for the advancement of knowledge Royal courts were adorned with the best intellect and the finest talent that the world could produce. When education became general the resources of civilization were applied to the advancement of general happiness and comforts of life Public hospitals were for the first time created and learned physicians were appointed to allay human pain and misery Beautiful mosques, baths, libraries and schools were erected for the benefit of the public Much of the Saracenic glory is enshrined in the noble edifices they raised. They were the greatest architects in the world The graceful style of their architecture is a subject of wonder and admiration even to this day Those shrines of Beauty which draw hundreds of pilgrims annually from distant lands speak volumes for the minds to which they owe their inspiration

But great though were the intellectual success of the Arabs, much of them was a reflected light Greek arts and sciences were reproduced in the Arabian garb Their own achievments were no doubt great and entitle them to everlasting fame, but they lacked the element of continual growth Religion had of course, supplied them with the springs of thought, and they, within a wonderfully short period carried their intellectual activities in every direction But religion or rather the abuse of it prevented their mental expansion. After the first two generations of the Arab thinkers had passed away, their successors fell into that most abominable of all the intellectual evils, imitation They lost the power of original thought. Their predecessors had, in their opinion traversed the entire field of human knowledge; there was very little

of others He was ever ready to minister to the wants of the poor and the needy, and his private liberality was often in excess even of what was enjoined on him by the tenets of his faith. Self-aggrandisement at the experse of his neighbour was no part of his religion In the discharge of his public and private duties he never sought approbation from others, while he was always prepared to run risks, bear privations and make sacrifices for the common weal

The intellectual activityof the Arabs was the most remarkable phase in their versatile nature Religion among many other things gave great stimulus to their mind And with the eagerness of children they applied themselves to explore the unknown regions of Divine mystery and take some peep into eternal verities Many other races who had come and gone before them had attempted the same task Several paths to knowledge had been struck open They bore fresh the imprints of those who had travelled along their course Thither had gone the ancient thinkers of Persia and Egypt. Thither has also travelled the mighty men of Greece who had held communion with the spirit of th Sublime and the Beautiful and so greatly enriched the thought of the world. Their achievements are the common heritage of all mankind The Arabs, in the nature of things, inherited all the accumulated wisdom of the ancient world In fact they proved the custodians and saviours of the intellectual treasures of the past After the decline of the Roman Empire a tide of ignorance had set in which had engulfed the entire continent of Europe. The arts, learning and philosophy of Greece were on the point of total extinction But the gratitude of the whole world is due to the Arabs, who at this crisis appeared upon the scene and rescued the Grecian arts and sciences from decay and possible oblivion They had by this time exhausted their own store of knowledge and were in search of "fresh fields and pastures new. They luckily came across the knowledge of Greece and translated it into their own language Access to the experiences, the hopes and the fear of the wisest men of old gave new impetus to the Arabian thought. The stream of Grecian learning and philosophy poured in upon the Saracenic mind and there was no limits to the possibilities of growth and culture which came within its reach. The intellectual life of the Arabs began. At first it was confined to the chosen few who had spent many a patient year of toil and labour in silent devotion to the Goddess of letters, but gradually it continued to expand until its influences penetrated into the mansion of the wealthy and the cottage of the poor and the lowly, and created an atmosphere of high thoughts and noble aims. Great cen-

the heir of Eve. She attained to the dignity of her being. And emerging from the social bondage in which she had been kept for centuries, she at last recovered her position as the household queen whose womanly grace would tame the brute in-man and whose dearest prerogatives of love and peace would impart sweetness to human life. The Arab now for the first time felt the gentle influences of "home." The silent and steady love of his mother, the fond and affectionate regard of his sister and the anxious devotion of his wife completely changed his nature and inspired in him those wonderful feats of chivalry which he afterwards displayed on the field of battle, in private spheres of life or in councils of the empire. Nor were the Arab women kept in purdah as obtains in the Moslem world of the present day. They were free to move about as they pleased and even the ladies of higher families could join the assemblies of men if they chose to do so. They attended baths, tournaments, and other social functions regularly and were greeted everywhere with every mark of distinction that is due to their sex. The girls of the noble families were often highly cultured and accomplished. Some of them were poets, scholars, doctors and lecturers and the fame of their accomplishments lingers, even to this day. Indeed, the number of Arab ladies who devoted themselves to the pursuit of letters and their attainments in the various branches of knowledge lead irresistibly to the conclusion that the Saracens developed an enlightened and elastic system of society which established equality between man and man, in which the status of women was considerably raised and improved and every kind of social amenity was allowed and freely used. Its defects were due to an imperfect state of human knowledge while its beauties and advantages were greatly in advance of the age and are remembered with admiration and gratitude even to this day.

No people can be truly great unless their character is based on sound moral principles. Righteousness exalteth men as well as nations. History bears eloquent testimony to the fact that societies prosper or decay according as they follow or disregard the behests of moral law. Civilization is but a reflex of moral evolution. In their period of glory the Arabs were an intensely moral race. An Arab gentleman was an embodiment of virtue and truth. He was straightforward in his dealings and conscientious in his acts. He was scrupulously jealous of his honour and did not hesitate to shed his blood in order to save it from degradation. His word was to him a law and under no circumstances could he be induced to break it. He was generous to his foes and always extended a large-hearted toleration to the failings

plished We have already observed that Saracenic rule was on the whole conducted on just and humane principles It remains to be added that it embodied in its essence a despotic form of government. But with some exceptions it was a benevolent despotism. Towards the decline of the Saracenic power many abuses had crept into their political system; but the periods of their glory were in the main characterised by justice and peace

The social system of the Arabs was very simple and quite in accordance with the doctrines of Islam Their religion had taught them to believe in one immortal invisible God, the fountain-head of all goodness and virtue to Whom all human beings are accountable for their thoughts and deeds This belief supplied them with a solid basis for their social organization. They got the first conception of the great human brotherhood in which every man was equal and bound to his fellow-beings with reciprocal duties. This noble ideal is one of the proudest privileges of Islam, and the world owes not a little to the teachings of a faith which, destroying the artificial barriers of birth-right and privilege, increased the opportunities of social communion between man and man and invested human life with the sacredness and importance that were all its own. The personality of man now came to be respected not on account of his glorious parentage but with a view to his intrinsic merits Ability and innate worth became the criterion of honor, and an unprincipled person could never hope to inspire respect in society even though the bluest blood flowed in his veins The distinctions of colour, of creed and the pretensions of rank or riches were entirely swept away and people lived under the benign influences of a society in which character and ability were honoured and rewarded in all the forms that wealth and gratitude could suggest. Islam had nobly vindicated the right of women and Saracenic civilization considerably raised their status in society. In pre-Islamic days women were kept in strict social bondage. They were considered an object of infinite disgust and aversion and were often subjected to inhuman treatment. Female infanticide was rampant among those savages of the Age of Darkness, and thousands of hapless children were annually murdered in cold blood. Nothing could be more humiliating to an Arab than to be the father of a female child, and he felt the finger of scorn was at him as long as he suffered this household scandal to sully his name. But now came an end to all this. That most helpless of God's creatures—the women found a strong champion in Islam. Her natural rights which were usurped by the jealousy of man were restored to her. She was proclaimed

Community of interest and unity of aim taught him co-operation, while his sympathies were greatly developed and enlarged. A desire for a purer and higher life breathed new hopes and aspiration in his heart, and his mental outlook expanded with marvellous growth. All the forces that were latent in his mind were drawn forth by the ideal which he learnt to admire through the Islamic creed. The Arabs were now astir. They were inspired by a single idea and bound together by a single aim. And under an impulse other than material greed and with a purpose which was sacred in its cause, they left the deserts of their native land to play their *rôle* in the history of the world and work out the destiny that Providence had marked in their name. Within the second century of the birth of the Prophet the once forgotten, despised people of Arabia became the most powerful nation on earth ruling over the most fertile tracts of the then known world and commanding the allegiance of the proudest nations, while their superior mind, noble character add chivalrous temper dominated the thoughts and manners of mankind. Within the second century of the Hijra they were masters of Spain and North Africa on the one hand, were seated on the banks of the Tigris and the throne of Ormuz on the other, and they organised a system of law and civil Government which with all its shortcomings proved a source of infinite happiness and peace to the races that were placed under their charge. A perfect sense of equity pervaded the administration of justice, and even the officers of the royal Princes were visited with condign punishment. Great toleration was extended to non-moslem races and their religious susceptibilities were always respected. All the arts of peace and industry began to flourish within the empire and even state patronage was liberally bestowed whenever occasion demanded it.

And now the germs of progress that were inherent in the Saracenic race and religion began rapidly to develop into that system of civilization which undoubtedly represented the best temper of the middle ages and which has left an indelible impression on the growth of the human mind. It was inspired by an idea that was spiritual in its essence and Arabian in its creed. The effects of this idea were marvellous. It opened a new chapter in the history of the people and lifted them up from the lower groove. Their thoughts and doings greatly influenced their own age and are a source of inspiration to millions of men even to this day. The Arabian rule was established far and wide. The Saracenic civilization began. Religion was its dominant note. And in our opinion this was at once the cause of its rise and of its fall. Let us, however, in the first place briefly recapitulate what it accom-

influence on our race and which may at any moment overcloud our prospects in the future.

The appearance of the Arabian Prophet on the stage of the world was one of the greatest moral and intellectual phenomena that the world has ever seen. He bore the message of peace and civilization to a people who were divided by feuds, vexed by internal discord and plunged to the lowest depth of ignorance and superstition. They owned allegiance to no moral law, they were guided by no higher motive than that of animal greed and no fear could restrain the outburst of their savage passions.

Their sympathies were confined to their associates the camel and the horse, and in some respects they were even worse than these species of the brute creation. Plain physical truths were a source of terror to their untutored instincts and they knelt before the inanimate objects of Nature in profound reverence and awe. Such was the state of the people among whom the Founder of Islam was born. The task before him was stupendous. But the success he achieved seems incredible even to this day. A new mysterious idea dawned upon the people which appealed to their human instincts. Their minds were awakened to a higher touch and they suddenly found themselves at the threshold of a new world, a world full of happiness, beauty and peace which they were ready to claim as their own. In less than thirty years the various Arabian tribes and families were fused into a broader and peaceful life of a united nation and were welded together into a compact whole.

And now commenced an era of consolidation at home and of expansion abroad. Islam had taught equality, liberty and fraternity to the faithful, hence the ancient, political and social institutions of the country died a natural death. The patriarchal form of Government gave place to commonwealth presided over by the spiritual leader of Islam. The barriers of caste and privilege were speedily demolished and from the lowest menial to the proudest sheikh all were placed on an equal footing in the eye of the law. Liberty inspired every Arab with a sense of his own individuality and with a corresponding sense of his duties to his neighbour. Some of his manly qualities lost their insular frame as higher ideals illuminated his mind; and his lawless spirit bowed without a murmur to the restraints which society and religion imposed upon him. His independence and self-reliance bore him through with remarkable success whenever he was thrown on his own resources; and the power of initiative which he inherited from his ancestors was turned to good account in pursuit of better and nobler ends. Nor was this all,

pher who has to describe human evolution in its organic growth He has to trace out the direction of the human spirit in different ages and among different peoples He has to survey a vast field of human life in its social, moral, intellectual aspects, bring out those principles on which civilization is based and which impart unity and coherence to the events of the past He must have a broad out-look and deep penetration, profound scholarship and splendid art. And with the help of these rare combinations he should narrate the story of different nations, not as isolated units, but in their relation to mankind at large and assign them their proper niches in the Temple of Honour. This is the function of the historian, to illustrate philosphy and not to chronicle small beer or paint melodramatic scenes.

It is then in such a spirit that we intend to take a casual survey of the Saracenic civilization The chapter on the Saracenic period in history is no doubt brilliant and there are passages in it which shed an imperishable lustre on that versatile and elegant race But the light of modern criticism has robbed many a beautiful passage in history of its splendour and romance. The events that looked gigantic through the dim mist of ages have been reduced to their original shape The mist and therefore the mystery has been cleared away from them and now they stand forth in all the nakedness of their insignificance Similarly the records of the Saracenic glory have to be tested and scrutinised and purged of their unreal matters and presented to the world in their actual form. Distance always is calculated to lend a charm, and though only 14 centuries have rolled by since the Arabs entered on a career of enlightenment and progress, it is no doubt probable that their achievments have been magnified by the glowing accounts of enthusiastic writers. We therefore purpose in this article to turn the searchlight on the type of civilization which the Saracens developed in medieval times. What is their claim on the gratitude of mankind ? What effect did their institutions produce on the general peace and happiness of the world ? How much is the scientific and literary world indebted to their researches in the various branches of human knowledge ? To what extent did their ideals influence human thought ? What is, in short their title to immortal form ? These are some of the questions which we cannot afford to overlook if an accurate estimate of the Saracenic civilization is to be formed. We will be obliged to say some unpleasant things in this connection which may grate on a Musalman's instincts But our earnestness is our plea. Better to learn the stern truth than to live in sweet ignorance of the evils which have hitherto exercised a baneful

tricts, and Indians already fill with honour a considerable number of District Judgeships. It is not incompatible with my proposal that there should be a transitory administration in which the Chief Commissioner and some of the Secretariat should be Englishmen. There are Englishmen in the Covenanted Civil Service who are admirably fitted by temperament as well as by capacity to initiate their Indian juniors into the higher branches of administration, and many of these men would warmly sympathise with a well-considered plan for placing Indians in positions of great responsibility.

"While putting forward this suggestion I wish emphatically to dissociate myself from those who think that the administration of the country would be improved by reducing the number of Englishmen in Government employment. I am myself in the service of a governing body which is composed wholly of Indians, and of their own initiative my employers (who are a very representative body of men) are continually urging upon me the importance of adding more Englishmen to the staff of the College; if these gentlemen find that, in so comparatively unimportant a concern, their interests are best served by employing the expensive Englishman in preference to the cheaper Indian, I cannot believe that the State can afford to reduce the number of Englishmen in its employment.

"But I should be glad to think that the efforts of the Government to elevate the people were not confined to imparting instructions in science and scholarship, but also comprised the far harder task of fitting them worthily to fill the highest offices in a civilized State."

## A Side Light on Saracenic Civilization

The modern age of scepticism and free inquiry has brought about a revolution in the conception of History. We no longer look on battles, dynasties or royal personages as the chief points of human interest. The pomp and pageantry of courts, the press and throng of battles and the dash and glitter of scheming politicians have ceased to be the topics on which the historian may exercise his talent and skill. The days of the chronicler are past. The great incidents that took place in the life-time of a nation have lost their local charm. And History has now come to be regarded as the biography of the human race, the gradual revelation of the mighty forces which have evolved the civilized man. The task of the historian is that of the social philoso-

ened by the creation in their midst of a body of genuine scholars. This closes what I would say here about my first proposal, and with regard to what follows I speak with diffidence and hesitation as I am venturing outside the area with which I am personally acquainted.

"Scholastic education is not after all the only or indeed the prime factor in the moral and intellectual development of a people; the callings which they follow in after-life determine far more profoundly their position in the scale of civilization. I have been tempted to wonder whether the intellectual benefits of academic training have not in India been counterbalanced by a loss of masculine virtues; schools and colleges have diffused a set of new ideas which the people have come to value more highly, but the effect of British rule has been to keep the people at large in statu pupillari, in which the opportunity never occurs of deciding upon momentous issues and of taking a responsible part in grave emergencies. If it is a fact that the leaders of Indian society have lost the capacity to act in a crisis, that fact would seriously detract from the ultimate and permanent value of British rule. Much of the political speaking and writing which one hears now-a-days is of a kind to make one fear that such has been the case. I confess that I would rather, were it possible, have the opinion of Mahdajee Sindhia or of Ranjit Singh upon a political question than of the leaders of Congress. Such an enfeebling of the people is, I am convinced, alien to the intentions of the Government, but the present seems an appropriate time to signalise the danger because the division and redistribution of provinces which is now in the air suggests a means of partially counteracting it. I put forward the suggestion that a small Province or Chief Commissionership might be formed and be officered exclusively by Indians; a suitable field for this experiment might perhaps be found in Orissa enlarged by the addition of the Uriya districts of Madras and the Central Provinces; this area contains but a small number of vested interests which could take umbrage at such a change and the administrative problems are not, I imagine, either so complicated or important as to offer an insuperable objection to the experiment. When the area has been selected and defined my suggestion is that the Government should declare their intention of reserving to Indians for a certain experimental period all the appointments in this province from that of the Chief Commissioner downwards.

"It would not, I believe, be impossible to find Indians in the higher ranks of the Civil Service now serving in other Provinces, to act as Magistrates in so small a number of dis-

something more than this—something more than the adoption of philology and of western principles of Grammar. In Europe the study of the thought of a particular people is made to serve as an introduction to the study of similar speculations in other ages, as, for example the works of Plato and Aristotle at Oxford, though forming part of a classical education, are also made to form the basis of the teaching of Philosophy; and similarly I conceive that in India a thorough comprehension of Vedant would form an admirable introduction to the comparative study of European philosophy; in like manner Indian history would be interpreted and illustrated by European analogies and although the history of India is not as rich as that of Greece or Rome in political wisdom, it presents an unrivalled field for those speculations upon the constitution of early society which now occupy so large a place in the scientific study of history. However, I must resist the temptation of dwelling upon all the details of such a school of advanced studies. I only wish to show that I conceive of it as a place wholly different from any existing College inasmuch as its object would not be to communicate and examine upon elementary or well-known truths but would be chiefly engaged in those higher reaches of knowledge where the master takes pupil along with him in his investigations of the unknown. I may perhaps be told that there is no place in the framework of our Indian Universities for such a school; to this I would reply that I do not think it important that this school should be affiliated to any University; I do not think that it should prepare students for a degree, I do not even desire that its courses of study should terminate in an examination, let us have at least one institution where Indians may read for the love of learning and because they delight in study; on leaving they would take with them a diploma to the effect that they had read certain subjects under certain Professors and I should trust their after-life to show what benefit they had derived therefrom. But there cannot, I fancy, be any doubt about the desirability of creating at least one such school of advanced studies for the whole of India if once we clear our minds of the illusion that the Colleges of our existing Universities are ever likely to undertake any really advanced teaching.

"I urge the endowment of this school in the interest of the Indian student, who is at present obliged to go to Europe if he desires to become proficient in any branch of science or scholarship, and I urge it even more strongly in the interest of Indian society generally as I am convinced that the intellectual level of a people must be sensibly height-

little over 5 lakhs and for the first two years, during which the details of the proposed school were being worked out and Professors engaged, this income will be devoted to purchasing a site and erecting buildings, and I should like to say in passing that there are in my opinion overwhelming reasons for placing such an institution in the hills. Of the capital sum of a crore and-a-hlaf I would devote the major part perhaps as much as 90 lakhs, to the natural sciences, because the spread of scientific knowledge is of such paramount importance for developing the material resources of the country. The school of science would perhaps comprise as many as ten chairs, filled by men who had already distinguished themselves in Europe by original work, and their salaries would probably absorb as much as Rs 12,500 a month, or a little less than half the whole income of the school; under them would be assistants and demonstrators on smaller salaries, and the remainder of the income would go all too quickly in the expenses of laboratories, libraries and subscriptions to scientific periodicals But, though I recognise the importance of science in India, I cannot reconcile myself to the idea of a University solely engaged in the cultivation of such utilitarian knowledge The 60 lakhs, still unassigned, would yield a monthly income of Rs 17,500, and with this comparatively small sum we could not pretend to cover the whole circle of the literae humaniores, but we might at least hope to establish a school of Oriental studies which would eventually become the recognised authority upon all branches of eastern learning. This Oriental side would naturally fall into three schools, of which the first and largest would be devoted to Pali, Sanskrit and the studies which would naturally be grouped about Sanskrit literature The second school would be of Arabic and Persian, and I should like to put in a plea for a third smaller group of studies which would comprise Political Economy, Comparative Economics and the Economic History of India, and this school would form a natural link between Science and Arts

"There is a considerable number of persons in India who honour Sanskrit or Arabic with their lips but who are strenuously opposed to any project for making Indian youths devote much time to the study of these venerable classics, to allay the fears of this class I would explain that with regard to both Arabic and Sanskrit literature the methods of study would be European though the subject-matter would be Oriental.

This in itself would imply a complete change in the manner in which the languages would be studied, but I mean

the proposition that our Colleges in India are in reality nothing more than schools ; the age of the students, the methods of teaching, and the standard of attainments are all those of the school and not of the University. Such an estimate of the value of our Colleges may seem invidious from the mouth of an Englishman, and so I prefer to quote the opinion of an Indian friend of mine who took the highest degree in Mathematics that the Indian Universities could bestow and then proceeded to Cambridge to study for a Research degree. After being a year in Cambridge he wrote to me that he regretted he had not read for the Ordinary Tripos as he found that many boys came up from English schools with a better knowledge of mathematics than he had brought from India, and my friend is a Master of Arts in Calcutta and a Doctor of Science in Allahabad

"It simplifies many questions of educational policy to recognise that our Indian Colleges are really schools, it disposes in the first place, of many irrelevant reproaches which are constantly made against them, it is frequently said, for instance, that our Indian Colleges have done nothing for the advancement of learning, this is true and it would be a serious indictment of a University, but it is no reproach to schools, the function of which is to give instruction in familiar and undisputed truths, and which are not constituted for research. In the second place, if we recognise that our Indian Colleges are really schools, we will realise that we cannot with impunity wrench them from their place in a system of secondary education and translate them to the superior grade of University Colleges, as schools they are doing very good work, and if an Indian College cannot as yet claim equality with a German gymnasium or an English Public School, many of them are capable of an approximation to those types ; but if we wish to transform them to the likeness of Colleges in a European University we shall be obliged, in the first place, to reorganise and reconstitute them from top to bottom and then to set to work to create substitutes to carry on the work which they have done hitherto.

The wiser as well as the easier course is to leave our B. A. Colleges undisturbed at the work of secondary education and to make some provision, on a perfectly fresh foundation, for higher studies. This brings me to my first proposal ; if it is found this time next year that there is a considerable surplus after defraying the ordinary cost of administration, I make bold to ask that a sum of £1,000,000 be set aside as the endowment of a school of advanced studies.

The interest upon one million sterling amounts to a

prices of 100 commodities during these nine years as equivalent to 100, Mr. Atkinson has prepared a series of Index numbers up to the year 1901 This Index number stood in 1881 at 95, in 1891 at 116, and in 1901 at 135; this last figure is perhaps unduly swollen by the famine prices of that year, but if the whole of that series of figures is consulted it cannot, I believe, be seriously contended that there has been any tendency towards a fall of rupee prices since 1893.

"The depreciation of the rupee since 1893 has been obscured by the stability of exchange with gold countries. I recognise that as soon as the rupee was linked to gold, local prices could not have long gone on rising if the value of gold had remained stable, but a glance at Sauerbeck's tables will show that the value of gold fluctuated greatly in that period, gold prices which had been represented by 102 in 1874 had fallen steadily until in 1896 they stood at 61 Since that year they have been rising and in 1900 stood at 75 and in 1901 at 70. As gold prices have been rising since 1896 it is no matter of surprise that rupee prices, though linked to gold, have risen too, and if this proposition is established that the purchasing power of the rupee has declined since 1893, there is no ground whatever for the assertion that by the same taxation the Government is taking more than formerly from the pocket of the taxpayer

"If then the burden of taxation has not been increased the only question that recurring surpluses suggest is whether the people or the Government of India is likely to make the best use of the money collected in excess of the present needs of the administration, personally I do not believe that the small sums secured to each family by the remission of taxation are at all likely to be employed productively; the money will not, in the familiar phrase, fructify in the pockets of the people But I can see many ways in which the Government of India might spend these considerable sums upon the people themselves; and as there will be many claimants for the surplus which I hope the Hon'ble Member for Finance may have to announce next year, I venture to put forward two suggestions; both ideas have been suggested to me by my experience as an educational officer, but they raise such large questions of general principle that they could not, without irrelevancy, be discussed along with the Universities Bill; the first of these suggestions has reference to the organisation of higher education and the second has a direct bearing upon the moral and intellectual development of Indian society though it will hardly add anything to the burdens of the taxpayer.

"At the outset I should like to secure general assent to

The second kind of punishment was resented very much by the boarders of the lower class. They considered that their class was made something like a penal colony. Of this the 2nd and 3rd class boarders could only have a taste. Sometimes memorials, representations and petitions were sent up but to be simply ignored But this punishment was resorted to in very exceptional cases; and I remember only one or two instances during my stay of eleven years in the College.

I am afraid I almost forgot to mention another punishment I mean a good thrashing from the Old Syed's stick I regret that I missed it because there was a tradition among us that this thrashing was very efficacious in improving one's prospects in life. It brought Barristerships, Deputy Collectorships and many other emoluments

In conclusion, I must acknowledge the kindness, in some cases amounting almost to fatherly affection, with which our teachers and guardians treated us It would be wrong to say that all were treated alike In the nature of things it could not be. But this is certain the fault must have been with us rather than with them Had it not been for that, that feeling of love and devotion which many of us entertain for the College would not have been engendered

## Mr Morison on the Budget.

"Ever since the Government of India entered upon a season of surpluses one complaint has been constantly repeated in the public Press, the complaint that by the closure of the mints in 1893 the Government of India increased taxation, inasmuch as the taxpayer has to pay as many, or nearly as many, rupees of the artificial value of sixteen pence as he had to pay when the natural value of the rupee was thirteen pence.

"I venture to say that if there is one thing demonstrably clear in currency problems, it is that the purchasing power of the rupee has not yet risen in consequence of the closure of the mints; I believe on the contrary that it could be far more easily maintained that the value of the rupee went on falling after 1893; it is generally admitted that an index number is the only means of arriving at probable certainty with regard to the rise or fall in the value of money, and of all the index numbers which have been composed I know of none which has been prepared with such elaborate safeguards against error as the series published by Mr. F. J Atkinson in various issues of the Journal of the Statistical Society. Beginning with the years 1868-76 and taking the average

if you have seen cavalry or artillery horses fed, a moment's delay after the bugle is sounded will make the horses neigh wildly We adopted other methods to show our profound disapproval of the khansama's conduct That cheeky fellow to allay our impatience or raise false hopes would make some one ring the bell inside without opening the doors And that adding insult to injury From the dining-room we returned to our rooms The night prayers we were supposed to have in our rooms, but how many acted up to that supposition I cannot say Some might be burning midnight oil, but generally bed was most alluring after the day's work was over

The first six months did not end with us homesick ones, without our writing home of imaginary ills that we suffered each day

There were some days extraordinary in our small routine of life The annual sports generally lasted two days in winter with many prizes for the winners The greatest excitement prevailed when the events were being competed for It reached its climax with the tug-of-war

The annual prize-day was another great function;—at least for us bookworms a greater day than the former Some big personage presided at the distribution Dressed out in your best as you walked up to receive your prize and to salute, you felt great awe as if you were going to burst or fall

The exhibition gave us each year some days to squander our little allowance away with as much rapidity as we could

Visits from some lord sahib or Indian nobleman was another festive occasion because it began with an address and meeting in the Strachey Hall and necessarily ended with a day's holiday, most appreciated by the boys

I cannot finish this without a reference to punishments which breaches of rules involved Imposition, standing on the bench, caning are ordinary forms of that and one must have had his share of them unless he was an exception But there were some forms of them which appeared to me injurious to one's honour and hence dreaded most and felt most if any one happened to incur the wrath of Maulvi Mushtaq Husain to that extent The delinquent was (1) not allowed to take his food along with others, and (2) reduced from a higher class of boarding house to the lower. The first was generally known as being made to take your food "on the shoes"—not your own but probably of others. I think nothing more painful to a young beast could be devised and I believe that unless the victim was too far gone,—and let me add that we had some of this sort too—this could not fail to bring on the desired effect and reformation

you rush to the mosque. You join at the end and finish off yourself. On return you go to the dining-room, find your tea during the cold weather and milk and a piece of bread during summer. Considering the stuff we got it is wonderful how quietly we partook of it many a time without even a word of protest. Sometimes the old Khansama was called on to improve matters, but he knew he could quite ignore such orders. After your morning tea you went to your room to prepare lessons. A bell at 9 a.m. called you to your break-fast. Many of us did not wait for that bell. The bearer was sent forward some minutes ahead of the time. Generally we took our books, when going to break-fast. To return to your room for the books was considered rather tedious. At half-past-nine was the first bell for School, and at 5 minutes to 10 the second bell was rung. By the second bell most of us were in the class room and the day's work began. In some schools it is the custom that the particular rooms are allotted to particular classes and the teachers come and go. We had the other way. The students used to go from room to room. Whatever might be said about the former from the point of view of discipline, the latter was no doubt more liked by us. Instead of being in your seat for two or three hours at a stretch like a dullard in the air and a free chat with your chum outside the class room was certainly very much enjoyed.

For noon-day prayers and tiffin an hour's rest was allowed at 1 p.m. At 2 we were back in the class room for another two hours' trouble with our teachers. At 5 the classes dismissed, and afternoon prayer over, you had a free run of the play ground. In those days, except for the annual sports and occasional cricket matches, there was not much in the way of training of the muscles. We had probably some old rickety parallel and horizontal bars. But they were not very much patronized. The membership of the Cricket Club was not compulsory but optional. Our Cricket team was not then considered very formidable, and much to our grief, we used to get defeated by Bareilly and Delhi Colleges. It was not till Mr. Beck arrived in 1884 that real interest in cricket and sports began. The fame of our Cricket team was established after the Punjab tour.

Football, Hockey, Tennis, are innovations of later date. Some of us bookworms wish that we might have utilized our opportunities better and been now healthier in body if not in mind.

At sunset another bell, and we were at the evening prayers. Having finished that, we were hammering away at the dining-room gates. It sometimes did happen that the dinner was late and you cannot well imagine our impatience;

Khalifa Syed Inayat Husain, and some other Patiala students lived in this bungalow. Beyond the two pipal trees was another kachcha barrack for boarders Further on in the same line stood M Mohamed Abbas's bungalow who was for so many years Manager of the Boarding house In two magazine-like rooms in the garden was the store room The clerk in charge of it carried on a petty shop to loot us Some of us had terribly long bills with him

I think this is all we had then in the shape of accommodation for boarders and staff, with the lecture rooms

In the same year with the increase of boarders the kachcha barrack was begun. The room next to the College and No 1 of this barrack was first occupied by M Aziz Mirza The College verandah was enclosed, M Abdul Ghani, Shah Habib Ahmad and Mohamad Ali occupied it The compound was built on the south side only with Faiz and Zahur Husain Gates on the two ends The Lady Muir Park tablet is near the Faiz Gate For the College the bungalow on the other side of the road was taken, and I think it was there that we received Sir Salar Jang He had been to Simla in connection with the unhappy Berar question, and it was on his return journey that he honoured us with a visit

College life began with me at least—(I do not know other persons' experience) by shedding of tears My father had brought us there We were taken to the Head-Master, Mr Nesbitt, who gave a chit to the teacher who had charge of the admission register. We were sorted out into our classes after the usual ceremony of taking down name, father's name, caste and creed, was gone through I was placed with a cousin of mine in the 7th Class. The school peon or somebody else left us there Either it was for separation from home, or that as a mere boy I was frightened at the prospect of being knocked by a heavy bunch of keys which our teacher carried tied in a corner of his long handkerchief, anyhow I began to weep like anything I can never forget that during the whole of that time till school closed for the summer vacation we were weeping and continually writing home asking to be called back. How fortunate it seems now that the request was not granted, and we had to stay not only that year but for many years to come. It is the experience of many of us old boys that those who took fright and ran away lost the best opportunity of getting the best education that a Moslem can have in India.

The average day began with the morning prayers, and I do not suppose that any of us there could have begun it earlier. With hasty ablutions in which always strict observance of the details was hardly to be expected or carried out,

| | | | | |
|---|---|---|---|---|
| Arabic Prize I | 1. | Ali Mahomed Khan | 2. | Tawasul Husain |
| *Preparatory* | 1 | Taffuzul Husain | 2. | Mohsin Beg |
| *Persian* | 1. | Abdul Hasan | 2. | M. Taqi. |

*School Monitors.*—Md. Hanif, Sujjad, Mahboob Ali Khan, Nazir Husain, Salim Inayat-ul-lah, Husain Ali.

*Mrs. Morison's Elocution Prizes* —

| | |
|---|---|
| College ... . | Abdul Ghani |
| School .. | S Ross Masud |

## My College Life.

### Twenty Years Ago

It was on the 20th January, 1881, that I first saw the College. I was then about ten years of age and was entered in what then we termed the 7th school class. Let me take you round the College buildings as they then stood. The College and School were both located in a building which is now entirely occupied by the school Mr. Siddons, the then Principal, used to sit in the big hall, and Mr. Nesbitt in the room next to it. I well remember our class was held in a small room on the south side of the Principal's hall.

On the north of the school building was the Hindu Boarding House Beyond that was the Principal's bungalow. On the south side was Maulvi Mushtaq Husain's bungalow—one of the six of smaller type. On the other side Mr. Nesbitt's first bungalow had just been finished. Behind Mr. Nesbitt's bungalow was the Hospital Assistant's house.

In front of the present College hall there were two barracks with the 1st class kitchen between them. These kachcha barracks were for 3rd and 2nd class boarders. The present Siddon's Union Club was the 1st class dining-room in a side room of which a reading room was located The other side room was occupied by some boarders at first and for some time by M. Abdul Jabbar Khan.

At the north-east corner of the present Denton Court there were three or four houses in which 2nd and 3rd class boarders used to dine. The present College lecture rooms were under construction. Bare walls were standing. The Mehdi Manzil was not in existence except for the foundations. The pucca barrack room No. 8. or 9 was under construction.

In front of the Strachey Hall a bungalow stood occupied by 2nd class boarders. Maulvi Fazal Haq, guardian of

The following is a full list

Iqbal Gold Medal (University of Allahabad)
*S Abu Mahomed, B.A.*

Cambridge Speaking Prize *Tarafdar Husain.*

Mr Tipping's Prize for Extempore Speaking
*R V. Gulam Husain.*

*House Monitors* —Said Mahomed Khan, Nazir-ud-din Husain, M Mosunna, Mazuffar Mahomed Khan, S Mustafa Husain, Syed Husain, Rafat Ali Khan M Akram, Talammuz Husain

*Food Monitors* —Ashfaq Husain I, Abdul Ghani, Yaqub Khan, Imtiaz Ali, Sarfaraz Khan, Abdul Malik, Tarafdar Husain, Ibn Ahmad, Ashfaq Husain II, M Aslam, Abdul Hameed.

Mrs. Hickson's Prize for Mathematics Arshad Khan.
Raja J Kishan Das' Prizes Ganpat Lal.

*Chhattarpur Prizes for Hindus* —

| | |
|---|---|
| I Year | Sukkumar Banerji |
| II Year | Siva Chandra Misra. |
| III Year | C Ram Dhan |
| IV Year | Bai Kunth Chandra |
| III Year—English Prize | Ghulam Rasool |
| III Year—Maths Prize .. | Ghulam Rasool |

Ghulam Rasool also received a medal from the Islamia College Lahore

| | |
|---|---|
| III Year Political Economy Prize | Mohiul Islam. |
| I Year—English Prize | Md. Bashir |
| I Year—Maths. Prize . | Abdul Majid. |

Ghulam Rasool is Head of the New Fourth Year, and Sukkumar Banerji Head of the Second Year.

*Theology Prize* —Nisar ul-lah, Farid-ud-din, Md. Zahir-ud-din, S Mohomed Amin

*School Prize Winners* —

| | | | |
|---|---|---|---|
| For the Best Boy .. | | | . Minhaj-ud-din. |
| Class IX | 1. Bashir Ahmad | 2. Ahsanul Ghaffur. | |
| Arabic Prize | .. Bashir Ahmad | | |
| „ VIII | 1. Md. Haidar. | 2. Md. Hanif | |
| „ VII | 1. Md. Idris | 2. Md. Ismail II | |
| „ VI | 1 Ahmad Husain Khan | 2 Bijai Bahadur | |
| „ V | 1. Md Ibrahim | 2 Zahurul Haq | |
| „ IV | 1. Abdul Ghaffur | 2 Sibti Husain, | |
| „ III | 1. Amin Ahmad | 2. Abid Ali. | |
| „ II | 1. Said Mirza | 2. Phool Chand. | |

preparation. None the less the performers are to be congratulated on their efforts. The first piece, a scene from Henry IV, was not very successful: it was perhaps too difficult for a satisfactory rendering. The Scene from Molières "Forced Marriage" was much better, Professor A Kadir being particularly good; and finally the "Pleader caught in his own trap" was excellently rendered by Sa'd Husain, Masud Husain and Abdul Rahman. Thanks are due to the Hon. Sec. Ashfaq and the members of the Committee, who worked hard to make the evening a success.

---

A prize of Rs 10 has been awarded to R. M. Ghulam Husain for the article which appears in this number.

Similar prizes will be regularly offered. Competitors, and indeed all who send contributions, are reminded that the following conditions are essential:—

(1) Plain writing, with no abbreviations.

(2) To leave a margin, and to write on one side of the paper only.

---

The University Examination results are most satisfactory and the College can justly pride itself on them. Sixty-one candidates passed the Intermediate, and in the Entrance twenty-five were successful, and five in the School Final. The percentage of "Passes" is sixty-six and seventy-five respectively.

—:o:—

## Prize-Giving.

—:o:—

The annual distribution of Prizes took place on Saturday April 23rd, in the Strachey Hall, later this year than usual, as Founder's Day, March 28th, fell on one of the days of Mohurrum.

Mrs. Morison very kindly presented the Prizes to the various winners.

# The Aligarh Monthly.

May, 1904

## College Notes

—o—

By the time this number appears all the new Classes will have been formed and the College will be unusually full.

The Staff too is at full strength as no one has Home leave due this year.

---

It is with great pleasure we announce the munificent gift of the Raja of Nandpara, who has presented the College with 30,000 Rupees to build a wing or a block of new Class rooms for the School.

Particulars as to site will be announced later.

---

We hear that the Cricket Eleven is going up to Simla at the end of this month. As to other games the League Foot-ball is again going on, and in Hockey there is to be a House Competition, which should create equal enthusiasm.

---

The Union Club held their anniversary and entertainment on April 4th. The programme was an ambitious one and there was not enough time allowed for careful rehearsal and

# علیگڈھ منتھلی


| جلد ۲ | جون ۱۹۰۴ عیسوی | نمبر ۶ |
| --- | --- | --- |


## عیادتِ بیمار میں ہمارا برتاو

جہاں تک ہمنے اپنی قوم کے اخلاق اور طرزِ معاشرت پر نظر کی ہی ہمیں اس میں صدہا باتیں لائق اصلاح معلوم ہوتی ہیں۔ ہمکو ان باتوں کے روا رکھنے میں نہ صرف اپنی قوم سے بلکہ بڑے بڑے حقانی مزاج والوں اور اچھے پڑھے لکھوں سے شکایت ہے، جو اخلاق جلالی۔ اخلاق ناصری اور اخلاق محسنی کو چاٹے بیٹھے ہیں، اور جو اخلاق کو چند ظاہری تکلیف و معاشرت پر منحصر اور محدود سمجھتے ہیں۔ ملاقاتِ دوستانہ اور مراسمِ مہانداری کی علاوہ، جو از حد درجہ خراب طریقے سے برتے جاتے ہیں، اور جن کے باعث ایک دوست کو دوسرے دوست سے تکلیف پہونچتی ہی، اور جو اکثر موقع میں کبھی دلی خوشی سے عمل میں نہیں آتے، اُن میں ایک رسمِ عیادت اور بیمار پرسی بھی حیوانیت سے خالی نہیں، جسکا کوئی حاصل نہ دین میں ہی نہ دُنیا میں۔

شارعِ مقدس نے بیشک عیادتِ بیمار کا ثواب مقرر کیا ہی، مگر نہ اُس عیادت کا جس سے بیمار کی افزائشِ مرض کا خوف ہو۔ اگرچہ ہر بیمار کا حال جُدا گانہ ہی، کوئی غریب ہے، کوئی امیر، مگر ہمارا طرزِ رفتار دونوں کیلئے ضرر رساں ہے

اَیسے غریب جنکی معیشت صرف اُن کی صحتِ جسمانی پر منحصر ہے، دو طرح کے آزار میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ ایک تو بذاتہٖ مرض، دوسرے حالتِ بیماری میں تنگی آمدنی سے۔ اُسپر طُرّہ یہ کہ عیادت کنندہ عورتوں کی سواریوں کا کرایہ دیتے دیتے ناک میں دم ہو جاتا ہے، علاوہ اِسکے کہار ہیں کہ کہاری کے لئے دروازہ پر الگ چیخم دھاڑ مچائے ہوئے ہیں، اور عورتیں اور اُنکی بچے اُدھم بالشت بھر کی جگہ میں جُدا اٹھائیں ٹھائیں کر رہے ہیں۔ بیچارے تیمارداروں کو دم لینے کی فرصت نہیں ملتی، وہ تیمارداری کریں یا مہمانداری۔ حکیم صاحب کا نسخہ ساڑھے بارہ آنے سے کم میں تو بندھتا ہی نہیں، اُسکے لئے گھر کی چیزیں گرو رکھی جا رہی ہیں۔ پھر فرمایئے بڑی شرم کی بات ہے، دَوا نہ آئے مگر کہاری تو ضرور دیجائے۔

رہے اُمراء وہ البتہ ان مشکلات سے حالتِ مرض میں فارغ البال رہتے ہیں، مگر اُن کے ساتھ ایک دوسرا طریقہ اختیار کیا جاتا ہے، جو حد درجہ مذموم ہے۔ بیمار کی صورت دیکھنے کے ساتھ ہی ایک بڑی لمبی اور ٹھنڈی سانس کھینچی جاتی ہے جو بعض وقت محض بناوٹ کا پہلو لئے ہوتی ہے۔ پھر اُسکے بعد "اے ہے۔ یہ حضور کی کیسی شکل ہو گئی ہے، آنکھیں نکل آئی ہیں، چہرہ پر خون کی چھینٹ تک ندارد، دیکھیئے خدا کو کیا منظور ہے۔ ہم لوگ تو اپنی جانیں لڑا رہے ہیں، شب بھر دُعائیں مانگتے ہیں، فلاں فلاں فال کھولنے والے کے پاس بھی گئے تھے، سُنتے ہیں کہ نصیبِ دشمناں حضور پر جادو ہوا ہے"۔

اگر بیمار اِن مار پیچ کے فقروں میں آ گیا تو پھر پو بارہ ہیں۔

اب باوجود تفصیلی حال معلوم ہونے کے بار بار پوچھ رہے ہیں، اور یہی نہیں کہ ایک آدمی نے پُوچھا ہو۔ ہر شخص جُداگانہ مریض کو مزاج پُرسی کی تکلیف دینا اپنا فرض سمجھتا ہے، اور یہ اُمور اخلاق اور مراسمِ عیادت میں اِسقدر داخل ہو گئے ہیں کہ اِن کی اِصلاح ناممکن ہے۔ کیا سوا اسکے اور کوئی دوسرا طریقہ عیادتِ بیمار کا نہیں ہے، اور کیا یہی ظاہری اخلاق اصلی اخلاق کہلاتے ہیں۔ بہت افسوس ہے کہ ہم اپنے حال کی مطلق خبر نہیں لیتے، اور عملیات کو اُس کسوٹی پر نہیں کس لیتے، جو خدا کے کلام اور رسول کی حدیث سے ملتی ہے۔ اِسمیں شک نہیں یہ سب ریا اور خود پسندی کا ثمرہ ہے جسکا نخل ہمارے دلوں میں مدتوں سے بویا گیا ہے، اور حقیقۃً یہ اُن باغبانوں کا قصور ہے، جو اپنے وعظ کے تیشوں سے

اِن اُمور کی اصلاح نہیں کرتے، اور جنھوں نے مدتوں تک اِن درختوں میں پانی سینچا ہے۔ کیا یہ قیاس غلط ہے کہ اِس قسم کا برتاؤ کرنا اپنے عزیز بیمار کے حق میں کانٹے بونا ہے، کیا آئینِ دوستی کا یہی اقتضا ہے کہ ہم ظاہری ایسے چند الفاظ اپنے منہ سے نکالیں، جنسے ہمارے پیارے مریض کو تشویش ہو، اور ایسی تشویش جو تلخیٔ مرگ سے مشابہ ہو۔

سجاؔد (دہلوی عظیم آبادی)

# زندگی کا بیمہ

دُنیا میں ایسا مبارک دن شاید ہی ہوتا ہو کہ جس دن اہلِ دُنیا میں سے کوئی نہ کوئی ایسی مصیبت میں گرفتار نہ ہو جاتا ہو، جو بظاہر اُس کی ساری اُمیدوں کا خاتمہ کر دیتی ہو۔ کبھی کبھی یہ مصائب ایسے ناگہانی طور پر آجاتے ہیں، کہ الاماں۔ تجارتی شہروں کے رہنے والوں میں سے اکثروں نے ایسے مصیبت زدہ تاجر کو دیکھا ہوگا کہ کسی خاص جہاز کے ڈوب جانیکی خبر نے اُسکو مختل الحواس کر دیا ہے۔ کون نہیں جانتا کہ یکایک آگ لگ جانیسے کتنے عالیشان محل ایسے برباد ہو گئے ہیں کہ اُن کو پھر آباد ہونا نصیب نہیں ہوا۔ اور ایسے چشم دید واقعات کی بھی کمی نہیں کہ ایک عزیز یا دوست شام کیوقت صحتِ کُلی کی حالت میں چلتا پھرتا اور دُنیا کا ضروری کاروبار کرتا نظر آیا، اور صبح کو اُسکی یہ خبر ملی کہ وہ دُنیا کا کام ہمیشہ کے لئے ختم کر گیا۔ کون ایسا انسان ہے، کہ جسکا دل ایسے واقعات کے سُننے سے بھر نہ آئے، اور جسکو غمزدوں کے ساتھ ہمدردی نہو۔

دُنیا کی عمر جیوں جیوں بڑھتی گئی، اسمیں شک نہیں کہ اُسی کے موافق تہذیب زیادہ ہوتی گئی، اور آسایش و آرام کی صورتیں زیادہ نکلنے لگیں۔ لیکن جہاں آسایش و راحت کی چیزیں عدم سے وجود میں آئیں وہاں انسان کو چشم زدن میں وجود سے عدم میں پہنچا دینے والی چیزیں بھی بحد ایجاد ہوئیں۔ جہازات اور ریل بہت کچھ بنے، بنی آدم کے آرام کے باعث ہوئے، لیکن اُسی کے ساتھ اُن کے ہاتھوں

بہتیرے چشم زدن میں وجود سے عدم کو جا بسے۔ آلاتِ جنگ میں جو جدّتیں ہوئیں، اُن سے سالہا سال کی لڑائیوں کا فیصلہ منٹوں میں ہونے لگا، مگر کتنی عزیز جانیں مثلِ مالِ مُفت ایک چشم زدن میں ضائع ہونے لگیں۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ دُنیا کی ترقی و تہذیب بحالتِ مجموعی انسان کے حق میں مضر ثابت ہوئی، نہیں، میرا مقصد صرف یہ ہی کہ دُنیا کی ترقی کیساتھ مرگِ ناگہانی کے واقعات بھی بہت ہونے لگے، اور لوگوں کو اپنی بنی نوع کے ساتھ ہمدردی کا موقع زیادہ ملنے لگا۔

ہمدردی کی علی العموم دو شکلیں ہیں۔ ایک زبانی، دوسری عملی، زبانی تو یہ کہ کسی غمزدہ کے دُکھے ہوئے دل کو تسکین کے کلمات سے تسلی دینا۔ عملی یہ کہ اُسکے نقصان کی تھوڑی بہت تلافی کر دینا۔ یہ سچ ہے کہ دُنیا میں بعض نقصانات ایسے بھی ہوتے ہیں جنکی تلافی ہو ہی نہیں سکتی۔ مثلاً شفیق ماں باپ کا سایہ سر سے اُٹھ جانا یا ہونہار نورِ نظر اور جاں نثار قوتِ جگر کا آنکھوں کے سامنے سے ہمیشہ کے لئے اوجھل ہو جانا۔ لیکن اگر غور کی نظر سے دیکھا جائے، تو اِن ناسوروں میں بھی جو مُندمل ہوتے نظر نہیں آتے، گہرا زخم اُسی جانب کو ہی، جدھر مالی نقصان کا پہلو ہے۔ میں فطری محبّت اور قدرتی اُلفت کا مُنکر نہیں، مگر یہ ضرور کہونگا کہ اِن سارے حادثات سے صدمہ اُسی وقت زیادہ پہنچتا ہی، جب کوئی دُنیاوی نقصان (مالی یا کسی اور طرح کا) ہوتا ہو۔ الغرض دُنیا میں بڑا صدمہ مالی صدمہ ہے، اور بڑی امداد مالی امداد ہے۔

اب سے تقریباً سوا دو سو برس پہلے لندن کو یکے بعد دیگرے دو ایسی سخت آفتوں کا سامنا کرنا پڑا کہ الاماں۔ پہلا جانی صدمہ تھا، اور دوسرا مالی۔ لندن کی حالت پر جسقدر اس دوسرے صدمہ کا اثر پڑا اُسقدر پہلے کا نہیں۔ چنانچہ ۱۶۶۵ء کی گرمیوں کے مہینوں میں جب لندن میں وبا کا زور ہوا تو شہر اور اہلِ شہر کی یہ حالت ہو گئی تھی کہ اوّل تو جسکے امکان میں تھا اُسنے شہر چھوڑ دیا، اور جو رہ گئے تھے، اُن میں کوئی ایک دوسرے کا پُوچھنے والا نہ تھا۔ بڑے سے بڑے دوست کو بھی ایک لمحہ کے لئے اپنے گھر میں امان دینے کا کوئی روادار نہ تھا۔ بھلے چنگے آدمی ایک دوسرے سے ایسے ڈرتے تھے، کہ خدا کی پناہ۔ سبکو اپنی جان کے لالے پڑے ہوئے تھے۔ جس گھر میں کوئی وبا میں مبتلا ہوتا تھا تو پھر نہ تو اُس گھر کے رہنے والوں کو مکان سے باہر آنے دیتے تھے، اور نہ کوئی دوسرا اُس

مکان میں داخل ہوتا تھا۔ نہ زندوں کا کوئی خبر گیراں تھا، اور نہ مُردوں کا پُرسانِ حال۔ تجہیز و تکفین کی فقط یہ صورت باقی رہگئی تھی، کہ رات کے وقت سرکاری آدمی گاڑیاں لئے ہوئے ہر ہر گلی کوچے میں آواز دیتے پھرتے تھے، کہ اپنے اپنے مُردوں کو باہر لاؤ۔ اُن مُردوں کو لیجاکر اُسی حالت میں ایک عمیق گڑھے میں اوپر تلے دفن کردیا جاتا تھا۔ خدا خدا کرکے جاڑوں کا زمانہ آیا تو اُس مرضِ مُہلک میں کمی شروع ہوئی لیکن اسی عرصے میں گھر کے گھر اور محلے کے محلے صاف ہو چکے تھے۔ ابھی پُورے طور سے مرض کا استیصال نہیں ہوا تھا کہ سنہ ۱۶۶۶ء میں لندن کو ایک ہولناک آتش زدگی کی مصیبت جھیلنی پڑی۔ آگ کیا تھی، ایک بلائے آسمانی تھی کہ جس نے سارے شہر کو خاک سیاہ کردیا۔ تین روز تک مُسلسل آگ لگی رہی شرق سے غرب تک اور شمال سے جنوب تک لندن کا کوئی حصّہ اُس سے محفوظ نہ رہا۔ بڑے بڑے سربفلک کشیدہ محل جلکر خاک سیاہ ہوگئے۔ اور غربا کے مکانات میں سے تو ایک بھی نہ بچا۔ ہزاروں آدمی بے خانماں ہوکر مارے مارے پھرتے تھے، اور جسکے پاس جو کچھ مال و متاع تھا وہ سب آگنی ماتا کی بھینٹ چڑھکر خاکستر ہوگیا۔ یہ مالی صدمہ سالِ گذشتہ کے جانی صدمہ سے کہیں زیادہ بڑھگیا۔ مرنے والوں پر تو خیر کسی نہ کسی طرح زندہ بچنے والوں نے صبر کرلیا، لیکن اس مال کے نقصان پر صبر آنا مشکل تھا، اِسکی تکلیف ہر دم محسوس ہوتی اور ہر لحظہ ستاتی تھی۔ جیتا جاگتا آدمی ہاتھ پر ہاتھ دھرے زیادہ عرصے تک تو نہیں بیٹھ سکتا، لیکن جمع پونجی جو کچھ تھی، وہ تلف ہو چکی تھی، یہ بیچارے کرتے تو کیا کرتے، اور جاتے تو کدھر جاتے۔

لیکن شاباش ہے لندن والوں کو کہ ایسے نازک وقت پر بھی اُنھوں نے ہمت نہ ہاری، بلکہ ترقی کرنیوالی قوم کے موافق، کہ مصیبت کے وقت اُسکے افراد کی ہمت اور مضبوط ہوجاتی ہے، یہ لوگ بھی زیادہ مستعد ہوگئے، اور یہ مصیبت کے واقعات اُن کی ترقی کا ذریعہ بنگئے۔ چنانچہ منجملہ اُن مفید نتائج کے، جو اس آتش زدگی سے مترتب ہوئے، ایک یہ بھی تھا کہ کچھ اہل دل لوگوں کی توجہ اس طرف مائل ہوئی کہ ایک ایسا سرمایہ جمع کیا جائے، جو آتش زدگی کے بُرے وقتوں میں کام آئے۔ اِسکا یہ نتیجہ ہوا کہ اُسی زمانہ میں تھوڑے سے آدمیوں نے ملکر ایک کمپنی قائم کی، اور سنہ ۱۶۸۱ء میں اُس کے باقاعدہ دفتر کا افتتاح ہوا اور ایک کمپنی آتش زدگی کا بیمہ کرنے کے لئے باضابطہ قائم ہوگئی۔ اور اس طرح

سے بیمہ کرنیوالی کمپنیوں کی ابتدا ہوئی۔

بیان متذکرۂ بالا سے ظاہر ہوا ہوگا کہ سب سے پہلے بیمہ کرنیوالی کمپنی آتش زدگی کے لئے قائم ہوئی تھی، اور رفتہ رفتہ بیمہ کا اسقدر رواج ہوا کہ ہر قسم کی چیز کا بیمہ ہونے لگا - قرضداروں کا بیمہ، ژالہ زدگی کا بیمہ، یہاں تک کہ ملازم کے بیمہ تک کی نوبت آپہونچی۔ لیکن آتش زدگی زندگی اور حادثات بحری کے بیمے سب سے زیادہ مقبول ہوئے۔

زندگی کا بیمہ کرنے کیلئے کمپنیاں سترہ صدی میں قائم ہوئیں۔ اِن کمپنیوں کا مقصد زندگی کا بیمہ کرلینے سے یہ نہ تھا کہ زندگی کی حفاظت کا اُنھوں نے بیڑہ اُٹھالیا تھا، اور نہ یہ مقصود تھا کہ جو بدنتائج اُس شخص کے فوت ہوجانے سے اُسکے وُرثاء کو ہوتے ہوں، وہ آیندہ نہوں، بلکہ یہ مقصود تھا کہ اُس بڑے مالی نقصان سے بچنے کے لئے، جو کسی شخص کے یکایک مرجانے سے ہوا کرتا ہے کچھ انتظام پہلے سے کرلیا جائے۔ ابتدا میں بیمہ کا یہ طریقہ اختیار کیا گیا تھا کہ کمپنی تھوڑے تھوڑے عرصے کے لئے زندگی کا بیمہ کیا کرتی تھی، اور سالانہ چندہ کی تعداد بہت زیادہ رکھتی تھی۔ مثلاً ہزار پر دس سال کے لئے بیمہ کرنے کیواسطے سالانہ چندہ سو اسو لیا جاتا تھا، اِس صورت میں صرف بعض موقعوں پر بیمہ کرانیوالوں کو نفع ہوتا تھا، ورنہ عموماً نقصان رہتا تھا کیونکہ صرف اس صورت میں کہ بیمہ کرانیوالا دس سال کے اندر مرجائے تو اُسکے ورثاء کو ہزار کی رقم ملجاتی تھی، ورنہ کمپنی کو کچھ دینا نہیں ہوتا تھا اور چونکہ کم زمانہ کیواسطے اور صرف اچھی تندرستی والوں کا بیمہ کیا جاتا تھا، اسوجہ سے کمپنی بہت زیادہ فائدہ میں رہا کرتی تھی، مگر یہ صورت زیادہ عرصے تک قائم نہ رہ سکی۔ سترہ صدی کے اخیر میں محض بیواؤں اور یتیموں کے فائدے کی غرض سے ایک کمپنی قائم ہوئی، لیکن چونکہ وہ بھی ٹھیک اور صحیح اُصول پر نہیں چلائی گئی، اسوجہ سے اُسکو بھی ناکامی ہوئی۔ سنہ۱۷۰۶ء یعنی اٹھارویں صدی کی ابتدا میں ایک کمپنی بنام امیکیبل سوسائٹی قائم ہوئی، اُسکے ممبر ۱۲ سال سے کم عمر اور ۵۵ سال سے زیادہ عمر کے آدمی نہیں ہوسکتے تھے، قاعدہ یہ تھا کہ ہر عمر کے آدمی سے ایک رقم معینہ سالانہ وصول کیجاتی تھی اور اُسکا منافع اُن لوگوں کے ورثاء پر، جو سال کے اندر مرتے تھے، تقسیم کردیا جاتا تھا۔ اگرچہ اس میں

کثرت سے لوگوں کی حق تلفی ہوتی تھی، کیونکہ کم عمر والوں کو زیادہ عرصے تک سالانہ چندہ دینا پڑتا تھا، لیکن پھر بھی یہ کمپنی ایسی حالت میں ایک پوری صدی تک قائم رہی۔ سنہ ۱۸۰۷ء میں یعنی پورے سو برس کے بعد ایکیبل سوسائٹی میں چندہ کا مختلف نرخ عمر کے اعتبار سے قائم کیا گیا ہے۔ سنہ ۱۸۵۶ء میں ایک شخص ڈادسن نامی نے ایکیبل سوسائٹی کی ممبری کی درخواست کی، لیکن چونکہ اُس کی عمر ۵۵ سال سے زیادہ تھی، اسوجہ سے وہ ممبر نہ بنایا جاسکا۔ ایکیبل سوسائٹی کا یہ فیصلہ اُسکو نہایت سخت معلوم ہوا اور اُسنے اُسی وقت سے یہ کوشش کی کہ دوسری کمپنی ایسے مقصد کیلیئے قائم کیجائے، جس میں ہر عمر کا آدمی شریک ہوسکے، اور کسی کی حق تلفی نہو۔ چنانچہ ۶ برس کی لگاتار کوشش کے بعد یعنی ۱۸۶۲ء میں ایکوئیٹیبل سوسائٹی کے نام سے ایک کمپنی قائم ہوئی اس میں کم و بیش سارے وہ اُصول مدِنظر رکھے گئے تھے، جو آج تک رائج ہیں۔ اسکے بعد بیمہ کرنیوالی کمپنیاں اسقدر مقبول ہوئیں کہ ہر سال ایک ایک نئی کمپنی کھُلنے لگی، یہانتک کہ ۱۸۴۴ء میں ان کمپنیوں کی تعداد ۱۰۰ تک پہنچ گئی۔ یہ کمپنیاں جو قواعد چاہتی تھیں، بنالیتی تھیں، جسقدر مناسب سمجھتی تھیں سالانہ چندہ مقرر کرلیتی تھیں، کوئی اُن کی کارروائیوں کا نگراں نہ تھا۔ آپس میں تقسیم حصص کیوقت دقتیں پڑتی تھیں، کبھی کبھی بعض کا دیوالہ نکلتا تھا، اسوجہ سے سرکاری مداخلت کی ضرورت محسوس ہوئی، اور ۱۸۴۴ء میں جائنٹ اسٹاک کمپنی کا ایکٹ پاس ہوا۔ اُسنے اُن کمپنیوں کے لئے قواعد منضبط کردیئے۔ پھر آخر میں ۱۸۷۰ء میں لائف انشورینس کمپنی کا ایکٹ پاس ہوا، جسکے بموجب ہر کمپنی کیواسطے لازم قرار پایا کہ بیس ہزار پونڈ یعنی تقریباً تین لاکھ روپیہ اپنا کیپٹل جمع کرلے جب کام شروع کرے۔ اسکے علاوہ گورنمنٹ میں حساب کا پیش کرنا بھی لازم کیا گیا۔ یہاں تک بیمہ کرنیوالی کمپنیوں کی ابتدا اور اُس کی موجودہ حالت تک نشوونما کی تاریخ تھی۔

۔باقی آیندہ۔

سیّد جلال الدین۔

# جذباتِ سفر

## (قصیدہ ذو مطلعین در ذکرِ بھوپال)

دوستو ایکدم کی مہلت ہے — اس میں مل بیٹھنا غنیمت ہے
داستانِ سفر سُناتا ہوں — کچھ تو سُن لیجئے اجازت ہے؟
ہے پُرانی مثل "سفر ہے سقر" — اس زمانے میں اب تو راحت ہے
ریل کی بھی عجیب سواری ہے — دم میں طے منزلوں مسافت ہے
گرچہ بیجاں ہیں۔ کتنے ہی جاندار — بھاپ کی بھی عجیب قوت ہے
بھاپ جسکا یہ زور۔ کیا کہنا — نظر آتی خدا کی قدرت ہے
واقعی کائنات کی ہر چیز — حیرت افزائے اہلِ فطنت ہے
دیدۂ دل سے دیکھ دُنیا کو — اسکی ہر شے میں عین حکمت ہے
عالمِ مادی و رُوحانی — حیرت انگیز ان کی فطرت ہے
ایک سے ایک کا جدا عالم — اور ہی صورت اور سیرت ہے
کائنات ایک کارخانہ ہے — (ق) — جس میں ہر شے کی خوب کثرت ہے
ہے لمیٹڈ یہ کمپنی لیکن — تار کا سب کا ایک صورت ہے
ایک سے اک جدا اگر پھر ایک — یہی کثرت دلیل وحدت ہے
ساقیا دے شرابِ شوق مجھے — کیا ہی یہ خوشگوار نعمت ہے
مست ہو کر سناؤں ایک غزل — (غزل) — جوشِ دل سے عجیب حالت ہے
عشق۔ حسنِ ازل کی زینت ہے — کاشفِ پردۂ حقیقت ہے
مرنا۔ جینا ہے۔ رنج۔ راحت ہے — واہ کیا عالمِ محبت ہے

پوچھنا کیا وفا کی نعمت کا  جب جفا میں تری یہ لذت ہے
بوالہوس۔ عشق اور تو۔ کیا خوب  پاکبازی ہی شرطِ اُلفت ہے
جلوۂ حُسن ہے عیاں ہر سُو  دیدکی آہ کِسکو طاقت ہے
ناصحا میں سمجھ گیا۔ بس بس  بدلی شاید تری بھی نیّت ہے
دل میں ہر دم خیالِ یار رہے  یہی نوّاب اپنی جنّت ہے
(مطلع ثانی)
ٹھہر اے خامہ کیوں یہ وحشت ہے  سامنے تیرے دشتِ غُربت ہے
ہے نشیب و فراز ہر جانب  بس زمانے کی ایسی حالت ہے
کفِ دریا میں کوہ کا دامن  ماہِ کنعاں کی سی حقیقت ہے
آبشاروں کی وہ روانی واہ  موجزن جیسے حق کی رحمت ہے
دیکھ پتھر سے چشمے پھوٹتے ہیں  سنگدل۔ یہ مقامِ عبرت ہے
کوہِ سُرخ اُسپہ سبز درخت  ذکرِ حسنینؑ کی شہادت ہے
کیسا دلکش ہے منظرِ بھُوپال  شکلِ محبوب کی شباہت ہے
حُسنِ صورت میں ہی غضب کی آن  سادگی اور بھی قیامت ہے
آہ! باشندگانِ شہر مگر  ان کی افسوسناک حالت ہے
ہمّتیں پست ہیں نہیں کچھ جوش  ایسی کچھ بُجھ گئی طبیعت ہے
ہے اخوّت نہ آہ ہمدردی  ایک سے ایک کو عداوت ہے
خود پسندی نے راہ ہے ماری  اُسپہ خودبینی اور آفت ہے
ہیں پُرانی لکیر کے وہ فقیر  گھیرے ہر سمت سے ذلت ہے
مقتدر جو رئیس ہیں اُن کو  نشۂ بادۂ امارت ہے
متوسط ہیں جو مُسلماں اور  اُن کو سودائے عیش و عشرت ہے
حیثیت جن کی دیکھی معمولی  اُنپہ چھائی ہوئی فلاکت ہے

ہے نہ تعلیم و تربیت کا شوق — پھیلی ہر سمت کیا جہالت ہے
سرد بازارِ کسب ہے ہر سُو — بند دروازہ تجارت ہے
ہیں زمانے سے بے خبر افسوس — اب تو جاگیں۔ یہ کیسی غفلت ہے
سب تجھے شکوہ نہیں فقط بھوپال (ق) — ہند میں اپنی جو ریاست ہے
اُس کی حالت ہے ایسی ہی ابتر — یا الٰہی یہ کیا قیامت ہے
پر بُرا ماننے کی بات نہیں — ہوتی اپنوں ہی سے شکایت ہے
دوست کا پیار ہے بتانا عیب — کیا ہی سچا نشانِ اُلفت ہے
مثلِ آئینہ صاف مُنہ پہ کہے — یہی تعریفِ صاف طینت ہے
یوں جو خستہ خراب ہیں ہم لوگ — اپنے اعمالوں ہی کی شامت ہے

فضل کر فضل اے خدائے کریم
قابلِ رحم اپنی حالت ہے

خاکسار

# سکّہ کی ابتدا اسلام میں

(نواب علی نیوتنوی)

دُنیا میں وہ کون ہے، جو ابیض نورانی کی ناز آفریں اداؤں کا دل سے والہ و شیدا یا اُس کی قدر و قیمت سے واقف نہیں ہے لیکن ایسے بہت کم لوگ ہیں، جو اُس کی ابتدا، اُسکی ترقی اور اُس کی حالتِ موجودہ پر اُسکی تاریخ سے واقف ہوں، جس طرح کہ سکّہ کی ابتدا اقدیم سلطنتِ لیڈیا میں، جہاں کے دولتمند بادشاہ قارون کا نام ابیض نورانی کے عشق کے لحاظ سے آج تک ضرب المثل ہے، ہوئی، اور پھر یونانیوں اور رومیوں میں بتدریج ترقی پاکر تمام عالم میں پھیل گیا، اُس پر بحث کرنا ایک طولِ عمل ہے کیونکہ اسوقت ہم صرف اسلامی سکّہ کی ابتدا پر بحث کرنا چاہتے ہیں۔

ابتدا میں جبکہ جماعتِ انسانی کی ضرورتیں محدود ہوتی ہیں، تبادلہ سے کام چل جاتا ہی لیکن جب ترقی تمدن کیساتھ مختلف افراد کی ضرورتوں میں مختلف طور پر ترقی ہوتی ہے، تو کسی ایسی چیز کی ضرورت پیدا ہوتی ہے، جو سب اشیا کی خرید و فروخت کے لئے ذریعۂ تبادلہ بن سکے، اور چونکہ ایسی شی کے مقبول عام ہونیکے لئے علاوہ دوسری صفات کے ضروری کہ وہ (۱) کمیاب ہو (۲) بدقت حاصل ہوسکتی ہو (۳) وزن کے اعتبار سے جسامت میں کم ہو۔ (۴) بطور خود بھی اُس کی قدر و قیمت ہو (۵) سخت ہو۔ اِسی وجہ سے قدیم سے دُنیا نے بالاتفاق فیصلہ کر دیا ہے کہ جیسی قابلیت چاندی اور سونے میں ذریعۂ تبادلہ بننے کی ہی، ویسی کسی دوسری شے میں نہیں ہی، پس اسیوجہ سے یہ قیمتی دھاتیں عام اشیار کی خرید و فروخت میں استعمال ہونے لگیں، لیکن جب تجربہ سے ثابت ہوا کہ حرص و طمع ایسی چیز ہے کہ انسانکو دغا و فریب کیطرف مائل کرتی ہی، اور رفتہ رفتہ اِن دھاتوں تک بھی اُسکا سلسلہ پہونچا تو کسی ایسی معیار کی ضرورت داعی ہوئی، جس سے بآسانی خالص و قلب میں تمیز ہوسکے، اور چونکہ صنعت و حرفت اور تجارت و سلطنت سب کاروبار کے لئے کسی عام ذریعۂ تبادلہ کی ضرورت تھی، اسلئے سلطنت ہی نے اسکا اہتمام اپنے ہاتھ میں لیا، اور ان دھاتوں کے مختلف ٹکڑوں کو اپنی خاص علامت ثبت یا منقوش کرکے جاری کیا، تاکہ ہر شخص کھرے کھوٹے میں تمیز کرسکے، یہی ابتدا سکے کے چلن کی ہی۔ عرب میں قدیم زمانے میں کوئی مُلکی سکہ رائج نہ تھا، بلکہ جس جس حصۂ ملک پر جس سلطنت کا اثر تھا یا تجارتی تعلقات تھے، اُسکا سکہ وہاں رائج تھا۔ جنوبی عرب میں جہاں قدیم سے یمنی تمدن پھیلا ہوا تھا، حمیری سکے رائج تھے، اور وسطِ عرب میں جو سلطنتِ ایران سے متاثر تھا ساسانی سکوں کا رواج تھا، اور شمال میں جہاں رومی سلطنت کا سایہ پڑا تھا رومی درہم و دینار عام طور پر مروج تھے، جب ہمارے ہادیِ برحق نے جزیرہ نمائے عرب میں کلمۃ الحق کا اعلان کرکے اسلام کی تبلیغ کی تو جس زمانے تک کہ اسلام کے بیرونی تعلقات قائم نہ ہوئے تھے، وہی قدیم سکے رائج رہے، لیکن جب نورِ اسلام نے دوسرے ممالک کو روشن کیا، اور جدید تمدنی ضرورتوں اور تجارتی وسعت کے لحاظ سے پردیسی سکوں کی تعداد، جو قدیم زمانے میں اہلِ عرب کی محدود ضرورتوں کے لئے کافی تھی، ناکافی ثابت

ہوئی تو جس طرح پر کہ دوسرے مفیدے انتظامات کی بنیاد امیر المومنین عمرؓ فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مبارک زمانے میں پڑی تھی، اُسی طرح سکّہ کو بھی پہلی دفعہ ممالکِ اسلامیہ میں ضرب ہونے کی عزت اُسی متبرک عہد میں سنہ ہجری میں حاصل ہوئی[۱]، لیکن چونکہ طبیعتِ انسانی کا خاصہ ہے کہ جن اشیا سے مانوس ہوجاتی ہی، اُسکو بہت ہی مشکل سے ترک کرتی ہی، اور گو سمجھدار لوگ علم و عمل کے زور سے خاصّہ طبیعت کو روک بھی لیتے ہیں، مگر جاہل و ناداں لوگ تو اُسکے ہاتھ میں بالکل ہی بے بس ہوتے ہیں اور یہ ظاہر ہی کہ سکّہ ایسی چیز ہے جسکو جاہلوں اور عالموں دونوں، بلکہ جاہلوں سے بیشتر اور عالموں سے کمتر سابقہ پڑتا ہی اسلئے اُس کا بدلنا کچھ آسان کام نہیں ہی، اور اگر ایسا قصد بھی کرتے ہیں، تو بہت ہی بتدریج اور آہستہ آہستہ حصولِ مرام کیطرف قدم بڑھاتے ہیں، اسکے علاوہ یہ بھی بڑی دقت تھی کہ صرف مسلمانوں ہی میں لین دین محدود نہ تھا بلکہ تجارتی کاروبار کی ضرورتوں نے دوسری قوموں سے تعلقات قائم رکھنے پر بھی مجبور کیا تھا، اور اسلئے خالص اسلامی سکّے کے اجرا کے لئے استحکامِ سلطنت مقدم تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ابتدا میں سکّہ جب ضرب کیا گیا ہے تو نہ اُسکا نام یا وزن بدلا گیا اور نہ صورت و ہیئت۔ چنانچہ جو سکّے حضرت عمرؓ کے زمانے میں مضروب ہوئے تھے وہ درہم و دینار و فلوس ہی کہلاتے تھے، اور بعد میں بھی یہی نام مروج رہے، حالانکہ لفظ دینار رومی لفظ دیناریس اور یس (        ) اور درہم (        ) لفظ ڈریخم اور فلس لفظ فالس (        ) سے نکلا ہی، اور اسیطرح ہیئت کے اعتبار سے رومی اور ایرانی نمونے قائم رکھے گئے تھے، صرف اُنپر نام یا کوئی برکت کا کلمہ عربی زبان کا بڑھا دیا گیا تھا حضرت عمرؓ کے زمانے کا کوئی سکّہ ہماری نظر سے نہیں گزرا، لیکن ایڈورڈ ٹامس نے جن ساسانی سکّوں کی تصویریں دی ہیں، اُن کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا میں نام بھی عربی زبان میں نہیں لکھتے تھے، بلکہ بنانیوالے اور دار الضرب کا نام بھی دری زبان میں لکھا جاتا تھا، اور اُنپر ایک طرف خسرو پرویز کی صورت اور دوسری طرف آتش و قربانگاہ اور دو موبدوں کی تصویر بنائی جاتی تھی۔ سب سے زیادہ اس قسم کے سکّے زیاد ابن ابیہ کے زمانے کے پائے جاتے ہیں، جبکہ وہ امیر المومنین علی کرم اللہ وجہہ کیطرف

---

[۱] المقریزی ۱۲۔

سے بصرہ کا گورنر تھا۔ اُسکے بعد جب عبداللہ ابن زبیر کا زمانہ آیا تو اُنھوں نے اِس وجہ سے کہ اکثر مختلف قیمتوں اور عیار کے سکے رائج تھے، اور اُن کی وجہ سے عام طور پر کاروبار میں نہایت خرابی پڑتی تھی، اِس طرف توجہ فرمائی، اور اُن کے بھائی مُصعب ابن زبیر کے حکم سے حارث ابن عبداللہ ابن رابعۃ المخزومی نے سنہ ہجری میں سکے بنانے شروع کئے، مگر یہ سکے بھی بالکل ایرانی وضع کے تھے، صرف اتنا فرق تھا کہ اُنپر ایک طرف الفاظ (برکت اللہ) اور دوسری طرف (اللہ) بڑھا دیے جاتے تھے، لیکن چونکہ عبداللہ ابن زبیر کا زمانۂ خلافت محض چند روزہ تھا، اور یوسف ابن حجاج کے ظالم مگر قوی ہاتھوں نے بہت ہی جلد اُسکا خاتمہ کر دیا، اسلئے معلوم ہوتا ہے کہ اُنکے زمانے کے سکّے زیادہ عرصے تک مروج نہیں رہے، ابتدا میں ایرانی طرز کے سکوں کے مضروب ہونے کی یہ وجہ تھی کہ دارالضرب قسطنطنیہ تو جاری تھی، اسلئے ممالک شام وغیرہ میں سکوں کی کمی ہوتی تھی تو وہاں سے پوری ہو جاتی تھی، مگر برخلاف اُسکے دارالضرب ایران ساسانیوں کی تباہی کی وجہ سے بند ہو گئی تھی اور اسلئے وہاں سلطنتِ اسلامی ہی کو جدید سکے بنانے پڑے۔ غرضکہ عبداللہ بن زبیر کے زمانے تک سکوں کی وہی قدیمی شان قائم رہی لیکن خلیفہ عبدالملک بن مروان نے یوسف بن حجاج کی سختی اور تدبیر ملکی کی بدولت ممالک اسلامیہ کو اندرونی بغاوتوں اور قضیوں سے پاک کیا تو خلافتِ اسلامیہ کے سطوت وجبروت میں یہانتک ترقی ہوئی کہ اُسنے فرامین کی پیشانی سے تثلیثی طغرا کو نکالکر توحیدی طغرا قائم کیا، اسپر جسٹنین دوم قیصر روم نے رسم قدیم کے پھر اختیار کئے جانے سے مایوس ہوکر یہ دھمکی دی کہ میں اپنے سکّے میں نعوذ باللہ تمھارے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم) کے نام کے ساتھ ایسے الفاظ منقوش کرا دوں گا، جو تم کو نہایت ناگوار گزرینگے، اور چونکہ ہمارا سکّہ عالمگیر ہے اسلئے ساری دُنیای اسلام میں بآسانی پھیلجائیگا، یا یہ ہو جیسا کہ ابن خلدون نے بیان کیا ہی، کہ قیصر روم نے اُن خطوط کی پیشانی پر جو اُسکے پاس خلیفۂ اسلام کے یہاں سے آتے تھے، قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ، اور آں حضرت صلعم کا نامِ نامی دیکھکر پیچ وتاب کھایا، اور ایسی دھمکی دی۔

معلوم ہوتا ہی کہ جب سلطنتِ بنی اُمیّہ دمشق میں قائم ہوئی، تو اُنھوں نے رومیوں کی طرح

تثلیثی طغرے اور طراز کو محض علامات حکومت و سلطنت سمجھکر اختیار کرلیا، اور گو بعد میں اُسکے سعنی سمجھ بھی گئے لیکن چونکہ اندرونی بغاوتوں، اور آئے دن کے فسادوں کی وجہ سے اتنی قوت نہ تھی کہ اُس غیظ و غضب کا مقابلہ کرسکتے، اسلیئے اُنھوں نے اُنکو نہیں بدلا، لیکن جب عبدالملک کے زمانے میں سلطنت کی بُنیاد قوی ہوئی تو اُسنے پہلے ہی موقعہ پر اُس غلط طریقے کو بدل دیا جو قیصر رُوم کو نہایت ناگوار گزرا، لیکن چونکہ اُسکی رعایا کی منصفانہ بغاوتنے جیساکہ گبن نے لکھا ہے، جلد اُسکا خاتمہ کر دیا، اسلیئے اُس سے کوئی بدنتیجہ پیدا نہیں ہوا، اوّل یہ ہو کہ اگر قیصر رُوم دھمکی نہ بھی دیتا تو تمدنی ضرورتیں خود اس امر پر مجبور کرتیں کہ ممالکِ اسلامیہ میں سکّہ بنایا جایا، اور کثرت سے بنایا جائے، کیونکہ اس زمانے میں ممالکِ محروسہ کے حدود ایک طرف تو سرحدِ چین سے ملی ہوئی تھی، اور دوسری طرف خلیج بسکے سے ٹکر کھاتی تھی؛ پس گویا قیصر روم کا دھمکی دینا بارود میں شتابہ ہوگیا۔ اور عبدالملک بن مروان نے خالد بن یزید بن معاویہ کے صلاح و مشورہ سے، جنکو بوجہ علم و فضل اور دانش و فرہنگ کے ”حکیم بنی اُمیّہ“ کا معزز خطاب دیا گیا ہو، ۷۶ھ ہجری میں اسلامی سکّہ بنانا شروع کیا، مختلف تاریخوں کے دیکھنے سے ایک عجیب اختلاف معلوم ہوتا ہے، کیونکہ بعض مورخین نے لکھا ہے کہ ۷۴ھ ہجری میں سکّہ مضروب ہوا اور اکثر کا اسپر اتفاق ہے جیساکہ ہم نے بھی لکھا ہے کہ ۷۶ھ ہجری میں سکّے کا رواج ہوا۔ لیکن اگر خود سکوں کو علامہ مقریزی کے بیان سے مقابلہ کرکے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا میں جو سکّہ عبدالملک نے بنوایا تھا، اُس میں بڑی حد تک رومی شان قائم رکھی گئی تھی، یعنی اُس میں عبدالملک نے اپنی تصویر بنوائی تھی، جسکی کمر سے تلوار لٹکتی تھی۔ اب ہم چند قدیمی سکّوں کی تفصیل بتاتے ہیں

(۱) طرف اوّل۔ رومی طرز کی صورت۔ سر پر تاج، اُسپر صلیب۔ سیدھے ہاتھ میں ایک کرہ، اُسپر صلیب اور اُس کی دائیں طرف لفظ ”بحمص“ عربی خط میں اور بائیں طرف یونانی لفظ KAΛΛ ”عمدہ“ طرف ثانی۔ صرف M اُسپر ایک ستارہ اور دو دائرے اور حاشیہ پر یونانی لفظ IMECHC اور اُسکے نیچے عربی لفظ ”طیب“۔

(۲) طرف اوّل۔ رومی طرز کی صورت۔ جسم سیدھا، ہاتھ اوپر کو اُٹھا ہوا، برچھا لیئے

ہوئے دوسرے ہاتھ میں ایک کرہ، جسپر صلیب چڑھی ہوئی۔ بائیں طرف بسم اللہ سیدھی طرف ۵۸
طرف ثانی M اوسپر صلیب۔ حاشیہ پر IMECHC اوسکے نیچے "طلیب"۔
(۳) طرف اوّل۔ دو قدِ آدم مورتیں۔ ہر ایک کے ہاتھ میں عصای شاہی جسپر صلیب لگی ہوئی، اور اُن مورتوں کے بیچ میں (مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ) اور حاشیہ پر (لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ)
(۴) طرف اوّل قدِ آدم مورت۔ بال بڑے بڑے اور ایک طرف کمر سے تلوار لٹکتی ہوئی۔ حاشیہ پر (مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ) طرف ثانی M حاشیہ پر "ایلیا فلسطین"
(۵) طرف اوّل۔ مورت نصف جسم۔ چہرہ سامنے۔ اور بال لمبے حاشیہ پر (لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ) طرف ثانی شاہوا۔
(۶) طرف اوّل۔ کھڑی مورت چُغہ پہنے ہوئے ہاتھ سینے تک اُٹھا ہوا۔ اُسی ہاتھ میں تلوار کا غلاف جو کمر سے لٹکتی ہی، اور حاشیہ پر خطِ کوفی میں (لعبد اللہ عبد الملک امیر المومنین) لکھا ہوا طرف ثانی ایک صلیب جسکا سرا چار سیڑھیوں پر قائم ہے اُس کی سیدھی طرف (لقنسرین) اور اُلٹی طرف (واف) حاشیہ پر لا الہ الا اللہ وحدہ محمد رسول اللہ)
(۷) دینار طلائی۔ طرف اوّل وسط میں۔ (لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ) حاشیہ پر (محمد رسول اللہ ارسلہ بالھدی ودین الحق لیظھرہ علی الدین کلہ)
طرف ثانی وسط میں
(اللہ احد اللہ الصمد لم یلد ولم یولد) حاشیہ پر
بسم اللہ ضرب ہذا الدینار فی سنہ سبع وسبعین۔
(۸) درہم نقرئی۔ طرف اوّل وسط
(لا الہ الا اللہ
وحدہ لا شریک لہ)

حاشیہ پر (بسم اللہ ضرب ہذا الدرہم فی سنہ تسع وسبعین - اور حاشیہ پر پانچ علامات وقف (ہ)

طرف ثانی

(اللہ احد اللہ الصمد

لم یلد و لم یولد و لم

یکن لہ کفواً احد)

حاشیہ پر

(محمد رسول اللہ ارسلہ بالھدی ودین الحق لیظہرہ علی الدین کلہ ولو کرہ المشرکون)

ان سکوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ نمبر ۴ و ۵ کے غالباً وہی سکے ہیں، جنکے ابتدامیں ضرب کئے جانے کا علامہ مقریزی نے ذکر کیا ہے، اور اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مورخوں کے جوبیانات دربارہ تقدیم وتاخیر ہیں، اُن میں دراصل کوئی اختلاف نہیں ہے۔ کیونکہ رومی طرز کا سکہ پہلے سے ضرب ہوتا تھا، مگر خاص عربی عبارت کا سکہ ۷۶ھ میں ضرب ہوا، اگر دوسرے پہلو سے ان سکوں پر تفصیلی نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے جیسا کہ ہم نے پہلے بیان کیا ہے کہ کسقدر آہستہ آہستہ خالص اسلامی سکے کی ترویج کے لئے راستہ صاف کیا گیا ہے۔ سکہ نمبر ۱ میں تو کوئی تصرف سوائے اسکے نہیں کیا گیا کہ کوفی خط میں لفظ (بحمص) لکھدیا گیا تاکہ معلوم ہوجائے کہ یہ سکہ ممالکِ اسلامیہ میں مضروب ہوا ہے اور دوسری طرف اس خیال سے کہ لوگ اسکو جدید سمجھکر کہیں بُرا یا جعلی نہ سمجھیں لفظ (طیّب) منقوش کردیا گیا۔ دوسرے سکے میں رومی وعیسائی علامتوں کو قائم رکھکر (بسم اللہ) کو داخل کردیا گیا ہے اور دوسری طرف رفع شک کے لئے پھر لفظ (طیب) لکھا گیا ہے۔

تیسرے سکے میں رومی وعیسائی علامتوں کو قائم رکھکر ساتھ کے ساتھ اپنے مذہبی اعتقاد کا بھی اعلان کردیا گیا، اور ایک طرف دو صلیبوں کے مابین (محمد رسول اللہ) اور دونوں طرف حاشیہ پر (لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ) لکھدیا گیا۔ تثلیث و توحید کا یہ عجیب اتحاد ہے۔ اور اس سکے پر (طیب) کے لفظ کے نہ ہونے سے پایا جاتا ہے کہ اب لوگ اسلامی سکے سے مانوس ہوچلے تھے چوتھے سکے سے

ر بھی ترقی ظاہر ہوتی ہو کہ علامتِ صلیب غیر موجود ہی۔ اور پانچویں سکے میں تو خالص وحدانیت کا اظہار ہے
رکہ ایک صورت بھی موجود ہی۔ چھٹے سکے میں پوری طرح پر اعلان کر دیا گیا ہی کہ یہ سکہ خلیفۂ اسلام کا ضرب کیا
ا ہی مگر اُسکے ساتھ بنظرِ احتیاط علامتِ صلیب کو قائم رکھا گیا ہی، گو کہ اُس کی شکل ایسی بدل دی ہی کہ چاہو تو
سے کچھ اور سمجھ لو، رفع شک کے لئے لفظ (داف) بھی لکھدیا ہی۔

یہ چھ سکے دمشقی ہیں اور اس سے اور بھی اچھی طرح ظاہر ہوتا ہے کہ کسطرح اور کیسے آہستہ آہستہ
لائق کو خالص اسلامی سکے کے اجراء کے لئے تیار کیا گیا، کیونکہ یہ ظاہر ہے کہ سکہ ایک تو مقدار میں زیادہ
ہوتا ہے، دوسرے امیر و غریب سبھی کے ہاتھ میں جاتا ہی۔ تیسرے اُس کی قیمت اسقدر کم ہوتی ہی کہ کسی
شبہ ہو جائے تو بھی اُسکا چلن مشکل سے رُک سکتا ہے، جب عام طور پر ان ناقص اسلامی سکوں
رواج ہو گیا، اور ممالکِ متصلہ میں بھی وہ بے تکلف چلنے لگے، اور ادھر مسلمانوں میں بھی خالص
اسلامی سکہ پر تصویر ہونیسے ایک قسم کی برہمی پیدا ہو گئی تو عبدالملک نے جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا ہی، خالد بن
یزید کے مشورہ سے سنہ ۷۶ ہجری میں خالص اسلامی سکہ جاری کیا، اس سکے میں وہی عبارت تھی جو سکہ
نمبر میں ہے، جو ایک سال بعد کا ہی۔ اُس میں تمام رومی و عیسوی علامات کو ترک کر کے صاف صاف
لفظوں میں خدا کی وحدانیت اور رسول اللہ کے نبی برحق اور دینِ اسلام کے صراطِ مستقیم ہونیکا اعلان کیا
گیا ہی، اور عیسائیوں پر ظاہر کر دیا گیا ہی کہ اُنکا دین باطل اور ہمارا حق ہے۔

ان پرزور جملوں کے کندہ کرنیسے غالباً جسٹینین کا جواب دینا مقصود تھا اور شاید یہ پولیٹکل خیال
بھی ہو کہ ایسے پُرجوش فقرے لکھنے سے سکوں کے مروج ہونے میں مسلمانوں کے مذہبی جوش سے بھی
مدد ملیگی، لیکن میرے خیال میں اصلی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ ان پرجوش الفاظ سے تثلیث کے مقابلہ
میں توحید کی خوبی و عظمت کا اظہار ہو، اور لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ بیجان تصویروں سے فصیح الفاظ
زیادہ مؤثر اور معنی خیز ہوتے ہیں۔ جب یہ سکہ جاری ہوا تو اُسپر سورۂ اخلاص کے کندہ ہونے سے
مسلمانوں میں پھر ایک جوش پیدا ہوا کہ سکہ ایک ایسی چیز ہے کہ جو مطہر و غیر مطہر سب کے ہاتھ میں جاتا ہی
اسلئے اُسپر ایسی متبرک سورہ کا منقوش کرنا مناسب نہیں ہی، لیکن چونکہ اُس سے صرف اعلائے کلمۃ اللہ

مقصود تھا، اسلیئے اس قسم کی نکتہ چینیوں کی پرواہ نہیں کی گئی، اور وہ چند ہی روز میں خود بخود دب گئیں، سکہ نمبر ۸ کے دیکھنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ چاندی کا تھا، اور اسلیئے چونکہ اُسکا دور بڑا تھا اُسمیں چند الفاظ اور بھی بڑھا دیئے گئے، ہر قسم کے سکوں کے نام اخیر تک وُہی رہے، جو رومیوں میں قدیم سے مروّج تھے، غرضکہ ۱۲۸ھ ہجری تک سکّے کی یہی صورت رہی، مگر سنہ مذکور میں اسقدر ایجاد اور ہوئی کہ دارالضرب کا نام بھی لکھنے لگے۔ ۱۲۸ھ ہجری میں ابُو مسلم خراسانی داعی بنی عباس نے اپنا سکّہ جاری کیا اور اُس میں اپنی دعوت کے اعلان کے لئے بعض عبارتوں کا اضافہ کیا، اُس کی صُورت یہ تھی۔

طرفِ اوّل وسط میں۔

لا الٰہ الا اللہ

وحدہٗ لاشریک لہ

اُسکے گرد (قُل لّآ اَسْئَلُکُمْ عَلَیْہِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّۃَ فِی الْقُرْبٰی) اور حاشیہ پر۔

(بسم اللہ ہ ضرب ہ بجی ہ

سنہ ہ ثمان وعشرین ہ

طرفِ ثانی۔ وسط میں۔

اللہ احد اللہ الصمد

لم یلد ولم یولد ولم یکن

لہ کفوًا احد۔

حاشیہ پر حسبِ معمول (محمد رسول اللہ ارسلہ بالھدیٰ ودین الحق لیظھرہٗ علی الدین کلہ ولو کرہ المشرکون مگر علاماتِ وقف نہ تھیں۔

یہ پہلا سکّہ ہے جو علاوہ خلفاے وقت کے کسی شخص نے چلانے کی جرأت کی۔ لیکن اُس باغی نے بھی اصلی عبارت کے بدلنے کا خیال نہیں کیا، بلکہ فقط ایک ایسی عبارت بڑھا دی جس سے اُس کی پالسی کا اظہار ہوتا تھا۔ اگرچہ کوئی خاص صورت نہیں ہے لیکن غالبًا اس امر کا بتانا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ خلفاے

پہلا درہم جو عبداللہ السفاح نے ۱۳۲ھ ہجری میں تخت نشینی کے بعد مضروب کرایا، اُس میں بھی
درہم سے کچھ زیادہ تغیّر و تبدّل نہیں کیا گیا، بلکہ اُسکو تقریبًا اُسی حالت پر قائم رکھا البتّہ وہ آیات
ے منقوش کئے جانے پر اہلِ تقویٰ کو اعتراض تھا، خارج کر دی گئیں۔ اُس کی صورت یہ ہے:

ف اوّل۔ وسط میں۔

(لا اله الا
الله وحده
لاشريك له

شیہ پر

(بسم الله ضرب هذا الدرهم
بالكوفة سنة اثنين وثلثين ومئة)

فِ ثانی۔ وسط میں۔

محمد
رسول
الله

شیہ پر

محمد رسول الله ارسله بالهدى ودين الحق ليظهره على الدين كله ولو كره المشركون۔
بِ منصور کے زمانہ میں اسقدر ترمیم ہوئی کہ طرفِ ثانی میں ولیعہد کا نام بھی سطرِ ذیل درج ہونے لگا

(بما امر به
المهدي محمد
بن امير المومنين)

مہدی کے زمانے سے خلیفہ کا نام لکھا جانا شروع ہوا، اور ہارون رشید کے زمانے میں

یہ رواج عام ہوگیا کہ جس صوبہ کے دار الضرب میں سکہ مضروب ہوتا تھا وہاں کے والی کا نام بھی اُس پر منقوش کیا جاتا تھا چنانچہ ایسے اکثر درہم اور بعض دینار ہمارے ذخیرہ میں بھی موجود ہیں، اسلامی سکہ بنی عباس کے دور کے آخر تک تھوڑے تھوڑے اختلاف سے قریب قریب اسی شکل پر رہا، چونکہ قدیم سے سکہ اور خطبہ علامتِ شاہی سمجھا جاتا رہا ہے، اور مسلمانوں میں صدہا حکمران خاندان ہوئے ہیں، اس لئے اسلامی سکے کا مضمون نہایت دلچسپ اور اُس سے تاریخ پر گہری روشنی پڑسکتی ہے، لیکن اُسکے لئے ایک ضخیم کتاب چاہیئے۔

چونکہ مجکو کئی سال سے سکوں کے جمع کرنیکا خبط سا ہوگیا ہے، اور اپنی حیثیت سے زیادہ روپیہ خرچ کر کے بہت سے سکے جمع کئے ہیں اور اس فنِ شریف میں کسیقدر مداخلت حاصل ہونیکے لئے سخت محنتیں بھی کی ہیں، اسلئے اگر زمانے نے فرصت دی، اور ناظرین علیگڈھ منتھلی نے اس مضمون کو پسند کیا تو کبھی کبھی کسی خاص خاندان کے سکوں کے حالات لکھے جایا کرینگے۔

محمد عزیز مرزا - از حیدر آباد دکن۔

# اولڈ بوائز ایسوسی ایشن

خدا کا شکر ہے کہ ہماری انجمن کے آنریری سکرٹری نے اپنے عہدے کا چارج لیتے ہی عملی کارروائی کی طرف توجہ کی، صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب سے ایسی سرگرمی کا ظاہر ہونا بالکل توقع کے مطابق ہے، اور خدا کی ذات سے اُمید ہے کہ اسکے نتائج شود مند ثابت ہونگے۔

اب اس امر پر بحث کرنا کار آمد نہیں، کہ ہم نے ابتک کیا کیا۔ غور طلب یہ امر ہے کہ آیندہ ہم کو کیا کرنا چاہیئے تاکہ جو امیدیں قوم کی کالج اور اُسکے طلبہ سے وابستہ ہیں، وہ کیونکر پوری ہوں، ہمارے سکرٹری صاحب نے اپنے خیالات کو چند کار آمد تجاویز کی شکل میں ظاہر کر کے اولڈ بوائز سے استدعا کی ہے، کہ وہ ان امور کی بابت اپنی رائے ظاہر کریں تاکہ بعد بحث مباحثہ ایک قطعی رای ایسوسی ایشن کی آیندہ کارروائی کے متعلق قائم کیجا سکے۔ ہم شکر گزار ہیں صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب کے کہ اُنھوں نے ہمکو اپنے دلی

خیالات ظاہر کرنیکا موقع دیا، اور میری یہ آرزو ہی کہ کالج کے اولڈ بوائز جو کچھ خیالات اس بارہ میں رکھتے ہوں، وہ ہن وعن پیش کریں، تاکہ اندازہ ہوجاسے کہ مجاریٹی کی کیا خواہش ہی، اور وہ کیا وجوہ تھے، جنہوں نے ابتک ایسوسی ایشن کی عملی کارروائی میں اُن کو حصّہ لینے سے باز رکھا، اور آیندہ کسطرح اسکا رفعداد ممکن ہے۔ سکرٹری صاحب سے یہ التجا ہی کہ وہ اپنی تجاویز کی اشاعت کو محض منتھلی کے صفحات تک محدود نہ رکھیں، یا ایک دو اُردو اخبارات تک، کیونکہ مجھے اندیشہ ہی کہ اس طریقے سے طبقۂ اعلیٰ کے اولڈ بوائز کی توجہ اسطرف مبذول نہ ہوگی، پس اِسکا خاص طور پر انتظام کیا جاسے، کہ یہ تجاویز کم سے کم ایک بار اُن کی نظر سے گزر جائیں تاکہ آیندہ کسی کو محلِ شکایت نہ رہے۔ ایڈیٹران اخباراتِ اسلامی (اُردو و انگریزی) اِن تجاویز کو اپنے اخبارات میں شائع کردیں تاکہ وہ اولڈ بوائز، جنکی ملاحظے میں منتھلی نہیں گزرتا ہی، اور افسوس ہے کہ اُن کی تعداد کچھ کم نہیں ہی، وہ بھی معلوم کرلیں کہ کیا تجاویز درپیش ہیں، خود اولڈ بوائز سے یہ گزارش ہے کہ اگر وہ اپنی راسے اس بارہ میں ظاہر فرمائیں تو بہتر ہے کہ منتھلی کو اِسکا ذریعہ قرار دیا جائے تاکہ دوسرے لوگوں کو اُسپر غور و بحث کا موقع مِل سکے۔ سکرٹری صاحب یا میر ولایت حسین صاحب (کیونکہ سکرٹری صاحب کو شاید اِتنی فرصت نہ ہو) اِس امر کا التزام فرمادیں کہ جو تجاویز بذریعہ دیگر اخبارات پبلک میں پیش ہوں، یا جو براہِ راست دفتر سکرٹری میں موصول ہوں، اُن کو منتھلی میں برابر شائع کیا جاسے۔ اس امر کا انتظار نہ کیا جائے کہ آخر سال پر اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے جلسے کیوقت بحث و مباحثہ کرکے آخر رای قائم کیجائے کیونکہ اُسوقت بسبب تنگیِ وقت کے بہت کم موقع امورِ بحث طلب پر کافی بحث کا مِل سکتا ہی۔ بہرحال یہ میرے خیالات اُس کارروائی کی بابت تھے جو عرض کیے۔ اب مجکو مختصراً اصلی تجاویز پیش کردۂ سکرٹری صاحب کی نسبت بھی اپنا خیال ظاہر کرنا ہے۔

سکرٹری صاحب نے علاوہ دو مسلّمہ اُصولوں کے یعنی یہ کہ ہر اولڈ بواے مسلمان رہے اور گورنمنٹ کا خیرخواہ، پانچ اور تجاویز پیش کی ہیں جنکا خلاصہ حسبِ ذیل ہے۔

(۱) جملہ اولڈ بوائز کا یکساں لباس (۲) کالج کی خدمت (۳) ہندوستان کی دیگر اقوام کے ساتھ

تعلقات (۴) انگریزوں کیساتھ برتاؤ (۵) اولڈ بوائز کا باہمی برتاؤ۔ اِن کُل تجاویز کے عمدہ اور کارآمد ہونے میں کسی کو بھی شک نہیں، لیکن ہر ایک تجویز کے کُل پہلوؤں پر نظر ڈالنے سے یہ ظاہر ہو جائیگا کہ بلحاظ اہمیت سب برابر نہیں، اور نہ سب پر ہمارے قومی اغراض کا یکساں انحصار ہے۔ اس خیال سے کہ غلط فہمی نہ واقع ہو، میں صاف طور پر کہتا ہوں کہ ان میں سے کسی ایک تجویز کا بھی میں مخالف نہیں، بلکہ ہر ایک کو ایک خاص حد تک مفید خیال کرتا ہوں۔ الّا بلحاظ اہمیت و اولویت سب کو ایک بریکٹ میں نہیں کہہ سکتا میری رائے میں اگر ان جملہ تجاویز کو ایک ہی حد تک مفید اور ضروری خیال کر لیا جائیگا تو ضرور ہے کہ جو جوش اور سرگرمی سب سے زیادہ مفید کام کی تکمیل میں صرف ہونا چاہیے وہ اُس سے کم درجے کی تجویز میں منعطف ہو کر اس مقدم چیز کی تکمیل میں ایک حد تک ضرور حارج ہوگی، پس ہم کو سب سے پہلے نہایت ضروری چیز کو اختیار کرکے اپنی ساری قوت اُن میں صرف کرنا چاہیے۔ ایسے اُصول کو مدِ نظر رکھکر میں تجویز نمبر (۳) و (۴) کو سرِ دست ایسا ضروری نہیں خیال کرتا کہ جس کی وجہ سے ہم اپنی توجہ دیگر ضروری تجاویز کی تکمیل سے ہٹا لیں یا کم کر لیں۔ اِن کی نسبت سب سے بڑا معلم وقت ہے۔ اِنسان پر روزانہ زندگی میں جو کچھ کہ پڑتا ہے، وہ اُس کے بموجب عمل کرنے پر مجبور رہوتا ہے۔ عموماً دُنیاوی کشمکش میں ایسے مقررہ اُصول کافی ثابت نہیں ہوتے۔ اور لامحالہ موقع اور وقت کے مطابق ہر شخص کو کام کرنا پڑتا ہے، الّا ماشاء اللہ۔ پس ایسے امور میں کسی خاص مقررہ اصول کی، خواہ وہ کیسی ہی دُور اندیشی پر مبنی ہوں، پابندی خالی از دقت نہیں، بلکہ بعض اوقات واقعی ناممکن ہے، میں خود جانتا ہوں کہ میرا یہ بیان مجمل ہے، ممکن ہے کہ بعض اصحاب اس اجمال کی تفصیل مانگیں، لیکن میں مصلحتاً اِس سے گریز کرتا ہوں، کیونکہ اُسکے اظہار میں کسی نہ کسی کی دل آزاری کا اندیشہ ہے اور اس سے بلا ضرورتِ اشتد میں بچنا چاہتا ہوں۔ بہر حال اِس میں کوئی ہرج نہیں کہ کچھ اُصول اِس قسم کے جیسے کہ صاحبزادہ آفتاب احمد خانصاحب نے بتلائے ہیں، بعد پسندیدگی ایسوسی ایشن بغرض ہدایت اولڈ بوائز شائع کرا دیے جائیں، اور اُنپر اُن کی توجہ دلا دی جائے، الّا اُنپر ہر حال میں عمل کرنے کی مجبوری کا بار ڈالنا ٹھیک نہ ہوگا۔

ہر دو تجاویز متذکرۂ صدر کے علاوہ اب تین تجویزیں اور باقی رہتی ہیں، جو قریب قریب یکساں

ضروری ہیں، اور جنکی تکمیل پر ہماری قومی زندگی کا مدار ہی، یہ تین تجویزیں بابت (۱) یکساں لباس (۲) کالج کی خدمت اور (۵) اولڈ بوائز کے باہمی برتاؤ کی ہیں۔ ممکن ہے کہ نمبر (۱) کی نسبت بعض اصحاب کا یہ خیال ہو کہ وہ اسقدر اہم اور ضروری نہیں، جسقدر کہ نمبر (۲) و (۵) ہیں۔ یہ سچ ہے کہ انسان کا لباس اُس کے افعال کا ذمہ دار نہیں۔ "در عمل کوش ہرچہ خواہی پوش" ایک پُرانا اور مفید مقولہ ہی، لیکن اِس میں بھی شک نہیں کہ اِس بیسویں صدی میں لباس کو قومی زندگی میں بہت کچھ دخل ہی۔ بحث کرنیکے واسطے تو موافقین اور مخالفین تجویز ہذا کو بہت کچھ گنجایش ہی، لیکن ہم کو اس مسئلے کے صرف عملی پہلو پر نظر ڈالنا ہے ہمارے معزز سکرٹری نے بھی مختصر مگر جامع طور پر اس مسئلے کے ہر پہلو پر بحث کی ہی۔ اور اُن کی آخر رائے ایک لباس اختیار کرنے کے حق میں قائم ہوئی ہے۔ مجکو بہت شبہ ہے کہ ابھی یہ مسئلہ جلد طے نہ ہوسکے گا۔ ہماری قوم کی بحیثیت مجموعی ابھی وہ حالت ہے کہ وہ اس مسئلے کو قومی زندگی کیواسطے ضروری نہیں سمجھتی۔ پس جبتک کہ پبلک اوپنین اِس مسئلے کی امداد نہ کریگی، اسکا حل ہونا مشکل ہے، میرا مطلب یہ نہیں ہی کہ اِسکے حل کرنیکی کوشش نہ کیجائے، ضرور کوشش کیجائے، لیکن صرف وہ پہلو اختیار کیا جائے جسپر اسوقت عمل ممکن ہو، انگریزی عمل در آمد اور انگریزوں کی موجودگی جبتک کہ ہندوستان میں ہی، اسوقت تک ہر فرقہ کا قدرتی رُجحان انگریزی وضع وقطع اختیار کرنے کی نسبت بڑھتا رہیگا، اِس قدرتی خواہش کے بجا یا بیجا ہونے کی نسبت بحث کرنا فضول ہے۔ سلطنت کی کشش برقی کو کوئی چیز روکنے والی نہیں۔

پس اِن حالات پر لحاظ کرنے کے بعد یہ پیشین گوئی کیجا سکتی ہی کہ آیندہ پچاس برس کے بعد انگریزی وضع کے کپڑے اور زیادہ عالمگیر ہو جائینگے۔ ہر شخص اپنی مقدرت کے لحاظ سے وہی وضع وقطع اختیار کرنا چاہیگا۔ اور جسقدر زیادہ مالدار کوئی شخص ہوگا اُسیقدر وہ انگریزی فیشن میں زیادہ ترقی کریگا پس ہم کو ایک ایسا انقلاب دیکھنا ہے (گو کہ ہم اُسوقت زندہ نہ ہوں، لیکن ہماری آیندہ نسلیں موجود ہونگی اور وہ اِس انقلاب میں شریک ہونگی) کہ جو بالکل انگریزی وضع سے ڈانڈا ملائے ہوئے ہوگا۔ ایسی صورت میں ہمارے معزز سکرٹری کی یہ صلاح کہ سرسید مرحوم کا لباس اختیار کیا جائے کچھ بیجا نہیں، لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس پر عمل نہ ہوسکیگا۔ ادنی طبقہ تو اسطرف بآسانی مائل ہو جائیگا مگر اعلیٰ

طبقہ (جو اب بھی اس مجوزہ وضع کو صرف اس خیال سے کہ انگریزوں کی پوری تقلید ہی اور جو ہمیشہ ایسے امور میں عوام کا رہبر ہوتا ہی) ہرگز یہ گوارا نکریگا کہ وہ اپنے چھوٹے کوٹ کی لمبائی کو گھٹنوں کی طرف بڑھائے۔ ادنے طبقے کے امکان میں بلحاظِ مالی حالت نہ ہوگا کہ وہ اپنے دامن (خواہ ترکش کوٹ ہی کے ہوں) اونچے کریں۔ اِس تحریر سے حاشا میرا یہ مطلب نہیں کہ میں کسی شخص کی ذاتی وضع پر اعتراض کرتا ہوں، بلکہ صرف اس امر کا دکھلانا مقصود ہی کہ یہ بیل منڈھے چڑھتی نظر نہیں آتی، وُور کیوں جائیے خود کالج میں دیکھ لیجیے، باوجود سر سید کی خواہشِ دلی کے اور مسٹر بیک کی کوشش کے یہ نہ ہوسکا کہ اسوقت تک ایک ہی وضع کالج کے احاطے میں قائم ہوجائے۔ وضع سے مراد یہاں پر یہ نہیں ہی جو عام طور پر وسیع معنی میں خیال کیجاتی ہے، بلکہ ایک خاص لباس سے ہے، جو یہاں پر زیرِ بحث ہے یہ سچ ہے کہ کالج کے طالب علم کالج میں اب بھی ایک حد تک ایسی حالت رکھتے ہیں کہ اُن پر یہ شعر صادق آتا ہے ؎

بہ ہر رنگے کہ خواہی جامہ مے پوش ؂ من اندازِ قدت را می شناسم

لیکن کوئی شخص یہ نہیں کرسکا کہ کالج کے احاطے ہی میں ایک خاص لباس جاری رہے۔ پس جب کہ کالج ہی کے قیام کے زمانے میں طالب علموں کے لباس کی یہ حالت ہے تو جب وہ اُس زبردست اثر سے علحدہ ہوکر باہر جائینگے تو کیا اُمید ہوسکتی ہی کہ وہ ایک ہی لباس پر قائم رہینگے۔

اِس مسئلے کو اوّل عملی اور لازمی طور پر کالج میں چلانا چاہیئے۔ اور جب وہاں کے چار پانچ سال کی قیام میں کچھ عادت پڑجائیگی تو ممکن ہے کہ آیندہ کچھ اثر اُسکا قائم رہے۔ اِس تمام تحریر کا یہ مطلب نہیں کہ ہمکو اپنی قومی زندگی کے اظہار کا کوئی بیرونی ذریعہ اختیار نہ کرنا چاہیئے، اور مشکلات پر نظر ڈال کر مایوس ہوکر خاموش بیٹھ جانا چاہیئے، نہیں کچھ ہاتھ پیر ہلانا ضرور ہے۔ سرِدست ایسی ابتدا کیجائے کہ جو زیادہ تر قابلِ عمل ہو۔ میری ناچیز رائے میں اولڈ بوائز کو کم سے کم ترکی ٹوپی کا استعمال پبلک موقعوں پر ضرور کرنا چاہیئے، یہ ایک ایسی نشانی ہوگی کہ جو ہر طرح پر قابلِ عمل ہے، باستثنای اُس طبقے کے جو ٹھنڈا اور رات کے وقت بھی ایوننگ کیپ کا دلدادہ ہے (کیونکہ دھوپ میں ہیٹ لگانا کوئی ہرج نہیں) شاید اور لوگ

اُسے اختیار کر سکیں۔ اسکے ساتھ کالج بیج بھی مجکو یاد ہوکہ کالج بیج کی نسبت ہمارے مکرم دوست سید طفیل احمد صاحب نے ایک موقع پر تجویز بھی کیا تھا کہ اُسکو اولڈ بوائز مجامع عام میں برابر استعمال ۔ اگر کالج بیج ایسے موقعوں پر برابر استعمال کیا جائے تو ترکی ٹوپی کی جو عمومیت مسلمانوں کے ہوگئی ہے وہ بھی اس خصوصیت کے ساتھ خاص الخاص ہوجائیگی۔ پس لباس کے متعلق میری تجویز یہ تھی۔

اب دو تجویزیں یعنی نمبر (۲) کالج کی خدمت اور نمبر (۵) اولڈ بوائز کا باہم وگرتاؤ باقی رہگئی ہیں یہ اہم اور سنجیدہ مسئلے ہیں کہ ان کی نسبت میں اسوقت عجلت میں کچھ عرض نہیں کرسکتا، آیندہ بشرط فرصت (انشاءاللہ) اس بارہ میں بھی اپنی راے ظاہر کرونگا۔

تحصیل ہاترس ضلع علیگڈہ - ۳۰ - جون ۱۹۰۱ء - حبیب اللہ خاں -

# مدرسۃ العلوم علیگڈہ اور اُسکے پرانے طالبعلم

آج ہم اپنی پریشانی خاطر اُن سے کہ جاتے تو ہیں، پر دیکھیے کیا کہتے ہیں

گذشتہ اولڈ بوائز ڈنر کے موقعہ پر اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے قائم مقام سکرٹری نے سالانہ رپورٹ اپنے طلبا کی کالج کے ساتھ بے توجہی اور لاپرواہی کا نہایت پُر درد الفاظ میں مرثیہ پڑھا۔ شرکاے افسوسناک قلت اُن کے بیان کا بدیہی ثبوت تھی۔ جن لوگوں کی اِسطرح پر شکایت کیگئی، وہ موجود جو موجود تھے اُنھوں نے اپنے کو اس الزام سے بری سمجھکر فوراً صَدَّقْتَ یَا عَبْدَ اللّٰہ۔ کہدیا۔ اگر اس شکوہ و شکایت کا رپورٹ ہی پر خاتمہ ہوجاتا تو ایسے بہت سے لوگوں کی جی کی جی ہی میں رہجاتی بھی شیشہ کی طرح بھرے بیٹھے ہیں، اور اسبات کے منتظر ہیں کہ کوئی ذرا چھیڑے تو بس بھر پڑیں۔ خدا کا شکر ہے کہ آسودگانِ کوہی دوستی نے دُور افتادگانِ دیارِ غربت کی طرف بھی نظرِ التفات دیکھا، اور اُن کی داستانِ غم سُننے کا اشتیاق ظاہر کیا۔ دیکھیے اِس سرود بستان یاد دہانیدن کا پہ ہوتا ہے اور کس کس طرف سے ع من نیز حاضر میشوم تصویر جاناں در بغل۔ کی صدائیں بلند ہوتی ہیں

لم اُٹھانیسے پیشتر اس مسئلے پر لکھنا جسقدر آسان معلوم ہوتا ہے، دوات قلم لیکر بیٹھنے پر اُتنا آسان ممکن ہے کہ زیادہ قابل وسیع الخیال مضمون نگاروں کو کچھ دشواری پیش نہ آئے کہ اُن کے ناپیدا اقفیت کے سمندر میں ہر قسم کے جواہر بہ آسانی مل سکتے ہیں۔ میں نے تو اپنی بساط بھر کئی مرتبہ غوّاصِ فکر کو لی تہ تک پہونچایا، مگر ہر مرتبہ ناکامی کے ساتھ واپس ہونا پڑا۔ تاہم چند بار غور کرنے کے بعد جو کچھ پراگندہ ت مجتمع ہوگئے اُن کو کاغذ کے سپرد کرتا ہوں۔ اُمید ہے کہ میرے اور کالج کے بھائی اِس اہم مسئلے پر ضرور مدہ مضمون لکھینگے، اور اس مضمون کے نقص اُن سے پورے ہوجائینگے۔ خاص طور پر میں اپنے عزیز ت سیّد سجاد حیدر سے، جو آجکل ہم لوگوں کو چھوڑ بغداد چلے گئے ہیں، اُمید کرتا ہوں کہ وہ کالج کی محبت ادا کریں، اور اپنے شُستہ خیالات بذریعہ علیگڈھ منتھلی کے ظاہر فرمائیں۔

اِس میں ذرا شُبہ نہیں کہ شیخ عبداللہ صاحب کی صدای پُر درد بالکل بے معنی یا ایشیائی شاعروں کی انِ فراق کیطرح سراسر مبالغے سے مملو نہ تھی، ایک حد تک اُنکا یہ فرمانا ضرور صحیح ہے کہ مدرسۃ العلوم کے نے طالبعلم اِسقدر سعادتمند ثابت نہیں ہوئے جیسی کہ اُن سے اُمید یا کم از کم بانیِ کالج کی توقع تھی۔ اس سوال کا جواب دینے سے پیشتر، کہ ایسا کیوں ہوا؟ مندرجہ ذیل امور قابلِ غور ہیں:—

ل) مدرسۃ العلوم کے سابق طلبا میں جن کی تعداد اب ہزاروں سے زیادہ بیان کیجاتی ہے، بڑا حصّہ اُن لوگوں کا ہے جو صرف اسکول کلاسوں میں کم عمری کے زمانے میں پڑھ کر چلے گئے ایسے طالبعلموں کو در اصل کالج کا پُرانا طالب علم کہنا صحیح نہیں ہے، اسکول کی تعلیم کا زمانہ کم عمری کا زمانہ ہوتا ہے، اُسوقت قومی انسٹیٹوشن کا خیال، اُس کی عظمت اور اُسکے ساتھ ہمدردی اور قومی تنزل اور ترقی کا احساس کسکو ہوتا ہے، ایسے لوگوں سے کسی قسم کی ہمدردی یا امداد کی کیا توقع ہو سکتی ہے، لہٰذا طلبا کی تعداد سے ایسے نام کے طالبعلموں کو خارج کر دینا چاہیے، اور ایسا کرنے سے نسبت نما کا ایک بڑا حصّہ گھٹ جانے سے شمار کنندہ کی منہمائی بہت کم ہو جائیگی۔

م) کالج کے ایام طفولیت میں مدرسۃ العلوم کی تعلیم و تربیت اور دیگر سرکاری مدارس کی تعلیم و تربیت

میں بہت کم فرق تھا۔ وہ کلب اور انجمنیں جو آج بورڈنگ لائف کی جان ہیں، اُسوقت موجود نہ تھیں، اور نہ کوئی اور ایسا ذریعہ موجود تھا، جو طلباء کے دلوں میں قومی کالج کی خصوصیت کا خیال اور اُس کی محبت پیدا کرتا، لہذا اِس زمانے کے طالبعلم بھی زیادہ تر طلباءِ قسم اوّل میں شمار کیئے جانے کے قابل ہیں۔

اِن دو اقسام کے طلباء سے قطع نظر کرنے کے بعد پُرانے طالبعلموں کی تعداد ہزاروں سے گھٹ کر سینکڑوں پر پہونچ جائیگی، اُن کے حالات معلوم کرنا اور اُنکی عدم توجہی کے اسباب دریافت کرنا انجمن کا فرض ہو گا۔

عام طور پر طلباء کی عدم توجہی اور بے پرواہی کے مندرجہ ذیل وجوہ معلوم ہوتے ہیں:-

(۱) زمانے کا خاصہ ہے کہ وہ اپنی ہمیشہ جاری رہنے والی رفتار کے ساتھ انسان کے دلوں سے تمام جذبات اور خیالات کو اسطرح محو کرتا اور دھوتا چلا جاتا ہے جسطرح دریا کے بہاؤ کے ساتھ چٹانیں اور آبادیاں کٹتی اور مٹتی چلی جاتی ہیں۔ اور زمانے کا یہ خاصہ حکیم مطلق کی ایک عظیم الشان مصلحت پر مبنی ہے، اگر ایسا نہ ہوتا تو بہت سے مصائب اور آلام جنسے کوئی فرد بشر محفوظ نہیں رہسکتا گھائل دلوں کے زخموں کو ہمیشہ غیر مندمل رکھکر تمام نظام عالم کو مختل کر ڈالتے۔ پس جن طالب علموں کو کالج سے جدا ہوئے زیادہ عرصہ گزر جاتا ہے اُن کے دلی جذبات اور کالج کی محبت رفتہ رفتہ ٹھنڈے پڑ جاتے ہیں، اور قومی ہمدردی کا وہ جوش جو طالبعلمی کے زمانے میں طوفانی سمندر کی طرح موجزن تھا، قائم نہیں رہتا۔ اسی بنیاد پر فارسی کا ایک پُرانا مقولہ "از دیدہ دُور از دل دُور" مشہور چلا آتا ہے۔

(۲) جیسی کہ بانی کالج کی اُمید اور خواہش تھی اُس قسم کی تعلیم اور تربیت بوجوہ چند در چند اسوقت تک کالج کو میسّر نہیں اور بلحاظ حالات موجودہ کے نہ اِس بات کی امید ہے کہ مکمل تعلیم اور تربیت کا خاطر خواہ ساماں جلد میسّر آسکے اسواسطے طلباء کے اخلاق اور خیالات میں ایسی شائستگی اور وسعت اور بلندی اور دلوں میں قومی ہمدردی پیدا نہیں ہوتی جیسی کہ انگلستان کی مشہور یونیورسٹیوں کے

طلبا میں پائی جاتی ہے اور جو دھندلے نشانات ناکمل تربیت سے پیدا ہوتے ہیں جلد مٹجاتے ہیں۔

(۳) الصُّحبَۃُ مُؤثِّرَۃٌ۔ عربی کا ایک پرانا مقولہ ہے، مولانا روم علیہ الرحمہ اسکو اسطرح فرماتے ہیں ؎

صحبتِ صالح ترا صالح کند ٭ صحبتِ طالح ترا طالح کند۔

لیکن افسوس ہے کہ مسلمانوں کی سوسائٹی عام طور پر نہایت مخرب اخلاق اور بدنما رنگوں سے رنگی ہوئی ہے، کالج سے نکلنے کے بعد ناتجربہ کار نوجوان طلبا عمدہ سوسائٹی سے محروم ہوکر مجبوراً ع "باہمیں مرداں بہ باید ساخت" پر عمل کرکے اپنے گرد و پیش کی سوسائٹی میں شامل ہوجاتے ہیں۔ جسکے زہریلے اثر سے تھوڑے ہی دنوں میں اُن کے تمام پاکیزہ خیالات اور عمدہ عادات مٹجاتی ہیں اور اُن تمام اُمیدوں کا جو اُن کی ذات سے وابستہ تھیں، خون ہوجاتا ہے۔

(۴) اِسوقت تک کالج سے جسقدر طالب علم نکلے ہیں، تقریباً کُل اس زمانے کے جسکو شاعرانہ مذاق کے لوگ عصر الجدید کہتے ہیں کشمکش میں مبتلا ہیں، اور تفکراتِ دُنیا سے اُن کو بہت کم اوّل خویش سے گزر کر بعدہٗ قوم تک پہونچنے کی فرصت نصیب ہوتی ہے، قومی کام زیادہ تر وہ لوگ کرسکتے ہیں، جنکو اسبابِ معیشت سے فراغ حاصل ہو اور جوانی کی عمر میں ایسے لوگ بہت کم ہوتے ہیں۔

(۵) بمبئی۔ کلکتہ۔ رنگون۔ مدراس اور میسور وغیرہ کے جو طالب علم کالج سے پڑھ کر گئے ہیں، اُن کی طرف سے کبھی کوئی صدا اُٹھائی نہیں دی، اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ بُعد مقامی بھی اکثر عدم توجہی کا باعث ہوتا ہے۔

(۶) زمانہ طالبعلمی میں بعض وجوہ سے بعض طلبا کے دلوں میں کالج کیطرف سے سرد مہری پیدا ہوجاتی ہے یا بعد کالج چھوڑنے کے بعض کو ایسے ناگوار واقعات پیش آجاتے ہیں، جو محبت کو نفرت سے اور یگانگت کو بیگانگی سے بدل دیتے ہیں، اسلئے اُن کی ہمدردی جاتی رہتی ہے اور بجائے شکر کے اکثر اُن کی زبان سے شکایت سُنی جاتی ہے لیکن غنیمت ہے کہ ابھی اِس قسم کے طلبا کی تعداد بہت کم ہے، البتہ اندیشہ ہے کہ کہیں اسمیں زیادتی نہو جائے۔ جو کالج کیواسطے نقصان کا باعث ہو۔

سعادت یار خاں رنگیں نے خوب کہا ہے ؎

اُن سی کر خوف۔ تیری محفل سے ٭ اُٹھ گئے جو کہ چشم نم لیکر

(۷) خانہ خراب مفلسی تیرا بُرا ہو۔ تو بہتسے ارمان بھرے دلوں کے ولولے سرد مہری کی گورِ غریباں میں زندہ درگور کر دیتی ہے اسلیئے ہمارے پیغمبر آخر الزماں صلعم نے اَلْفَقْرُ سَوَادُ الْوَجْہِ فِی الدَّارَیْنِ ؕ فرمایا ہے۔ اور اکثر ایسا ہی ہوتا ہے کہ خدا جنکے حوصلے بلند کرتا ہے اُن کو اُتنی وسعت نصیب نہیں ہوتی ؎

کسے را کہ ہمت بلند اوفتد ؛ مرادش کم اندر کمند اوفتد۔

ہمارے خیال میں یہ وجوہ ہیں جنھوں نے زیادہ تر کالج کو اپنے فرزندانِ علم سے بے التفاتی کی شکایت کا موقعہ دیا ہے۔ اور سچ یہ ہے کہ ان میں سے بعض موانع ایسے کٹھن ہیں کہ اُن کے ہوتے جو کچھ خال خال طالب علم کر گزرتے ہیں وہ بھی بسا غنیمت ہے۔ لیکن پھر بھی خدا کے فضل سے سینکڑوں ایسے ہیں جنکو ہر طرح کی فارغ البالی اور مندرجۂ بالا اسباب سے آزادی حاصل ہے، تاہم وہ کچھ نہیں کرتے، یہ لوگ نہ محض شایانِ شکایت بلکہ قابلِ ملامت ہیں، انھیں کیطرف رپورٹ میں شیخ عبداللہ کا روئے سخن تھا اور انھیں کو راہ راست پر لانے کی تدابیر سوچنے کی غرض سے گزشتہ سالانہ جلسے میں رزولیوشن نمبر ۳ (جلسۂ سہ پہر) پاس ہوا ہے۔

مندرجۂ ذیل تدابیر موانعِ مذکورہ کا اثر گھٹانے میں غالباً مفید ثابت ہونگی:۔

(۱)۔ کالج ڈائرکٹری کو جہانتک جلد ممکن ہو مکمل کیا جائے، اور مثل سرکاری سول لسٹ کے طلبا کے صحیح پتے اور مختصر حالات (اگر ملسکیں) اُس میں درج کئے جائیں، تاکہ ہر موقعہ پر ہر ایک سے بہ آسانی خط وکتابت کرنا ممکن ہو۔ سوا اسکے کہ بار بار طلبا سے اپیل کیا جائے اور کالج کی محبت کے خیال کو اُن کے دلوں میں تازہ کیا جائے، اور کوئی ذریعہ غفلت اور بے پروائی کے دُور کرنیکا معلوم نہیں ہوتا۔ عربی کی ایک پرانی ضرب المثل ہے کہ اِذَا تَکَرَّرَ عَلَی السَّمْعِ تَقَرَّرَ فِی الْقَلْبِ یعنی جو بات بار بار گوش گزار کیجائے اُسکا آخر کار دل پر کچھ نہ کچھ اثر ضرور ہوتا ہے نیز اِس امر کے معلوم کرنے کی کوشش کیجائے کہ کون کون طالب علم آپس میں ہمعصر تھے۔ اور ہر ایک کو اُسکے خاص خاص دوستوں کے خطوط (اگر دستیاب ہوسکیں) روانہ کرائے جائیں اسواسطے

کہ بہ نسبت ایک اجنبی شخص کی باضابطہ خط کے ایک پرانے دوست یا کلاس فیلو اور روم فیلو کی دوستانہ تحریر کا زیادہ اثر ہوگا۔

امسال بعض بعض طالبعلموں نے خود مجھسے ڈنر کا کارڈ نہ آنیکی شکایت کی ہے اور اگرچہ میری راے میں ڈنر کی تاریخ معلوم ہونے کے بعد دعوت کے خط کا انتظار کرنا ہم لوگوں کیواسطے ضروری نہیں ہے تاہم جہانتک ممکن ہو ایسوسی ایشن کی جانب سے کسی قسم کی شکایت کا موقعہ نہ دیا جاے۔

(۲) اسبات کی کوشش کیجاے کہ علیگڈہ منتھلی کے تقریبًا کل طالب علم خریدار ہوجائیں تاکہ کالج کے ساتھ ایک قسم کا تعلق قائم رہے اور کالج اور اپنے احباب کے حالات طلبا کو معلوم ہوتے رہیں کہ یہ ذریعہ دلچسپی کے قائم رہنے کا ہوگا۔ اسکیے ساتھ اس امر کی بھی کوشش کیجاے کہ منتھلی میں طلباے سابق کی دلچسپی کے مضامین زیادہ درج ہوں اور اُس کی اشاعت باقاعدہ اور ٹھیک وقت پر ہو

(۳) اس امر کی کوشش کیجاے کہ تقریبًا ہر بڑے شہر میں، جہاں کالج کے سابق طلبا کی تعداد کسیقدر زیادہ ہو، اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کی ایک شاخ قائم ہوجاے، تاکہ شہروں کی خراب سوسائٹی کے اثر سے محفوظ رہکر طلبا کو اپنے ہمخیال لوگوں کی صحبت ملسکے اور کالج کے اور قومی معاملات کے ساتھ لگاؤ اور دلچسپی قائم رہے، ایسی لوکل ایسوسی ایشن میں علاوہ کالج کے سابق طلبا کے وہ لوگ بھی شامل کیے جائیں، جنکو کالج کے ساتھ ہمدردی اور قومی معاملات میں دلچسپی ہو اور اُن کے اخلاق اور عادات عمدہ ہوں۔

(۴) مولوی طفیل احمد صاحب کی، جو کالج کے طلبا میں نہایت ممتاز اور قابل وقعت ہیں، یہ رای ہے کہ قومی معاملات میں دلچسپی پیدا کرنے کا سب سے عمدہ یہ ذریعہ ہے کہ سید مرحوم کی لائف اور لکچر لوگوں کو پڑھاے جائیں۔ مجھے مولٰنا موصوف کی اس رای سے کامل اتفاق ہے۔ ممکن نہیں کہ اُس شیدای قوم کی سوانح عمری، جسنے اپنی تمام عمر قوم کی خدمت میں بسر کردی ہو اور اُس کی وہ جادو اثر تقریریں جنھوں نے پتھر سے زیادہ سخت دلوں کو موم کردیا ہو، اُن لوگوں کے دلوں پر اثر پیدا نکریں، جنھوں نے برسوں قومی کالج میں تعلیم پائی ہے اور صبح شام سوتے جاگتے قوم کا مرثیہ سُنا ہے۔

(۵) اگر ممکن ہو تو کالج کے چند پُرانے طالب علم شل صاحبزادہ آفتاب احمد خانصاحب۔ مولوی طفیل احمد صاحب۔ اور حبیب اللہ خانصاحب کے مختلف مقامات پر کبھی کبھی دورہ کیا کریں اور جو پُرانے طالبعلم وہاں موجود ہوں اُن کو کالج کی اور قومی معاملات کی طرف متوجہ کریں۔

(۶) اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کو کسیقدر زیادہ اخلاقی جرأت سے کام لینا چاہیئے، بیجا خوشامد اور ناواجب تعظیم کو چھوڑنا چاہیئے، اور جن طالبعلموں نے ایسے افعال، جنسے کالج کی نیک نامی پر دھبا آتا ہو یا اُنکا کالج کے بھائیوں کے ساتھ متکبرانہ اور خراب برتاؤ ثابت ہو اُن کو اوّل بذریعہ پرائیوٹ تحریر کے تنبیہ و فہمایش کرنی چاہیئے۔ اور اگر ایسی تحریروں کا کوئی اثر نہو تو سالانہ جلسے میں اُن کے نام پیش کرکے اُنکو ایسوسی ایشن سے خارج کردیا جائے، اور آیندہ کالج اُنکے ساتھ کسی قسم کا تعلق قائم نہ رکھے بلکہ اس امر کا اعلان کردیا جائے کہ فلاں طالب علم کو ایسوسی ایشن کی ممبری سے خارج کردیا گیا اور آیندہ کالج کو اُس کے ساتھ کسی قسم کا تعلق نہوگا۔

اگرچہ اس تجویز کے عملدرآمد میں کسیقدر دُشواریاں ضرور پیش آئینگی لیکن مستقل طور پر اس کی پابندی کرنیسے ایسوسی ایشن کا اثر بہت بڑھجائیگا اور پُرانے طلبا پھونک پھونک کر دنیا میں قدم رکھینگے اور درستی اخلاق کیواسطے یہ علاج نہایت مفید ثابت ہوگا۔

اس میں شک نہیں کہ موجودہ طلبا کی طرف توجہ کرنا پُرانے طلبا کی طرف متوجہ ہونیسے بھی زیادہ ضروری ہی۔ چھوٹے پودوں کی ہمیشہ پُرانے درختوں سے زیادہ حفاظت کیجاتی ہے اسواسطے کہ باغ کی آیندہ سرسبزی اور دیرپا بہار اُن کی شادابی پر موقوف ہے۔ نیز یہ کہ طالبعلمی کے زمانے میں ہر طرح کا اثر بہ آسانی پڑسکتا ہے، اور جو اثر اس زمانے میں پڑجاتا ہے وہ کچھ نہ کچھ آخر عمر تک قائم رہتا ہے ؎

چوب تر را چنانکہ خواہی پیچ ؛ نہ شود خشک جز بہ آتش راست

صرف عمدہ تربیت ہی موجودہ طلبا پر ایسا اثر ڈال سکتی ہے جس کی وجہ سے کالج چھوڑنے کے بعد بھی اُنکی وُہی خیالات قائم رہیں، جو طالب علمی کے زمانے میں ہوتے ہیں۔ لیکن موجودہ طلبا کی تربیت کی خاص ذمہ دار منتظمینِ کالج ہیں، اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کا براہ راست اُن سے کسی قسم کا تعلق نہیں ہی، یہانتک کہ وہ

ایسوسی ایشن کے سالانہ جلسوں میں بھی شریک نہیں کئے جاتے۔ اور ممکن ہی کہ موجودہ طلبا کی تربیت کے معاملہ میں ایسوسی ایشن کی دست اندازی کو منتظمین کالج اپنے حقوق میں مداخلتِ بیجا خیال کریں۔ تاہم ایسوسی ایشن اپنے فرض سے اسطرح پر سبکدوش ہوسکتی ہی کہ جو تجاویز اُسکے خیال میں مفید ہوں اُن کو منتظمین کالج کے سامنے پیش کردے۔

مدرسۃ العلوم کی بورڈنگ لائف کا خاص مقصد یہ ہے کہ ہندوستان کے نوجوان مسلمانوں کو مسلمان رکھکر عمدہ مغربی تعلیم اور تربیت دیجائے۔ اور یہ مقصد اُسوقت تک حاصل نہیں ہوسکتا کہ یورپین اسٹاف کا طلبا کے ساتھ زیادہ میل جول رہے۔ اور یورپین اسٹاف کے ممبر اپنے عمدہ خیالات اور مہذب سوسائٹی سے اُن کو مستفیض کریں۔ پس اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کو سب سے اول اس امر کی سفارش کرنی چاہیے کہ یورپین اسٹاف کا زیادہ وقت بورڈنگ لائف کی درستی اور طلبا کے ساتھ دوستانہ مراسم پیدا کرنے میں صرف ہو۔ مثلاً یونین کلب اور بورڈنگ کی اور انجمنوں کے جلسوں میں یورپین اسٹاف کے ممبر ہمیشہ شریک ہوں۔ مسٹر ماریسن نے جو ٹیوٹوریل سسٹم قائم کیا تھا وہ پھر جاری کیا جائے۔ اور چونکہ پانسو طلبا میں ہر ایک کے ساتھ خصوصیت کے ساتھ ملنا پروفیسروں کیواسطے غیر ممکن ہے اسواسطے یہ طریقہ نہایت مفید ثابت ہوگا ہر ایک بورڈنگ ہاؤس میں ایک یورپین پروفسر کیواسطے مکان بنانے کی جو تجویز ہے اُسپر حتی الامکان جلد عملدرآمد ہو، اور یورپین پروفیسر کبھی کبھی بورڈنگ ہاؤس میں گشت کریں، تاکہ طلبا کی پرائیویٹ لائف کو دیکھنے اور اُس کے درست کرنے کا اُن کو موقعہ ملے۔

سب پراکٹر مقرر کرنے کا موجودہ سسٹم اُصولاً ضرور نہایت مفید ہے لیکن میری راے میں سب پراکٹروں کے انتخاب میں زیادہ احتیاط سے کام لیا جائے، ہر شخص جو عمدہ کلاس کا ٹیچر ہوسکتا ہے وہ لازمی طور پر عمدہ سب پراکٹر یا تربیت دینے والا نہیں ہوسکتا۔ جس شخص نے مدرسۃ العلوم میں تعلیم نہ پائی ہو، نہ اُسکو خود بورڈنگ لائف نصیب ہوئی ہو، وہ دوسروں کی تربیت کیا خاک کرسکتا ہے، ع او خویشتن گم ست کرا رہبری کند۔ سب پراکٹروں کیواسطے وجاہتِ ظاہری کا ہونا بھی ایک لازمی امر ہے ورنہ طلبا پر اُنکا کسی قسم کا رُعب نہیں ہوسکتا۔ اسکول بورڈنگ ہاؤس کے

سب پر اگر جہانتک ممکن ہو سمرّ اشخاص مقرر کئے جائیں اور سب پر اکٹری کیواسطے عموماً مدرسۃ العلوم کے طلبا کو باہر کے لوگوں پر ترجیح دیجائے۔ مذہبی تعلیم قومی ہمدردی پیدا کرنیکا نہایت عمدہ ذریعہ ہے اسواسطے ایسوسی ایشن کو خاص طور پر اس امر کی سفارش کرنی چاہیے کہ اسلامی اخلاق اور اسلامی ہمدردی کی تعلیم طلبہ کو زیادہ اہتمام کے ساتھ دیجائے۔ تجربہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بہ نسبت دینیات کی موجودہ کتابیں پڑھانے کے اخلاقی لکچروں کا طلبا پر زیادہ اثر ہوتا ہے چنانچہ نواب محسن الملک و مولوی حبیب الرحمٰن خانصاحب کے مذہبی لکچروں کو عام طور پر طلبا نے نہایت رغبت اور پسندیدگی کی نظر سے دیکھا، اور مولٰنا شاہ محمد سلیمان صاحب کے دو تین وعظوں کا طلبا پر عام طور سے جسقدر عمدہ اثر پڑا ہے، برسوں تک کتابیں پڑھانے سے نہیں ہوسکتا تھا۔

در طریق ما رواج سبحہ و زنار نیست ؛ آنچہ تو در کار داری نزد ما در کار نیست

اسلئے کالج میں ایک نہایت باا ثر، خوش بیان۔ ذی علم۔ غیر متعصب۔ روشن خیال اور زمانہ کی ضروریات اور ہوا کے رُخ کو پہچاننے والے واعظ یا ڈین کی بہت ضرورت ہے۔

اِس امر کی خاص طور پر کوشش کیجائے کہ طلبا کے باہم کسی قسم کے نزاعات پیدا نہوں، اور جو شکر رنجیاں کسی وجہ سے پیدا ہو جائیں وہ فوراً رفع کرادی جائیں۔ نیز یہ کہ کالج کیطرف سے طلبا کو کسی قسم کی شکایت یا بددلی پیدا نہو جائے جس کیوجہ سے اُن کی ہمدردی جاتی رہے۔ نوجوان طبیعتیں اکثر زودرنج اور سریع الہیجان ہوتی ہیں، لہذا اُن کو قابو میں کرنا اور اُن کی دلدہی کرنا منتظمینِ کالج کا سب سے مقدم فرض ہونا چاہیے۔

اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کو چاہیے کہ صرف کالج کلاسیز کے طالبعلموں کو ایسوسی ایشن کے سالانہ جلسوں میں بطور وزیٹر کے شریک ہونے کی اجازت دے تاکہ زمانۂ طالبعلمی سے ایسوسی ایشن کے ساتھ اُن کو ایک قسم کی مناسبت اور دلچسپی پیدا ہو جائے، نیز یہ کہ اُن کو پرانے طلبا سے ملنے اور اُن کے حالات اور خیالات معلوم کرنے اور اُن کے تجربوں سے سبق حاصل کرنیکا موقعہ ملے، اور پرانے اور نئے طلبا میں سلسلۂ ملاقات قائم رہے تاکہ کالج چھوڑنے کے بعد وہ آپس میں غیر مانوس و اجنبی محض نہوں۔ نئے طلبا کے ساتھ رسم و راہ پیدا ہونے سے پرانے طلبا کو کالج کے حالات بھی بہ آسانی زیادہ مفصل معلوم ہوسکینگے اور کالج کے معاملات میں مداخلت کا اُن کو زیادہ موقعہ ملیگا۔

محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس اور دیگر قومی مجالس میں شرکت کی طلبا کو ترغیب دیجائے تاکہ قومی معاملات سے اُن کو واقفیت اور دلچسپی پیدا ہو جائے، اور قوم کے سربرآوردہ لوگوں سے ملنے اور اُن کے خیالات معلوم کرنیکا موقعہ دستیاب ہو۔

آخر میں دوبارہ نہایت زور کے ساتھ میں اس امر کی سفارش کرونگا کہ سرسید مرحوم کی مذہبی اور قومی تصانیف اور لکچر ہر طالب علم کو لازمی طور پر پڑھائے جائیں۔ اس خیال کو میں پہلے بھی کئی بار ظاہر کرچکا ہوں اور اب پھر بغیر اُسکا اعادہ کئے نہیں رہ سکتا کہ جبتک سرسید کی تصانیف کالج کی تعلیم کے زمانے میں ہر طالب العلم کو لازمی طور پر نہ پڑھائی جائینگی، سچی قومی ہمدردی اُن کے دلوں میں کبھی پیدا نہیں ہوسکتی، اور میں یہانتک دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ بغیر سرسید کی تصانیف پڑھے ہوئے انگریزی خواں طلبا کسیطرح پورے مسلمان بھی نہیں ہوسکتے۔ ابتک کالج کے پُرانے اور نیز موجودہ طلبا میں مشکل پانچ فیصدی ایسے ہونگے جنھوں نے سرسید کی تصانیف کو کبھی دیکھا ہو اور یہی وجہ ہے کہ اُن میں اُس قومی ہمدردی کا عشر عشیر بھی نہیں پایا جاتا جو سرسید کے رفقا کے دلوں میں پیدا ہوگئی ہے۔

ہماری قوم میں عموماً اور کالج میں خصوصاً کام کرنیوالوں کا قحط ہے، ہمیشہ نہایت عمدہ تجاویز پیش ہوتی ہیں، نہایت مفید رزولیوشن پاس ہوتے ہیں، موٹی موٹی روئدادیں طیار کیجاتی ہیں، سٹیج کا پل ہمیشہ سینکڑوں کا ہوتا ہے لیکن افسوس ہے کہ اُن تجاویز پر عملدرآمد بہت کم ہوتا ہے۔ لکچر بازی بند کیجائے۔ فصاحت اور بلاغت کے دریا روکے جائیں، اور عملی کارروائی زیادہ مستعدی اور استقلال کے ساتھ کیجائے، اگر یہ نہیں تو پھر سب اسپیچیں اور لکچر بیکار اور رزولیوشن اور تجاویز بے سود ہیں۔ ؎ خود ہمین ست گر آئین طلبگاری ما
وای بر ما و بریں ہرزہ زبانکاری ما۔

الراقم۔ محمد یعقوب عفی عنہ۔

## علیگڈھ منتھلی میں انعامی مضامین

سالگذشتہ میں قرار پایا تھا کہ منتھلی کیطرف سے مضمون نگاروں کو عمدہ مضامین پر خواہ وہ انگریزی ہوں یا اردو فی مضمون نذرانہ دیا جائیگا۔ چنانچہ بعض صاحبوں کو اس تجویز کے موافق نذرانہ دیا بھی گیا، مگر زیادہ پابندی کیساتھ اس تجویز پر عملدرآمد نہیں ہوا۔ اس سال پھر اس تجویز کی تجدید کیگئی ہے اور تین شخصوں کی ایک کمیٹی جنمیں شمس العلما مولانا

# توسیعِ یونین کلب

چند مہینے ہوئے توسیعِ یونین کلب کی تجویز ہمارے ناظرین کی نظر سے گذر چکی ہو اور غالباً اُن کو انتظار ہوگا کہ اُس تجویز کا کیا حشر ہوا۔ اِس لئے ہم نہایت خوشی کے ساتھ اطلاع دیتے ہیں کہ وہ تجویز اب قریب تکمیل ہے۔ مولوی عبد الجبار صاحب وکیل ہائیکورٹ حیدر آباد کے عطیہ مبلغ ایکہزار روپیہ نے اِس تجویز کو پبلک میں پیش کرنیکی جرأت دلائی تھی، اور اولڈ بوائز سے اِستمداد کا اپیل کیا گیا تھا، اور بعض نے اُنمیں سے اِس باب میں اظہارِ فیاضی بھی کیا تھا، مگر پھر بھی اندیشہ تھا کہ یہ تجویز نامکمل رہیگی۔ حُسنِ اتفاق سے کرنیل عبد المجید خاں صاحب فارن منسٹر ریاست پٹیالہ کالج میں تشریف لائے اور یونین کلب کی طرف سے ایک ڈیپوٹیشن بغرض استمداد اُن کی خدمت میں حاضر ہوا۔ صاحب موصوف نے فراہمی چندہ میں مدد کا وعدہ فرمایا اور "اَلْکَرِیْمُ اِذَا وَعَدَ وَفیٰ" کے مقولہ کے موافق دو ماہ کے اندر مبلغ تین ہزار روپیہ نقد حضور نواب صاحب مالیر کوٹلہ سے وصول کر کے کالج میں تشریف لائے۔ اور کالج کی اِس بڑی ضرورت کو رفع کیا۔ اب صرف ایکہزار روپیہ کی کمی ہو۔ مگر ہمکو توقع ہو کہ یہ کمی بھی اولڈ بوائز اور کالج کے ہمدردوں کی مدد سے بہت جلد پوری ہو جائیگی۔ کرنیل عبد المجید خانصاحب کی ذاتِ بابرکات سے پچھلے چند سال میں کالج کو بڑی مدد ملی ہو خدا اُنکے وجود باجود کو عرصے تک قائم رکھے، اور کالج کے لئے ایسے ہی چندہ اور ہمدرد پیدا کر دے۔ جن اولڈ بوائز نے کہ اِس کارِ خیر میں کالج کی مدد کی ہو اُن کے نامِ نامی معہ رقم چندہ حسب ذیل ہیں۔

| | | |
|---|---|---|
| مولوی نذیر احمد صاحب بی۔ اے پرسنل اسسٹنٹ محکمہ مال ریاست کشمیر | صہ / | وصول |
| خواجہ سجاد حسین صاحب بی۔ اے اسسٹنٹ انسپکٹر مدارس حلقہ راولپنڈی۔ | عصہ / | ” |
| مولوی منظور احمد صاحب کمسریٹ ڈپارٹمنٹ دانا پور۔ | عہ / | ” |
| مسٹر محمد علی خاں بی۔ اے کیمپ نائب ناظم محکمہ مال ریاست بڑودہ۔ | صہ / | وعدہ |
| مولوی حبیب اللہ خاں صاحب بی۔ اے تحصیلدار ہاتھرس۔ | عصہ | ” |
| مسٹر شوکت علیخاں بی۔ اے سب ڈپٹی ایجنٹ ضلع بہرائچ۔ | صہ | ” |

امیر حسن خاں سکرٹری کمیٹی توسیعِ یونین کلب۔

# ممیرہ اور سچّے موتیوں کا سفید سرمہ

مصدّقہ جناب نامی گرامی ڈاکٹر ڈبلیو آر کرائیپر صاحب بہادر ایل ایف۔

سی۔ ایس۔ اے۔ آر۔ ایس۔ ایم۔ فیلو آف کمسٹری **لنڈن**

معزز ڈاکٹروں اسسٹنٹ سرجن ہسپتال اسسٹنٹ و نوابوں و راجاؤں کی حکیموں و گورنمنٹ کے اعلیٰ ترین عہدہ داروں و انگریزی گریجوایٹوں و تعلقہ داروں و یورپین معزز انگریزوں کی سارٹیفکیٹ بکثرت موجود ہیں، جنکو ہم بوقت فرمایش بھیجینگے۔
ہم نے اصلی اور عمدہ ممیرہ بڑی تلاش سے ہندوستان کے باہر سے منگوایا ہے۔

## ہمارے سرمہ کا امتحان اور اسمیں جلد کامیابی

(۱) نگاہ ناپ کر ہمارا سرمہ لگائیے دو ہفتے میں روشنی آنکھ کی بہت بڑھ جائیگی اور آنکھ کی جملہ نقص دور ہو جائینگے (۲) عینک چھوٹ جائیگی (۳) دھند۔ دھلکہ۔ آنسو بہنا۔ سرخی۔ سوزش۔ کھجلی۔ آنکھ کے سامنے کا اندھیرا پلکوں کے اندر کے دانے و سرخی۔ گوہانجنی (۱۲) لکھنے پڑھنے سے آنکھوں کا تکان۔ درد بہت جلد شرطیہ رفع کرتا ہے۔ (۱۴) کمزور نگاہ سے سوئی میں تاگا پرو لیجیے۔ پڑوال۔ سبل۔ جالا۔ پھولی۔ ابتدائی موتیابند۔ ناخونہ۔ گگرے۔ (۲۲) آنکھوں میں سرخ ڈورے پڑنے کو (۲۳) پلکیں گر جانے والی بیماری کو مفید ہے۔ (۲۴) کمزور آنکھ کو قوت دیتا ہے۔ (۲۵) آنکھوں کا میل اور ہوا وصاف کرتا ہے۔ آنکھ کو جملہ امراض سے محفوظ رکھتا ہے۔ **قیمت فی تولہ تین روپیہ** (محصول ڈاک ۴؍)

**المشتہر رام سرن نگم۔ کانپور نیا چوک** } اپنا نام و پتہ و نام ڈاکخانہ خوشخط لکھو۔ بوقت فرمایش

## ذیل میں چند نامی گرامی اُن اصحاب کے لکھے جاتے ہیں کہ جنکے سارٹیفکیٹ حال میں آئی ہیں

(۱) جناب ڈاکٹر ای۔ وائی۔ روڈر صاحب بہادر۔ آر۔ ڈی۔ ایم۔ پی۔ ایل مقام لنڈن۔
(۲) جناب ڈاکٹر۔ پی۔ این۔ بنرجی صاحب اسسٹنٹ سرجن (حال مقام میرٹھ)
(۳) جناب ڈاکٹر جوگیندر ناتھ صاحب باسو۔ ایل۔ ایم۔ ایس۔ کانپور۔
(۴) جناب ڈاکٹر الیاز خانصاحب۔ ایس جی۔ سی۔ ہسپتال اسسٹنٹ مقام نگینہ۔
(۵) جناب مسٹر اے۔ ڈبلیو۔ براننٹ صاحب ورمالک براننٹ کمپنی کانپور

(۶) جناب مسٹر جے۔ اے۔ آر۔ رائلینین صاحب ہیڈ ٹکٹ کلکٹر اودھ روہلکھنڈ ریلوے۔
(۷) جناب بابو نیل مادھب رائے صاحب بی۔ اے۔ بی ایل جج خفیفہ بہادر کانپور
(۸) جناب بابو بپن بہاری صاحب۔ ایم اے ایل ایل۔ بی۔ ڈسٹرکٹ و سشن جج گونڈا (حال کانپور)
(۹) جناب مسٹر شب سنکر لال صاحب سٹی مجسٹریٹ مقام سنڈیلہ۔

(۱۰) جناب منشی کالیچرن صاحب منصف درجۂ اول۔ مقام بہرائچ۔
(۱۱) جناب مولوی سید حامد حسن صاحب منصف درجۂ اول مقام ہمیرپور۔
(۱۲) پنڈت بنسی دھر صاحب تحصیلدار ضلع باندا۔
(۱۳) مسٹر لکشمی نراین۔ بی۔ اے ایل ایل۔ بی۔ وکیل ہائیکورٹ ضلع اناؤ (اودھ)
(۱۴) مسٹر بشمبر ناتھ صاحب۔ بی۔ اے۔ ایل۔ بی۔ وکیل ہائیکورٹ کانپور۔

(مطبوعہ ریاض ہند پریس علی گڈھ)

as meaning the firmans and title deeds relating to grants of land, family histories and manuscripts. Old books likely to prove of value to the historical student are also desired.

The value of such collections of coins and documents is obvious. But to increase the usefulness of the Society's work it is proposed that all documents, which we obtain, shall, with the permission of the givers or lenders, be copied and translated, and shall have added to them short notes as to their origin and date, and as to any other feature of interest they may possess. Thus if we obtained access to a large number of documents we should obtain in the course of time a large quantity of material really useful to the student of history, and particularly of economic history.

Another kind of gift for which the Society would be grateful is good photographs illustrating Indian architecture. These would be treated with the same care as documents.

Anyone who is willing to give or to lend to the Society anything of historical interest is invited to communicate either with the Principal, M. A.-O. College, or with the Honorary Secretary, Prof. Abdul Kadir Khan, M. A.-O. College, Aligarh, or with myself.

I am, Sir,

Yours very faithfully,

J. H. FOWLE,

*President.*

ALIGARH,
*1st May, 1904.*

# Correspondence.

[TO THE EDITOR OF THE "ALIGARH MONTHLY."]

SIR,

I should be glad if you would allow me to draw the attention of your readers to a Society which exists in the College—I mean the M. A.-O. College Historical Society.

The Society was founded some few months ago by Mr. Morison, who was largely prompted thereto by a letter which he had received from Mr. Burn, I.C.S. The latter pointed out that at Aligarh we had great opportunities for almost every kind of historical and antiquarian research, and he urged that we should make use of these opportunities. For this purpose the Historical Society was established. It has been thought advisable up to the present to keep the first efforts of the Society more or less unknown. But now that we have ground for hoping that it is fairly established there is no reason why it should not be known beyond the walls of the College. In fact the more widely our objects are known, the greater will be the chance of doing good work.

The objects of the Society are (*a*) to enquire into questions of local or national historical interest; (*b*) to collect, preserve and study Indian antiquities, particularly coins and documents.

The first object we try to attain by means of papers read at the periodical meetings of the Society. Other means are also under consideration, whereby a more thorough and scientific research into such questions may be made. With regard to the second object not much has yet been done. But we have had offers of assistance and suggestions from various sources, and some documents and coins have already been given or lent to us. For the safe preservation of any documents and coins which come into our possession a large "strong box" has been provided by the College and all reasonable care will be bestowed on any such gifts of loans.

Anyone therefore interested in this kind of work and willing to place at our disposal Indian coins or documents, whether as a gift or a loan, may be assured that they will be well guarded. The word "documents" may be taken

Cambridge set what uniform standard there was. When a great man's son left school, he might make the grand tour of Europe with a tutor and go to Venice and 'swim in a gondola'; then perhaps he might become attached to some nobleman's household or even like our courtier friend in the Fifth form at St Anthony's, get a place at court. The young squire would go back to his father and his native shire at the age of sixteen, unless he was considered worthy of a sojourn at one of the universities. A large number of youths, sons of respectable parents, would be sent to London and there be bound as apprentices to trade, destined, some of them, to grow into lordly merchant princes and worthy ornaments of a city that was itself a light and ornament in Europe.

The all-seeing Shakespeare touches here and there on the foibles of pedantic School-Masters and the peculiarities of boy-hood. There is the vivid picture of the "shining morning face" of the urchin on his way to work. A hint at the pleasures of playing truant makes one fancy that the poet himself had, in his urchin-days, snatched now and then an unlawful hour for a birds-nesting foray in Sir Thomas' park or a ramble by the banks of the pleasant Avon.

In two or three of the comedies there are strange pictures of School-Masters. Holofernes, in "Love's Labour Lost," is a fantastic fellow, full of words, with a rare nose for false Latin, yet boyish enough to enjoy a revel and the "delightful ostentation" of a masque. His work it was "to educate youth at the charge-house on the top of the mountain," and many commentators have thought that Harrow is here referred to. In the "Merry Wives" there is Sir Hugh Evans, the Welsh parson schoolmaster, and he too takes part in a masque and revel in Windsor Forest. His method of teaching is exemplified on the stage in a lesson in Latin grammar. Young Page is put through his cases and pronouns, to please his listening mother, who was doubtful about her son's attainments. However, Sir Hugh was in a lenient mood; it was a holiday and there was a merry game to be played at Falstaff's expense. There were to be songs and fairy dances round Herne's Oak at midnight, and the pedagogue Sir Hugh was to lead the revels. In truth, those were days of merry pedants and merry holidays!

J. R. C.

Every one went on to Latin which for many years was the language of official business. There was an elementary Latin Grammar called "Mylke for Children" written by one Master John Holt, about 1490, and a little later Colet, the famous Head of St. Paul's, published a Grammar which long kept its place as a standard work. St. Antony's Hospital was a famous London School, founded about 1230 and largely attended up to about 1562. A courtier of Queen Elizabeth's, who was at Kenilworth in 1574, says: "I went to school, forsooth, both at Poule's and St. Antony's, was in the Fifth form, past Aesop's Fables, read Terence, and began with my Virgil. I could my rules, construe and parse with the best of them." This tells us a good deal. A boy in the fifth, that is five classes from the bottom, the sixth being probably the highest class, was advanced enough in Latin to read Terence's plays.

He had just begun Virgil (the "*my* Virgil" is a pleasing touch) and he adds "I could my rules" that "I knew my Rules" with the best of them. The sixth form, to which presumably this courtier never attained, would be reading Horace, Cicero and more Virgil, and would contain boys of fifteen or sixteen years of age. For Mathematics, problems in Arithmetic seem to have been the commonest exercise. Here are two specimens of such, which belong to the Elizabethan times, with the original spelling preserved:

(i) Suppose a piece of timber to be 2 foot by 2 inches broad and 1 foot by 8 inches deep wt is the true square of the piece, say you?

(ii) There be two Townes A and B lye south and north and between them 25 miles a third Towne C lyes straight west from B 60 miles; I demand the just distance A. to C.

This was the standard of work that produced the Drakes, the Sidneys, the Raleighs, not to mention Shakespeare, Ben Jonson and Milton—these subjects and one study more—perhaps of more influence from a point of view of literary training than all the others, namely the English Bible.

There was no Department of Education, nor any examinations. Custom only and the requirements of Oxford and

not be the gainer by the suppression of many of the fashionable magazines which can hardly escape the stigma of vapidness.

In the second place, I should like to have a provision laid down in the above legislation which, while reserving to the Reviewers full rights of free expression of opinion in matters of literary criticism, should preclude them and the publishers from writing or doing anything to unduly applaud or decry the true value of a book. I want to have this provision in order to prevent the "booming" or "running down" of a book which, at the present time, forms such a discreditable feature of a section of the British press

In the third place I should like to see something done to supplement the curtailed supply of literature, and to place the classics, the higher form of poetry, and the better sort of modern publications, within easy and attractive reach of the public. Popular editions of the classics, of selections from the standard poets and of really good modern books, should be printed on good paper and in big type and placed on the market. In this connection the work of certain philanthropic societies—and notably of the "Society of Rational Thinkers"—is deserving of special praise and should serve as a model.

M. H.

---

## Old English Schools, II.

---

Mention was made of the general demand for schools in England from the year 1400 and onwards, and it was shown that education was cheap and eagerly sought after by the enterprising Middle Classes; and now, one may ask what books were used, what subjects taught, and what standard was aimed at. For many years, long after the invention of printing, books were very dear. Beginners were given an article called a Horn Book—a board varying in size (not unlike the wooden boards on which Indian children now learn to write the letters of the alphabet.) These "books" inscribed with the alphabet and often a simple prayer, were faced with transparent horn, and were in common use till about 1800.

them, but to enjoy scenic splendours, dancing and the lightest of music; and the chief influence in that demand comes from the stalls Periodicals and plays of the most vapid kind have taken the place of poems of high and lofty moral meaning"

In short to whichever department of literature we turn we are confronted with unmistakeable evidences of a decadence of the taste for pure literature which is truly alarming, and the condition of things disclosed has a greater bearing on the general welfare than is commonly perceived. Mr. Sidney Lee, in a recent lecture at the London School of Economics, spoke of "Books in relation to national efficiency" and tried to show that "books of the right kind undoubtedly make for national efficiency, the more they are read the more their readers become efficient citizens." There is a great deal of truth in this remark, and I believe its converse holds equally good. The production and diffusion of an enormous mass of vapid literature of the kind which I have described—and this happens almost daily in England—must surely tend to lower national efficiency in the long run. It ought to be the business of those whose position might enable them to be the agents in bringing about a better state of things to set to work earnestly to improve and educate the public taste. But there would seem to be little hope of this unless the matter were taken up by the state.

The State patronage of literature which ended with the last Stuart Sovereign of England, has not been a part of the policy of her Hanoverian successors. But at the present juncture it is perhaps not too much to expect that the State should come to the rescue, and if it were at all inclined to do so, I believe it could do a great deal in the direction of reform. In the first place a law should be passed extending complete Government supervision over all the publishing houses of Great Britain. The State should appoint a number of competent critics or censors over each publishing house —who should judge of books proposed for publication according to a common pre-arranged standard of literary quality and intrinsic worth, and refuse sanction to those which fall short of that standard. I would also include in this censorship all periodical publications, with the exception of the daily newspapers, and the weekly and monthly reviews; for I would like to see the periodical literature purged of all such *trashy and flashy publications as the "Pick-me-up," "Photo* Bits," "Scraps," and many others which are such an eyesore at the bookstalls. I do not know if the reading public will

if we except the fashionable periodicals—which the public care to read. Personally I am not against novel reading. It has its advantages which nobody can gainsay. But I deplore the deterioration in the standard of the modern novel. It is certainly a sign of decaying taste that the "shocker" type of novels has grown to be popular with the better class of readers The "penny" and "threepenny shockers" gave place to the "shilling shocker" and now we have the "six shilling shocker." As a type of this last class of novels I might mention the works of Mr William LeQuex, who in his characteristic vein, writes books hardly more wholesome than say the notorious "Budget Story Series" There are many other writers of sensational fiction of this kind and their works always find a ready sale Now such books ought never to be printed and given to the public Besides being most stupid and vapid they produce a morbid effect on the imagination of the reader and string his nerves to a tension which, from a medical point of view, is highly injurious to health Let the public have novels by all means, and modern novels if they like. But let the books be wholesome and have something of human interest in them. I should like to see more writers of the type of Mr. Thomas Hardy, whose novels make us *feel* and exercise our sympathies and emotions in a quiet, healthy manner. If the reader wants with all these something of excitement and adventure he can go, for instance, to Stanley Weyman, and be sure of being in a safe atmosphere. At all events it is, I believe, in the true interests of the public welfare to demand that the "shockers" be abolished.

If we turn to poetry we find the same indications of decaying taste on the part of the British public. I am tempted to quote here at some length from the lecture of Mr Alfred Austin which he lately delivered at the Royal Institution, and which gives a vivid description of the popular dislike of poetry. "At the present day," he says, "men and women turn away from reflective poems unless of the most modest dimensions ......" He goes on to show that poetry is being ousted from popular favour by the novels and prose romances of the present day, and says, "to use novels simply as a means of killing time and stimulating curiosity must perforce destroy the taste for the higher poetry......" As to whether modern plays and periodicals are responsible for the decline of poetry in popular favour, Mr. Austin says, "the stage which used to be the domain of the highest poetry is now governed by the determination of audiences not to have poetry inflicted on

I have often heard it remarked as a kind of aphorism that the material well-being of the world is advancing at the cost of the intellectual. I need not stop here to consider the appropriateness of this remark. One can hardly be positive about such things in a general manner, and sweeping assertions of this kind have a way of turning turtle which is uncomfortable for the asserter. However, I say this for the remark which I have quoted—the world is growing to be so busy with material concerns that it has very little time to think of literature and intellectual pursuits. This is a very pronounced feature of modern life, and it seems Jules Verne was not very far wrong when he said that the average man of the future would have no time for any literature except the morning paper at breakfast. As matters stand at the present day, however, all the indications point to the fact that the English public has become indifferent to literature. And it is not want of time but want of interest which is at the root of the evil. I am aware that I must speak with great diffidence of the condition of things in England, but from what I have read of views of responsible critics on the subject, I believe there can be little doubt as to what I say here. Mr. William Watson writing in a recent number of the "Fortnightly Review," says—"there has grown up amongst us and is at the present time flourishing exceedingly, a spirit which I can only describe as a spirit of profound insensibility and indifference to literature. It is not the note of a class, it is a pronounced feature of the national life. To the vast majority of the people the most real and abiding glories of our country are virtually non-existent. To the vast majority of the people the very names of all but two or three, at most, of the supreme masters of our language—the two or three of world-wide acceptance and honour—are unknown. The phenomenon of so huge an illiteracy, at once too palpable to escape us and too familiar to surprise, is a remarkable one." This indictment discloses a very deplorable state of things, and one wonders if the large number of free public libraries which are scattered all over the kingdom are used at all, and if so, to what purpose? On this question I remember the finding of a writer in one of the reviews, who had taken the trouble to make a careful calculation and had prepared statistics as to the kinds of books demanded at some of these libraries. His figures showed that almost 75 % of such books consisted wholly of works of fiction, while the rest included books on general literature, biography and a very small proportion of poetry and the classics. There can be no doubt in fact as to the immense vogue which the modern novel has come to have at the present day. It would seem to be the only literature—

with greater stock of health, and consequently with more perfect means of enjoyment. At home, we enjoy true comfort and consolation, tranquillity of mind and profound rest ; and one reward of work is to secure rest.

During Holidays, there is an opportunity for us to educate the females of our families, and to impress upon the minds of our parents, relations and friends the benefits we derive from Western education Thus, we can enliven their senses to the great need of English education, and remove to a great extent, the prejudices that unfortunately still pervade native society

As the days of vacations pass on, we learn to know the value of time, and begin to revise what we have read with our teachers. Then we really understand that each day is a little life and must be utilised as fully as we can. During Holidays we also make up for lost time and not unfrequently when we return, we return with more recruits for our College In short, Holidays are vital to study. There must always be a time for work and a time for play

SAHIB-UD-DIN.

---

## The Decadence of Taste for Pure Literature. How can it be checked ?

I was present recently at a discussion as to whether "Genius had declined in the Nineteenth Century and after," and was surprised to find how many pertinent things could be said in favour of the denunciation. I was not brought round completely to support the proposition, perhaps because, though not a keen optimist, I have a horror of cynicism. But I thought that in the last decades of the 19th century at least, literary genius had declined in England, that is to say, the literary output of these 30 or 40 years was very poor when compared with that of the preceding decades. If the fact stood by itself, it would perhaps occasion no alarm, for the barrenness could be explained away as the usual gap between two outbursts of which the history of English literature presents many instances. But this is not so, and in considering the facts of the case we are brought face to face with a disquieting state of things which is certainly worth inquiring into.

*Third Year.*—PROSE : Green's "Short History of the English People." Oman's "History of Greece" Pelham's "Outline of Roman History" Kipling's "Captain Courageous," Scott's "Quentin Durward."

POETRY—Tennyson "Idylls of the King." "Princess" and shorter poems. Milton's 'Comus'

*Fourth Year.*—PROSE : Macaulay's History of England, Macaulay "Essays" (selections). Mrs Craik's "John Halifax, Gentleman," Hazlitt's Essays, Stevenson's "Island Nights"

POETRY—Shakespeare's "As you Like It.' Butcher and Lang's Translation of Homer's Odyssey Tennyson Selections.

---

## Holidays

——:o:——

Of all the privileges we enjoy in College, perhaps the most delightful and interesting is the gift of holidays.

Holidays afford us a great occasion of joy and cheerfulness, and are more precious in our eyes than riches. They open to us the various avenues of the temple of rest. And rest is as necessary as study ; there runs a proverb " through labour to rest, through combat to victory." We must rest to be able to work well, and work to be able to enjoy rest.

Great and manifold are the advantages we derive from Holidays As we go home, most of us to distant places, we improve ourselves by long journeys and pleasing conversations by coming in contact with men of different cities and different places· exchange of ideas is a great benefit to an educated and trained mind, and to this we find an easy access, as we travel in far countries. When we reach home, we spend our days in enjoyment, and social and family intercourse. Our imagination is calm, our brains un-troubled. If we read, we read at our pleasure, and if we work, we work at our will; and, when we come back to College, we come

take this opportunity of reminding Old Boys and others in England who are interested in the College, that every item of news that concerns them will be heartily welcomed here.

---

His Honour the Lieutenant-Governor of these Provinces is to visit Aligarh at the end of July

---

Students have so often asked for advice in the matter of general English reading, that it seems fitting enough to suggest a kind of graded course of subjects and books suited to various years. Private reading is most essential to the Indian student, who is at times apt to keep his eye fixed on the University "Course" only, and forgets that there is near at hand a vast store-house of literature from which he can not only take abundance of knowledge but which also will provide him with nourishment that will give happiness and life-long satisfaction. Essay writing and the producing of ideas are no doubt good in their way but there must be some foundation to work on, and the essay writing will gain in efficiency as the store-house of ideas is filled and enriched with the best products of English Literature The list given here is offered as a help and a suggestion. It is intended to mark out enough private reading to fill up an average student's spare time

*First Year.*—PROSE: Scotts "Kenilworth," Captain Marryat's "The King's Own," and "Peter Simple." Hughes' "Tom Brown's School Days." Goldsmith's "Vicar of Wakefield." Smiles' "Self Help"

POETRY—Macaulay's Poems, Scott's "Lady of the Lake," Coleridge's "Ancient Mariner."

*Second Year.*—PROSE: Chesterfield's Letters, Dicken's "Pickwick Papers" and "The Tale of Two Cities." Scott's "Waverley."

POETRY—Longfellow (selections.) Gray's Elegy. Edwin Arnold's "Light of Asia."

The College Cricket team played Simla on June 2nd and 3rd, and won by eight wickets. The following were the chief scorers: 1st innings, Simla, Mitchell 17; Aligarh, Sayid Mahommed Khan 23; Ali Raza 20; 2nd innings, Simla, Smallwood 38; Alexander 27; Aligarh, Abid Husain 56 (not out); Akram, 36 (not out).

The Eleven then journeyed to Kasauli and beat the Kasauli team by 110 runs.

---

The Hockey Team is going to play two matches at Naini Tal in the middle of this month.

---

On Saturday, June 4th, the six-monthly election was held at the Union Club with the result that the following were chosen members of the Select Committee: Niaz Mahommed, Gholam Rasool, Mohyul Islam, Asaf Zaman, Tassaduq Ahmed and Mahommed Shafi

---

Mr. Arnold has been made Professor of Arabic at the University College, London. His address is:

31, St. Thomas' Mansions,
Westminster Bridge,
London, S W.

---

News concerning Old Boys is always welcome, and it is particularly gratifying to have to record the success of Aijaz Ali, B.A., who was appointed a Deputy Collector in May 1903. He has passed the Departmental Examination (Higher Standard) and is raised to the Rs. 200 grade. In February last he was granted Second Class Magisterial powers and his Collector remarked that his judicial work was "most careful and thorough."

---

We shall doubtless, be soon having news of the Annual Dinner of the Aligarh Association in London. We would

# The Aligarh Monthly.

## JUNE, 1904.

## College Notes

AN apology is due to subscribers for the late appearance of the May number, and in all probability for a like offence this month also The May number was delayed by the fact that the Urdu part was not ready, and this was due to the Urdu printer's misfortune. He was, we hear, entangled in a law-suit No blame can be attached to the "Mission Press," Cawnpore, who are always most prompt and business-like in all their dealings with us If the June number is late, the Editor must be blamed, though, he says, he fails to see what harm is done, so long as the June number appears in June, and not July.

In our note on the University Examinations last month, we should have added that Minhaj-ud-din, last year's Head boy in the School, came out first on the School Final list.

The various classes are filling up very quickly The School houses are full and the old School class rooms are uncomfortably and oppressively crowded. In the Pucca Court there are a few rooms vacant for College students

The Asman Manzil is completed and was hanselled on June 6th by the Fourth Year, with a recital of a portion of Shakespeare's "Coriolanus."

علیگڑھ منتھلی

| جلد ۲ | جولائی سنہ ۱۹ عیسوی | نمبر ۷ |
|---|---|---|

# الاموۃ عند العرب

(نمبر ۲)

(سلسلہ کے لئے مئی کا منتقل دیکھنا چاہیئے)

**نکاح ذواق** اس دعوی کی تائید میں اور بھی بہت سے دلائل ہیں۔ مثلاً عرب زمانۂ جاہلیت میں نکاح شرعی دوامی کو کچھ زیادہ مہتم بالشان نہیں سمجھتے تھے۔ اسکا ثبوت عربوں میں "نکاح ذواق" کے رواج سے ملتا ہے۔ "نکاح ذواق" ایک قسم کا نکاح تھا جو بلا کسی شرط کے منعقد ہوتا تھا، اور جس وقت لذت فرحت اور جذب کشش باقی نہیں رہتی تھی، تو دونوں فریق کو اسکے توڑ ڈالنے کا اختیار ہوتا تھا۔ ام خارجہ کی نسبت بیان کیا جاتا ہے، کہ اس نے بیس قبیلوں کے چالیس سے بھی زیادہ مردوں سے جماع کیا۔ خواستگار نکاح آکر کہتا "خِطْب" یعنی "منگنی کرتی ہو"؟ وہ فوراً جواب دیتی "نکح" "یعنی ہاں! نکاح کرتی ہوں" غرضکہ ایک سے نکاح کرتی تھی، اور دوسرے کو چکھ کر چھوڑ دیتی تھی۔ اسی عورت پر اس ضرب المثل کی بنیاد پڑی ہے کہ "اَسْرَعُ مِنْ نِکَاحِ اُمِّ خَارِجَۃ" یعنی اگر کسی چیز کی سرعت کا ذکر

کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ "ام خارجہ کے نکاح سے بھی زیادہ جلد"۔ ام خارجہ جیسی عورتیں کثرت سے موجود تھیں۔ سیدانی کی بعض تشریح امثال سے اسکا پتہ چلتا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ:—

"ام خارجہ اور ماریہ بنت الجعید العبدیہ وغیرہ عورتوں میں سے جب کوئی عورت کسی مرد سے نکاح کرتی، اور رات اُسکے پاس رہ جاتی، تو یہ اُسکی مرضی پر موقوف ہوتا تھا کہ چاہے اُس مرد کے پاس ٹھیرے، اور چاہے چلی جائے"۔ اور رضامندی کی یہ علامت ہوتی تھی کہ صبح کے وقت شوہر کے لئے کھانا تیار کرتی تھی"۔

لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ طلاق کا حق صرف عورتوں ہی کو حاصل تھا۔ بلکہ مردوں کو بھی تھا۔ جیسا شریعتِ اسلامی سے ظاہر ہوتا ہے، کہ اُس نے احکامِ قدیم، اور ان حقوق کا اعتراف کرکے اپنے پیرووں کو بلا کسی قید و شرط کے استعمالِ طلاق کی اجازت دی ہے۔

**کثرتِ طلاق کی چند مثالیں** | مندرجۂ ذیل مثالیں اس دعوی پر روشنی ڈالتی ہیں۔ لین (LANE.) نے "الف لیلہ" کے انگریزی ترجمہ میں ایک نوٹ لگایا ہے، جس میں وہ لکھتا ہے کہ:—

"عربوں اور خصوصاً متوسط طبقہ کے لوگوں میں، ایک وقت میں، متعدد بیویوں کا کرنا کچھ عمدہ دستور نہیں خیال کیا جاتا تھا۔ لیکن اس طبقہ میں ایسے افراد بہت کم تھے، جنہوں نے ایک وقتِ واحد میں چند بیبیاں نہ کی ہوں۔ اس کی وجہ طلاق کی آسانی تھی۔ مثلاً امام حسنؓ نے دو سو مطلقہ عورتوں سے بھی زیادہ سے نکاح کیا۔ اور انہی کی نسبت یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ کبھی کبھی چار چار عورتوں کو طلاق دینے کے بعد وقتِ واحد میں چار عورتیں بھی رکھتے تھے۔

مغیرہ بن ثابت کی نسبت بیان کیا گیا ہے، کہ اُس نے اسّی عورتوں سے بھی زیادہ سے نکاح کیا۔ خود عربوں کی تصنیفات میں اس قسم کی لاانتہا مثالیں پائی جاتی ہیں۔ اس کی وجہ بجز اس کے اور کوئی نہیں کہ وہ بیبیوں کے اول بدل کو بہت پسند کرتے تھے۔ اس قسم کی سب سے زیادہ عجیب غریب مثال وہ ہے، جو نہایت معتبر ذرائع سے محمد بن صتلغ بغدادی (متوفی سنہ ۲۳۲ ہجری بعمرِ ہشتاد سال) کی نسبت بیان کی جاتی ہے، کہ اُس نے نو سو عورتوں سے بھی زیادہ سے

نکاح کیا۔ اگر ہم اُس کے نکاحِ اول کے وقت اُس کی عمر پندرہ۱۵ برس کی فرض کریں تو اُس کی ہشتاد سالہ زندگی میں فی سال تیرہ۱۳ عورتوں کا اوسط پڑتا ہے۔"

اِس کی وجہ بجز اِسکے اور کچھ نہیں بیان کی جاسکتی کہ یہ تمام باتیں مراسم قبل اسلام کے اثرات سے پیدا ہوئیں۔

متعہ بطور بقیہ رسوم جاہلیت کے

اگر ہم اِس بات پر غور کریں کہ "متعہ" (جس کی موجودگی میں "نکاح دوامی" کی ضرورت نہیں رہتی) ایک زمانے میں عربوں کے قومی رسوم میں داخل تھا، اور اُس کی جڑیں اُن کے اخلاق و طبائع میں جاگزیں تھیں، تو اُس وقت ہم کو اِس بات کا سمجھنا نہایت آسان ہو جاتا ہے کہ باوجودیکہ شارعِ اسلام نے ان قدیم عادتوں کو منسوخ بھی کر دیا تھا، لیکن ایک مدت دراز تک عربوں میں اُن کے آثار باقی رہے۔ اِس لئے کہ جو احکام اس حالت میں صادر ہوئے خود انکی طاقت سے یہ بات خارج تھی کہ وہ عربوں کو اُن کی قدیم اور مضبوط عادتوں سے پھیر کر دفعتہً نکاح دوامی شرعی کا عادی بنا دیتے۔

یہ خیال کرنا بالکل غلط ہے کہ اسلامی طلاق میں سہولت کا موجود ہونا، اور بسا اوقات اُسکا عجیب و غریب صورتوں میں ظاہر ہونا، مسلمانوں میں "نکاح متعہ" کی ڈھیل اور قدیم عادات عرب کے اثر سے پیدا ہوا۔ اس لئے کہ کوئی شخص اس سے انکار نہیں کرسکتا، کہ اُس نکاح میں جو نہایت سہولت و سرعت سے فسخ ہو سکتا ہو، اور "متعہ" میں فرقِ عظیم ہے۔ اگرچہ آجکل ہم اکثر فقہا کی رایوں میں اس فرق کا اثر تقریباً مفقود پاتے ہوں۔ کیونکہ اُن میں سے اکثر نے اس بات پر اتفاق کیا ہے کہ:۔

"جس شخص نے (بظاہر) بلا کسی تعیین وقت کے نکاح کیا ہو، لیکن اُسنے اپنے دل میں اُس عورت کے ساتھ رہنے کو ایک زمانۂ خاص تک محدود کر دیا ہو، تو یہ نکاح صحیح اور جائز ہے۔ اور "نکاح متعہ" میں داخل نہیں۔ اس لئے کہ نکاح متعہ وہ ہے جس کے انعقاد میں تعیینِ وقت کا ذکر کیا جائے۔"

اقسامِ نکاح بزمانۂ جاہلیت | اس بحث کے بعد اب ہم صحیح بخاری کی وہ عبارت نقل کرتے ہیں، جس میں زمانۂ جاہلیت کے نکاح کی قسمیں بیان کی گئی ہیں۔ امام بخاریؒ لکھتے ہیں کہ:۔

زمانۂ جاہلیت میں نکاح کی چار قسمیں تھیں:

(۱) نکاح الفروی | ایک نکاح تو اسی طرح ہوتا تھا، جس طرح آجکل ہوتا ہے، کہ ایک مرد دوسرے مرد سے اُس کی ولیہ یا بیٹی کی درخواست کرتا ہے۔ ولی قبول کرتا ہے، اور نکاح ہو جاتا ہے۔

(۲) نکاح الاستبضاع | نکاح کی دوسری صورت یہ تھی، کہ جب عورت حیض سے فارغ ہو جاتی، تو اُس کا خاوند اُس سے کہتا کہ فلاں شخص کو بلا کر اُس سے نطفہ حاصل کر۔ شوہر اُس وقت تک بیوی سے علیحدہ رہتا اور ہاتھ تک نہیں لگاتا تھا، جب تک کہ اُس مرد (غیر) کے نطفہ کا حمل ظاہر ہو جاتا تھا۔ حمل ظاہر ہو جانے کے بعد اگر شوہر چاہتا تو اپنی بیوی سے جماع کرتا۔ اِس سے مقصد یہ ہوتا تھا کہ بچہ نجیب و شریف حاصل کیا جائے۔ اس نکاح کو "نکاح الاستبضاع" کہتے تھے۔

(۳) نکاح تعدد الازدواج | نکاح کی تیسری صورت یہ تھی، کہ دس مردوں سے کم ایک ٹکری جمع ہو کر ایک عورت کے پاس جاتے، اور سب اُس عورت سے جماع کرتے۔ اگر وہ حاملہ ہو جاتی، اور بچہ جنتی، تو وضع حمل کے چند دنوں بعد اُن تمام مردوں کو بُلاتی۔ کسی مرد کی یہ مجال نہ تھی کہ آنے سے انکار کر سکے۔ جب سب جمع ہو جاتے تو عورت اُن سے کہتی کہ جو کچھ تم نے کیا ہے اُس سے تو تم واقف ہو، اب میرے بچہ پیدا ہوا ہے۔ اے فلاں! وہ تیرا بیٹا ہے۔ (اس وقت) اُس کا جو جی چاہتا بچے کا نام رکھتی۔ اس گفتگو سے بچہ اُس مرد کے حوالہ کیا جاتا۔ اور اُس کو انکار کرنے کی مجال نہ ہوتی۔

(۴) نکاح المشارکت | نکاح کی چوتھی صورت یہ تھی، کہ بہت سے مرد جمع ہو کر ایک عورت کے پاس جاتے اور وہ ان میں سے کسی ایک آنے والے کو بھی منع نہ کرتی۔ یہ کسبیاں ہوتی تھیں، جو اپنے دروازوں پر بطور نشانی کے جھنڈیاں نصب کیا کرتی تھیں، جس کا دل چاہتا اُن کے پاس جاتا جب ان عورتوں میں سے کوئی حاملہ ہو کر بچہ جنتی، تو یہ تمام مرد اس عورت کے پاس جمع ہوتے، اور قیافہ شناس بُلائے جاتے۔ قیافہ شناس اس بچے کو جس مرد کے مشابہ دیکھتے اُس کی اولاد قرار دیتے، اور

ن کا بیٹا کہلاتا، اور مرد اُس سے انکار نہ کرتا۔"

قتباس مذکورۂ بالا سے ظاہر ہوتا ہے کہ عرب جاہلیت میں نکاح کی چار قسمیں تھیں۔ جن میں سے
سے قطع نظر کر کے باقی تین سے بحث کی جاتی ہے، کیونکہ وہ ہمارے مقصود سے زیادہ تعلق
تی۔

بخاری کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ عربوں میں نکاح کی دوسری قسم کا نام "نکاح الاستبضاع"
ارع بخاری کی رای کیموافق اس نکاح میں شوہر اپنی بیوی کو قوم کے کسی شریف و معزز مرد
ع کرنیکی اجازت دیتا تھا، تاکہ نجیب و شریف بچہ حاصل کیا جائے۔ اس صورت میں جو کچھ
و غرابت ہے اُس کو ہر شخص سمجھ سکتا ہے۔

متعدد قوموں میں | یہ رسم عربوں کے علاوہ دوسری قوموں میں بھی پائی جاتی ہے، لیکن باتنے
ستبضاع" کا وجود | فرق کے ساتھ کہ عورت اپنے شوہر کے علاوہ غیر مرد سے صرف اسی وقت
تی ہے جبکہ اپنے شوہر سے اس کے اولاد نہ ہوتی ہو۔ عورت کا یہ فعل ایک خاص سبب
ا۔ ایک جرمنی عالم گرِم (Grimm) کے بیان سے اس سبب کا پتہ چلتا ہے۔ وہ قدیم
ں پر گفتگو کرتا ہوا لکھتا ہے کہ:۔

ن کے نزدیک نکاح کی یہ غرض تھی، کہ وارث شرعی پیدا ہو۔ یہاں تک کہ اگر کسی عورت
بذنا مستحق ہو جاتا، تو خاوند کو بلا کسی اعتراض کے اُس کو طلاق دینے، اور دوسری عورت
اح حاصل ہوتا تھا۔"

بعض قدیم (جرمنی) قصائد میں ایک بزرگ عورت یصابات کی روایت سے بیان کیا گیا ہے،
تو زنگ کا ایک سوار اپنے ضعف کی وجہ سے جائز وارث شرعی کے پیدا ہونے سے
ہو گیا تو اُس نے یصابات کے شوہر امیر لوو نک کے پاس آ کر یہ خواہش ظاہر کی کہ وہ
،، اُس کی بیوی سے جماع کرے۔

س قسم کی مثالیں جو نہایت آزادی سے رائج تھیں، گرم (Grimm) کی کتاب

حکمۃ الشعب" میں نہایت کثرت سے ملتی ہیں۔ اس کتاب میں سے ہم صرف ایک مثال بیان کرتے ہیں۔ مصنف نے ایک سوال لکھا ہے کہ:—

"اگر خاوند بیوی کا حق (جماع) نہ ادا کر سکے، اور بیوی شوہر سے نارضامند بھی نہ ہو، تو شوہر کو اپنی بیوی کی دلداری اور انبساطِ خاطر کے لئے کیا تدبیر کرنا چاہیئے"؟ اسکا جواب یہ لکھا ہے کہ:—

"شوہر کو چاہیئے کہ بیوی کو اپنی پیٹھ پر لاد کر گھر کی چار دیواری سے باہر لے جائے، اور چار دیواری کے باہر عورت کو کسی ایسے مرد کے حوالہ کرے جو اُس کو خوش کر سکے۔"

یہ رسم قدیم یونانیوں میں بھی رائج تھی۔ اسپارٹا (Sparta) کا بوڑھا مرد جب اپنی بیوی پر قادر ہونے سے عاجز ہو جاتا تھا، تو وہ اُسکو اپنے کسی نوجوان دوست کے حوالہ کر دیتا تھا، تاکہ وہ اُس سے جماع کرے۔ اگر یہ عورت اپنے شوہر کے دوست سے حاملہ ہو کر بچہ جنتی، تو یہ پیرمرد اُس کو متبنّیٰ بنا کر حقیقی بیٹے کی طرح اپنا وارث قرار دیتا۔

ایتھنز (Athens) میں وارث بننے والی لڑکی کو یہ حق حاصل ہوتا تھا کہ وہ جس مرد سے چاہے جماع کرے، لیکن یہ حق عورت کو اُسی وقت حاصل ہوتا تھا، جب کہ شرعی شوہر بیوی پر قادر ہونے سے عاری ہوتا تھا۔

بیان کیا جاتا ہے کہ شمالی سیبیریا کے قبائل تشوکشی میں بھی یہ رسم آج تک رائج ہے۔ اس قبیلہ میں اگر کسی مرد کے اولاد نہ ہو، اور اُس کو وارث کی خواہش ہو، تو وہ اپنی بیوی کو کسی غیر مرد سے جماع کرنے پر آمادہ کرتا ہے۔

اس میں کچھ شک نہیں کہ عربوں کی یہ رسم، اور اس قسم کی دوسری رسمیں اُس زمانہ کی یادگار ہیں، جبکہ اُن میں "نکاحِ شرعی" رائج نہیں تھا۔

ایک مشہور انگریز مصنف میک لی نن اس امر کی نسبت لکھتا ہے کہ:—

"خاندان کی آیندہ بقا کا انتظام کرنا ہم کو انسان کی اُس قدیم سوسائٹی کو یاد دلاتا ہے جب کہ تعدد ازواج کی رسم جاری تھی۔ اِس لئے کہ جس زمانہ میں "نکاح فردی" عام طور پر رائج ہو، اور

زوجین میں سلسلۂ محبت نہایت قوی ہو، تو اُس وقت اس اہتمام پر کوئی سبب مجبور کرنیوالا نہیں"

نکاح شارکت" میں باپ کا مشخص ہونا | زمانۂ جاہلیت کے نکاح کی تیسری اور چوتھی صورت بعینہٖ تعددِ ازواج (Polyandry) اور نکاحِ شارکت" (Promiscuity) سے مماثل ہیں آخری صورت کی یہ تعریف کیگئی ہے کہ:-

"بہت سے مرد جمع ہوکر ایک عورت کے پاس جاتے۔ اگر اس جماع سے کوئی بچہ پیدا ہوتا تو اُن میں سے ایک شخص اُس کو اپنا متبنّیٰ بنالیتا"

اس قسم کے نکاح کی تائید میں بہت سی سندیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ جن میں سے ہم صرف شہرستانی کی کتاب الملل و النحل پر اکتفا کرتے ہیں۔ مصنف موصوف "جھنڈے والی عورتوں" کے بیان میں، لکھتا ہے کہ:-

مرد باری باری اُن کے پاس آتے، اور یہ سب ایک ہی گھر میں اُن سے جماع کرتے، جب بچہ پیدا ہوتا، تو عورت اُسکو ان مردوں میں سے کسی ایک کے گلے منڈھ دیتی۔

مذکورۂ بالا بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ "مقتسمہ" عورت اگرچہ تمام مردوں کے لئے مُباح ہوتی تھی، جیساکہ صراحۃً بخاری میں بیان کیا گیا ہے، لیکن فی الواقع یہ عورت ایک خاص جماعت کے لئے مخصوص ہوتی تھی۔

قومِ نائر میں نکاحِ شارکت" | بچہ کو قیافہ، یا کسی خاص مقررہ علامتوں، کی بنا پر کسی مرد سے وابستہ کردینے کا کیا مطلب ہے؟ اس کے سمجھنے کے لئے اس بات کی ضرورت ہے کہ عرب کی اس رسم کا مقابلہ دوسرے اقوام کی اسی قسم کی مراسم سے کیا جائے، مثلاً قومِ نائر جو ہندوستان کے سواحل ملابار پر ایک پرانی قوم ہے، اُس میں "نکاحِ شارکت" برابر جاری ہے، اور ساتھ ہی "نکاحِ شرعی" سے بالکل ناواقف ہے۔ اکثر پرتگیزی، اٹیلین، انگریزی اور ہالنڈی سیاحوں نے اپنے سفرناموں میں اس قوم کی نسبت یہی بیان کیا ہے۔ ان تمام رایوں کو باکوفین (Bachofen) نے اپنی کتاب "قدیم لوگوں کی رائیں دربارہ قرابت" میں جمع کیا ہے

چنانچہ مصنف مذکور قوم نائر کی نسبت لکھتا ہے کہ:

"اُس قوم میں عورتیں مشترک ہوتی ہیں جس کا جی چاہتا ہے مختلف اوقات میں اُن کے پاس آتا ہے، مگر شرط یہ ہے کہ مرد عورت ہی کے قبیلہ کا ہو، اور نیز یہ کہ حقیقۃً یہ عورت اپنے قبیلہ کے مردوں کی ایک خاص جماعت کے ساتھ مخصوص ہوتی ہے۔ ایک خوبصورت عورت تین یا چار نائر مردوں سے وابستہ ہوتی ہے۔ یہی مرد اُسکی ضروریات پورا کرتے ہیں، اور یہی اُس سے وطی کرتے ہیں۔

"اُن کے ہاں یہ رواج بھی ہے، کہ جس عورت کے چاہنے والے زیادہ ہوتے ہیں، وہ اپنے قبیلہ کی نظروں میں زیادہ معزز سمجھی جاتی ہے، اور نیز ہر ایک عورت کے دو۲ مردوں سے بارہ۱۲ مردوں تک ہوتے ہیں، لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ اُن کے علاوہ اور مردوں سے معاشرت نہ کر سکے، اگرچہ افضلیت پہلے شوہروں کو ہوتی ہے۔ جس وقت ایک مرد "معشوقہ" کے ساتھ خلوت کرتا ہے، تو دروازہ پر بطور نشان خلوت کے، اپنی تلوار، یا کپڑا لٹکا دیتا ہے۔ پھر دوسرے مرد کو یہ مجال نہیں ہوتی کہ وہ اندر گھس آئے، جو شخص اس قاعدہ کے خلاف کرتا ہے اُسکو قتل کی سزا دی جاتی ہے۔ البتہ جس وقت دروازہ پر کوئی علامت نہیں ہوتی تو اُس وقت ہر مرد کو اندر جانے، اور خلوت کرنے کا حق حاصل ہوتا ہے۔ جب عورت حاملہ ہوتی ہے، اور بچہ جنتی ہے، تو اس جماعتِ معینہ میں سے اُس مرد کے ساتھ اُس کو وابستہ کرتی ہے، جو سب سے زیادہ اُس عورت کے پاس آتا جاتا ہو"

**"نکاحِ مشارکت" اور "تعددِ ازواج" میں فرق** عرب جاہلیت کی رسم اور اُس رسم میں کسقدر مشابہت پائی جاتی ہے۔ اس مسئلہ پر نظر غائر ڈالنے سے "نکاحِ مشارکت" اور "تعددِ ازواج" قانونی میں بیّن فرق معلوم ہو جاتا ہے، کیونکہ مؤخر الذکر صورت میں عورت چند خاص مردوں کے لئے مخصوص ہوتی ہے، اور دوسروں سے کچھ علاقہ نہیں رکھتی، جیسا کہ زمانہ جاہلیت کے نکاح کی تیسری صورت میں دیکھا جاتا ہے۔

اسلام نے نکاح کی ان چار صورتوں میں سے صرف پہلی صورت کو جائز رکھا، اور باقی تین صورتوں، یعنی "نکاح استبضاع"، "نکاح مشارکت"، اور "تعدد ازواج" کو ہمیشہ کے لئے ناجائز قرار دیا، لیکن اس بات سے کون ناواقف ہے کہ کسی امر کا ممنوع قرار دینا اور چیز ہے، اور دائرۂ عمل سے فوراً اُسکا خارج ہو جانا دوسری چیز ہے، اس لئے کہ ایسی عادت کی قطعی بیخ کنی کرنا، جو انسان کی رگ و پے میں بس کر اُسکی زندگی کا ایک عنصر بن گئی ہو، نہایت مشکل کام ہے۔ پس ایسی حالت میں اگر عربوں میں شیوع اسلام کے ایک زمانۂ دراز کے بعد بھی جاہلیت کی ان رسموں کے کچھ آثار باقی پائے جائیں، تو کچھ تعجب کی بات نہیں۔

ان تمام نظائر سے اشارۃً ثابت ہوتا ہے کہ قدیم عربوں میں "تعدد ازواج" اور "نکاح مشارکت" دونوں رائج تھے۔

بعض مسلمانوں میں عرب جاہلیت کی باقیات — ان سب سے زیادہ عجیب و غریب یہ بات ہے، کہ بعض ایسے مسلمان بھی ملتے ہیں، جو نکاح کے اسلامی احکام سے بالکل ناواقف تھے۔ مشہور مستشرق علامہ ڈوزی (Dozy) نے جو واقعہ اپنی کتاب "اسپین میں اسلام کی تاریخ" میں ابو اسمٰعیل بصری کے حوالہ سے بیان کیا ہے، وہ اِس دعوی کی بیّن دلیل ہو سکتا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ:۔

"کہ ایک بوڑھے اعرابی نے ایک نوجوان شخص سے یہ معاملہ طے کیا، کہ وہ (بوڑھا) اپنی بیوی کو اس شرط سے اُس (نوجوان) کے پاس جماع کرانے کے لئے بھیج دیگا، کہ وہ اُس کے گلہ کی حفاظت کرے۔ جب امیر المومنین کو اس عجیب و غریب معاملہ کی خبر ہوئی تو اُس نے دونوں کو بلا کر دریافت کیا کہ کیا تم کو یہ نہیں معلوم کہ اسلام اس قسم کی باتوں سے منع کرتا ہے"۔ اُن دونوں نے قسم کھا کر کہا کہ "ہم اِس حکم سے بالکل ناواقف ہیں"۔

بارھویں اور چودھویں صدی عیسوی میں اس قسم کی اکثر مثالیں ملتی ہیں۔ بعض عرب سیاحوں مثلاً یاقوت حموی اور ابن بطوطہ کی تصانیف سے اس کا پتہ چلتا ہے۔

یاقوت کی شہادت — یاقوت حموی اپنے جغرافیہ "معجم البلدان" میں شہر مرباط کے بیان میں لکھتا ہے کہ:۔

"یہاں کے باشندے عرب ہیں، اُن کا لباس بھی قدیم عربوں جیسا ہے۔ ان لوگوں میں باوجود تعصب اور تُندمزاجی کے کچھ صلاحیت بھی ہے۔ بےحیائی اُن کی عادت میں داخل ہے۔ یہاں کی عورتیں ہر رات کو شہر کے کُھلے مقامات میں نکلکر بےشرم مردوں سے گپ شپ کرتی ہیں۔ بہت رات گئے تک اُن مردوں کے ساتھ ملاعبت کرتی رہتی ہیں۔ مرد اپنی ماں، بیٹی، بہن، اور خالہ کو دیکھتا ہوا چلا جاتا ہے، کہ وہ دوسرے مردوں سے ملاعبت اور بات چیت کر رہی ہیں جس طرح دوسرے مرد اس کی بیوی سے سلوک کر رہے ہیں۔ اسی طرح یہ بھی اپنی عورتوں سے منہ پھیرے ہوئے دوسری عورت کے پاس جاکر بیٹھ جاتا ہے۔ میں ان کے بہتسے سرداروں سے ملا ہوں۔ جن میں سے ایک شخص نہایت عقیل و ادیب تھا۔ اُس کو اکثر چیزیں حفظ یاد تھیں، اُس نے مجھکو اشعار سنائے، جن کو میں نے قلمبند کرلیا۔ جب بہت دیر تک اُس سے باتیں ہوتی رہیں، تو میں نے اُس سے کہا کہ مجھکو تمھاری قوم کی ایک ایسی بُری بات معلوم ہوئی ہے کہ جسکی صحت کا مجھکو یقین نہیں، اُس نے جلدی سے کہا کہ شاید تم ہمارے رات کے گپ شپ کرنے کی طرف اشارہ کرتے ہو؟ میں نے کہا ہاں۔ اِس پر اُس نے جواب دیا کہ اس کی نسبت جو کچھ تم کو معلوم ہوا ہے، وہ صحیح ہے۔ واللہ یہ نہایت بُری رسم ہے۔ لیکن کیا کریں، جب سے پیدا ہوئے ہیں۔ اسی حالت کو دیکھا ہے۔ اور یہی عادت دلوں میں گھر کر گئی ہے۔ اب اس کا چھوڑنا نہایت دشوار ہے۔ اگر ہم سے ہوسکتا تو ہم اس رسم کو بدل دیتے۔ لیکن سالہا سال سے اس عادت پر زندگی بسر کرنے کی وجہ سے اسکے چھوٹنے کی اُمید نہیں ہوسکتی۔"

**ابن بطوطہ کی شہادت** ابن بطوطہ نزوا پایۂ تخت عمان کے بیان میں لکھتا ہے کہ:۔

"اُن کی عورتیں بہت فسق و فجور کرتی ہیں۔ نہ اُن میں غیرت ہے، اور نہ اُسکو بُرا جانتے ہیں۔"

اس دعویٰ کے ثبوت میں اُس نے مندرجۂ ذیل قصہ نقل کیا ہے کہ:۔

میں ایک روز عمان کے سلطان ابو محمد بن نبہان کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ اتنے میں اُس کے پاس ایک کم سن خوبصورت عورت منہ کھولے ہوئے آئی، اور اُس کے سامنے کھڑی ہوکر

کہنے لگی کہ اے ابا محمد میرے سر پر شیطان چڑھا ہے؛ سلطان نے جواب دیا کہ جا اور شیطان کو اُتار ڈال؛ عورت نے کہا کہ میں ایسا نہیں کر سکتی، کیونکہ میں تیرے جوار میں رہتی ہوں، سلطان نے کہا جا جو تیرا دل چاہے سو کر؛ جب میں وہاں سے اُٹھ آیا، تو لوگوں نے مجھ سے بیان کیا کہ یہ عورت اور جو ایسے افعال کرتی ہیں، وہ سب سلطان کے جوار میں رہتی ہیں، اور بدکاری کرتی پھرتی ہیں۔ اُس کے باپ یا کسی دوسرے رشتہ دار کو اتنی مجال نہیں کہ اس بارہ میں کچھ غیرت سے کام لیں، اگر وہ اس عورت کو مار ڈالیں، تو خود بھی قتل کئے جائیں، کیونکہ یہ سب عورتیں جوارِ سلطان میں رہتی ہیں۔"

**زمانۂ حال میں عرب جاہلیت کے آثار۔**

ان قدیم مصنفوں کے بیان کے ساتھ اگر اُن نظائر کو بھی اضافہ کیا جائے تو کچھ مضائقہ نہیں، جو زمانۂ حال کے سیاحوں نے عرب کے اخلاق و عادات کے متعلق اپنے سفرناموں میں درج کی ہیں۔ جس سے ناظرین کو معلوم ہو سکتا ہے، کہ عرب کی اخلاقی حالت اصلاح کی محتاج ہے۔

**پالگریو کی شہادت**

منجملہ ان سیاحوں کے ایک انگریز سیاح پالگریو (PALGRAVE) ہے، جس نے سنہ ۶۲-۶۳ء عیسوی میں وسطی اور شرقی عرب کا سفر کیا ہے، وہ بدوؤں کے اخلاق کی نسبت لکھتا ہے کہ :—

بدوؤں کی انتہائی اخلاقی خرابی نے اسلامی قوانین نکاح میں سے بعض کو ناجائز، بعض کو غیر ضروری، اور بعض کو زائد قرار دے رکھا ہے، اس لئے کہ ان کا ازدواجی تعلق بہ نسبت "تعدد زوجات" کے "نکاحِ مشارکت" سے بہت زیادہ قریب ہے۔ اگر یہ کہا جائے تو بالکل صحیح ہوگا کہ خود اُن ہی کا یہ مقولہ کہ "وہ بچہ نہایت چالاک ہے، جو اپنے باپ کو جانتا ہے"۔ جس قدر اُن پر صادق آتا ہے دوسروں پر صادق نہیں آتا۔ اس بارہ میں اور ایسے ہی اور بہت سی دوسری باتوں کے متعلق (جن کی تفصیل سے میرے ناظرین مجھکو معاف رکھینگے) اُن کا تمام مقولہ تھا، جو بار بار میرے سُننے میں آیا کہ ہم سے تو کتے ہی بہتر ہیں؛ میں اُن کی اس آخری درجہ کی راست گوئی کی تعریف کرتا ہوں، جو بالکل جھوٹ سے پاک ہے۔"

**اسپنسر کی شہادت** اسپنسر Spencer نے سواحل نیل ابیض کے ایک قبیلہ بنی الحسنی کی نسبت جو کچھ بیان کیا ہے، وہ بھی اس موقع پر قابلِ ذکر ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ:۔

عرب کی بعض عورتوں کو مسئلۂ نکاح میں جو آزادی حاصل ہے، میرے خیال کے مطابق دنیا کی اور عورتوں میں اُس کی مثال ملنا محال ہے۔ مثلاً جب اس قبیلہ کا کوئی مرد کسی لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہے، تو پہلے لڑکی کے والدین سے اُسکا معاوضہ طے کرتا ہے۔ اس معاوضہ کی مقدار ہفتہ کے صرف ان دنوں کے لحاظ سے مقرر کی جاتی ہے، جن کی نسبت عورت یہ معاہدہ کرتی ہے کہ وہ ان دنوں میں پوری امانت کیساتھ تعلقاتِ زوجیت کی نگہداشت کریگی۔ جب یہ معاملہ طے ہو چکتا ہے، تو لڑکی کی ماں یہ کہکر معاہدہ توڑ ڈالتی ہے کہ اُس مسئلہ کے تمام اطراف و جوانب پر نظر ڈالنے، اور حقوقِ خاندانی کی حفاظت پر غور کرنے کے بعد میں اپنی لڑکی کو کسطرح اس بات پر مجبور نہیں کر سکتی کہ وہ اس نکاح کی وجہ سے ایک ہفتہ میں دو دن سے زیادہ اپنی عفت کی نگہداشت کیا کرے، لیکن بہت کچھ بحث و تکرار، اور رقمِ معاوضہ بڑھوا لینے کے بعد جانبین اس پر متفق ہوتے ہیں کہ عورت ایک ہفتہ میں "چار دن" شوہر کے ساتھ رہا کریگی، اور اس عرصہ میں کسی غیر مرد سے تعلق نہ رکھیگی، جیسا کہ اس قبیلہ کے تمام معززین میں دستور ہے۔ لیکن عورت اس قبیلہ کی قدیم رسم کی بنا پر اس عرصہ میں بھی کسی قید کی پابند نہیں ہوتی، بلکہ اُسکو اپنی ذات پر پورا اختیار حاصل ہوتا ہے کہ جو چاہے کرے۔ چاہے شوہر کے ساتھ رہے، اور چاہے نہ رہے، اُسکو ہر وقت یہ حق حاصل رہتا ہے کہ پوری آزادی سے کام لے، اور فرائضِ زوجیت میں سے کسی ایک کو بھی پورا نہ کرے،،۔

یہی مصنف پھر اسکے بعد لکھتا ہے کہ:۔

"میں نے خود دیکھا ہے کہ یہ شادی کرنے والے اگر ہفتہ کے "غیر مشروط" دنوں میں اپنی عورتوں کی کچھ بھی نظرِ التفات پاتے ہیں، تو اپنے آپ کو نہایت خوش قسمت سمجھتے ہیں، اور اس توجہ کو عورتوں کی محبت کی دلیل خیال کرتے ہیں۔"

اِس وقت تک جو کچھ عرب جاہلیت کے نکاح کے متعلق بیان کیا گیا ہے، اُس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اُن کے ہاں باپ کے معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ بلکہ اُس کی ضرورت ہی نہیں خیال کی جاتی تھی، اسلئے کہ جس گذشتہ زمانہ میں "ازدواج شرعی" مفقود تھا، تو بچہ اپنی ماں سے وابستہ ہوتا تھا، اور ہر ایک بات میں اُسی سے تعلق رکھتا تھا۔

نکاح مشارکت میں تشخیص پدر کے اصول۔ لیکن اس سے یہ ضرور نہیں تھا کہ کسی مرد کے دل میں اس بچہ کی محبت کا خیال تک آتا ہو، جس کے وجود کا وہ سبب ہوا ہے، اور نہ اُس کو اس بات کی ضرورت تھی کہ وہ اپنی محبتِ قلبی کو نہایت پُر تکلف صورت میں ظاہر کرے، بلکہ اگر اُسکو بچہ سے بہت زیادہ تعلق خاطر ہوتا تھا، تو وہ اُس سے ظاہری تعلق بھی بڑھا لیتا تھا۔ اور میں خیال کرتا ہوں کہ مرد کی اسی فیلنگ نے بعض "نکاح مشارکت" کرنیوالی قوموں میں اس رسم کی بنیاد ڈالی ہے کہ چند خاص علامتوں اور خارجی مشابہتوں کی بنا پر بچے کا باپ معین کیا جاتا ہے۔

علامہ باکوفین نے اپنی کتاب "الاموتہ" میں زمانہ قدیم کی بعض اسی قسم کی مثالیں بیان کی ہیں۔ ہم ان میں سے چند مثالیں مزید توضیح کے لئے بیان کرتے ہیں۔ علامہ موصوف لکھتا ہے کہ:—

"نیقولاوس نے قوم لیبورن (Liburnians) کی نسبت بیان کیا ہے کہ ان کی عورتیں مشترک ہوتی ہیں، پانچ برس کی عمر تک وہ اپنی کل اولاد کو ایک ہی گھر میں پرورش کرتے ہیں، چھٹے برس سب بچوں کو جمع کر کے قبیلہ کے مردوں سے ملا کر دیکھتے ہیں، جو بچہ جس مرد کے مشابہ ہوتا ہے وہ اُسکو دیدیا جاتا ہے، اور وہ اُسکو اپنا بیٹا بنا کر اُس کی غور و پرداخت کرتا ہے۔"

سواحلِ بحر احمر کے بعض حبشیوں میں بھی یہ رسم بیان کی جاتی ہے، چنانچہ ہیرو ڈوٹس لکھتا ہے کہ

"اس قبیلہ کی عورتیں مشترک ہوتی ہیں، وحشیانہ طور پر مردوں سے مجامعت کرتی ہیں، مرد اُنکو اپنے ساتھ کسی گھر میں نہیں رکھتے۔ بچے جب اپنی ماؤں کے گھر میں بڑے ہو جاتے ہیں، تو ہر تیسرے مہینے مرد جمع ہوتے ہیں، جو بچہ جس مرد کے مشابہ ہوتا ہے وہ اُس کو دیدیا جاتا ہے، اور وہ اُسکو اپنا بیٹا اور وارث بناتا ہے۔"

قوم کرس میں "نکاح مشارکت" اور تعینِ پدر کے رواج کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ:—
اُن میں سے کسی مرد کے پاس کوئی خاص عورت نہیں۔ وہ نہ "نکاحِ مشارکت" کی اولاد کو پرورش کرتے ہیں، اور نہ اُس بچہ کو جسکا باپ معلوم نہ ہو، بلکہ صرف اُس بچہ کی پرورش کرتے ہیں، جسکو اُنھوں نے بعض علامتوں اور خارجی مشابہتوں کی بنا پر اپنا متبنّیٰ بنایا ہو"

اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ قومِ نائر کی مائیں اپنے بچوں کو اپنے قبیلے کے مردوں میں سے جس شخص سے چاہتی وابستہ کردیتی تھیں۔ عرب میں بھی یہی دستور تھا، جیسا کہ بخاری کی مذکورۂ بالا حدیث سے ظاہر ہوتا ہے، جس میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ "قیافہ شناس علامات خارجی کی بنا پر ہر بچے کا باپ معین کرتا تھا" لیکن اسمیں کچھ شک نہیں کہ فرضی باپ کا وجود بمقابلہ "تعددِ ازواج" کے "نکاحِ مشارکت" میں کم پایا جاتا ہے، اسلئے کہ "تعددِ ازواج" کی صورت میں صرف چند رشتہ دار یا کل بھائی ایک عورت کو استعمال کرتے تھے، اور بچے کا باپ معین کرنیکی ضرورت نہیں پڑتی تھی، بلکہ اکثر و بیشتر بڑا بھائی، یا وہ شخص جسکو عورت سب سے پہلے منتخب کرلیتی، بچہ کا باپ شمار کیا جاتا، اگرچہ یہ شخص حقیقۃً بچے کا باپ نہو۔

ہم کو جولیس قیصر کی کتاب میں، جس میں اُس نے قدیم اہلِ برطانیہ کا بیان کیا ہے، اسکی صاف شہادت ملتی ہے۔ جولیس ان کی نسبت لکھتا ہے کہ:—
"دس یا بارہ مردوں میں ایک مشترک عورت ہوتی تھی، بھائی اور رشتہ دار سب اس میں مستحق ہوتے تھے، ایک ایک مرد باوقاتِ مختلف عورت کے پاس آتا تھا۔ یہ عورت جب بچہ جنتی، تو ان ہی مردوں میں سے کسی ایک شخص کو اُس کا باپ منتخب کرتی، اور یہ وہ شخص ہوتا تھا جو سب سے پہلے عورت کی بکارت زائل کرتا تھا"

جن اہلِ تبت میں "تعددِ ازواج" کی رسم جاری ہے، ان کی نسبت بیان کیا جاتا ہے کہ:—
"مشترک بیوی کا انتخاب کرنا بڑے بھائی کے متعلق ہوتا ہے، اور وہی اس عورت کی تمام اولاد کو اپنا متبنّیٰ بناتا ہے"

لیکن عرب جاہلیت کی مذکورۂ بالا مثالوں میں نظر آتا ہے کہ اُن میں اس کے برعکس یہ رائج تھا کہ "نکاح مشارکت" اور "تعدد ازواج" دونوں صورتوں میں قیافہ شناس ہی بچہ کا باپ معین کرتا تھا نہ کوئی اور شخص۔ قدیم عربوں کی اس رسم میں نظام اسومی کو بہت بڑا دخل ہے۔

ماں پر انحصارِ قرابت | اس میں کچھ شک نہیں کہ اگر ان میں شروع ہی سے یہ دستور ہوتا کہ یا تو ہمیشہ بچہ کا حقیقی باپ ہوا کرتا، یا ہمیشہ کسی فرضی طریقے سے باپ معین کیا جایا کرتا، تو ہم کو اس بات کا معلوم کرنا نہایت مشکل ہو جاتا، کہ زمانۂ قدیم میں رشتۂ قرابت کا صرف ماں تک منحصر رہنا کن اسباب پر مبنی تھا، جب اس بات کے تسلیم کرنے سے کچھ مفر نہیں ہو سکتا کہ مذکورۂ بالا رسم کی بنیاد انسانی سوسائٹی میں "نکاحِ مشارکت" اور "تعدد ازواج" کے رواج کے بعد پڑی ہے، اور اس کی اشاعت "نکاح فردی" کے وجود پذیر ہونے کے وقت تک بھی پائی جاتی ہے، تو اُس وقت اس میں کچھ شک باقی نہیں رہتا، کہ عرب جاہلیت میں ایک ایسا زمانہ گذرا ہے، جس میں بچے کا حقیقی باپ نہیں ہوتا تھا، بلکہ کوئی مرد مذکورۂ بالا طریقوں سے اُس کو اپنا متبنّیٰ بھی نہیں بناتا تھا۔ اس کی وجہ خواہ "نکاح مشارکت" کا رواج ہو یا کوئی دوسری وجہ، جسکو ہم نہ جانتے ہوں۔ لیکن "نظامِ اسومۃ" کے قائم کرنے، اور صرف ماں تک رشتہ قرابت منحصر رکھنے کی بنیاد اسی اُصول پر ہے۔

راقم

محمد اختر۔ حیدرآباد دکن۔

# شاعری

شعر کی کامل تعریف میں شعرائے کاملین کسقدر نالاں ہیں۔ مگر عام مذاق کے موافق یہ تعریف کافی ہو سکتی ہے کہ شعر وہ چیز ہے، جو طبیعت میں اُمنگ۔ جوش، سرور اور فرحت پیدا کرے، اور یہ تعریف اُسی نظم کے لئے موزوں ہو سکتی ہے، جس سے اس قسم کی خوشیاں حقیقۃً پیدا ہوں، اور جسکے سُننے سے دماغ پر گرانی نہو۔

**نظم**۔ مصرعوں یا کڑیوں سے جکڑی ہوتی ہے، مگر وہ کڑیاں نظم کی بازو ہی تو ہیں، رُوحِ رواں نہیں ہیں۔ نظم۔ مخالفِ علم یا حکمت ہے، اور نثر مخالفِ وزن۔ علم کا مقصود یہ ہے کہ اُس سے اکتساب یا شیوعِ صدق ہو۔ نظم کا مآل یہ ہے کہ اُس سے فوری جوش یا انبساط حاصل ہو نظم اُسے کہتے ہیں، جس سے وُہی اضطراب، وہی اُمنگ، وہی ولولے، وہی درد، وہی حرکت سامع کے دل میں بھی پیدا ہو، جو ہنگامِ نظم شاعر کے دل میں پیدا ہوتی ہیں۔ نظم ایک اثرِ روحانی کا نام ہے، جسمیں نشاط انگیز، اور درد خیز دونوں مادے موجود ہیں۔ مگر نظم سے یہ باتیں کیونکر حاصل ہوسکتی ہیں؟ کسی مغموم یا شکستہ شے کو دیکھکر دل بھر آتا ہے، کسی دلگداز افسانہ کو سُنکر قلب اُمنڈ آتا ہے، کسی معرکہ کو دیکھکر کلیجہ ہاتھوں اُچھلنے لگتا ہے۔ تغیّراتِ عالم پر نظر ڈالنے سے تصویرِ عبرت اِن نظارہ باز آنکھوں کے آگے پھر جاتی ہے۔ کسی المناک منظر کو دیکھکر آنکھیں نمناک ہوجاتی ہیں۔ اِن کے علاوہ بہت سے ایسے اسباب ہیں، جو دل کو اُبھارتے اور بٹھاتے ہیں، مگر ایسی چیزوں، حکایتوں یا نظاروں کو ہم نظم نہ کہینگے۔ بہت سی دلکش نقلیں، اور ظریفانہ داستانیں جو رشتۂ نظم سے وابستہ ہیں، تماشہ گاہوں میں دلوں پر مضبوط اثر ڈالتی ہیں، اسوجہ سے کہ وہ جلسوں، اور محفلوں کی تصویریں اُتار کر پردۂ نظر میں چپکا دیتی ہیں، مگر انھیں بھی ہم نظم نہ کہینگے اِسیطرح کسی شور انگیز بیان کو بھی ہم نظم نہ کہینگے، گو اُس میں اثر قریب قریب نظم کے پیدا ہو۔ اشعار میں چند الفاظ اِسطرح کلیجہ مسل دیتے ہیں کہ ویسا اثر نہ تو رستم یا نپولین کی بہادری۔ نہ اسپین کی خوفناک آتشزدگی۔ نہ ہمالیہ اور نہ ایلپس پہاڑوں کے سین سے پیدا ہوتا ہے، تاہم انھیں ہم نظم نہ کہینگے۔ سچا رنگین نگار نثار، جو مضامین کے پھولوں کا چمن لگا دیتا ہے اگر وہ اپنے اصلی رنگ پر جا رہے، اور اپنے جادو طراز قلم کی شگوفہ کاریوں سے نیچر کی بہار افزا رنگینیاں دکھائے تو وہ ایک لطفِ خاص اور اثرِ شاعرانہ پیدا کریگا، مگر اُنھیں ہم نظم نہ کہینگے۔

لیجئے اب اِن باتوں سے شاعری کی قدر و منزلت اور دوبالا ہوتی جاتی ہے۔

**شاعری**۔ ایک خلقی قوّت کا نام ہے، جو خود موجد ہے، مقلّد نہیں۔ مگر ارسطو نے ایک مقام پر

اس کی تعریف تقلید بیان کی ہے، نہ اس خیال سے کہ وہ نیچر کا چربہ اُتارتی ہے، بلکہ اِس لحاظ سے کہ مرقع اُسکے پیش نظر ہے، اور وہ نک سک تک تصویر پوری نہیں کھینچ سکتی ہے۔ لارڈ بیکن کا قول ہے کہ شاعری دل کو اُبھارتی، بلند کرتی، اور انبساطِ خاطر کے لئے صورتِ شی آنکھوں کی آگے پیش کر دیتی ہے۔ خیال اُس نمایش کو بدل دیتا یا بڑھا گھٹا دیتا ہے، اور شاعری وہ صورتیں یا شکلیں کھڑی کر دیتی ہے، جو اِس تراش خراش سے پیدا ہوتی ہیں۔

شاعری سے تین طرح کی مسرتیں حاصل ہوتی ہیں۔ ایک حرکت یا جوشِ قلب، دوسرے خیال کی تگ و دو۔ اور تیسرے خوبیٔ انشا سے۔

پہلی دو صفتیں انبساطِ شاعرانہ کے لئے بہت ضروری ہیں۔ اب دیکھنا چاہیے کہ یہ مسرت کس شے سے حاصل ہوتی ہے، اور اسکا ماخذ کیا ہے۔ وہ قوتیں ہیں، اور مختلف ہیں، حظِ شاعری کے لئے ایسی قوتوں کی کہیں کم کہیں زیادہ ضرورت ہوتی ہے، اور خاص شعرا میں بھی کسی میں یہ قوت زیادہ اور کسی میں کم پائی گئی ہے، مگر کل قوتیں ایک شاعر میں مجتمع نہیں دیکھی گئیں۔

**خیال**۔ اعلیٰ درجہ کی قوتِ شاعرانہ کا نام ہے۔ یہ متحرک اور موجد ہے اور اُن اسباب سے جنکا وجود پیشتر سے ہے، نئی نئی باتیں اور سچائیاں نکال لیتا ہے۔ یہ ایک مرکب قوت ہے، اور اس میں وہ قوتیں بھی شریک ہیں، جنھیں عالمانِ علوم عقلی۔ ادراک۔ تصور اور عقل کہتے ہیں۔

پہلی قوت اُس چیز کی صورت نمائی کرتی ہے، جسے ہم سمجھ سکیں۔ دوسری قوت منتخب اجزا کو اُن خاصیتوں اور کیفیتوں سے جدا کر دیتی ہے، جن سے وہ اِس عالم میں وابستہ ہیں۔ تیسری قوت صرف اسباب منتخب کر لیتی ہے۔

شاعری میں خیال کی شگوفہ کاریاں انواع واقسام کی ہوتی ہیں، یہ ہر رنگ اور ہر لباس میں نظر آتا ہے، کبھی سرو کو معشوق کے قدِ رعنا سے تشبیہ دیتا ہے، کبھی گل سے جامۂ عاریت مانگتا ہے اور زلفِ سنبل میں الجھا رہتا ہے۔ کبھی ماہوشوں کے کمندِ گیسو سے فرشتوں کو عرش سے کھینچ لاتا ہے، اور جھوٹی باتوں کا طومار باندھ دیتا ہے، کبھی بیابان میں روحِ مجنوں سے باتیں کرتا ہے

اور ناقۂ لیلےٰ کی سار بانی کرتا ہی، کبھی محفلِ وعظ، یا بزمِ رنداں میں صدر میں جگہ پاتا ہی، کبھ
بہ چمنِ عالم میں شور کرنے لگتا ہے، کبھی اپنی جان سے عاری ہو جاتا ہے، کبھی ایسا سرگ
کرلب سے لب[2] نہیں ملتے، اور کبھی شیریں دہنوں کے وہ بوسے لیتا ہے کہ لب سے لب
ہونٹے[3]، کبھی اپنی ہرزہ سرائی[4] پر خود پشیمان ہوتا ہے، کبھی ایک جزوِ کلام کو دوسر
مقدم کرتا ہے، کبھی جزوِ مؤخر کو مقدم کر دیتا ہے، کبھی الفاظ میں مشابہت پیدا کر
کلام میں ایسی چیزیں آمیختہ کر دیتا ہے کہ آپس میں[5] متناسب ہوں، کبھی گہوارہ میں خ
اور رروشن آواز[6] میں بچوں اور شیر خواروں کیطرح رونے لگتا ہے، کبھی ترجیع بنا
رہتا ہے۔ **واقف** پٹیالوی سے۔

"گہ با تو بنو دسے آشنا دل ‏ رُسوا نشدسے ہزار جا دل
نالم کہ چرا اسیر دم اسے واے ‏ با ہمچو تو شوخ سیرزا دل
من عشق نمی شناختم چیست ‏ افگند مرا درین بلا دل
برحالِ خرابِ من نظر کن ‏ ویرانہ ببین زدیدنِ تا دل
از روزنِ سینہ دل نگاہم ‏ بنگر کہ غمت چہ کرد با دل
چوں یافتم آنکہ بر درِ تو ‏ ہرگز نہ رسد بہ مدعا دل

بنشینم و ترکِ عشق گویم
دست از تو بہ آبِ دیدہ شویم"

اُسپر قیامت کی مستزاد شوخیاں کرتا ہے۔ **صیدی** سے۔

"دل برد زمن خوش پسرے ماہ لقائے ‏ مثلِ مہِ کنعاں
شیریں دہنے عشوہ گرے شوخ بلائے ‏ سرِ فتنۂ دوراں

---

لہ سجع - سّہ واسع الشفتین - سّہ واصل الشفتین - سّہ مہملہ - شہ مراعات النظیر
سّہ براعۃ الاستہلال -

نوشیں لبِ او قوتِ دل و قوّتِ جانہا  چوں بادۂ گلگوں
زلفِ کجِ او فتنہ گرے ہوش ربائے  غارتگرِ ایماں
صد پارہ شود گر تنم از تیغِ جفایش  ہر روز دو صد بار
یا بند زہر پارۂ او بوسے وفائے  زاں مہرِ درخشاں
پیوستہ بہ ہر برگ بود بوئے وفایش  از خونِ دو دیدہ
از تربتِ من گر بدمد شاخِ گیاہے  در فصلِ بہاراں
صیدی شدہ از عشق چناں زار کہ آخر  ای نورِ دو دیدہ
جز داروئے جاں نیست دگر ہیچ دوائے  ہیہات چہ درماں ''

کبھی سرگرمِ مناظرہ رہتا ہے۔ مُلّا اُنسی۔ ؎

'' دوش در مجلسِ احباب گل و مُل باہم  میزدندے ز مُباہات دم از فخر و کرم
ہر دو را در شرفِ خویش کتابی روشن  ہر دو را در ہنرِ خویش دلیلے محکم
مُل زد و شد لی انداخت بہ خورشید کلاہ  گُل ز خوبیِ رُخ انداخت بعیّوق علَم
مُل برآشفت کہ آنجا کہ منم جلوہ فروش  ہر طرف قافلہ بر قافلہ لطف ست و کرم
مور از تربیتم مُہرہ رباید از مار  روبہ از تقویتم پنجہ زند با ضیغم
چوں نہ نازم کہ خداوندِ جہاں در قرآں  نامِ نامیِ من و نفعِ مرا کرد رقم
گُل بخندید کہ ای خیرہ ہم اندر قرآں  از خبیثات تُرا گفت خدائے عالم
اِنَّمَا الْخَمْرُ۔ تُرا سلسلۂ گردن شد  آیتِ فَاجْتَنِبُوْا کردہ و ہرت ملزم
آنکہ دریافتہ بوئے تو نَعُوْذُ بِاللّٰہ  منقبض گردد و لاحول کناں گیرد رم
منم آں پاک کہ چوں بوئے کُنم میگویند  صَلِّ یَا رَبِّ عَلٰی رُوحِ رسولِ اکرم
نازشِ من بود ایں بس کہ مرا جا باشد  بر سرِ زُبدۂ اولادِ رسولِ اعظم ''

کبھی ایّامِ جوانی۔ شورشِ عشق۔ ولولۂ شوق۔ شوخیِ حُسن اور نظر فروزیِ بہار پہ نثار رہتا ہے۔

**فائق سے۔**

"زمانِ بہارست وعہدِ شباب — گناہست ساقی نہ خوردن شراب
مئے لعل در جامِ گلگوں بریز — بہ نوبہ خورشید کن ہم رکاب
اگر نشۂ مئے نہ دارد بسر — چرا لالہ مستست و نرگس خراب
توای زاہد امروز مئے نوش کن — مخور غم کہ فرداست یوم الحساب
بقولِ تو گر مئے حرام آمدست — چرا در بہشت ست جوئے شراب

چہ فصلِ بہارست یارب کہ شد
دلِ **فائق** از آتشِ مئے کباب

کبھی ہمہ تن وہم ہو جاتا ہے، کبھی طعن وتشنیع کا بادل بنکر اُمنڈ آتا ہے، اور سہامِ ملامت برسانے لگتا ہے، کبھی اخلاق ومتانت وسنجیدگی کی مقطع اور نورانی پوشاک پہنکر آتا ہے، کبھی انسان کے حالات، واقعات اور اوضاع کا مرقع پیشِ نظر کر دیتا ہے، کبھی تہجین کرتا ہی تو کبھی تحسین۔ غرض مختلف صورتوں اور انواع اداؤں میں جلوہ گر ہوتا ہے۔

خیال کسیقدر فکر سے ہم آغوش ہو کر جس میں تھوڑی بہت قوتِ شاعرانہ بھی شریک ہو، سلمائی سخن پر اس عنوان کی شاعری کا غازہ مل دیتا ہے، جسے عقلا اور اربابِ ہنر زیادہ پسند کرتے ہیں، مگر وہ عام دلوں کو اپنے قابو میں نہیں کرتا۔

نکتہ داں تعریفِ فکر وخیال میں کسیقدر عاجز آجاتے ہیں۔ فکر کا کام یہ ہے کہ وہ نیچر کے دنیاوی جز کو نشاط آگیں بنائے، اور خیال ازلی یا ابدی جز کو روکے یا سنبھالے رہے، یہ نہایت ہی بال سے باریک اور پیچیدار تعریف ہے، مگر ایک فلاسفر نے دوسرے الفاظ میں یوں تعریف کی ہے کہ:۔

فکر اصلی رائی کو بدل دیتی ہے یا نئے سر سے اُسے گڑھ کر چند غیر ضروری اشیا سے وزنی بنا دیتی ہے۔ خیال اُسے یوں ہی رہنے دیتا ہے، اُس میں ہاتھ تک نہیں لگاتا

مگر اُسے ایسی چیزوں سے دست و گریباں کر دیتا ہے، جو آپس میں متناسب ہوں۔
خیال۔ ذہن۔ ارادہ اور عقل کے اثر سے پیدا ہوتا ہے، جسکے باعث ہم نتیجہ صحیح نکال سکیں نظمِ فکرِ صحیح وہی ہے، جو ایسے خیال سے پیدا ہو۔ اکثر فلاسفروں نے خیالی مسرت کے ساتھ وہ مسرت بھی ضم کر دی ہے، جو بہ آسانی قوتِ مُدرکہ سے پیدا ہوتی ہے۔ خیال شاعری کی جان ہے، اظہارِ سوزش و درد، شوق و تحمل و صبر، اسکے بہار جیسے ہیں۔ سیدھی سادی نظم پر ان کا افسوں خوب چلتا ہے، اور ہر طبقہ اور ہر مُلک کی شاعری میں اِنھیں کی سلطنت ہے۔ باوجودیکہ اس طرز کی شاعری دلپسند ہے، پھر بھی قابلِ قدر نہیں۔ اِس سے مسرتِ خالص نہیں حاصل ہوتی؛ ہاں خاص خاص جوشوں کے باعث دل میں ایک حرکت ہو جاتی ہے، مگر کیفیت خاص نہیں پیدا ہوتی، یہی وجہ ہے کہ قبولیتِ عام معیارِ خوبیِ شاعری نہیں۔ منصف طبع اُسی کو شاعری کہیگا جو اُسکے دل میں اثرِ جذب پیدا کرے، مگر جوشِ قلب اور دلی جذبات مؤثر زبان میں ادا کرنے کے لئے بڑی شاعرانہ قابلیت کی ضرورت ہے۔ اظہارِ عشق و محبت، شکوۂ فراق، ہائے وائے کا غُل، ناصح کی مذمت، شبِ وصل کا اختصار، بیوفائیوں کا گلہ تو شاعروں کی گھٹی میں پڑا ہی؛ مگر اس میں شک نہیں کہ ایک مسرت اور کیفیتِ خاص وُہی ہے، جو بندشِ کلام اور چستیِ الفاظ سے پیدا ہوتی ہے، اور یہ باتیں آرایشِ نظم کے لئے ویسی ہی ضروری ہیں، جسطرح کسی معشوقِ سیمیں بدن کو جڑاو گہنے کی ضرورت ہوتی ہے۔

بندشِ الفاظ جڑنے سے نگوں کے کم نہیں
شاعری بھی کام ہے آتش مرصع کار کا

کلام کو اِن باتوں سے ضرور مُعرّا ہونا چاہیئے۔ مناقصہ نہو، یعنی دونوں مصرعوں میں اختلاف بلندی و پستی نہو۔ تقدیم و تاخیر کا بھی لحاظ رہے، یعنی مصرعۂ اوّل کا مضمون مصرعۂ ثانی میں، اور مصرعۂ ثانی کا مضمون مصرعۂ اوّل میں نظم نہو، تعقید کا بھی مرض نہو، اور اختلالِ الفاظ سے ترکیب غیر ظاہر الدلالۃ نہو، بقول شخصے ع۔ "خانۂ مُلّاح در چین ست و کشتی در فرنگ"

ضعفِ تالیف سے بھی دُور بھاگے، الفاظ خلافِ محاورہ نہ استعمال کرے، تنافُر سے بھی پناہ مانگے کہ سامع یا خود شاعر کو الفاظ ثقیل یا گراں معلوم ہوں، غرابت سے بھی اپنی جان بچائے، یعنی کلم غیر مانوس الاستعمال سے پرہیز کرے، اغلاطِ کلام سے بہت ڈرے۔ الفاظ و ترکیب میں غلطیاں نہ واقع ہوں، توارُد و سرقۂ بالعمد سے محفوظ رہے۔ ایطائے جلی سے بھی کوسوں دُور بھاگے، محذوفات و مقدرات سے بھی حذر کرے، تخلیع کا بھی خیال رکھے، اوزانِ نامطبوع ثقیل الارکان کو بھی سلام کرے۔ غرض نظم میں جب تک یہ صفات نہونگی، وہ شہرتِ دوام کی ہمیشہ محتاج رہیگی، اور ہرگز روح پرور نہوگی سہ

"عیب شاعر کو لگا دیتا ہے آتش نقصِ شعر
داغ جب پھل میں لگا عیبِ شجر میں داغ ہے"

سید علی سجاد۔ (دہلوی عظیم آبادی)

# عالمِ فانی

---

ہے صبح کا وقت کیا سہانا — رنگیں بُلبل کا وہ ترانا
تکبیر کی آتی ہیں ندائیں — ناقوس بھی دیتے ہیں صدائیں
کوئی مسجد کو جا رہا ہے — بُتخانے سے کوئی آرہا ہے
جاتا ہے نہانے کوئی دریا — دُکان ہے کھولے کوئی بیٹھا
کوئی مخمورِ خواب شیریں — ہے جسپہ نثار فر و تمکیں
راحت سے محل میں سو رہا ہے — ڈیوڑھی پہ ہجوم ہو رہا ہے
عریاں اِک فرشِ خاک پر ہے — تکیہ ہے نہ خشت زیر سر ہے
جسنے آنکھوں میں رات ساری — مرکھپ کے کسیطرح گزاری

لو چمکی وہ دھوپ بام و در پر — ہے بارشِ نور ہر شجر پر
بھولے سب رات کے فسانے — پھر کھل گئے بند کارخانے
ہنگامۂ حشر پھر ہے برپا — پھر ہونے لگا وہی تماشا
شادی گھر میں کہیں رچی ہے — ہے عیش و نشاط، خرمی ہے
کوئی بیٹھا ہے سلطنت پر — گھیرے ہیں اسے رفیق و یاور
کوئی مسند پہ جلوہ گر ہے — دین و دنیا سے بے خبر ہے
آنکھیں مخمور، ہوش زائل — عیش و عشرت پہ دل ہے مائل
ساغر سے لڑی ہوئی نگاہیں — ٹھنڈی سانسیں ہیں اور آہیں
یوں کٹتی ہے پاک زندگانی — چلتی ہے شرابِ ارغوانی۔
جیئے کوئی، یا مرے، انھیں کیا — پابندِ بلا رہے، انھیں کیا
عیش و عشرت سے کام ان کو — فکرِ عقبیٰ حرام ان کو
اک پھرتا ہے چیتھڑے لگائے — کیونکر اُسے پھر نہ رحم آئے
دانہ پانی نہیں میسّر — ہے کلمۂ یاس خشک لب پر
اک خاک پہ ہائے لوٹتا ہے — تقدیر پہ اپنی رو رہا ہے
اک بند ہے قلعۂ کہن میں — اور ہاتھ ہیں حلقۂ رسن میں
دھری پاؤں میں بیڑیاں ہیں — آفت کی یہی نشانیاں ہیں
مردہ بچہ کہیں پڑا ہے — ماں فکرِ کفن میں مبتلا ہے
دادی آنسو بہا رہی ہے — نانی بھی پچھاڑیں کھا رہی ہے
فاقہ گھر میں ہے تین دن سے — جب بھیک ملے تو لاش اُٹھے
یہ لیل و نہارِ آسماں دیکھ — عبرت کا محل ہے، دیکھ، ہاں دیکھ !!
فانی دنیا کا یہ چلن ہے — شادی ہے کہیں، کہیں محن ہے

لیکن آنکھوں سے جو نہاں ہے — جسکے قبضے میں دو جہاں ہے
ہے جس سے پھری نظر ہماری — لیتا ہے وُہی خبر ہماری

سجاد - از عظیم آباد -

# رپڑی

(ضلع مین پوری)

شکوہ آباد ضلع مین پوری کی تحصیل میں جمنا کا کنارہ خوبی منظر اور حُسنِ سواد کے اعتبار سے نظر فریب عالم رکھتا ہے، لُطفِ شکار اُس کی دلچسپیوں کو دوبالا کر رہا ہے - اُس شعر کا لُطف نہیں بھولتا، جو وہاں سے ایک عزیز نے دعوتِ شکار کے عنوان پر لکھ بھیجا تھا ؎

ہمہ آہوانِ صحرا سرِ خود نہادہ بر کف — بامیدِ آنکہ روزے بشکار خواہی آمد

وعدے کا انتظار، اور متعدد وعدوں کا ٹلنا دوسرا مصرع کس خوبی سے ادا کر رہا ہے - صدہا برس سے بارش کا پانی کنارۂ مذکور کی چھاتی پر آرے چلا رہا ہے، جسکے اثر سے ہزاروں چاک اُس کے سینے پر نظر آتے ہیں، اس طرح جو نشیب و فراز پیدا ہوا ہے، اُسنے کناروں کو پہاڑوں کا نمونہ بنا رکھا ہے - اِن کھڈوں میں چکارہ ہرن کا چڑھنا اُترنا وادیوں میں دلآویز رفتار سے دوڑنا نظر کی جیتی جاگتی تصویر ہے - گذشتہ سرما کے چند روز ہیں نے اِس میدان کے شکار میں صرف کئے، ایک روز چکارہ اور لوے کی تلاش صحرا نوردی و بادیہ پیمائی میں مشغول کئے ہوئے تھی، کہ ایک ایسا منظر نظر کے سامنے آگیا، جو اپنی نوعیت میں گرد و پیش کے عالم سے بالکل ممتاز تھا - یعنی رفیع الشان عمارت کے کھنڈر دُور سے نظر آنے لگے - نگاہ کے ساتھ دل اُن کی طرف متوجہ ہوا، اور توجہ نے استفسارِ حال کیا - معلوم ہوا کہ قصبہ رپڑی ہے - یہ سُنکر شکار کے خیالات دماغ سے جُدا ہونے لگے، اور اُن کی جگہ شوقِ آثارِ قدیمہ لینے لگا - موقع پر پہونچکر

ایک وسیع قبرستان ملا جس میں صدہا سنگین، اور پختہ قبریں بنی ہوئی تھیں، شہر خاموشاں کا سکوت اور وقار ہمیشہ دلوں پر اثر کرتا ہے لیکن ان کے سکوت کی تاثیر گرد و نواح کے سناٹے کے ساتھ مل کر بہت زیادہ قوی ہو گئی تھی، قیامت یہ کہ اُن کی خاموشی صدای صبر آزمائی دے رہی تھی۔ قبروں کی حالت سنگِ مزار کی صفائی و موزونی کہتی تھی کہ ہم ذی مرتبہ لوگوں کے آرام گاہ ہیں۔ مگر گمناموں کے نام پوچھو، تو خاموش۔ بیسیوں قبریں دیکھیں، کتبہ اور کتابہ نام کو نہ ملا۔ آخر نگاہِ شوق اُس احاطے کی طرف بڑھی، جو وسطِ گورستان میں بنا ہوا ہے، اور جسکے اندر سے گنبد گویا صلائے زیارت دے رہے تھے۔ شوق اِس خیال سے بے چین ہوا کہ اس میں ضرور بے نشانوں کا نام و نشان ملیگا۔ وہاں پہونچکر دیکھا کہ ایک وسیع احاطہ قبروں سے معمور ہے، غربی حصے میں دو سنگین روضے بنے ہوئے ہیں۔ ان کی جالیاں سنگِ سُرخ کی ہیں، اور گنبد گچ کے۔ گنبدوں کا بھاری پن اُس طرزِ عمارت سے ملتا ہوا ہے، جو عہدِ مغلیہ سے پیشتر مسلمانوں میں رائج تھے جالیوں کے نفیس جال اور بیل بوٹے سنگ تراشی کے عمدہ نمونے ہیں، ہر ایک گنبد کے نیچے دو یا تین پختہ قبریں ہیں۔ شرقی روضے کے پشت پر جنوب کی جانب پختہ فرش پر چند قبریں ہیں منجملہ اُن کے ایک قبر کا اعتقاد سب سے زیادہ دلوں کو گرویدہ کئے ہوئے ہے، ناکامی مایوسی بن گئی، جب یہاں بھی لبِ گور پر مُہرِ سکوت دیکھی، یعنی باایں ہمہ اہتمام لوحِ مزار نقشِ مدعا سے سادہ تھے۔ فاتحہ پڑھی اور مایوس باہر نکل آیا۔ نکلتے نکلتے ایک پختہ دیوار نظر آئی، جاکر دیکھا تو عیدگاہ کا قبلہ رُخ پردہ تھا۔ اُس وقت کی مسرت بیان کے امکان سے باہر ہے، جب اُس دیوار پر بڑا سا سنگین کتبہ نظر آیا خط کی کہنگی اب بھی شوق کی سدِ راہ تھی۔ آخر اینٹوں کے ایک انبار پر چڑھ کر شکار پارٹی نے پڑھنا شروع کیا، کسی لفظ کو کوئی نکالتا تھا، اور کسی لفظ کو کوئی، جب کوئی مشتبہ لفظ صاف ہوتا تو ایک نعرۂ مسرت بلند کیا جاتا، بالآخر سارا کتبہ پڑھ لیا گیا، کوشش کا پھل ذیل کی عبارت ہے۔

"بنای این بقعۂ شریف بتوفیق یزدانی و تائید سبحانی و فضل ربانی در عہدِ خلافت سکندر الثانی علاء الدنیا والدین المخصوص بعنایت اللہ رب العالمین ابو المظفر محمد شاہ السلطان ناصر امیر المومنین

ونوبت ایالت ہند کمینہ غدا الگانی کافور سلطانی تقبل منہم واحسن اللہ جزائہم فی المنتصف من الشہر المبارک رمضان عظم اللہ حرمتہ سنتہ احدی عشر سبعمائتہ ۷۱۱ھ ،،

اس عبارت سے واضح ہوگا کہ چھ سو گیارہ برس ہوئے سلطان علاء الدین خلجی کے عہد میں اُس کے سربرآوردہ امیر ملک کافور (فاتح دکن) نے یہ عیدگاہ بنوائی تھی، سارا حصہ فنا ہوگیا، یہ دیوار قائم ہے، بارش کے ہزاروں حملے اُس پر ہوئے ہیں، تاہم وہ قدم جمائے میدان میں کھڑی ہے، پلاستر اکثر جگہ سے اُکھڑ گیا ہے، مگر کسی اینٹ نے اپنے موقعہ سے جنبش نہیں کی، گرونہ پر نیلی چینی کی تختیاں لگی ہیں، اُن کے نیلے رنگ کی آب و تاب صاف کہہ رہی ہے کہ کاریگر نے ابھی ہاتھ اُٹھایا ہے۔ عیدگاہ نے تو دل خوش کیا، لیکن روضوں میں آرام کرنے والوں کے حال پر سے پردہ نہ اُٹھا۔ رڑکی والوں سے پوچھا، تو جوش خوش اعتقادی بہت کچھ ظاہر کیا، لیکن حال اِس سے زیادہ نہ کہہ سکے کہ پختہ فرش والی قبر قتا شاہ کی ہے۔ باقی رہا یہ امر کہ وہ بزرگ کون تھے، کب تھے، کس سلسلے کے تھے، یہ کچھ نہ کھلا۔ یہاں چلے آنے پر بھی تلاش کی خلش دل میں رہی۔ کتابیں دیکھیں، واقف کاروں کو خط لکھے، ٹھیک پتا نہ چلا۔ جوئندہ یابندہ۔ پانچ مہینے کی تلاش کے بعد ایک بزرگ* کی توجہ سے حال معلوم ہوا اور جیسا دل چاہتا تھا، ویسا ہی معلوم ہوا۔

جن بزرگواروں کے وہ مزار ہیں، اُن کا اصل مسکن برناوہ ضلع میرٹھ تھا۔ وہاں کے ایک بزرگ علاء الدین چشتی نے اگلے زمانے میں "چشتیہ بہشتیہ" ایک کتاب لکھی ہے۔ اُس میں رڑکی کے مزاروں کا حال بھی درج ہے، اُس کی عبارت فارسی کا خلاصہ متعلق مقام یہ ہے۔

مخدوم شیخ بدرالدین صاحب ولایت حضرت ابو ایوب انصاری کی اولاد میں ہیں، جو جلیل القدر صحابی تھے، یہ حضرت نصیر الدین چراغ دہلی کے خلیفہ تھے، سو برس سے زیادہ عمر پاکر ۸۸۰ھ ہجری میں رحلت کی، ان کا مزار برناوہ کے متصل ہنڈن ندی کے کنارے پر ہے اُن کے صاحبزادہ نصیر الدین بزرگ تھے۔ یہ اپنے والد کے خلیفہ اور مرید ہیں۔ ۱۱۔ ذی حجہ روز

* سید علیم الدین صاحب امام آستانۂ سلطان نظام الدین اولیاء دہلی۔

یکشنبہ کو ۸۴۹ھ ہجری میں انکا انتقال ہوا۔ شیخپورہ راپڑی کے مزار میں اِن کی قبر بڑے سنگِ سُرخ
کے گنبد کے نیچے ہے۔ اِن کے دو بیٹے تھے۔ علاءالدین عرف شیخ بڈھن۔ وفات ۲۰۔ شوال
۸۶۳ھ ہجری، روز دوشنبہ۔ اِن کی قبر اپنے والد کی قبر کے متصل سنگ سُرخ کے گنبد کے
نیچے ہے۔ دوسرے شیخ فریدالدین عرف شیخ فدو۔ وفات ۱۴۔ شوال ۸۷۵ھ ہجری۔ انکی
قبر احاطے کے شمالی دیوار کے متصل اپنے والد کے مزار کے پسِ پشت واقع ہے۔ ان کا آستانہ
زیادہ مشہور ہے۔

بزرگانِ بالا کے علاوہ شیخ زکی الدین۔ قاضی عبدالملک (جو قاضیان بزناوہ کے
جدِ اعلیٰ ہیں)، خواجہ ابوالعلیٰ وغیرہ بزرگوں کی قبریں بھی اس احاطے میں ہیں۔ دونوں گنبدوں
کے بیچ میں مخدومۂ جہاں بنتِ شیخ ابوالاعلیٰ کی قبر ہے۔ انتہی خلاصہ چشتیہ بہشتیہ۔

شیخ فدو علیہ الرحمۃ کی قبر کا جو نشان مذکور ہوا اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ شرقی گنبد
شیخ نصیرالدینؒ کے مزار کا ہے، اور غربی اُن کے صاحبزادہ شیخ علاءالدین کے مزار کا۔ قصبہ
سے غربی جانب ایک شکستہ وسیع مسجد ہے، جو کسی زمانے میں جامع مسجد تھی، اسکی چھت اور
محرابیں شکستگی کی نظر ہو چکی ہیں۔ مگر کتبہ کے ٹکڑے مسجد کے ایک گوشے میں رکھے ہیں، انکی عبارت
باوجودِ سعی پوری نہیں پڑھی گئی۔ جو کچھ پڑھی گئی اُس سے مفہوم ہوا کہ سلطان محمد شاہ غازی کے زمانے
میں یہاں ہندوؤں سے سخت معرکہ پڑا تھا (اس معرکے نے غالبًا مذکورۂ بالا گورستان کی آبادی
میں معتدبہ حصہ لیا ہوگا) شکرانۂ فتح میں بُت خانہ توڑ کر اُس کی جگہ یہ مسجد بنائی گئی۔ فاتح کا نام
نظام الملک لکھا ہے۔ مسجد کی عمارت میں بُت خانہ کے پتھر جا بجا نظر آتے ہیں۔ قصبہ ریپڑی کا ذکر
(بنام رابری) ابن بطوطہ نے سفرنامہ کی جلد دُوم میں، اور ابوالفضل نے آئین اکبری میں (بہ ضمن
صوبہ آگرہ) کیا ہے*

آج یہ قصبہ ویران اور تباہ ہے۔ تاہم سادات، شیوخ اور پٹھانوں کے خاندان اُس میں

* ابوالفضل کے بیان سے واضح ہوتا ہے کہ عہدِ اکبری میں خشتِ پختہ کا قلعہ یہاں بنا ہوا تھا۔ ۱۲

آبا ذہیں، اور جہانتک سُنا گیا، اُنھوں نے اپنے نسب کو محفوظ رکھا ہے، ایک شخص کی زبانی یہ سُنکر دل کو خاص مسرت ہوئی کہ وہ شروانی پٹھان تھا، اس سے بھی زیادہ خوشخبری یہ تھی کہ ہمارا کالج اپنا فیض اس ویرانہ کو بھی پہونچا رہا ہے۔ تعلیمی حالت دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ وہاں کا ایک لڑکا کالج میں پڑھتا ہے۔ دیوبند کی برکت بھی پیچھے نہیں ہی۔ وہاں کے ایک صاحب مدرسۂ مذکور میں فارغ التحصیل ہوئے ہیں۔ افسوس ہے کہ وہ اُس ماننے میں باہر تھے ورنہ نیاز حاصل کرتا۔

شروانی

بھیکن پور ضلع علی گڈہ۔ یکم جولائی ۱۹۰۱ء۔

# توسیع یونین کلب مدرستہ العُلوم علیگڈہ

(از آنریری منیجر)

ماہِ دسمبر گذشتہ میں جب علیگڈہ منتھلی کے ذریعے سے توسیع یونین کلب کی تجویز پبلک میں پیش ہوئی، تو خیال تھا کہ غالباً پانچ ہزار روپئے میں کالج کی یہ بڑی ضرورت رفع ہو جائیگی۔ اس میں سے مبلغ ایکہزار روپیہ یونین اپنی بچت میں سے دیسکیگا، اور باقی چار ہزار کیواسطے اولڈ بوائز و دیگر ہمدردانِ کالج سے اپیل کیا گیا تھا۔ الحمدللہ کہ ہمدردانِ کالج کی توجہ سے یہ تجویز تقریباً تکمیل کو پہونچ گئی، یعنی مبلغ ایکہزار روپیہ مولوی عبدالجبار صاحب وکیل ہائی کورٹ حیدرآباد نے دینے کا وعدہ فرمایا جس میں سے مبلغ ۵۰۰ روپیہ دو اقساط میں اُن سے وصول ہو گیا، اور باقی روپیہ بھی وہ عنقریب عنایت کرینگے، اور مبلغ تین ہزار روپیہ کرنیل عبدالمجید خاں صاحب فارن منسٹر پٹیالہ کی توجہ سے ہز ہائنس نواب صاحب بہادر مالیرکوٹلہ نے عطا فرمایا۔ مگر انسان کا خاصہ ہی کہ جسقدر اُس کی اُمیدیں پوری ہوتی ہیں، اُسیقدر اُسکا حوصلہ بڑھتا ہے، اب جو عمارت کا نقشہ بنوایا گیا اور اُس کے صرف کا باقاعدہ تخمینہ کیا گیا، تو معلوم ہوا کہ کالج کی شان اور ضرورت کیموافق عمارت کی توسیع میں مبلغ ساڑھے سات ہزار روپئے کی ضرورت ہوگی

اس میں سے پانچہزار کا بندوبست ہو چکا ہے، اور ڈھائی ہزار روپے کیواسطے پھر دستِ طلب
دراز کرنے کی ضرورت ہے۔ جب توسیعِ یونین کا خیال اوّل دماغوں میں آیا، تو خانۂ دوستاں بروب
کے مقولے کے موافق بالخصوص سابق طلبائے کالج ہمارے پیش نظر تھے، اس لئے علاوہ شخصی
کے ذریعے سے اپیل پیش کرنے کے تقریباً پانچ سو خطوط طلب اولڈ بوائز کی خدمت میں روانہ
کئے گئے، اور توقع تھی کہ اگر بحسابِ اوسط فی کس ۵/ بھی دیں، تو پانچہزار کی رقم اس مقصد کے
لئے کالج کے پاس جمع ہو جائیگی۔ اور اس چھوٹے کام کے لئے ہم کو پبلک کے سامنے ہاتھ
نہ پھیلانا پڑیگا۔ مگر افسوس ہے کہ طلبائے کالج نے اُس کی طرف پوری توجہ نہیں کی، اور
دو ہزار سے زیادہ اولڈ بوائز میں سے صرف آٹھ نے اس وقت تک پیش قدمی کی ہے۔
مگر دُنیا بامید قائم ہماری ابھی تک اُن ہی کیطرف آنکھیں لگی ہوئی ہیں۔

عموماً کہا جاتا ہے کہ جدید تعلیم نے مسلمانوں میں سے ایثار کا مادہ کم کر دیا ہے، اور اُن میں خود غرضی
پیدا ہو گئی ہے۔ اُن کے مصارف اِسقدر بڑھ جاتے ہیں کہ اُن کو اپنی ذات سے فرصت نہیں ملتی قوم
یا ملک کی کیا خبر لیں، یہ بھی سُنتے ہیں کہ جب سرسید نے اوّل کالج کا خیال دماغ میں پکایا، تو
مسلمان انگریزی تعلیم کو کفر سمجھتے تھے، اور اس قسم کی تلقین کرنے والے کو کافر مطلق جانتے تھے
بایں ہمہ اُن فیاض طبع لوگوں نے لاکھوں روپیہ کالج کو دیدیا۔ سرسید کے رفقا اکثر ملازمت پیشہ اور
متوسط الحال لوگ تھے، جنکی آمدنیاں موجودہ نسل کے لوگوں سے ہرگز زیادہ نہ تھیں، بلکہ اُس زمانہ
میں اس درجہ کے سرکاری عہدوں کا دروازہ ہندوستانیوں کے لئے کھلا بھی نہ تھا، ڈپٹی کلکٹری
اور صدر الصدوری اُن کا معراجِ کمال تھا۔ مگر پھر بھی وہ لوگ لنگوٹی میں پھاگ کھیلتے تھے، اور
کبھی دستِ سوال کو رد نہ کرتے تھے، اب خدا کے فضل سے خود کالج کے طلبا میں تحصیلدار،
منصف، ڈپٹی کلکٹر، اکسٹرا اسسٹنٹ کوڑیوں موجود ہیں، وکیلوں کی بھی کمی نہیں۔ بعض اُن
میں سے جج اور بعض بیرسٹر بھی ہیں۔ غرضکہ ہر صیغے میں اعلیٰ عہدوں پر ممتاز ہیں، اور علاوہ اسلامی
تعلق کے کالج سے متمتع بھی ہوئے ہیں مگر پھر بھی اُن سے کالج کو اسقدر مالی مدد نہیں ملی جسقدر کہ

پہلی نسل کے لوگوں نے سرسید کو باوجود کفر کے فتووں کے دی تھی، اور اب بھی جو کچھ ملتا ہے اُن ہی پرانی قسم کے فیاض طبع لوگوں سے ملتا ہے۔ معترضین یہ بھی کہتے ہیں کہ نئی تعلیم یافتہ گروہ میں دو قسم کے لوگ ہیں، زیادہ تر وہ کہ جنکو بجز اپنی ذات کے دُنیا و مافیہا سے کچھ تعلق نہیں، اور دوسری وہ قلیل جماعت ہے، جو اظہارِ درد بہت کچھ کرتی ہے، کچھ متحرک بھی معلوم ہوتی ہے، اور ترکِ دُنیا بمردم آموز کے طریقہ پر لوگوں کو ایثار علی النفس کی تعلیم بھی دیتی ہے، مگر جب اُن کی باری آتی ہے، تو سخن دریں ست کی شکل میں پڑ جاتی ہے، اسلئے یہ جماعت بھی ہمارے درد کی دوا نہیں۔ غرضکہ اسی قسم کے بہت سے اعتراض ہیں، جو نئے تعلیم والوں پر کئے جاتے ہیں، اگرچہ ہم چونکہ خود بھی اسی گروہ میں شامل ہیں، دل نہیں چاہتا کہ ان اعتراضات کو قبول کریں، ہمارے نزدیک نئے گروہ کی نسبت ابھی کوئی رائے قائم کرنا قبل از وقت ہے۔ ہم نہیں سمجھ سکتے کہ وہ تعلیم جسکا حبِّ قومی، اوّل سبق ہے، جو اس محبت کو جزو ایمان گردانتی ہے، مشرق میں منتقل ہو کر متضاد اثر کیونکر دکھلائیگی، ہم اس تعلیم کا اثر قیام کالج کے زمانے میں طلبا میں بہت کچھ پاتے ہیں، اور جانتے ہیں کہ ابتدائی اثر بہت دیر پا ہوتے ہیں۔ پھر کوئی وجہ نہیں کہ وہ اثر زمانۂ طالب علمی کے بعد دل سے محو ہو جائے، ہم یقین نہیں کر سکتے کہ وہ طلبا جو ایام طالب علمی میں اسقدر فدائی کالج ہوتے ہیں وہاں سے جانے کے بعد اُسکو بھول جائینگے، اور اگر ایسا ہو تو اس سے بڑھکر کوئی دل شکن بات نہیں ہو سکتی ہے۔ کیونکہ پہلی نسل کے لوگوں کا اب خاتمہ ہوتا جاتا ہے جو کچھ اُمیدیں ہیں موجودہ اور آیندہ نسلوں سے ہیں۔ اور جب اُنکا یہ حال ہو تو بس اب مسلمانوں کا فاتحہ خیر پڑھ لینا چاہیئے۔ مگر نہیں یہ بوڑھوں کے مایوسی بھرے خیال ہیں۔ ہم مُردہ پرست نہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ زمانے کی ترقی کا قدم آگے ہے، اور مسلمان بھی کچھ چونکے ہیں۔ ہم کو حافظ کا یہ شعر بہت پسند ہے ؎

رسید مژدہ کہ ایامِ غم نخواہد ماند      چناں نماند و چنیں نیز ہم نخواہد ماند

ہم کو موجودہ اور آیندہ نسلوں سے اور بالخصوص اپنے اولڈ بوائز سے بہت کچھ اُمیدیں ہیں ہم ع۔ پھر اُسی بیوفا پہ مرتے ہیں، اور اُن ہی سے ہماری ساری اُمیدیں وابستہ ہیں۔ ہم

ہیں کہ وُہی ہمارے اڑے وقت میں کام آئینگے۔ اور اسوقت توسیع یونین کلب کی
ں وُہی تکمیل کو پہونچا ئینگے۔ آخر فتح اُنھیں کے نام رہیگی۔ ہم نہیں چاہتے کہ وہ بڑی بڑی
یں دیں، بلکہ ہماری خواہش ہے کہ خفیف چندوں سے وہ اپنی دلچسپی کا ثبوت دیں،
ں کی نسبت چھوٹی رقمیں ہمیشہ زیادہ مفید ہوتی ہیں۔ اُنکا دینا گراں نہیں ہوتا، اور
ں سے ایک خوان بھر جاتا ہے۔ چونکہ ہمارے چندہ دینے والوں کی فہرست بہت
اس لئے ماہِ حال کے وعدوں اور وصول کو شامل کرکے پھر ہم اپنے محسنوں کے
ں درج کرتے ہیں، اور اُمید ہے کہ ماہِ آئندہ میں اس فہرست میں بہت سے نام
ہونگے۔

| نام | وعدہ | وصول |
| --- | --- | --- |
| نواب صاحب بہادر مالیر کوٹلہ۔ | ہمہ | ہمہ |
| لجبار صاحب وکیل ہائیکورٹ حیدر آباد دکن۔ | الـہ | معار |
| ر احمد صاحب۔ بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی | | |
| ٹ محکمۂ مال ریاست کشمیر۔ ٹرسٹی کالج۔ | صہ | صہ |
| ین صاحب۔ بی۔ اے اسسٹنٹ انسپکٹر مدارس حلقۂ راولپنڈی۔ | صعہ | صعہ |
| خاں بی۔ اے کینیٹ نائب ناظم محکمۂ مال ریاست بڑودہ۔ | صہ | عہ ر |
| غلام الثقلین صاحب بی۔ اے ایل۔ ایل۔ بی وکیل میرٹھ۔ | عہ ر | عہ |
| رسین کمشریٹ ڈپارٹمنٹ داناپور۔ | عہ ر | عہ ر |
| ب اللہ خاں صاحب بی۔ اے۔ تحصیلدار ہاتھرس۔ | صعہ | × |
| ت علیخاں بی۔ اے سب ویم ایجنٹ بہرائچ۔ | عہ | × |
| ان الحق بیرسٹر ایٹ لا جالندھر۔ | صعہ | × |
| ر محمد خاں صاحب وکیل جالندھر۔ | صعہ | × |
| ت حسین صاحب بی۔ اے۔ | عہ | × |

# محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس

جیسا کہ ہمارے ناظرین کو معلوم ہے، اِس سال ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس بمقام پٹنہ ہوگا اور کانفرنس کے ایجنٹ اُس علاقہ میں مقاصد کانفرنس کی اشاعت کے لیے عنقریب جانیوالے ہیں۔

کانفرنس کے شعبوں میں سے صیغۂ اصلاحِ تمدن و انجمنِ ترقیِ اُردو سالگذشتہ سے برابر اپنا کام کر رہے ہیں۔ اسکول سکشن مولوی بہادر علی مرحوم کے انتقال کے بعد سے بیجان ہے، کانفرنس کے گذشتہ اجلاس میں اُسکے لئے کوئی سکرٹری بھی نہیں تجویز کیا گیا۔ اس لئے سمجھنا چاہیئے کہ مرحوم سکرٹری کا اُسنے بھی ساتھ دیا، اور اُسکے لئے بھی اب مرحوم کا لفظ استعمال ہونا چاہیئے۔ تعلیمی مردم شماری کا صیغہ گو بقیدِ حیات ہے، مگر مُردوں سے بدتر ہے، مسٹر بیک مرحوم کو اس صیغے سے خاص دلچسپی تھی، اور تعطیل کے زمانے میں وہ طلبا سے اس کام میں مدد لیا کرتے تھے۔ مگر اُن کے مرنے کے بعد سے اس صیغے میں کبھی جان نہیں آئی۔ دہلی کے اجلاس میں مولوی بشیر الدین احمد صاحب اس صیغے کے سکرٹری مقرر ہوئے تھے، اور اُن کی پُرجوش طبیعت سے لوگوں کو توقع ہوتی تھی کہ شاید اس صیغے میں پھر جان پڑ جائے۔ مگر وہ اُمید پوری نہیں ہوئی۔ کانفرنس کا پانچواں شعبہ یعنی صیغۂ تعلیم نسواں سالگذشتہ جانکنی کی حالت میں رہا، اُسکی پُرجوش سکرٹری نے اُسکے لئے نصابِ تعلیم طیار کرنے کی غرض سے ایک تجارتی کمپنی قائم کرنے کی تجویز پبلک میں پیش کی تھی، مگر وہ تجویز چلنے والی نہ تھی، اور اس لئے اُس میں ناکامی ہوئی۔ مسلمانوں سے کوئی متفقہ کام ہونا مشکل ہے، اس سال انھوں نے عورتوں کی معلومات بڑھانے کی غرض سے ایک ماہوار رسالہ موسومہ خاتون نکالنے کی تجویز کی ہے، مگر عام رائے اُسکے موافق نہیں معلوم ہوتی، اسلئے یہ تجویز بھی غالباً انجام کو نہ پہونچے۔ اب اُنھوں نے ایک تیسرا قصد کیا ہے، اور وہ ممکن الوقوع معلوم ہوتا ہے، اگر وہ اس پر قائم رہے، اور اُسکی صورت پذیر ہونے

نش بھی کی، تو کچھ بعید نہیں کہ اس تجویز میں اُن کو کامیابی ہو، اور آیندہ کانفرنس کی
بی اُس سے ترقی ہو - وہ چاہتے ہیں کہ آیندہ اجلاس کانفرنس کے موقعہ پر صیغۂ تعلیم
رف سے مستورات کی دستکاری کی ایک نمایش ہو، اور قابلِ انعام اشیا پر انعام
ں، اور جو شخص جس چیز کو خریدنا چاہے اُس کے ہاتھ اُسکو فروخت کر کے بنانیوالی کی
ں قیمت بھیجدی جائے - اس نمایش میں عمدہ کشیدہ، جالی، چکن، گلوبند، رومال،
ستانہ، پھول، بیل بوٹے وغیرہ وغیرہ اعلیٰ دستکاری کی چیزیں پیش ہو سکینگی، ہمکو
یہ اخبار تہذیبِ نسواں اس خبر کو اپنے ناظرین کے گوش گذار کریگا۔

## محمڈن کالج بُک ڈپو

ے بُک ڈپو نے قصد کیا ہے کہ ہر سال کم از کم دو ہزار جلدیں کسی مُفید کتاب کی طبع کرا کر ملک
یم کیا کرے - چنانچہ سب سے پہلی کتاب جو اس طرح تقسیم ہونیکے لئے تجویز ہوئی ہے، وہ
ی ہے - اِس کتاب کی خوبیاں بیان کرنے کی ہمکو چنداں ضرورت نہیں، عموماً لوگ اُس
ے ہیں، ہماری خواہش ہے کہ شل کریما و خالق باری کے یہ کتاب بھی مُسلمان بچوں کے
بس کا ایک جزو ہو جائے - کتابِ مذکور ابتدای گشت آیندہ میں تقسیم کے لئے طیار
ور جو صاحب کہ تقسیم کے لئے طلب کرینگے، اُن کی خدمتیں مطلوبہ جلدیں بھیجدیجائینگی۔

## اولڈ بوائز ایسوسی ایشن

ا ایسوسی ایشن کے گذشتہ اجلاس میں ایک سنڈیکیٹ کا قائم ہونا قرار پایا تھا، اور
وں نے اُس کی ممبری بھی قبول کی تھی، چندۂ ممبری سے ۶ روپیہ سالانہ تجویز ہوا تھا۔

صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب سکرٹری ایسوسی ایشن کی درخواست ہے کہ جن صاحبوں نے ممبری سنڈیکیٹ قبول کی تھی، مگر اُسوقت چندۂ ممبری ادا نہیں کیا تھا وہ اپنا چندہ عنایت فرمائیں، اور جو اولڈ بوائز کہ اجلاس کیوقت موجود نہ تھے اور سنڈیکیٹ کی ممبری کے خواہشمند ہوں وہ اپنے قصد سے سکرٹری کو مطلع کریں تاکہ ممبروں کی کافی تعداد ہو جانے کے بعد سنڈیکیٹ اُن کی راے سے کوئی مفید کام شروع کرے۔ یہ سنڈیکیٹ ایسوسی ایشن کیطرف سے ایک کارکن جماعت ہوگی، اور ہر کام جو ایسوسی ایشن کیطرف سے کیا جائیگا وہ ممبران سنڈیکیٹ کے مشورہ سے ہوگا۔

## علیگڈہ منتھلی میں انعامی مضامین

ہم کو افسوس ہے کہ ماہ جون کے مضامین میں سے کسی پر نذرانہ نہ دیا جاسکا۔ مولوی عزیز میرزا صاحب کا مضمون اسلامی سکوں کی ابتدا پر نہایت تحقیق کے ساتھ لکھا گیا تھا، اور ضرور اس قابل تھا کہ اُس پر نذرانہ دیا جاتا، مگر چونکہ وہ مضمون اول رسالہ مخزن میں بھیجا گیا تھا اور جب وہاں چھپنے میں دیر ہوئی تو ہمارے پاس آیا، اور اسطرح پر دونوں رسالوں میں چھپ گیا، اسلئے ہم اُسکو تخصیص کیساتھ علیگڈہ منتھلی کا مضمون قرار نہ دےسکے، اور نذرانہ پیش کرنے سے قاصر رہے۔ آنریری منیجر

## مختصر فہرست کتب موجودہ بکڈپو مدرسۃ العلوم علیگڈہ

| قیمت فی جلد | خلاصۂ مضامین | نام کتاب |
|---|---|---|
| ۱۲ر | اس جلد میں سورۂ فاتحہ اور سورۂ بقر کی تفسیر ہے۔ طبع جدید مطبوعۂ مفید عام آگرہ پریس۔ کاغذ سفید ولایتی۔ بلا جلد۔ | تفسیر القرآن جلد اوّل مصنفۂ سید احمد خاں مرحوم |
| ۱۲ر | اُس جلد میں سورۂ آل عمران۔ سورۂ نساء۔ اور سورۂ مائدہ کی تفسیر ہے۔ طبع جدید مطبوعہ مطبع مفید عام آگرہ۔ کاغذ ولایتی بلا جلد۔ | ؍؍ ؍؍ جلد دوم |
| | اس جلد میں سورۂ انعام اور سورۂ اعراف کی تفسیر ہے۔ طبع سابق مطبوعۂ | ؍؍ ؍؍ جلد سوم |

| نام کتاب | خلاصۂ مضامین | قیمت فی جلد |
| --- | --- | --- |
| تفسیر القرآن | انسٹیٹیوٹ پریس علیگڈہ - کاغذ ولایتی مجلد مُطلا - | سے/ |
| ” ” ” سوم | ” ” ” . غذ زرد ” سادہ | للعہ/ |
| ” ” ” جلد چہارم | اس جلد میں سورۂ انفال - سورۂ توبہ - اور سورۂ یونس کی تفسیر ہے - مطبوعۂ انسٹیٹیوٹ گزٹ علیگڈہ - کاغذ سفید ولایتی مجلد مُطلا - | سے/ |
| ” ” ” ” | ” ” ” کاغذ زرد ” ” سادہ | سے/ |
| ” ” ” جلد پنجم | اس جلد میں سورۂ ہُود - سورۂ یوسُف - سورۂ رعد - سورۂ ابراہیم - سورۂ حجر اور سورۂ نحل کی تفسیر ہے - مطبوعۂ انسٹیٹیوٹ پریس کاغذ سفید مجلد مطلا - | سے/ |
| ” ” ” جلد ششم | اس جلد میں سورۂ بنی اسرائیل کی تفسیر ہے، اور معراج کے قصّے پر نہایت تفصیل سے بحث کیگئی ہے - کاغذ عمدہ مطبوعۂ انسٹیٹیوٹ پریس مجلد - جلد طلائی - | سے/ |
| ” ” ” ” | کاغذ زرد ” ” ” جلد سادہ | سے/ |
| ” ” ” جلد ہفتم | یہ جلد سیّد نے وفات سے چند روز پہلے ختم کی تھی، مگر بعض وجوہ سے اسکا طبع ہونا اسوقت تک تعویق میں تھا - اب ہم نے اسکو عمدہ کاغذ پر خوشخط اور صحیح چھاپ کر ہدیۂ ناظرین کیا ہے - اس جلد میں سورۃ الکہف - سورۂ مریم - اور سورۂ طٰہٰ کی تفسیر ہے، مطبوعۂ مفید عام آگرہ پریس - بلا جلد - | عہ/ |
| ” ” جلد سوم و چہارم | مجلّد در یک جلد کاغذ عمدہ جلد طلائی - مطبوعۂ انسٹیٹیوٹ پریس - | ۵/ |
| خطباتِ احمدیہ | سیّد کی جملہ تصانیف میں یہ کتاب سب سے اعلیٰ اور قابلِ قدر ہے، اس میں ایک دیباجہ اور بارہ ۱۲ خطبے شامل ہیں - طبع دُوم مع جلد پختہ ہے ۲/ جلد خام - | سے/ |
| اعجاز التنزیل - | مصنفۂ خلیفہ سیّد محمد حسن مرحوم وزیر اعظم ریاست پٹیالہ - اس میں بڑے بڑے نامور عیسائی عالموں کے اقوال مذہبِ اسلام اور قرآنِ مجید کی حمایت اور تائید میں درج کئے گئے ہیں - طبع جدید - کاغذ عمدہ - مطبوعہ مطبع مفید عام آگرہ - | سے/ |

# ممیرہ اور سچے موتیوں کا سفید سرمہ

## مصدقہ جناب نامی گرامی ڈاکٹر ڈبلیو آر گرائیر صاحب بہادر

## ایف۔سی۔ایس۔اے۔آر۔ایس۔ایم۔ فیلو آف کمسٹری لندن

معزز ڈاکٹروں اسسٹنٹ سرجن ہسپتال اسسٹنٹ ونوابوں وراجاؤں کے حکیموں و گورنمنٹ کے اعلیٰ ترین عہدہ داران انگریزی گریجوایٹوں تعلقہ داروں و یورپین انگریزوں کے سارٹیفکیٹ بکثرت موجود ہیں جنکو ہم بوقت فرمائش بھیجی ہم نے اصلی و عمدہ ممیرہ بڑی تلاش سے ہندوستان کے باہر سے منگوایا

## ہمارے سرمے کا امتحان اور اُس میں جلد کامیابی

نگاہ ناپ کر ہمارا سرمہ لگائیے، دو ہفتے میں روشنی آنکھ کی بہت بڑھ جائیگی، اور آنکھ کے جملہ نقص دور (۲) عینک چھوٹ جائیگی۔ (۳) دھند۔ [۴] دھلکہ۔ [۵] آنسو بہنا۔ [۶] سرخی۔ [۷] سوزش۔ [۸] کھجلی۔ [۹] آنکھ کے سامنے کا اندھیرا۔ پا اندر کے دانے و سرخی۔ گوہانجنی [۱۱]۔ (۱۲) لکھنے پڑھنے سے آنکھ کا تکان۔ (۱۳) درد بہت جلد شرطیہ رفع کرتا نگاہ سوئی میں تاگا چھوڑ لیجئے۔ پروال [۱۵]۔ سبل [۱۶]۔ جالا [۱۷]۔ پھولی [۱۸]۔ ابتدائی موتیابند [۱۹]۔ ناخونہ [۲۰]۔ گرے [۲۱]۔ (۲۲) آنکھوں سرخ ڈورے پڑجانے کو (۲۳) پلکیں گرجانے والی بیماری کو مفید ہے۔ (۲۴) کمزور آنکھ کو قوت د (۲۵) آنکھ کا میل اور سواد صاف کرتا ہے۔ آنکھ کو جملہ امراض سے محفوظ رکھتا ہے۔ **قیمت فی تولہ تین روپیہ**

**المشتہر رام سرن نجم۔ کانپور۔ نیا چوک** } اپنا نام و پتہ و نام ڈاکخانہ خوشخط لکھ

## ذیل میں چند نام نامی اُن صاحب کے لکھے جاتے ہیں کہ جنکے سارٹیفکیٹ حالمیں آ

(۱) جناب ڈاکٹر اے۔ والی۔ روڈز صاحب بہادر آر۔ ڈی۔ ایم۔ پی۔ ایل۔ مقام لندن
(۲) جناب ڈاکٹر پی۔ ین۔ بنرجی صاحب اسسٹنٹ سرجن (حال مقام میرٹھ)
(۳) جناب ڈاکٹر جوگیندر و ناتھ صاحب باسو۔ ایل۔ ایم۔ ایس۔ کانپور۔
(۴) جناب ڈاکٹر اللہ یار خاں صاحب ایس۔ جی سی ہسپتال اسسٹنٹ مقام نگینہ
(۵) جناب مسٹر۔ اے ڈبلیو براسیٹ صاحب ورمالک براسیٹ کمپنی کانپور۔
(۶) جناب مسٹر جے۔ اے۔ آر۔ رانسن صاحب ہیڈ ٹکٹ کلکٹر اودھ روہیلکھنڈ ریلوے۔
(۷) جناب بابو نیل ادھب رام صاحب بی۔ اے۔ بی۔ ایل جج خفیفہ بہادر کانپور
(۸) جناب بابو بپن بہاری صاحب۔ ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی۔ ڈسٹرکٹ و سشن جج گونڈا۔ (حال کانپور)
(۹) جناب مسٹر شب شنکر لال صاحب سٹی مجسٹریٹ مقام منڈلیسر۔
(۱۰) جناب منشی کالیچرن صاحب منصف درجۂ اول۔ مقام
(۱۱) جناب مولوی سید حامد صاحب بمنصف درجۂ اول مقا
(۱۲) پنڈت بنسی دھر صاحب تحصیلدار ضلع باندا۔
(۱۳) مسٹر لکشمی نراین۔ بی۔ ایل۔ بی۔ وکیل ہائیکورٹ ضلع
(۱۴) مسٹر بشمبر ناتھ صاحب۔ ایل۔ بی۔ وکیل ہائی کورٹ

بوقت فرمائش اخبار کا حوالہ

(مطبوعۂ ریاض ہند پریس علیگڈھ)

prosperous future, I bring my remarks to a close"—(deafening cheers)

M. Hardan, the founder of the Association and the famous explorer of Dudhpur, rose to respond, (prolonged cheers.) He said :—

"Hard was the task I had to perform (cheers), tedious were the toils I had to endure, innumerable were the difficulties I had to surmount, great were the dangers I had to face, and heavy was the labour I had to undergo (cheers), but all have been forgotten in the warmth and cordiality of the reception I have met at your hands. Dudhpur, as you know, is a *terra incognita*, a land of death and danger. It abounds in lions and tigers, bears and wolves, snakes and dragons. There are monsters and cannibals There is plague and cholera. There is sleeping sickness and laughing sickness. There are rivers and mountains, hills and valleys, meadows and forests, bogs and fens, and plains and plateaus. But I was not to be daunted I was armed with the sword of zeal and the shield of hope (cheers). The hope of meeting you again at Aligarh was my guiding star The assurance that my services would be thankfully received inspired me with fresh courage. Thank heaven, the object of my arduous mission has been accomplished and the world has been startled and dumb-founded by the announcement of my discoveries, (cheers.) I am proud of my honourable colleagues, and of the work they have done during my absence I am proud of being able to secure the co-operation of these distinguished gentlemen There is still much to do There is still much glory to win. There are still many risks to run (boom—boom—rumbling sounds are heard). My colleagues and myself are prepared to die in the interests of the Association. We are ready to go anywhere, we are ready to die anywhere. (The sounds are heard again.) A moment's notice and we are ready to go even into the jaws of death" (The sounds interrupt him a pause follows He resumes speaking)

I hear strange rumbling sounds. It is said that these mysterious sounds have been heard from time immemorial As far as I know, no satisfactory scientific explanation has been given as yet, to clear up the mystery. My trusted colleagues, let us go and pry into the mystery. Here is a golden chance. It might bring us fresh glory There is no time to be lost. Why should we put off till to-morrow what we can do to-night ? It is a moonlit night. Let us summon our courage and set off in the direction from which the sounds are coming." (Here M. Hardan stops abruptly In an instant he and his colleagues are off on their new expedition. The meeting breaks up.)

teem. Very many persons would, of their own accord, like to ingratiate themselves with them and endeavour to further their cause.

This much is by way of prolegomenon

C. R. D. L.

—— :o ——

## Our Research Association.

An extraordinary meeting of the Aligarh Research Association was held on Friday evening on the lawn in front of the Union Club, to welcome M. Haidari on his return from Dudhpur, where he had gone to carry on researches of various kinds. The Chairman, while according M. Haidari a hearty and enthusiastic welcome, enlarged upon the extremely useful work which the Association had done during his absence. He said :—

" I congratulate you upon your safe return. I congratulate you upon the successful completion of your Herculean toils, upon the important discoveries you have been able to make in Dudhpur and upon the wealth of knowledge you have brought from there. Although we have not had the advantage of hearing your voice and of benefitting by your company for many years, yet I assure you that we have not been wasting our time. Your noble example was more than sufficient to inspire us with high ideals. While you were away, exploring the *terra incognita* of Dudhpur, we were making important researches,—researches historical, Archaeological, economical, statistical, geological and topographical. I am proud to mention, on this occasion, the names of Meerza, Hamid, Mahmood and Akram, your honourable friends and colleagues. Meerza has astonished the world by writing an exhaustive pamphlet on the immigration of crows into the College gardens. Hamid is the world-renowned author of 'the past, present and future of Sahabagh.' Mahmood is the famous historian of the Aligarh fort. These are some of the illustrious men whose fame has spread to the four corners of the world. Your name, the names of your colleagues, and the name of this Association have become immortal. Let us rejoice that we have a great and glorious future before us. There is vast material to be utilised. There are unknown regions to be explored. There are innumerable inscriptions to be deciphered. India is a land of hoary antiquity; and fortunately we live in the heart of the country. Here every ruin is a history and every stone a chronicle. Sir, now that you have returned from your perilous expedition, a new era of vigour and activity is sure to set in. Wishing you a long and useful career, the Association a world-wide name, and the College a bright and

value to anyone enquiring into a history of religion. Similarly any local or national difference in ceremony should be noted and traced back to its beginning if possible.

To conclude, the maxims to be remembered are these: Acquire and examine facts patiently, accurately and impartially. Do not be in a hurry to adopt or to form a judgment. Do not neglet details, however laborious to acquire they may be. Finally, always use your common sense.

J. H. I.

——:o:——

## For Orators

HOW *not* TO BEGIN.

—— o ——

To assert anything however preposterous and pleonastic, it may be in itself is very easy, but the corroboration and verification of it eludes the most inventive and most imaginative brain backed though it may be by the perspicuity of understanding and force of genius.

Some men would like to flow against the stream, which, they look upon as the sure means of signalising themselves, which often prepares them to appear before the public eye in "the peacock's feathers," simply to render their foibles the more conspicuous, and hence to make them an object of utter abhorrence and antipathy.

Their actions which are prompted by their uneasy spirit of ambition, excite our honest wrath and indignation, which embitter our feelings against them, and which make us ever ready to drag them down from the sphere they are moving in and envelop them in as complete an obscurity as possible.

They conceive that eccentricity and idiosyncracy will lend countenance to their ambitious ends and an assumption of serious tone in thought, word and action will be as favourable.

Hence they often maintain such propositions and trains of thought which, odd and foolish in themselves, they clothe in sesquipedalian phraseology and grave words to win approbation; but alas, their endeavours are rendered futile and abortive, and they are reduced to the very extremity of wretchedness and undergo all the excruciating perturbation and mental affliction attendant on defeated ambition.

But how gratifying and entertaining it would be, if these ingenious persons were ingenuous as well and sought to acquire fame and eminence by honest means and straight forward conduct. If they appear in their native hue, their progress, though slow, will be steady. Their unassuming character would make them an object of admiration and es-

age of the letters and their probable genuineness. Then, if you have the skill, work up your knowledge into a little note on the subject, if not, show your information to some one who can use it well or who is making a study of that particular subject

Economic history is another branch which affords us ample scope.

Admirable authorities for this are found in lists of prices, accounts,—private accounts are of immense value—records of lands, especially documents showing the amount of cultivated land and the crops raised from the land. A knowledge of implements in use formerly and nowadays is very advantageous to the economist. Any sign of change in system in India is of great importance, for India is a country wherein changes are rare and slow

There is another study which we can all help. In a way it is the most fascinating of all, though it is not the most useful branch of enquiry It is ' folklore' or "the learning of the people"

This means the traditions of the people, their tales of heroes, giants, dragons etc., their beliefs and superstitions with regard to animals, birds and plants Much work can be done in many districts, in fact, India generally should prove a magnificent field for this kind of enquiry.

The knowledge of folklore is useful as showing the kinship of races and nations ; for instance, the legend or the fairy tale of Cinderella and the slipper is found in almost every nation East and West Of course the original authority for folklore is tradition. It need hardly be said how careful we must be in taking tradition Wherever possible the traditions of one place should be compared with those of another and fairly distant place.

The evidence of one single account should only be received with great care Here, as always, we must use common sense.

Lastly the history of a religion is very important. There is hardly anything belonging to mankind that is so liable to receive additions and alterations as religious belief. How important is it then to get at a knowledge of the real foundation of our faith ! It was neglect in this matter that led to many of the abuses and false ideas in the Christianity of the Middle Ages. A careful historical enquiry into many parts of religious teaching would certainly have some astonishing results. Old MSS of preachers and teachers, inscriptions on Mosques and Temples, would be of great

the picture is coloured. The facts serve their proper purpose—namely, that of illustrating and supporting the statements of the historian We must not therefore be content with amassing facts, we must organise them and draw their real meaning out of them

Where are we to get our facts? From existing books Exactly, but how much is there in existing books? The books, already written, have a very great value, in some cases they are our only source of fact But we must remember two things (a) the historian may have been prejudiced, e.g., Tacitus gives a distorted account of Tiberius, (b) the historian may have been only half informed In history, as in everything else 'a little knowledge is a dangerous thing' Thus we have a real need of original authorities, now these may consist of the following, viz, firmans, family official documents, inscriptions, coins—a very useful authority as Mr Morison has pointed out,—remains of buildings, roads, implements, and finally the family histories and letters. In relative value the order of these authorities is (1) the actual tangible relics (2) the coins, (3 the laws official documents and inscriptions, (4) private letters, (5) family histories, (6) tradition.

Now we must use our authorities carefully We must collect study and compare them It is a good thing to make a careful note of every authority or of every fact we collect, e.g., the place where the document, or inscription or tradition was found, the age of the tradition or document; the person or persons from whom the fact was obtained Finally, if any other evidence can be got to support our new discovery we should try to find this evidence

The same general remarks hold good, not only of political history but of social history—the history of a people as a Society. Social history is very interesting, it appeals to every one of us We all like to know what customs have prevailed among our ancestors In fact to have a good knowledge of the past and present customs of a country or even a district, is most useful in enquiring into social history. Get to know the customs, compare them and contrast them and you will be doing a real service in this work

Private letters too, often throw a light of the social history of the age in which they were written

If you find a collection of private letters to which you can obtain access, study them carefully If you think they are very important, make a careful abstract or summary of the whole of them, if they only contain a few interesting passages, make a copy of these passages Add a note on the

I have chosen this instance because (*a*) it is comparatively recent history; (*b*) the dates were easily obtainable from the very first If a popular mistake like this can be made in a matter, in which one would think it almost impossible to go wrong, how much easier will it be to err in our case, when we may be dealing with matters that occurred hundreds of years ago and are supported by poor evidence ?

The third and greatest essential—in fact, if we observe this, we shall observe the other two as well—is common sense.

We must use common sense, *i.e.*, we must act reasonably in accumulating our facts and in treating them. Facts that are obviously irrelevant or unnecessary only confuse us and encumber the ground of our enquiries Here is an instance which by its very ridiculousness will show more strongly what is meant In accumulating facts for the history of the Mohammaden educational movement it is of no use to record the fact that the pavement of the pucca court verandah of the M.-A. O College is worn in places.

Again we have another great need for our common sense. We must not think that, because one event happened before another, therefore the earlier caused the later. Because George III. died in 1820, and railways exist to-day, we must not imagine that we owe railways to the death of King George The example is ridiculous enough, but so is the fault it illustrates, and the fault is only too common among those not greatly accustomed to historical enquiry and among those who are entering on unexamined facts.

Briefly then we may say that for all branches of our work we want three things, *viz.*, impartiality, accuracy and common sense, and the greatest of these is common sense.

Now we may just touch upon the various branches of the work which we are going to undertake. Do not, however, expect to-night illustrations drawn from Indian history, and above all pardon my ignorance if in these remarks I seem to neglect any Indian matter or to treat it wrongly.

First of all we may take Indian political history, by which we mean the history of the relations of Indian states one with another, their growth and their outward development Here, I am told, we have a great field open to us. Now scientific history is not a mere compilation of facts arranged in chronological order.

If I may attempt a definition, History is more of a word picture showing the tendencies and the growth of the policy and life of a nation.

The facts are used, as it were, as the paint with which

the best kings England ever had. The authoress had apparently come to the conclusion that, because some maligned characters in history have turned out not so bad as he had been painted. With this comfortable theory she went to work to clear John's character—but not with any great success.

We can hardly venture to follow this lady's example We must beware of theories especially in our first attempts But we need not condemn all theories—let us condemn our own, but be careful of those of others If a theory is well-established and is generally accepted, there is no harm in trying to find fresh evidence to support it.

It is with regard to new theories that we must be very careful,—careful in making them and careful in accepting them. In fact "Do nothing without thought," should be our motto in all this kind of work

The requisite is accuracy We must be quite sure that our "facts" are real "facts" We must try to get at the truth in everything, and the best way to do that is to support one fact by another, or in legal words, to adduce confirmatory evidence.

The following is a good example of inaccuracy —

It is commonly supposed that the battle of Trafalgar put an end to Napoleon's scheme for invading England. This view was printed in many histories, even those of a learned rather than a popular nature. But if we consider a few dates we shall see how much this view is worth Napoleon's orders to the French Admiral in 1805 were to draw away Nelson's fleet to the West Indies, then to hurry back and to command the channel for two or three days so as to allow Napoleon's great army to get across to the English coast in safety. The time fixed for the French Admiral's return was June 10th to July 10th. This the Admiral failed to accomplish, as, though Nelson could not catch him in the West Indies, he sent a ship to warn the British Government, and the French Admiral was intercepted by Admiral Calder off the Spanish coast and forced into Corunna harbour The other French fleets were being blockaded in Brest and Rochefort, and if Napoleon was to get his idea carried into execution all these fleets must get out to sea and keep the English Channel.

But the French Admiral failed to get these other ships out, and in *September* Napoleon started his army away from Boulogne and by *October 21st,* when Trafalgar was fought Napoleon's army was in Austria. Thus Napoleon's idea for invading England had already been abandoned, and if the French had actually won at Trafalgar the victory would have done them no good.

# Historical Method

## Some Elementary Hints.

[This paper was read by Mr. Towle on June 15th, 1903, at the first meeting of the Historical Society and was not originally intended for publication.—Ed.]

In these days of scientific historical enquiry it seems strange to hear of a vast field of historical knowledge still waiting for adequate exploration. When we have learned writers publishing lengthy pamphlets on the question whether a certain conspiracy took place in Athens in the year 632 B.C. or 612 B.C.—a matter which is only of academic importance—it is refreshing to know that there is still a grand opportunity for enquiry in a really useful department of history.

Yet, the very extent of our opportunity may cause us to make errors and fall into confusion, which may dishearten some who otherwise are capable of and have the chance of doing really useful work. We have to guard against this possibility and to take care that our efforts shall be so directed that we may gain the best results with the least trouble.

It must not be said by any of us "There are so many facts and so much material that I do not know where to begin."

Whatever class of fact we are going to consider, whether we are studying the political, the constitutional, the economic, or the social history of a people, or whether it be their religion or their folklore, there are three absolutely essential things for us to bear in mind.

The first requisite is impartiality ; by this is meant that we must keep an absolutely open and fair mind

This is necessary for everybody, but it is most essential for us who are like pioneers engaged in exploring a new land. We cannot afford to have our minds already made up on any matter before we look into that matter. We must not set out to prove some pet idea of our own and twist every fact we meet to suit that theory or neglect every fact which would seem to point another way.

Here is an instance in point. King John of England has been universally recognised as the most untrustworthy and least capable king who ever sat on the English throne. This judgment is well supported by the actual facts of his reign.

Yet what do we find ? Only the other day a book came out which endeavoured to prove that John was really one of

The Union is proposing to make some alterations in its Rules with regard to the election of officers. It is also hoping, very shortly, to commence the enlargement of its buildings. We look forward to the time when the ground at the back of the Union will be cleared of its present encumbrances and be laid out in the form of a garden.

---

We are glad to learn that Mahomed Wilayat Ullah, Ex. Asst. Commissioner, an Old Boy of the College, is appointed to officiate as Deputy Commissioner of the Betal district

---

The League Football matches are over and the Entrance Class is again first in the competition, under the Captaincy of Mohin-ud-din Seven teams entered, the best contested matches were those between the Entrance and the three College classes The first year team was individually good but showed want of practice

---

Ahmad Husain, the Football Captain, complains of the want of more football grounds The question of more space for playing fields generally is already a pressing one.

---

The Football team is going to make a tour to Dehra Dun and Mussoorie. We hope to publish a record of this in our next number.

—:o:—

A copy of the Annual Report of the M. A. O College Association has just arrived from London. The Dinner took place on June 27th, an account of which will, we trust, appear in our next issue.

---

On March 25th last the Association gave an "At Home" at the Westminster Palace Hotel, at which 150 guests were present, including Sir John Strachey, Sir Charles Crosthwaite, Sir Charles and Lady Lyall, Mr. and Mrs. Arnold, Mrs. T. Beck, Miss Morison, and many others. The work of the Association seems to be deservedly prospering.

The College is sending in forty-six candidates for the belated B. A. Examination which begins on July 18th.

——:o:——

Mahomed Akram Khan is appointed Cricket Captain from July 1st in succession to Said Mahomed Khan.

---

Said Mahomed Khan is to be congratulated on the success of his work as Captain. He had frequent difficulties to face and he deserves the thanks of the College for having faced them well. All who play cricket here should remember that they owe absolute and loyal obedience to those officers who give their time and trouble so freely for the advancement of the great game of cricket

---

The Hockey eleven went to Naini Tal, but had no remarkable success as far as winning matches is concerned They did not meet with the best of good fortune, but have no cause to be discouraged. The team is a young one: time will bring them better luck and more experience

---

There were two lectures given in June, the first by Mr. Gardner Brown on June 16th, the subject being—"The Development of Japan," the second on "The London of Shakespeare's time," by Mr Cornah. Both lectures were well attended and were followed by interesting discussions.

---

His Honour the Lieutenant-Governor of these Provinces will visit the College on July 20th. He has consented to receive an Address from the Trustees and to open the new lecture rooms and the Nizam's Museum.

—— o ——

The Editor must again complain that hardly any items of news are sent in from the various College Clubs and Societies. There is a School Literary Society, with Mr. Twiss for President, there is the First Year Debating Society, there is the mysterious but we believe well-intentioned Tara Club, and others also; but they are all apparently anxious to hide their various lights.

# The Aligarh Monthly.

JULY, 1904


## College Notes

—— o ——

There seems very little breathing time for the hard-worked Editor, who finds himself face to face with another month, almost before he has sent one allotted batch of manuscript to the Printer Nor can he, as a rule, comfort himself with a rich store of material and subject matter. There in a dearth of College news, and the burning, breathless hours in which we wait for the sound of abundance of rain are little calculated to stimulate the imaginative faculties.

——.o.——

The College life is somewhat jaded in these days, but the Duty has not been wanting in energy. The Keeper, Mr. Gardner Brown, and the Assistant Keeper, Professor Abul Hasan, have been working hard, and Committee Meetings and General Meetings have been held to formulate some new rules, which give promise of sound and hopeful work. Under the new constitution the ultimate authority is vested in a Council consisting of the Principal, the Honorary Secretary of the Trustees, and a "leading Mahomedan gentleman," who we understand, is to be Mr Aftab Ahmed Khan.

——:o:——

At this time the members of the various deputations are being carefully selected and appointed.

جلد ۲ | اگست ۱۹۰۴ء عیسوی | نمبر ۸

# سفرِ بغداد

(بصرہ تا بغداد)

---

رسید مژدہ کہ ایّامِ غم نخواہد ماند     چناں نہ ماند چنیں نیز ہم نخواہد ماند

چنانچہ ایسا ہی ہوا، ہمارا بھی زمانۂ رنج و محن یعنی قرنطینہ ختم ہوگیا؛ اور ہم اپنے قفس سے با بال و پر نکل آئے۔ قسمت کا ستارہ اوج پر تھا یعنی اُسی روز "مجیدیہ" نامی جہاز بغداد کو روانہ ہونیوالا تھا، بعد خرابی بصرۂ قرنطینہ کے مکان سے سیدھے جہاز پر پہونچے۔ اب جہاز پر جو قدم پڑتا تھا، اُس میں ایک خاص غرور کی شان تھی، کیونکہ اب ہم آزاد تھے، اور اِس لفظِ آزادی کے معنی کی تہ پر ہم اب پہونچے تھے سہ پہر کو جہاز بصرے سے روانہ ہوگیا؛ اور اُسوقت میں نے اطمینان سے جہاز کا چکر لگانا شروع کیا، فرسٹ کلاس میں صرف ایک ترک مصطفےٰ فہمی آفندی ناظرِ دیوانِ عمومیہ ولایت بغداد تھے

دوسرا مسلمان میں تھا، (میں بھی مجبوری سے اس کلاس میں تھا، کیونکہ سیکنڈ اور تھرڈ میں بالکل جگہ نہ تھی،) باقی سب یہود و نصاریٰ تھے، سیکنڈ کلاس بالکل یہود و نصاریٰ سے پُر تھی، صرف ایک تھرڈ کلاس بچی جسمیں شوکتِ اسلام ظاہر ہو رہی تھی۔ اللہ اکبر! اسلامی حکومت میں بھی دولت اور دولت کے ساتھ عیش و آرام دوسری ہی قوموں کے پاس ہے! تھوڑی دیر بعد کپتان سے دیہ یاد رہے کہ جہاز ایک انگریزی کمپنی کا ہے اور کپتان انگریز ہے) باتوں میں اسکا ذکر آگیا، تو اُسنے عجیب باتیں بتائیں۔ یہ کپتان تین برس سے اِس جہاز پر ہے اسلئے اُسکا تجربہ کوئی آجکا تجربہ نہیں ہے، اُسنے کہا کہ تیس برس پہلے بغداد کے مسلمان تاجر کسی طرح یہودیوں سے کم نہ تھے بلکہ بڑھ کے ہی تھے لیکن اسوقت یہودیوں نے یورومین یا یہ کہنا چاہئے امریکن ڈھنگ کی تجارت نہ سیکھی تھی، اسلئے مقابلہ برابر کا تھا، تاجر سچے سیدھے لوگ ہوتے تھے، لیکن پھر یہودیوں نے امریکن ٹرسٹ کا قاعدہ اختیار کیا جسمیں تاجر کا مقصد شروع شروع میں نفع حاصل کرنا نہیں تھا بلکہ اپنے حریف کو نقصان پہونچانا اسلئے وہ حریف کو تباہ کرنے کے لئے اپنا مال ایسا کوڑیوں کے مول بیچ ڈالتا ہے کہ خود بھی تباہ ہو جاتا ہے، اور جب مقابلہ کے لئے کوئی نہیں رہتا، تو میدان اُن کے ہاتھ میں ہوتا ہے اور پھر وہ آہستہ آہستہ تجارت کا مالک بلا شرکتِ غیرے ہو جاتا ہے۔ اسوقت اسی طریقے سے یہودیوں نے مسلمان اور نصاریٰ کو تجارت کے میدان سے نکال دیا ہے، اور اسوقت بصرہ اور بغداد کی تین چوتھائی دولت اور تجارت اُنکے ہاتھ میں ہے۔ یہودیوں کے بعد نصاریٰ کا نمبر ہے اور مسلمان تیسرے درجہ پر ہیں۔ عراق و شام کے یہودی بھی قدامت کے لحاظ سے عجیب قوم ہیں۔ اہل بابل انھیں قید کر کے لائے، اور حالتِ جلاوطنی میں اُنھوں نے دولت پیدا کرنی شروع کی، یونانی و رومی و عرب و عجم و مغول و ترک نے یکے بعد دیگرے حکومت کی مگر اس قدیم قوم نے ان سب کو اپنی دولت کا چوکیدار سمجھا اور سمجھتی ہے اور انھیں اُنکی چوکیداری کا حق دیتی ہے، اور خود دولت پیدا کرنے میں مشغول رہتی ہے۔ چوکیدار کبھی کبھی انھیں ذلیل سمجھتے ہیں مگر روپیہ کی ضرورت ہوتی ہے تو انھیں کے آگے دستِ سوال دراز کرتے ہیں۔ اسوقت بغداد میں کوئی مہاجن اور بنکر غیر یہودی

ں ہے۔

یہ تو اُس دولت کا حال ہے جو چلتی پھرتی چھاؤں کہی جاتی ہے۔ گو یہ چلتی پھرتی چھاؤں اُنکی
ں سے چلتی پھرتی نظر نہیں آتی ،، مگر قدرت نے ایک دولت یہاں مساوی تقسیم کی ہے اور وہ
ت حُسن ہے۔ یہودی و نصاریٰ و ارمنی و عرب، عراق کی سب قومیں اس سے برابر
ستفید ہوئی ہیں، جہاز پر سوائے میرے اور چند دیگر ہندیوں کے جو کربلائے معلّٰی کی زیارت
رہے تھے کوئی سانولا نہ تھا، یہ تو مردوں کی کیفیت تھی، اور عورتوں کے حُسن کا عالم
ان کچھ اور ہی ہے۔ میں نے بغداد میں ابھی تک سوائے حبشیوں کے کوئی کریہ المنظر عورت
ں دیکھی ہے حُسن یہاں سب میں یکساں ہے لیکن چونکہ عیسائیوں اور یہودیوں میں پردہ مطلق نہیں
لئے جلبِ نظر یہ زیادہ کرتی ہیں۔ عراق کشمیر یا یورپ کیطرح سرد ملک نہیں، قریب قریب
وستان کی برابر گرم ہے۔ پھر آخر کیا وجہ ہے کہ قدرت نے یہ نعمت بھی یہاں کے لوگوں کو ایسی بادلی
دے رکھی ہے؟ جہاز پر بھی مجمع حسینوں کا غیر معمولی تھا، اور دوسرے روز مجھے معلوم ہوا کہ
سے پیمانہ پر محاصرۂ ٹرائے اور محاصرۂ چتور گڈھ کے واقعات "مجیدیہ" پر بھی ہو رہے ہیں اور
ن اور پدمنی کی ایک جانشین دو یہودی خاندانوں کے امن و امان میں خلل انداز ہے، یعنی ایک
ت حسین لڑکی مع اپنے والدین کے بغداد جا رہی تھی اس لڑکی کی شادی بغداد کے ایک نوجوان
ی سے ٹھیری تھی، وہ بھی ساتھ تھا لیکن جہاز پر ایک دوسرا نوجوان مع اپنے والدین کے تھا
ب اِس بات پر اڑے ہوئے تھے کہ اوّل الذکر نوجوان سے شادی نہونے دیں بلکہ اس لڑکی کو
ے گھر کا نور بنائیں۔ روز اِن تینوں خاندانوں میں کسی نہ کسی بہانے سے لڑائی ہوتی تھی۔ یہاں تک
من وقعات کپتان کو دخل دینا پڑتا تھا۔ اور اُسوقت مجھے شاعر کے قول کی تصدیق ہوتی تھی کہ ۵

ہم ست کزیں فتنہ پر آشوب شود  اِیں قدر نیز نبایدکہ کسے خوب شود

مگر ہیلینوں اور پدمنیوں کے لئے پیرس اور علاء الدین خلجی ضرور پیدا ہو جاتے ہیں جو ان کی
ہزارہا خلقِ خدا کا خون کر دیتے ہیں۔ یہاں اگر تین خاندانوں میں لڑائی ہو گئی تو کونسا تعجب ہے

دوسرے روز شط العرب (جسے میں نے اس سے قبل دجلہ و فرات کا مجموعۂ پانی، نام نہ معلوم ہونے کی وجہ سے کہا تھا) ختم ہوگیا، یعنی وہ مقام آگیا، جہاں دجلہ و فرات کا سنگم ہوتا ہے۔ اور یہیں ہمارا جہاز الف لیلہ کے چہیتے اور شیخ سعدیؒ اور شعرائے عرب کے ممدوح دریائے دجلہ پر چلنا شروع ہوا۔ اللہ رے دجلہ کی پیچیدگیاں! شاید ہی کوئی دریا اسقدر پیچ اور چکر کھاتا جاتا ہو۔ اس وجہ سے جہاز بہت کم فاصلہ طے کرسکتا تھا، اگر دریا سیدھا بہتا تو جہاز زیادہ فاصلہ طے کرتا، مگر مجھے ایسے پُر لطف منظر کب نظر آتے؟ ہاں اِسوقت یاد آیا، فاؤ سے بصرے تک کی منظر کی میں نے بیحد تعریف کی تھی اور لکھا تھا کہ میں سُنتا ہوں کہ بصرے سے بغداد تک جہاز ایسے ہی منظروں میں ہوکر جائیگا۔ یہ صحیح نہ نکلا۔ بصرے سے بغداد تک دریا کے دونوں کناروں پر ایسے گھنے درخت نہ تھے جیسے فاؤ سے بصرے تک تھے، لیکن پھر بھی بڑے اعلےٰ درجہ کے اور دلکش نخلستان نظر آئے جو شادابی میں تو بصرے کے نخلستانوں سے شاید بڑھے ہی ہوئے تھے۔ اور دجلہ کے کنارے صحرا نورد بدّوؤں کے خیمے بھی نظر آئے۔ ہمارے جہاز کو دیکھکر یہ لوگ کنارے پر ساتھ ساتھ دوڑتے اور چیختے چلّاتے تھے، اور جہاز کے مُسافر ان کے لئے خُرمے اور نارنگیاں پھینکتے تھے جنھیں وہ بڑے شوق سے اُٹھاتے تھے اور ناچتے تھے۔ ان لوگوں کو دیکھکر مجھے خیال آتا تھا کہ یہ بھی قضائے قدر کا ایک چھوٹا سا مذاق ہے کہ جن ممالک میں ہزاروں برس اوّل مدنیت نے ایسی ترقی کی ہو کہ بابل و نینوا و مدائن کا نام تاریخ میں یادگار ہے، وہاں بیسویں صدی عیسوی میں بادیہ نشین عرب اپنے خیمے لگائے پڑے ہوں اور تمدن میں صرف اتنے بڑھے ہوں کہ گلّے چراتے ہوں۔ کون کہہ سکتا ہے کہ انسانی ترقی دیرپا ہے؟

اب ہم اُس خطے میں جارہے تھے جسکا چپہ چپہ قدیم تاریخ کی زینت ہے۔ وہ جہاں بکریاں چر رہی ہیں طاقِ کسریٰ ہے؛ وہ مٹّی کا ڈھیر جو مزبلہ معلوم ہوتا ہے سلیوسیا (مدائن) ہے؛ وہ کونے میں افق کے کنارے جو مقام نظر آتا ہے وہاں یونانی جنرل فلاں و فلاں خیمہ زن ہوا تھا، اور وہاں رومن شاہنشاہ کا پرچم لہراتا تھا جب وہ یہاں سے گذرا تھا۔

چوتھے روز، یار تھا، گلزار تھا، بادِ صبا تھی، میں نہ تھا ؛ نہیں میں بھی تھا، دن کے نو بجے تھے، آفتاب میں مطلق تمازت نہ تھی، ہوا نہایت، نہایت خوشگوار تھی ؛ کہ ہم شاہد مقصود سے ہمکنار ہوئے یعنی دارالسلام مدینۃ بغداد پہونچے۔

جہاز آہستہ آہستہ گمرک بغداد (کسٹم ہوس) تک پہونچا، اس عرصے میں میرے خیالات نے آہ! کس کس زمانہ اور کس کس وقت کی سیر کرلی، اور کن کن واقعات کو مجسّم کرکے اپنے سامنے بلا لیا! مگر گمرک پہ پہونچنا تھا کہ یکبک سے خیالات عہدِ خلافتِ عباسیہ سے بڑی بیدردی سے واپس بلائے گئے۔ کشتی والوں، اور حمّالوں کی ایک فوج سے میں محصور کر لیا گیا جنہوں نے بڑی فصاحت اور روانی کے ساتھ مجھے عربی سنانی شروع کی، اور میری طرف سے اُس عربی کی داد نہ ملنے پر کسی نے بکس اُٹھایا، کسی نے بستر۔ میں کچھ فارسی کی لیاقت جتاتا ہوں، اور کچھ تُرکی کی ٹانگ توڑتا ہوں، مگر وہاں کون سنتا ہے، آخر یہ ہی مناسب سمجھا کہ اگر اسباب گُم کرنا منظور نہیں ہے تو ان لوگوں کے ساتھ ہو لینا چاہیئے ؎

رشتہ در گردنم افگندہ دوست!     میبرد ہر جا کہ خاطر خواہ اوست

اسباب ایک کشتی میں رکھدیا گیا، اور میں بھی اس طرح گویا اسباب کا ایک جز ہوں، ایک کونے میں کور رکھدیا گیا، اور یوں پا بہ دستِ دگرے، دست بہ دستِ دگرے، ہم (یعنی میں اور اسباب) گمرک پہونچے ؛ اور وہاں اپنی قلیل تُرکی دانی سے اسقدر سمجھا دیا کہ اگر اپنا کُل اسباب بکھروانا نہیں چاہتے، اور اپنی کُل کتابیں ضبط کرانا نہیں چاہتے تو ایک روپیہ افسر گمرک کے بھینٹ چڑھاؤ۔ ہمنے خوشی خوشی اُس قاضی الحاجات روپیے کو نذر کیا اور گمرک سے باہر آ گئے۔ یہاں ایک صاحب جو میرے آنے سے واقف تھے گر مجھسے واقف نہ تھے ملے، میں نے اپنے تئیں اُن کے سپرد کیا اور اب ہماری تمام پریشانیوں اور تکالیف کا خاتمہ ہو گیا۔ لِلّٰہ الحمد۔

آج مجھے بغداد میں دو مہینے ہو گئے ہیں ؛ اسلئے اِسکے متعلق ذاتی کچھ دیکھے کے قائم ہوئی ہیں

یوروپ والے تو ہندوستان کے اعلےٰ سے اعلےٰ شہروں کو بھی خراب کہتے ہیں، لیکن جہاں تک میونسپلٹی کا تعلق ہے، بغداد، ہندوستان کے شہروں سے بھی گیا گذرا ہے۔ یہ نہیں کہ یہاں میونسپلٹی نہیں، میونسپلٹی ہے، اسکا رئیس (پریسیڈنٹ) ہے، اور منتخب شدہ اور حکومت کے نامزد کردہ، دونوں قسم کے اعضاد (میمبر) ہیں، مگر شہر کے (اور شہر چھوٹا نہیں، بڑا غداً شہر ہے) تمام گلی کوچے کچے ہیں، کوئی پکی سڑک نہیں، کوچے تنگ اور پیچدار جنہیں ہفتہ بھر کوڑا پڑا رہتا ہے، ہفتہ میں ایک مرتبہ صفائی ہوتی ہے۔ صرف میدان یعنی وہ حصہ جہاں ترک رہتے ہیں اور کچہریاں ہیں، صاف ہے، اور وہاں سڑکیں بھی چوڑی ہیں، مگر کچی۔ لیکن درع عیب جملہ بگفتی ہنرش نیز بگو۔ بغداد کے مکان سجے اور شاندار ہیں، دجلہ کے دونوں کنارے، قصر بہت خوبصورت اور نئی وضع کے ہیں، سڑک سے مکانوں میں داخل ہو جیئے تو تعجب ہوتا ہے کہ مکانوں میں کیسی صفائی رکھی جاتی ہے۔ یہاں عام طور پر لوگ مصارفِ زندگی خرچ کرتے ہیں، مکانات کے تمام کمرے الافرنگ (یوروپین وضع میں) سجے ہوتے ہیں۔ شلاملق یا سافرادوہ سی (ڈرائنگ روم) کی آرایش میں بہت صرف کیا جاتا ہے اور اکثر ڈرائنگ روم کے سٹ نہایت خوبصورت اور قیمتی ہوتے ہیں۔ اہل بغداد کے شوق کا اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ باوجود ان سڑکوں کے یہاں بہت سی فٹن اور بگھیاں ہیں، اور کم وبیش سو بائسکلیں ہیں جو ان سڑکوں پر خدا ہی جانتا ہے کس طرح دوڑتی پھرتی ہیں۔

گورنمنٹ ہوس یعنی وہ عمارت جسمیں تمام کچہریاں اور دفاتر ہیں اور جسے یہاں سرای حکومت کہتے ہیں، بڑی شاندار عمارت ہے، اور دفاتر ہندوستانی دفتروں کی بلکہ انسے بہتر سجے ہوئے ہیں۔

"علی گڈھ منتھلی" کے مضمون میں بغداد کے مدارس کا کچھ ذکر لازمی ہے۔

مدینۃ العلم والفضل بغداد، اپنی تمام فضیلت کھو بیٹھا ہے۔ مدرسۂ نظامیہ کے شہر میں آج، پرانی یا نئی تعلیم کا کوئی ایسا مدرسہ نہیں ہے جسے کالج کے لقب سے یاد کیا جائے۔ ہاں دس بارہ اسکول ہیں، جنہیں زیادہ تر یہود و نصاریٰ کے یا امریکن مشن، پروٹسٹنٹ مشن، فرنچ کیتھولک مشن،

سکے ہیں، یہ اسکول ہندوستان کے مشنری اسکولوں کیطرح بہت منتظم اور عمدہ حالت میں ہیں، مسلمانوں کی طرف سے کوئی اسکول نہیں، صرف حکومت کی طرف سے چند اسکول ہیں، مثلاً مکتبِ ابتدائیہ، مکتبِ رشدیہ، مکتبِ اعدادیہ، مکتبِ صنائع؛ مگر اہلِ شہر عرب مسلمان ان میں بھی کم پڑھتے ہیں؛ ترک ہی زیادہ تر ان مدرسوں میں سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔

مکتبِ اعدادیہ، فوجی اسکول ہے، یہاں سے تعلیم پاکر طلبہ قسطنطنیہ کے ملٹری کالج میں بھیجے جاتے ہیں۔ اعدادیہ کے طلب العلم فوجی وردی پہنتے ہیں، اور یہ گورے گورے چھوٹے چھوٹے کپتان و کرنیل و جرنیل اپنی چھوٹی چھوٹی وردیوں اور لال لال ٹوپیوں میں بہت ہی بھلے معلوم ہوتے ہیں۔ کیا خبر ہے کوئی آیندہ زمانیکا عثمان پاشا ان ہی میں پڑھ رہا ہو؟

یہاں تعلیمِ نسواں کے معنی صرف مضامینِ متعلق تعلیمِ نسواں لکھنا نہیں ہے۔ عیسائیوں اور یہودیوں کے تو بہت سے مدارسِ نسواں ہیں۔ اسکے کہنے کی ضرورت نہیں، مسلمانوں کے لئے بھی ایک مکتبِ نسواں ہے؛ جو ہائی اسکول کے درجہ تک ہے۔ اور اس میں ترکی اور بعض عربی خانمیں پڑھتی ہیں۔ خانموں کے ذکر میں پردہ کا ذکر بھی بیموقع نہوگا۔ یہاں تمام مسلمان عورتیں، ادنیٰ اور اعلیٰ درجہ کی برقع اوڑھ کر خود بازار جاتی ہیں۔ اور خود خرید و فروخت کرتی ہیں۔ ترکی خانموں کا پردہ تو بالکل برای نام ہوتا ہے، اُن کے چہرہ کا نقاب اسقدر باریک ہوتا ہے کہ بعض اوقات قریب سے دیکھنے والوں کو چہرہ صاف نظر آتا ہے۔ لباس ترکنوں کا بالکل انگریزی ہے، لیکن عربنوں کا عربی ہوتا ہے۔

ترکی حکومت کا سول انتظام کیسا ہی ہو، اور خدا شاہد ہے، کہ اس میں اصلاح کی سخت ضرورت ہے، لیکن میں افواجِ عثمانی کی بہت تعریف سنتا تھا، وہ بہادر اور توانا ضرور ہیں، مگر اتنا کہنا پڑتا ہے کہ احمد فیضی پاشا[1] مُشیر (کمانڈر انچیف) ولایتِ بغداد، عساکرِ عثمانیہ کو اچھی حالت میں نہیں رکھتے

[1] یہ ولایتِ بغداد کے مشیر ہیں۔ اور اب کوئی سال بھر سے والیِ بغداد (گورنر جنرل بغداد) بھی یہی ہیں۔ یہاں عام طور پر ان کے انتظام سے ناراضی پھیلی ہوئی ہے۔

وردیاں پھٹی ہوئی ہیں، جوتے ٹوٹے ہوئے ہیں، اور وہ اس حالت میں سڑکوں پر پڑے پھرتے ہیں۔ میں سُنتا ہوں کہ ممالکِ عثمانیہ کے دیگر ولایات میں ایسی ابتر حالت میں نہیں ہیں۔ انھیں خرابیوں کے رفع کرنیکے لئے سلطنتِ عثمانیہ میں نئے تعلیم یافتوں کی ایک پارٹی ہے جسے یہاں عام طور پر اسکے فرانسیسی نام جانِ ترک (نوجوانِ ترک) کے نام سے پکارتے ہیں، اور جسے انگریزی اخبارات ینگ ٹرکش پارٹی کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔ یہ پارٹی، ٹرکی کی نیشنل کانگرس سمجھنی چاہیئے۔ صرف فرق اسقدر ہے کہ اس ٹرکش نیشنل کانگرس کے ممبر ٹرکی ہیں۔ اپنی زبان نہیں کھول سکتے، اور انڈین نیشنل کانگرس والے دھڑلے سے ہندوستان میں جلسے کرتے ہیں اور اخبار نکالتے ہیں۔ بانی اس پارٹی کا مرحوم مدحت پاشا تھا جسے میں اپنے اعتقاد کے موافق، ٹرکی کا لبرل سید احمد خاں اور پولیٹیکل نجات دہندہ سمجھتا ہوں۔ اِس پارٹی والے بیچارے، لنڈن اور پیرس میں جاکر جلسے کرتے ہیں، وہاں سے اخبار نکالتے ہیں، مگر ان کے ہمدرد یہاں بجز انکے بصدق دعائے بکندا ور کچھ نہیں کرسکتے لیکن یہ پارٹی ہمیشہ ایسی حالت میں نہیں رہی، جب رئیس الامرا مدحت پاشا کا دور دَورہ تھا، تو اس پارٹی کا زور تھا، اور ۱۸۷۶ء میں ٹرکی کو پارلیمنٹ نصیب ہوگئی تھی! کاش وہ دَورہ قائم رہتا، تو آج ٹرکی کا چھوٹا بھائی جاپان اکیلا ترقی نہ کرجاتا، بلکہ ترقی کی بساط پر اُسکے ساتھ یہ بھی بیٹھی ہوتی۔

اس پارٹی کے چند ممبروں سے میری بھی ملاقات ہوئی، اور تبعۂ دولتِ اجنبی سمجھکر اپنے خیالات کو انھوں نے مجھسے نہیں چھپایا۔ اُن کی لیاقت، اُن کی وُسعتِ نظر، اُن کی حُبِّ وطن اور حُبِّ ملت دیکھکر مجھے تعجب ہوتا ہے کہ یہ لوگ ملک کے دشمن سمجھے جاتے ہیں۔ یہ لوگ سلطان عبدالحمید خاں سے بالکل خوش نہیں اور انھیں ہمیشہ تخت سے اُتارنے کے درپے رہتے ہیں، ابھی حال ہی میں رؤیٹر نے اطلاع دی تھی کہ خود سلطان کے داماد، کامل پاشا مع بہت سے اعلیٰ عہدہ داروں کے، شاہزادی خدیجہ دُختر معزول سلطان مراد خاں کے ساتھ خفیہ خط وکتابت رکھنے کے جرم میں پکڑے گئے۔ یہ بھی ینگ ٹرکش پارٹی کی ناکام کوششوں سے ایک

کوشش تھی، یہاں اسکے حالات مفصل معلوم ہوئے ہیں، کوشش یہ تھی کہ سلطان عبدالحمید خاں کو معزول کر کے سلطان مراد کو دوبارہ تخت پر بٹھائیں، مگر پوری نہ ہوئی، نوجوان ترکوں کو چھوڑ کر عام اہلِ ملک بہت وفادار معلوم ہوتے ہیں کیونکہ یہاں ہر محفلِ رقص و سرود کے اختتام پر (جہاں قانون، شنینہ کمانہ اور عود پر عربی موسیقی کا کمال دکھایا جاتا ہے) ذیل کا راگ بطور نیشنل انیتھم کے گایا جاتا ہے:—

| | |
|---|---|
| آدم آدم ربي | عبد الحميد الغازي |
| والنصرة في الحرب | في كل اعزاز |
| في عصر الجديد | لله عظيم الشان |
| في ظل مولٰنا | مولا بني عثمان |
| سلطاننا المهاب | ذلت له الرقاب |
| يا رب يا وهاب | ابذل له الاعزاز |

اللہ اللہ! بغداد شریف کی خاک میں کیسے کیسے بزرگ سوتے ہیں، امام موسیٰ کاظم و امام محمد تقی علیہم السلام، شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ، اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ! ان کے مزاروں کی زیارت میں نے کی، اور ہر جگہ نہ معلوم کن کن خیالات کا ہجوم ہوا، افسوس ہے کہ میں مذہبی آدمی نہیں اور نہ مجھے مذہبی واقفیت ہے، تاہم میرے بے بہرہ دل پر اس امر کا اثر ہوتا تھا کہ میں اُن بزرگوں کی حضوری میں ہوں جو اپنے علم، اپنی فضیلت، اور اپنے تقدس کی وجہ سے اسلام اور مسلمانوں کے لئے باعثِ فخر و سببِ برکت تھے،

امام موسیٰ کاظم کا مزار نہایت ہی شاندار ہے، مگر شیخ، اور امام ابوحنیفہ کے مزاروں کی عمارتیں بہت اعلیٰ درجہ کی نہیں ہیں، تاہم کیا انکی شان مزاروں کی رفعت سے مستغنی نہیں؟

مگر دار الخلافۃ بغداد کے شاہی محل کہاں ہیں؟ وہ کتبخانہ، وہ مدرسے، وہ رصدگاہیں کدھر

فٹ نوٹ:— یہ سب یہاں کے باجوں کے نام ہیں جنمیں قانون اور عود بہت اچھے باجے ہیں۔

ہیں؟ مدرسۂ نظامیہ کس جگہ ہے؟ قصرِ خلد کس طرف ہے؟ آہ! یہ سوالات ہلاکو خاں سے کرو، ہم کیا جواب دیں۔

شمس العلما مولانا حالی دہلی کے سیاح سے کہتے ہیں ؎

دیکھ اس شہر کے کھنڈروں میں نہ جانا ہرگز
لیکے داغ آئیگا سینے پہ بہت اے سیاح

لیکن یہاں اس نصیحت کی بھی ضرورت نہیں، کیونکہ یہاں کھنڈر تک نہیں رہے۔ ولایت بغداد کے سرکاری سالنامہ میں مؤلف تاریخی عمارات کے ذکر میں فرماتے ہیں:۔

"جہاں آجکل دفترِ نظارتِ رسومات ہے، وہاں مدرسۂ نظامیہ تھا!" ہارون اور مامون کی تمام کوششوں کا یہ نتیجہ ہے!! ہاں ایک زبیدہ کا مقبرہ تو شکستہ حالت میں باقی ہے، جہاں عرب راہزن رات کو جمع ہو کر مالِ غنیمت آپس میں تقسیم کرتے ہیں۔ بابل جو ہزاروں برس پہلے تباہ ہو، اُسکے کھنڈر تو باقی ہوں، اور نہ باقی ہوں تو عباسیوں کے جاہ وجلال کے نشان! اگرچہ بابل کو ہلاکو نے تھوڑا ہی تاراج کیا تھا۔

لیکن کیا یہ تعجب کی بات نہیں کہ جو قوم بغداد کو تباہ کرے، اُسی کی ایک شاخ جامع مسجد قلعۂ دہلی، و تاج محل آگرہ جیسی عمارتیں ہندوستان جا کر بنائے؟ کیا یہ مغلوں کی طرف سے تباہیِ بغداد کا نادانستہ کفارہ تھا؟

بہرحال اے بدبخت دہلی و آگرہ! تم پھر بھی خوش نصیب ہو کہ تمہاری بہت سی مشہور عمارتیں قائم ہیں؛ اور تمہارے کھنڈر ابھی غائب نہیں ہوئے، مگر اے بغداد! ــــ؟

بغداد۔ جولائی ۱۹۰۴ء۔ (ہلال رمضان)

# رسالۂ اتحاد اور ہندو مسلمانوں کا باہمی ارتباط

✻

ہمکو خوشی ہے کہ ہمارے ملک کے مشہور اہلِ قلم مولوی عبدالحلیم صاحب شرر نے لکھنؤ سے ایک رسالہ بنام اتحاد جاری کیا ہے، جسکا مقصد ہندوستان کی دو بڑی قوموں ہندو اور مسلمانوں میں

اتحاد کو ترقی دینا ہے پھر بھی خواہ ملک کے لئے اس سے زیادہ خوشی کی کوئی بات نہیں ہوسکتی کہ ہندوستان کی اِن دو بڑی قوموں کے درمیان یگانگت بڑھے اور نفاق دُور ہو، جو لوگ خواہ ہندو ہوں یا مسلمان، اپنی حماقت یا خود غرضی سے قومی جوش کے پیرایہ میں اِن دونوں قوموں کے درمیان مُنافرت کے بڑھانیکی کوشش کرتے ہیں، وہ ملک کے اور نیز اپنی قوم کے حقیقی دشمن ہیں، اور اگر اُن کی نیک نیتی پر حملہ نہ کیا جائے تو بھی ہم اُن کو نادان دوست سے بہتر لقب نہیں دے سکتے ہیں، اور ایسے لوگوں سے ہر حال میں حذر واجب ہے۔ ہم اپنے معزز معصر کو اُن کے نیک ارادہ پر مبارکباد دیتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ وہ اپنے عمدہ مقاصد میں کامیاب ہوں۔ چونکہ بعض لوگوں کی راے ہے کہ اس کشمکش کے زمانے میں ہندو اور مسلمانوں کے درمیان اتحاد کی کوشش ایک لا حاصل ہے، اور اس میں کامیابی کا کسی طرح امکان نہیں ہے۔ اِسلئے ہم اس وقت اِس مسئلے پر کسیقدر تفصیل سے بحث کرینگے۔ اوّل اُن اسباب کا پتہ چلائینگے جو مانع اتحاد ہو سکتے ہیں۔ اور پھر دیکھینگے کہ وہ اسباب بحالتِ موجودہ کہاں تک اپنا اثر رکھتے ہیں۔ ہمارے نزدیک ہندو مسلمانوں کی علیحدگی کے پانچ بڑے سبب ہو سکتے ہیں۔ اوّل اجنبیت۔ دوم اختلافِ رسم و رواج۔ سوم فاتح و مفتوح کا فرق چہارم اختلافِ مذہب پنجم جدید تعلیم

اس میں شک نہیں کہ ہندو اِس مُلک میں پیشتر سے آباد تھے۔ اور مسلمان بعد میں آئے، اور ہر اجنبی شخص سے ابتدا میں یک گونہ علیحدگی رہتی ہے۔ اور اسی بنا پر کچھ مدت تک ہندوؤں کو مسلمانوں سے مغائرت رہی ہوگی، مگر چونکہ مسلمان ہندوستان میں بس پڑے اور بسے بھی ایسے کہ ہندوؤں کے ساتھ چاندہ سے چاندہ ملا کر اور آب و ہوا کے اثر اور تبادلہ خیالات سے اُن کے بالکل ہمرنگ و ہم خیال ہوگئے اسلئے بتدریج ایک دوسرے کے مانوس ہوگئے اور سمجھنے لگے کہ ہم دونوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ہم توام پیدا ہوئے اور توام رہینگے اور ہم دونوں کا مرنے جینے کا ساتھ ہے اس حالت کی مثالیں ہم دیہات میں جہاں نئی علمی روشنی ابھی تک کم پہونچی ہے بکثرت پاتے ہیں اسلئے یہ سبب بحالتِ موجودہ مانع اتحاد نہیں۔

## وجہ دوم یعنی اختلافِ رسم و رواج

اِس میں شک نہیں کہ گرم اور زرخیز ملکوں کی آب و ہوا بہت جلد سوسائٹی میں سے جمہوریت کی روح کو زائل کر دیتی ہے اور اُس میں مختلف طبقوں کے لوگ پیدا ہو جاتے ہیں اسیوجہ سے آریوں کے ہندوستان میں آتے ہی ذاتوں کی تفریق شروع ہو گئی اور ایک گروہ دوسرے گروہ سے اپنے تئیں اعلیٰ و برتر سمجھنے لگا اور ادنے گروہ کے لوگوں کے ساتھ کھانا پینا رشتہ ناتہ باعثِ ننگ و عار ہوا اور یہ حالت سوسائٹی کی اسقدر عرصہ دراز تک قائم رہی اور اس قسم کے امتیازات کے یہ لوگ استنے عادی ہو گئے کہ اُن اصلی وجوہ سے قطع نظر کر کے کہ جن سے یہ امتیازات پیدا ہوئے تھے وہ اُن کو اپنا پیدایشی حق سمجھنے لگے۔ ایک برہمن کا بیٹا خواہ وہ ویش لوگوں کے ہاں دربدر بھیک مانگتا ہی کیوں نہ پھرے مگر وہ اپنے تئیں مہاراج پانو لاگین کے خطاب کا مستحق جانتا تھا اور چھتری بچہ خواہ کیسا ہی نحیف و زار کیوں نہو ایک شودر سے خدمت لینا اپنا قدرتی حق سمجھتا تھا۔ جبکہ ہندو سوسائٹی کی یہ حالت تھی۔ اُن میں ایک ایسی قوم آئی جنکے ہاں لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ کے دو لفظ کہنے سے ذلیل سے ذلیل آدمی بڑے سے بڑے شخص کے ساتھ ہمسری کا دعویٰ کر سکتا تھا اور کھانے پینے اُٹھنے بیٹھنے میں اُسکا شریک ہو سکتا تھا۔ کُلُّ مُؤْمِنٍ اِخْوَۃٌ کی یہ مساوات ہندو مذاق کے بالکل خلاف تھی۔ اور ایسے لوگوں کے ساتھ ہندوؤں کا شیر و شکر ہو جانا ذرا مشکل تھا مگر رفتہ رفتہ یکجائی کیوجہ سے خود مسلمانوں میں اسی قسم کے امتیازات پیدا ہو گئے۔ اُنھوں نے ہندوؤں کے بہت سے رسم و رواج اختیار کر لئے۔ ہندو بھی اُن کے اِن طریقوں کے دیکھنے کے اسقدر عادی ہو گئے کہ اُن کی نظروں میں اُنکا انوکھا پن جاتا رہا اور بعض باتیں ہندوؤں نے مسلمانوں کی اختیار کر لیں غرضکہ اب ہندوؤں کا مسلمانوں سے پرہیز یعنی چھوت کا مسئلہ ایک جسم بیجان ہے اُسکی اصلی روح نکلی ہے اُسکا عملدرآمد کسی عداوت یا نفرت کیوجہ سے نہیں کیا جاتا بلکہ محض ایک رسمی بات ہے جو نئی تعلیم کی بدولت اُٹھتی جاتی ہے۔ اسلئے یہ دوسرا سبب بھی مانعِ اتحاد نہیں ہو سکتا۔

تیسرا سبب باہمی اختلاف کا فاتح و مفتوح کا فرق ہے مگر ہمکو خوشی ہے کہ بجز معدودے چند

شاہوں کے مسلمانوں نے اس فرق کو بہت کم قائم رکھا۔ اُن کے عہد میں ایک قوم کی حکومت دوسری قوم پر نہ تھی بلکہ ایک شخص واحد کی حکومت دونوں قوموں پر ہوتی تھی۔ مسلمان چونکہ ہندوستان میں بہت جلد آباد ہو گئے۔ اس لئے رعایا ہونے میں ہندوؤں کے برابر تھے۔ دونوں قوموں کے لوگ اکثر برابر عہدہ پاتے تھے۔ مسلمان بادشاہ کے جھنڈے تلے ہندو وفاداری کے جوہر دکھاتے تھے اور ہندو راجہ کی فوج میں مسلمان دادِ مردانگی دیتے تھے۔ اور اگر یہ امتیاز کبھی رہا بھی ہو مگر اب عرصے سے دونوں قومیں یکساں حالت میں ہیں، دونوں ایک بادشاہ کی رعایا ہیں۔ دونوں مفتوح ہیں اور اس بات کا موقع ہے کہ ؎

آ عندلیب مل کے کریں آہ و زاریاں      تو ہائے گُل پکار میں چلاؤں ہائے دل

کی صدا بلند کریں۔

چوتھا سبب باہمی علیحدگی کا اختلافِ مذہب ہے۔ مگر اب دُنیا میں خود مذہب کی کوک ڈھیلی ہے۔ عیسیٰ بدینِ خود موسیٰ بدینِ خود کے مسئلے پر دُنیا کاربند ہوتی جاتی ہے۔ اب وہ زمانہ نہیں ہا کہ اختلافِ مذہب کیوجہ سے مسلمان اسپین سے یا یہودی روس سے نکالدیے جائیں۔ اب دُنیا میں ٹولریشن کی عملداری ہے۔ دوسرے ہندوؤں کے مروجہ مذہب میں بھی بہت کچھ اصلاح ہوتی جاتی ہے تعلیم نے توحید کے مسئلے کو جو اسلام کی جان ہے ہندوؤں میں بہت کچھ زندہ کر دیا ہے۔ اب کوئی تعلیم یافتہ ہندو فو کرور خدا انہیں مانتا۔ مورتی پوجن کے بھی اکثر لوگ مخالف ہوتے جاتے ہیں۔ رہا بیشمار دیوتاؤں کا مسئلہ یہ کوئی مالاینحل مسئلہ نہیں ہے۔ خود مسلمانوں کے ہاں یہ مانی ہوئی بات ہے کہ خدا نے ایک لاکھ اسی ہزار یعنی بیشمار نبی اپنی خلقت کی ہدایت کے لئے دنیا میں پیدا کئے اور کوئی حصہ دنیا کا ایسا نہ چھوڑا جہاں اِتمامِ حجت نہ کیا ہو۔ پس ممکن نہیں کہ ہندوستان جیسے وسیع ملک کو خدا نے اپنے مرسلین سے خالی چھوڑا ہو اور احتمال ہے کہ ہندوؤں کے دیوتا اسی قسم کے لوگ ہوں جنکو ہم مرسلین کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور جب ہم دیکھتے ہیں کہ ان لوگوں نے بھی اپنی قوم کو نیکی کا راستہ بتانے کی کوشش کی ہے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ ہم اُن بزرگ منش لوگوں کو

ابھرا کیں۔ رہے ہندو ان کی طبیعتوں میں ہیرو ورشپ کا مادہ پہلے ہی سے ضرورت سے زیادہ موجود ہے وہ اب بھی مسلمان ولی اللہ کی عزت کرتے ہیں، فقرا کو مانتے ہیں۔ محرم میں سبیلیں لگاتے ہیں شہیدوں کی قبروں پر چڑھاوے چڑھاتے ہیں۔ علیگڈھ میں اساڑھ کے مہینے میں شاہ جمال کی قبر پر ریوڑیوں اور پیسوں کا زیادہ تر حصہ غالباً ہندوؤں ہی کے پاس سے آتا ہے۔ امروہہ میں شیخ سدو کے بکرے اکثر انھیں کی طرف سے چڑھتے ہیں۔ بہرائچ اور مکن پور کے میلوں کی رونق یہی لوگ بڑھاتے ہیں۔ غرضکہ ایسی قوم سے یہ اندیشہ نہیں ہو سکتا کہ وہ مسلمانوں کے بزرگان دین کی عزت میں کسی قسم کی کوتاہی کرینگے۔ ایسی حالت میں اگر مسلمانوں کی طرف سے بھی کچھ محبت مساوات ہو اور وہ ہندوؤں کے بزرگان دین کو وقعت کی نگاہ سے دیکھیں تو ممکن نہیں کہ مذہب ان کے اختلاط باہمی میں کوئی روڑا اٹکا سکے۔

مذکورۂ بالا اسباب کا جو کچھ اثر تھا وہ مسلمانوں کے فتوحات کے شروع زمانہ میں ہوگا مگر عرصۂ دراز تک ساتھ رہنے کی وجہ سے وہ سب اثر زائل ہو چکے تھے اور مدت سے دونوں قومیں مثل بھائی بھائیوں کے رہتی تھیں۔ ایک دوسرے کو رشتہ سے پکارتے تھے۔ غم و شادی میں شریک ہوتے تھے۔ بجز کھانے پینے کی چھوت اور لباس کے خفیف سے فرق کے دلوں میں مطلق فرق نہ تھا۔ ہم کو اپنے بچپن کی باتیں بخوبی یاد ہیں۔ ہمارے محلے میں چند گھر اگروال بنیوں کے اور دو ایک گھر گوڑ برہمنوں کے تھے۔ ان کی عورتیں ہمارے گھروں میں آیا کرتی تھیں۔ ہم انھیں ہمیشہ رشتہ کے الفاظ سے خطاب کیا کرتے تھے۔ اگر ہمارے ہاں کسی کے کانٹا بھی لگتا تو ان کو اسیقدر تکلیف ہوتی تھی جسقدر کہ اپنے قریبی رشتہ داروں کو۔ اور یہی حال ہماری گھر کی بیویوں کا ان کے ساتھ تھا۔ غرضکہ اختلاف قوم و ملت کسیطور پر مانع دوستی و محبت نہ تھا اور یہی حالت اکثر قصبات میں تھی۔ مگر افسوس ہے کہ پچھلے تیس برس میں جدید تعلیم نے ہماری سوسائٹی میں ایک بڑا انقلاب پیدا کر دیا۔ ہندو اور مسلمان جو پیشتر بہت یگانگت رکھتے تھے اب بالکل بیگانہ ہو گئے۔ تعلیم نے جو مثل آبحیات کے ہے ہمارے لئے سمی اثر پیدا کئے اور ہمکو نئی تعلیم کی شان میں یہ شعر پڑھتے

ہوئے شرم آتی ہے کہ ؎ تو برای وصل کردن آمدی ٭ نے برای فصل کردن آمدی ٭
انسان فطرتاً خود غرض واقع ہوا ہے۔ وحشت کے زمانے میں وہ اپنی خواہشات کا بندہ ہوتا ہے
مگر جب ایکدرجہ ترقی کرتا ہے تو اُسکی ہمدردی اپنے قبیلہ کے لوگوں تک وسیع ہوتی ہے۔ پھر
ترقی کے دوسرے درجے میں اُسکی ہمدردی کا دائرہ زیادہ وسیع ہوکر اُن لوگوں تک پہونچتا ہے
جو ہر طرح سے اُسکے ہم خیال اور مثل ہیں اور جنکا نام وہ اپنی قوم رکھتا ہے۔ اور یہی حالت اب
ہندوؤں اور مسلمانوں کی ہے۔ مغربی تعلیم نے ابتدا میں ہماری قوتِ ہمدردی کو ضرور متحرک
کیا مگر ابھی اُسکو وسیع نہیں کیا اور اُسکے ساتھ ہی جب ہندوؤں نے تواریخ کے مطالعہ سے
اپنے پچھلے حالات سے آگہی پیدا کی تو اُن کو مسلمانوں سے یک گونہ تنفر پیدا ہو گیا لیکن یہ ایک
عارضی بات ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ تعلیم انسان کو بہائم سے دُور اور فرشتوں سے قریب کرتی ہے۔ اُسکی
بدولت کوتاہ نظری دُور اور دُور اندیشی پیدا ہوتی ہے۔ ایک قدم بڑھ کر وہ دونوں قوموں
کو بتائیگی کہ نفع ہمارا اسی میں ہے کہ ہم پرانے فسانے فراموش کردیں اور باہم سلوک سے رہیں۔
ہندوستان نہ آریوں کا اصلی وطن تھا اور نہ مسلمانوں کا۔ اصلی باشندوں کے لحاظ سے دونوں
غاصب ہیں۔ صرف ماقبل و مابعد کا فرق ہے اور اب قبضۂ مخالفانہ اسقدر عرصۂ دراز سے ہے
کہ کوئی بھی اُن میں سے بیدخل نہیں ہو سکتا۔ ایسی حالت میں بہتر یہی ہے کہ صلح و سازگاری سے
زندگی بسر کریں۔ قدرت کی دولت محدود نہیں ہے کہ اگر ہندو اُس میں سے زیادہ حصہ پالینگے
تو مسلمانوں کو کیا ملیگا۔ وہ نامتناہی ہے اور ہر شخص جسقدر چاہے اُس میں سے حصہ لے سکتا ہے
صرف کوشش شرط ہے۔ پس چھوٹی چھوٹی باتوں پر لڑنا کہ فلاں عہدہ ہندو کو کیوں ملا مسلمان
کو ملنا چاہئے تھا یا مسلمان کو کیوں ملا ہندو کا حق تھا ایک فضول بات ہے۔ دولت پیدا کرنے اور
آرام سے زندگی بسر کرنے کا ملازمت ہی ایک ذریعہ نہیں ہے۔ اُسکے ہزاروں طریقے ہیں۔ اگر تم
میں قابلیت اور ہمت ہے تو سو طرح سے اسباب معیشت بہم پہونچا سکتے ہو۔ یہودیوں کو دیکھو
کہ حکومت میں اُن کو بالکل حصہ نہیں ملا ہے، ملازمتِ سرکاری میں وہ بہت کم پائے جاتے ہیں۔ مگر

باینہمہ دُنیا میں سب سے زیادہ دولتمند قوم ہے۔ سرکاری ملازمون کو وہ محض اپنے گھر کا چوکیدار سمجھتے ہیں اور جو اسباب تعیش اُنکو حاصل ہیں اُسکا عشر عشیر بھی اُن لوگوں کو نصیب نہیں جو حکومت میں حصہ رکھتے ہیں۔ اسیطرح پر اُردو ناگری کے قصّے کو طول دینا اور اُسکی وجہ سے اچھّے دلوں کو بُرا کرنا دُور اندیشی کے خلاف ہے۔ مُلک کی زبان جو کچھ ہو ہی اور اُسمیں جو تبدیلیاں کہ قدرتی طور سے ہونیوالی ہیں وہ ہونگی اور ضرور ہونگی۔ نہ پرچارنی سبھا اُن کو روک سکتی ہی اور نہ انجمن ترقی اُردو کے بس کی بیر ہے حروف اُن کے لئے بھی لڑنا بیفائدہ ہی اگر اُن میں اپنی حفاظت کی قوت ہے تو وہ قائم رہینگے ورنہ مٹجائینگے۔ اگر خود اُنکے پیروں میں قائم رہنے کی قوت ہے تو وہ قائم رہینگے ورنہ لکڑی کی ٹانگ کو کھڑا کرنے سے کچھ فائدہ نہیں۔ دُنیا مفید چیز کو کبھی ہاتھ سے نہیں دیتی۔ پس اگر فارسی حروف میں بہ نسبت ناگری کے کسی قسم کی آسانی اور سہولت ہی تو لوگ اُنھیں کو استعمال کرینگے۔ خواہ کتنا ہی مذہبی رنگ دوسری قوم کے حروف پر چڑھا ہو۔ اور اگر اُن میں کوئی اصلی خوبی نہیں ہی بلکہ دوسرے حروف اُنسے مفید اور سہل تر ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ قائم رہیں اور اُن کی کوشش وسمہ برابر ہوے کور سے زیادہ مفید نہیں ہی۔ وہ ضرور مٹینگے اور اُن کو مٹنا چاہیئے۔ ہندو، مسلمانوں کی نسبت زیادہ تعلیم یافتہ ہیں اور اسیوجہ سے ہر شخص اُن سے زیادہ دُور اندیشی کی توقع کرتا ہی۔ اُن کا مرتبہ اس سے بالاتر ہے کہ وہ پُرانے توہمات کی حمایت کریں اور عوام کا ساتھ دیں۔ اُنکا فرض ہے کہ اگر جُہلا سے کوئی ایسی غلطی ہو بھی جائے جو باہمی رنجش کا باعث ہو تو وہ خوبصورتی سے اُسکی دُرستی کریں اور کوئی بات ایسی نہونے دیں کہ جس سے دوسروں کی دل آزاری ہو۔ سہ

خیالِ خاطرِ احباب چاہیئے ہر دم　　انیسؔ ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

بالخصوص وہ بزرگ جو ہندوستانیوں کے ایک نیشن ہونے کے خواہشمند ہیں اپنے روزمرّہ کے طرزِ عمل سے ثابت کریں کہ اُن کی خواہش ایک سچّی خواہش ہے۔

اگرچہ ہم روزمرّہ سُنتے ہیں کہ نئی تعلیم کا زہریلا اثر زیادہ تر ہندوؤں پر ہوا ہی۔ وہ مسلمانوں کے خلاف دفاتر میں سازشیں کرتے ہیں اُنکو داخل نہیں ہونے دیتے اور اگر بخت اتفاق سے داخل بھی ہو جاتا ہے، تو اُسکی بیخ کنی کی

کوشش کرتے ہیں۔ ہندو افسر مسلمان ماتحتوں کو تنگ کرتا ہے۔ ہندو ماتحت مسلمان افسر کے ساتھ وفاداری سے کام نہیں کرتے مگر ہم اپنے اُصول کے موافق سمجھتے ہیں کہ یہ قومی جوش کا ابتدائی درجہ ہے اسکے بعد وہ دن آنیوالا ہے کہ جب اس قسم کی دوئی جاتی رہیگی اور ہمہ اوست نظر آنے لگیگا۔ ہم جانتے ہیں کہ یہ سب عارضی باتیں ہیں۔ ہندو اور اُنکا مذہب دونوں لچکدار واقع ہوئے ہیں وہ غیروں کو اپنا بنا لیتے ہیں۔ پارسیوں کے ساتھ جو مسلمانوں کی نسبت نو وارد ہیں اُنکا کیسا اچھا سلوک ہے۔ پہاڑی قومیں جو کچھ عرصہ پہلے بہائم سے بہتر نہ تھیں اب ہندوؤں کے ساتھ تعلق رکھتی ہیں۔ ہندو فطرتاً ایک نہایت احسانمند و نرم دل قوم ہے۔ انسان تو انسان اگر اُن کو کسی حیوان یا بیجان شئے سے بھی کچھ نفع پہونچتا ہے تو اُس کی بزرگداشت کو پرستش کے درجے تک پہونچا دیتے ہیں اگر کوئی اُن کی طرف ایک گز بڑھتا ہے تو وہ دس گز اُس سے قریب ہو جاتے ہیں۔ پس اگر مسلمان اُن کے ساتھ اچھا سلوک کرینگے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ ہندو اُن سے متنفر رہیں اور اسکے ثبوت وہ شاہانِ مغلیہ کے زمانے میں بہت کچھ دے چکے ہیں اور خود ہمارا تجربہ ہے کہ ہم دہلی کے سرکاری بورڈنگ ہوس میں رہا کرتے تھے۔ جہاں مسلمان خال خال اور زیادہ تر ہندو ہی بورڈر ہوا کرتے تھے۔ ہمکو ان لوگوں کے ساتھ ساڑھے تین سال تک رہنے کا اتفاق ہوا مگر ہمارے ساتھ اُنکا برتاؤ ہمیشہ نہایت یگانگت کا رہا اور ہم نہیں کہہ سکتے ہیں کہ وہ ہم میں اور اپنے ہندو بھائیوں میں کسی قسم کا فرق کرتے تھے۔ اُن میں سے بعض کے ساتھ ہم کو زیادہ خلوص تھا اور وہ خلوص اسوقت تک اُسی درجے کا ہے

اِس بیان سے ہمارا مطلب یہ ہے کہ اگر مسلمان چاہیں تو یہ کوئی دشوار بات نہیں ہے کہ ہندو اُن کے ساتھ پھر مانوس ہو جائیں۔ اور وہ دن ہندوستان کے لئے نہایت مبارک دن ہوگا جبکہ اِن دو بڑی قوموں کے درمیان یکجہتی و یکدلی پیدا ہوجائیگی اور جو لوگ کہ اس اتحاد کے حامی ہیں وہ ہندوستان کے بڑے محسن کہلائینگے۔ اِس لئے ہم رسالہ اتحاد کا نہایت گرمجوشی سے خیر مقدم کرتے ہیں۔

ولایت حسین۔

# اولڈ بوائز ایسوسی ایشن

بعالیخدمت جناب سکرٹری صاحب اولڈ بوائز ایسوسی ایشن۔

ا۔قبل اسکے کہ میں اُن تجاویز پر جو کہ آپنے اولڈ بوائز کی فلاح کے لئے پیش کی ہیں کچھ اپنی راے بحیثیت ایک اولڈ بواے ہونے کے ظاہر کروں۔نہایت ہی ادب سے یہ درخواست کرنیکی اجازت چاہتا ہوں کہ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے ناکامیابی کے اسباب میں سے ایک سبب کالرکن جماعت کی لاپروائی بھی ہے۔

میرے اِس فقرے سے آپ یہ نہ خیال کریں کہ کیا مہمل اور بے موقع فقرہ ہے بلکہ میرا مطلب اِس فقرے سے یہ ہے کہ آپنے جو مضمون بہ عنوانِ بالا لکھا وہ بجز علیگڈہ منتھلی کے اور کسی پرچے میں شائع نہیں کرایا۔آپکو چاہیئے تھا کہ ایسی اہم تجاویز کے لئے یہ مضمون علیحدہ چھپواکر تمام اولڈ بوائز کے پاس بھیجتے اور اگر یہ ممکن نہ تھا تو یہ تو ضرور ممکن تھا کہ متعدد پرچوں میں یہ مضمون شائع کرایا جاتا۔کیونکہ منتھلی بہت سے لوگوں کی نظر سے نہیں گذرتا۔ایک میں ہی اپنی کہتا ہوں کہ اگر میرے چچا مولوی حبیب اللہ صاحب جوائینٹ مجسٹریٹ یہاں رخصت پر نہ ہوتے تو میری نظر سے وہ مضمون نہ گذرتا۔اسکے بعد میں آپ کی اُن تجاویز پر جو آپنے اولڈ بوائز کے لئے ظاہر کی ہیں اپنی راے ظاہر کرتا ہوں۔

## لباس

اگر آپکے ملاحظے سے اپریل کا عصرِ جدید گذرا ہے تو آپکو خیال ہوگا کہ میں نے ایک مضمون "ہم اور ہماری طرزِ معاشرت" کے عنوان سے لکھا تھا اور اُس میں لباس کا خاص طور سے ذکر کیا تھا ۔میں خوش ہوں کہ جس لباس کیطرف میں نے اشارہ کیا تھا وہی لباس آپ بھی اولڈ بوائز کیلئے تحریر کرتے ہیں۔فرق صرف اسقدر ہے کہ میں نے بجاے پتلون کے وہ پائجامہ لکھا تھا جو کہ علیگڈہ میں

زیادہ رائج ہے اور جسکو لوگ علی گڈھی پائجامہ کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ کیونکہ پتلون ابھی ہماری سوسائٹی کے لئے موزوں نہیں ہو سکتا۔ اور بعض مقاموں پر پتلون سے تکلیف اُٹھانی پڑتی ہے۔ لہذا پائجامہ زیادہ مناسب ہے۔ مگر اُس کے ساتھ ہی میں انگریزی ٹوپی کے بالکل خلاف ہوں۔ خواہ برسات کا موسم ہو، خواہ گرمی کا، خواہ لو ہو، خواہ دُھوپ ہو۔ ہمکو اپنی تُرکی ٹوپی نہ چھوڑنی چاہیئے۔ میں حبیب اللہ خان صاحب تحصیلدار ہاترس کی اس رای میں متفق ہوں کہ اس تجویز کو عملی صورت میں لانا مشکل ہے۔ مگر ہمکو کام شروع کر دینا چاہیئے اور دیکھنا چاہیئے کیا نتیجہ ہوتا ہے کچھ نہ کچھ نتیجہ تو ضرور ہی ہوگا کم سے کم وہ صاحبان جو اسکے محرک و مؤید ہونگے انگریزی کوٹ کو اُتار کر ترکی کوٹ زیب تن فرمائینگے

## کالج کی خدمت کرنا اپنا فرض سمجھنا

یہ سوال ذرا اہم اور وقت طلب ہے، مگر اُسکے ساتھ ہی اسکا بڑا الزام کالج اور اُسکے ٹرسٹیز پر ہے، کیونکہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ "کالج کی خدمت کرنیکے کیا معنی ہیں" کیا بقول میرے عزیز کے کہ "کالج کی خدمت صرف روپیہ ہی سے ہوسکتی ہے" میرے خیال میں ٹرسٹیز کالج کالج کیخدمت اسیکو سمجھتے ہیں۔ چنانچہ ہمارے سیکرٹری صاحب نے بھی اولڈ بوائز کی بے اعتنائیوں کا ذکر کرتے وقت وہ مثال دی ہے جسمیں ہر اولڈ بوائے کو اپنی آمدنی میں سے عہ فیصدی دینا چاہیئے۔ میری یہ رائے نہیں ہے کہ اولڈ بوائز کو عہ فیصدی نہ دینا چاہیئے، نہیں اُنکو عہ فیصدی نہیں بلکہ عا فیصدی دینا چاہیئے۔ مگر اُسکے ساتھ ہی مجھکو یہ درخواست کرنیکا حق ہے کہ کیا اولڈ بوائز کے کچھ حقوق کالج پر نہیں ہیں، کیا وہ کالج کے معاملات کو کچھ نہیں سمجھ سکتے ہیں، اور اگر سمجھ سکتے ہیں اور حقوق بھی ہیں، تو تعجب اور سخت تعجب ہے کہ کیوں اولڈ بوائز پوچھے نہیں جاتے۔ کالج میں اولڈ بوائز کا ذکر صرف اُسوقت میں کیا جاتا ہے جبکہ کوئی چندہ کی اسکیم پیش کیجاتی ہے۔ میری رای میں اگر کالج اولڈ بوائز سے کچھ کام لینا چاہتا ہے تو اُسکو دو کاموں میں سے ایک کرنا چاہیئے۔ یا تو (۱) موجودہ ٹرسٹیوں کے علاوہ کچھ ٹرسٹی اولڈ بوائز میں سے منتخب کئے جائیں یا (۲) قواعد کالج میں ایک باب اولڈ بوائز

کے حقوق کا اضافہ کیا جائے، اور ایسے قواعد بنائے جائیں جنکی رُو سے اولڈ بوائز کا کالج کے معاملات میں، اسے دینے کا حق ہو۔

## (۳) ہندوستان میں جو اور قومیں آباد ہیں اُن کے اور مسلمانوں کے درمیان کیسے تعلقات ہونے چاہئیں؟

ہماری رائے میں اولڈ بوائز کے لئے یہ سوال نور اقبل از وقت ہے اور خوب یاد رکھنا چاہیئے کہ ایک ایسا غیور اور خود دار طبقہ جیسے کہ اولڈ بوائز کا ہے ہرگز ہندوؤں کے تعصب کے مقابلے میں اُن کی ہاتھ نہ جوڑیگا اور بیجا خوشامد نکریگا۔ لہٰذا اُسوقت تک جب تک کہ ہندو صاحبان خود اپنے تعصب کو کم کر کے ہمکو گلے ملانے کیلئے راضی ہوں ہمکو اُن کی خوشامد کرنی نہ چاہیئے۔ تالیاں دونوں ہاتھوں سے بجتی ہیں۔ یہ ناممکن ہے کہ ہمارے اوپر چھریاں پھیری جائیں اور ہم چپ بیٹھے رہیں۔ اب اُسکا زمانہ گیا ہم بھی خوب سوئے اب جبکہ چونکے ہیں تو آنکھوں میں پٹیاں باندھ کر نہ بیٹھینگے۔ ہاں اگر ہندو صاحبان اپنے تعصب کو کم کر کے ہم سے ملتے ہیں تو "چشم ما روشن دلِ ما شاد"۔ نہایت خوشی ہے ہم بھی ملنے کو تیار ہیں اور اپنے کو اُن کا قوتِ بازو ثابت کرنے کو مستعد ہیں۔

## (۴) ہندوستان میں جو انگریز حاکم ہیں اُنکے ساتھ برتاؤ کا ایک خاص طریقہ ہونا اور اُسپر جہانتک ہو سکے اولڈ بوائز کا عمل کرنا

## (۵) جس مقام پر ایک سے زیادہ اولڈ بوائز ہوں اُنکا آپس میں برادرانہ برتاؤ رکھنا۔

میں اِن دونوں امر میں آپسے بالکل متفق ہوں۔

خاکسار جمال احمد۔ اڈیٹر ہمدرد۔

# فیثاغورس

(ماخوذ از ہلال)

پیدایش سنہ ۵۸۰ قبل مسیح - وفات سنہ ۵۰۰ قبل مسیح۔

ساموس جزائر یونان میں سے ۲۱۳ میل مربع کا ایک سرسبز جزیرہ ہے، جسکو ایک تنگ خلیج نے ایشیاے کوچک سے جُدا کر دیا ہے، اُسمیں بلند بلند پہاڑ ہیں، جنکی چوٹیوں پر نہایت عمدہ پھلدار درخت ہیں۔ ارخبیل کے تمام جزائر میں اپنی سرسبزی و شادابی کی وجہ سے ممتاز ہے، اسی جزیرے میں یونان کا نہایت مشہور فلسفی فیثاغورس چھٹی صدی قبل حضرت عیسیٰؑ کے پیدا ہوا اور اسی صدی میں کنفیوشس چینی فلاسفر بھی پیدا ہوا تھا۔ یہ دونوں فلاسفر ایک زمانے میں پیدا ہوئے۔ اور باوجودیکہ ان کے مولد و مسکن میں ہزارہا میل کا فاصلہ ہے مگر ان کے اعمال ایک دوسرے سے مشابہ ہیں۔

فیثاغورس سنہ ۵۸۰ قبل مسیح میں کنفیوشس سے ۳۰ سال قبل جزیرۂ ساموس متذکرۂ بالا میں پیدا ہوا۔ اُسی جزیرہ میں اُسکا زمانۂ طفولیت بسر ہوا اور ابتدائی علوم کریوفیلوس سے (جو اُس زمانہ کا عالم تھا)، حاصل کئے۔ پھر جزیرۂ اسکیروس میں گیا اور حکیم فرسیدس سے (جسکی نسبت کہا جاتا ہے کہ اوّل وہ شخص ہے جسنے علوم طبعی میں کتاب تصنیف کی، اور جو رُوح کے قیام کا قائل تھا) فلسفہ حاصل کیا، حکیم موصوف اُس سے بغایت درجہ محبت رکھتا تھا حتےٰ کہ اُسکو اپنا متبنّےٰ بنا لیا۔

اُسکے انتقال کے بعد فیثاغورس نے حکیم طالیس ریاضی داں سے (جو یونانی فلاسفروں کا ابو الآبا کہا جاتا ہے، اور جو پانی کو* اصل ہر چیز کی بتاتا ہے)، تعلیم حاصل کی۔

فیثاغورس کو فلسفہ کا نہایت درجہ شوق تھا، اُسکے حاصل کرنے کے شوق میں اُسنے بڑے بڑے سفر اختیار کئے۔ اوّل فینیقیہ میں پہونچا اور وہاں کاہنوں سے بکرجز (؟) اعظم اُن کے علوم کا حاصل کیا۔ اُس زمانے میں وہاں جمعیتہ الکبرا کے نام سے ایک انجمن قائم تھی۔ اُس میں داخل ہوا اور اُس کے تمام اسرار سے واقفیت حاصل کی۔ پھر تمام بلاد شام کا سفر کیا اُسکے تمام مذہبی رسوم و علوم سے آگاہی حاصل کرکے یہود کی سرزمین میں پہونچا۔ اُن میں ایک مخفی انجمن تھی جو حضرت عیسےٰؑ

* چنانچہ قرآن شریف میں وارد ہے۔ وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ ۱۲

کی پیدایش تک قائم رہی، اُس میں شامل ہوا۔

اس سے بھی اُسکی علمی پیاس نہ بجھی، اور شوق تحصیلِ علم پورا نہوا، تو مصر کا قصد کیا، اسوقت کا زمانہ تھا جسمیں بدون سخت محنت اور جانکاہی اور کسی بادشاہ یا امیر کے توسّط کے تحصیلِ علم ناممکن تھی اسلئے اپنے وطن سامُوس کو واپس گیا اور وہاں کے بادشاہ لوکریٹس سے تقرّب پیدا کر کے اسکے بادشاہ مصر کے نام خط لکھالیا، اُسپر اُسکو علوم حاصل کرنیکی اجازت دی گئی۔ مصر میں اُن کے دیوتا کے نام پر ایک انجمن ایزیس سیریہ کے نام سے قائم تھی اُس میں داخل ہو کر تمام اسرار اور علوم سے واقفیت پیدا کی، مگر پھر بھی طلبِ علم کا شوق کم نہوا اور وہاں سے ہندوستان کا رُخ کیا، یہاں پہونچکر جوگی فقیروں کے گروہ میں شامل ہوگیا، جو برہنہ زندگی بسر کرتے ہیں اور جسمانی تکالیف کی پرواہ نہیں کرتے اُن کی تعلیمات حاصل کر کے کلدانیوں میں گیا اور پارسیوں کے علوم حاصل کئے وہاں سے کریٹ پہونچکر وہاں کے کاہنوں سے ملا وہ اُس کے ساتھ نہایت عزت اور احترام سے پیش آئے اور اُسکو ابدا کے متبرک غاروں میں (جسکی نسبت اُنکا خیال تھا کہ جوپیٹر کو علوم و فنون انھیں غاروں سے حاصل ہوئے ہیں) داخل ہونے کی اجازت دی، وہاں پر حکیم اپی مینیدس سے (جو یونان کے سب سے بڑے حکماے سبعہ میں داخل ہے) ملاقات ہوئی اور اُسنے فیثاغورس کو فلسفۂ یونانی کی تلقین کی۔ کریٹ سے اسپارٹا گیا اور وہاں کے حاکم لیون سے ملا اُسنے دریافت کیا کہ تم کون ہو اُسنے کہا کہ میں فیلسوف یعنی محبِّ علم حکمت ہوں، یہی لفظ فیلسوف عربی میں رائج ہُوا، اسوقت تک تمام فلاسفر اپنے آپ کو حکما کے لفظ سے تعبیر کرتے تھے، فیثاغورس نے تواضعاً یہ لقب اختیار کیا اور وہ پہلا شخص ہے جو فیلسوف کے نام سے ملقب ہوا۔

تعلیمات فیثاغورس | جب فیثاغورس اپنے زمانے کے تمام علوم سے واقفیت اور آگاہی حاصل کر چکا تو اپنے وطن اصلی ساموس میں واپس آیا اور مدرسہ ساموس کے نام سے ایک اسکول جاری کیا جسمیں اپنی تعلیمات کو رمزیہ طریقہ پر پھیلانا شروع کیا مگر اُسکا مقصد صرف تعلیم و تعلّم ہی نہیں تھا بلکہ کسیقدر پولیٹکل پہلو بھی لیئے ہوئے تھا اُسکو قوت اور شوکت حاصل کرنیکا بھی خیال تھا اسلئے ساموس میں اُس کے

مقاصد پورے نہوئے۔ تو وہاں سے یونانِ اعظم کے شہر کروتونہ میں چلا گیا اور وہاں ایک مخفی انجمن جمہوری اُصول پر پولیٹیکل گروہ طیار کرنے کے لئے اُسی طریقے پر قائم کی جو اُس زمانے میں رائج تھا اُسکے قوانین ہمارے زمانے کے سوشیالسٹ فرقے سے بہت مشابہ تھے۔ اُسکی پہلی شرط یہ تھی کہ اُسکے تمام ممبروں کی املاک اور جائداد مشترک ہوگی اور سب برابر خرچ کرنے کے مجاز ہونگے۔ اس گروہ میں سوای شرفا کے اور کوئی داخل نہیں ہوسکتا تھا۔ اسلئے کروتونہ کے عمائد اکثر اُس میں شامل ہوگئے اور پہلے بہت سخت استحان لئے بدون کسیکو اپنے گروہ میں شامل نہیں کرتے تھے۔ اُسکے ممبروں کے لئے ضرور تھا کہ تمام لذاتِ دنیوی سے بالکل انقطاع کرکے زُہد اور پرہیزگاری اختیار کریں۔ اکثر لوگ کئی کئی سال تک خاموش رہنا اپنے اوپر لازم کرلیتے تھے۔

جو شخص اس گروہ میں داخل ہوجاتا اور استحانات کی شدت اور قوانین کی سختی سے گھبراکر شکایت کرتا تو اُسکو اجازت دیجاتی تھی کہ اپنا مال و متاع لیکر چلا جائے اور کوئی شخص اُس سے کچھ تعرض نہیں کرتا تھا۔

جب کوئی ممبر تمام امتحانات میں کامیاب ہوکر امتیاز حاصل کرلیتا تو اُسکو اسرارِ انجمن سے واقفیت حاصل کرنے اور علومِ طبعی اور روحانیات اور ادبیات اور سیاستِ مدن وغیرہ کے تحصیل کرنیکی اجازت ہوتی تھی اور جب ان علوم میں مہارت حاصل کرلیتا تو انجمن کے کاموں پر کروتونہ میں مقرر کیاجاتا تھا اور جابجا اسلئے روانہ کیاجاتا تھا کہ دیگر بلادِ یونان میں انجمن کی تعلیمات کو شہرت دے۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس انجمن کے قائم کرنیکی اصلی غرض یہ تھی کہ اُن تمدنی اُصول اور اجتماعی تعلقات کو عالم میں مشتہر کرے جن سے عقلونکی صفائی اور جلا ہوکر حق کے قبول کرنے اور انصاف کے اختیار کرنیکی اُن میں قابلیت پیدا ہوجائے۔ اسکے تمام ممبر اپنے اہل و عیال سمیت قریب قریب اور ہمشکل مکانات میں سکونت رکھتے تھے۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ سب ایک ہی خاندان کے لوگ ہیں۔ صبح کو جمع ہوتے تھے کہ تمام دن میں کرنیکے کاموںکو متعین کرلیں اور شام کو اُن تمام اعمال پر نظر کرتے تھے۔ صبح کو سب اوّل نماز پڑھتے اور سجدہ کرتے تھے اور پھر ہومر وغیرہ شعرای یونان کے اشعار پڑھتے تھے اور کبھی کبھی ان اشعار کو آلاتِ موسیقی پر بھی گاتے

تھے کہ اُس سے عقل کی ریاضت ہوتی ہے اور دوسرے کاموں کو عمدہ طور سے انجام دینے کی اُنکو قدرت اور ہمت ہوجاتی ہے، اُسکے بعد انجمن کے کاموں میں شل درس تدریس و بحث و مباحثہ علمی کے مشغول رہتے، اور کسی قدر آرام لیکر ریاضتِ جسمانی کرتے تاکہ جسم میں چُستی اور چالاکی پیدا ہوجائے پھر صبح کا کھانا کھاتے جسمیں اکثر روٹی شہد اور پانی ہوتا تھا، اور بقیہ دن بھی علمی مشاغل اور دوسرے کاموں میں بسر کرتے۔

اس انجمن کے قائم ہونیسے پہلے تمام یونانی اقوام جہالت کی تاریکی اور لہو و لعب و شہوات نفسانی میں منہمک رہتے تھے اور فتنہ و فساد اور ظلم و ستم کا بازار اُن میں گرم رہتا تھا۔ اس انجمن کے قائم ہونے اور اُسکی تعلیمات کے رائج ہونے کے بعد یہ تمام معائب فرحت وانبساط، عدل، استقلال علم و فضیلت سے بدل گئے۔ تمام مُلک میں امن ہوگیا، علم و ادب تمام مُلک میں پھیلگیا، اور یونانی قوم سعادت اور فلاح سے متمتع ہونے لگی۔

لیکن اس انجمن کی عمر کچھ زیادہ نہوئی اسلئے کہ اسکی ترکیب جمہوری طریقے کی تھی، اور سیاسی پہلو لئے ہوئے تھی، اور اکثر اسکے ممبر شرفا میں سے تھے اسلئے ارسطو قراطی گروہ اُس سے بدظن ہوکر مقابلہ پر کھڑا ہوگیا اُسکے ایک شخص نے اس گروہ میں شامل ہونا چاہا، مگر اُسکو شامل نہ کیا گیا۔ تو تمام گروہ برافروختہ ہوگیا اور مکانِ انجمن کو آکر گھیر لیا۔ انجام کار انجمن کو توڑنا پڑا اور اُسکے تمام ممبر منتشر ہوگئے۔

مگر اُسکے ممبروں کا پراگندہ ہونا فیثاغورس کی تعلیمات کے عام ہوجانیکا سبب ہوگیا، ہر ممبر جس جگہ جاتا تھا مدارس اور انجمنیں قائم کرتا اور فیثاغورس کی تعلیم کو رواج دیتا تھا۔ حتّٰی کہ صدیوں تک اُسکی تعلیمات عالم میں رائج رہیں۔

فیثاغورس نے اپنی عمر کا آخری حصّہ نہایت جدّ و جہد سے اپنی تعلیمات کے شائع کرنے میں صرف کیا۔ اور اُس میں بڑی مشقتیں اور محنتیں برداشت کیں۔ سبا اوقات ذلت و توہین بلکہ قتل کا کھٹکا لگا رہتا تھا اسلئے کہ اُسکی تعلیم تمام قوم کے اعتقادات اور اوہام رائجہ کے خلاف تھی باینہمہ

# جدید تعلیم کی طرف سے غلط معذرت

غمت بہ شہر شبیخوں زناں بہ بُنگہِ خلق — عسس بہ خانۂ و شہ درحرم سراخفت ست

علی گڈھ منتھلی اپنے مضامین کی تازگی اور دلچسپی کی وجہ سے ترقی کرتا جاتا ہے۔ ہم اپنے محترم دوست سیّد ولایت حسین صاحب بی۔ اے کو اسکی ترقی کی وجہ سے مبارکباد دیتے ہیں۔ فروری ۱۹۰۴ء کے رسالے میں ہمارے نوجوان مگر ناتجربکار اور لائق دوست ریڈیکل نے مولوی اکرام عالم صاحب کے مضمون کا (جو دسمبر ۱۹۰۳ء کے عصر جدید میں (بعنوان جدید تعلیم کا ناقص اثر) شائع ہوا تھا) جواب دینے کی کوشش کی ہے۔

میرے نزدیک ہر بے لاگ اور واقف کار شخص دونوں مضامین کے پڑھنے کے بعد صرف یہ نتیجہ نکالیگا کہ مولوی اکرام عالم صاحب نے شاید مبالغہ کیا ہو مگر "ریڈیکل" کا راستہ بالکل غلط ہے! اور "ریڈیکل" نے اصلاح کے معاملہ میں اپنے آپ کو سخت کنسرویٹو ثابت کیا ہے۔ مجھے اب تک اس مضمون کے متعلق لکھنے کی فرصت نہ تھی، اور نہ میں ایسے مباحث کا (جن میں کچھ بھی ذاتیات کا پہلو ہو) عصر جدید میں ذکر کرنا پسند کرتا ہوں۔ اور اوّل حصہ اس مضمون کا ذاتیات کے پہلو سے بچا ہوا نہیں ہے۔ لیکن چونکہ علی گڈھ منتھلی کے آدم ثانی نے کئی بار مجھ پر تقاضا کیا ہے کہ اپنے کالج کے سرخرو آرگن میں کچھ لکھوں لہٰذا اسرارِ اطاعت ختم کر کے اس مفید بحث پر کچھ لکھتا ہوں۔

اسراف "ریڈیکل" فرماتے ہیں کہ نئے تعلیم یافتہ فضول خرچ نہیں ہیں بلکہ پُرانے لوگ مسرف ہیں مگر جو شخص اس نئی نسل اور اُن کے رہبروں کے مسرفانہ کارناموں سے واقف ہے وہ جانتا ہے کہ یہ نسل کبھی اپنی آیندہ حالت پر غور نہیں کرتی۔ مسلمانوں کی تمدن میں یہ خرابی ہے کہ پُرانی خرابیاں بھی اُن میں موجود ہیں اور جہاں پُرانی فضول خرچیاں دُور ہوتی جاتی ہیں اُنکی جگہ نئے عیب ایسے پیدا ہوتے جاتے ہیں جنکا علاج کیا جائے تو وہ (جدید تعلیم) شاید مرض (جہالت) کی برابر مضر ہو جائے کیں سرکہ سے صفرانہ بڑھ جائے روغن

بادام خشکی زیادہ نہ کرنے لگے۔ ؎

از قضا سرکہ انجبیں صفرا فزود — روغنِ بادام خشکی مے نمود

خیال کرو کہ اسوقت جو لڑکے تعلیم پاتے ہیں یا تعلیم پا چکے ہیں، اُن کی کیا حالت ہے؟ اکثر کے لئے کُل کا حکم ہوتا ہے۔ وہ ظاہری آرایش پر فریفتہ ہیں۔ جفاکش محنت سے گھبراتے ہیں ظاہرداری اور شان و شوکت کی عزت اُن کے دلوں میں راسخ ہوگئی ہے مفلس لڑکا بھی ایسا خرچ رکھنا چاہتا ہے جسقدر دولتمند۔ آیندہ جاکر ملازمت اسکو ملتی ہے تو ۲۵ سے ۵۰ حد تا ماہوار کی۔ دو چار معقول عہدوں پر ہوگئے تو کیا؟ اب وہ زمانہ قریب ہے کہ مسلمان گریجویٹ مثل ہندو گریجویٹوں کے بہت تھوڑی ماہوار بھی مشکل سے پا سکینگے۔ تجارت۔ زراعت میں اُن کو دخل نہیں۔ پھر ہوگا کیا اور ہوتا کیا ہے؟ وہی ہوگا جو اَب تک ہوا ہے۔ یہ لوگ اپنا گذرا ایمانداری سے اب بھی مشکل کر سکتے ہیں قرضدار رہتے ہیں اور اس ورخرچی کی وجہ سے خواہ وہ طالبعلمی میں ہو یا مابعد ہو۔ جھوٹ، فریب، ریا بے ایمانی۔ سینکڑوں نقص اور عیب پیدا ہوجاتے ہیں۔ ماں باپ کو دھوکا دینا معمولی بات ہے۔ کالج کا بل چڑھالینا اور پھر ادا نہ کرنا، روزمرہ کا مشغلہ ہوجاتا ہے۔ یہ لوگ اولاد کو کیا تعلیم دینگے؟ قوم کی اڑے وقت پر کیا مدد کرینگے؟ چندہ کہاں سے دینگے؟ یہ وہ خطرات ہیں جنکی طرف ہر محبِ قوم کو متوجہ ہونا چاہیئے۔ جس قوم کے نوجوان شروع ہی سے جھوٹ کا سبق سیکھیں یعنی جہاں اپنے تئیں حیثیت سے زیادہ ظاہر کرنا جنٹلمینی کا لازمہ ہو۔ جن کو ایثار علی النفس اور محنت کا سبق نہ سکھایا جائے وہ اس سخت اور درشت اور پتھریلے راستے میں جسکو دُنیا کہتے ہیں، کسی قوم کو کامیاب نہیں بنا سکتے ہیں ع۔ ایں زمیں آسمانے دیگر ست۔

"ریڈیکل" کا یہ کہنا کہ اکرام عالم "مناسب ہے کہ اُپنے معزز دوست غلام الثقلین سیکرٹری صیغۂ اصلاح تمدن وغیرہ کا ہاتھ بٹائیں یعنی صرف پُرانی رسوم کو ترک کرائیں" نہ صرف ایک نصیحت یکطرفہ ہے بلکہ وہ اصلاحِ تمدن کے مقاصد کو سمجھتے ہی نہیں ہیں۔

صیغۂ اصلاحِ تمدن مسلمانوں کو ایک سنجیدہ اور عملی قوم بنانا چاہتا ہے اور جس گلٹ نمائشی

(تہذیب ہے کے شیدا عشاق جدید تعلیم کے ہونہاروں میں پیدا ہو رہے ہیں، وہ جادو نہ ایک عملی قوم کا جادۂ ہے، نہ ایک سنجیدہ قوم کا آئیڈیل ہو سکتا ہے۔ میں قبول کرتا ہوں کہ کپڑا صاف رکھنا اور مکان کو مناسب طور پر آراستہ رکھنا قابلِ تعریف ہے نہ قابلِ الزام۔ لیکن "جدید تعلیم کا ناقص اثر" ہم کو یہ نہیں بتاتا کہ تم غلیظ رہو اور بے ترتیب مکان رکھو۔ اور میں غور سے کے ساتھ کہتا ہوں کہ اصلاحِ تمدن کے سرگرم حامی نہ غلیظ رہتے ہیں نہ مکانوں میں بے ترتیبی کا نظام قائم رکھتے ہیں اور نہ پرانی رسوم کے دلدادہ ہیں وہ چاہتے ہیں کہ جو نفرت انگیز طرز و خیال ہم لوگوں میں پیدا ہوتا جاتا ہے جس کی وجہ سے ہم "ظاہر پرست لوفر" بنتے جاتے ہیں اسکے خلاف اعتراض کیا جائے اور مسلمان نوجوانوں میں پختہ اور سنجیدہ عادات اور بے لاگ قومی خدمت کرنے کیلئے مستقل کوشش جاری رکھیں۔

**یورپ کی تقلید نادرست** یورپ کی تقلید سے سبق سیکھنا چاہیئے کہ ہم قومی محبت، مستعدی، جفاکشی، اتفاق، ایثار کا سبق سیکھیں، مفید علوم کی طرف راغب ہوں۔ غیر مفید جھگڑوں سے پرہیز کریں۔ انگلستان جس کی آمدنی اوسط ۳۰ روپیہ سال فیکس ہے یعنی ہندوستان سے پندرہ گنی۔ وہ اگر ہمارا مقتدا طرزِ معاشرت اخراجات میں ہو تو یہ تقلید ایسی ہی مضر ہو گی جیسی کہ ایک غریب خاندان کو محمد شاہ مرحوم یا واجد علیشاہ مغفور کے دربار کا طریقہ اختیار کرنا۔ ایک ایسی مفلس قوم کو جیسے کہ ہم ہیں، اپنے اخراجات پر ہر وقت نظر ڈالنی چاہیئے۔ ذرائع معاش بڑھانے کی فکر لازم ہے نہ یہ کہ باپ دادا کا جو کچھ بچا کچا موجود ہے وہ سب بیرسٹری کی تعلیم میں یا مغربی طرز کی تقلید میں کھو دیا جائے ہمارے ریڈیکل دوست (جو برائے نام ریڈیکل ہیں کیونکہ ریڈیکل کی تعریف ہے کہ جڑ سے خرابیوں کی اصلاح کرے نہ کہ وہ ایک پرانی شاخیں کاٹ ڈالے) چاہیں تو ہم انکو نئی طرز معاشرت کی سینکڑوں تباہ کن مثالیں بتا سکتے ہیں۔

شراب خواری کی بابت "ریڈیکل" نے اکرام عالم صاحب کے مضمون پر ثبت لے دے کی ہے مگر میں "ریڈیکل" سے عرض کرتا ہوں کہ آپ میرے ساتھ آیئے اور ہم پنجاب اور دکن وغیرہ کا سفر کر کے دکھلائیں کہ موجودہ تعلیم یافتہ کیسے کہ موجودہ تہذیب شراب خواری کے معاملے میں کیا گل کھلا رہی ہے۔

**تعلیم یافتہ گروہ عملی نہیں ہے۔** اس مضمون کے ذیل میں بہت سی باتیں کہہ سکتے ہیں مگر میں صرف ایک بڑا اعتراض اپنے معاصرین پر کرتا ہوں اور مجھے اُمید ہے کہ جو صاحب اس رائے کے خلاف ہیں وہ بذریعہ علی گڈھ منتھلی یا عصرِ جدید اس کی تردید کرینگے۔ میرا اعتراض جسکو بعض تقریروں میں بھی ظاہر کر چکا ہوں، یہ ہے کہ جدید تعلیم والے ابتک تعلیم کا مقصد ہی نہیں سمجھے۔ لاہور میں سال گذشتہ یہی اعتراض میں نے کیا تھا۔ مگر افسوس ہے کہ اُسکی طرف کسی نے توجہ نہیں کی۔ وہ اعتراض یہ ہے کہ ہم ابتک نہیں سمجھے کہ تعلیم محض ایک ذریعہ ہے کہ ہم کو ایک عملی اور باکار گروہ بنادے۔ اگر تعلیم پاکر ہم صرف اس تعلیم پر بس کریں تو ہم سے زیادہ نافہم کوئی نہوگا

**تعلیم کو ایک آلہ نہیں سمجھتے** ایک غلطی جو قدیم فلسفی سے لیکر ایک جاہل گنوار تک سب نے کی ہے وہی غلطی ہمارا تعلیم یافتہ گروہ کرتا ہے۔ مرحوم سید احمد خاں جو قوم کا طبیب تھا اُس نے ضرورتِ زمانہ کے لحاظ سے سب کاموں کو ملتوی کر کے تعلیم کیطرف کامل اور مکمل توجہ مصروف کی تھی۔ اِس خیال سے کہ جو لوگ پیدا ہونگے وہ باقی مسائل خود حل کر لینگے اور باقی خرابیوں کی آپ تلافی کرینگے۔ نہ سید صاحب نہ کسی دوسرے زیرک سوچنے والے کا یہ منشا تھا نہ ہوسکتا تھا کہ کلڑہار اکلہاڑی بنوا کر خاموش ہو جائے۔ لہار سنداں اور ہتھوڑا بنانے میں اپنی عمر صرف کرے اور پھر اُسکو بیٹھا دیکھا کرے۔ کمہار چاک بنالے اور مٹی کے ڈھیر لگے ہوئے ہوں مگر برتن بنانیکا خیال نہ کرے غرض منشا تعلیم کا اسکے سوا کیا ہوسکتا ہے کہ وہ انسان کی قوتیں عالمِ اخفا سے عالمِ ظہور میں لائے۔ جو قابلیتیں دبی ہوئی ہیں اُن کو ظاہر کرے۔ بُری صحبت یا جہالت سے جو پردے دماغ پر پڑے ہوئے ہوں اُن کو ہٹائے۔ بیکاروں کو باکار و سُست گروہ کو چُست اور بے پروا قوم کو جوشیلی قوم بنادے۔ تعلیم کا صرف یہی منشا نہیں کہ آدمی اپنی معاش تھوڑی بہت حاصل کرے اور چار حرف پڑھنے کے بعد ہاتھ پر ہاتھ رکھکر بیٹھ جائے یا بڑی قومی خیر خواہی اسکو سمجھے کہ دوسروں کو بھی اپنی مانند بنالیوے۔

**تعلیم کے ذریعے سے عملی اور ضروری کام کرنے چاہئیں** اس بحث سے یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ تعلیم پھیلانے کیلئے بے حد اور سخت کوشش کی ضرورت نہیں ہے بلکہ تعلیم تو قومی ترقی کیلئے ایسی ہی ضروری چیز ہے کہ جسطرح پانی بھرنے کیلئے ڈول یا ڈھینکلی۔ یا چلنے کیلئے پانوں۔ پس جو لوگ تعلیم پھیلاتے ہیں وہ سب سے بڑی

قومی خدمت کرتے ہیں۔ شراب کیلئے حدیث میں آیا ہو کہ اَلْخَمْرُ اُمُّ الْخَبَائِث۔ وہ سب برائیوں کی ماں ہو اسیطرح تعلیم کو جملہ فضائل اور اصلاح کی ماں کہنا بیجا نہیں ہے اور علم کی تعریف جو اسقدر کیگئی ہے اسواسطے کہ علم انسان کے خیالات اور اُسکی معلومات کو لاکھ گنا کر دیتا ہے اور پچھلے لاکھوں عقلا کے خیالات اور تجربات کو اُسکا محکوم بنا دیتا ہے۔ پس تعلیم کی کوشش ضرور ہونی چاہیئے مگر وہ تعلیم ایک مفید آلہ کا کام دے نہ کہ ایک بیکار اوزار کا۔

اسوقت تک جو ہزاروں (غالباً لاکھ تک تو نوبت نہ پہونچی ہوگی) اوزار اس تعلیم سے بنے ہیں اُن میں بہت کم ایسے ہیں جنھوں نے تعلیم کے اس رُخ پر غور کیا ہو اُسکی وجہ یہی ہو کہ اُنکو خود تعلیم جب دیگئی تو یہ بات نہیں سمجھائی گئی تھی۔ اُن کے ماں باپ اسکو ایک آلہ روپی کمانے کا سمجھتے رہے اور خود قوم نے بھی اس مقصد کو اچھے طور پر نہیں سمجھا۔ بہرحال ہم یہ کہتے ہیں کہ تعلیم ایک آلہ ہو اس سے کام لینا چاہیئے۔ یعنی نئی نسل جو تعلیم پا رہی ہے۔ اُسکو مفید آلہ بنانیکا۔ پس تعلیم کے غلط معنی نہ سمجھنے چاہئیں اور نہ تعلیم کو فی نفسہٖ منزل مقصود سمجھنا چاہیئے۔ کیا فائدہ اگر ہمیں تمام دُنیا کے دریاؤں کے نام یاد ہوں اور ہم کو اُس سے کیا مطلب اگر زمین کے اندر پچاس دھاتیں ملی ہوئی ہیں ہم کو کیا غرض اگر پولیٹیکل اکانمی کا علم یوروپ میں ترقی کر رہا ہے۔ اور مل نے ایک عمدہ کتاب اسپر لکھی ہو۔ اگر میں کسی مسافر کو راستہ بتاؤں، کوئی کان کھود کر نکالوں، کوئی ذریعہ دولت کے بڑھانیکا بتاؤں تو البتہ میں نے کوئی کام کیا۔

پس تعلیم کوئی مقدس چیز نہیں ہو جو پوجا پاٹ ہی کیلئے مفید ہے، بلکہ ایک ہتیار ہے جو دنیا کی جنگ میں کام آتا ہے ہمکو اصلاح کی ضرورت اسلئے ہو کہ تعلیم کا عملی نتیجہ نکالا جائے۔

آخر میں اُمید کرتا ہوں کہ علی گڈھ منتھلی کے ناظرین، علی گڈھ کالج کے طلبہ اور وہ ہشیار جماعت ہندوستان تعلیم کی جوان مسائل پر غور کرتی ہے۔ ٹھنڈے دل اور متانت کیساتھ غور کریگی اور ایسی تعلیم دلانے اور پانیکی کوشش کریگی جس سے کوئی عملی مفید نتیجہ پیدا ہو یعنی خاص اور معین اغراض کیساتھ تعلیم ہونی چاہیئے اور بعد فراغت وہی مقاصد مدت العمر پیش نظر ہیں۔

غلام الثقلین، سکرٹری صیغۂ اصلاح تمدن۔

# اولڈ بوائز ایسوسی ایشن مدرسۃ العلوم علیگڈھ

یہ ایسوسی ایشن چند سال سے قائم ہے مگر سال میں ایک بار ڈنر کرنے کے سوا اس ایسوسی ایشن نے اسوقت تک کوئی عملی مفید کام نہیں کیا۔ تین سال ہوئے ایک رزولیوشن پاس ہوا تھا کہ ہر اولڈ بوائے اپنی آمدنی کا ایک فیصدی کالج کو بطورِ امداد دیا کرے۔ اس رزولیوشن میں بھی حسب دلخواہ کامیابی نہیں ہوئی بعض فیاض طبع اولڈ بوائز نے اسکی تعمیل کی مگر اکثروں نے اُسکی طرف توجہ نہیں کی تعمیل کرنیوالے فیاض طبع اولڈ بوائز میں سے بہت سوں کا جوش عارضی تھا۔ اور صرف چند ایسے پُرجوش و باہمت ہیں جو رز سیلیوشن در ایں ہست کے امتحان میں پورے اُترے اور اسوقت تک اپنے قول پر ثابت قدم ہیں۔ ہم آیندہ ان ثابت قدم اور واثق الاقرار لوگوں کے نام دوسروں کی تحریص کیلئے منتھلی میں شائع کرینگے۔

سالِ گذشتہ کے ڈنر میں اس ایسوسی ایشن کو عملی شکل میں لانیکی غرض سے تجویز کیا گیا تھا کہ اس گروہ میں سے ایک کارکن جماعت ہو جن کے صلاح و مشورہ سے انجمن کوئی مفید کام شروع کرے۔ بطور ثبوت دلچسپی اس کارکن جماعت میں شریک ہونیوالوں کے واسطے ۶ روپے سالانہ چندہ واسطے اخراجات ایسوسی ایشن کے مقرر کیا گیا تھا۔ داخلہ کیواسطے فی الحال کوئی دوسری شرط بجز چھ روپے سالانہ چندہ اور اولڈ بوائے ہونیکے قرار نہیں پائی۔ مگر با اینہمہ بجز اُن چند صاحبوں کے جنہوں نے ڈنر کے موقعہ پر اُس کارکن جماعت یا سنڈیکیٹ کی ممبری قبول کی تھی اور کسی نے شرکت کی خواہش نہیں کی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہماری جماعت کسقدر ٹھنڈی پڑی ہوئی ہے کہ باوجود مختلف طور پر گرمانے کے اُن میں کسی قسم کی گرمی نہیں پیدا ہوتی۔ بہرحال۔ باہمیں مرداں بباید ساخت۔ کے مقولہ پر عمل کرکے کچھ کارروائی شروع ہونی چاہیئے۔ ہمارے اولڈ بوائز سارے ہندوستان کی اسلامی سوسائٹی کا بہترین حصہ ہیں۔ ہماری خواہش ہے کہ وہ بتدریج ہندوستان کے مسلمانوں کی طرف سے نیابتاً کام کرنیوالا گروہ بنجائیں۔ اور یہ اُسیوقت ہوسکتا ہے

کہ جب وہ کچھ کر کے دکھائیں اور اپنے عمل سے ثابت کریں کہ وہ اس معزز عہدے کے مستحق ہیں۔ چھوٹے کاموں سے شروع کریں اور رفتہ رفتہ اپنی قابلیت کا ثبوت دینے پر بڑے بڑے قومی کاموں میں دخل حاصل کریں۔ پھر کالج کے ٹرسٹی بھی وہ ہی ہیں اور قوم کے لیڈر بھی وہی۔ کام شروع کرنے کی غرض سے ہم اسوقت پیش کرتے ہیں کہ ہر اولڈ بوائے کو کالج کے متعلق انتظامی یا اپنے حقوق کی نسبت جو شکایت ہو اُسکو وہ تحریراً سیکرٹری اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کی خدمت میں بھیجیں۔ جسقدر شکایتیں کہ اس طور پر ماہ ستمبر میں سیکرٹری کے پاس آئیں اُن کو وہ چھاپ کر ماہ اکتوبر تک واسطے اظہار رائے کے سنڈیکیٹ کے موجودہ ممبروں کی خدمت میں بھیجدیں آخر اکتوبر تک جسقدر شکایتیں کہ سنڈیکیٹ کی اتفاق رائے سے معقول قرار پائیں وہ شروع نومبر میں ایسوسی ایشن کی طرف سے باضافہ آنریری سیکرٹری ٹرسٹیان کی خدمت میں واسطے تدارک بھیجدیجائیں۔ اگر اولڈ بوائز نے اس تجویز کیطرف توجہ کی تو اُمید ہے کہ اُس سے کوئی مفید نتیجہ نکلیگا اور آیندہ ہم اور تجویزیں اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے غور کیلئے پیش کرینگے۔

## توسیع یونین کلب

ہمکو افسوس ہے کہ اس ماہ میں توسیع یونین کلب کے چندہ کی فہرست میں بہت نام اضافہ نہیں ہوئے صرف مسٹر شوکت علیخاں بی۔ اے سب اوپیم ایجنٹ بہرائچ نے مبلغ ؎۱ روپے عنایت فرماکر ایفاء وعدہ کیا ہے اور مولوی محمد باقر خاں صاحب ڈپٹی کلکٹر سلطانپور نے جو غالباً ہمارے اولڈ بوائز کے زمرہ میں داخل نہیں ہیں اور کالج سے بذاتِ خود متمتع نہیں ہوئے ہیں محض قومی ہمدردی سے مبلغ صہ روپے عنایت فرماکر ہمکو مشکور کیا ہے۔

## انعامی مضامین

علی گڈھ منتھلی کے انعامی مضامین پرکھنے کی خدمت شمس العلما مولنا محمد شبلی صاحب نعمانی نے مہربانی سے اپنے ذمہ لی ہوئی ہے چونکہ مولنا کا معیار عمدگی مضمون بہت اعلیٰ ہے اور شاید علالتِ طبع بھی کسیقدر

باعث ہوئی ہو۔ ماہ جولائی کے شائع شدہ مضامین میں سے کیسکی نسبت اُنھوں نے ہمکو اپنی پسندیدگی سے مطلع نہیں کیا اسلئے ہم ماہ گذشتہ کی بابت اپنے مضمون نگاروں کو نذرانہ پیش کرنیسے معذور رہے

## محمڈن کالج بُک ڈپو

ہمکو افسوس ہے کہ حسب وعدہ شروع اگست میں ہم مطبع کی تاخیر کیوجہ سے مسدس حالی تقسیم نہ کرسکے اب کتاب مذکور طیار ہے اور جو لوگ کہ تقسیم کیواسطے منگانا چاہیں اُنکو بھیجی جاسکتی ہو مگر شرط یہ ہو کہ مثل اشتہار روئے اُسکو اپنے پاس ڈال نہ رکھیں بلکہ ایسے اشخاص کو دیں جو اُسکو پڑھیں اور مستفید ہوں۔ کتاب مذکور کو قیمتاً دینا قطعاً حرام ہے۔ ہمکو افسوس ہے کہ تعطیل کیوجہ سے ہم علیگڈھ سے دور ہیں اور تقسیم کا کام خود نہیں کرسکتے ہیں۔ اُمید ہو کہ ماسٹر نعیم الدین خانصاحب جو اسوقت کالج میں موجود ہیں اور بک ڈپو کے انچارج ہیں اور باقاعدہ کام کرنیوالے ہیں فرمایشات کی تعمیل جلد جلد کریںگے۔

## ہز آنر سر جیمس ڈگس لاٹوش کی آمد علیگڈہ کالج میں اور تعلیم عربی کی نسبت آخر فیصلہ

ہز آنر کی تشریف آوری کی تقریب سے اکثر ٹرسٹیان کالج اور بعض دیگر عمائد و ہمدرد باہر سے تشریف لائے تھے۔ ۲۸- جولائی کو ۱۲ بجے دن کے ہز آنر کالج میں رونق افروز ہوئے۔ اوّل ٹرسٹی صاحبان سے پرنسپل صاحب کے لکچر روم میں کالج کے بعض اہم مطالب پر مشورہ کیا۔ بعد ازاں اسٹریچی ہال میں ہز آنر کو ایڈریس دیا گیا۔ ایڈریس میں کالج کی موجودہ ترقی تفصیل کے ساتھ بیان کیگئی تھی اور اُس توجہ اور امداد کا شکر کیا تھا جو ہز آنر کی ذات باصفات سے ہمیشہ کالج کو ملتی رہی ہے۔ ایڈریس کے جواب میں ہز آنر نے کالج کی روزافزوں ترقی پر اظہار مسرت کیا اور اُن غلط فہمیوں کو رفع کرنیکی کوشش کی جو ترقی تعلیم عربی کے مسئلہ کے متعلق لوگوں میں پھیلی ہوئی تھیں۔ ہز آنر نے فرمایا کہ ترقی تعلیم عربی سے یہ لازم نہیں آتا کہ اور علوم کی

تعلیم کو ترقی نہ دیجائے۔ کالج بدستور دیگر علوم کی تعلیم دیتا رہیگا۔ تعلیم عربی اختیاری ہوگی نہ کہ لازمی اور اُسکا انتظام صرف اُن لوگوں کے لئے کیا جاتا ہے جنھوں نے امتحان بی۔ اے میں زبانِ عربی کو بطور سیکنڈ لینگوئج کے لیا ہو اور بی۔ اے کی ڈگری حاصل کرنیکے بعد تعلیم عربی کی تکمیل کرنا چاہیں۔

عربی یا سنسکرت کی جو خدمت کہ زمانہ حال میں کیگئی ہے وہ اسوقت تک جرمنی والوں کا حصّہ ہے۔ حالانکہ اہلِ جرمنی کو اِن دونوں زبانوں یا اُن کے بولنے والوں سے کسی قسم کا تعلق نہیں ہے۔ ہندوستان سنسکرت کا گھر ہے۔ مسلمانوں کی آبادی بھی زیادہ تر اسی ملک میں ہے۔ ان دونوں زبانوں کی تعلیم بھی بہت کچھ اس ملک میں ہوتی ہے۔ بہتیرے خدا پرست ہندو اور مسلمان اپنی عمریں ان متبرک زبانوں کی تعلیم و تعلّم میں صرف کر دیتے ہیں مگر صحیح راستے پر نہ چلنے کیوجہ سے اسوقت تک کوئی مفید نتیجہ نہیں نکلا۔ اسلئے گورنمنٹ کی خواہش ہے کہ جدید طریقہ پر ان زبانوں کی تعلیم دیجائے اور شائقینِ عربی و سنسکرت کو تحقیقات کی نئی راستے بتائی جائیں۔ چونکہ شہر بنارس سنسکرت کی تعلیم کا ہمیشہ سے مرکز ہے اور علیگڈھ کالج مسلمانوں کا تعلیمی مرکز ہوتا جاتا ہے اسلئے گورنمنٹ نے خیال کیا کہ اِن دو مقامات سے بہتر دوسری جگہ ان زبانوں کی ترقی تعلیم کا موقعہ نہیں ہو سکتا۔ اور اِن ہی مقامات پر ایک ایک یوروپین پروفیسر سنسکرت و عربی کا اپنے صرف سے مقرر کرکے تحقیقات کی نئے طریقوں کیطرف لوگوں کی راہنمائی کرے۔ اسطرح پر امید ہے کہ آئندہ ہندوستانیوں اور انکی گورنمنٹ کو اُن قدیم زبانوں کی خدمت کے باب میں جرمنی والوں کے مقابلہ میں خفت نہ اُٹھانا پڑیگی۔ عربی زبان کا جو پروفیسر کہ علیگڈھ کالج میں مقرر ہوگا اُسپر بھی ٹرسٹیوں کو وہی اختیارات حاصل ہونگے جو دوسرے پروفیسران کالج پر ہیں۔ البتہ گورنمنٹ بقدرِ تنخواہ یوروپین پروفیسر عربی کی کالج کی امداد میں اضافہ کردیگی۔ بشرطیکہ ٹرسٹیان کالج اس قسم کی امداد کے خواہشمند ہوں اور تعلیم عربی کی ترقی میں اپنی آمادگی ظاہر کریں۔ اور طلبہ کیلئے وظائف کا مستقل بندوبست کرنیسے اس آمادگی کا ثبوت دیں۔ چونکہ فی الحال ایسے طلبا کی تعداد جو بی۔ اے کے بعد اپنی تعلیم عربی جاری رکھیں آٹھ دس سے زائد ہونیکی توقع نہیں ہے۔ اور اس قلیل تعداد طلبا کیلئے ایک یوروپین پروفیسر عربی کافی ہوگا اسلئے مبلغ ۱۵۰ روپیہ ماہوار کی رقم جو ٹرسٹیوں نے سال حال کے بجٹ میں ایک ہندوستانی پروفیسر عربی کیلئے مندرج کی تھی عربی خوان طلبا کی وظائف کی مد میں منتقل کیگئی اور سب سے حاضرین جلسہ نے اپنی جیب سے وظائف مقرر کیے۔ گورنمنٹ نے یہ بھی توقع دلائی ہے کہ اگر عربی خوان طلبا کی تعداد آئندہ بڑھ گئی اور ایک ہندوستانی پروفیسر عربی کی ضرورت ہوئی تو ممکن ہے کہ گورنمنٹ اُس پروفیسر کی تنخواہ بھی اپنے خزانہ سے دیدے۔

(مطبوعہ مطبع ریاض ہند علیگڑھ)

books ; and is it not futile, insolently futile almost, to imagine that we who cannot, in truth, pretend to be able to frame a thought of our own making, can attempt to do without the great thoughts that lie stored in such a treasure house as a College Library should be ?

Now is the time, I feel sure, to urge the matter ; for there are distinct signs among the students of a desire for books, and for reading, and of more reverence for books, which feeling is the first essential in creating a real Library.

What we require then is, a suitable building ; and this, it is hoped, we may soon acquire, and in my opinion a suitable building will go far to create the spirit of reverence and teach us *how* books are to be used.

We want books. We must prevail on our friends to give books or money to buy them with. We must, if necessary, retrench in other directions. To my mind it is absolutely sinful to spend money on garden-parties and dinners, when our Library is starving.

We must make our Treasure-house of Books a store-room of the best we can find. Why not good prints and engravings of historic pictures ? Why not a bust of Homer or Plato ?

For all these things tend to edification At present, unfortunately, another force is at work not altogether for evil, but likely to produce evils, which I cannot dwell on now, namely a craving for novel-reading. Young men will read something. Who is to blame if their desires are not turned in the right direction ?

J. R. C.

——:o:——

the European professor, while the College and private benefactors must meet the cost of scholarships There were two points regarding which he had felt bound to satisfy himself; rst, whether there was a real and genuine desire for the stablishment of the proposed course of study . and, secondly, hether the arrangements, if made, were likely to be permanent. On both points he had been fully satisfied, and he was repared to recommend to the Government of India the grant the aid required He now awaited the definite proposals the governing body of the College So far as the aid from overnment was concerned he would do what he could to btain it, and would adopt that course which seemed to him orthy of the College, and in harmony with the aims and ishes of its founder.

Khan Bahadur Mizammilulah Khan, thanked His Honour n behalf of the Trustees, and Mr Syed Ali Imam, of Patna, Trustees of the College, read a discriptive account of the izam Museum and the Asman Manzil which dealt with the *nerosity and help of His Highness the Nizam and his inisters* towards the College The Hyderabad grant had ow risen to Rs. 24,000 annually The Hyderabad State irsed the College in its infancy, and had increased its sustenance as the College advanced till at the present moment it is, along with their own Government the mainstay and nief support

After leaving the Strachey Hall, His Honour declared e new buildings open.

——:o ——

## The College Library.

——:o:——

To all who have the welfare of the College at heart the ndition of the Library and its urgent needs create a feeling hich can only be described as extremely depressing. For n institution that has fulfilled more than a quarter of a cenry's work in the way of education, our Library is altogether nworthy, not only of the place but even of the name. I do ot refer to the Oriental or Law Libraries—of their condition know nothing, and only recently have I come to realize e poverty of the general Library, which has a most imrtant duty to perform but which cannot possibly perform under its present circumstances.

No student can do any worthy or thoughtful work nless he learns how to read for himself Essay-writing, eech making and *production* of any literary nature must llow, not precede, the careful study of the world's best

dress before an assembly consisting of twenty-nine Trustees, about fifty visitors, from different parts of India, and the Staff and boys of the School.

After referring to the present state of the College and to the recent grant given by His Honour's Government in aid of teaching English in the School, the Arabic question was touched on in the following terms :—

" We assure Your Honour that we fully realize the value and importance of extending and modernising the study of Arabic in this College It occupies an important place in the scheme of the proposed Muhammadan University, and can never fail to command our earnest attention The interest which Your Honour has shown in the revival of Arabic learning cannot but be dear to every Musalman's heart, and we sincerely thank Your Honour for it. The subject, in its practical shape, is before us, and Your Honour's visit to-day is most welcome and opportune, as it is sure to help us in arriving at a satisfactory decision "

His Honour, in reply to the Trustees, said that he had conferred with them and ascertained their views It was proposed that the College should offer an opportunity for an advanced study of Arabic to students who had taken their B. A. degree in English, and who wished to proceed to their M. A. University degree with Arabic as their chief subject. There was no intention of substituting Arabic learning for English learning, nor would the study of Arabic be made compulsory. The facilities for the study of other courses in the College would be in no way diminished. Two things were necessary : the appointment of a European professor and the establishment of scholarships. If a real advance was to be made it was essential that the results of enquiry and research in the West should be compared with the results attained by learned men in the East. This comparison would open up new points of view in all directions, and stimulate higher study. The number of students who took up Arabic study would always be few. There was no large leisured class in India, and openings for students who were proficient in Arabic were not numerous. Students would always pursue that course of study which offered them the best prospects of success in life, but after all a graduate of the University, who had studied Arabic, was not at a disadvantage as compared with other graduates. The Trustees recognised that at first scholarships were essential, and they proposed to establish ten scholarships a year for two years at Rs. 25 a month. The proposal was that the Government, in pursuance of its policy of aiding higher University education, should meet the cost

support of our own or against another's resolution with the old zeal of the Union when we could get excited over such innocent questions as the desirability of matrimony, or the undesirability of smoking, the crimes of King Charles, or the superior power of the pen. To crown the day's work we rise in the evening with the painful consciousness of having been the College wit or the Poet Laureate, to the utter post-prandial *facetiae* that have often done service in times gone by, or to recite limping verses in which of course the names of *Bake and Mahesan* elicit applause which we appropriate as the appreciation of the second Hall.

Very pleasant all this, no doubt, but how [illegible] old men playing hide and seek or blind man's buff? It is a duty we owe to ourselves to squeeze into our dreary existence in a humdrum land a little bit of seasoned enjoyment. It is a duty we owe to the undergraduates to amuse them with after-dinner speeches or supply them with ancient models of the national elegy. Add to the meeting of old friends, to the speech making, the *facetiae* and the halting rhymes a little bit of solid work—for thinking is work and hard work too—and you change the re-union of school boys into a meeting of grown-up men capable of thinking for themselves. The proper use of the franchise, the deliberation of old students even for two days and the carrying away to our other work not only a freshness we all want so badly to save it from being mere drudgery, but a determination to do some national work according to the lines determined by a corporate body—all this would give to the Old Boys Association a *locus standi* a definite character, and above all definite work. We would then feel that we were no more schoolboys, to be humoured and cajoled or if necessary peremptorily silenced and thought to know our place. This is the reform which I have outlined here and which I think would be productive of honest work. Let the patriarchs and the pedagogues change their attitude of suspicion and jealousy which goes ill with their age and profession. But if they go on asking as "What do you want?" in their cold brusque way, they should not complain if we criticise nor ask like old maidens, "why don't the young men come?"

——:o:——

## The Lieutenant-Governor's Visit.

——:o:——

On July 28th, His Honour the Lieutenant-Governor paid a visit to the College, and after an interview with the Trustees in the Principal's Hall, was presented with an Ad-

and people in a every corner of India however remote from the old home. Our colonists are the pioneers of the new movement and have to establish fresh centres of activity. It is therefore no disparagement of the Aligarhite to say that he has gone out in search of fresh fields and pastures new; though it may be far from flattering to him for it to be even whispered that "ulterior" motives were the chief inducement to stay at the homefarm.

It is clear therefore that representation to be real must be elective. And surely the educated, enthusiastic men from Aligarh can be trusted not to abuse this privilege when there are so few temptations in the shape of wealth, or celebrity, or great power. They are in touch not only with the conditions existing at Aligarh but also with their difficulties in the outside world for which they have been fitted out. There will be no wildness in their schemes of reform, for respect for their elders and for their teachers is a characteristic of Musalmans which they have not yet lost, and this reverence for more experienced men is sure to have a moderating effect. This reform will create an extended franchise that will break through the close corporation of the present Trustees. Favouritism too will be eliminated, and whatsoever of it would remain would be the higher form of favouritism, namely the generous respect of one equal for another whom he owns his superior in worth and intelligence. To begin with, we could give to the "Old Boys" the selection of three Trustees, one to be elected every year and holding office for three years though eligible for re-election. Three out of seventy is not so large a number as to excite life-long jealousies in the fold. The electors would be the Old Boys of a certain standing in the Old Boys' Association and their representatives would be men with certain "statutory" qualifications and thus there would be neither "mob-rule" nor indiscriminate selections. The men selected would hold office for a limited time and would thus be bound to live up to their promise.

What the status of the Old Boys is at present can be judged from their Association which has no aims, no character, no work and no responsibility. On the first of every month it demands from us one per cent. of our earnings which we religiously give for the satisfaction of getting the old *zarda* and *feereeni* served to us in the old place just in the old sweet way. We have the pleasure of seeing some of the old familiar faces once again and of talking and jabbering in the old style, forgetful of such thing as *Chalans* and *Jawab Jamabandi* and *So boot*. We make one or two speeches in

empty praise we have had enough. Of paternal advice even more. Give us, not loaves and fishes, for the nation is bankrupt in that, but give us work, settled position, and responsibility. On your own testimonials a fastidious Government has thought it fit to open to us some of the highest offices of the State, where as much honesty, assiduity and responsibility are needed as that which you demand and get from your European Professors. Don't treat us then like the bad horse which you have praised only to palm it off on an unsuspecting friend.

"But you *are* represented in the counsels of the community," you would say. That there *are* Old Boys and a goodly number of them who are Trustees of the College, I readily admit. But place the list before the public and before the class whom these men are supposed to represent and there will surely be room for some surprises. In saying this I mean no offence to those who are Trustees, many of whom are my personal friends and for almost all of whom I have great respect. It testifies to the general excellence of the class that even such a haphazard selection cannot show serious defects of character or other disqualifications than mediocrity in those selected. Such is my trust in their outspoken honesty that I appeal to them to answer two questions themselves. Would some of them have been Trustees were it not for the influence of, or the respect felt for, a parent or an uncle? Would some others have been selected were it not for their taking up residence at Aligarh where, to speak in the blunt phrase of law, they "work for gain?" Take away these two reasons and hardly one would have been a Trustee, though some would have undoubtedly deserved the office.

The idea of representation therefore falls to the ground. But there are other objections to such a selection than the sacrifice of representation. Those who owe their place to nepotism cannot be expected to have either independence of feeling or independence of action. We might as well have given two or three votes to the fathers or uncles.

Those who owe it to the choice of their place of work cannot furnish us with any guarantee of being free from selfish calculations. Even the most generous estimate cannot exempt them from the charge of mediocrity. It would certainly be the realization of our fondest dreams if more of us could settle down at Aligarh and create there the atmosphere of a liberal learning now peculiar to Oxford and Cambridge. But we must not forget that Oxford is now over a thousand years old, while Aligarh has just completed the first quarter of a century of its existence. We have yet to spread out

vilege of humanity to grumble about work and drudgery; but the thing we remember longest and with the best feelings is the work which has occupied our mind and body. By being made to participate in the great work going on at Aligarh, by being made to recognise our dignity as the ocean and to forget our petty individuality as the tiny drop or the little puddle falling into it, we would have another a stronger tie—that of common work—binding us to Aligarh which we now remember only as the scene of our past follies and our past jollities The chief element in the Aligarhite's pride in Aligarh is, as I have said, the feeling that it is the work of our own hands This feeling is in the undergraduate but borrowed, for it is not he who works but men of his own faith. In the graduate who is entrusted with the work of the place, this feeling would be more intense for he would be a worker himself It is this which is at the bottom of all national pride, patriotism and independence. It is this which we have to trace back to the rude Teuton of Tacitus in the forests of Germany where *de minoribus rebus principes consultant, de majoribus omnes* (in small matters the chiefs deliberate, in great matters all), when we think of the greatness of the British Empire "broad-based upon the people's will" In politics we call it the Government of the people, for the people, by the people. To say that some people are not at any time fit for self-Government is one of those plausible objections that "come to stay" 'Deserve before you demand' is a good maxim on the whole, but people don't deserve self-Government before they have it. They have it first and deserve it afterwards Could any of the *principes or duces* of early Germany of the same mind as our Viceroy have convinced the free soldier-citizens that they were not ripe for self-Government, the Empire over a large part of which His Excellency rules to-day would still be none too big for the confines of the Fatherland

In God's name, I say, make a beginning and to-day is just as good a day as any other. You the patriarchs of our race and you the mentors of our youth cannot object to us on the score of lack of public spirit. You cannot object to us on the score of ignorance Do not imitate the Government by decrying your own wares.

هم نیک هدں یا بد هدں پر آخر هدں تمهارے نسبت بهت اچھي

هی اگر حال برا هی —

Even the counterfeit coiner will not object to his own manufacture for fear of discrediting himself. So, in the name of consistency do not damn us with faint praise. Of

ties there was a Session of the Conference at Aligarh. The old worker rose to address an expectant audience. He began slowly and deliberately, and without theoretic or apparent passion gave us the details of his many schemes for the welfare of his people and how he had failed to achieve success through the supineness of an unresponsive public. He then expressed his intention of renouncing the work which sleeping or waking had engaged his thoughts and energies for half a life-time. This sudden announcement stupified the audience with the shock of a half-realized danger. Then the speaker faced us, the schoolboys, who sat in the galleries for the sole purpose of cheering when others cheered, without caring what we applauded. He said, (I quote from memory).

مگر اے گیلری میں بیٹھنے والے طالبعلمو مجھے تم سے ابھی کچھ
کہنا ہے - اگر مجھے کچھ امید باقی ہے تو بس تم سے ہے - لیکن
تمہیں بھی اپنی مردہ قوم کا ساتھ دینا ہو تو جاؤ مرو - گلو - سڑو -
مجھے تمہاری بھی پروا نہیں —

We could see the tears in the tone of the speaker's voice. This simple, direct, forcible appeal touched us, who had been such indifferent listeners to the rest of the proceedings. All the little folks looked at the speaker and at each other with a sort of bewilderment. Why did he appeal to *us*? What could *we* do? But we knew the appeal *had been* made and we were anxious to respond to it, if we only knew how.

The little boys of the early nineties are grown-up men of to-day. Some of them are elected presidents of local institutions with great *éclat*. Others are listened to as oracles of the race. Some others again write with the belief that there is magic in their pens. When we visit the Old College we strut in "the peacock vein" with all the dignity of an "Old Boy." Pardonable weakness this, but unpardonable is that attitude which cannot turn the innocent vanity, this human weakness to better advantage. As peacocks we come and as peacocks we go out to be lost in the hurrying and jostling crowds where we cannot spread out our feathers. Old associations cannot last for ever. Old ties will be broken or loosened by new ones. Aligarh would be to us in the busy work-a day world a mere name half-forgotten. In our old age and retirement it would be a pleasant dream productive of a happy half hour and a few sighs; but its recollection will be dismissed from our minds as a senile weakness. But is it not possible that a part of our energies could be drawn towards the centre from which we had our life? It is a pri-

owes its existence to the one supreme idea that the people feel a common grief and a common misfortune and knowing the disease to be theirs have exerted themselves to furnish the remedy This has been the secret of our pride and this too has been the secret of our success Had Syed Ahmad Khan been an English Governor or an Indian Prince, nay had he been even a rich man or a friend of rich men, could we have felt that pride in him or his College that we feel to-day? An English Governor who in spite of a lack of some sentiments that go to make a man noble had great regard for the welfare of the people and had kept alive in the midst of debasing politics a pure literary taste worthy of an intimate acquaintance of Johnson and Macintosh, founded exclusively for Musalmans, the Calcutta Madrassa Yet for all that we know or care to know they may be teaching Chinese or some other heathen lore at the Madrassa The Nizam's College has been built out of Mohammadan money, yet is it one whit dearer to us than the Colleges at Jeypore or Baroda? We love Aligarh because a subordinate judge retiring on a pension equal to the pay of a raw Assistant Collector fresh from Wren's, went abegging almost literally from door to door, and though the hand came out of the people's pocket not much richer than when it went in, the heart of the beggar inspired the hearts of the givers with a feeling which blesses him that gives and him that takes. And this feeling had its original fountain at Aligarh. We the students, so to speak, lived, moved and had our being in it Whether we have justified the education we received by our lives as men struggling in a world of untruth, selfishness and misery in the various spheres of life in which our lot was cast, whether as the officer of a district or a petty clerk in his office, whether as judges, policemen, vakils or schoolmasters we have done our duty as men, let others speak. It suffices to know that those others are not silent.

But the work expected from us was not only that of good citizens. We had received the heritage of a vast work from a great worker and the fabric, even the foundations of which had hardly been laid, was to rise up through our own exertions. *Quot rami tot arbores* (As many branches, so many trees) might as well have been the motto of our College as it is that of the Allahabad University. I remember an event of my childhood I cannot but call it an *event* which I cannot forget. When I recollect the passionate words of the Master I recognise to-day why he had selected us—his أمين—for the last words of his memorable speech. It was a forlorn hope, but the General knew it must succeed. Early in the Nine-

British rule; they arose from slackness, from idleness and from other causes which were preventible and could be overcome. It had often been his privilege to meet with Mahomedans of great distinction, and when he turned to his right and to his left and looked along those tables he saw every evidence that Mahamedans were quite capable of holding their own in the modern competitive race (Hear, hear.) That the Association might increase their strength and their influence was his wish, as it was the wish of the founder of the College. Now he had the honour of being associated with distinguished members of that College it would be his pleasant duty to watch their efforts in developing it, to notice what was done by Mahomedan nobles and chiefs in India to give of their superfluity to the College in order that it might attract the best educational agency, so that the Mahomedans of India might there in great numbers be educated into loyal subjects of the English raj and be in the future, as so many of them had been in the past, men of great distinction in the administration and in the legislatures of the central and provincial Governments, so that their Mahomedan fellow-subjects might in increasing degree look up to them, and knowing that they were in the counsels of the highest English authorities might rest assured that their rights and their interests were carefully guarded in the counsels of the nation. (Loud cheers).

This concluded the speech-making and the assembly broke up a few minutes earlier than the midnight hour at which the light above Big Ben was extinguished as a token that the cry "Who goes home?" had been heard in the lobbies of the House of Commons, close by.

## The Old Boys.

——:o——

To-day I turn towards the Old Boys of Aligarh and discuss the place which they *ought* to and that which they *actually* occupy in the counsels of the community. I take it that it will not be construed as mere self-praise that the Aligarh men feel greater pride in their *alma mater* than men of any other Educational institution. A common table or a common Chapel are certainly potent factors in the development of the Aligarh *esprit de corps*; but there is something more *Aligarh is ours!* It owes not its existence to the enlightened liberality of the Government though Government support has been as hearty as it has been useful. It owes not its existence to the indifferent charity of an Indian autocrat though Indian Princes are among our chief benefactors. It

tiated, and in order to state what he hoped would always be the progress made from year to year, bringing that College up to the highest educational development. (Cheers.) He thanked Sir Evan James, whom he was glad to meet on that occasion, for the way in which he proposed the toast and for the reminder of good deeds which, according to him, had been perpetrated by him (Lord Reay). It was extremely pleasant to have such reminders, though he was sure that if Sir Evan James was invited to give some criticism of his Bombay administration, he would not be slow to present the other side of the mirror. (Laughter.) The question of the efficiency of educational institutions in India was undoubtedly one of very great importance, because any false step made in the conditions upon which Government grants were given must inevitably retard the educational progress of India. The longer he had looked into educational questions in India the more he had been struck by their complexity and by the difficulties which they presented. This was so in England, but the difficulties were much greater in India, where we had to be very careful that we did nothing which in any way could be interpreted by our fellow-subjects in India as an invasion of their conscientious scruples. He was well aware that the Mahomedans in founding educational institutions laid great stress on the claim that their children should in no way be educated in a manner which would make them less good Mahomedans than their ancestors were under the great Charter given by the late Queen—(Cheers.)—they had a perfect right, just as much as any one in England, to say that nothing should be done to militate against their conscientious convictions. He for one had the greatest respect for those who wished to see these two things combined—educational progress, in accordance with the latest results of scientific investigation and reverence towards those principles on which they had been trained. (Cheers.) It was only on the condition of scrupulous respect for the convictions of our fellow-subjects in India that we could hope not only to retain but to increase their loyalty to English rule (Hear, hear.) To that principal of English administration he attributed mainly the great success it had achieved. There must be the fullest religious liberty for all races over which the British Crown held sway. He appealed to those of them who were returning to India to press upon their co-religionists the importance of strenuously exerting themselves to keep in India the position to which they were entitled. That it was a fair field there could be no doubt. Such difficulties as existed were not imposed by

what were the hopes, the fears and the prejudices of the people.

In proposing the health of Lord Reay, Sir Evan James said that it was by a very happy instinct that they had asked his Lordship to be their president. Lord Reay was not only a educationist, but to the knowledge of the speaker he had done more for education in Westren India and especially for the education of the Mahomedan community, than any other statesman of our time. (Loud cheers.) Sir Evan proceeded to give some examples of Lord Reay's educational activity when he was Governor of Bombay. Thanks to his strenuous precepts and example a large Mahomedan High School was started by private enterprise in Sind, where two thirds of the people were Mahomedans. Lord Reay saw that the school was put on a substantial footing by providing it with a considerable annual grant. The school still existed and as a result Mahomedan education in Sind had made enormous strides during the last few years. When he (Sir Evan) was Commissioner in Sind they were able, with the help of the Amir of Kharpur, to send home and get a first class Baliol man as principal of the school. The first thing he (Sir Evan) did when the new Principal arrived in Sind was to send him to Aligarh to get the latest tips in education (Laughter and cheers). The Mahomedans of Western India owed to Lord Reay a deep debt of gratitude.

On rising to respond Lord Reay met with a most enthusiastic reception, the cheering being again and again renewed. After a playful allusion to the dissipation a member of the Upper House naturally felt in rising to speak after 11 o'clock at night, when he was accustomed to hear apologies for speaking after 7 o'clock in the House of Lords, the President thanked the members of the Association for the honour they had done him in asking him to fill that position. He esteemed it no small honour to be associated in this way with gentlemen who had been educated at a College which owed its origin to the wise initiative of a distinguished member of their own community. Having often had before him in India the question of Mahomedan education, he felt the inestimable value of a College like that at Aligarh, which stood on the bed-rock of self-help. (Cheers.) If the Mahomedan community in India were to obtain their proper position it could only be done by the exercise of their own efforts. (Cheers). That was well understood by the distinguished man who founded that great institution, and it was well that his name should be honoured by them and that they should annually meet to call to remembrance the work he ini-

he must do nothing to disgrace the family name. (Cheers.) He thought, perhaps, that another reason why he had been selected to reply to the toast was that he represented, however unworthily, that not small class, and every day increasing class, of Englishmen who desired a closer union between the East and the West. (Cheers.) A phrase often on people's tongues was that—

East is East, and West is West,
And never the twain shall meet.

But he might describe that phrase as a false epigram which never had his concurrence and he hoped never would (Hear, hear) What was the East, and how many Easts were there? What was the West, and how many Wests were there? In what respect was it impossible that they should meet? Was regard to be paid to the great divergence caused by religion, by climate and by habit between different branches of mankind? Was it to be forgotten that they in England derived their religion, a large part of their language, and the beginning of their learning from the East? And was it to be thought impossible that there might be a *rapprochement* between East and West far greater than had yet taken place? That there should be such *rapprochement* was a counsel of hope, whereas he looked upon the poet's lines as a counsel of despair that was utterly unjustifiable. He thought the speeches that evening, and the history of the College and of that Association all tended to show that the East and the West could to a large extent at any rate, come together (Loud cheers.) He had been specially struck with the practical way of looking at things which characterised the speeches of those who represented the College, and that gave reason for the hope that the "Old Boys" returning to India would do much to further the good work the College was performing. He had only to congratulate hosts and guests on the happy manner in which the former had blended East and West by linking Oriental hospitality with Western gastronomy. (Laughter and cheers).

To the toast of "The Members returning to India" proposed by Dr Zia ud-din Ahmed, Mr. S. S Ahmed replied in a speech which introduced a few of those lighter touches which were somewhat lacking in earlier orations. He pertinently observed that he and his friends returning with him, having received the benefits of Western culture, should seek to advance the general well-being by acting as connecting links between officials in India and the masses. (Cheers.) Their duty would be to explain the objects of Government policy to the people, and to explain to Government officials

had as its basis the equality of all races and creeds. (Cheers). The Great Akbar tried to realise that ideal in India, a fact little understood and very little appreciated He came to the throne when he was but a lad of 14, for half a century he worked with that ideal before him, and he succeeded in rivetting the affections of the people round the throne at Delhi. There was an innate sense of loyalty among the people of India, which required to be evoked by sympathy and justice on the part of its rulers and he felt sure that the great loyalty of the Indian people would in time solidify round the Throne of England. (Cheers) But its full attainment depended upon each individual Englishman who went out to India He had only to work with the example before him of the distinguished guests present that evening to attain the desired consummation (Cheers.)

Sir Charles Stevens said that though there were many of the guests who could reply to this toast far more ably than himself, in one respect he yielded to none of them, and at the same time he could expect none of them to yield to him, and that was in the cordiality with which he thanked the hosts for the hospitality which they were exercising Aligarh College was not so well known in Bengal as it should be, and speaking as a Bengal man he must say that he devoutly wished they could show an institution of the same kind. (Hear, hear) It would be a great day for Bengal when it could do so Possibly one reason why he had been asked to respond to the toast was that he was interested in and represented a kindred but not a rival body, the National Indian Association. In regard to that he would say that he believed there was not one person present who did not feel most sincerely gratified that a high honour had lately been bestowed upon the highly valued honorary secretary, Miss Manning (Loud cheers) The objects of the National Indian Association were not precisely those of the Aligarh Association, but they marched along with them, and it was gratifying that their paths coincided to the great extent that they did. But the hosts of that evening had the advantage, for it was an advantage to some extent, of a narrower field of endeavour, and the bond of union between the members of their Association was naturally closer than that between the members of the older Association That bond could not fail to be useful in a high degree, and he could imagine that many a young man surrounded by the temptations of sojourn in London was helped to keep straight by the knowledge that he was banded with fellow old-students of the College, that his parents' friends were about him and that

acceptance of the presidentship of what was, after all, a Students' Association. That the Association had been gaining ground there could be no doubt, for even during the past three months there had been an increase of nine ordinary and 12 honorary members, and another lady had been added to the roll of associates. The Association had as far as possible made widely known its willingness to help any Indian student here, and it had been formulating plans for receiving and helping "freshers" from India. Help of the kind had been asked for both here and from India, and had been cheerfully given. The standard the Association would ever set before the boys who reverenced their *alma mater* at distant Aligarh was that of free enquiry, of large-hearted toleration and pure morality. (Cheers.)

In terms of sonorous eloquence Mr. Ameer Ali gave the toast of "The Guests." Whether still in harness or enjoying well-earned leisure the interest of their guests in India was, he said, as keen as when they lived and worked there It had been the fashion in recent years to compare British rule in India with Roman rule in Western Asia, but with all deference to the great ancients he thought that comparison did injustice to the sense of duty which animated all officers in India both Indian and English, high and low. (Hear, hear.) To his mind not even the best Romans had a conception of the duty they owed to the rude people over whom they were put in authority. The one great idea of the Roman official was to amass riches and to return to Rome to spend his wealth in riotous living and in pampering the populace whose acclamations might further his ambitions. The young Indian Civilian of to-day who left his English home on the threshold of manhood went out with a determination to do his duty faithfully and honestly to the country to which he was sent wherever his life might be cast. He performed his work conscientiously and earnestly, and no one could grudge him his occasional holidays or the amusements with which he tried to while away the tedium of exile from the land of his birth (Hear, hear.) They might also look at the Indian in the subordinate, judicial and executive services—the munsiff, the subordinate judge working from morning to night with hardly any respite, and the deputy magistrate, all examples of the sense of duty which animated the British administration in India, for which there was no analogy, no parallel in the history of the Roman Empire (Loud cheers). If analogy was needed he, speaking as a Mahomedan, would compare British rule with the rule of the Abyssides in Western Asia and Northern Africa, which

Anxious as they were to have a university of their own at Aligarh, they did not wish to have one in name only—*nam ke waste?* Their ideals of university education were high, and while their resources remained limited they would rather husband those resources and make their college more and more perfect as a college, make it approximate more and more to what it would some day become as a university; in fact bring about its evolution. They would not cry for the moon. The charter was the very last *desideratum* they would ask for they would sooner have a first class college fulfilling, on a small scale, the functions of a university, without a charter, than a charter without what they understood by a university. "What's in a name" should be their motto in this case. (Cheers).

As already mentioned, Sir Charles Lyall in proposing this toast had to step into the gap caused by Mr. Richard's departure for the House of Commons at a few moments' notice He made a humorous reference to the situation in which he was placed and expressed his regret that Mr. Richards had not left his speech behind But he had the consolation that very few words were needed to commend that toast to their hearty support Having had some small part in the ceremony with which the Association was inaugurated he felt a special interest in its progress and prosperity. During the two years of its existence it had been of great advantage both to its members and to the outer world, before whom it set itself to represent the Mahomedan students in London. He trusted the progress made would continue, and that year by year they might enjoy the privilege of thus meeting those young men from Aligarh who so worthily represented here the most advanced Mahomedan community in India.

In the course of a thoughtful reply to the toast, Mr. Hidayat Hosain, the new joint-secretary, described the objects of the Association and remarked that it was now established on a permanent footing. They could not do other than regret that such leaders of thought and culture as Major Syed Hasan, Shamsul Ulama Bilgrami, and Mr Ameer Ali had left India, thus depriving the Mussulman community locally of their invaluable services But if their examples of ripe scholarship and true citizenship were followed by the young men who came here for their studies and were brought into contact with these distinguished men through the medium of the Association the loss would be partially made up. A tribute to the memory of the late Lord Stanley of Alderley led up to a loudly cheered reference to the feelings of pride and pleasure with which the members welcomed Lord Reay's

might congratulate not only the present staff of the Aligarh College, but the governing body of that institution, and the leaders of thought among its supporters, on the fact that they had now fully realised the true ideal of what such a University should be. Riper experience had taught them this lesson especially the experience of a growing number of young men who had seen something of the methods of English Universities and of their high ideals of education : who had felt something of the influence of that atmosphere of high culture that in all departments of human knowledge, presided over their teachings, minds whose enthusiasm was so contagious and so stimulating.

In India the majority of students were very poor and their first care, through sheer necessity, was to provide themselves with the wherewithal for self-support But he was fully convinced that many of them were fond of learning also. Else, they would not have produced the many men of learning and culture they found scattered in all parts of India, who had received no other education than that provided by the Indian Colleges and who, moreover, laboured under the disadvantages that arose from the general absence in India of facilities for study, such as libraries, books of reference, periodicals and what not So that, if immediately on taking their degrees, really brilliant and selected graduates of the Indian universities could be provided with some of the bye product of which he had spoken, they would no doubt adopt the pursuit of knowledge for its own sake. (Cheers.) And in this matter it was not necessary for them to ransack the West in quest of ideals They had only got to look back to their own learned men of a couple of generations ago, the great Moulvies of Delhi, Lucknow, Rampore and other centres of Mussalman learning. who often represented a school of thought in Moslim theology, logic, philsophy or law These men looked for nothing more than the support of a wealthy patron in the matter of food and clothing with an occasional largess. Fees from pupils themselves, mostly supported by charity, were unknown. Nothing but the love of learning was the motive force, which enabled them to devote a whole life-time to the study of some abtruse subject. The moral he wished to draw was that those who desired to see an improvement in the quality of the education in India should see to it that they established something corresponding to the fellowships, tutorships, scholarships and prizes of the English universities ; and above all make every student feel that he might rise to the highest places on the staff of his college if only he should possess the necessary merit.

of sedition and disaffection . it was so in Turkey and in Egypt. This state of things he was thankful to say, had never existed in Aligarh—(hear, hear)—thanks to the admirable lead set by Sir Syed, and the prudent policy of the men who were associated with him in the administration of the College. There had always been in the institution a spirit of loyalty and sanity in the view of political affairs Sir Auckland Colvin said a few years ago that to have been an Aligarh boy was a passport to the confidence of the whole English and Indian community. (Hear, hear ) He (Sir Charles) believed this was true when first spoken it was true to-day, and he hoped it would always continue to be true in increasing measure, and that every prosperity would attach to the College he now begged to toast (Cheers )

Major Syed Hasan, who was warmly received on rising to reply to the toast, said that the kind and sympathetic words of Sir Charles Elliott would be highly appreciated by their people, not only at Aligarh, but throughout India. When Sir Syed Ahmed first conceived the idea of a national college the majority of his friends declared it to be Utopian. "Where was the money to come from ?" they said The money did come and the old Syed Sahib lived to see the College an accomplished fact His successors had since laboured with considerable success to place it on a sounder footing But when they talked of completing his original scheme by gradually evolving a Moslem University, the croakers and pessimists still cried "where is the money to come from ?" That it would ultimately come from somewhere they felt thoroughly confident—(cheers) but for his part he felt that unless their people rose to a keener sense of their responsibility in this matter of a truly national education, by more amply and more readily providing the sinews of war, it was to be feared that for some time to come the scope of the endeavours would have to be limited rather to *emendation*, improvement, consolidation, with perhaps some expansion, than made to include any new departure in the shape of a teaching university But this in itself was a programme by no means to be despised, especially as its achievement must bring them some steps nearer to their goal, constitute in fact a stage in that evolution of which he had spoken and which must sooner or later culminate in the establishment of a great University at Aligarh. (Loud cheers.) The *desiderata* for such a University were many, not the least important being the attainment of correct notions as to what the functions of a great University and of higher education, in the true sense of the word, really were. And he was glad to say that they

and he had an opportunity of seeing them occasionally. He was glad also to read of the interest which was taken in the cricket and football contests with other institutions, in athletic sports of all kinds, in drill and physical exercises. Such exercises were taken as voluntary objects of study. He trusted that the "old boys" now returning to India would tell their friends what an essential thing it appeared in the view of educational experts here that physical exercises should be compulsory in all classes (Cheers). If it was necessary here to insist that education should be supplied, not merely for moral and intellectual needs but also for bodily needs, it was still more necessary in the enervating climate of India. He saw in the report that they had on the staff a professor of science, but he could not find any opinion as to what the character was of the science taught, or what facilities there were for its study. That brought him to another point which he hoped those of them who were going back to India would do their best to impress upon public opinion that was to tell their friends that the expert view firmly established here was that education should not be confined to intellectual wants but should include within its scope manual instruction in wood-work, in metal work in drawing, the training of the eye and hand, and the study and observation of Nature. (Hear, hear.)

But if he were asked what was the greatest test of the success of the College he would say that it consisted in having lived down the hostility and suspicion with which it was at first regarded. He thought there were but few present who could recall or realise how strong the opposition was in the seventies. It was at Hyderabad that the doctrine which were regarded as especially the doctrines of Sir Syed Ahmed became most popular and consequently the feeling of many devout Mahomedans towards Hyderabad was bitter in the extreme. He remembered a leading rais of Rohilkhund going to him with a puzzled and anxious face and condemning Hyderabad for accepting the supposed teaching of Sir Syed that religious difficulties could be solved better by the light of nature than by reference to authority or tradition. But all such bitternesses had now passed away, the Mahomedan community throughout India now accepted Aligarh with perfect confidence, and looked to it as the nucleus of a future University (cheers),—a University which would be mainly confined to Mahomedans, which would have a theological faculty able to explain doctrines of their faith, and which would seek to reconcile the doctrines of Islam with the teachings of science. In many countries Mahomedan schools were hotbeds

Syed consulted when he first mapped the outlines of this great undertaking. The first visit he paid the College was in 1878, when it was still in a state of infancy. About that time his direct connection with the North-Western Provinces ceased and he was placed on duty elsewhere. But he always took the opportunity when travelling to or from Simla or elsewhere to stop at Aligarh for a few hours in order to see the progress the work was making. The last occasion, in 1890, when he was on his way to Calcutta to take up the appointment of Lieutenant-Governor of Bengal, Sir Syed was ill in bed suffering from fever, but he insisted on seeing him and talked with him for a long time about his plans and aspirations. Mr. Theodore Beck subsequently took him round and showed him the latest developments of the work, and he left delighted with the enthusiasm the principal exhibited and with his enlightened views and policy. Since then the College and School had made immense progress, far greater than any anticipations then formed could have realised. Sir Charles proceeded to cite figures from the last annual report of the College to demonstrate the high stage of development it had reached. The number of students which stood at 60, when he first knew the College, had now risen to over [illegible]00, two-fifths being members of the College and three-fifths being members of the school. The school was more and more performing the function of being a feeder to the College, though he feared that many students left the school at too early an age and did not remain to complete their studies by a collegiate career. Since he first knew Aligarh the income had risen from a mere Rs. 5,000 to a lakh of rupees, but the cost of maintenance had increased with equal rapidity, and there was need for larger capital fund to carry out the expenditure necessary to complete the equipment and buildings of the institution. He was glad to see evidences that some ruling princes and wealthy noblemen were rising to the belief that wealth could hardly be better spent than on objects of this character, and it had become an honourable ambition to improve the general prosperity of the community by subsidising educational institutions. In educational work the test of the examinations must be applied, and from this point of view the record for the past year at Aligarh was very gratifying.

Having specified these results, Sir Charles said that almost as important as evidence of the intellectual spirit and tone of the place was what he read in the report of the numbers and flourishing condition of the debating societies and other literary institutions, and also the state of the College magazine a few numbers of which came to England

Messrs. I W Arnold, F. H Brown, Alan Cadell, Harold Cox (late secretary of the Cobden Club), W Coldstream, J Dobby J. Kennedy, W. Moore, J. W Neill, W A. Raleigh, N. Subrahmanyam (Administrator-General, Madras), F W Thomas, Arnold Ward, and A N Wollaston. The hosts not already named were D Zia-ud-din Ahmed, Mr. H Hidayat Hosain, the joint secretary, Nawab Hamid Yar Jang, and Messrs S Asalat Ali Akbar, S Ghazi-ud-din Ali Akbar, H. M. Abdul Ali, I C S., M. Anwar Ali, Abdul Aziz, S Mahdi Hosan Bilgrami, S M. Habibullah, Mir Aga Hasan, M Haidar Hasan, S. Ishrat Husain, S Sajjad Husain, Fazle Mahomed Khan, Latafat Hosain Khan, M Ibrahim Khan, M Ismail Khan, S Abdul Majid Suleman M Mangi, S Abdul Kadir, Kalilur Rahman Samı-ud-din, and Mahomed Wasim

Loud applause greeted Lord Reay when he rose to propose the health of the King Emperor Nowhere, he said, was there more loyalty to the Throne than in India, and no community was more loyal than the Mahomedan community. (Cheers) They rejoiced that in King Edward they had a Sovereign who was personally acquainted with India, and they were sure that the King-Emperor had the same solicitude for the welfare of his Indian subjects as was exhibited by his Royal mother in such an eminent degree. (Cheers) They hoped that some day India might have the privilege of greeting their Royal Highnesses the Prince and Princess of Wales—(hear, hear)—for it was certainly desirable that the heir to the Throne should become personally acquainted with India and its millions of loyal subjects The work His Majesty had done in promoting the establishment of peaceful relations with other Powers was appreciated no less in India than in England, for it was of the highest importance to secure the blessings of peace to the Dependency. If India was to progress, if India was to reap all the benefits of modern civilisation, if India was to maintain that marvellous financial prosperity, of which we in England at the present time were envious, then the first condition of that prosperity was that peace should be maintained (Cheers) No one was more convinced of that fact than our present Sovereign, and this was one of the reasons why the toast should be received with the utmost heartiness and loyalty (Cheers)

It fell to the lot of Sir Charles Elliott to propose the toast of the College, and he commenced with the remark that the performance of this pleasant duty gave him an opportunity to revive old associations. His friendship with the late Sir Syed Ahmad was a very close one and dated from a great many years back He was one of those whom Sir

# The Aligarh College Association.

## Annual Dinner.

*(From the Pioneer.)*

London, 1st July.

Rather more than two years ago I sent you an account of a foregathering of "Old Boys" of the Mahomedan and Anglo-Oriental College at the Trocadero Restaurant, and from the enthusiasm manifested I drew the conclusion that the gathering was destined to be the first of a permanent series of annual dinners. Soon after the College Association was formed, and the dinner, instead of being left to the uncertain chances of promotion by an ever-changing ad hoc committee, is now a feature, and by no means the least important feature, of the work of the Association year by year. In bringing the members and the honorary members and guests together in convivial friendship in a way that no evening party could do, for it permits of leisurely exchange of views on topics of mutual interest, it gives an opportunity for speeches which stimulate the *esprit de corps* of the old students and the interest of friends and well-wishers in the College. This stimulation is not confined to those present, for not only is the function briefly alluded to in the English Press, but through the medium of your columns the proceedings are made known throughout India with great advantage to the work of the College and the promotion of the great ideals for which it stands among the Mussalmans of the Dependency.

Lord Reay who presided at the second annual dinner on Monday evening had on his immediate right Mr. Ameer Ali, late Judge of the Calcutta High Court, Sir Charles Elliott, and Shamsul-Ulama Syed Ali Bilgrami, the honorary secretary, while the corresponding places to the left of his Lordship were occupied by Major Syed Hasan Bilgrami, chairman of the committee, Sir Charles Crosthwaite and Mr S.S. Ahmed. Guests and hosts were similarly sandwiched all round the tables. The House of Commons was represented by Sir M. M. Bhownaggree and Mr. H C. Richards, but as both hon. members had to leave soon after nine in response to the appeals of Government Whips, we had not the anticipated opportunity of hearing Mr. Richards propose the toast of the Association of which he is vice-president. His place on the toast list was taken at a moment's notice by Sir Charles Lyall The other guests of the evening were Sir Evan James, Sir Charles Stevens, Sir Curzon Wyllie, Major-General Dickson, Colonel Oswald Fitzgerald, Dr. W. Blake Odgers, K. C., and

self. expressed objections to the local butcher, a man as it happened of considerable wealth, when he proposed to send his sons to St Paul's. The butcher's reply was, 'Very well, Sir; very well. I'll send them to Eton'; and he did. The system of mixed schools is carried to perfection in America, where while, socially, there is plenty of class distinction, in the school there is none.

---

We insert an article on "The Old Boys" which appeared some weeks ago in the Punjab "Observer." Although there is room for much difference of opinion with regard to many of the views which the writer puts forward we commend to the attention of the public the suggestion for creation of an electoral body of Old Boys to elect three Trustees to hold office for a limited time. This is similar to the "election by Graduates" which has been made law in the recent Universities Bill, but in the case of Aligarh the electoral constituency would be better fitted to pass an opinion upon matters concerning their own College than the graduates of many diverse centres to legislate for the University. The difficulties to which the writer has not referred are (1) that the reform of the constitution of the Governing Body has long been an urgent need and yet it seems impossible to get the Trustees to legislate. The practical work of the College can only be carried on in defiance of the letter of the constitution and yet this vitally disabling defect is not removed nor does it seem to be likely to be removed. The second and perhaps more serious difficulty is that if the Old Boys can only come to the College for Trustees' Meetings, there is no work for them to do. If they will come frequently if they can be present, say once a month, and take an active and continuous interest in College work, then there is an abundance of work for them to do; but there is next to nothing of any interest or value to be done at an annual meeting; such meetings *must* become matters of mere form, they can only *confirm* what has been done or decided upon. As an example we would point to the Indian Universities in which the senates have almost everywhere been reduced to ornamental duties, the real work of the University being done by the Syndicates. Aligarh wants a Syndicate, and if a considerable number of Syndics are Old Boys so much the better; but they must be residents in Aligarh.

——:o:——

terests of his order. In Sind then the governing ought, where it can, to be done by Mahomedans just as in the Maratha country it should be done mainly by Marathas, and in Gujarat by Gujaratis. A leaven from outside is invaluable, nay, perhaps indispensable. But the main body of the governing officers should be of the same religion, the same mode of thinking as the governed. And what alone prevents this in Sind? Simply the lack of education among Mahomedans. Then again every man should be able to protect the interests of his own order.

Now the Mahomedans here are mainly the land-owning and agricultural orders, the Hindus rather the commercial and professional orders. We all know how admirably they protect their interests. We often hear how poorly the interests of the Mahomedans are protected. And why is that? Again because the Mahomedans lack education.

Now, gentlemen, for the promotion of Mahomedan education I regard this institution as one of the most important, perhaps the most important engine in Sind.

But what is it that recommends this college to the Mahomedans of Karachi? I think it is particularly that here they obtain for their children, at the same time as secular instruction, religious instruction of the kind which they approve. In this Mahomedan parents have my warmest sympathies. Parents in almost all countries have shown the same desire. The question has been a burning one in many countries—in England—in France. In Scotland the question has been satisfactorily solved, but there in every board school religious instruction is given as here by ministers of religion. I will only venture, I trust without offence, to express my regret that your noble scriptures, the Koran, are still taught by rote,—and to hope that before long they will be translated, like our Bible, into the 'vulgar tongue,' and be taught with intelligent explanation to understanding learners.

There is one other feature of this school which I should like to mention, and that is the mixture of classes. I see here smartly dressed Talpurs side by side with boys of humble rank. I delight in seeing them living and working in the same school together. I myself was at Eton, which is generally supposed to be a school for one class only. But this is quite wrong. Though there are few unmoneyed boys, there is plenty of mixture there. The scions of the noblest and most ancient families congregate there with the sons of self-made men. I should like to tell you an anecdote to illustrate this. My two sons went to another school, St Paul's, where also there is a mixture of classes. One parent, of no great position him-

In less than a hundred years the Hall, which is even now a shrine of many sacred memorials, would become a real treasure house, with walls engraved with the names of Kings —Kings not of mere earthly territories, though space might even be found for them, but Kings of work well done, great hearted men of high hopes and of something accomplished

—:o:—

Think too of the candidates sitting there in examination time. When hand and brain grew weary, what more restful pause could be indulged in than a placid contemplation of those enduring walls? Nor would time be given idly to meditating on all that those inscriptions might mean and teach

—:o:—

The Football Team went away on tour early in July The following is the list of the matches they played at Dehra-Dun with results

| | | | |
|---|---|---|---|
| v. | European Class, Imp Forest School, | won | 4–0 |
| v. | Native Class, Imp Forest School, | lost | 0–1 |
| v. | The Rest Camp | won, | 2–0 |
| v. | Native Class, (return match) | won, | 4–0 |
| v. | Railway and Survey Department | lost, | 0–1 |

The match at Mussoorie against the Manor House could not be played owing to heavy rain

—:o:—

There is an interesting account in the Scind Gazette of July 22nd, of the Prize-giving at the Sind Madrasah, where Mr Vines is doing such good work as Principal The Commissioner-in-Scind, the Hon'ble Mr J W P Muir Mackenzie, made a speech of such general interest to all Mahomedans that we quote a great part of it here

THE COMMISSIONER SAID —I should now like to address a few words to the grown-up portion of the audience on the matters which after all form my principal motive in coming here, namely, my strong sense of the duty which the Commissioner-in-Sind owes to Mahomedan Education. Now, what is the reason why Government are exerting themselves so much on behalf of Mahomedans, and in particular on behalf of Mahomedan Education in Sind? Surely the answer is very simple,—nine-tenths of the people are Mahomedans—and the first object of Government is and ought to be to fit the great bulk of the population to govern itself, and to enable every member of every order to protect the in-

# The Aligarh Monthly.

**AUGUST, 1904.**


## College Notes.

—o—

There is but little to record, as the College is now closed for the Vacation; but the chief point of interest, for the month of July, centres in the visit that Sir James LaTouche paid the College on the 28th, an account of which is printed in this number.

—o—

The account is not so full as we could have wished; but there was apparently a very fair gathering of Trustees and friends of the College to welcome His Honour, whose intention, however, was not to mark the occasion as one of formal ceremony but rather as an opportunity for conferring with the Trustees and seeing the College grounds and buildings.

—o—

It is pleasing to have to record that considerable sums of money were paid and promised for the Scholarship Fund for advanced study in Arabic. The names of these donors will be published in a later issue of the Monthly.

—o—

While speaking of donations one is reminded of a recent proposal, a very excellent one, we think—to have the names of all the College Benefactors inscribed on the walls of the Strachey Hall. Many names are already so inscribed, but there certainly should be a list of those who have contributed to the Scholarship Fund, the Prize Fund or the Endowment or to anything that helps the work and edification of the College. We might go further, and put up memorial tablets to those who have served the College well in any department

# علی گڈھ منتھلی

جلد ۲ | ستمبر سنہ ۱۹۰۴ عیسوی | نمبر ۹


## الاموسۃ عند العرب

(نمبر ۳)

(سلسلے کیلئے مئی اور جولائی کا "منتھلی" دیکھنا چاہیئے)

**نظامِ اموسۃ کا اثر وراثت پر** — قوم نائر جس میں "نکاح مشارکت" کی اولاد کو متبنٰی بنانے کی رسم برابر رائج چلی آرہی ہے، اِس وقت تک "نظامِ ابوۃ" سے ناواقف، اور "نظامِ اموسۃ" پر قائم ہے، اور اُسکے تمام اخلاق وعادات سے اس کا ثبوت ملتا ہے۔ چنانچہ حقِ وراثت صرف عورت کی ذریات میں منحصر ہے، اور خصوصًا بہن کی اولاد میں۔

باکوفین نے اپنی کتاب "اموسۃ" میں قوم نائر کے "نکاح مشارکت" کے بیان میں اکثر اُن روایتوں کو جمع کیا ہے، جو مختلف تصانیف میں اُن کی نسبت لکھی گئی تھیں۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ:—

"وضعِ حمل کے بعد عورت بچے کا باپ معیّن کرتی ہے، تاکہ وہ اُسکی ضروریات اور تربیت کا

"متکفل ہو۔ یہ ذمہ داری اُس وقت عائد ہوتی ہے جبکہ نائر بڑا ہو کر اچھی طرح چلنے پھرنے لگتا ہے۔
"بچہ کبھی اپنے باپ کا وارث نہیں ہوتا، بلکہ بہن کی اولاد اُس کی وارث ہوتی ہے۔ اگر بہن کی
"اولاد موجود نہ ہو، تو مرد کے وہ رشتہ دار وارث ہوتے ہیں، جو اُس کی دادی کی طرف سے رشتہ
"قرابت رکھتے ہوں[۱]۔"

[۱]- باکوفین اپنی کتاب مذکور کے صفحہ (۴۴۷) میں نکولوڈی کونٹی (NICOLODI CONTI) کے حوالہ سے
بیان کرتا ہے کہ:۔
"عورت ہر بچے کا باپ معین کرتی تھی، لیکن یہ بچہ اُس شخص کا وارث نہیں شمار کیا جاتا تھا، جو اُسکو متبنیٰ
"کر لیتا تھا، بلکہ اُس کی وارث، اُس کی بہن کی اولاد ہوتی تھی۔"
اِس کی شہادت ابن بطوطہ کے بیان سے بھی ملتی ہے، چنانچہ وہ ملابار کے بیان میں لکھتا ہے کہ:۔
"ان راجاؤں کے بیٹے راج کے وارث نہیں ہوتے، بلکہ اُن کے بھانجے وارث ہوتے ہیں۔"
اُردو ترجمہ سفر نامہ ابن بطوطہ جلد دوم۔ صفحہ ۲۰۳۔ مطبوعہ لاہور۔ اختر۔
ہنٹر اپنے "گزیٹیر" میں ٹراونکور کے بیان میں لکھتا ہے کہ:۔
"وراثت بہنوں، اور بہنوں کی اولاد کو ملتی ہے۔ اگر بہن نہ ہو یا بھانجی نہ ہو، تو کسی کو متبنیٰ بہن بناتے
"ہیں۔ ورنہ وہ شخص لاوارث سمجھا جاتا ہے۔ نائر کی اولاد اپنے ماموں کا ورثہ پاتی ہے، اور اُسی کا
"کریاکرم کرتی ہے، باپ کی وراثت اُسکو نہیں ملتی۔ یہ وراثت کا طریقہ "تعدد ازدواج" کی رسم کا بقیہ ہے
"جو اَب تک بھی کہیں کہیں باقی ہے۔"
ابوالقاسم فرشتہ، تحفۃ المجاہدین کے حوالہ سے لکھتا ہے کہ:۔
"رعایای ملیبار اکثر کفار اند۔ وعشائر آنجا را نیار (نائر) گویند۔ وعقد نیار بازن خیط ایست در گردن
"زن۔ بعد از آں سرو کار آں زن نسبت بہ عاقد وغیر عاقد یکساں ست۔ چنانچہ یک زن می تواند بود
"کہ بے عقد، شوہر متعدد داشتہ باشد، وہر شب نوبتے بہ یکے میرسد۔ ودیگر قومہا غیر از براہمہ
"دریں امر با نیار موافقت جویند۔ ہمچنیں قوم گکھر در پنجاب قبل از اسلام ایں رسم سیہ داشتند۔ ہنر نے

لہذا ہماری اِس راے پر کچھ اعتراض نہیں کیا جا سکتا، کہ قدیم عربوں کی ابتدائی سوسائٹی کی بُنیاد "اُموتہ" پر قائم تھی۔ اِسکے علاوہ ہمارے پاس اس دعوے پر اور بھی بہت سے دلائل ہیں۔ مزید توضیح اور رفع اعتراضات کے لئے ہم بعض دلائل اور بھی بیان کرتے ہیں۔

**لفظ "بُطن" سے "اُموتہ" پر استدلال۔** عرب میں "نظامِ ابوۃ" کی بنیاد پڑنے سے پہلے "اُموتہ" کے رائج ہونے پر سب سے بڑی دلیل ایک لفظ "بُطن" ہے۔ عرب آجتک اِس لفظ کو قبیلہ یا خاندان کے معنی میں استعمال کرتے ہیں۔ اِس میں کچھ شک نہیں کہ یہ لفظ اپنے اصلی معنی کے لحاظ سے اُس زمانے کے وجود پر اشارہ کرتا ہے جبکہ خاندان کا مصدر و منبع اور مرکز عورت سمجھی جاتی تھی۔

**الفاظ "قرابت" سے "اُموتہ" پر استدلال۔** عرب کے علاوہ اکثر اور قوموں میں بھی بعینہٖ یہی لفظ یا اس کے ہم معنی کوئی اور لفظ پایا جاتا ہے۔ بخوفِ طوالت ہم اِس قسم کی مثال صرف انڈین آرکی پے لے گو یا بالائی جزیرہٴ سوماٹرا[1] کے باشندوں کے الفاظ کی بیان کرتے ہیں۔ اِن تمام قبیلوں میں "نظام اموتہ"

"چندیں شوہر میداشت، و ہر شوہرے کہ بخانہٴ زن می آمد علامتی از خود بیرونِ در میگذاشت، تا دیگر شوہر آنرا دیدہ باز گردد۔ قاعدہٴ برہمنانِ ملیبار چنان است کہ ہر گاہ چند برادر باشند یک زن میگیرد، و دیگران بلا عقد با زنان نیار وغیرہ میانند۔ وراثت درمیانِ قوم نیار بہ ہمشیرگان کہ از یک مادر باشند و اولادِ ہمشیرگان، و اولادِ ہمشیرگانِ والدہ میرسد۔ و بہ اولاد متوفی نمی رسد۔" تاریخ فرشتہ جلد دوم۔ مقالہٴ یازدہم۔ صفحہ ۹۰۷۔ مطبوعہ بمبئی ۱۸۳۲ء۔

سب سے زیادہ تعجب آمیز وہ مثال ہے جو ابن بطوطہ نے سوڈان کے حالات میں بیان کی ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بعض قوموں میں اسلام قبول کرنیکے بعد بھی اُن کی پہلی مراسم کی بنا پر "نظام اموتہ" باقی رہا۔ وہ لکھتا ہے کہ:-

"ہر ایک شخص اپنے باپ کا بیٹا نہیں کہلاتا، بلکہ اپنے ماموں کا بھانجا کہلاتا ہے، اور ہر ایک شخص کے وارث اُس کے بیٹے نہیں ہوتے، بلکہ بھانجے ہوتے ہیں۔" اِن لوگوں کے مسلمان ہونے اور اس رسم کے رائج ہونے پر وہ ان الفاظ میں تعجب ظاہر کرتا ہے کہ "لیکن تعجب ہے کہ یہ لوگ مسلمان، نماز کے پابند، قرآن کے حافظ، اور بڑے بڑے فقیہ ہوتے ہیں۔"

اُردو ترجمہ سفرنامہ ابن بطوطہ۔ جلد دوم۔ صفحہ ۴۶۷۔ مطبوعہ لاہور۔ اختصار۔

[1] وان ہیزلسٹ کی کتاب "بالائی سوماٹرا کے باشندوں کا بیان" (ڈچ) صفحہ ۲۴۵۔

قائم ہے۔ ان قبیلوں میں ایک لفظ "سَابُوَوَہ پِی رُوٹ" (SABUWANPERUT.) مستعمل ہے۔ اسکے معنی "ایک بطن کا" یا ایک ماں کے رحم کا" ہیں - یہ لفظ اُن رشتہ داروں کی جماعت پر بولا جاتا ہے جو ایک ہی گھر میں اور ایک ہی خاندان بنا کر رہتے ہوں - یہ یگانگت صرف ایک عورت سے تعلق رکھنے کی بنا پر ہوتی ہے، جو مادرِ قبیلہ ہوتی ہے۔

اس قسم کا ایک اور لفظ "پاسَاری بَٹ ٹَنگَنگ" (PASARIBATTANGANG.) ہے - قبائل بَاکَاسَل عموماً اس لفظ کو بھائیوں، بہنوں، یا خاندان کا مفہوم ظاہر کرنے کے لیے بولتے ہیں - اس کے لفظی معنی "بطنِ واحد سے پیدا ہونے والے" ہیں[1] - گمانِ غالب ہے کہ یہ مجازی الفاظ دنیا میں اُسوقت پیدا ہوئے ہیں جبکہ نظامِ خاندانی صرف "اُموتہ" پر قائم تھا -

اِسی قسم کا ایک اور لفظ سَنَا تُوتُوآن (SAMATOTOAN.) ہے جو جزائر سیلیبس (CELEBES-) کے قبائلِ غور میں مستعمل ہے (یہ لفظ "تُوتُو" سے ماخوذ ہے، جس کے معنی اُن کی زبان میں "دُودھ" کے ہیں)۔ اس لفظ کے اصلی معنی "ایک دُودھ سے پرورش پانیوالے ہیں"

قبائل بطاس خاندان کے ہر رکن کی نسبت لفظ "سِین نِی نَا" (SENNINA—) استعمال کرتے ہیں، جس کے معنی "رفقاء الام" ہیں - یا اسی موقع کے لئے ایک دوسرا لفظ "ڈُانگَن سَبُوتُوہا" (DONGA-SABUTUHA-) استعمال کرتے ہیں - اسکے معنی "رفقاء البطن" ہیں -

الفاظ مذکورہ بالا کا استعمال نہایت عمدگی سے اس بات کو ثابت کر رہا ہے، کہ اِن قوموں میں کسی گذشتہ زمانے میں "نظامِ اموتہ" قائم تھا، اور رشتۂ قرابت صرف ماں تک منحصر تھا -

اِن تمام دلائل و نظائر کے بعد ہماری اِس رائے میں کسی شبہہ کی گنجایش باقی نہیں رہتی، کہ عربوں میں لفظ "بطن" کا استعمال خاندان کے معنوں میں ہوتا تھا -

**"اُموتہ" اور انساب عرب** کسی قبیلہ میں "نظام اموتہ" کے جاری ہونے کا نتیجہ ہونا چاہیئے، کہ بچہ اپنی ماں کی طرف منسوب کیا جائے، اور اُسی کے نام سے اُسکا نام لیا جائے - لیکن انساب عرب

[1] - جی - اسے ولکن کی کتاب "ملائی قوموں میں قرابت ازدواج اور وراثت کا بیان" (ڈچ) صفحہ ۸۲-

میں ہمکو اس بات کا پتہ نہیں چلتا، بلکہ بجائے اسکے یہ ملتا ہے کہ بچہ اکثر و بیشتر اپنے باپ کیطرف منسوب ہوتا ہے، اور اُسی کے نام پر اسکا نام رکھا جاتا ہے۔

یہ ظاہری تفاوت حقیقتِ نفس الامری کو کچھ صدمہ نہیں پہنچاتا، اسلئے کہ ہم پہلے بیان کر آئے ہیں کہ عرب کا علم الانساب تاریخی وقعت کے درجے سے گرا ہوا ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ یہ شجرہ ہائے نسب اُس وقت بنائے گئے ہیں جبکہ عربوں کے خاندان کی بنیاد "نظامِ ابوۃ" پر رکھی جا چکی تھی؛ اور "اُموتہ" کا کچھ نام و نشان باقی نہیں رہا تھا۔ پس اِسوقت عربوں کا علم الانساب نہایت خلط ملط اور غلط ہے، اور اسکا سبب بھی "اُبوۃ" کا قائم ہونا ہے۔

لیکن اس پر بھی ہمارے پاس ایسے شواہد موجود ہیں، جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اولاد اپنی ماؤں کی طرف منسوب ہوتی تھی، اور اُن ہی کے ناموں پر اُن کے نام رکھے جاتے تھے۔

مشہور مستشرق نول ڈی کی ( NöLDEKE - ) نے بعض ایسی مثالیں بیان کی ہیں، جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ امراءِ عرب تک میں یہ دستور رائج تھا[1]۔ وہ تمام قبیلے، جو باپ سے قطع نظر کر کے ماں کی طرف منسوب کیے جاتے تھے، اِسکی عمدہ مثال ہو سکتے ہیں۔ مثلاً قبیلۂ بنی خندف، جو لیاس (شوہر) اور خندف (بیوی) کی اولاد میں سے بیان کیا جاتا ہے، ابوالفدا اس کی نسبت لکھتا ہے کہ:—

" لیاس کی تمام اولاد، جو خندف سے پیدا ہوئی، وہ باپ کی طرف منسوب نہیں کی جاتی، بلکہ
" ماں کی طرف منسوب ہو کر بنو خندف کہلاتی ہے، اور لیاس بن مضر کا نام نہیں لیا جاتا[2]"

اِسی طرح بنو مزینۃ اپنی ماں مزینۃ کی طرف منسوب کیے جاتے ہیں، اور اپنے باپ عمرو کی طرف نسبت نہیں دیے جاتے[3]۔

---

[1] - نول ڈی کی کی کتاب "ساسانیوں کے زمانہ میں عربوں اور ایرانیوں کی تاریخ" (جرمنی) صفحہ ۱۷۔

[2] - ابوالفدا کی کتاب التواریخ القدیمہ من المختصر فی اخبار البشر" مطبوعہ فلی چر ( FLEICHER - ) صفحہ ۱۹۶۔

[3] ابوالفدا کی تاریخ مذکورۂ بالا۔ صفحہ ۱۹۶۔

اسی قسم کی ایک مثال مقریزی نے مصر کے عربوں کے بیان میں لکھی ہے، کہ بنو عمرو جو عمرو بن شبیس کی اولاد میں سے ہیں، بنو عقدۃ کے نام سے بھی ملقب کئے جاتے ہیں، اور یہ عقدۃ اُن کے قبیلہ کی ماں تھی۔[1]

اگر یہ دلائل بھی عرب میں "نظامِ اموتہ" کے رواج پر ناکافی خیال کئے جائیں، تو ہم اس دعوے کی تائید میں اور تسکین بخش دلائل بھی بیان کر سکتے ہیں۔

**"اُموتہ" کا اثر ازدواج پر۔** یہ بات بدیہی ہے کہ جب رشتۂ قرابت عورت کیطرف سے ہوگا، اور بچہ بجائے باپ کے ماں کیطرف منسوب ہوگا، تو اس حالت میں "بنی العلات" (ایک باپ اور چند ماؤں کی اولاد) میں کوئی لحاظ اور حقوقِ قرابت ملحوظ نہیں ہونگے، اور نہ ان بھائی بہنوں میں باہم شادی بیاہ کرنا ہی ممنوع ہوگا۔ درحقیقت دُنیا میں ایسا ہوتا ہے، اور ہمارے پاس اس کے بہت سے شواہد بھی موجود ہیں۔

جزیرہ مڈغاسکر کے قبائل ہوفاس کی نسبت، جن میں "نظامِ اموتہ" قائم ہے، بیان کیا جاتا ہے کہ:۔

"یہ لوگ بہن بھائی کا نکاح جائز قرار دیتے ہیں، بشرطیکہ یہ دونوں ایک ہی ماں کی اولاد ہوں۔"[2]

قدیم یونانیوں میں بھی اس رسم کا وجود پایا جاتا ہے۔ چنانچہ اغسطین طوبادی نے ویرد کے حوالہ سے بیان کیا ہے۔ کہ:۔

"ایتھنز کے باشندے اپنی ماؤں کی طرف منسوب ہوتے تھے۔"[3]

یعنی اُن میں اصولِ "اموتہ" قائم تھا۔ یونان کے مشہور مقنن سولن کے بعض قوانین سے بھی اس کا پتہ چلتا ہے۔ چنانچہ اُس کے قانون میں بھائی کو اپنی ہمشیرہ پدری سے نکاح کرنے کی

---

[1] "المقریزی" صفحہ ۹۔ مطبوعہ یورپ۔

[2] اسپنسر کی کتاب "تشریح علم المعاشرت" جلد ۱۔ باب ۹۔

[3] سنٹ آگسٹائن کی کتاب "خدا کا شہر" (لیٹن)۔ صفحہ ۹-۱۸۔

اجازت، اور ہمشیرۂ مادری سے نکاح کرنے کی ممانعت تھی۔

سامی قوموں میں اس قسم کے نکاح کی مثالیں کثرت سے ملتی ہیں۔ اور یہ رسم بلاشبہ اُس پُرانے زمانے کی یادگار ہے جبکہ رشتۂ قرابت مادری کو رشتۂ قرابت پدری سے بہت زیادہ اہمیت حاصل تھی، اور تمام نظام خاندانی "اموتہ" پر قائم تھا۔

اس جگہ ہم اس رسم کے بعض نہایت مخفی باقیات کو بیان کرتے ہیں، اور عبرانیوں سے شروع کرتے ہیں۔

توراۃ سے معلوم ہوتا ہے، کہ حضرت ابراہیم کی بیوی سارا ان کی ہمشیرہ پدری تھیں چنانچہ ایک روز خود اُنھوں نے اپنی زبان سے اسکا اقرار کیا، اور کہا کہ:—

"وہ (سارۃ) بھی حقیقت میں میری بہن ہے، اس لئے کہ وہ میرے باپ کی بیٹی ہے" "اور میری ماں کی بیٹی نہیں[1]"

اور نیز ثامار نے امنون سے نکاح کیا۔ امنون اگرچہ داؤد کی بیٹی تھی، لیکن ثامار کی ماں سے نہیں تھی۔ چنانچہ امنون کے ان الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ:—

"اب بادشاہ سے کلام کر، کیونکہ وہ مجھ سے تجھ کو روکے گا نہیں[2]"

اس قسم کے نکاح کی مثالیں خرقیال نبی کے زمانہ میں بھی ملتی ہیں، اس لئے کہ خود خرقیال اپنی اُمت کو اس رسم پر زجر و توبیخ کرتے تھے[3]

---

[1] - سفر تکوین - باب ۲۰ - آیت ۱۲ -

[2] - تواریخ الملوک - باب ۱۳ - آیت ۱۳ -

[3] - خرقیال ا - باب ۲۲ - آیت ۱۱ - یہاں سے ثابت ہوتا ہے کہ عبرانیوں میں اس زمانہ سے بہت پہلے سے "اموتہ" رائج تھی - ہمارے پاس "نظام اموتہ" کے ثبوت میں بھائی کے ہمشیرہ پدری کے ساتھ نکاح کرنے کے علاوہ اور دلائل بھی ہیں، جن میں سے بعض دلائل کو رابرٹ سن اسمتھ نے بیان کیا ہے وہ لکھتا ہے کہ:—

یہ امر مسلّم ہے کہ عرب میں بھی اس قسم کا نکاح رائج تھا۔ ملوک[1] حیرۃ کے تاریخی واقعات، اور باشندگان شہر مرباط کے حالات اس کی کافی دلیل ہیں۔ چنانچہ بیان کیا گیا ہے کہ:۔

"بھائی بلا کسی روک ٹوک کے اپنی بہنوں سے نکاح کرتے تھے۔ یہ بہنیں ایک باپ اور مختلف ماؤں سے ہوتی تھیں۔"

**"اُموتہ" اور وراثت مالی وخاندانی۔** رابرٹ سن اسمتھ نے اپنی کتاب مذکور میں اس رسم کو بیان کیا ہے۔ "نظام اموتہ" قائم ہونے پر سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ بھانجوں کو وراثت ملتی تھی۔ ہم اوپر بیان کر آئے ہیں کہ دور "اُموتہ" میں وراثت کے حقوق بجائے سلسلۂ پدری کے سلسلۂ مادری میں منتقل ہوتے ہیں۔ یعنی اولاد اپنے باپ کی وارث نہیں ہوتی، بلکہ بھانجے وارث ہوتے ہیں۔ اور سب سے زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ باپ اکثر وبیشتر، خصوصاً القاب شرافت کا وارث بنانے میں، اپنے بھانجوں کو اپنی اولاد پر ترجیح دیتا تھا۔ حتیٰ کہ بعض اُن لوگوں میں بھی یہ دستور تھا جن میں "نظام اموتہ" قائم نہیں تھا۔ ان عجیب رسم کی بُنیاد بجز اسکے اور کچھ نہیں تبلائی جا سکتی کہ یہ "نظام اموتہ" کی بچی کھچی یادگاریں ہیں۔

اسلام سے پہلے کی تاریخ عرب میں اس قسم کی اکثر مثالیں پائی جاتی ہیں، اور بہت سے ایسے سردار و نجابتہ چلتا ہی جنکی خدمات اور لقب کے وارث بجائے اُنکی اولاد، اُنکے بھانجے ہوئے ہیں جنکو ان واقعات کی صحت میں کچھ شبہ ہو اُن کو ابوالفدا[2] کی

---

"اسحاق کی بیوی حاصل کرنے کے لئے جو ہدایا دیے گئے وہ عورت کی ماں اور بھائی کو دیے گئے۔" (سفر تکوین۔ باب ۲۴۔ آیت ۵۳) ایک باپ کو یہ ضرور تھا کہ جس نظر سے وہ اپنی بیٹیوں کو دیکھے، وہ اسی نظر سے اپنی بھانجیوں کو بھی دیکھے۔ اور ماں ہی کے رشتہ داروں کو قاتل سے دیت لینے کا حق حاصل تھا۔" (قضاۃ۔ باب ۸۔ آیت ۱۹۔

[1] ۔ نول ڈی کی کتاب۔ صفحہ ۱۳۲ و ۱۳۳۔

[2] ۔ ابوالفدا کی کتاب "التواریخ القدیمہ من المختصر فی اخبار البشر"، صفحہ ۱۱۸ و ۱۲۲۔

کتاب میں اسلام سے پہلے کی تاریخ عرب پڑھنا چاہیئے۔

جب ہم اس اُصول پر نظر ڈالتے ہیں، کہ عرب میں حقوق وراثت بجائے کسی اور سلسلہ کے، ماں کے سلسلہ سے اولاد تک پہنچتے تھے، تو سب تعجب رفع ہوجاتا ہے، اسلئے کہ جس وقت عرب میں "نکاح متعہ" رائج تھا، اور جب کوئی باپ کا نام تک نہ جانتا تھا، تو اُس وقت صرف ماں ہی خاندان کا مرکز اور بنیاد سمجھی جاتی تھی، اور اسی لئے "نکاح متعہ" میں باپ کی طرف سے اولاد کو میراث نہیں ملتی۔

اگر ہم کو یہ نہ معلوم ہوتا کہ "نکاح مشارکت" اور "تعدد ازواج" قدیم عربوں میں "نظام اسومتہ" کے قائم ہونے سے پیدا ہوئے تھے، تو یہ چند مثالیں جن سے بعض قبیلوں کا اپنی ماؤں کی طرف منسوب ہونا، بھائی بہن کے نکاح کا جائز ہونا، اور بھانجوں میں وراثت کا منحصر ہونا ظاہر ہوتا ہے، کچھ زیادہ باوقعت نہ تھیں۔

**"نظام اسومتہ" پر چند دلیلیں**۔ "نظام اسومتہ" کی دلیلیں ہم اوپر بھی بیان کر آئے ہیں، اور مندرجۂ ذیل براہین سے بھی اسکے وجود پر استدلال کرتے ہیں۔

**"نکاح خارجی" سے "اسومتہ" پر استدلال**۔ یہ بات پایۂ تحقیق کو پہنچ گئی ہے کہ عرب قدیم زمانہ میں "نکاح خارجی" (EXOGAMY) کیا کرتے تھے۔ لیکن اُن کی یہ عادت بہت جلد "نکاح داخلی" (ENDOGAMY) سے بدل گئی۔ یعنی ہر قبیلہ کے مرد دوسرے قبیلوں کو چھوڑ کر اپنے ہی قبیلہ میں نکاح کرنے لگے۔ لیکن اس رواج نے کوئی مستحکم صورت اختیار نہیں کی تھی۔ کیونکہ اس رسم کی موجودگی میں بھی غیر قبیلوں میں نکاح ہوتا تھا لیکن صورت یہ تھی کہ عورتیں اکثر و بیشتر غیر قبیلوں میں نکاح کرتی تھیں۔ اور مرد نہیں کرتے تھے۔ بعض قبیلوں میں یہی قاعدہ عام ہوگیا تھا چنانچہ ابن بطوطہ کے بیان سے اس کی تصدیق ہوتی ہے، وہ یمن کے ایک شہر زبید کی عورتوں کی نسبت لکھتا ہے کہ:۔

"اُن کے ہاں مسافر کی بہت قدر ہے۔ وہاں کی عورتیں ہمارے ملک کی عورتوں کی طرح پردیسی سے نکاح "کرنے میں کچھ تامل نہیں کرتیں۔ نکاح کے بعد جب یہ پردیسی سفر کا ارادہ کرتا ہے، تو اس کی منکوحہ اُس کی "ساتھ جاکر تھوڑی دور تک اُسکو رخصت کر آتی ہے۔ اگر اُس سے کوئی اولاد ہوئی تو اُس کی ذمہ داری "کرتی ہے، اور اُس کے باپ کی واپسی تک اُس کی تمام ضروریات کو پورا کرتی ہے۔ مرد کی عدم موجودگی

اُسکے زمانہ کا نان نفقہ اور لباس وغیرہ کچھ طلب نہیں کرتی۔ اگر یہ پردیسی عورت ہی کے شہر میں رہ پڑے، تو وہ
" تھوڑے سے خرچ اور لباس پر قناعت کر لیتی ہیں، لیکن ہرگز اپنے شہر سے باہر نہیں جاتیں۔ اُن کے
" شہر سے باہر لے جانے کے لئے اُن کو خواہ کتنا ہی روپیہ دیا جائے، لیکن وہ کبھی اس پر راضی نہیں ہوتیں"[1]

اُنیسویں صدی کے مشہور سیاح مشرق برٹن (BURTON) کے بیان سے معلوم ہوتا ہے، کہ جنوبی عرب کے بدوؤں میں اس وقت تک یہ رسم رائج ہے۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ:—
" عرب کے وحشی بدّو اپنی لڑکیوں کو اجنبیوں سے نکاح کرنے سے بالکل نہیں روکتے، لیکن وہ اپنے داماد
" کو اپنے ہاں رہنے پر مجبور کرتے ہیں"[2]

اِس بات کو ہم سب جانتے ہیں کہ شادی کے بعد عورت کا اپنے قبیلہ اور رشتہ داروں میں رہنا "اُموسة" کے متعلقات وصفات میں شامل ہے۔ اور نیز اس صورت میں اولاد بھی اپنی ماں کے ساتھ رہتی ہے، جیسا کہ ابن بطوطہ کے مذکورۂ بالا بیان سے معلوم ہوتا ہے، کہ "ماں بچہ کی ضروریات کی کفیل اور ذمہ دار ہوتی ہے"

عورت کا اجنبی مرد سے نکاح کرنا، ہم کو اس نتیجہ تک پہنچاتا ہے، کہ عرب کے بعض قبائل میں "نظام اُموسة" یا اُس کا کچھ حصہ اب تک قائم ہے، اور بہت سی پرانی رسموں سے اُس کے آثار ظاہر ہوتے ہیں، اور نئی رسمیں اُن کو اپنے دامنِ رواج میں چھپاتی جاتی ہیں۔

**توریث اخلاق سے "اُموسة" پر استدلال**۔ چنانچہ اہل عرب کا یہ عقیدہ رکھنا بھی اس رسم کے اثرات میں سے ہے، کہ مرد کے طبعی اوصاف اُسکے بھانجہ میں منتقل ہوتے ہیں۔ وہ خیال کرتے ہیں، کہ بچہ اپنے ماموں کی اخلاق وعادات پر جوان ہوتا ہے، نہ کہ باپ کے اخلاق وعادات پر۔ ایک جرمنی سیاح ویٹازین (WETZSIEIN.) نے بہت سے شواہد کی بنا پر اپنی یہ رائے ظاہر کی ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ:—
" مجکو دمشق میں رہتے ہوئے کچھ بہت زیادہ دن نہیں ہوئے تھے، کہ میں عربوں میں ماموں بھانجہ

---

[1] سفرنامۂ ابن بطوطہ مطبوعۂ یورپ۔ جلد ۲ صفحہ ۱۶۸۔ یا اُردو ترجمۂ سفرنامۂ مذکور مطبوعۂ امرتسر۔ جلد اوّل صفحہ ۲۶۱
[2] برٹن کا سفرنامہ موسوم بہ "زیارتِ مکہ ومدینہ"۔ جلد دوم صفحہ ۸۴۔

"کے تعلقات کی اہمیت کو معلوم کرنے لگا جس چیز نے سب سے پہلے میری توجہ کو اس طرف مبذول
" کیا، وہ یہ تھی کہ میں ہر روز سڑکوں اور گلی کوچوں میں یہ و نوم کے یہ جملے سُنا کرتا تھا کہ:۔۔
" خدا تیرے ماموں پر رحم کرے، یا خدا اُس پر لعنت بھیجے۔ یا اور اسی قسم کے جملے، جن سے
" یہی مفہوم مترشح ہوتا ہو۔ جب کوئی شخص کسی دوسرے کی کوئی بُری بھلی بات بیان کرتا، تو میں
" دیکھتا کہ بعض تو لعن اللہ خالہ' یا 'رحمہ' کہتے ہیں۔ اور دوسرے حاضرین نہایت متانت
" سے 'آمین' کہہ کر اُس کی تصدیق کرتے ہیں۔ اگر کوئی اجنبی شخص اِن جملوں کو خلاف موقع محل سمجھ کر
" اُن سے یہ دریافت کرے کہ بھلا یہ بات کس طرح صحیح ہو سکتی ہے کہ تم بھانجے کی باتوں کو اُس ماموں
" کی طرف منسوب کرتے ہو جو شاید اب سے بیس برس پہلے اس دُنیا سے چل بسا ہے'؟ تو وہ یہ جواب
" دیتے ہیں کہ بھانجے کو وراثتہً اپنے ماموں کی طبیعت سے حصہ ملتا ہے[1]"

اسکے بعد مصنف مذکور نے اس عجیب و غریب اعتقاد کی تائید میں اور چند امثال و شواہد بھی بیان کئے ہیں، جنکو اُس نے دمشق میں جمع کیا تھا۔

**توریث اخلاق مادری کی تھیوری پر ضرب الامثال اور اشعارِ عرب سے استدلال**

شلاً: اگر کوئی بچہ بداخلاق ہو تو عرب اِس بارہ میں یہ اعتقاد رکھتے ہیں، کہ دو ثلث بداخلاقی وراثتہً اُس کے ماموں کی طرف سے اُس میں منتقل ہوئی ہے، اور ایک ثلث خود اُس کی ذاتی ہے[2]۔

---

[1] "سیکرز ن علم الاقوام" (جرمنی)۔ جلد ۱۲ صفحہ ۴۶۴۔

[2] عرب جاہلیت اس موقع پر یہ جملہ بولتے ہیں:

" نزعہ عرق لخال"۔ یعنی فلاں شخص اپنے ماموں پر گیا"۔ "تاریخ طبری" جزو اول صفحہ ۹۹۔ مطبوعہ یورپ۔ ("اصل تاریخ طبری" کے مذکورہ بالا صفحہ پر ہم کو یہ عبارت نہیں ملی شاید صفحہ کا نمبر غلط لکھا گیا ہے) اختر۔

فلسطین اور سوریا میں بھی اس قسم کی ضرب الامثال بولی جاتی ہیں۔ شلاً: "ثلثین الولد لخالہ"۔ یعنی بچہ میں دو ثلث اُس کے ماموں کا حصہ ہے"۔ اور "خیر الرجال من تخول"۔ یعنی اچھا آدمی وہ ہے جو اپنے ماموں پر جائے"۔

اس میں کچھ شک نہیں، کہ عرب کی اکثر ضرب الامثال جو اس وقت تک مستعمل ہیں، اسی بنیاد (اعتقاد) پر مبنی ہیں۔

مثلاً: "قیل للبغل من ابوك؟ قال الفرس خالی"۔ یعنی "خچر سے دریافت کیا گیا کہ تیرا باپ کون ہے؟ تو اس نے جواب دیا کہ گھوڑا میرا ماموں ہے"۔

اور مثلاً: "سألته عن ابیه فقال خالی شعیب"۔ یعنی "جب میں نے اس کا باپ دریافت کیا تو اس نے جواب دیا کہ شعیب میرا ماموں ہے"۔

اور سب سے زیادہ اہم ضرب المثل یہ ہے: "الاصیل یخول"۔ یعنی اصیل اپنے ماموں پر جاتا ہے۔

ان ضرب الامثال کے حقیقی معنی معلوم کرنے کے بعد رسولِ عرب کے اس قول کے معنی سمجھنے نہایت آسان ہو جاتے ہیں، جو انھوں نے سعد ابن ابی وقاص کی شان میں ان کی خدمات کا شکریہ کرتے ہوئے، ان کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر کہا تھا، کہ "ھذا خالی"۔ یعنی یہ (سعد) میرا ماموں ہے"۔

ان کے علاوہ اور بہت سے ایسے شواہد پیش کئے جا سکتے ہیں، جن میں عربوں کے خیال میں "ماموں بھانجے" کے تعلقات اور روابط خلقی کی اہمیت ثابت ہوتی ہے، اور نیز اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ وہ اپنے ماموؤں کی شرافت پر کس قدر فخر، اور ان کی رذالت پر کس قدر عار کرتے ہیں۔

اس اعتقاد کا پتہ عمرو بن الاہتم کے ان الفاظ سے چلتا ہے جو اس نے ایک مشہور شیخ عرب زبرقان کی مذمت میں رسولِ عرب کے سامنے بیان کئے تھے۔

اس نے ان الفاظ میں زبرقان کی مذمت کی:—

"زامن المروۃ، ضیق العطن، احمق الولد، لئیم الخال"۔ یعنی "زبرقان ضعیف المروۃ، کوتہ دست، بیوقوف کی اولاد اور لئیم ماموں کا بھانجا ہے"۔[1]

ابو جعفر طبری، ہشام بن عمرو ایک سردار بنی تغلب کے حوالہ سے بیان کرتا ہے کہ:—

"وہ (ہشام) ایک روز خلیفہ منصور کے پاس گیا، اور اپنی بہن کو خلیفہ کی زوجیت میں دینے کی

---

[1] عقد الفرید۔ جلد اوّل۔ صفحہ ۱۴۴۔ مطبوعہ مصر۔

"خواہش ظاہر کی۔ اس پر منصور نے اپنی گردن نیچی کر لی، اور بید سے زمین کریدنے لگا، اور ہشام سے کہا
" کہ اس وقت جاؤ، تم کو سیر احکم بعد میں پہنچ جائے گا" جب ہشام چلا گیا، تو منصور نے (اپنے خادم)
" ربیع سے (مخاطب ہو کر) کہا کہ اے ربیع! اگر جریر نے بنی تغلب کی شان میں یہ شعر نہ کہا ہوتا،
" تو میں ہشام کی بہن سے شادی کر لیتا۔
" جریر کا شعر یہ ہے:
" لا تطلبن خؤولۃ فی تغلب ؛ فالزنج منھم اکرم اخوالا۔"
" یعنی خؤولت (کی خوبیاں) بنو تغلب میں تلاش نہ کرو، کیونکہ تعلقِ خؤولت کے لحاظ سے تو زنگی بھی اُن
" سے زیادہ معزز ہیں۔ منصور نے یہ شعر پڑھ کر کہا۔ میں ڈرتا ہوں کہ اگر کہیں ہشام کی بہن سے میری
کوئی اولاد ہو گئی، تو اس شعر سے اس پر عیب لگایا جائے گا۔"[1]

ہمارے خیال میں اس پر کوئی شخص تعجب نہیں کر سکتا، کہ شعراء عرب باعتبار نسب کے ایک دوسرے کی ہجو کیا کرتے تھے، جیسا کہ واقعۂ مذکورۂ بالا سے ثابت ہوتا ہے، کیونکہ عرب کے لٹریچر اور تاریخ میں ایک صرف یہی اکیلا واقعہ نہیں ہے۔

جن شعراء نے اس صنفِ کلام میں شہرت پائی ہے، اُن میں سب سے زیادہ مشہور فرزدق گذرا ہے۔ اُس کے وہ اشعار جن میں اُس نے جریر کی ہجو کی ہے، اپنی شہرت کی وجہ سے کسی یاددہانی کے محتاج نہیں ہیں۔ اُن اشعار میں سب سے زیادہ مہتم بالشان یہ شعر ہے:

" شبھت امک یا جریر فانھا ؛ نزعتک والام اللئیمۃ تنزع
" یعنی "اے جریر تو اپنی ماں سے بہت زیادہ مشابہ ہے حقیقۃً اُس نے تجکو اپنی طرف کھینچ
" لیا ہے، اور بات یہ ہے کہ لئیم ماں اپنے رنگ پر لے ہی آتی ہے۔"

**استدلال مذکورۂ بالا کا نتیجہ۔** امثال مذکورۂ بالا اور اس قسم کی بہت سی مثالوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عرب اپنے اعتقاد میں اس خیال پر جمے ہوئے تھے، کہ "ماموں بھانجے" میں ایک اندرونی تعلق

[1] "تاریخ طبری" سلسلۂ سوم۔ جلد اوّل۔ صفحہ ۳۶۲۔ مطبوعہ۔ لیڈن۔

ہوتا ہے۔ اور ہمارے نزدیک بلا شبہہ یہ اعتقاد اُس قدیم زمانہ کا بقیہ ہے جبکہ اولاد نسب میں اپنی ماں کے تابع ہوتی تھی، اور باپ کو کوئی قابلِ ذکر اہمیت حاصل نہیں تھی، بلکہ "باپ اور بچوں" میں کوئی ایسا تعلق ہی نہیں تھا جو اُن کو باہم ملا سکتا۔ بخلاف اس کے ماں کے بعد ماموں سے قرابت قریبہ ہوتی تھی۔ ایسی حالت میں عربوں میں اس اعتقاد کے پھیل جانے پر کوئی تعجب نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ یہ تمام باتیں "نظام اموستہ" کے نتائج و متعلقات میں داخل ہیں، جسکو ہم اس وقت تک زمانۂ جاہلیت میں ثابت کرتے چلے آئے ہیں۔

**غلاموں کی حالت و حقوق سے وجود "اموستہ" پر استدلال۔** عرب جاہلیت میں "نظام اموستہ" کے وجود پر ہم اس وقت تک کافی دلائل بیان کر چکے ہیں، لیکن ابھی ہمارے پاس کچھ اور شواہد بھی موجود ہیں، جن میں سے قدیم عربوں میں غلاموں کی حالت اور حقوق قابلِ ذکر ہے۔

یہ بات ظاہر ہے کہ "نظامِ اموستہ" میں اولاد کی حالت اپنی ماں کے تابع ہوتی ہے، جس کو فقہا ان الفاظ میں تعبیر کرتے ہیں کہ "الولد یتبع الرحم" یعنی "بچہ رحم کے تابع ہوتا ہے۔" اس دعوے پر بہت سی شافی دلائل موجود ہیں۔

**حریت اور رقیت پر "اموستہ" کا اثر۔** مشہور قدیم یونانی مورخ ہیرودوٹس (۴۸۴-۴۲۵ ق م) قبیلہ لوسی کی نسبت بیان کرتا ہے کہ

"اُن میں ایک ایسی عجیب رسم ہے، جس کی وجہ سے وہ دُنیا کی اور قوموں سے بالکل الگ تھلگ
" نظر آتے ہیں، یعنی وہ بجائے باپ کے اپنی ماں کے نام سے ملقب کئے جاتے ہیں۔ اُن میں سے اگر کسی
" شخص سے اُسکا نام دریافت کیا جائے، تو وہ پہلے اپنا نام لیتا ہے، اور پھر اپنی ماں اور دادی کا
" علیٰ ہٰذا آخر تک بلا کسی غلطی کے سلسلۂ نسب مادری بیان کرتا چلا جاتا ہے۔ اس سے بھی زیادہ عجیب
" و غریب رسم یہ ہے، کہ اگر اس قبیلہ کی عورت غلام سے شادی کرتی ہے تو اُس کی اولاد آزاد سمجھی
" جاتی ہے، بخلاف اسکے اگر شوہر آزاد اور بیوی باندی ہو تو ایسی عورت کی اولاد غلام شمار کی
" جاتی ہے۔ اگرچہ ان بچوں کا باپ تمام مُلک میں اعلیٰ درجہ کا شخص ہی کیوں نہو۔"

دوسرے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ اولاد کی حالت ماں کی حالت کے تابع سمجھی جاتی تھی

جس سے بعض لوگوں کے خیالات کے خلاف یہ نتیجہ مستنبط ہوتا ہے کہ عورت ہی معززا ور اعلیٰ طبقہ کو عالمِ وجود میں لانے والی خیال کی جاتی تھی، نہ کہ مرد۔ دُنیا کی جن وحشی قوموں میں "نظامِ اموتہ" رائج ہے اُن میں یہ اُصول بھی اس وقت تک برابر قائم ہے، کہ غلام شوہر اور آزاد بیوی کی اولاد، آزاد سمجھی جاتی ہے، اور آزاد مرد اور باندی کی اولاد، غلام[۵۱]"

مغربی افریقہ کے اُن باشندوں کی نسبت بھی ایسا ہی بیان کیا جاتا ہے، جن میں اس وقت تک "نظامِ اموتہ" موجود ہے۔

مغربی افریقہ کے باشندوں کی اس رسم کو سب سے پہلے ایک مشہور سیاح (سنہ ۱۷۰۳ء) ۔ بوس مین (BOSMAN.) نے اپنے سفرنامہ "خلیج گفینیا اور غلاموں کے شہر کے حالات" میں پبلک کے سامنے پیش کیا ہے، وہ لکھتا ہے کہ:—

" ان وحشیوں میں سے ہر ایک شخص اپنی رائے پر شادی کرتا ہے۔ شادی کے بارہ میں ہر شخص
" مساوی ہے، لیکن بادشاہ کی بیٹی بمقابلہ آزاد مرد کے غلام کو اپنی زوجیت کے لئے ترجیح دیتی ہے،
" اور بادشاہ کے بیٹے اس کے برعکس کرتے ہیں، اس لئے کہ اس مُلک کے باشندوں کا رسم اور قانون
" یہ ہے کہ اولاد اپنی ماؤں کے تابع ہوتی ہے۔ لہٰذا اُن کی اولاد صورتِ اول میں آزاد ہوتی ہے،
" اور صورتِ ثانی میں غلام۔ بخلاف "نظامِ ابوۃ" کے جس میں اولاد اپنے باپ کی تابع ہوتی ہے[۵۲]"

یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ عادت کا اثر اس قدر قوی ہوتا ہے، کہ گو بہت سی قومیں نہایت قدیم زمانہ سے "نظامِ ابوۃ" اختیار کرچکی ہیں، لیکن تاہم اس وقت تک اُصولِ مذکورہ بالا (اولاد کا ماں کے تابع ہونا) پر کاربند چلی آتی ہیں۔ غلامی کے عام رواج نے اس نتیجہ کے پیدا کرنے میں بہت بڑا حصہ لیا۔

جرمنی کے قانون ازمنہ متوسطہ میں اس کے بہت سے آثار پائے جاتے ہیں۔ چنانچہ جرمنی کے مشہور مقنّن گریم (                ) کے مجموعۂ قوانین "قدیم جرمنیوں کا فقہ" میں جہاں اُس نے فرڈرک اوّل

---

۵۱۔ ڈوسے رر کی کتاب "شمالی افریقہ کے قبائل ٹوریگ" (فرنچ)۔ صفحہ ۲۳۲۔

۵۲۔ سفرنامۂ بوس مین (BOSMAN.) جلد اوّل۔ صفحہ ۱۸۴۔

(سنہ ۱۱۹۰-۱۲۱۲ء) شہنشاہ جرمنی کے قانون کا بیان لکھا ہے، ہم یہ دیکھتے ہیں کہ:—

"اگر کوئی آزاد مرد باندی سے، یا غلام آزاد عورت سے شادی کرے، تو اولاد ان دونوں صورتوں میں
"ماں کے تابع ہوگی"

"یہی مصنف اس کے بعد لکھتا ہے کہ:—
"ڈنمارک میں بھی اِن ہی احکام کی پابندی کی جاتی ہے۔ چنانچہ اولاد اُسی وقت آزاد شمار کی جاتی ہے
"جبکہ اُن کی ماں حرّہ ہو، ورنہ نہیں" ؎۱

مجمع الجزائر ہندا ورخصوصاً سوماترا کے قبائل بٹاس (BATTAS) جن میں "نظام اموسۃ" کا اُصول جاری ہے، اور جو اس وقت تک قاعدۂ مذکورۂ بالا پر کاربند چلے آرہے ہیں، وہ بھی آزاد عورت اور غلام کی اولاد کو آزاد، اور باندی اور آزاد مرد کی اولاد کو غلام شمار کرتے ہیں، یہاں تک کہ غیر آزاد ماں باپ جو مختلف آقاؤں کے مملوک ہوں، اُن کی اولاد کو بھی ماں ہی کے آقا کی ملک قرار دیتے ہیں۔ اِس رسم کی بنیاد بھی اُصولِ مذکورۂ بالا پر مبنی ہے۔

قبائل بٹاس میں سب سے زیادہ عجیب وغریب رسم یہ دیکھی جاتی ہے، کہ اگر بچوں کی ماں باندی ہو تو کوئی آزاد باپ اپنی اولاد کو حُر شمار نہیں کرسکتا، اگرچہ ان کے والدین کا نکاح شرعی ہی کیوں نہ ہوا ہو۔ بخلاف اس کے ایک آزاد ماں، اگرچہ اُس کا شوہر غلام ہی کیوں نہ ہو، اپنی اولاد کو درجۂ احرار میں شمار کرسکتی ہے۔

اب اس بات پر غور کرنا چاہئے، کہ باندی اور غلام کے اِس اختلاف وتفاوتِ حقوق کی بنیاد کس چیز پر ہے؟ اور اس کو کس اصول کا نتیجہ سمجھنا چاہیئے؟ بلاکسی شک وشبہ کے ہماری رائے میں بجز اس کے اور کوئی وجہ نہیں بیان کی جاسکتی، کہ یہ بھی "نظامِ اموسۃ" کے آثار کا ایک بقیہ ہے۔ "اُموسۃ" اور فقہ اسلامی۔ قبائل بٹاس وغیرہ میں جو کچھ غلامی کے نتائج بیان کئے گئے ہیں، وہ ہو بہو عربوں میں بھی دیکھے جاتے ہیں۔

؎۱۔ گریم کی کتاب "قدیم جرمنیوں کا فقہ" صفحہ ۳۲۵۔

اسلام کے اس اصول سے کون ناواقف ہے کہ "بچہ اپنی ماں کے تابع ہوتا ہے" جس پر یہ نتیجہ مترتب ہوا ہے کہ حرّہ کی اولاد حُر ہے۔ اور باندی کی اولاد اُس کے آقا کی مملوک ہے۔

اہل عرب اور قبائلِ ثلاث اس مسئلہ میں بھی متفق ہیں کہ جب ماں باپ مختلف آقاؤں کے مملوک ہوں، تو اولاد آقا رِ مادر کی مملوک سمجھی جائے۔

ایک مشہور فقیہہ ابن قاسم کی عبارت سے بھی یہی مترشح ہوتا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ:۔

"اگر کوئی شخص کسی غیر کی باندی سے جائز یا ناجائز طور سے جماع کرے، اور وہ حاملہ ہو جائے، تو
" یہ بچہ عورت کے آقا کی ملکیت ہوگا" [1]

اس عبارت میں لفظ "کوئی شخص" سے آزاد مرد مراد نہیں ہے، بلکہ غلام مراد ہے، اس لئے کہ اگر ان کی مراد آزاد مرد سے ہوتی، تو وہ اس طرح اس کی صراحت کر دیتا، جس سے کسی شک و شبہہ کی گنجائش باقی نہ رہتی۔ البتہ شارح کے بیان سے مجملاً یہ مترشح ہوتا ہے کہ کم سے کم عبارت کا مفہوم بلا کسی تخصیص کے قائم رکھا جائے، لیکن خود شارح آگے چل کر لکھتا ہے کہ:۔

"بچہ آقا رِ مادر کی مِلک ہے، اس لئے کہ اولاد کی رقیت اور حرّیت ماں کی رقیت اور حرّیت
" کے تابع ہوتی ہے"

ابن قاسم کی عبارت کی تشریح و توضیح خواہ کسی طرح کی جائے، مگر پھر پھر کر ہم اس اصل الاصول قاعدہ تک پہنچ جاتے ہیں، کہ "اولاد رحم کی تابع ہوتی ہے"۔ لیکن یہ اصول اُس صورت میں ملحوظ نہیں رکھا جاتا تھا جب کہ اَمَتہ کا شوہر غلام یا آزاد مرد ہو۔ بہرحال یہ قاعدہ بھی "نظامِ اموتہ" کا ایک بقیہ ہے، جو زمانہ جاہلیت سے اسلام میں منتقل ہوا ہے۔

**اُموتہ اور نسب** ہمارے اُن دلائل پر کسی قسم کا اعتراض وارد نہیں ہو سکتا جو ہم نے ماؤں کی اُس عظمت و منزلت، اُن کیطرف انتساب نسب کی اہمیت، اور خود دولت کی وقعت پر پیش کی ہیں، کہ جس پر

[1] - ابن قاسم کی "شرح بیجوری" جلد اوّل صفحہ ۶۴۳ - ۶۴۴ -

نظامِ اموتہ" کے زمانہ میں عربوں کا نظام خاندانی مبنی تھا۔

فرے تگ[1] (FREYTAGE.) اور برک ہارٹ (BURCKHARDT) نے جو عربی ضرب الامثال جمع کی ہیں، اُن کے مطالعہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ عرب جب کسی شخص کی حالت سے واقفیت حاصل کرنا چاہتے تھے، تو اسکے باپ کا نام دریافت کرنے کے بجائے اُس کے ماموں کا نام دریافت کرتے تھے۔ اور اس کے ساتھ ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ مرد نہیں بلکہ عورت ہی طبقہ اعلیٰ واشرف کی اصل ومنشا خیال کی جاتی تھی۔ اس کے آثار خلفاء کے زمانے تک پائے جاتے ہیں کہ عرب شرافتِ خاندانی کی حفاظت کے لئے عورت کے نسب کو مرد کے نسب پر زیادہ ترجیح دیتے تھے، مگر یہ اعتقاد کچھ زیادہ زمانہ تک قائم نہ رہا اور نئے خیالات نے پرانے اصول کو کلیۃً بدل دیا۔، اور عرب شرافتِ نسب کی حفاظت میں تساہل سے کام لینے لگے۔

چنانچہ مشہور مستشرق وان کریمر (VON KREMER.) اپنی کتاب "تاریخ العمران فی الشرق" میں لکھتا ہے کہ:-

" عربوں کے دل ودماغ سے شرافتِ نسب کے قدیم خیالات ومعیار کی اہمیت بالکل مفقود ہوگئی
" ہے، اور اُن کے خیالات اُس وقت سے بالکل بدل گئے ہیں جب سے کہ وہ ماں اور باپ دونوں
" کو شرافتِ نسب میں یکساں اہمیت دینے لگے، چنانچہ اس تغیر تدریجی کا یہ نتیجہ نکلا کہ متقدمین
" خلفاء اسلام کے زمانہ ہی میں ایک پرستار زادہ کا تختِ سلطنت پر بیٹھنا ناممکن ہوگیا، اگرچہ
" اُس کا باپ خلیفہ ہی کیوں نہ ہو۔ بنی اُمیّہ کے ایک خلیفہ نے اس کے خلاف کرنے کی کوشش کی
" تھی، مگر وہ کامیاب نہیں ہوا، اس لئے کہ جب عرب لونڈی کی اولاد کو نظرِ حقارت سے دیکھنے لگے،
" تو ماں کے نسب کی بھی بڑے شدومد سے رعایت کرنے لگے"[2]

"اموتہ" اور نکاح خارجی"۔ اس بحث کے متعلقہ مسائل میں سب سے زیادہ ضروری حل طلب یہ مسئلہ ہے، کہ

---

[1] "مقدمہ تعلیم زبان عربی" یعنی مجموعہ ضرب الامثال عربی مع ترجمہ جرمنی مصنفہ فرے تگ۔ صفحہ ۴۶۔

[2] وان کریمر کی کتاب "تاریخ العمران فی الشرق" جلد ۲ صفحہ ۱۶۔

عربوں میں "نکاح خارجی" (Exogamy) بھی رائج تھا یا نہیں؟

ہم پہلے بیان کر آئے ہیں کہ دورِ اُموتہ میں "نکاح خارجی" کے بجائے "نکاح داخلی" (Endogamy) جائز ہوتا ہے۔ کثرت سے اس کی مثالیں موجود ہیں، جن میں سے چند اس جگہ بیان کی جاتی ہیں۔

اس بحث کو شروع کرنے سے پہلے ناظرین کو یہ بتا دینا نہایت ضرور ہے کہ مشہور مستشرق ۔ رابرٹسن سمتھ کے اعتقاد کے مطابق عرب اپنی ابتدائی حالت میں "نکاح خارجی" کے عادی تھے۔

"نکاح خارجی" کی بنیاد "دختر کشی" پر پڑی۔ اس دعوے پر اس کے دلائل وہی ہیں جو ایک انگریز مصنف لینان نے "نکاح خارجی" کی اصلیت اور اس کے اسباب ظہور پر بیان کئے ہیں۔ اس کی رائے میں "نکاح خارجی" کی بنیاد عربوں کی "دختر کشی" سے پڑی، اور جب اس مذموم رسم کے ہاتھوں لڑکیوں کی تعداد کم ہو گئی تو مرد خواہ مخواہ غیر قبیلوں سے لڑکیاں لانے پر مجبور ہوئے۔

ہم تسلیم کرتے ہیں کہ عربوں میں یہ رسم شنیع جاری تھی کہ وہ لڑکیوں کے پیدا ہونے کے بعد حتی الامکان اُن کو بہت جلد مار ڈالتے تھے۔[۱]

---

[۱] علامہ زمخشری "اذا الموءودۃ سئلت۔ بای ذنب قتلت" (التکویر ۸۱۔ آیت ۸ و ۹) کی تفسیر میں لکھتا ہے کہ:—

"جب حاملہ عورت کے دن پورے ہو جاتے، تو وہ ایک گڑھا کھود کر اُس کے دہانہ کے پاس دردِ زہ کا زمانہ گذارتی۔ اگر لڑکی پیدا ہوتی تو اُس کو گڑھے میں پھینک دیتی، اور اگر لڑکا پیدا ہوتا تو اُسکو گود میں اٹھا لیتی۔"

اسی مصنف نے اس سے پہلے اسی سورت کی تفسیر میں بیان کیا ہے، کہ جب لڑکیاں چھ برس کی ہو جاتیں تو وہ (عرب) اُن کو زندہ دفن کر دیتے تھے۔ اُس کے الفاظ یہ ہیں کہ:—

"اگر کسی شخص کے لڑکی پیدا ہوتی، اور وہ اُسکو زندہ رکھنا چاہتا تو وہ اُس کو سُوت یا اُون کا ایک جبہ پہنا دیتا، اور وہ جنگل میں اُس کی بھیڑ بکریاں اور اُونٹ چرایا کرتی۔ اور اگر اُس کے مار ڈالنے کا قصد ہوتا، تو وہ اُسکو ویسے ہی چھوڑ دیتا۔ جب چھ برس کی ہو جاتی تو باپ لڑکی کی ماں سے یہ کہتا کہ اُس کو بنا سنوار کر اُس کے خوشبو لگا۔ میں اُس کو اُس کے چچاؤں کے پاس لیجانا چاہتا ہوں۔ اور دراصل جنگل میں اُس کے لئے

**دختر کُشی پر امثال عرب۔** اور اُن کی ضرب الامثال سے بھی اِس رسمِ بد کی تعریف ظاہر ہوتی ہے۔ چنانچہ ایک ضرب المثل ہے: "نقدیم اخرام من النعم" یعنی حرم کو (دوسری دُنیا میں) "بھیج دینا ایک نعمت ہے۔"

ایک دوسری ضرب المثل ہے: "دفن البنات من المکرمات" یعنی "لڑکیوں کا (زندہ) دفن کر دینا نہایت معزز کاموں میں داخل ہے۔"

**اسبابِ دختر کُشی۔** عربوں کا اپنی لڑکیوں کا زندہ درگور کرنا یا تو اس لالچ سے ہوتا تھا کہ اُن کے بارِ پرورش سے خلاصی ملے، اور یا اِس خوف سے کہ بیٹی ذات کے وجود سے شرم و ندامت نہ اُٹھانا پڑے۔[1]

ایک کنواں کھودتا، اور وہاں لے جا کر اُس سے کہتا کہ کنوئیں میں دیکھ۔ (جب وہ کنوئیں میں جھانکتی تو) خود پیچھے سے دھکا دے کر اوپر سے مٹی ڈالنا شروع کرتا، اور کوئیں کو زمین کے برابر کر دیتا۔" تفسیر کشاف۔ جلد دوم صفحہ ۵۲۶

[1] علامہ زمخشری اور بیضاوی سورہ انعام کی آیت (۱۵۲) کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ:—

"عرب اپنی لڑکیوں کو افلاس کے خوف سے مار ڈالتے تھے۔"

سورہ تکویر کی آیت (۸ اور ۹) کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ:—

"عرب اپنی بیٹیوں کو بخوفِ مفلسی یا ایک قابلِ شرم چیز سمجھ کر زندہ درگور کر دیتے تھے۔"

"زبرقان کی نسبت بیان کیا گیا ہے کہ اُس نے اپنی سات بیٹیوں کو زندہ دفن کیا تھا۔ جب اُس سے اس کی وجہ دریافت کی گئی، تو اُس نے یہ جواب دیا کہ مجھے اِس بات کا خوف تھا کہ کہیں وہ کسی قبیلہ کے مردوں کے ہتے نہ چڑھ جائیں۔"

قبیلہ بنو تمیم سے جب اُس کی دختر کُشی کی وجہ دریافت کی گئی تو اُس نے بھی قریب قریب یہی بیان کیا تھا۔ چنانچہ بیان کیا جاتا ہے کہ جب قبیلہ بنو تمیم نے نعمان بن منذر کو خراج دینے سے انکار کیا تو وہ اس قبیلہ کی عورتوں اور بچوں کو گرفتار کر کے لے گیا۔ جب بنو تمیم نے اپنے قیدیوں کو واپس مانگا تو قیدیوں کی رائے دریافت کی گئی کہ آیا وہ اپنے قبیلہ میں واپس جانا چاہتے ہیں یا نہیں؟ ان اسیرانِ جنگ میں قیس بن عاصم کی ایک بیٹی بھی تھی، اُس نے اُس شخص کے پاس رہنے کو ترجیح دی جو اُس کو قید کر کے لایا تھا۔ قیس نے اپنی بیٹی کی اِس حرکت پر یہ قسم کھائی کہ وہ اپنی سب بیٹیوں کو زندہ دفن کر دے گا۔ کہا جاتا ہے کہ اُس نے ایسا ہی کیا۔ اور اسی واقعہ سے قبیلہ بنو تمیم میں دختر کُشی کی بنیاد پڑ گئی۔

قرآن میں دخترکشی کی ممانعت۔ جب شارع اسلام نے اپنی تعلیم شروع کی، تو انھوں نے اس رسم کو بھی حرام قرار دیا۔ لہ

لہ۔ سورۂ بنی اسرائیل میں آیا ہے :۔

"ولا تقتلوا اولادکم خشیة املاق، نحن نرزقهم وایاکم، ان قتلهم کان خطأ کبیرا" (آیت ۳۳)

یعنی "افلاس کے ڈر سے اپنی اولاد کو قتل نہ کرو، اُن کو اور تم کو ہم ہی روزی دیتے ہیں، اولاد کا مار ڈالنا بڑا سخت گناہ ہے"

سورۂ انعام میں بھی اسی کے ہم معنی ایک آیت آئی ہے :۔

"ولا تقتلوا اولادکم من املاق، نحن نرزقکم وایاهم" (آیت ۱۵۲)

سورۂ تکویر میں آیا ہے :۔

"واذا الموؤدة سئلت۔ بای ذنب قتلت" (آیت ۸ و ۹)

یعنی "جس وقت اُس لڑکی سے جو زندہ درگور کر دی گئی تھی پوچھا جائے گا، کہ کس قصور کی سزا میں ماری گئی"

یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ عربوں نے اسلام سے پہلے ہی اس عادت کو چھوڑنا شروع کر دیا تھا۔ چنانچہ صعصعہ بن ناجیہ کی نسبت کہا گیا ہے کہ وہ دخترکشی کا بڑا سخت دشمن تھا۔ شہر بہ شہر "موؤدات" کو تلاش کرتا پھرا کرتا تھا، اور دو اونٹنیاں اور ایک اونٹ دے کر اُن کی جان بچاتا تھا۔ اس طرح پر اُس نے ۳ سو ۶۰ لڑکیوں کی جان بچائی۔ چنانچہ اسی ہمدردی کی وجہ سے اُس کو "محیی الموؤدات" کا لقب دیا گیا تھا۔

فرزدق نے اپنے اس شعر میں اُس پر فخر کیا ہے :۔

"ومنا الذی منع الوائدات ؎ فاحیا الوئید فلم توأد"

یعنی "ہم ہی میں سے وہ شخص تھا جس نے زندہ درگور کرنے والیوں کو روکا، اور جس کی کوشش سے زندہ درگور کی جانے والیوں کی جان بچ گئی"

(محمد اختر۔ حیدرآباد دکن)

# شاعری اور اُسکے اصناف

ہر ملک میں باشندوں نے اپنی ضرورتوں کے اظہار کے لئے آوازیں یا الفاظ مقرر کئے اور وہ اسقدر فراہم ہوئے کہ وہ اُس مُلک کی زبان ہو گئی اور جب یہانتک اُسنے ترقی کی کہ نہ اُسمیں صرف وہ الفاظ ہوئے کہ جنکے ذریعہ سے روزمرّہ کی حاجت و حالت کا اظہار کیا جائے بلکہ اسقدر الفاظ بڑھے کہ جن سے ہر قسم کے خیالات کا اظہار بخوبی ہو سکے تب زبان میں وسعت آئی اور خیالات میں باشندوں کے ترقیاں ہوئیں اسوقت ہر مُلک کے رہنے والوں کو اس بات کا خیال پیدا ہوا کہ مکالمہ کے لئے اسلوب قائم کئے جائیں درستیِ اسلوب کلام کے لئے علمِ منطق وجود میں آیا تاکہ مکالمہ میں خیالات بطریقِ شایستہ ظاہر ہوں۔ جب اس سے بھی زیادہ زبان نے ترقی کی تو کلام موزوں کہ انعکاس آئینۂ صفائی زبان کا ہے پیدا ہوا کلام موزوں کی غرض اوّلاً یہ تھی کہ ایسے خیالات کہ جن سے حمیّتِ قومی بڑھے اور قوم کے خیالات بلند و وسیع ہوں منظوم ہونے لگے۔ چنانچہ خواجہ نصیر الدین طوسی نے اساس الاقتباس کے مقالۂ نہم کی فصلِ اوّل میں یہ لکھا ہے کہ "صناعتِ شعری ملکۂ باشد کہ باحصولِ آن ایقاعِ تخیّلات کہ مبادیِ انفعالات مخصوص باشد بر وجہِ مطلوب برآن متکلّم قادر باشد" اِس سے یہ مترشح ہے کہ جب کسی قوم کے خیالات میں ترقی ہوئی تو اسوقت بغرضِ ایقاعِ تخیّلات کہ جو مبادیِ انفعالات ہیں بطور معقول بغرضِ حصولِ مطلب احاطۂ کتابت میں آئیں اور یہ تخیّلات رسوم۔ عادات۔ طرزِ معاشرت تغیّراتِ فصول اور معلوماتِ فلسفیانہ عالمانہ و صوفیانہ پر موقوف ہیں۔ اسلئے ایک مُلک کی شاعری کو دوسرے مُلک کی شاعری کے ساتھ خیالات میں اتحاد نہیں ہے۔ جب قوم کی معلومات بڑھی اور خیالات میں بھی وسعت آئی، تو شاعری میں بھی بلند پروازی آئی۔ ابتدائی خیالات جو تعلیم یافتہ قوموں کے نظم ہوئے وہ متعلق بہ رزم ہیں، یا بر جز مقصود اسکا یہ تھا کہ قوم میں جُرأت و ہمّت بڑھے۔ ہومر کی مثنوی جو یونان میں لکھی گئی اور ورجل کی کتاب جو روم میں تحریر ہوئی اور جو ملٹن نے انگریزی میں لکھی، اُن میں بڑے زوروں سے رزم لکھی گئی۔ قیس علےٰ ہذا فارسی میں شاہنامہ اور سنسکرت میں مہابھارت کا وجود ہوا۔ بعد اِس قرنِ ابتدائی

کے جب انجمنِ انسانی میں ترقیاں ہر قسم کی شروع ہوئیں تو مثنویاں ایسی جن میں بیان بزم اور مضامینِ عاشقانہ جسکی طرف فطرتِ انسانی کو توجہ ہے وجود میں آنے لگیں۔ جیسا کا لیداس کی مثنوی میگھ دوت سنسکرت میں اور فارسی میں مثنویاں نظامی خسرو اور جامی کی وجود میں آئیں۔ جب کسی قوم نے رزم و بزم کے نظم کرنے میں تحملہ پیدا کیا تب قوم نے اُن اُمورات کے نظم کرنے میں جو متعلق طبیعت اور مصنوعاتِ فطرت کے ہیں توجہ کی۔ یورپ کی شاعری میں بزم محدود ہے رزم یا خیالاتِ عاشقانہ یا اُن خیالات کا کلام موزوں میں اظہار ہے کہ جو روزمرہ کی عادات و کوائفِ انسانی سے متعلق ہیں اِس آخر قسم کی شاعری میں شکسپیر کو ید طولیٰ ہے۔ خارجی کوائف کے انسان کے خیالات پر کیا تغیرات ہوتے ہیں اور وہ اُنکا اظہار کس طرح پر کرتا ہے شکسپیر نے قلم بند کیا ہے۔ اس قسم کی شاعری کیطرف ایشیائی مُلکوں کے شعرا کی توجہ نہیں ہے۔ اور اسکی بڑی وجہ یہ ہے کہ اُردو، فارسی اور عربی کے کلام میں ڈراما نہیں ہے اور ڈراما کی تحریر کے لئے کلامِ موزوں کی ضرورت تو ہے مگر قوافی اُس کی وسعت کو تنگ کرتے ہیں۔ اسلئے یورپ میں کلامِ موزوں بلا قافیہ جسکو بلنیک ورس کہتے ہیں جاری ہوا۔ بلنیک ورس سنسکرت میں پائی جاتی ہے۔ چنانچہ اس زبان میں ڈراما بھی ہے۔

ایشیائی مُلکوں میں حکومتِ شخصی رہی اور اُسکا ایک خاص اثر فنِ شعر پر مترتب ہوا۔ یعنی ایسی نظمیں لکھی گئیں کہ جن سے مدح و ذم اکابر قوم کی ہو اور یہ باعثِ تمتعِ شعرا ہوا۔ چنانچہ اسی خیال سے قصیدہ گوئی وجود میں آئی۔ پہلا قصیدہ فارسی زبان میں مامون کی تعریف میں لکھا گیا اور زمانہ مامون وہ تھا کہ جبوقت زبان بادشاہ کی عربی تھی۔ اکثر عربی میں قصائد مدحیہ تعریف میں خلفاے اُمیہ و بنی عباس کے لکھے گئے تھے اور چونکہ ابتداے اسلام میں جرأت و ہمت بڑی چیزیں سمجھی جاتی تھیں اسلئے ایسے قصیدے بھی عربی میں لکھے گئے کہ جن سے سامعین کی ہمت بڑھے۔ جب دُوَلِ عرب کی قوت گھٹی اور ترکیوں میں سلطنت آئی اور ایران کے نامی شہر انکے پایۂ تخت ہوئے تو اُس زمانہ سے فارسی کی قصیدہ گوئی میں بہت ترقی ہوئی اور شعراے قصیدہ گو حکام رس رہے۔ محمود کے عہد سے سلطان ناصرالدین مرزا کے زمانہ تک قصیدہ گو شعرا کی برابر قدر افزائی رہی۔ الوری کے حال پر

لکھا ہے کہ ایک روز مدرسہ سے نکلکر شام کو حضرت سیر کیلیے چلے دیکھا کہ ابوالفرح رونی کی سواری بڑی شوکت وشان سے آتی ہے متعجب ہو کر پوچھا کہ یہ کس امیر کی سواری ہے معلوم ہوا کہ ابوالفرح رونی ملک الشعرای سلطان سنجر کی ہے۔ انوری نے بآواز بلند کہا کہ "رتبۂ شاعری بایں بلندی و من بایں پستی۔ فردا من ہم شاعر می شوم"۔ چنانچہ اُسنے سلطان سنجر کی مدح میں ایک قصیدہ لکھا کہ جسکا مطلع یہ ہے ؎

گر دل و دست بحر و کان باشد ؁ دل و دست خدایگان باشد

دیوان اُسکا اسی قصیدے سے شروع ہوا ہے۔ اس قصیدہ کو سلطان سنجر کے حضور میں گذرانا اور زمرۂ شعراے سنجری میں داخل ہوا۔ قصیدہ گو شعرا کی قدر شاہان ایران اور ترکی نژاد بادشاہوں میں پانچویں صدی سے شروع ہوئی اور آجتک باقی ہے۔ قدیم قصیدہ گو شعرا میں حکیم سنائی مختاری۔ خاقانی شروانی۔ کمال الدین اصفہانی۔ اثیر الدین اومانی۔ سیف الدین اسفرنگی۔ سلمان ساوجی ہیں۔ سلطان ناصر الدین مرزا کے زمانہ میں خاتم الشعراے قصیدہ گو حکیم قاآنی ہے۔ قصیدہ گوئی میں ایک خاص بات حکیم سنائی نے پیدا کی یعنی اس حکیم عصر کو چونکہ اُسنے کسی کی مدح مقصود نہ تھی اسلیے اسنے اپنے قصیدوں میں خیالات صوفیانہ و فلسفیانہ داخل کیے اور اس روش قصیدہ گوئی کو اس کمال تک پہونچایا کہ جسکا پھر تتبع کسی سے نہو سکا قصیدہ گوئی کی دو قسمیں ہیں ایک صوفیانہ و فلسفیانہ خیال کے ساتھ ہے اور دوسرا مدح یا ذم ہے جو استعارہ بندی کیساتھ لکھی گئی ہے۔ حکیم سنائی کو قسم اول میں ید طولے ہے اور خاقانی کو قسم دوم میں اور اسی لئے دونوں اپنی اپنی روش میں کامل سمجھے جاتے ہیں۔ قاآنی نے جسکو زبان پر حکومت تھی دونوں روشوں کو ملا دیا مگر نہ بلند خیالی حکیم سنائی کی آئی اور نہ استعارہ بندی خاقانی کی، مگر با اینہمہ اپنے قصیدوں میں اسقدر لطف زبان پیدا کیا کہ اُسکی اُستادی پر کوئی حرف نہیں لاسکتا ہے اور اسمیں کوئی شک نہیں کہ یہ بڑا کمال حکیم موصوف کا ہے۔

فارسی شاعری میں ایک خیال اور بڑھا ہے جو کسی زبان میں نہیں۔ یعنی خیالات صوفیانہ جسکو انگریزی میں مسٹک پوئٹری کہتے ہیں۔ یہ خیال سنسکرت شاعری میں بھی ہے اور میر غلام نبی بلگرامی کے دوہوں میں بھی موجود ہے۔ اس خیال کی ابتدا حکیم سنائی نے کی، تکملہ اسکا مولوی روم نے کیا اور خاتمہ اسکا محمود شبستری صاحب گلشن راز پر ہوا۔ حکیم سنائی، فرید الدین عطار اس خاص خیال کی شاعری میں بلند نام شعرا ہیں۔ خیالات صوفیانہ فارسی

کی غزلوں میں سعدی خسرو حافظ نے داخل کئے اور ان کے تتبع شعرائے ایران رہے۔ اور اس خاص قسم کی شاعری کا وجود یورپ میں مطلق نہیں ہے۔ زبان سنسکرت میں اسکا وجود پایا جاتا ہے کیونکہ اہل اسلام کا تصوف و اذکار فقراے ہند سے بہت ملتے ہوئے ہیں۔ شعراے ایران نے اخلاق کی درستی میں بہت کوشش کی اور یہ امر اصناف نظم فارسی میں پایا جاتا ہے مثنویاں جو نظامی، سعدی، خسرو، جامی نے لکھی ہیں، تصنیفات بالغہ اس صنف شاعری میں ہیں۔ قطعات ابن یمین ایک ایسی نظم پاکیزہ ہے کہ اس روش میں کسی دوسری زبان میں ایسی نظم پائی نہیں جاتی ہے۔ ایک صنف شاعری کی غزل سرائی ہے اسکی بنا مولانا سعدی نے ڈالی اور کاتبی نے تتبع اُن کی کی اُس روش کی صفائی سلمان ساوجی نے بھی کی۔ حضرت سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے اسکا اسلوب پاکیزہ قائم کیا۔ خواجہ حافظ شیراز نے تصوف کا مذاق غزلوں میں دیکر غزل کا رتبہ بہت بلند فرمایا۔ امیر خسرو علیہ الرحمۃ نے غزل سرائی کو اپنے عشق اور تصوف سے جلوہ دیا۔ اور اسی روش پر مولٰنا جامی کا کلام ہے۔ شعراے ایران سعدی اور حافظ کے عرصے تک متبع رہے۔ یہانتک کہ فغانی کا زمانہ آیا۔ اُسنے ایک نیا انداز غزل سرائی میں پیدا کیا۔ اسی کی تتبع لسانی و ضمیری و نظیری وغیرہ نے کی۔ فارسی کی غزل سرائی میں دو قسمیں ہیں۔ ایک واقعہ بندی اور دوسرے خیال بندی۔ واقعہ بندی میں حضرت خسرو کو ید طولےٰ ہے اور شعراے مابعد اُن کے پیرو ہیں سیلی ترک۔ ولی دشت بیاضی آقا شاپور وغیرہ واقعہ بند شعرا کہلاتے ہیں۔ میرزا صائب نے اپنی غزلوں میں بڑے لطف پیدا کئے۔ اور اپنی غزلوں میں مسائل فلسفیہ حکمیہ اور صوفیانہ داخل کئے۔ طرفہ تر یہ ہے کہ روزمرہ کے عادات انسانی اور وہ واقعات جو ہر شخص کے سامنے پیش پا افتادہ ہیں داخل کئے اور یہ شیکسپیر کی ایک خوبیوں میں سے ہے دعوے کو پہلے مصرعہ میں قائم کیا اور دوسرے مصرعہ میں اُسکو ثابت کیا۔ ایسا پُرگو غزل سرا ایران میں دوسرا نہیں ہے۔ میرزا عبدالقادر بیدل جسکی ذات پر عظیم آباد کو فخر کرنا چاہیے بڑے پُرگو شاعر ہیں۔ اُنکا کلام ایبسٹریکٹ آئی ڈیا سے مملو ہے یعنی جو خیالات تصوف و حکمت کے اُن کے دماغ میں آئے بلا توضیح موزوں کردیے اسی لئے اُن کے کلام کے سمجھنے میں بڑی دقت واقع ہوتی ہے۔ فارسی زبان میں ایک صنف کلام موزوں کا رباعی ہے۔ سنسکرت کے حال سے تو میں واقف نہیں ہوں

اگر یورپ کی زبان میں کوئی کلام رباعی کی روش پر نہیں ہے۔ سلطان ابوسعید ابوالخیر نے رباعی کو رونق دی۔ اور حکیم عمر خیّام نے رباعیوں کی بلندی کو بامِ فلک تک پہونچایا۔ ان کی رباعیاں انگلینڈ اور کونٹنینٹ میں نہایت مرغوبِ خاطرِ علما ہیں۔ تکلفات سے لندن کے مختلف مطابع میں چھپیں اور زبانِ انگریزی اور فرنچ میں ترجمے ہوئے۔ یورپ کے شہروں میں ناصح انجمنیں ان رباعیوں کے [illegible] انعقاد کی ہیں جہاں ان کی رباعیاں پڑھی جاتی ہیں اور اُن کے مطالب پر غور ہوتا ہے اور محاسن بیان ہوتے ہیں۔ ان کی رباعیاں ایک مجموعہ لطیف خیالات فلسفیانہ صوفیانہ رندانہ اور عاشقانہ کا ہے۔ اگرچہ ہر شاعر نے ایران کے رباعیاں لکھیں اور اُنکی تقلید کی، مگر کسیکو خیّام کے مقابلہ میں فروغ نہ ہوا۔ جب اُردو میں حیثیت زبان کی آئی تو ولی دکنی نے قصدِ غزل سرائی کا اُس زبان میں کیا، اگرچہ اُسوقت یہ زبان آراستہ و پیراستہ نہ تھی۔ ولی دکنی کو اُردو زبان کی غزل سرائی کا موجد کہنا چاہیئے۔ میر تقی نے جو ایک بڑے خاندان کے آدمی ہیں، اُردو کی غزل سرائی کو جلوہ دیا اور اِسقدر اس زبان میں حلاوت پیدا کی کہ آجتک مقبولِ شعراے اُردو زبان ہے۔ اگرچہ میر صاحب کے وقت سے اس زبان میں بہت تغیّر و تبدّل ہوئے مگر میر صاحب کی شیریں کلامی اِس وقت تک مقبولِ ہر خاص و عام ہے۔ مرحوم اسد اللہ خاں غالب شیخ امام بخش ناسخ کے قول پر استدلال فرماتے ہیں اور کہتے ہیں ؎

میر کے شعر کا میں حال کہوں کیا غالبؔ ؎ اُسکا دیوان کم از گلشنِ کشمیر نہیں۔

ریختہ کا وہ ظہوری ہے۔ بقولِ ناسخ ع۔ آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میر نہیں۔ شیخ امام بخش ناسخ کی نسبت غالب فرماتے ہیں کہ وہ موجدِ طرزِ جدید اور پُرانی ناہموار روشوں کے ناسخ تھے۔

میر صاحب کے کلام کو بغور دیکھنے سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اِس شخص کی معلومات بہت وسیع تھی اور فطرت نے اُن کی طبیعت کو خاص قوتِ شاعری عنایت فرمائی تھی، اِس شخص کی نظر غامض تھی۔ اور کوائفِ انسانی کے دیکھنے کا مادہ قریب قریب ویسا ہی تھا جو فطرت نے شیکسپیر کو عطا کیا تھا اِن کے کلام میں تصوف نے بھی اپنا رنگ دکھلایا۔ دہلی کے شعرا بروشہاے مختلفہ متبع میر صاحب کے ہیں

لکھنؤ کے شعرا میں اُس قسم کی باریک بینی جسکو اوبزرویشن کہتے ہیں، نہیں ہے اور نہ صوفیانہ خیالات سے کچھ علاقہ ہے۔ اِن دونوں امور کے نہ ہونے کی جہت سے کلام بلندرتبہ نہیں ہے۔

اِس زمانہ میں ہماری قوم کے انگریزی دانوں کے دماغ میں انگریزی شاعری کے دیکھنے کے بعد یہ خیال پیدا ہوگیا ہے کہ اُردو اور فارسی کی شاعری فطرتی نہیں ہے۔ میرے خیال میں انگلستان کیا تمام یورپ کی شاعری کی روش ایشیا کی شاعری کی روش سے مختلف ہے۔ اہل یورپ کے خیالات، اُن کے طرزِ معاشرت، رواج اور فصول اور عنوانِ تعلیم پر مبنی ہیں اور اس وجہ سے جو اثر کہ اُن کے خیالات پر ہوا اُسنے اُن کی شاعری کو بالکل ایشیائی شاعری سے جُدا کردیا۔ اسقدر مجکو اتفاق ہے کہ خیال ور استعارات مستبعد جنکو انگریزی میں فارفچڈ آئیڈیا کہتے ہیں، ہماری موجودہ شاعری میں بہت ہیں اور اگرچہ بضرورت تشبیہ با دنیٰ ملابست جائز رکھی گئی ہے مگر اُسکا استعمال بافراط ہوگیا ہے اور اسی جہت سے یہ اعتراض وارد ہوگیا کہ اُردو اور فارسی کی شاعری میں لُطفِ مضامینِ فطرتی نہیں ہے اور بقول ان حضرات کے شاعری اَن نیچرل ہوگئی۔ مبالغہ کو اسقدر وسعت دیگئی ہے کہ اگر صورت شعرا کے معشوق کی مصوّر کیجائے تو اُس سے زیادہ بدہیئت اور بدصورت دُنیا میں دوسرا نہوگا۔ اور یہ بوجہ استعمال اُن تشبیہات کے ہے جو بادنیٰ ملابست جائز رکھی گئی ہیں۔ استعاراتِ بعیدہ اور مبالغاتِ ناپسندیدہ کی بدولت یہ اعتراض وارد ہوا ہے۔ جن شعرا نے اپنے کلام میں اِن باتوں کا لحاظ کیا اُن کا کلام نہایت پسندیدہ اور قرینِ فطرت ہے جیسا کہ میر صاحب کا یہ شعر ؎

بہارِ رفت پھر آئی ترے تماشے کو ؛ چمن کو یمنِ قدم نے ترے نہال کیا

یا کسی شاعر کا یہ شعر ؎

بجائے آشک آنکھوں سے کوئی خوں رو نہیں سکتا ؛ صدف کانِ گہر ہے لعل اِس میں ہو نہیں سکتا۔

باریکیِ کمر میں اسقدر مبالغہ کیا گیا کہ عدیم الوجود ہوگئی۔ تنگیِ دہن کے اوصاف میں اسقدر ترقی کی گئی کہ بقول شخصے ؎ دہن بر چہرہ زخمے بود بہ شد۔ ناظرین خود انصاف فرمائیں کہ کمر ندارد منہ کا وجود نہیں۔ پھر ایسا معشوق جسکے کمر نہ ہو، مُنہ نہو حسین ہوگا۔ یا بدہیئت۔ ایسی شاعری فطرتی ہو یا غیر فطرتی میرے

نزدیک ہجو معشوق ہے۔ بیانِ خوبیٔ حُسن۔ یہ باتیں استعاراتِ بعیدہ و تشبیہاتِ باد نیٰ ملابست اور مبالغۂ ناجائز کی بدولت ہوئیں۔

ناظرین پر واضح ہو کہ خوبیِ کلام سے فنِ معانی و بدیع پیدا ہُوا۔ اور شعرائے سلف کے کلام سے اقسام اسکے مُستخرج ہُوئے۔ عربی میں جو کتابیں صنائع و بدائع میں لکھی گئی ہیں، اُن میں استدلال قرآن مجید سے اور اُن شعرا کے کلام سے کیا گیا ہے جنکی قادر الکلامی اور زباندانی مستند سمجھی گئی ہے۔ چنانچہ شیخ عبد الغنی نابلسی نے جو قرنِ حادی العشر کے علما سے ہے اپنی شرح بدیعیہ کے خُطبے میں لکھا ہے کہ اقسام بدیع کلام سے قائم ہوئے۔ سکاکی نے اپنی مفتاح میں صرف ۲۹ قسمیں لکھی ہیں اور کہتا ہے کہ عبد اللہ بن معتز نے ایک کتاب ۲۷۴ھ میں لکھی اور اس نے صرف ۱۷ قسمیں قائم کیں اور جعفر کاتب نے صرف ۲۰ قسمیں۔ ابو ہلال عسکری نے ایک کتاب جمع کی اور اُسنے ۳۷ قسمیں لکھیں۔ اسی کی تائید ابن رشیق اور شرف الدین نے کی۔ انکے بعد ابن ابی الاصبع نے نوّے قسموں تک تعداد بڑھائی۔ عبد العزیز حلی نے جو ملقب بہ صفی ہے قصیدۂ نعتیہ نظم کیا اور اُس میں بدیع کے اقسام ۱۵۱ لکھے اور خود اُسکی شرح کی۔ شیخ عز الدین موصلی نے ایک قصیدہ بروشِ حلی لکھا اور اُس میں اپنی طرف سے کچھ اختراعات کیے۔ حموی کے بعد عائشہؓ باعونیہ نے ایک قصیدہ نظم کیا اور اسکی خود شرح بھی کی۔ یہ کتاب فنِ بدیع میں مبسوط ہے جسکو نابلسی نے بخطِ مصنّفہ دیکھا ہے۔ آخر میں قصیدۂ نابلسی کا ہے جسمیں سب کچھ مجتمع کیا گیا ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ کلام سے یہ فن پیدا ہُوا نہ فن سے کلام۔ خوبیِ بندش نے صحتِ الفاظ سے صنائع پیدا کئے۔ میرا خیال یہ ہے کہ ہر شعر میں الفاظ اصلی و ذیلی ہیں اور خوبیِ شعر اُسوقت ہو گی کہ الفاظ پابندِ معنی ہوں، نہ معنی پابندِ الفاظ۔ اصلی الفاظ ہر شعر کے وہ ہیں کہ جن سے اصل خیال شعر کا پیدا ہوا اور ذیلی الفاظ وہ ہیں جو توضیح اصل خیال کی کریں۔ شاعری میں اِس امر کی ضرورت شدید ہے کہ ذیلی الفاظ اصلی الفاظ کے ساتھ نسبت رکھتے ہوں اور مربُوط ہوں۔ مرحوم اسد اللہ خاں غالب نے اپنی ایک تحریر میں لکھا ہے کہ الفاظ دُرست ہوں اور بندش چُست۔ یہ جُملے مختصر تو ہیں مگر ان میں بڑی کار آمد ہدایت شاعروں کے لئے ہے۔ مقصد اسکا یہ ہے کہ الفاظ شعر میں صحیح آئیں اور اُن سے مفہوم صحیح پیدا ہوں۔ اور بندش

حیثیت سے یہ غرض ہے کہ ایک لفظ سے دوسرے لفظ کو نسبت خاص ہو جیسا اگر لفظ باغ آئے تو اُس کے ساتھ باغ کے تلازمے ہونے چاہئیں مثلاً گل، بلبل، غنچہ، سبزہ، شبنم۔ اسی طرح سے اور لفظوں کی رعایت ہونی چاہیے۔ اگر یہ رعایت صحیح طور سے شعر میں نہو گی تو لطفِ شعر میں فرق آئیگا مثلاً یہ شعر میر صاحب کا

گیسو و رخسار یار آنکھوں میں اب پھرتے ہیں ؎ میر یہ لیل و نہار دیکھیے کب تک ... ار رہے

ہمارے ذی علم ناظرین اس امر کو خیال فرمائینگے کہ اس زمانے کی شاعری محدود عشق و عاشقی ہے جس میں کہیں کہیں غیر مہذب مضامین بھی بندھا کرتے ہیں۔ اگر خیالات شعرا کے محدود رہیں اور اُنکو وسعت نہ دیجائے تو شاعری کم رتبہ ہو جائیگی۔ جس قسم کے مضمون کی بندش یہاں کی غزلوں میں ہے وہ عربی اور یورپ کی شاعری میں نہیں ہے۔ جو لوگ فطرتی شاعری سے اس زمانے میں خواہاں ہیں اُنکو ضرور اس امر کی تائید لازم ہے کہ خیالات رکیک اور مضامین پیش پا اُفتادہ سے کنارہ کریں اور ایسے خیالات کہ جو پڑھنے والوں کے حق میں مفید ہوں اور اُن کے خیالات دُرست ہوں اور اُن کے اطوار میں شائستگی آئے شائع کریں کیونکہ یہ امر متفق علیہ ہے کہ کلامِ منظوم کا خاص اثر دلوں پر ہوتا ہے۔ ایک امر اہم متعلق اس شعر و شاعری کے جسکا چرچا اس زمانے میں ہے میرے دماغ میں اکثر گذر کرتا رہا۔ مسٹر ٹونبک ایک بلند نام افسر پٹنہ کالج نے اپنی تقریر میں فرمایا تھا کہ مسلمانوں کے بچے تیرہ چودہ برس کے سن تک اپنی کلاسوں میں بہت نمایاں ہوتے ہیں اور دوسرے لڑکوں پر ہمیشہ فوق رکھتے ہیں مگر جوں جوں اُن کا سن بڑھتا جاتا ہے اُن کی جودت و ذہانت کم ہوتی جاتی ہے۔ یہ جملہ ایک افسر سررشتۂ تعلیم کا بہت خیال کرنے کے قابل ہے کیونکہ یہ ضرور ہے کہ کسی سببِ خارجی سے یہ حالت پیدا ہوتی ہے۔ اس بحث پر انشاء اللہ تعالےٰ میں ایک تحریر طویل لکھونگا۔ مگر بہ مناسبتِ حال اس تحریر کے میری گزارش ترقی خواہانِ قوم کی خدمت میں یہ ہے کہ اسوقت کی روش شاعری وجہ من الوجوہ ان نوجوانوں کی بربادی کی ہے۔ معشوق کا سراپا، اُن کی اداؤں کا بیان اُن کے غمزوں کا اظہار نہایت ہی غیر مہذبانہ طور سے نظم ہوتے ہیں۔ جو کچھ اُنھوں نے دیوانوں میں پڑھا اُن کو بوقتِ شام سیر و گشت میں کوٹھوں پر مجسّم دیکھا جسکا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تحریکیں دل میں بُری قسم کی پیدا ہوتی ہیں۔ میرے نزدیک تعجب انگیز امر یہ ہے

کہ ثقات شعراے اُردو زبان کے دیوانوں میں بھی یہ نقص پایا جاتا ہے اور ایسے اشعار موجود ہیں کہ
جنکو مہذب صحبتوں میں پڑھنا معیوب سمجھا جائیگا۔ مجھے اِس قسم کے اشعار کو اِس تحریر میں جگہ دینا منظور
نہیں اور نہ کسی شاعر کو نامزد کرنا مقصود ہے۔ ماہرانِ سخن اس سے خود بخوبی واقف ہیں اور میں
اُمید کرتا ہوں کہ اساتذۂ فن اپنے شاگردوں میں ایسی نامہذب شاعری کو آنے نہ دینگے۔ عظیم آباد
او مضافاتِ عظیم آباد میں میری گُزارش مبالغہ نہ سمجھی جائے سینکڑوں شاعر نوجوان موجود ہیں۔
ش۔ ق تو وہ دُرست تلفظ کرتے ہیں مگر کسی قسم کی لیاقت نہیں رکھتے۔ ہمارے دوست خان بہادر
شاد جنکی شاعری پر پٹنہ کو فخر و مباہات کرنا چاہیئے نوجوانوں کی شاعری میں اصلاحِ معقول دیں۔
شاعری ہمیشہ تحصیلِ علم سے باز رکھتی ہے چنانچہ ایک یہ نقل مشہور ہے کہ زلالی خوانساری اور میر
باقر داماد ہمسبق تھے۔ زلالی ایک ذہین آدمی تھا ہمیشہ میر مرتوبہ پر فوق لیجاتا تھا۔ میر کو اسکا خیال ہوا
کہ کسیطرح سے زلالی کو پیچھے رکھنا چاہیئے۔ شعر گوئی شروع کی۔ زلالی نے بھی اسطرف توجہ کی کیونکہ
اُسے ہر کام میں میر باقر داماد سے تقابل تھا۔ زلالی مذاقِ شاعری کے دام میں پھنس گیا اور تحصیلِ علم
سے باز رہا۔ میر باقر داماد کا حال روشن کالشمس فی نصف النہار ہے۔ میں نے جب خود قصد شعر کہنے
کا کیا تو میرے اُستاد جناب میرزا عبدالرزاق رحمۃ اللہ علیہ اصفہانی نے مجھے بہ تشدد باز رکھا اور مجھے
اسکا خود بھی خیال آیا کہ میرا کلام ہرگز شعراے ایران کے ہمرتبہ نہ ہوگا۔ الحمد للہ کہ میرا دماغ اس قسم کی
خوشخیالیوں سے بچا۔ اسمیں کچھہ شک نہیں کہ شاعری کا رتبہ بہت بلند ہے مگر یہ بھی یقینی ہے کہ کم حیثیت
لوگوں کی شعر گوئی سے حیثیتِ شاعری پست ہوجاتی ہے۔ فی زمانناضرورت اسکی ہے کہ تحصیلِ معاش
کے لئے مُسلمانوں کے بچے۔ بی۔ اے۔ بی۔ ال۔ ام۔ اے۔ ہوں۔ تاکہ تحصیلِ معاش کا اُن کو وسیلہ ہو
اُردو کی شاعری کی قدر گورنمنٹ میں نہیں ہے اور خصوصًا ایسی شاعری کہ جسکو حکّامِ انگلشیہ اگر بخوبی سمجھیں تو
اسکی اشاعت کو جائز نہ رکھیں۔ اِس عرض سے غرض ہماری اسیقدر ہے کہ اِس مسئلہ پر قوم کے خیر اندیش
حضرات ضرور غور فرمائیں اور اصلاح معقول فرمائیں۔
میں سمجھتا ہوں کہ میں مرتکبِ ترک ایک فعل لازمی کا ہونگا اگر اسوقت کے عام شعراسے خواجہ الطاف حسین

حالی سلمہ اللہ تعالےٰ کو علیحدہ نکروں۔ اِن بزرگوار نے اُس روشِ قدیم کو جو شُعراے عرب نے قوم کی ہمت دلانے کے لئے جاری کیا تھا، ہزار بارہ سو برس کے بعد از سرِ نو اختیار کیا، اور احیاے اموات فرمایا۔ فی الحقیقت مجھ میں ایسی لیاقت نہیں ہے کہ فراخورِ شان اُن کے کلام کی داد دوں۔ اسقدر کہنا کافی ہے کہ انداز نیا۔ زبان میں لُطفِ خاص۔ بندشیں پاکیزہ۔ الفاظ دُرست۔ مضامینِ عالی اُن کی نظموں میں موجود ہیں۔ اُنکا وہ کلام ہے کہ اہلِ اسلام اُسکو اپنا وظیفہ بنائیں، اور اپنی اولاد کے لئے ودیعت چھوڑیں۔ یہ بھی لکھنا ضرور ہے کہ فارسی میں جو صوفیانہ نظم ہے اُسکا لُطف جناب حضرت شاہ محمد اکبر صاحب ابوالعلائی دانا پوری نے اپنی غزلوں میں زبانِ [illegible] پیدا کیا۔ اور چونکہ صوفیانہ خیال کے شاعر کی نظم غیر مہذب نہیں ہوسکتی اسلیئے اُن کے دیوان پر کسی قسم کا اعتراض عائد نہیں ہوسکتا۔ اُن کی زبان بھی پاکیزہ اور خیالات صوفیانہ بھی صحیح اور بندشیں بھی دلپذیر ہیں۔ مجھے بڑی خوشی اس بات کی ہے کہ سید نذیر احسن ملہوی المتخلص بہ نسیم جو خواہرزادہ جناب شاہ مزبور کے ہیں، اپنے ماموں کی روش پر چلے ہیں۔ آیندہ دیکھیے کیا ہو۔

فی زماننا خان بہادر شاد کی ذات اِس عظیم آباد میں غنیمت ہے۔ اِن بزرگ نے اپنی عمر شعر و شاعری میں صرف کی۔ میرے ساتھ یہ متفق ہیں کہ اِسوقت کی شاعری کی روش بدلنی چاہیئے۔ اور کلام میں یہ حیثیت پیدا کرنی چاہیئے کہ جس سے قوم میں تہذیب آئے اور تحصیلِ علم کا شوق بڑھے۔

اُن حضرات کے ملاحظہ کے لئے جو فطرتی شاعری کا ڈنکا بجا رہے ہیں، چند اشعار ایک مثنوی کے جس سے کیفیتِ بہاریہ پیدا ہے، میں نقل کرتا ہوں اور اُمید کرتا ہوں کہ اس نظم کو ٹامسن سیزنس (                ) کی نظم سے مقابلہ کر کے انصاف فرمائیں کہ ہم ایشیائی خیال والوں کے لئے کیسی پاکیزہ اور دست بدست فطرت کی ہے۔ اس مثنوی میں حکیم نصیر اصفہانی نے دو فلسفیوں کی تقریر لکھی ہے ایک اُن میں سے (ایپکیورین) اور دوسرا (اسٹوئیک) ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ ٹامسن کا طرزِ بیان بالکل جُدا اگانہ اُس سے ہے کہ جو ایشیائی ملک کے شعرا کا ہے۔ اور ان دونوں کے ایک کرنے کی اُمید کرنا مجھے خیلے دُشوار معلوم ہوتا ہے۔ راسخ عظیم آبادی نے جو عشق کی تعریفیں نظم کی ہیں اُن کو بھی بغرضِ تفننِ طبعِ ناظرین درج کرتا ہوں اور انگریزی دانوں سے اُمید کرتا ہوں کہ ورڈس ورتھ

(          ) کے سونیٹ (          ) اور لارڈ بائرن کی چائلڈ ہیرلڈ کو پیشِ نظر رکھ کر ملاحظہ فرمائیں۔

مبصرانِ اولی الابصار سے چشمِ اُمید یہ ہے کہ سہو و خطا کو میری قلمِ اصلاح سے دُرست فرمائیں اور میری جاہل کو مورد تشنیع نہ کریں۔ ع

آنانکہ خاک را بہ نظر کیمیا کنند ٭ آیا بود کہ گوشۂ چشمے بما کنند۔

شبی با نوجوانی گفت پیری
کہ بادِ نوبہار از ابرِ آزار
صبای یوسفِ گُل شد جہانگیر
جہان شکلِ نگارستانِ چین است
چو مُوئ بار از نیسان خوشگوار است
رُخِ گُل آئینہ روی عکسِ یار است
پریشان زلفِ سنبل از نسیم است
قدِ سروِ سہی در طرفِ گلزار
سحر نرگس خمار آلودہ خیزد
فروزان لالہ چون روی ستان
چنان جنبانده آئینۂ آب
ترشحہای ابر از ہر کناری
دل از کف دادگان ابرو از دست
چنان در ہر طرف بالیدہ موی
پری پیکر بتان چون سرو مہوش
ہمہ سحر آفرین خوش بیانی

کہن دیوی کشی صافی ضمیری
شنیدم خیمہ زد در طرفِ گلزار
زلیخای جوان شد عالمِ پیر
صبا مشکِ ختن در آستین است
قدح در دست ابرِ نوبہار است
ہوا مشاطۂ آئینہ دار است
نسیم از بوی عنبر شمیم است
و دریا وار نہالِ قامتِ یاس
شکر خند از دہانِ غنچہ خیزد
شقایق چون عذارِ مہ پرستان
گران جنبش نیفتد عکسِ مہتاب
بود چندان کہ بنشاند غباری
پریشان نالہای قمری است
خرامان ہر طرف زیبا تدروی
ہمہ چون گُل بپیرایہ نپوش
ہمہ جادو زبان در ہر زبانی

چو جم صاحب دلی روشن روانی
بہر گلبن ہزاری ساز برداشت
مشو غافل کہ ایامِ بہار است
زبان عیسوی دم وعنبر سرشت است
شرابِ فیض در مینای ابر است
گلستان غرق تن چو روی وہ نو باشست
بنفشہ در کنارِ جوی یاران
صنوبر چون جوانان دوش بر دوش
چو مستان ارغوان از دستِ ایام
سحرگاہان نسیم آہستہ خیزد
چمن ابرِ آزاری نوازد
نقاب افگندہ باد از چہرۂ گُل
بسیرِ گُل بہر سو گُل عذاران
گرفتہ ہر گلی در ہر کنارے
ہمہ در باغِ جان نازک نہالان
ہمہ آگہ ز طرزِ دلربائی

درین دیرِ کہن پیرِ معانی
بہر سوے تذرو آواز برداشت
سراسر کوہ و صحرا لالہ زار است
زمین مینو وش از روی بہشت است
بیا پی رشحۂ صہبای ابر است
چمن دلکش چو کوی سیمبر وشست
چو خط گردِ لبِ سیمین عذاران
سمن چون گلرخان سیمین بناگوش
شرابِ ارغوانی کردہ در جام
چنان کز برگِ گُل شبنم بریزد
بباران کہ خاکش گُل بسازند
گرفتہ شور در شوریدہ بلبل
پریشان چو ابرِ نوبہاران
بپای گلبنی دستِ نگارے
ہمہ در راغِ گُل رعنا غزالان
ہمہ ہم آشنا در آشنائی

ہمہ از تابِ مے افروختہ گل ‌ ‌ خمارش نرگس و آشفتہ سنبل
سہی بالا جوانانِ سمن بر ‌ ‌ چو غلمانِ بہشتی روح پیکر

ہمہ برگردِ گل سنبل دمیدہ ‌ ‌ ہمہ مشکیں رقم بر بر کشیدہ
ہمہ بر تختِ خوبی تاجداراں ‌ ‌ در اقلیمِ نکوئی شہریاراں

ہمہ سرخوش ز جامِ ارغوانی ‌ ‌ ہمہ جویایِ عیش و کامرانی
کنوں اندر سرِ ہر کس ہوا نیست ‌ ‌ بہر شاخی ز ہر مرغی نوا نیست

قدح در دستِ مستاں بر لبِ جست ‌ ‌ کفِ ساقی ز مینا رشکِ مینوست
ہمہ چوں شاخِ گل پیمانہ در دست ‌ ‌ تماشایِ غرابِ باغباں ست

## مثنوی مسمّٰے ناز و نیاز

عشق کی مجھسے نہ پوچھو کچھ بات ‌ ‌ عشق سے با مزہ ہے موت و حیات
ہے نہ جینا ہے حلاوت کے ساتھ ‌ ‌ مرگ بھی آئی ہے لذت کے ساتھ

عشق میں لوگونے جانیں دی ہیں ‌ ‌ تلخیاں عشق کی کیا شیریں ہیں
عشق کا رنج ہے راحت کا رشک ‌ ‌ اسکی تلخی ہے حلاوت کا رشک

عشق سمجھو تو عجب ہے کچھ چیز ‌ ‌ درد و داغ اسکے بھی کتنے ہیں عزیز
ایک ہے دلمیں چھپا کتنی کی گوں ‌ ‌ ایک چھپاتی ہے لگا کتنی کی گوں

عاقلوں سے ہے بہت عشق نفور ‌ ‌ عقل سمجھے اسے کب ہے یہ شعور
ان سے جو وحشی ہیں مانوس ہے عشق ‌ ‌ آتشِ خرمنِ ناموس ہے عشق

یار اسکے سبھی سودائی ہیں ‌ ‌ ساکنِ کوچۂ رسوائی ہیں
انکا سامان ہے بے سامانی ‌ ‌ تن پہ ہے پیرہنِ عریانی

پیرہن کے نہیں پابند اسیر ‌ ‌ کفنی پھاڑتے ہیں اسکے فقیر
کارپرداز جنوں ہے اسکا ‌ ‌ محرمِ راز جنوں ہے اسکا

کچھ لباس ہے نہیں زیبایِ عشق ‌ ‌ خاک ہے جامۂ رعنایِ عشق
ربط رکھتا ہے یہ دیوانوں سے ‌ ‌ راہ اسی چاک گریبانوں سے

عشق کا مرتبہ ہے بسکہ بسیط ‌ ‌ کب قیاس من عرو اسپر ہو محیط
جسنے کچھ بھی اسے پہچانا ہے ‌ ‌ وہ سڑی خبطی ہے دیوانا ہے

# اخلاق اور قانون

انسان کو عقل راہنمائی کے لیے عطا ہوئی ہے، لیکن انسان کی عقل کے مراتب مختلف ہیں، اور ہر شخص کی عقل اسقدر کامل نہیں ہے کہ وہ ہر انسان کو برائیوں سے بالکل بچا سکے۔ بلکہ اکثر انسان سے ایسے افعال صادر ہوتے ہیں، جو اسکی ذات یا سوسائٹی کو نقصان پہونچاتے ہیں۔ جب انسان اپنی عقل سے کام لیتا ہے، تو بہت مفید نتائج حاصل ہوتے ہیں۔ مثلاً وہ ایک خاص مذہب کی پابندی کرتا ہے۔ خدا سے

عز و جل کی پرستش کرتا اور اپنے تئیں عبد سمجھتا ہے - علم و فن میں ترقی کرنا اور طرح طرح کی دستکاریاں کرنا ہے- تمدّن و معاشرت میں اصلاح کرنا اور امن و رفاہِ عام کے قیام و ثبات میں مدد دیتا ہے - اسی طرح شہروں میں ملکر رہنا- دوسروں کے ساتھ مشارکت اور مخالطت اختیار کرنا، ایک طاقت بہم پہونچانا اور سلطنت قائم کرنا- مال و دولت جمع کرنا، اور ہر شخص کی علیحدہ ملک قرار دینا، اپنی اپنی چیزوں سے حظ اُٹھانا، ایک حالت سے دوسری حالت میں ترقی کرنا، نئی معلومات بہم پہونچانا، نئی اشیا یا اشیا کے خواص یا قدرت کے قانون دریافت کرنا، اہم مسائل میں غور و فکر کرنا انسان کے لئے ایسے کام ہیں جو اُسکو عروج اور ترقی کی طرف مائل کرتے اور اُسکا رتبہ بلند کرتے ہیں- اور یہی انسان کا کمال ہے - یہ انسان کی ضروریات، ارادہ، دانش اور استعداد کا نتیجہ ہیں- لیکن جب انسان پر حیوانیت کا غلبہ ہوتا ہے، تو یہی انسان لوگوں کو قتل کرتا، عمارتوں کو ڈھاتا، کھیتوں کو مسمار کرتا. شہروں کو ویران کرتا، معابد و مساجد توڑتا صنعت و کمال کے نمونوں کو مٹاتا، کتبخانوں کو جلاتا، لوٹ مار کرتا اور ہر طرف بربادی پھیلاتا ہے، اس حالت میں اُسکی روح تنزّل کیطرف مائل ہوتی ہے، اور وُہ انسانیت سے دُور ہو جاتا ہے-

انسان قدرت کے منشا کے مطابق اپنی عقل اور ارادہ پر کاربند ہوتا، اور اپنی سمجھ کے مطابق ہر کام کرنا چاہتا ہے- لیکن اُسکی ناقص عقل اور غلط رائے اُسے بُرائی کی طرف مائل کرتے ہیں اور انسان کو ضرورت پڑتی ہے کہ وہ یہ جانے کہ مجھے کسطرح عمل پیرا ہونا اور اپنے چال چلن کو کتنا اصول کا پابند رکھنا یا اپنی طبیعت پر کسطرح قابو رکھنا چاہیئے- یہ علم اُسے "اخلاق" کے جاننے سے حاصل ہوتا ہے- لیکن انسان کی جہالت اور بعض اوقات باوجود علم اُسکی طبیعت کا ضعف اُسے قوانین اخلاق پر کاربند نہیں رکھتا، اور اس سبب سے تمدّن میں خرابی اور امنِ عامّہ میں خلل پڑتا ہے - اور تمام گروہ کی آسائش اور حفاظت کے لئے یہ ضرورت پڑتی ہے کہ جو لوگ عمداً یا احیاناً قانونِ عدالت کی خلاف ورزی کرنی چاہیں، انکو بہ جبر و بہ زور عدالت پر قائم رکھا جائے- اور اگر کبھی اُسکے خلاف کریں تو سزا دیجائے تاکہ لوگوں کے گروہوں میں امن و ترتیب قائم رہے - چونکہ ہر سوسائٹی میں گورنمنٹ اس منشا کیواسطے قائم ہوتی ہے، لہذا یہ اختیار گورنمنٹ کو دیا گیا ہے اور جو ضوابط کہ گورنمنٹ لوگوں کے افعال میں

حد قائم کرنے کے لئے جاری کرتی ہے "قانون" کہلاتے ہیں۔

قانون وہ قواعد ہیں، جو ایک سلطنت اپنی رعایا کے معاملات اور ایسے افعال کی درستی کے لئے مقرر کرے، جو تمدن سے تعلق رکھتے ہیں اور جنکی رو سے انکی باہمی مقدمات کا انفصال کیا جائے۔

تمدنی حالت میں جبکہ انسان کے گروہ ملکر رہیں، دو چیزیں انسان کو ٹھیک رکھ سکتی ہیں اور اسکے دست تغلّب اور جبر کو روک سکتی ہیں، ایک[1] اخلاق دوسرے[2] قانون۔ تمدنی حالت میں جسقدر ترقی ہوتی جاتی ہے اور ہر ایک انسان کے عام خیالات یا اُس کے پیشے جسقدر بڑہتے جاتے ہیں، اُن پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کے خانگی یا منزلی خیالات، طبعی تحریکیں، شوق، دلچسپیاں، اُسکے اخلاق پر اثر ڈالتی ہیں، اور ان سب میں وہ قانون کے خوف کے مارے کچھہ نہ کچھہ عدالت کا خیال رکھتا ہے۔ قانون خاندان کیواسطے ضابطہ بناتا ہے اور فیصلہ کر دیتا ہے کہ خاندان کی ہر ممبر کی کیا حیثیت اور اُسکے کیا حقوق ہیں۔ اسیطرح تمام گروہ میں ہر شخص کی ملک اور اُسکے حقوق کی نگہبانی قانون کرتا ہے۔ قانون کاروبار اور معاملات دنیا میں ہر امر کی تحقیق اور تشریح کرتا ہے اور پھر اُن میں ہر شخص کے فرائض معین کرتا ہے۔ قانون معاملات میں صداقت رکھنے اور حقوق کی نگہداشت پر مجبور کرتا ہے اور عدالت کو نہایت استواری اور استحکام سے قائم کرتا ہے۔ لیکن قانون کے حدود کے اندر بھی ایسے بہت سے چھوٹے چھوٹے کام ہیں، جنکا اثر مضرت اور فائدے، راحت اور تکلیف پہونچانے میں بہت قوی ہے، اور قانون کا اُن پر بس نہیں چلتا۔ ایک شخص ایک بڑا خاوند ایک بڑا باپ ایک بڑا سرپرست ہو سکتا ہے لیکن قانون کی حد میں نہیں آتا۔ ممکن ہے کہ ایک شخص جابر زمیندار ہو اور اجارہ داروں پر جبر و تعدی کرتا ہو یا اجارہ دار ہو لیکن پیداوار زمین برباد کرتا اور منافع تلف کرتا ہو۔ سوداگر ہو لیکن بے اعتبار ہو۔ اور ملک کا قانون اُسے درست نہ کر سکے۔ ممکن ہے کہ ایک شخص اسعلےٰ درجے کا چالباز۔ فتنہ پرداز۔ خیرہ سر ہو۔ لیکن مطمئن ہو کہ قانون اُسپر کوئی دعوے نہیں کر سکتا۔ لیکن باوجود ان اسقام کے بھی قانون قومی اور ملکی فلاح اور امن کے لئے ضروری اور لابدی ہے۔

انسان اپنی بنی نوع کے ساتھ قاعدۂ عدالت کی دو سبب سے رعایت کرتا ہے یا تو اُسکو یہ خوف ہو

کہ اگر بے ایمانی اور دغا کروںگا تو بُرے نتائج مجھے بھگتنے پڑینگے، یا جس کام کو وہ واجب اور فرض سمجھتا ہو طبعاً اُسکے پورا کرنے کی طرف راغب ہو۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اخلاق کی تمام تحریکیں اُمید و بیم سے پیدا ہوتی ہیں، بعض کہتے ہیں کہ تمام انسانوں میں اخلاقی اثر عقل حیوانی کیطرح قدرتی اور فطرتی ہوتا ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ اخلاقی اثر کچھ تو طبعی اور جبلّی ہوتا ہے اور کچھ تمدنی حالت یا سوسائٹی کے اثر یا زندگی کے تجربوں سے اُسپر رنگ چڑھتا ہے، اور سبسے زیادہ یہ کہ جو خیالات عام طور پر قوم میں پھیلے ہوئے ہوتے ہیں اور جنکا اثر قوم کی ہر فرد میں اسطرح ساری ہوتا ہے کہ اُن کے نیک و بد کی تمیز اُن ہی خیالات پر مبنی ہو جاتی ہے اور وہ انسان کی طبیعت میں ایسا انقلاب پیدا کر دیتے ہیں کہ اُن کا اثر وراثتاً دوسری نسل میں پہونچتا ہے اور اُن سے جبلّی کیفیت کیطرح ظاہر ہوتا ہے۔ اُن لوگوں کے اعتقادات کے موافق اُصولِ اخلاق کسی فرقہ میں رفتہ رفتہ ترقی کرتے ہیں۔ اور قوم کے عام طریقے اور رویّہ کے اثر سے پیدا ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ اِس عام اخلاق کا اثر انسان کی زندگی کے ہر حصّے، ہر جذبہ، اور ہر فعل سے ظاہر ہوتا ہے اور تبادلۂ خیالات کیوجہ سے اُن میں نئے نئے اشتقاق ہوتے جاتے ہیں یا اُن میں زیادتی اور کثرت پیدا ہوتی جاتی ہے اور یہی قومی اخلاق کی ترقی یا تنزّل کا باعث ہے۔

اخلاق اور قانون میں یہ فرق ہے کہ اخلاق میں اگرچہ افعال کو بھی دیکھا جاتا ہے لیکن زیادہ تر انسان کے خیالات اور دلی جذبات سے بحث کی جاتی ہے اور قانون میں صرف افعال کو دیکھا جاتا ہے اور اگر خیالات اور میلان کا ذکر ہوتا ہے تو اسیقدر کہ انسان کے افعال کے حالات کے معلوم کرنے میں مدد مل سکے۔ دوسرا فرق یہ ہے کہ قانون کی ساری قوت سزا کے خوف میں ہے لیکن اخلاق انسان کو مائل کرتا ہے کہ ایسے اعمالِ حسنہ کا پابند ہو جن کا رتبہ اُن اعمال سے بہت بلند ہے جن پر قانون مجبور کر سکتا ہے۔ اسلئے قانون فطرتاً خوف پیدا کرتا ہے اور اخلاق انسان کو جری بے خوف اور دلیر بناتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ قانون کی پابندی میں بھی اُصولِ اخلاق پر چلنے کی فرصت اور آزادی حاصل ہے اور اسی سبب دلیری اور جُرأت پیدا ہوتی ہے، لیکن یہ جرأت قانون میں اخلاقی حصّے کا نتیجہ ہے نہ قانون کا۔ اور

جب قانون کے بنانے میں ذرا غلطی ہوجاتی ہے تو یہ اثر فوراً جاتا رہتا ہے۔

لیکن باوجود ان نقائص کے دُنیا میں قانون کی بہت حاجت ہے کیونکہ قانون اگرچہ بلاواسطہ اخلاق پر اثر نہیں ڈالتا لیکن بالواسطہ اخلاق کی بہت مدد کرتا ہے۔ انسان کو سب سے زیادہ اپنے اغراض اور اپنے فوائد عزیز ہوتے ہیں اور اُن کے حصول کے پیچھے وہ دوسروں کی فلاح اور اغراض کا بہت کم خیال رکھتا ہے لیکن قانون تمام لوگوں کے اغراض اور مقاصد پر نظر رکھتا ہے اور سب لوگوں کے مال و اسباب کو تغلّب اور تصرّف سے بچاتا ہے۔ اسیطرح بعض سادہ دل اور بھولے آدمی یا کمزور طبیعت اشخاص رضامند ہوجاتے ہیں کہ اپنی آزادی کے حقوق سے دست بردار ہوجائیں۔ اور اپنے تئیں ظالموں کی مرضی کے حوالہ کردیں لیکن قانون اُن کی حمایت کرتا ہے۔ اُن کو سہارا دیتا ہے، اور اُنھیں اُن کے حقوق یاد دلاتا ہے۔ اور ظالموں کو تنبیہ کرتا ہے کہ اِن کی طرف آنکھ بھر کر بھی نہ دیکھنا۔ اسلئے قانون انسان کی اخلاقی فطرت کی تکمیل میں مدد دیتا ہے، اور سب لوگوں کو انسانیت کے احکام کی اطاعت پر مجبور کرتا ہے۔

کسی ناجائز کام کے ارتکاب سے انسان کو تین قسم کی تکالیف برداشت کرنی پڑتی ہیں۔ مذہبی[1] اخلاقی[2] اور جسمانی[3]۔ مذہبی تکالیف کا اِنحصار کسی مذہب پر یقین رکھنے اور معصیت پر سزا ملنے کے اعتقاد پر منحصر ہے۔ اخلاقی تکالیف طرح طرح کی ہوتی ہیں پشیمانی، غم، افسوس، شرم، وغیرہ جسمانی تکالیف بیماری، موت وغیرہ ہیں۔ قانون جو سزائیں دیتا ہے وہ جسمانی ہوتی ہیں، لیکن اُن کا اثر رُوحانی قُوٰی پر بھی پڑتا ہے:۔ انسان اپنے اعضا کا استعمال خاطر خواہ نہیں کرسکتا۔ اور جن جسمانی کاموں میں لذّت و فرحت حاصل ہوتی ہے اُن سے بالکل روک دیا جاتا ہے، اپنی جائداد اور املاک سے محروم ہوجاتا ہے اُسکی حقوق چھن جاتے ہیں، اُسکی آزادی سٹ جاتی ہے، اور وہ ہمیشہ کے لئے یا کچھ عرصے کیلئے ابنا جنس کی سوسائٹی سے علٰحدہ کردیا جاتا ہے جو اُسکی روحانی تکلیف کا باعث ہوتا ہے اور جو ذلت کہ اُس کو قانونی سزا میں سہنی پڑتی ہے وہ اُسے غم، غصّہ اور شرم میں مبتلا کرتی ہے۔ قانونی سزا انسان کی مذہبی اور اخلاقی سزا کو کم نہیں کرتی، بلکہ اُس کے اثر کو اور تیز کردیتی ہے۔ غرض تمام سزاؤں کی بُنیاد خوف پ

ہے، اور قانون اِس خوف کو زیادہ کرتا اور پھیلاتا ہے۔

انسان بہت سے کام صرف اِس خوف سے کرتا ہے یا بہت سے کاموں سے صرف اِس سبب سے پرہیز کرتا ہے کہ اُن کے ترک یا ارتکاب سے کسی تکلیف کے سہنے کا خوف ہوتا ہے۔ خوف کے اثر میں اسقدر جلدی تغیر نہیں آتا جیسا کہ دوسرے جذبات میں آتا ہے، بلکہ خوف کا اثر اِسقدر قوی ہوتا ہے کہ جہاں کہیں نتیجہ مشتبہ یا اُس میں کسی قسم کی بھلائی کی اُمید بھی ہو تو بھی کسی بُرائی یا تکلیف کا شُبہ انسان کو محتاط رکھتا ہے۔ بلکہ مُلک کا قانون اخلاق کے قانون کا ضمیمہ یا اُسکی شرح ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اخلاقی قانون تمام بنی نوع انسان کے لئے یکساں ہے لیکن مُلک کا قانون بلحاظِ مصلحتِ مُلک و معاشرت فروعی اُمور میں مختلف ہوتا ہے۔

مُلک کے قانون کے خلاف کرنے میں جرمانہ، قید، موت وغیرہ سزاؤں کی دھمکی ضرور ہے، ورنہ مُلک کے قانون کا اثر بالکل زائل ہوجاتا ہے اور کسی کو اُسپر کاربند ہونے کی پروا نہیں رہتی۔ اخلاق کے قانون کی یہ حالت نہیں وہ بے اختیار شرم، غصہ، رنج، ندامت اور اکثر بیماری کی سزائیں دیتا ہے۔ اخلاق کے خلاف کرنے کی خاصیت ہی یہ ہے کہ انسان اُس کی سزا بھگتے۔ مُلک کا قانون طبعًا یہ کیفیت پیدا نہیں کرسکتا۔ اسلئے جسمانی سزاؤں سے کام نکالتا ہے۔ انسان کا بنایا ہوا قانون اُسکے اپنے رویہ کی دُرستی کا ایک ضابطہ ہے اور انسان کا رویہ یا اُس کے اعمال اُس کمال کا زینہ ہیں جس تک پہونچنے کی اُسکو خواہش ہے۔

حیدرآباد دکن۔ گوشہ محل۔
۱۹۔ اگست ۱۹۱۰ء

سجاد مرزا بیگ۔

# الفلسفۃ والاسلام

(سلسلے کیلئے دیکھو علیگڈھ منتھلی بابتہ ماہ مئی ۱۹۰۳ء)

**علمی انکشافات کی بُنیاد۔** پھر جب انسان نے قدم اور آگے بڑھایا، دُور دراز ملکوں کی سیر کی، قدرتی واقعات کے طبعی اسباب اور تاثیر ونکو دیکھا مثلاً- جوالا مُکھی پہاڑوں کی آتش فشانی، سمندروں کا جزر و مد زلزلوں کا آنا، زمین کا جا بجا سے شق ہونا، بادلوں کا گرجنا، بجلی کا چمکنا، گہرے خونی کُہر کا پڑنا، چاند سورج کا گہنانا، ستاروں کا ٹوٹنا، دہنک کا آسمان پر نمودار ہونا، نیز وہ انقلابات جو دوامًا اجرامِ سماوی و ارضی پر پیش آیا کرتے ہیں اور آیندہ کسی خوفناک حادثہ کی علّت ہوا کرتے ہیں، جنکو دیکھکر ایک بڑے عالمِ طبیعات اور فلاسفر کے دل پر بھی رُعب چھا جاتا ہے۔ تو انسان کو اِن تمام حوادثات کے ملاحظے سے نہایت ہی حیرت پیدا ہوئی اور حیرت کے ساتھ تعجب پیدا ہُوا۔ تب انسان کے مُنہ سے بے اختیار نکلا "دیکھو! دیکھو!! یہ کیا ہے؟ اسے یہ کیا ہے؟"۔ اِس تعجب نے انسان کو غور وفکر کرنیکی توجہ دلائی، اور علمی انکشافات کی جانب رہنمائی کی۔ اسی وجہ سے تعجب کو 'امّ العلوم' اور 'بنتُ الجہل' کا لقب دیا گیا ہے۔ اوّل تعجب جہل سے پیدا ہوتا ہے اور راخیر تعجب عبودیت کا ماخذ ہے۔ انسان کا پہلے پہلے التفات اُن ہی اُمور کی طرف ہُوا جو زیادہ تعجب انگیز تھے۔ افلاطون، ارسطو، اور پلوٹارک کہتے ہیں کہ تعجب ایک تاثیر فلسفی ہے اور حکیم بیکن اُسکو فلسفہ کی غایت بیان کرتا ہے۔ کولرج صاحب کہتے ہیں کہ فلسفہ تعجب سے شروع ہوتا ہے، اور تعجب ہی پر ختم ہوتا ہے۔ بلا شُبہ انسان کے اندرونی جذبات کو اُبھارنیوالی اور ملکۂ فطرت کو برانگیختہ کرنیوالی شے تعجب سے بڑھکر کوئی نہیں۔ یہ ہی وجہ تو ہے کہ انسان اپنے بدّو تحرّک (ابتدای آفرینش) سے علل ظواہر کی بحث وتلاش میں لگا رہتا ہے۔ وہ جس شے کو دیکھتا ہے اُسکی حقیقت دریافت کرنے کی کوشش کرتا ہے، جو حادثہ اُسکو پیش آتا ہے اُس کے سبب کی جستجو کرتا ہے، جسکو اصطلاح میں علّت کہتے ہیں، گو کہ وہ اپنی کم علمی یا نا واقفی یا کسی غیر مُسلّم اصول کے ذریعے سے یا کسی اعتقاد کی بنا پر کوئی ناقص ادھوری یا غلط محض علّت ہی فرض کیوں نہ کر لے مگر علّت

قرار دینے کا خیال کم و بیش ہر آدمی کے دل میں پیدا ہوتا ہے۔

انسان نے جب تعجب کی نگاہ سے خوفناک تغیرات و حوادث کو دیکھا اور اپنے کو چار د
سے عظیم الشان طاقتوں میں گھرا ہوا پایا، جن سے نکلنے کی کوئی راہ اُسکے ہاتھ نہ آئی، نہ اُن پر اور
حاصل کرنے اور قابو پانے کا کوئی ذریعہ اُسکو دستیاب ہوا تو خواہ مخواہ اُسکا خیال ایک ایسی
سے تعلق پیدا کرنے طرف گیا جو اُن سب سے زیادہ طاقتور ہو تاکہ جب کبھی کوئی مشکل اُسکو پیش
اور کسی مصیبت کا سامنا ہو تو وہ اُس ذات سے توسل پکڑے اور اُسکو اطمینان و جمعیت حاصل ہو۔
خیال نے اُسکی ہمت کو بلند، اُسکے دل کو قوی کر دیا، تب وہ مارے خوشی کے جامے میں پھولا
اور اُسنے خوشی خوشی اُسکی شکرگزاریوں کے یوں گیت گائے۔ "او او !! ارے او !! او و
ہی !! ارے وہ جو ہمیشہ رہیگا !! میرا شکر لے !! اُس انجان جانب کار نے میرا شکر لیا۔ اب ہم
اُسکی برکت کے پھل پھول ہیں"۔ ایک مصنف کا نہایت سچا قول ہے کہ آدمی خلقۃً اپنے خالق او
الاسباب کی معرفت حاصل کرنے پر مجبول کیا گیا ہے۔ پس اگر وہ اپنے معبود حقیقی سے بے خبر رہیگا
مجازی معبود اپنے لئے تلاش کریگا۔ حضرت ابراہیم پیغمبر کے اُس قصّے پر نظر کرنے سے، جو قر
میں مروی ہی، اس قول کی وضاحت ہوتی ہے۔ اُس قصّے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ انسان کا
اوّل اوّل الٰہیات کیطرف کیونکر میل ہوا۔ ستارہ پرستی اور بت پرستی کی اصلیت کا بھی پتہ چلتا ہے۔

**ابراہیم پیغمبر کا قصّہ قرآن میں۔** ابراہیم نے جب اندھیری رات میں چمکتا تارہ دیکھا تو کہا یہ ہے میرا
جب وہ نظر سے چھپ گیا تو کہا میں دوست نہیں رکھتا نظر سے غائب ہونیوالوں کو۔ پھر جب چاند
ہوا دیکھا تو کہا یہ ہے میرا پروردگار۔ پھر جب وہ ڈوب گیا تو کہا بیشک میں غلطی پر تھا، اگر میرے
کی مدد میرے ساتھ نہوتی تو میں گمراہ ہو گیا ہوتا۔ پھر جب سورج چمکتا ہوا نظر آیا تو کہا کہ یہ ہے
پروردگار۔ یہ ہے سب سے بڑا۔ پھر جب وہ غروب ہو گیا تو کہا یہ بھی وہ نہیں۔ اے میری قوم
بیشک بیزار ہوں اُس سے جسکو تم معبود ٹہراتے ہو"۔ اس قصّے میں انسان کی اصلی فطرت کی
علوم عقلی کی طرف طبعی رغبت اور علت پیدا کرنیکا خیال بخوبی ثابت ہوتا ہے۔

اصل یہ ہے کہ دُنیا میں جتنی چیزیں ہیں اُنکی فی ذاتہ ایک حقیقت و ماہیت ہے اور انسان کو اُن چیزوں کی حقیقت و ماہیت دریافت کرنے کو بطور آلہ کے ایک قوت اور جوہر نورانی عطا کیا گیا ہے، جسکا نام عقل ہے، جب بذریعہ عقل کے کوئی حقیقت منکشف ہوجائے اور دل و دماغ میں سما جائے اُسیکا نام فلسفہ ہے، جو چیزیں کہ در اصل کوئی حقیقت و ماہیت رکھتی ہیں، اُن میں بہت ایسی ہیں جنکے چہرے سے علم نے پردہ اُٹھا دیا ہے، اور بہت چیزیں ایسی بھی ہیں، جو ہنوز علم کے دسترس سے باہر ہیں۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کوئی شے جو فی الحقیقت ایک اصلیت و ماہیت رکھتی ہو، عقل انسانی سے باہر نہیں، یہ ممکن ہے کہ عقل سے بالاتر ہو۔ بہت سے نظام قدرت ایسے ہیں، جنکو انسان نے اپنے کثیر تجربے، بالتکرر مشاہدہ اور وسیع معلومات سے دریافت کرلیا ہے اور بہت سے رموزِ فطرت ایسے ہیں جو ہنوز انسان کی معلومات سے مُستتر ہیں جنکو علم قانون قدرت کے مطابق وقت دون وقت زمان بعد زمان کھولتا رہیگا۔ امام ہمام ابو حامد محمدُ الغزالیؒ نے کیا خوب بات کہی ہے کہ ھوالذی۔ استعد بہ لقبول العلوم النظریۃ وتدبیر الصّناعات الخفیۃ الفکریۃ۔ جس صفت سے کہ انسان انسان ہوسکتا ہے وہ ایک استعداد ہے علوم نظریہ کے قبول کرنے اور پوشیدہ صنعتوں کی تدبیر پیدا کرنیکی اسی استعداد کا نام عقل ہے۔ جو لوگ خدا کی دی ہوئی قوتوں کو کام میں لائے اور اُن کو معطل نہیں چھوڑا اُنسے اِنکشافات وحقائق کی روشنی پھیلی اور اپنے مقاصدِ اعلیٰ سے متمتع ہوئے اور جن لوگوں نے اُن قوتوں کی حقِّ قدرِہ قدر نہ پہچانی اور اپنی معلومات پر بھروسہ کرکے اُن ہی تمام چیزوں کو، (جو منکشف ہوچکی ہیں اور عمدہ نتائج عقلِ انسان میں سے ہیں) کامل سمجھ لیا اور اُن ہی پر قصر کیا وہ اپنی غلطی سے تنزّل اور ادبار کے عمق میں جا پڑے۔ کیونکہ کسی شی پر بھروسہ کرلینے سے اِستغنا پیدا ہوتا ہے اور استغنا سے قوتِ عملیہ بیکار و ضائع ہوجاتی ہے۔ چونکہ یہ قوتیں انسان میں فطرتی ہیں اور کشفِ حقائق کا مادہ انسان کی سرشت میں رکھا گیا ہے اِسلئے ہر انسان کا طبعًا میلِ خاطر اُسکی طرف پایا جاتا ہے، اِسی میلانِ طبعی کے لحاظ سے بعض اقوام وملل کی تقسیم بھی کیگئی ہے۔

جن قوموں نے فلسفہ میں مابہ الامتیاز حصّہ لیا ہے، اُن میں مشہور سُریانی، فینقی، مصری، فارسی

ہندی، چینی، یونانی، رومی، عربی قومیں ہیں۔ حاجی خلیفہ قسطنطینی متوفی ۱۰۶۷ھ ہجری نے کشف الظنون عن اسامی الکتب والفنون میں لکھا ہے۔ اعلم انہم باعتبار العلم والصناعۃ قسمان، قسمٌ اعتنیٰ بالعلم فظہرت منہم ضروب المعارف فہم صفوۃ اللہ تعالیٰ من خلقتہ وفرقۃ لم تعتن بالعلم عنایۃ یستحق بہا اسمہ (فالاولی) امم منہم اہل مصر والروم والھند والفرس والکلدانیون والیونانیون والعرب والعبرانیون (والثانیۃ) بقیۃ الامم لکن لا نبہ منہم الصین والترک یعنی تمام آدمی باعتبار علم وصناعت کے دو قسم پر ہیں، ایک تو وہ جنھوں نے علم کیطرف توجہ کی اور اُن سے طرح طرح کے معارف ظہور میں آئے۔ یہ لوگ برگزیدۂ خلقِ خدا ہیں، دوسرے وہ لوگ جنھوں نے علوم کیطرف ایسا اعتنا نہیں کیا کہ وہ اُن علوم کے ساتھ نامزد کئے جاتے۔ پہلی قسم چندگروہ ہیں جنھیں اہل مصر، اہل روم، اہل ہند، اہل فارس، اہل کلدان، اہل یونان اور عرب وعبرانی لوگ ہیں۔ دوسری قسم میں باقی اور قومیں اور اُمتیں داخل ہیں، اُن سب میں چین وتُرک زیرک وہوشیار ہیں۔ ملل ونحل میں اسطرح پر ہے کہ ان الکبار الامم اربعۃ العرب والعجم والروم والھند ثم ان العرب والھند یتقاربان علی مذھب واحد واکثر میلھم الی تقریر خواص الاشیاء والحکم باحکام الماھیات والحقائق واستعمال الامور الروحانیۃ والعجم والروم یتقاربان علی مذھب واحد واکثر میلھم الی تقریر طباع الاشیاء والحکم باحکام الکیفیات والکمیات واستعمال الامور الجسمانیات (ترجمہ) چار گروہ بڑے ہیں، عرب، عجم، روم، ہند، ان میں سے عرب وہند تو قریب قریب ایک مذہب پر ہیں۔ اُنکا میلانِ خاطر اکثر خواص اشیاء کو ثابت کرنے اور احکامِ ماہیت وحقائق پر حکم لگانے اور امورِ روحانیہ کو عمل میں لانے کیطرف ہے اور عجم وروم یہ دونوں قریب قریب ایک مسلک پر ہیں، ان کا میلانِ طبعی اکثر طبائع اشیاء کے بیان کرنے اور احکامِ کیفیات وکمیات پر حکم لگانے اور امورِ جسمانی کو استعمال کرنے کیطرف ہے"۔ بہرحال ان تمام قوموں میں جو اقوام زیادہ قدیم ہیں، اُن کی فلسفی تحقیقاتیں اِستدادِ زمانہ سے اور نیز اِس وجہ سے کہ وہ کامل طور پر ضبطِ کتابت میں نہیں آچکی تھیں، کالعدم ہوگئیں۔ اور جو کچھ باقی رہ بھی

گئی ہیں وہ چنداں قابلِ اعتنا نہیں، تاہم جو کچھ بطورِ اختصار بیان کرنیکے قابل ہیں اُنکا ذکر اسموقع پر لطف سے خالی نہوگا
قومِ سُریانی| قدیم اقوام سے ایک قوم سُریانی ہے جنکو کلدانی یا بابلی کے لفظ سے بھی پکارتے ہیں، کیونکہ
یہ سب قومیں قریب قریب تھیں اور ایک دوسرے میں شامل ہوگئی تھیں، اِس قوم کا ملک دریای
دجلہ اور فُرات کے مابین واقع ہے، قدیم زمانے میں اس قوم کی سلطنت اُس مُلک میں تھی، جسکو اب میسو
پوٹیمیا کہتے ہیں۔ شہر نینوا (جو نہر فرات کے کنارے پر آباد تھا) اور بابل جو ساحل نہر دجلہ پر واقع تھا۔)
یہ دونوں شہر وہاں کے اعظم مدن میں شمار کئے جاتے تھے۔ اِن کے رہنے والے کچھ زمانہ گذرنے
کے بعد مِل جُل کر ایک اُمت ہوگئے۔ اور دو مختلف ناموں کا ایک مسمّٰے واحد پر اطلاق ہونے لگا
اِس قوم کے سلاطین جو بعد طوفان ہوئے نمارِدہ کے لقب سے پکارے جاتے تھے یہ جمع ہے نمرود کی،
بخت نصر بھی اِسی قوم سے تھا۔ یہ لوگ اپنے حال پر قائم رہے یہانتک کہ اہلِ فارس اُنپر غالب ہوئے
اور اُنکی مملکت پر اُنھوں نے اپنا تسلُّط کیا۔ زمانہ سابق میں جسکی تاریخ مجہول ہے، اِس قوم میں صنائع
اور فنون بڑی عظمت کے ساتھ قائم تھے۔ اُن میں ایسے علما اور حکما بھی تھے جنکی وسعتِ علمی ہر فن پر حاوی تھی
بعض کا قول ہے کہ پہلا مؤلف جو اس قوم میں گذرا وہ زردوا ستر ہے جسکا ذکر قدلیس
الیناتیوس نے بھی کیا ہے، وہ لکھتا ہے کہ یہ شخص زمانہ نمرود میں تھا۔ پھر حکیم بیلوس معلم
فلک۔ اُسکا زمانہ ظہور سنہ ۲۲۳۱ ق م میں تھا اُسنے دورہ کواکب پر غور و تامل کرکے ایک کتاب علم الفلک
میں دقیق مضمون کی سہل ممتنع طریقے پر لکھی تھی، اُسکی عظمت و جلالت ایسی دلوں پر بیٹھی ہوئی تھی کہ مرنے
کے بعد اُسکو معبودیت کا درجہ عطا کیا گیا۔ اُس کے بعد بیدا روس مشہور ہوا یہ شخص عہدِ بطلیموس فیلادلف
ملکِ مصر سنہ ۲۸۳ ق م میں ہوا۔ یہ پہلا شخص ہے جسنے کلدانی علوم کو یونان کیطرف منتقل کیا۔ اہل
اثینہ (ایتھنز) نے اِس قابلِ قدر خدمت کے معاوضہ میں اُسکے مجسمہ کو (جو سنگِ مرمر کا بنا ہوا تھا)
طلاے خالص کا خلعت پہنایا۔ ابرحسن اور اصطفن بھی مشہور علما میں گذرے ہیں، اس قوم کو
رصد کواکب کیطرف بڑا اعتنا تھا، خواص و احکام ثابت کرنے میں بلیغ اہتمام رکھتے تھے۔ بہت سی
صورتیں اور طریقے کواکب کے قوٰی حاصل کرنے کے اور ان کی طبیعت ظاہر کرنے کے اقسام طرح کی نذر و نیاز

کے ساتھ اُن میں جاری تھے۔ کواکب کے لئے اُنھوں نے مزاول ایجاد کئے تھے اُن سے بہت کچھ عجیب وغریب افعال مثل طلسمات وغیرہ کے ظہور میں آئے۔ بطلیموس نے کتاب مجسطی میں اُن کے مذاہب نقل کئے ہیں۔ آخر میں وہ باہم اُن علوم وصناعات پر تفاخر تزئین کرنے لگے۔ تکلفات کی رسمیں اُن میں بکثرت پھیل گئیں۔ قیدوس کے عہد میں (جو بابل کا بادشاہ تھا) فسق وفجور کا اُن میں زور ہوگیا۔ اُنکی عورتوں کی عفت، اُن کے رجال کی حیا سب معدوم ہوگئی۔ لغو وبیہودہ باتوں نے اُن کے عقائد میں راہ پائی۔ تمام علوم خرافات کے قالب میں مستحیل ہوگئے۔ حوادثاتِ مستقبلہ کو رصد کواکب سے دریافت کرنے لگے۔ اُسکا نام علم التنجیم رکھا۔ ستارہ پرستی عام طور پر ہونے لگی، جسطرح ایک زمانے میں اُن کے کارنامے علوم وفنون کی روشنی سے چمکتے نظر آتے تھے، اُسیطرح اب اُن کی تالیفات دُور از کار ردّیوں کا ڈھیر دکھلائی دینے لگیں۔ مثل تالیف باطلہ مزمعات وتفسیر احلام وسحر وغیرہ سحر وساحری کا چرچا اُن میں ایسا بڑھا کہ اُن کے مُلک کو سحر سے نسبت دینے لگے۔ اور وہ بابل السحر کے نام سے مشہور ہوگیا۔ سحر بابل کا مشہور لفظ بھی اُسی حالت کا عکس ہے۔

اُن کے معبودوں کی تعداد بارہ[12] تک پہونچ گئی تھی، اُن کے نام یہ ہیں۔ الق[1]، ایا[2]، اوربیل[3]، سن[4]، رمان[5]، شماش[6]، استر[7]، نرگال[8]، نندار[9]، نیبو[10]، مرودلت[11]، بیلیت[12]۔

وہ ارواحِ خبیثہ کو بھی مانتے تھے اور اُن سے محفوظ رہنے کی تدبیریں کیا کرتے تھے۔ ارواحِ طیبہ سے توسّل چاہا کرتے تھے اور اُن سے اعانت کے طالب ہا کرتے تھے۔ بہت قسم کے اُن میں منتر پڑھے جاتے تھے۔ چھوٹے چھوٹے پتھروں یا دھات کی تختیوں پر منتر لکھکر گلے میں لٹکاتے تھے۔ یا بازو پر باندھا کرتے تھے۔ بیماریوں کو وہ ارواحِ خبیثہ سے تعبیر کرتے تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ وہ ارواحِ خبیثہ انسان کے بدن میں سرایت کرجاتی ہیں، اُنکا علاج منتروں اور گنڈوں سے کیا کرتے تھے۔ دیواروں اور دروازوں پر اُن کی خوفناک تصویریں اور مورتیں بنایا کرتے تھے۔ تاکہ وہ اپنی ڈراؤنی صورتیں دیکھکر بھاگ جائیں۔ ہمارے زمانے میں بھی ایسی مورتیں نکلی ہیں، جو برٹش کے (میوزیم) عجائب خانہ میں دھری ہیں۔ اُن میں سے ایک مورت کی پُشت پر یہ کندہ ہے کہ۔

"یہ جنوب مغربی ہوا کی دیوی ہے کسی کھڑکی یا دروازے پر اسکو لٹکا دینا چاہیے"

کتاب الفہرس میں لکھا ہے کہ زبانِ نبطی سریانی سے زیادہ فصیح ہے، اہلِ بابل اسی زبان میں بات چیت کیا کرتے تھے، لیکن جس نبطی زبان کو دیہاتی لوگ بولتے تھے، وہ غیر فصیح تھی، بعض کہتے ہیں کہ جو زبان کتبِ فصیحہ میں مروج تھی، وہ اہلِ سوریا اور حرّان کی زبان تھی اور زیادہ فصیح یہ ہی تھی۔ سریانیوں میں تین قسم کے خطوں کا رواج تھا۔ اُن خطوں کے حروفِ ہجا میں کچھ یوں ہی سا فرق تھا ثاء مثلثہ، ذال، ضاد، ظاء، اور غین، حروفِ منقوطہ میں سے اور غیر منقوطہ میں سے صرف الف لام ساقط تھا۔ حروف کی ترتیب اُن کے یہاں داہنی طرف سے چپ کی جانب تھی

قوم فنیقی۔ دوسری قوم جسنے فلسفہ میں اشتغال کیا، فنیقی کے نام سے مشہور ہے انھیں کو صورمن بھی کہتے ہیں۔ اِن کے بلادِ مسکونہ یہ ہیں۔ صور، صیدا، بیروت، جبیل، طرابلس ارواد۔ یہ لوگ سواحلِ بحرِ ابیض شامی پر بستے تھے۔ چونکہ یہ مقامات پیداوار کیواسطے مناسب نہ تھے نہ وہاں زندگی کی عام ضرورتیں بہم پہونچ سکتی تھیں اسوجہ سے مضطربانہ اُن کو تعلیم و صنائع کیطرف توجہ کرنا پڑی۔ اُنکا اضطراب ہی اُن کی تعلیمات کا بڑا ذریعہ بنگیا۔ امورِ اتفاقیہ کے ظہور اور تجارت اور تفکرات کے وقوع نے اُن کو بہت فائدہ بخشا اور وہ دفعتًہ منافعِ کثیرہ، معارفِ جلیلہ کے مالک و گنجور بنگئے۔ قدرت نے گویا اُن کی ترقی کے پہلے سے اسباب مہیا کر رکھے تھے، اُنکا ملک جس میں وہ رہتے تھے، ایک قدرتی بندرگاہ تھا، تجارتی ہوائیں جو اُس مُلک سے ہوکر گذرتی تھیں، اُن کو خوابِ غفلت میں پاکر ہر وقت مُنہ پر چھینٹے مارا کرتی تھیں۔

یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ترقی کی ابتدا بیشتر اقوام میں اوّلاً دریاؤں کے اُن وادیوں سے شروع ہوئی ہے، جہاں انسانی محنت کے مختلف ذرائع اور اُس کے عمدہ ثمرات مہیا کئے جاسکتے تھے خصوصًا جبکہ وہ سرزمین مستقل آبادیوں اور مختلف کاروبار کے اجرا کے لئے موزوں بھی ہوتی تھی تو وہاں کے باشندے کسی نہ کسی قسم کی علمی یا صنعتی ترقی کر جاتے تھے چنانچہ ایسے بستے شواہد ہم تاریخِ قدیم میں پاتے ہیں۔ دوآبہ دجلہ و فرات، سواحلِ بحرِ ابیض شامی و بحرِ زرد، اسیطرح دریاے نیل مصر میں۔

سندھ پنجاب میں، دریای یانگ تسی کانگ وہوانگ ہو وغیرہ چین میں اسکی شہادت دے رہے ہیں
بحری سفروں سے انسان کی تحقیقات میں بڑے بڑے اضافے ہوئے ہیں۔ صدہا قسم کے مقاصد
کی تکمیل اور اکتشافات و معلومات کی تحت وتحقیق اُن سے ظہور میں آئی۔ علم و شائستگی کے نایاب جواہر اور
سنامات و فنون کے دُرہائے شاہوار اِن ہی بحری سفروں کی بدولت نوعِ بنی آدم کے دامن میں
پہونچے۔ البتہ وہ قومیں جن کے ملکوں کو ایسا موقع حاصل نہ تھا، ہرچند کہ وہ ساحلوں پر آباد تھیں ان فوائد
سے محروم رہیں۔

اہلِ فینشیا یعنی فنیقیون کو اُن ہی کے ملک کی سرزمین نے (جو ہر طرح اغراض مذکورہ کے حاصل
کرنے کے لئے موزوں اور مناسب تھی) اُبھارا۔ ابتداءً اُنھوں نے جبل لبنان کی جھاڑیوں سے
لکڑی کاٹ کر کشتیاں تیار کیں، پھر اُن پر تجارتی اسباب لاد کر دُور و دراز ملکوں سے لانے اور لیجانے
لگے بہت سے قبائل اُن میں کے قبرس، رہوڈس، بلاد یونان جزیرۂ صقلیہ (سسلی) سردانیا
اور بلاد اندلس بلکہ بحرِ محیط مغربی تک پہونچے، اور وہاں پر اپنے تجارتی تعلقات قائم کئے، اُن کی
تجارت کا بڑا مرکز شہر فارس تھا۔ اُن کے تجارتی بیڑہ جہازات حوالی افریقہ میں گشت لگایا کرتے
تھے۔ قدیم اقوام میں اہلِ فینشیا جہازرانی کے بڑے ماہر اور محقق تھے۔

اُن کی تاریخ چار دَوروں پر منقسم ہے۔ پہلا دَور اُس وقت سے شمار کیا جاتا ہے، جبکہ نسلِ حام
وسام کے قبائل بلادِ مذکور میں وقتاً فوقتاً آکر آباد ہوئے، اور اُن میں نظم و نسق کی باقاعدہ رفتار شروع
ہوئی۔ اُن کا ملک یعنی صیداء تمام دُنیا کے ملکوں پر شہرت میں سبقت لیگیا۔ یہ واقعہ حضرت
مسیحؑ سے ڈیڑھ ہزار برس قبل کا ہے۔ دوسرا دَور اُس وقت سے چلا جبکہ مدینہ صور نے مثل ملک
صیداء کے شہرت حاصل کی، یہ زمانہ ملک سلیمانؑ کا تھا۔ اِسی دَور میں اہلِ فینشیا اوجِ عظمت پر
پہونچے، اور اُن کی طلائی و نقرئی مصنوعات نے اطرافِ عالم میں رواج پایا۔ تیسرا دَور اواسط قرن ثامن
ق م سے مُراد ہے جبکہ مدینہ صور کی اوج موج ایک وسیع ترقی کر گئی تھی۔ شلمناصر ملک آشور کی
مشہور لڑائی اسی زمانہ کا واقعہ ہے۔ اس آٹھویں قرن میں بہت سے اہلِ فینشیا نے ممالکِ مختلفہ کیطرف

ہجرت کی اور جزائر بحر روم کے کناروں پر جو ایشیا، یورپ اور افریقہ کے متصل پھیلتے ہوئے چلے گئے ہیں آباد ہوئے، وہاں انھوں نے بستیاں بسائیں، قلعے تیار کئے، تجارت کے ذریعے سے ہندوستان اور ممالک برطانیہ تک اپنے جہاز پہونچائے۔ چوتھے دَور پر اُن کے تمام کمالات وصناعات کا خاتمہ ہوگیا۔

ہیومر جو تقریباً حضرت مسیحؑ سے ایک ہزار برس قبل گذرا ہے، کہتا ہے کہ وہ مشہور جہاز راں اہل فنیشیا ہی تھے، جو اپنے جہاز بلاخوف وخطر سمندر کی مہیب موجوں میں ڈال دیتے تھے۔ بحر رُوم کے تمام جزائر اور کناروں پر اُن کے تجارتی تعلقات موجود تھے، اُن کے جہاز تارشش تک۔ (جو ملک اسپین میں ہے) جاتے اور اسپین کی کانوں سے جو سونا نکلا کرتا تھا، اُس کو جہاز میں بھر کر مشرق کو لیجاتے تھے۔ ٹائر کے جہازات ساحل برطانیہ تک پہرا کرتے تھے۔ اور کارنوال کی معدنوں سے ٹین لیکر واپس آتے تھے۔

ٹائر نے جو خوبصورت بڑا استناع تھا حضرت سلیمانؑ کیواسطے (جبکہ وہ بیت المقدس کی تعمیر میں مصروف تھے) دو ستون کانسے کے سنگ تراشکر تیار کئے تھے۔ علاوہ اُن کے مختلف نقش ونگار کی چلمچیاں، ظروف گلی، طشت، کرچھے وغیرہ اُس معبد کی آرایش کیواسطے روانہ کئے تھے، یہ سب اُسکی دستکاری اور صناعت کے نمونے تھے۔ ٹائر کو سونے، چاندی، پیتل، لوہے، لکڑی کے کام میں مہارت تھی۔ نیلا، ارغوانی، قرمزی رنگ رنگنا خوب جانتا تھا۔

فنیقیین کو سلسلۂ تجارت ہی نے علوم وصناعات کی کُنجی ہاتھ میں دیدی تھی۔ فن رنگ آمیزی اور علم موسیقی کے وہ ماہر تھے۔ ٹائر کے ارغوانی رنگ سے (جو مچھلی کے خون سے تیار کیا جاتا تھا) سلاطین کی پوشاکیں رنگی جاتی تھیں، اُن کی تمام ایجادات سے بڑھکر عجیب وغریب جو شے تسلیم کیجا سکتی تھی، وہ حروفِ ہجا کا اختراع ہے، جس سے اہل مصر ناواقف تھے۔ قدیم اقوام میں تحریر مختلف صورتوں کے پیرایہ میں ہوا کرتی تھی یعنی بجای حروف کے وہ تصویروں کا استعمال کیا کرتے تھے۔ اب بھی بعض قوموں میں تصویری کتابت ایک ناتراشیدہ وضع میں پائی جاتی ہے۔ اہل فنیشیا نے تصویروں یا آوازوں کے بجائے حروف کا استعمال کیا اور ان کی ایک محدود ترتیب قرار دی۔ پھر اُن سے یونانیوں نے

یہ حروفِ ہجا اخذ کیئے۔ اور اُن حروفِ ہجا سے حروفِ لاطینی (لیٹن) نکالے گیٔے۔ یہ وُہی حروف ہیں جنپر آجکل یورپ کی خط وکتابت کا دار ومدار ہی۔ اہل فنیشیا کی اس ایجاد کی جسقدر عزت کیجائے وہ کم ہی کیونکہ حروفِ ہجا کی ایجاد نے دُنیا کی ترقی اور انسانی مفہومات میں جان ڈالدی بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ حیاتِ جاوداں بخشی، کتابیں لکھنے کا سلسلہ جاری ہوا۔ کتب خانے سجائے گئے۔ علم نے مُستقل زندگی حاصل کی۔

سُریانی قوم کیطرح اہل فنیشیا بھی مختلف قسم کے بتوں کی پرستش کیا کرتے تھے اُنکی دیانت کا حال بالکل تاریکی میں پڑا ہُوا ہی۔ اور کوئی کتاب مذہبی اُنکی مثل اُستا وژند وغیرہ کے ہمارے پاس موجود نہیں ہی۔ البتہ کچھ کچھ حالات بعض کتبِ قدیمہ اور توراتِ مقدس سے بطور اشارۃ النص کے مُستنبط ہوتے ہیں یا اُن آثار سے جو ممالکِ قدیم مثل صور، صیداء، قرطجنتہ میں پائے جاتے ہیں، کچھ کچھ اُنکی دیانت کا پتہ لگتا ہی بہرتقدیر اس قوم کے اصنام کی تعداد بیس تک بیان کیجاتی ہی۔ اُن کے نام یہ ہیں بعل، عشتورث، ملاث، کرث، صولك، ادوني، راحون، اشمون، هداد، ایل، عليون، بعلتي، انکا۔ شمس، صديق، كبيري۔ یہ وہ اصنام ہیں، جنکو وہ معبودِ وطنی خیال کرتے تھے۔ باقی اصنام کو معبودِ غربت کہکر پکارتے تھے اور حالتِ سیر وسیاحت میں اُنسے توسّل پکڑتے تھے، اُن کے نام یہ ہیں۔ تانیث، اموت، اوزیر۔

یہ تمام اسماءِ صرف متعدد اصنام کے ساتھ مخصوص نہ تھے، بلکہ بعض ناموں کا اطلاق اختلافِ صفات کی حیثیت سے آلہٰ واحد پر کیا جاتا تھا۔ اسماء مذکور کے معنی پر غور کرنے سے بھی اِسکی صداقت ہوتی ہے مثلاً بعل۔ اِسکے معنی ہیں یعنی پالنے والا یا سیّد یعنی سردار۔ اس نام کے چند بُت ممالکِ مختلفہ میں تھے۔ اور اُنھیں ملکوں کے نام کے ساتھ مشہور تھے۔ بعل صور، بعل صیدون، جسکو صیداء کہتے ہیں، بعل طرس، جسکو طرسوس کہتے ہیں، بعل زبوب، یعنی سیّد الذباب بعل رمین یعنی سیّد السّماء وغیرہ۔

اِسی قبیل سے ہیں نسل سام کے قبائل یہ سب نام ذات واحد حیّ الازلی واجب الوجود پر بولا کرتے تھے۔ بعد میں جب اُن کے عقائد فاسد ہوگئے تو اُنھوں نے اس نام کے بتوں کی

پرستش شروع کی۔ پہلے سے وہ عابدینِ اصنام تھے، نہ انھوں نے اوثان خود کبھی بنائے۔ شعائرِ دین میں وہ نماز، تسبیح اور ذبائح کے پابند تھے، اُن کے ذبائح بیشتر حیوانات سے تعلق رکھتے تھے، شراب و بخور کرنیکے عادی تھے۔ اعتدال ربیعی کے خوشگوار موسم میں وہ عید کے جشن منعقد کیا کرتے تھے

(باقی آیندہ)

صفی الدولہ حسام الملک نواب سید علی حسن خاں بہادر۔

# ایک برہمی افسانہ

ہمکو خوشی ہے کہ اہل برما بھی ہمارے مخزن کیطرف توجہ رکھتے ہیں اور اُردو زبان مثل دیگر حصص ہندوستان کے برما پر بھی اپنا قبضہ کرتی جاتی ہے۔ اڈیٹر مخزن کو اب اس حصّہ ملک کو بھی اپنے نقشے میں شامل کرلینا چاہیے۔ حال میں ہمارے پاس ایک مضمون مانڈلے سے مخزن میں شائع ہونے کیلئے آیا ہے، جو ہم ذیل میں ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں، ہر ملک کے پرانے افسانے اکثر دلچسپ ہوتے ہیں، اور اُن سے ملک کی پرانی تاریخ پر بہت کچھ روشنی پڑتی ہے۔ ہمکو امید ہے کہ آیندہ بھی برما کے متعلق مضامین مخزن میں چھپینگے، جنکو ہمارے ناظرین دلچسپی سے پڑھینگے اور برما کے متعلق اُن کی معلومات میں ترقی ہوگی۔ آنریری منیجر

شمالی برما کے دار الحکومت مانڈلے کے پرگنہ ٹونگ بیونگ کا موضع، منتانی ٹونگ کے مندر کیوجہ سے خاص شہرت اور دلچسپی رکھتا ہے، یہ مقام معمولی اوقات میں قرب و جوار کے ساکنین کا معبد ہوجاتا ہے۔

زائرین کے نذر و نیاز کے چڑھاوے سے ایک کثیر رقم جمع ہوجاتی ہے، جو بالآخر مناور کی تعمیر و قیام اور بُت سازی میں صرف ہوجاتی ہے، مذکورۂ بالا مناور میں ایک وقت میں آٹھ روز تک میلہ رہتا ہے، ان ایام میں سے چار دن صرف ناچ و پرجوش کسرت وغیرہ میں صرف کئے جاتے ہیں میلہ سال میں دو بار مارچ و اگست میں منعقد ہوتا ہے، اخیر میلے میں زیادہ دلچسپی اسلئے ہوتی ہے کہ یہ

"سُودَونگ بنِي" بت خانہ کے فوائد و "توام نت" کی اظہارِ عزت کی غرض سے کیا جاتا ہے۔

"توام نت" کی مورتیں دھات کی بنی ہیں، اور اُنپر زرّیں ملمع ہے، جس مقام پر یہ مورتیں نصب ہیں، اُسکو "نت نَن" محلِ ارواح کہتے ہیں۔

توام نت کے معنی ایک ساتھ پیدا ہوئے دیوتا کے ہیں۔ اِن دیوتاؤں کا ذکر برہمی تواریخ میں حسبِ ذیل ہے۔

ایک ہزار برس کا زمانہ گذرا، بادشاہ تہ تھون کے عہد میں ایک فقیر دریا میں غسل کرنے کے لئے گیا جب کہ وہ نہا رہا تھا، اُسنے ایک چوبی خوان پر دو لڑکوں کو بیٹھے ہوئے دیکھا، اور وہ خوان اُس کیطرف آرہا تھا، لڑکے بہ ظاہر ہندوستانی نسل سے معلوم ہوتے تھے، فقیر اُن بچوں کو اپنی خانقاہ میں لیگیا۔ اور اُن کا نام "بیات وِي" و "بیات تا" رکھا۔

فقیر نے بچوں کی اچھی طرح سے پرورش و پرداخت کی، اور جسقدر اُسکو علم تھا، سب اُن دونوں کو سکھلا دیا۔ وہ اکثر جنگل کو جاتا، اور اپنی ہمراہ اُن لڑکوں کو بھی لیجایا کرتا تھا، اِس آمد و رفت میں فقیر کو ایکمرتبہ "ویک زا" کی لاش پڑی ملی۔ "ویک زا" ایک جادوگر تھا، اور اُسکے کُل جسم پر سحر کے ٹیکے لگے ہوئے تھے، جنکے اثر سے وہ جب چاہتا، عام نظروں سے پوشیدہ ہوجاتا تھا، فقیر کے دل میں آئی کہ اگر میں اس لاش کو بھونکر کھا لونگا، تو مجھ میں بھی مافوق الفطرت قوتیں آجائینگی اور اس خیال سے اُسنے لڑکوں سے کہا کہ اس کو ہماری خانقاہ میں لیجاکر رکھو۔ فقیر جب گھوم کر واپس آیا، اُسکو معلوم ہوا کہ لڑکوں نے پہلے ہی اُس جسمِ مُردہ کو بھونکر چٹ کرلیا ہے، اور بچے شریر ملک الشیاطین بن گئے ہیں، فقیر کو سخت غصہ آیا، اور اُسنے اِس بات کی بادشاہِ وقت "تہ تھون" سے فریاد کی، شاہی عدالت سے دونوں کی گرفتاری کا حکمنامہ جاری ہوا، چنانچہ بڑا بھائی گرفتار ہو کر تیغ اجل کے نذر کردیا گیا، لیکن "بیات تا" موضع "پگان" کو بھاگ گیا اور وہاں بادشاہ "نورتھامن زو" کی حکومت میں ملازمت اختیار کرلی، اُسکو محل سرای شاہی میں پھولوں کے بہم پہونچانے کی خدمت دیگئی، اور (پَندوزت) سُلطانی مالی کے معزز لقب کے ساتھ ملقب کیا گیا، وہ پھولوں کی تلاش میں

موناکوہ پوپا کو چلاجاتا تھا جو دارالسلطنت سے ایک ہفتہ کی مسافت کے فاصلہ پر واقع تھا، لیکن وہ اپنے جادو کے زور سے اس بعید مسافت کو ایک ہی دن میں طے کرلیا کرتا، اس پہاڑ میں اُس سے ایک عفریت سے ملاقات ہوئی، جو ایک حسین عورت کے بھیس میں رہا کرتی تھی، دونوں میں سلسلۂ محبت قائم ہُوا اور کچھ دن بعد اُس کے بطن سے دو توام بچے پیدا ہوئے، جن کی وجہ سے اس کی کنیت "بیات تا" یعنی توام بچوں کا باپ" ہوگئی۔ بچوں کی ولادت کے سبب سے "بیات تا" اکثر اپنی منصبی خدمات کے ادا کرنے میں تساہل کرنے لگا، اور اس بات سے بادشاہ نے ناراض ہوکر اُسکے قتل کئے جانے کا حکم دیدیا، اس حکم دینے کی بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ بادشاہ اُس کی مافوق الفطرت قوتوں سے ہراساں ہو چلا تھا۔

مرنے کے پیشتر بیات تا نے بادشاہ سے التجا کی کہ حضور میرے بچوں کو لیلیویں، کیونکہ وہ بھی مثل اپنے باپ کے ملک الناصر ہونیوالے ہیں۔

"جادوگرنی" اس قتل کی واردات سے واقف ہو چکی تھی، اُسنے بچوں کو ایک ایک گھڑے میں رکھکر دریا میں بہا دیا، جو بہتا بہتا "پگان" میں آلگا، اور حسنِ اتفاق سے بادشاہ کو ملگیا۔

شاہ نے ان بچوں کا نام "شوی بین جی" اور "شوی بین نگے" رکھا، یہ دونوں بڑے ہوتے ہی محل بھر میں ہر دلعزیز ہوگئے، اور اپنے باپ کیطرح فوق الفطرت قوتوں کا اظہار کرنے لگے۔

برہمی سنہ کی تیسری صدی میں شاہ "نورہتا" نے چین پر فوجکشی کی، اس حملے سے اُسکا یہ مقصود تھا کہ گوتم بدہ کا دانت جو فغفور کے قبضے میں تبرکا تھا، اُس سے چھین لائے اور خود اُسکا محافظ بنے جب فغفور "اودیوا" کو اس حملہ کی خبر ہوئی تو اُسنے غنیم کے مقابلے کے لئے جادو کے نیزے اور تلواریں بھجوائیں، اور شہرپناہ کے گرد آگ اور پانی جمع کرادیا۔

بادشاہ نے "شوی بین جی" اور "شوی بین نگے" کو مقابلے کے لئے آمادہ کیا، یہ دونوں کل آفات پر غالب ہوتے فغفور کے آرامگاہ تک پہونچ گئے، اور اُس کے چہرے پر سوتے میں چونا مل دیا، اور دیواروں پر جابجا کچھ لکھ دیا، اور فغفور کے سر کے تین بال اُکھاڑ واپس چلے آئے۔

فغفور جب بیدار ہُوا، تو اپنی حالت دگرگوں دیکھکر سخت غضبناک ہُوا، لیکن دیوار پر تحریریں

کے دیکھنے سے وہ ششدر رہ گیا، اور گوتم کے دانت کو باضافہ زر وجواہرات وچند حسین سہیلیوں کے شاہ "نوزتھا" کے سپرد کردیا، اور آخرکار دونوں پادشاہوں میں صلح ہوگئی، بیان کیا جاتا ہے کہ گوتم کا دانت ابھی تک مانڈلے کے شاہی محل کے مشرقی دروازے کے مینار میں مدفون ہے، اِس فتح کی یادگار میں پادشاہ پگان نے موضع "تونگ بیونگ" میں "سود ونگ بئ" بتخانہ کی تعمیر کی بنیاد ڈالی، اسکے بنانے میں پادشاہ کی ہمراہی افواج کا ہر ممبر کام کرتا تھا۔

چونکہ فتح "شوی بین جی" اور "شوی بین نگے" کے ہاتھوں سے ہوئی تھی، اسلئے اہلِ دربار اُن دونوں پر حسد کرنے لگے، اور اُن پر شاہی عتاب کے نازل ہونیکا موقع ڈھونڈھنے لگے، ان لوگوں نے اسی غرض سے بتخانہ کی عمارت میں دو اینٹوں کی جگہ خالی چھوڑ دی، اور شاہ کے حضور میں عرض کی کہ "شوی بین جی" اور "شوی بین نگے" کی غفلت سے عمارت ناتمام رہی۔

شاہ "نوزتھا" نے دونوں کی ہلاکت کا فرمان جاری کر دیا، اس ڈر سے دونوں غائب ہوگئے، اور بعد مدت کے پھر ظاہر ہوئے، اور شاہی اطاعت اختیار کی، شاہ نے حکم دیا کہ دونوں کو "پگان" سے دور کسی مقام پر قتل کر دیا جائے، شوی بین توام برادروں کے قتل کیلئے معمولی آلات سے کام لینا دشوار تھا، اسلئے چمڑے کی رسیوں کو استعمال کرنیکا طریق تبلایا گیا، (موضع "لون دونگ" ابھی تک اِس بات کو ثابت کرتا ہے) اور اِن ہی رسیوں سے حقیقت میں اُنکی پھانسی لگائی جاسکتی تھی

قاتلوں کی جماعت دونوں کو کسی بعید مقام پر لیگئی اور ایک لاٹھی جو اُن کے اعتقاد میں "زبانس (وِنِ دولت) کی تھی، لے آئے، کیونکہ مجوزہ قتل کے لئے اِس قسم کے بانس کی بھی ضرورت تھی، شوی بین دونوں بھائیوں نے اپنے قتل کے طریقے کو خود ہی آسان کردیا، اُنھوں نے کہا کہ ہمکو کسی مقام پر لیچلو، اور ایک خاص طریقہ قتل سے جسکو برہمی زبان میں "اُکت نہیت" کہتے ہیں ہمکو ہلاک کرو۔ تو ہم بآسانی مرجائینگے، چنانچہ وہ اسی طرح پر مارے گئے، یہ قتل گاہ "کت یوا" ابھی تک اِس قدیم واقعہ کی یاد دلاتی ہے، "سود ونگ بئ" بتخانہ میں اِسوقت تک دو اینٹوں کی جگہ خالی پڑی ہوئی ہے، اسی مقام پر دو پتھر پڑے ہوئے ہیں، جو دونوں بھائی گنبد کے طور پر کھیل میں

استعمال کرتے تھے، اور جس کوٹھری میں وہ قتل کئے گئے تھے، اُس میں ہنوز خون کے نشانات پائے جاتے ہیں۔

واقعہ مذکور کے تھوڑے عرصے بعد پادشاہ "یگان کیاف" پانی کے راستے سے کشتی پر جا رہا تھا، یکایک کشتی منجدار میں رُک گئی، اور کسیطرح سے حرکت نہیں کرتی تھی، منجموں سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ کشتی کے رُک جانے کے باعث وہ دونوں مقتول ہیں، جو مرنے کے بعد "نت" دیوتا ہو گئے ہیں، اور اسوقت انتقام کی غرض سے آئے ہیں، اور فتح چین کے بعد جو اُنپر ظلم کیا گیا ہے، اُسکا بدلا لینا چاہتے ہیں، پادشاہ نے دونوں کو طلب کیا، اور پوچھا کہ کیا چاہتے ہو۔ انھوں نے پادشاہ کو سخت لعنت ملامت کرنے کے بعد کہا کہ ہمارے رہنے کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔ اسپر پادشاہ نے موضع "تونگ بیونگ" اُنکو عطا کیا، اور اُس میں اُن کے محلات تعمیر کرا دیئے جس میں اُن کی مورتیں نصب ہیں، اِن دیوتاؤں کی خدمت کیلئے پادشاہ نے نغفور کی دی ہوئی عورتوں میں سے ایک حسین عورت کو اُس مندر کی خاوسہ بنا دیا۔

راقم۔ مونگ پھو لو۔ از برہما۔

## عصرِ جدید

اِس نام کا ایک ماہواری رسالہ ۴۸ صفحہ ۲۰+۲۶ کی تقطیع پر جنوری ۱۹۰۳ء سے خواجہ غلام الثقلین صاحب بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی وکیل ہائیکورٹ کی اڈیٹری میں میرٹھ سے شائع ہوتا ہے۔

اسکے مقاصد یہ ہیں۔

(۱) مسلمانوں میں جو تباہ کُن فضول خرچیاں اور خلافِ مذہب رسوم جاری ہیں، اُنکی اصلاح کرنا۔

(۲) قومی ترقی کے اسباب اور وسائل قوم کے سامنے پیش کرنا۔

(۳) پولیٹکل معاملات پر نہایت آزادی مگر سنجیدگی اور اعتدال کیساتھ بحث کرنا۔

یہی ایک رسالہ ہے، جو محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے صیغہ اصلاح تمدن کا آرگن ہے، اور جس نے اصلاح کی تحریک کو ملک میں عام طور پر پھیلا دیا ہے، اور بوجہ اپنے نیک مقاصد کے پبلک میں قبولیت عام حاصل کر رہا ہے۔ مُلک کے تمام سربرآوردہ و معزز اخباروں نے اِس کی بابت عمدہ رائیں ظاہر کی ہیں۔ نمونہ کا پرچہ

صرف ۲ر کے ٹکٹ آنے پر ارسال ہوسکتا ہے۔ قیمت مع محصول ڈاک تین روپیہ سالانہ ہے۔

## کتب مفیدہ موجودہ دفتر عصر جدید بغرض فروخت

### کتب مصنفۂ مولوی خواجہ غلام الحسنین صاحب سابق انسپکٹر مدارس صوبۂ گلبرگہ۔

(۱) اصولِ تربیت۔ یہ رسالہ جدید اور قدیم اصول کا جامع ہے اور تمام والدین و معلمین کو اور عام اہل علم کو اس کا پڑھنا ضروری ہے، نہایت عمدہ اور اعلیٰ تربیت کے مضامین اس میں جمع کئے گئے ہیں جسمانی، عقلی، اخلاقی تربیت کے اصول، مقاصد، طریقہ حصول بتائے گئے ہیں، یہ کتاب نہایت خوشخط اور بصاف چھپی ہے۔ حجم ۱۲ صفحہ۔ قیمت . . . . . ۲ر

(۲) قوانینِ دولت۔ مسٹر مل کی کتاب لاز آف ویلتھ، جسکی قیمت انگریزی میں ۸ر ہے اسکا نہایت سلیس ترجمہ اعلیٰ درجے کے کاغذ پر رفاہ عام سٹیم پریس لاہور میں ۴۰ صفحہ پر چھپا ہے۔ دولت کیا چیز ہے؟ کیونکر پیدا ہوتی ہے؟ کسطرح تقسیم ہوتی ہے؟ ۲۸ مضامین علم پولٹیکل اکانمی کے اسمیں اسطرح بیان ہوئے ہیں کہ مبتدی اور عام شائقین آسانی سے سمجھ سکیں، جو طلبا، یا مدرسین یا عام شائقین اس علم کے ابتدائی اصول کو جاننا چاہیں، اس سے بہتر کتاب انکو نہیں ملسکتی، مترجم نے بعض مفید حواشی بھی دیے ہیں۔ قیمت - - - - - - - - ۴ر

(۳) فنِ تعلیم۔ یہ کتاب اہل علم اور معلمین اور عام شائقین کیلئے جن کو تعلیم سے دلچسپی ہے مفید ہے، بقول شمس العلما منشی ذکاءاللہ صاحب اردو میں اس سے بہتر کتاب اس مضمون پر نہیں لکھی گئی۔ حجم ۵ جزو خوشخط قیمت صرف . . . . ۶ر

کتب مصنفۂ خواجہ غلام الثقلین۔ (۴) عصر جدید سنہ ۳ کے ۸ پرچے۔ علاوہ محصول . . . . . . ۱۲ر

(۵) اسپیز اینڈ ایا تھمز۔ علمی اور فلسفانہ مضمون انگریزی میں ہیں یعنی پالٹکس، تہذیب، کلچر، حیات المشاہیر اور منتخب کلمات نہایت عمدہ کاغذ و ٹائپ پر چھپے ہیں۔ حجم ۱۲۵ صفحے۔ قیمت سابق عہ، قیمت حال . . . . . . ۸

تصانیف مولانا حالی۔ (۶) حیاتِ جاوید۔ دوسرا ایڈیشن۔ ۵۰ جزو قیمت سے ر (۷) مجموعہ نظم حالی۔ صفحے ۱۴۰ - ۱۴ نظمیں۔ ۱۰ر - (۸) مسدس حالی مکمل مع ضمیمہ۔ صفحے ۱۵۰ - خوشخط اعلیٰ درجہ کی۔ . . . ۸

دیگر کتب۔ (۹) اسلام کی صداقت۔ مصنفۂ نواب صدرالدین خانصاحب۔ ایک جزو کا عمدہ رسالہ . . . . . ۱ر

(۱۰) گلدستۂ منافع۔ ۵ جزو کی نہایت خوشخط کتاب ۱۱ مفید مضامین قیمت۔ ۵ر۔ علاوہ حیاتِ جاوید کے باقی کتب ۵ روپیہ کی خریدی جائیں تو محصولڈاک کی رعایت ہوگی۔

المشتہر

خواجہ منور علی منیجر عصر جدید میرٹھ۔

# زمانہ

## ایک اعلیٰ درجہ کا ماہوار رسالہ

جسمیں ہرماہ مشاہیر ملک میں سے کسی نہ کسی کی عکسی تصویر نذرِ ناظرین ہوتی ہے، اور جسکو باعتبار حجم۔ مضامین ترتیب، قیمت وغیرہ ملک کے کثیر التعداد اخباروں و اہل الرائے صاحبان نے اُردو کی موجودہ رسالوں میں خصوصیت سے قابلِ قدر بتلایا ہے۔ **قیمت سالانہ** سے ۲ر علاوہ محصول ڈاکی یا بذریعہ ویلیو پے ایبل۔

## فہرستِ مضامین زمانہ بابت جولائی و اگست ۱۹۰۴ء

(تصاویر سر ورق۔ شاہنشاہانِ روس و جاپان)

(۱) ہندو اور یونانی فلسفہ پر ایک نظر۔ از منشی شیو برت لال صاحب۔ ورمن ایم اے

(۲) جاپان اور ہم۔ از مولوی محمد عزیز مرزا صاحب بی۔ اے۔ فیلو رائل ایشیاٹک سوسائٹی۔ ڈپٹی کمشنر علاقہ نظام۔

(۳) قصیدہ توحید۔ نظم۔ از منشی سورج نراین صاحب مہر دہلوی اسسٹنٹ انسپکٹر مدارس

(۴) قیود ذات۔ از پنڈت برجنراین صاحب۔ لکھنوی بی اے

(۵) غزلیاتِ تسلیم۔ نظم۔ از منشی امیر اللہ صاحب تسلیم لکھنوی۔

(۶) ہندوستان کے فقیر۔ از قاضی عزیز الدین احمد صاحب۔ فیلو رائل ایشیاٹک سوسائٹی و ڈپٹی کلکٹر۔

(۷) ہوا۔ نظم۔ از منشی کندن لال صاحب شرر سہارنپوری

(۸) کیا ہندوستان میں مذہبی تعلیم کی ضرورت نہیں ہے؟ از لالہ لاجپت رائے صاحب وکیل چیف کورٹ پنجاب۔

(۹) علم و عقل۔ از خانصاحب مرزا سلطان احمد ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر

(۱۰) اُردو اخبار۔ از منشی بالمکند صاحب گپتا ایڈیٹر اخبار بھارت مترکلکتہ

(۱۱) سردار لال سنگھ مرحوم۔ از منشی صادق علیخاں صاحب۔

(۱۲) کلام اکبر۔ نظم خان بہادر سید اکبر حسین صاحب۔ جج پنشنر۔

(۱۳) گذشتہ ششماہی پر ایک نظر۔ (ایڈیٹر)

(۱۴) علمی خبریں۔ (۱۵) عرض حال

قیمت ۸ر حجم رسالہ جولائی و اگست ۱۹۰۴ء (۱۴۰) صفحات علاوہ ٹائٹل پیج و اشتہارات۔ قیمت ۸ر

درخواستیں بنام منیجر "زمانہ" قیصری پریس۔ بریلی آنا چاہئیں۔

نوٹ۔ زمانہ کی جنوری سے جون ۱۹۰۴ء تک کی ششماہی جلد جسکے قابل قدر مضامین ۴۹۶ صفحات پر آئے ہیں علاوہ ٹائٹل پیج و اشتہارات اور جسمیں سید احمد، پنڈت رتن ناتھ سرشار اور مسٹر تاتا کی تین بیتاب تصاویر عکسی دی ہیں عہ، مع مجلد اور طلائی کار دفتر سے مل سکتی ہے۔ صرف چند جلدیں باقی ہیں شائقین جلد طلب فرمائیں بعض تصویریں ۳ر فی تصویر کے حساب سے مل سکتی ہیں **المشتہر منیجر زمانہ بریلی۔**

(مطبوعہ ریاض ہند پریس علیگڈھ)

## II.—THE VAGABOND.

Give to me the life I love,
    Let the lave go by me,
Give the jolly heaven above
    And the by-way nigh me.
Bed in the bush with stars to see
    Bread I dip in the river—
There's the life for a man like me,
    There's the life for ever

Let the blow fall soon or late,
    Let what will be o'er me ;
Give the face of earth around
    And the road before me.
Wealth I seek not, hope nor love,
    Nor a friend to know me ;
All I seek, the heaven above,
    And the road below me.

Or let autumn fall on me
    Where afield I linger,
Silencing the bird on tree
    Biting the blue finger.
White as meal the frosty field—
    Warm the fireside haven—
Not to autumn will I yield,
    Not to winter even !

R. L. STEVENSON.

ready settled down, whose religious character is already formed are, I maintain, not affected by anything that English education teaches or that any language on earth could teach. This is the only solution which suggests itself to me of the question why among the English-knowing people "lip-believing" and indifference to "religious duties" are in *some* or ***most*** but not "*all*" cases taking the place respectively of "implicit faith" and proper observance of "religious formalities." I should wish and hope that the M. A.-O. College will turn out students infused with a "true religious spirit," as mindful of their religions as their worldly duties, who have shaped their characters on the lines and model laid before them by Islam, which certainly contains everything that is truly noble and sublime, and which is not in the least inconsistent with true modern civilization or the progress of arts and sciences If they could learn Arabic for any part of their college career, so as to be able to understand the plain wording of their holy Qurán, and devote some minutes to the study of the same, I can confidently hope that they will gradually learn all their Cerator requires of them to do in this mortal world so as to win real happiness here and eternal bliss in the world to come. Then and only then they will be able to understand the philosophy of their religion, the physychological relation which the religious duties bear to the manner of their performance, and the final goal which Islam aims at. By so doing they will indeed set an example to the world what an ideal of a civilized and educated Mohammadan of the present age could and should be, and "how far he could and should reconcile Islam with modern ideas"

KHAWJA ABDULAH, B.A.,LL.B.,
MUNSIF, PAWAYAN,
*Dist. Shahjahanpur*

## Fragments

### I.—A BOY'S PRAYER

God who created me
    Nimble and light of limb,
In three elements free
    To run, to ride, to swim ,
Not when the sense is dim,
    But now from the heart of joy
I would remember Him :
    Take the thanks of a boy.

H. C. BEECHING.

has in fact pleaded "guilty" and impleaded others as "guilty," or to use the legal phraseology as "joint offenders and the only defence set up by him is to attribute the "guilt' religious offence—to the commission of a lawful perhaps indispensable act, namely the "having an English edu tion." This is, however, no defence, much less a va defence, and it only remains for the ecclesiastical judge pass the proper sentence against the accused. The accu tion does not, however, seem to me to be well founded. the wearing of English dress is supposed to be an indiffere to religious forms, the mistake is evident, as no spe form of dress is prescribed by religion If the critic me to say that the students do not offer their prayers or obse fasting, I can say, speaking at least of my own times, t the accusation is based on false information The stude living in the Boarding house do offer their daily pray and fast in Ramazan, they celebrate with the great enthusiasm the anniversary of their great Prophet, and ce brate the completion of the Quràn in the sacred month Ramazan. There is in fact an Imam, a great Moulvi pointed to conduct the daily prayers, and only last y I had occasion to offer my evening prayers in the Coll mosque amidst a large gathering of Boarders Th may be students, who are not very strict about prayers, they are exception to the rule, and I can point out hund of young Musalmans, not knowing a bit of English, who equally indifferent to it If English education decide had the effect of producing this indifference, there would course be no English knowing Mohammadan but indiff ent to "religious forms," which is, however, contrary fact. I know of many B. As and M. As who pay due reg to "religious formalities." The principles of our "perfec religions are unquestionably not antagonistic with anythi that English education teaches. Why therefore, should it condemned (and condemned it must be if it does) as prod ing "these changes in our minds." Who can authoritativ say that such of the *English-knowing* young Mohammad as are indifferent to "religious forms" would not have been equ ly indifferent *without such education*. Perhaps they would ha been. As far as I understand, this religious apathy, which is t general complaint of these days, leaving aside the pecul (mostly heriditary) tendencies of one's nature, is to a gr measure due to the effect of early society in which the ch or the boy has to move and further to a want of suffici primary religious training, and the consequent ignorance the dictates of Islam. Those whose religious ideas are

religious spirit within, if you attend earnestly to the noble lessons taught by Islam, and closely watch the words and deeds of the illustrious founder of your faith, you will certainly learn all that is best in the character of man, all that is glorious, and noble and sublime—and achieve success in your various worldly pursuits

It was this "religious spirit," which pervaded the heart of Sir Syed, the illustrious founder of the M. A.-O College, and which must, therefore, permeate the hearts of every student of that College With all his philosophical ideas, his taste for western manners, his mode of living and dress with all his scientific commentations of the holy Qurân, the notorious tafsir, his sincere love of Mohammad (peace be on his soul) really amounted to a passion He has been seen by those who intimately mixed with him in social life to shed, at times, tears at the lovely name of the Prophet and to repeat Dúrood (God's blessings) on the blessed soul of Mohammad for hours together This is what can truly be called "religious spirit" or the "spirit of religion," and which of course lay at the bottom of all his success and his reputation in this world

To sum up No part of Islam proper admits of reform. The social part of Islam is as much a part of our religion as the religious part. The social customs or usages should be distinguished from the "social part of Islam", the former is the offspring of social intercourse, the latter is "the law of God in matters social or secular" Non-observance of religious duties or any rule belonging to the social part of Islam is a sin, while questioning the propriety of any order of God or its suitableness to modern ideas is "infidelity" or irreligion Knowledge of the true principles of Islam is essential for determining how far we can reconcile it to modern ideas The social condition of the Mohamadans and not the social part of Islam, stands at the present day in need of reform

Towards the conclusion of his article, the writer says "it is generally alleged that the students of the M A.-O College grow indifferent to "religious forms" But that in his opinion the same accusation can be laid against the students of all other Indian Colleges English education is producing changes in our minds and so on. I, too, belong to the same Alma Mater, and I must say that I read the above with great regret. The writer instead of clearing the students of the M. A.-O College of the alleged accusation has only dismissed it by saying that the same may be laid against the English knowing students of all Indian Colleges. He

action explained the verse to the true believers by prescribing the manner and the times of bowing down, and surely any one who thinks that these forms are mere "superficialities" fights against God and His apostle, and has no right to say "still I believe in the unity of God and the mission of the prophet." The line of argument adopted above in the case of 'usury' may be applied *mutatis mutandis* to the case of "prayers" and "fasting" and need not be repeated here.

If you are unable to concentrate your attention in the course of prayers, or to control your tongue while fasting, it is surely the fault of the man and not the fault of the "forms"; it is a defective performance of one's "duty", which at any rate is much better than absolute non-performance. For while there is a hope for pardon in the former case on the ground of human weakness, there be can no such hope in the latter, for nobody can reasonably plead "I did not perform my duty, because I thought I could not perform it just as I should.'

The writer is perhaps not aware of the fact that with all its "Puritanic austerity" Islam has found its way in to the centre of modern civilization—England itself—where in Liverpool over a hundred Europeans, all men of position, enlightment, and culture, have preferred and adopted Islam as the best of all religions, Mr. Abdulla Quilliam being the leader of the party. The greatest argument urged by the writer, namely "that it (Islam) cannot win over the peoples of Europe," therefore, falls to the ground. There is surely nothing in the "social part of Islam" in the sense I have explained above, which we cannot reconcile with modern ideas, or which is not inviting to a non-Muslim, provided of course he has any liking at all for a religion, and considers it the only means of salvation.

"We can do nothing," says the writer, and says so truly "unless we are infused with religious spirit." But in what does 'religious spirit' consist, and how is it to be infused, the writer does not tell. Does "religious spirit" consist in the sanctioning of "usury" against the very order of God, and in total indifference to the religious forms, as it is a "trying task" for a Musulman to observe them? Surely not, I would rather call it "secular zeal" than "religious spirit." Speaking from the Islamic point of view, "religions spirit" in the true sense of the words, consists of an implicit faith in religion, a passionate love of God and his Holy Prophet Mohammed, from which *must* spring a sincere affection and profound reverence for all what He and His Prophet have said unto the 'Faithful" to be followed by them on this side of the grave in order to attain eternal bliss. If you have this true

and may not be treated in this short review. It would, I think, give some consolation to the writer to read that according to the best of the Mohammadan Jurists, the Imam-i-Azam Abu Hanifa, there is no 'ribaw' or interest between a Muslim and a non-Muslim (Harabi) in Darul-Harb (country of non-Muslims), which determines the extent to which the taking of interest is allowed by Islam.

To deal with the question of forms and superficialities, in which, says the writer "Islam is *now* wrapped"—He has devoted a full paragraph (the 3rd para. on page 12) to the criticism of the present "Islam" on that ground, and has followed it up by saying "the greatest argument of the fact that we cannot reconcile *the social part of Islam* with modern ideas, is that it cannot win over the people of Europe," (*vide* para. II. page 13). But certainly the question of dress, and the forms of prayer and fasting are not the social part of Islam. The former is a mere social question, while the latter is strictly religious. It is true that young Mohammadans of the "new light" (and I am certainly of them), who wear English dress, are made the object of criticism by the orthodox Mohammadans of the old school, not strictly speaking on the ground of "disbelief" or "infidelity," but on other grounds, for instance that it was against the manners and the social traditions of their fore-fathers (Khilâf-i-waza, as they say) and as an unnecessary imitation of the English people, which was at once unbecoming and too expensive. I am not going to discuss whether or not the criticism is well-founded. All I wish to impress is that the question does not belong to either of the two parts of Islam—social or religious and it is a mistake to suppose that every social question must belong to "the social part" of Islam. As to religious forms, the form of prayers, and of fasting—the paragraph (3rd para. page 12) discloses a spirit of contempt on the writer's part, and I really fail to understand what the writer means when he says "we are to pray five times a day, a task, which is trying for a Mohammadan, and which is not inviting to a non-Muslim, who finds at the threshold of Islam a sort of Puritanic austerity, unless he means that this is an unnecessary tax imposed by Islam and may be dispensed with without encroaching upon the essential part of our religion. This is evidently fallacious. God distinctly commands his servants "to pray, to pay alms, and to bow down with those who bow down for worship" (Akeemus-salawta, wa-Atuzzakawta wai-kaoo ma-urrake, in chap. I. 4th Rukoo-sura-Bakar). Now the prophet (peace be on his soul) admittedly the best interpreter of the word of God, which was revealed to him, has by his word as well as by his

considered by Him to be an impurity) which blocked their way to that goal of nobleness, and glory, and perfection, which he had destined for them To help the needy and the poor was only incidental to the main object explained above. If this was the object and the reason of the order in question it must of course stand good for ever, unaffected by any change of circumstances. There may be other reasons besides, which it is not in the power of the finite and the imperfect to guess.

Again, if we look at the history of the Arabs, we find that, although trade was not then conducted on such a large scale as at present, it was nevertheless their chief occupation and an object of the greatest interest to them. The borrower of those days, it is true, was a "needy person," but the borrower of to-day is not—less so (borrowing without need is idleness and absurdity) and though the object of his borrowing was not then "to assist in making large profits," as the writer informs us, it was undoubtedly as much to make small profits, as to satisfy some other pressing want. If usury were sanctioned by Islam, the wealthier would have so freely and profitably advanced money to the poorer, who needed it, say, to start a business for himself, and who might not unlikely have developed his resources and increased his business, and eventually become a wealthy man himself. Why then was usury forbidden, when from the worldly point of view, it could have benefitted both the lender and the borrower? The writer will perhaps not deny that the number of needy Muslmans, who require money for the "satisfaction of some better and pressing want" is greater in these days than it was in the early days of Islam He will also admit that such people, on the principle suggested by himself, must in time of need be advanced money free of interest. But could he fairly deny that, if usury were now sanctioned from any consideration, no-body in possession of money would ever be ready and willing to lend it to such of his poor fellow-brethren without interest, when he could lawfully lend it at interest to others; the "bitter and pressing want" of the poor man will remain unsatisfied, and the only object conceived by the writer to underlie the prohibition of usury will be gone, and the word of God will become a "dead letter." "True religion is the foundation of society. When that is once shaken by *contempt*, the whole fabric cannot be stable or lasting!

I do not like in this review to discuss the question as to how far the taking of interest from non-Muslims is allowed by religion, and what is the force of Alif Lám in "Al-ribaw" as occurring in Ch. II of Al-Qurán (p. 30 of Sales' Translation). These are questions of religious jurisprudence or 'Fikha,'

ing upon the essential part of our religion—a belief in the unity of God and the Mission of the Prophet.

It must be admitted that a belief in the unity of God is not a very simple belief. It is a belief that there is but one God, the creator of all that is and all that will be, who is all-wise, all-powerful, all-knowing or omniscient—having knowledge of the past, the present, and the future—, who is in short beyond all that lies within human conception. If this be, as it ought to be, the belief of a Musalman, it follows of course that he must believe that God in His infinite wisdom and His fore-knowledge absolute must have foreseen the suitableness of any of His commandments to the requirements of the times to come. A fortiori if he holds that a certain commandment, though perfectly right when passed, is not consonant with modern ideas or suited to the requirements of the present age, he contradicts his own belief—an essential belief indeed—in His infinite wisdom and His fore-knowledge absolute, and cannot, therefore, rightly claim to be a true believer in the 'unity of God.' I doubt if the writer is aware that the prohibition of usury comes from God and is not one of the Prophet's own precepts the Hadis. "They, who devour usury shall not arise from the dead but as he ariseth, whom Satan has infected by touch, &c., &c., yet God hath permitted selling and forbidden usury, &c., &c. (*vide* Sales,' Translation of Al-Qurán, Ch. ii. p. 30). It is true that human wisdom is constantly advancing with the progress of arts and sciences, yet with all his great intellectual powers, man is finite and imperfect as against the Infinite and the Perfect, and, as a matter of fact, the wisdom of one age is proved to be a folly and ignorance by the other. When it is difficult for a man even to fully understand the 'objects and reasons" of a certain rule of law framed by the Legislature or the policy of an Act of Government—the act of man—how difficult it would be for him to explain away all the objects and reasons underlying any commandment of the Infinite. How bold it is for him to say that the reason for an order of God having disappeared, the order has lost its force and holds good no more!

The writer of the article, so far as I see, has explained no reason for the prohibitory order of God. He has only pointed out the condition of things existing at the time when the order was passed. The conducting of—trade on a small scale was surely not the *cause* of the issue of the order. All that we can think and understand is that the order must have been passed with a view to ennoble the character of the "Faithful" by filtering it of every impurity (and usury was

lief in the revival of the dead, in the Day of Judgment and the next world is not less indispensable. When, however, the writer turns his attention to what he says "*was* praiseworthy in Islam but *is* irreconcilable to modern ideas," he falls into some grievous errors which may not be passed over unnoticed. He thinks that the "social part of Islam" is irreconcilable with modern ideas, the greatest argument of which fact, he maintains, is that "it cannot win over the people of Europe."

He has nowhere defined or explained "the social part of Islam," though something may be gathered from the illustrations he has given on page 12 of the "Monthly" to show what he conceives by the phrase The question of interest, the question of dress, of the shaving or not shaving of beards, the forms and times of prayers, and the mode of fasting, are all mixed together as the principal points at which reform should be directed, appertaining, as it were, to "the social part of Islam" If religion can at all appropriately be divisible into two parts, social and religious, the only definition of the former would be "the commandments of the Supreme Being in matters social or secular," thus excluding the social customs or other rules framed by the society itself The writer seems to me to have made a confusion between the two. The questions of dress, or the shaving or not shaving of beards are purely social questions, while those of fasting and praying at the times and in the forms prescribed by Islam are questions strictly religious, while the prohibition about usury being also made by the Omniscient Himself is not the less religious, although it may belong to the "Social part of the Islamic religion."

A close observation of Islamic laws as embodied in the holy Qurán will show that there are some laws, which have their object, the maintenance of the essential relation between the "Creator" and the "Created," while others regulate the relation between man and man, having their object the maintenance, and the social, and moral prosperity of the Society itself. Under the former class fall the four great duties of religion, namely, praying, fasting, alms-giving and pilgrimage, while the laws relating to marriage divorce, will, inheritance and contracts, as well as the penal laws belong to the latter. There are again certain negative precepts or prohibitory orders founded mainly on the distinction between 'Halal' and "Haram" (lawful and unlawful) such as the prohibition of drinking wine, of taking interest, gaming and so on. Now the question is whether the Islamic laws of the latter class or "the social part of Islam" may be modified without encroach-

(vii) The Hon'ble Masiruddaula Mumtazul Mulk, Khalifa Syed Md. Husain Sahib, Member of Council, Patiala State, paid Rs. 1,000 for the Arabic.

(viii) Nawab Yusuf Ali Khan Sahib, Rais Chatari, paid Rs. 1,000 for the Arabic.

(ix) Raja Jafar Ali Khan, Rais Pindrawal, paid Rs. 500 for the Arabic.

The following five Annual Scholarships for the advancement of Arabic learning.

| | | |
|---|---|---|
| Raja Sahib, Nanpara . .. | Rs | 1,200 |
| Hon'ble Nawab Fateh Ali Khan Sahib, Qazalbash, C.S.I. | ,, | 600 |
| Raja Naushad Ali Khan Sahib, Rais Jahangirabad .. | ,, | 240 |
| Khalifa Syed Md. Husain Khan Sahib, Patiala Trustee of the College . | ,, | 120 |
| Khan Bahadur Barkat Ali Khan Sahib, Rais Lahore ... . | ,, | 120 |
| Syed Ali Imam, Esq., Barrister-at-law, Patna Trustee of the College . | ,, | 120 |
| Maulvi Habib-ur-rahman Khan Sahib, Rais Bhikampure, Trustee of the College | ,, | 120 |
| Col. Abdul Majid Khan Sahib Foreign Minister, Patiala . . | ,, | 120 |
| Maulvi Hasmat-ul lah Sahib, M.A., Joint Magistrate, Trustee of the College | ,, | 120 |
| Qazi Aziz-ud-din Ahmad Sahib, Deputy Collector, Trustee of the College .. | ,, | 120 |
| Nawab Safi-ud-daula Ali Hasan Khan Sahib, Bhopal, (now at Lucknow) . | ,, | 120 |

---

## How far can we reconcile Islam with Modern Ideas.

---

An article with the above heading appeared in the Aligarh Monthly in October last, in which the writer discussed at some length the question of religious reform, pointing out the pressing necessity of such reform in order to keep place with modern civilization He has started with explaining the theory of religions in general, and roughly, but suggestively, contrasted the simplicity of Islam with the more or less complicated character of other religions The essential elements of Islam are undoubtedly a sincere belief in the unity of God and the Mission of the Prophet, though a be-

In the B. A. thirty-two of our students pass, forty-six having been sent in. No Aligarh candidate, we regret to to see, appears in the First Division.

The following is the list of our new B. A's. The number after the name shows the Division gained in each case :—

| | | | |
|---|---|---|---|
| M. Sarfraz Khan . | III | Md Abbas Khan ... | II |
| Narendra Nath Banerji, | III | Abdur Rahim Khan | III |
| Nazir-ud-din Hasan . | III | Abdul Hamid Khan | III |
| Niaz Ahmad | III | Ahmad Jamil ... | III |
| Pitamber Prasad Mathur, | II | Abdul Karim ... | II |
| Rifat Ali Khan . | III | Ashfaq Husain ... | III |
| Sardar Khan | III | Baikunth Chandra Misra, | III |
| Shaik Imtiaz Ali Othmani, | III | Ch. Nadir Khan .. | III |
| Shaik Abdul Ghani | II | Khawja Latif Ahmed .. | II |
| Syed Mohamed Ashique, | II | Moazzam Ali Beg Meerza, | III |
| Sri Narain Mathur . | III | Md. Shamsuz Zoha | II |
| Syed Husain Naqavi | III | Md Munir-ud-din Ahmed, | II |
| Talammuz Husain ... | III | Md Mosanna | III |
| Tarafdar Husain ... | II | Md Amin Ullah Khan, | III |
| Tasadduq Ahmad | II | Mohamed Zainul Abdin, | III |
| Zia Uddin Ahmad . | II | Mohamed Said . | III |

## More Benefactors.

The following sums of money were paid or promised on the occasion of the Lieutenant-Governor's visit to the College at the end of July :—

(i) Haji Ahmad Said Khan Sahib, Rs. 4,800 for 3 rooms Annual income to go to scholarships for the School.

(ii) Hakim Karimullah Khan Sahib, Rs. 15,00 for a Room for Koràn-reading

(iii) Raja Md. Saddiq Khan Sahib, Raja of Nanpara, Rs. 100 monthly for Arabic

(iv) The Hon'ble Raja Tasadduq Rasool Khan, C S.I., Rais Jahangirabad, Barabanki, Rs. 5,000 for an Arabic Lecture Room.

(v) Moulvi Nizamuddin Hasan Sahib, Deputy Commissioner, Berar, Trustee of the College, Rs. 5,000 for Arabic.

(vi) Khan Bahadur Muzammil Ullah Khan Sahib, Rais, Bhikampur Trustee of the College, Rs 4,800 for 3 rooms. Annual rent to go to a scholarship in Arabic.

This is no new or untried experiment, and is in keeping with the ancient Indian tradition, which required the pupil to live in boarding-houses in the charge of his teacher. One of the pioneers of the system is the Mahomedan Anglo-Oriental College at Aligarh, where most excellent results have been obtained. Students from Aligarh have established a name for character and right conduct all over India. They have done splendid work as volunteers in the famine, and they have been able as police officials to withstand the temptations which beset all Indians who enter that difficult department. Aligarh may be taken as a model for the whole of India There may be found the personal relation between teacher and pupil and the associations in the school, the playground, and the boarding-house, which are essential to the formation of the character of students '

---

The Principal's Annual Report has been published and contains much interesting reading It is unnecessary, however, to quote from a compilation which will probably be more widely read than this Magazine. One extract alone may be permitted here on a subject which we consider represents an urgent need. Mr Morison says :—

"In order to make our opportunities for physical training complete, we still need a Swimming Bath ; the suggestion to erect one in the College was put forward many years ago, and the proposal having come to the ears of the present Lieutenant-Governor (then Mr. James La Touche), he sent to the College a sum of Rs. 100 as a subscription for that purpose, which sum was transferred to the athletic fund by his instructions when it was found impossible to raise the money required for the construction of the bath I have in my office three plans for swimming baths which were prepared for me in the office of Minister of Public Works, Hyderabad, and I should be very glad to see one of them put under construction."

---

The results of the Degree examinations of the Allahabad University are now declared

---

Syed Abu Mahomed has passed the M A. in Division III in Persian

---

Out of our twelve candidates for the LL. B. five are successful

There is no doubt that a great future lies in the way of scientific agriculture for India ; and it will be possible for a student to take either a practical, general course or to specialize in one of the higher branches of the science.

——:o:——

One hears occasionally of certain of our students, who are anxious to proceed to England to join an Agricultural College. Wye in Kent, and Aspatoria in the north of England, are two of the best institutions of this kind. The fees at each amount to about £100 yearly.

——:o:——

The Editor hopes to be able to publish before long an article on some of the needs of India in the way of agricultural improvement.

——:o.——

The London "Times" is publishing a series of articles, evidently by a master-hand, on Indian affairs. The following extract will prove interesting

"In India there is splendid material for educational enterprise, and those who go out from England to join the educational service in India will find much that is promising. They will find themselves in a land instinct with the traditions of ancient learning ; they will find boys of extraordinary quickness and industry, but, unfortunately, they will not commonly find evidences of character evolved by our educational system in the past. Here again the fault is not in the Indian, but in the system of education Limited, as it has been, if we look at the figures for the whole of India, it has also been of a wholesale and rough-and-ready description. It was judged by statistical results, like some other benevolent enterprises in India, and the individual was lost sight of. He was one of a batch of students who had to pass an examination, and to the overtaxed teacher he had little more personality than has the clay for the potter. Our besetting sin in India is our constant endeavour to do things cheaply. Our educational services have been starved, and we have sacrificed quality for quantity. But apart from the fact that our teachers are expected to do more than is possible, there is the further fact that when once the boy had finished his daily task he was under no supervision and free to do what he liked The Government of India has therefore wisely attached great importance to the provision of boarding-houses under the supervision of resident teachers, in connexion with colleges and secondary schools. Students will thus be protected from the dangers of life in large towns, while common interests and a spirit of healthy companionship will be created.

# The Aligarh Monthly.

## SEPTEMBER, 1904.

### College Notes.

News comes of the good work now being done by the various Duty deputations, a fuller account of which will be published later.

—.o.—

The Commissioner in Scind presided at a meeting in Karachi at which Ghulam Rasool made an excellent speech, clearly setting forth the aims and work of the College Mr. Vines has given a kindly welcome and much help to the Scind deputation.

—.o.—

Another deputation has realised a handsome donation from the Begum of Bhopal.

—:o:—

A donation of Rs. 15 sent with a message of kindest encouragement for the work of the College comes from Miss Griffiths of Dolgelly, Wales, who was travelling in India last cold weather. The amount has been placed to the credit of the Endowment Fund.

—.o:—

The Dargah Committee, Bahraich, has granted a monthly scholarship of Rs 5 to Wajid Ali, student of the College.

—.o:—

Various institutions and benefactors are already promising scholarships to be held at the Pusa Agricultural College, which is now in the course of construction and which is to offer advanced training in agricultural science on the most approved modern lines. It is to be hoped, that when the Pusa College is opened, some of our students may be among the first to seek admittance. There should be no difficulty in arranging for a few scholarships of about Rs. 20 each.

# علیگڈھ منتھلی

| جلد ۲ | اکتوبر سنہ ۱۹۰۴ عیسوی | نمبر ۱۰ |
|---|---|---|


## علیگڈہ کالج میں نظام میوزیم

---

ہمکو خوشی ہے کہ ہمارے دوست ڈاکٹر ضیاء الدین احمد صاحب ولایت میں بیٹھے ہوئے بھی کالج کی ترقی کی فکر سے خالی نہیں ہیں، اور عنقریب وہ وقت آنیوالا ہے جبکہ وہ ولایت سے واپس آکر کالج اور قوم کو اپنے وسیع علم اور تجربہ سے بہرہ مند کرینگے۔ ہمارے کالج سے اسوقت تک بہت سے طلبا اپنی تکمیلِ تعلیم کے لئے ولایت گئے ہیں، مگر جس درجہ کہ ڈاکٹر صاحب اُن سب سے علم وفضل میں ممتاز ہیں اُسی کے موافق اُن کے اغراض ومقاصد میں بھی فرق ہے وہ لوگ گلیم خویش بروں می بردز موج کے مصداق تھے اور ڈاکٹر صاحب پر دیں جہد میکند کہ بگیرد غریق را کی مثل صادق آتی ہے۔ اُن لوگوں نے اپنی واپسی پر خود ترقی کی اور

ڈاکٹر صاحب دوسرے بہت لوگوں کی ترقی کے باعث ہونگے۔ افسوس ہے کہ ہندوستان میں صیغۂ تعلیم جو سب سے اشرف پیشہ ہے اور جسپر قوموں کی ترقی اور تنزل کا دار و مدار ہے اِسقدر حقیر ہوگیا ہے کہ کوئی لائق شخص حتّی المقدور اس میں داخل ہونا پسند نہیں کرتا حالانکہ اسی پیشے میں سب سے زیادہ لائق لوگوں کی ضرورت ہے۔ ہمکو ایسے ہندوستانی ایجوکیشنسٹ درکار ہیں، کہ جو یورپ میں جائیں اور وہاں کے تعلیم و تربیت کے طریقوں کو غور سے دیکھیں اور پتہ لگائیں کہ وہ کون سے طریقے ہیں جن سے یورپ ایسے کام کے نوجوان طیار کر رہا ہے اور پھر اُن ہی طریقوں کو اپنے ملک کے کالجوں اور اسکولوں میں رواج دیں۔ ہمکو اُمید ہے کہ ڈاکٹر ضیاءالدین احمدؐ ہماری اس ضرورت کو ایک حد تک پورا کرینگے اور ولایت سے واپسی پر ہمکو ہمارے نقص بتلائینگے اور نئے طریقوں پر چلنے کی ہدایت کرینگے۔ ڈاکٹر ضیاءالدین احمدؐ کی تجویز کالج میوزیم کے متعلق جو ہم ذیل میں درج کرتے ہیں نہایت عمدہ اور قابلِ عمل ہے اور ہمکو اُمید ہے کہ کارکنانِ کالج اس پر توجہ کرینگے۔ (آنریری منیجر)

علیگڈھ کالج میں نظام میوزیم تیار ہونیکے بعد یہ سوال خواہ مخواہ دِل میں پیدا ہوتا ہی کہ آیا یہ کمرہ بطور ایک لکچر روم کے استعمال ہوگا یا فی الحقیقت میوزیم بنایا جائیگا۔ اِس میں کچھ شک نہیں کہ ایکدن ہمکو فیزکس۔ علمِ کیمیا، علمِ نباتات، علمِ معدنیات، علمِ حیوانات وغیرہ کے لئے علٰحدہ علٰحدہ میوزیم بنانیکی ضرورت ہوگی۔ تاہم کوئی شخص اس سے انکار نہیں کرسکتا کہ کالج کو موجودہ حالت میں بھی ایک میوزیم کی سخت ضرورت ہے یورپ کی تمام درسگاہوں میں میوزیم اُسیقدر ضروری سمجھا جاتا ہے جسقدر لائبریری۔ بڑی درسگاہوں میں ہر ایک فن کے لئے وسیع میوزیم ہوتا ہے۔ مگر چھوٹے مدرسوں میں صرف ایک میوزیم ہوتا ہے جسمیں ہر ایک فن کے مجموعہ کے لئے علٰحدہ علٰحدہ الماریاں ہوتی ہیں۔ کچھ عرصہ ہُوا میںنے ایک پبلک اسکول میں ایک میوزیم دیکھا جسکا افتتاح اسکول کے موجودہ ہیڈ ماسٹر نے دس برس کا عرصہ ہُوا کیا تھا۔ اُس میوزیم میں قریب پینتیس ۳۵ الماریاں تھیں اور ہر ایک لماری میں مختلف اقسام کی عجیب چیزیں تھیں۔ اُس میوزیم کو دیکھکر مجھے سخت تعجب ہوا اور میںنے ہیڈ ماسٹر سے دریافت کیا کہ اسکول فنڈ کسقدر روپیہ

سالانہ اس میوزیم کیلئے صرف کرتا ہے اور کسقدر شروع میں صرف کیا تھا۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نے جواب دیا کہ اسکول
نے شروع میں تمام الماریاں بنوائی تھیں۔ اُسکے بعد اسکول نے اِسپر کچھ صرف نہیں کیا یہ سنکر مجھے سخت تعجب
ہوا اور مینے اسکے متعلق استفسار کیا۔ معلوم ہوا کہ میوزیم کی تیاری کیلئے اسکول میں ایک کمیٹی ہے جسکے پریسیڈنٹ
اسکول کے ایک ماسٹر ہیں۔ ممبر ہر سال طالب علموں میں سے منتخب ہوتے ہیں اور انکا انتخاب دو بارہ
ہو سکتا ہے۔ ہر ایک ممبر کے سپرد ایک خاص الماری ہے اور وہ ممبر کوشش کرتا ہے کہ اپنے زمانہ ممبری
میں اُسمیں اضافہ کرے۔ ہر ایک چیز پر عطیہ دینے والے اور جمع کنندہ دونوں کا نام ہوتا ہے تاکہ دونوں
کی یادگار ہمیشہ کے لیے اسکول میں قائم رہے۔ یہی کمیٹی کچھ روپیہ بھی اسکول کے موجودہ اور سابق طلبہ
سے جمع کرتی ہے تاکہ وہ چیزیں جو بطور عطیہ فراہم نہ ہوسکیں خریدی جائیں۔ مثلاً ایک ممبر کے چارج
میں وہ الماری ہے جسمیں مختلف سکے ہیں۔ وہ طالب علم انکی ترتیب اور حفاظت کا ذمہ دار ہے جب کبھی اسکو
کسی پرانے سکے کا پتہ چلتا ہے وہ خود یا اپنے دوستوں کی معرفت اسکو حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔
اور اگر بطور عطیہ حاصل نہو سکے تو کمیٹی میں سفارش کرتا ہے کہ وہ سکہ خرید اجائے۔ اِس طریقے پر میوزیم
جمع کرنے میں تین فائدے ہیں۔

**اوّل** یہ کہ اسکول پر میوزیم کا کسی قسم کا بار نہیں ہوتا۔

**دُوم**۔ طالبعلموں میں چیزیں حفاظت سے رکھنے، ترتیب دینے، نایاب چیزوں کی وقعت کرنے
اور اُن کو جمع کرنے کی عادت ہوجاتی ہے، چنانچہ ہر ایک انگریز کا مکان ہمیشہ ایک چھوٹا سا میوزیم ہوتا ہے

**سوم**۔ طالب علم اسکول چھوڑنے کے بعد بھی میوزیم کو نہیں بھولتے اور جب کبھی اُن کو ئی عمدہ چیز نظر
آتی ہے وہ ہمیشہ اسکول کی نذر کرتے ہیں، اور وہ اس بات سے زیادہ خوش ہوتے ہیں کہ اُن کی جمع
کی ہوئی چیزیں صرف اُن کے اور اُن کے خاص دوستوں کی ہی نظر سے نہ گزریں بلکہ پبلک
اُن سے مستفید ہو۔ چنانچہ اس میوزیم میں تقریباً نصف چیزیں طالب علموں کے اسکول چھوڑنے
کے بعد کی عطا کی ہوئی ہیں۔

اگر ایک لمحہ کے لیے یہ فرض کر لیا جائے کہ کالج کے افسروں نے نظامِ میوزیم کو یا کالج کے کسی

اور کمرے کو میوزیم بنانے کا فیصلہ کرلیا ہے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس میوزیم میں کسی قسم کی چیزیں جمع کیجائینگی، اس سوال کا جواب نہایت مشکل ہے۔ اگر کوئی شخص یہ سوال کرتا کہ کالج میوزیم میں کن چیزوں کا ہونا نہیں چاہیئے، تو اسکا جواب آسان ہوتا۔ تاہم میں چند چیزوں کے بیان کرنے کی کوشش کرونگا۔ اس فہرست کو ہرگز مکمل نہیں خیال کرنا چاہیئے۔ کیونکہ جسقدر کالج کو ترقی ہوگی، اُسیقدر میوزیم کی بھی توسیع ہوتی جائیگی۔ تاہم ہم بحالت موجودہ مفصلہ ذیل اشیا سے میوزیم کا افتتاح کرسکتے ہیں۔

۱- **کتابیں**۔ اِس الماری میں تین قسم کی کتابیں ہونی چاہئیں۔ وہ قدیمی کتابیں جو کہ آجکل نایاب ہیں۔ وہ کتابیں جو کہ قدیم زمانے کی عمدہ جلدبندی کے نمونے ہوں۔ وہ کتابیں اور کاغذ جو کہ مشہور شخصوں کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہوں۔

۲- **سکے**۔ اسمیں قدیم سکے، اور وہ سکے جو کہ مختلف ملکوں میں اِسوقت استعمال ہوتے ہیں۔ موجودہ سکوں کے جمع کرنے سے دو فائدے ہیں۔ اوّل تو یہ کہ لوگوں کو اُن سے واقفیت ہوجائیگی جو اُن کے سفر میں بہت کام آئینگے۔ دوّم ایک وقت وہ آئیگا کہ یہ سکے خود نہایت نایاب ہونگے۔ سونے اور چاندی کے اگر اصل سکے خریدنے کیواسطے روپے نہوں تو نقلی کافی ہونگے۔

۳- **قدیمی اور موجودہ کلیں**۔ اِس الماری میں مختلف اقسام کی کلوں کے نمونے ہونے چاہئیں یہاں ہر قسم کے انجن، ہر قسم کے جہاز اور ہر قسم کی کلوں کے چھوٹے نمونے بکتے ہیں۔ اُن کے پُرزے مثل اصل کے ہوتے ہیں اور یہ مثل اصل کے کام کرتے ہیں۔ اُن کی اوسط قیمت دس ۱۰ روپیہ ہے اور دو سُو روپئے میں عمدہ قسم کے بیس ۲۰ نمونے مہیا ہوسکتے ہیں۔

۴- **انڈے**۔ ایک الماری مختلف جانوروں کے انڈوں کے لئے ہونی چاہیئے۔

۵- **جانور**۔ مختلف اقسام کے جانور مع پر وغیرہ اسٹف کراکر جمع ہونے چاہئیں۔ اور مختلف قسم کی تیتریاں اور چھوٹے کیڑے بھی اِس میوزیم میں موجود ہونے چاہئیں۔

۶- **کھیل**۔ اسمیں قدیمی اور موجودہ کھیل ہونے چاہئیں۔ موجودہ کھیلوں میں کنڈرگارٹن کھیلونکو

بھی شامل کرتا ہوں۔ کنڈرگارٹن کھیلوں کا جو کچھ بھی رتبہ ہماری آیندہ تعلیم میں ہو۔ مگر کوئی اس سے اختلاف نہیں کر سکتا کہ اِن کھیلوں کا موجود ہونا ہمارے میوزیم کے لئے ازحد ضروری ہے۔ کنڈرگارٹن کھیلونکی قیمت کا اوسط قریب دو روپیہ ہوگا۔ میرے نزدیک تین سو روپے میں قریب ڈیڑھ سو مختلف کھیلونکا عمدہ مجموعہ جمع ہو سکتا ہے۔ پُرانے کھیل بتدریج جمع ہوتے رہینگے۔

۷۔ **جیامیٹری کی شکلیں و میکینکس کے نقشے۔** غالبًا عام لوگوں کو معلوم ہوگا کہ انگلستان میں اقلیدس کی تعلیم موقوف ہوگئی ہے اور اُسکی بجائے موجودہ علم ہندسہ کی تعلیم ہوتی ہے۔ اور ہندوستان میں بھی اس انقلاب کا زمانہ جلد آنیوالا ہے۔ نئے علم ہندسہ اور اقلیدس میں ایک بڑا فرق یہ ہے کہ اقلیدس میں تمام شکلیں کاغذ پر لکیریں کھینچکر پڑھائی جاتی ہیں اور نئے علم ہندسہ میں اُن کی تدریس عملی طور پر موٹے کاغذ یا لکڑی کی کٹی ہوئی شکلوں سے ہوتی ہے۔ اِن چیزوں کی ضرورت تو اسوقت ہتل لائبریری کے ہے۔

۸۔ **میجک لنٹرن سلائڈس۔** اِسوقت کالج میں نہایت عمدہ میجک لنٹرن اور ایک عمدہ ذخیرہ سلائڈس کا بھی موجود ہے جو کہ کچھ عرصہ ہوا حاجی محمد اسمٰعیل خاں صاحب رئیس دتاولی نے انجمن الفرض کو عطا فرمایا تھا۔ ڈیوٹی ہر سال اپنے سالانہ جلسہ میں میجک لنٹرن کا تماشا دکھاتی ہے اور غالبًا اُن ہی تصویروں کو بار بار دکھانے سے تماشہ دکھانے والے اور تماشہ بین دونوں تھک جاتے ہونگے۔ غالبًا ڈیوٹی خود بھی مذاق کی مختلف سلائڈس جمع کریگی جو کہ نہایت سستی آسانی کے ساتھ دستیاب ہوسکتی ہیں۔ سلائڈس سے میرا مطلب تفریح کی تصویروں سے نہیں ہے بلکہ اُن تصویروں سے جو کہ کسی خاص چیز کے سکھانے میں استعمال کیجاتی ہیں۔

اِسپر غالبًا میوزیم کو روپیہ صرف کرنیکی ضرورت نہیں ہوگی۔ کالج کے بہتسے احباب مختلف اقسام کی سلائڈس خود بنا کر یا خرید کر خوشی سے کالج کی نذر کرینگے۔ چند مہینے کا عرصہ ہوا میں اینتھراپولوجی پر لکچر سُن رہا تھا۔ پروفیسر ڈاکٹر ہیڈن نے دُنیا کی تمام قوموں کے آدمیوں کے چہروں کی ساخت میجک لنٹرن کے ذریعے سے طالبعلموں کو دکھائی۔ اُنھوں نے مہربانی فرماکر (۵۰) پچاس میجک لنٹرن

سلائڈس مجھے دیدیں جو کہ میں میوزیم کی نذر کرنے کے لئے تیار ہوں۔ بشرطیکہ اس قسم کا میوزیم تیار کرنیکا ارادہ ہو۔ کالج کے اور بہت سے دوست لندن کی زندگی، کسان کی زندگی، شہر کی زندگی، یونیورسٹی کی زندگی کے متعلق مختلف اقسام کی سلائڈس کالج کو پیش کرنیکے لئے تیار ہو جائینگے۔

اِسوقت تک مینے اُن چیزوں کا تذکرہ کیا ہے جنھیں سے اکثر ہمیں یورپ سے جمع کرنی ہونگی۔ خود ہندوستان میں بہت سی نایاب چیزیں ہر قسم کی جمع ہو سکتی ہیں بشرطیکہ تھوڑی سی کوشش کیجائے۔ اِن چیزوں کی کوئی حد نہیں ہے اور تھوڑے سے غور کے بعد چند عنوان الماریوں کے قائم ہو سکتے ہیں۔ میرے ایک دوست نے مجھسے کہا کہ برلن کے ایک میوزیم میں وہ رُومال بھی رکھا گیا ہے جو کہ پارسال قیصر جرمنی نے اپنے زخم پر ڈاکٹر آنے سے پہلے باندھا تھا میرے دوست نے اِس مثال کو اس غرض سے پیش کیا تھا کہ جرمنیوں کو معمولی چیزیں بھی نایاب معلوم ہوتی ہیں۔ بہرحال اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جرمنیوں میں چیزوں کو حفاظت سے رکھنے اور اُن کی وقعت کرنیکا مادہ کسقدر ہے۔ ہمیں اپنے میوزیم میں اپنے لیڈروں کی چہیتی چیزوں کو بھی حفاظت سے رکھنا چاہئے۔ میرے دوست شیخ عبداللہ صاحب کو وہ وقت یاد ہوگا جبکہ وہ نہایت قلق کے ساتھ بیان کر رہے تھے کہ کالج میں کوئی جگہ ایسی نہیں ہے جہاں وہ سید صاحب کی دوات، بیک صاحب کا کاغذ دبانیکا پتھر اور ٹینس کا بلّہ جسکی تاریخ میں اسوقت بیان نہیں کرونگا محفوظ رکھتے۔ ایک زمانہ آئیگا کہ وہ تمام لوگ جو کہ ہماری موجودہ ترقی کے بانی ہیں ہم میں بطور داستان موجود ہونگے۔ اسوقت ہماری نسلوں کیلئے اُنکی چہیتی چیزیں مایۂ ناز ہونگی۔

اتفاق سے اِس مضمون لکھتے وقت میرے دو دوست آگئے اُن میں سے ایک شخص نے کہا کہ وہ پندرہویں صدی کی چھپی ہوئی دو کتابیں جو کہ اِسوقت بہت نایاب ہیں نذر کرنے کے لئے تیار ہیں، اور دوسرے صاحب نے کالج کے لئے ہر قسم کی میجک لنٹرن سلائڈس خود بنا کر نذر کرنے کا وعدہ کیا۔

ضیاء الدین احمد

# قسطنطنیہ کے چشم دید حالات

محمود عنان ایک مصری سیاح نے جو اِس سال جرمنی اور آسٹریا کی سیر کے لئے گیا ہے، راستے میں قسطنطنیہ میں قیام کرکے وہاں کے چشم دید حالات قاہرہ کے مشہور روزانہ اخبار (اللواء) کو تحریر کئے ہیں جو ۱۲۔ستمبر کے اللواء میں درج ہیں، چونکہ یہ حالات ایک سیاح کے چشم دید ہیں، اسلئے زیادہ اعتبار کے قابل ہیں، اِن سے معلوم ہوتا ہے کہ ترکوں میں تہذیب و شائستگی روز بروز ترقی کرتی جاتی ہے اور وہ زمانہ قریب ہے کہ ہماری اِس اسلامی سلطنت کا نام بھی شائستہ سلطنتوں میں شمار ہونے لگے، چونکہ یہ حالات اُن افواہوں کے خلاف ہیں جو سلطنت ترکی کی نسبت انگریزی اخبارات میں مشتہر ہوتے رہتے ہیں اسلئے اُمید ہے کہ دلچسپی سے دیکھے جائینگے، اور حسب ذیل ہیں۔

میں اِس سال جرمنی اور آسٹریا کی سیر و سیاحت کا ارادہ کرکے مصر سے روانہ ہوا تھا۔ یونان پہونچکر خیال ہوا کہ قسطنطنیہ کے راستے سے جانا بہتر ہوگا۔ چونکہ مصر میں سُنتا تھا کہ قسطنطنیہ میں عام سیاحوں اور خصوصاً مصریوں کے لئے دقتیں اور مشکلیں پیش آتی ہیں، اور پروانہاے راہداری وغیرہ کی صعوبتیں جھیلنا پڑتی ہیں، اسلئے یہ ارادہ تھا کہ وہاں صرف چند گھنٹے قیام کرکے جب بحرِ اسود کو جانیوالا کوئی جہاز ملے اُسپر روانہ ہو جاؤنگا مگر قسطنطنیہ پہونچکر اسکے برعکس معاملہ پیش آیا اور اِس اسلامی دارالسلطنت کا عجیب اور حیرت خیز حال معلوم ہوا، جس سے اُس کی عزت دل میں پیدا ہو گئی۔

عثمانیو! اپنی گذشتہ تاریخ اور سلاطینِ ماضیہ کے حالات کو خصوصاً اُس زمانے کے حالات کو جبکہ ہمارے خلیفۂ اعظم سلطان عبدالحمید خان خلد اللہ ملکہٗ و سلطنتہٗ سریرِ خلافت پر متمکن ہوئے تھے، غور سے پڑھو اور اُس زمانہ کو زمانۂ حال سے مقابلہ کرو۔ تمکو معلوم ہو جائیگا کہ حضور سلطان المعظم زمانۂ موجودہ میں اعلےٰ درجے کے مدبرین اور بادشاہوں میں ایک ممتاز درجہ رکھتے ہیں، اور ہر پیش آنیوالی مصیبت اور مشکلات کا

مقابلہ ایسی فراست اور حزم واحتیاط، دُور اندیشی اور استقلال سے کرتے ہیں، جسکی نظیر اِسوقت سلاطینِ عالم میں نہیں مِلسکتی۔

اگرچہ ممالکِ شاہانیہ ڈارڈنیلز اور آسفورس جیسے مضبوط سواحل سے محصور ہیں لیکن کیا عثمانی قوم بھی بمثل دیگر اجنبی (یورپین) اقوام کے یکدل ویکزباں ہیں؟ ہرگز نہیں۔

باوجودیکہ اختلاف اور عناد ہم لوگوں میں جاگزیں ہے، تعصباتِ مذہبی ہمارے گروہوں کے رگ پے میں بسا ہوا ہے، اور دوَلِ غیر کی طمع ہمارے ممالک کے ہضم کرنے کے لئے بڑھتی جاتی ہے۔ لیکن حضور سلطان المعظم ہی کی ذاتِ مقدس ہے، جو اِن تمام عناصرِ مختلفہ پر نہایت دانائی اور حکمت عملی سے حکومت کرتی ہے۔

اپنے مصری بھائیوں کیطرح میں بھی یہاں آنیسے پہلے یہی سمجھتا تھا کہ ابتک ترکی گردابِ جہالت میں پھنسے ہوئے ہیں، مگر اب معلوم ہوا کہ معاملہ بالکل برعکس ہے جو شخص ترکوں میں رہے اور بصدق دل سے اُن کے حالات پر غور کرے، اُسکو معلوم ہو جائیگا کہ ترکی قوم ایک منتظم حالت میں ہے۔ سکون، ادب، شجاعت عمدہ تربیت اُنکا قومی شعار ہو گیا ہے۔

ترکی سپاہی وردی پہنے ہوئے قاعدے اور پابندی چُستی چالاکی کے اعتبار سے بعینہ یورپین سولجر معلوم ہوتا ہے۔ اُس کی خودداری نے قوم اور مُلک کی نظروں میں عزت اور وقار پیدا کر دیا ہے ہر سپاہی اپنے فرائضِ منصبی کو ادا کرتے ہوئے اپنی عقل وتمیز کیوجہ سے حکومت کا قائم مقام معلوم ہوتا ہے۔ فرانسیسیوں کو اپنے سپاہیوں کی عزت اور حُرمت کرتے ہوئے دیکھکر مجھے تعجب ہوتا تھا لیکن آج ترکی سپاہی کو دیکھکر میرا تعجب اُس سے بھی زیادہ بڑھ گیا۔ افسرانِ لشکرِ عثمانی اپنی وردیاں پہنے ہوئے جب رستے میں گذرتے ہیں، اخلاق وآداب، ہمت وشجاعت کی تصویرِ مجسّم معلوم ہوتے ہیں۔

ایک مصری جسکو اپنے وطن سے سچی اور دلی محبت ہو جسوقت ترکی وزراءِ سلطنت کا وزراءِ مصر سے مقابلہ کریگا وہ پائیگا کہ بڑے سے بڑا وزیر خلق اور صفاتِ عالیہ کی زندہ مثال ترکوں کی ہے

وہ نہایت سادہ طور سے زندگی بسر کرتے ہیں۔ اور شریعت کے طور پر اپنی قوم سے بھائیوں کیطرح برتاؤ کرتے ہیں لیکن جب ڈیوٹی پر ہوتے ہیں تو شیر معلوم ہوتے ہیں۔

رشوت ستانی کا الزام بھی ٹھیک نہیں ہے۔ میں نے بذاتِ خود خاص طور پر اس امر کو جانچا ہے جو لوگ سواحل پر متعین ہیں اُن میں اعلےٰ سے لیکر ادنےٰ تک کسیکو اسکا مرتکب نہیں پایا گو کہ وہ چاہیں تو تمام محاصل کو جسکی تعداد کچھ کم نہیں ہے، ہضم کر سکتے ہیں۔ میں نے گھنٹوں علیحدہ کھڑے ہو کر غور سے دیکھا ہے اور بعض کاموں کیوجہ سے بعض دیگر اہلکاروں سے ملنا بھی ہوا۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ چھوٹے اور بڑے سب کو اپنی عزت اور آبرو کا بہت پاس و لحاظ ہے۔ گورنرانِ ممالک کی نسبت یہ الزام لگایا جائے تو اسکا مجھے علم نہیں۔ میں نے دولتِ علیہ کی مالی حالت پر بھی غور کیا ہے اور اُسکو عمدہ منتظم حالت میں پایا ہے۔ البتہ بعض ضروریات کیوجہ سے کبھی کبھی مالی مشکلات پیش آجاتی ہیں۔ مگر اب ہمیں بتلائیے کہ دولتِ علیہ کیطرح دُوَلِ یورپ میں سے کسکو ہمیشہ جنگ کیلئے طیار اور آمادہ رہنا پڑتا ہے۔ اِسوقت تین لاکھ فوج حدودِ مملکت پر مستعد موجود ہے اُسکا کیا خرچ ہوگا؟ ایک لشکر جرار جنگ کے لئے ہر وقت طیار رکھنا پڑتا ہے تاکہ جو حوادث پیش آئیں فوراً اور بروقت اُنکا تدارک ہو سکے۔

کیا یہ امور مالی ضروریات پیش آتی رہنے کا کافی سبب نہیں ہیں؟ یورپ کی کونسی سلطنت ہے جو دولتِ علیہ کیطرح ہر وقت مستعد کارزار رہے اور اُسکو افلاس کی شکایت نہو۔ پس ایسی حالت میں سلطنتِ علیہ پر ہم کیا الزام لگا سکتے ہیں۔

**عورتوں کی عزت** مجھکو تعجب ہوتا تھا کہ اہل یورپ اپنی عورتوں کی اسقدر عزت اور احترام کرتے ہیں مگر جب میں نے مصر اور قسطنطنیہ کی عورتوں کا مقابلہ کیا تو تعجب و حیرت کی کچھ انتہا نہیں رہی۔ مصری عورتوں کا حزن و ملال بیجا نہیں ہے کیونکہ قسطنطنیہ کی عورتیں تمام عالم کی عورتوں سے خوش حال اور صاحب نصیب ہیں۔ ترکی عورت کمال اور احترام کی مجسّم ویسی ہے۔ شہر کی سڑکوں اور گذرگاہوں پر نہایت آزادی اور اعزاز و اکرام کے ساتھ چل پھر سکتی ہے، اس بارہ میں وہ یورپین لیڈی کی مثل ہے

مگر حسن و جمال و درستیِ لباس میں اُن سے بڑھ کر ہے۔ ترکوں سے زیادہ کوئی قوم اپنی عورتوں کی عزت کرنیوالی اور اُن کے وجود کو غنیمت سمجھنے والی نہیں ہے۔ مصری عورتوں کیطرح وہ تنگ و تاریک چلغانوں میں قید نہیں ہوتیں۔ بلکہ اُن کی ریاضت کے لئے خاص مقامات مقرر ہیں اور تفریح کیلئے خاص زنانہ تھیٹر ہیں، باغوں میں قہوہ خانے اور تفرج گاہیں ہیں لیکن کیا کوئی شخص اُن میں جانیکی، اُن کی طرف بیجا طور پر نظر اُٹھانے کی جرأت کرسکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔

**قومی عزت** یہاں کے باشندے اپنی خود بھی عزت کرتے ہیں اور تمام اجنبی قومیں اُن کی عزت کرتی ہیں اور سلطنت نہایت عدالت اور انصاف کیساتھ اُن کی امداد کرتی ہے۔ حکومت کے نزدیک بڑے سے بڑا شخص اجنبی اقوام کا انصاف کے وقت ادنےٰ دیسی کی برابر ہے اسلئے آپ دیکھتے ہیں کہ تمام قوم عزت اور وقعت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے۔ یہاں دیسی اور پردیسی میں کوئی تمیز نہیں کیجاتی۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ اجنبی اقوام اپنے ہم قوموں کے مقابلے میں ترکی پولس کو امداد دیتے ہیں اور اُس سے محبت اور الفت رکھتے ہیں۔

**حفظِ ناموس** کیا آپ دارالسعادت کی کوئی دیسی عورت بتا سکتے ہیں جو بہ اجازت یا بلا اجازت اپنی عزت و ناموس کو برباد کرتی ہو یا اپنے ابنائے جنس کے سامنے ناچتی ہو۔ کیا تم کبھی اپنی آنکھ سے ایسا امر دیکھ سکتے ہو یا کسی اجنبی سے اسکی بابت سن سکتے ہو۔؟ نہیں ہرگز نہیں۔ دیسی اور اجنبی اور تمام دنیا کے لوگ اسکے شاہد ہیں کہ ترکوں میں یہ امر کبھی نہیں پایا جاسکتا۔

**قسطنطنیہ میں آزادی** قسطنطنیہ کے یورپین حصّے کا جہاں ممالکِ غیر کے عیسائی آباد ہیں حکومت کی طرف سے خاص اہتمام و انتظام ہے اُن کے لئے خاص خاص باغ بنائے گئے ہیں جہاں روزانہ ۵ بجے شام سے ۱۱ بجے رات تک علمِ موسیقی کے اصول کے مطابق گانا ہوتا ہے، اور یہ حصّہ تھیٹروں وغیرہ سے تمام رات صبح تک گلزار رہتا ہے۔ اُس میں جانے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یورپ کے کسی شہر میں آگئے۔ مگر جس حصّے میں مسلمان آباد ہیں، وہاں مصر کیطرح تھوڑی رات گئے کے بعد سنّاٹا ہو جاتا ہے۔

**سیاحوں اور اجنبیوں کے لئے آزادی** سیاحوں کو یہاں بھی یورپ کیطرح آزادیِ تمام حاصل ہے، نہ کوئی

شخص اُن سے تعرض کرتا ہو نہ پولس اُن کے درپے رہتی ہو۔ سیاح اپنی خواہش کے موافق بلاخوف و خطر ہر طرف ایسے ہی پھر سکتا ہے جیسے مصر میں۔ میں یہاں آنیسے قبل سُنا کرتا تھا کہ قسطنطنیہ میں جو شخص کسی پولٹیکل امر پر گفتگو کرتا ہے وہ قید کر دیا جاتا ہے۔ لیکن یہاں پہونچکر معلوم ہوا کہ یہ سب گپتیں ہیں۔ یہاں ہر طرح سے آزادی حاصل ہے کہ جو شخص جس امر پر چاہے بلاخوف و خطر گفتگو کرے، اور جس سے چاہے ملے تمام دُنیا کیطرح یہاں بھی آزادی حاصل ہے اور جو کچھ اسکے خلاف قسطنطنیہ کے بارہ میں مشہور ہے وہ محض افترا ہے۔ سیاحوں کو آزادی ہے کہ باسفورس کے کناروں پر جو اکثر بلاد یورپ سے افضل ہیں جبتک چاہے قیام کرے۔

اگر ہم (اہلِ مصر) ترکوں سے تعلقاتِ قرابت قائم رکھتے اور اُن کی عورتوں سے تمدنِ حقیقی اور کمالِ طبیعی کی اپنی اولاد اور لڑکیوں کو تعلیم دلاتے تو ہم بھی بہت قلیل عرصے میں ایسے ہی عزت اور احترام کی حالت میں ہوجاتے جیسے کہ وہ ہیں۔

سعید احمدؔ

# ڈلائی لاما کے تاریخانہ حالات

ملکِ تبت میں 'مہم' یا 'مشن' کے بھیجے جانے سے اخباری دُنیا میں ایک ہل چل مچگئی ہے اور سات ستمبر کو کرنل ینگھسبنڈ نے بڑی ہوشیاری و دانشمندی سے عہدنامہ کو اہلِ تبت سے منظور کرالیا ہے اور عہدنامہ کی منظوری ایسی حالت میں ہوئی ہے، جبکہ تبت کا بڑا مہنت ڈلائی لاما اپنے دار السلطنت سے فرار ہے اور بہت اندیشہ ہے کہ اُسکے واپس آنے پر عہدنامۂ منظور شدہ تسلیم کیا جائیگا یا نہیں، اور اُسپر عملدرآمد ہوگا یا نہیں۔ ایسی حالت میں خیال کرتا ہوں کہ اُردو داں ناظرین کی خدمت میں اس بڑے مہنت کے تاریخانہ حالات پیش کرنا دلچسپی سے خالی نہوگا، کیونکہ ابتک اُردو اخباری دُنیا میں اسکے متعلق مفصل اور اصلی حالات سے واقفیت دلانے والے مضامین کم شائع ہوئے ہیں۔

ملکِ تبت دُنیا کے عجیب و غریب مُلکوں میں سے ہے، اُسکے عجائبات کی سیر بیرونی دُنیا کی

صرف دو ایک اشخاص کو نصیب ہوئی ہے، اور وہ بھی بڑی دقتوں اور مشکلوں کے بعد۔ یہاں قدرت کے عجیب و غریب منظر ہیں۔ کہیں تو بالکل ویران اور صحرائی ملک ہے جسمیں بجز ریتے اور خاک اڑنے کے نہ کہیں گھاس کا نام و نشان ہے اور نہ کوئی جانور نظر آتا ہے۔ تھوڑی دور چلو اور عجیب و غریب مقامات میں پہونچ جاتے ہو۔ جہاں سبزہ بھی ہے اور اونچے اونچے پہاڑ بھی ہیں، جو ہمیشہ برف کی چادر اوڑھے رہتے ہیں۔ ان پہاڑوں کا سماں ایک مظاہر قدرت کے عجائبات میں سے ہے ان اونچے اونچے پہاڑوں کے عکس کیوجہ سے چھوٹی چھوٹی گھاٹیاں اور تنگ درے بہت خوفناک معلوم ہوتے ہیں کہیں ایسے مقامات ہیں جہاں دن اور رات میں کچھ فرق نہیں معلوم ہوتا۔ ہندوستان کی طرف تبت کی سرحد میں اسقدر برف اور پالا پڑتا ہے کہ الاماں الاماں۔ یہاں خوفناک پہاڑی راستوں اور بلند گھاٹیوں کا سلسلہ ایسا نامتناہی ہے کہ اگر کوئی شخص ہفتوں سفر کئے جائے تو بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ میں ابھی پہاڑوں کے بیچ میں ہوں۔ ایسے ملک کا دارالسلطنت لاسہ ہے جس میں صرف چار فرنگی مہم تبت کے پیشتر داخل ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر سوین ہیڈن جو وسطی ایشیا کا بہت بڑا سیاح ہے، سنہ ۱۹۰۱ء میں اس جادو آباد کیطرف روانہ ہوا لیکن اپنے مقصد میں ناکامیاب رہا۔ اس ڈاکٹر سیاح نے اپنی صورت منگولی جاتریوں کی سی بنائی ہوئی تھی۔ اسکا سر منڈا ہوا اور مونچھیں کٹی ہوئی تھیں۔ لیکن ڈلائی لاما کو الہام ہوا اور اسنے اس سیاح کا لاسہ کیطرف بڑھنا روک دیا۔ ہر ایک فرنگی کے لئے ڈلائی لاما کا سخت حکم یہ تھا کہ وہ مرد ناپاک "پاک زمین" میں نہ آنے پائے۔

تبت میں اصل حکومت لاما کرتے ہیں۔ یہ لوگ مذہبی پیشیرو ہیں، اور مذہبی رہنمائی کے ساتھ ساتھ انھیں دنیوی اقتدار بھی بہت کچھ حاصل ہے۔ اس ملک کی مختصر کیفیت لکھنے کے بعد ان لاماؤں کی سرگروہ یعنی لاما، اعظم کے حالات ہمارے ناظرین کے لئے دلچسپی سے خالی نہونگے۔ لاما اعظم کو بدھ مذہب کا پوپ سمجھنا چاہیئے، جسکو الہامی قوتیں حاصل ہیں۔ اہل تبت کی ابتدائی تاریخ خلاف قیاس افسانوں سے پر ہے اور اس ملک کے ابتدائی حالات لکھنے میں ان دور از قیاس روایات کو ترک کرنا مشکل ہے۔ اوائل تاریخ میں اہل تبت نہایت جنگجو تھے، اور ان کے سردار محض اپنی ذاتی طاقت اور

جرأت کے کارناموں کی بنا پر منتخب کئے جاتے تھے، یہ وہ زمانہ ہے جبکہ بدھ مذہب نے تبت میں قدم نہیں رکھا تھا، اور وہاں کے لوگ اِس بڑی برکت سے مستفیض نہیں ہوئے تھے۔ یہ وہ زمانہ ہے جبکہ وہ لکھنا پڑھنا کچھ نہ جانتے تھے، اور نہ بر اعظم چین کے تحت میں تھے۔ اِس زمانے کی تاریخ کا مؤرخوں نے مختلف ذرائع سے پتہ لگایا ہے۔ اور کہا جاتا ہے کہ یہ زمانہ چار سو یا پانچ سو سال قبل از مسیح تھا۔ اس زمانے کے چینی مؤرخ اپنے ہمسایہ یعنی اہلِ تبت کا سخت الفاظ میں ذکر کرتے ہیں کہ وہ وحشی مطلق تھے، اور اُن کو جانوروں سے تشبیہ دیتے ہیں، وہ گلّہ بانی کرتے تھے، اور چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں پھرا کرتے تھے اور آپس میں لڑتے بھڑتے رہتے تھے۔ اُن کے بیان سے ڈاروِن کے مسئلے کی تصدیق ہوتی ہے، وہ نہایت فخر سے کہتے ہیں کہ ہمارا مورثِ اعلیٰ ایک بندر تھا، جو کوہِ ہمالیہ کو عبور کر کے تبت میں آیا، اور وہاں کوہستان کی ایک بھوتنی سے اُس نے شادی کی۔ کہا جاتا ہے کہ کوہستان کی "روح مہربان" نے (جسکا ظہور بصورتِ انسان لاما، اعظم کی شکل میں ہوا) چند دانے گیہوں کے اُن کے سامنے ڈال دیے، جنکو اُن دونوں نے بڑی خوشی اور رغبت سے کھایا اور اُن کی اولاد عجیب غریب پیدا ہوئی۔ اُن کی دُم اور بال رفتہ رفتہ جھڑتے گئے، اور آخر کار بالکل غائب ہو گئے۔ اِس عجیب "روح مہربان" نے اُن بندروں کو اپنی خاص عنایتِ رحمانی سے جامۂ انسانیت پہنایا اور تہذیب و روشنی کے راستے دکھلائے۔ ان کے طور و طریقوں میں اُن کے مورثانِ اعلیٰ کی خصلتیں اب تک پائی جاتی ہیں، جو اِس عجیب و غریب دیومالا کی تصدیق کرتی ہیں۔

ساتویں صدی عیسوی تک اُنکی تاریخ دھندلی ہے۔ ساتویں صدی میں اس وحشی قوم نے اپنے ہمسایوں پر حملہ کرنا شروع کیا اور اُن کے حملے نہ محض ہندوستان پر ہوئے بلکہ چین کے شہنشاہ کو نہایت مغلوب کیا۔ اس زمانے میں فرمانروائے تبت رانگسن گمپو (                ) تھا جسکی عمر صرف ۲۳ سال کی تھی لیکن شہنشاہِ چین اسقدر مغلوب ہوا کہ اُسکو اپنی پیاری بیٹی حاکمِ تبت کے عقد میں دینی پڑی یہ وہ زمانہ ہے جبکہ بدھ مذہب چین میں عام ہو گیا تھا، اور اسکی شہرت اِس کوہستانی اور عجیب و غریب ملک میں ہو چکی تھی۔ یہ ملکہ بدھ مذہب رکھتی تھی۔ اُسنے اپنے خاوند کے دل پر اسقدر تسلط کیا کہ وہ بیچارہ اپنے

ملک کی خاطر مجبور ہوا کہ اِس مذہب یزدانی کی اشاعت اپنے ملک میں کرے۔ اسکے بدھ مذہب اختیار کرنے کا ایک عجیب قصہ ہے، جسکو ہم بخیالِ طوالت اسوقت نظر انداز کرتے ہیں۔ وہ بادشاہ اِس پاک مذہب کی اشاعت میں اسقدر محو ہوا کہ اسنے بانیِ مذہب کیطرح اپنی عمر و دولت و سلطنت اسکے نذر کردی۔ اِس عظیم الشان بادشاہ کے عہدِ سلطنت میں دار السلطنت لہاسہ کی بنیاد پڑی، اور رفتہ رفتہ یہ شہر بدھ مذہب کا مرکزِ عبادت بنا۔ ہند کی تاریخ سے پتہ لگتاہے کہ یہاں سے بدھ مذہب کے بڑے بڑے علما تبت میں مدعو کیئے گئے۔ اور اُن کی وہاں بڑی آؤ بھگت کیگئی۔ اِن لوگوں کو تبت میں مدعو کرنے سے دو مقصد تھے۔ اوّل یہ کہ تبتی زبان کو ترقی دیں، اور جو ترقی سنسکرت اور اُس کی شاخوں میں ہوئی تھی اُسکا اثر اس زبان میں پہونچائیں، دوسری غرض یہ تھی کہ جو مذہبی کتابیں ہند سے وہاں لائی گئی تھیں، اُنکا تبتی زبان میں ترجمہ کیا جائے۔ اب میں یہ بتلانا چاہتا ہوں کہ اُسوقت ہند میں بدھ مذہب کی کیا حالت تھی۔ آٹھویں عیسوی صدی میں ہندوستان میں اس مذہب کے ساتھ برہمنوں کی مخالفت کم کرنے اور اُن کے نوساخت مذہب کی روک تھام کے خیال سے، جسکی تلقین پُران کرتے ہیں، بدھ مذہب کے مہنتوں نے اپنے پاک مذہب میں بہت سی ایسی باتیں شامل کردی تھیں جو بانیِ مذہب کی تلقین کے بالکل خلاف تھیں، اور بدھ مذہب اِن آمیزشوں سے خراب ہوگیا تھا، اُس میں بُت پرستی شروع ہوگئی تھی۔ اِس خراب حالت میں یہ مذہب تبت میں پہونچا اور وہاں کی اوہام پرستی نے اُسے اور بھی کایا پلٹ کردیا۔

اِس مذہب کے محافظ لاما تھے، جنکا میں نے پیشتر ذکر کیاہے۔ اِن لوگوں نے مذہبی اختیارات پر کُلی قبضہ کرلیا، اور پُرانی عمارت کو نیست و نابود کرکے اُنھوں نے اپنے تئیں اسقدر زبردست بنالیا کہ سارا ملک اُن کے ہاتھوں میں مثل ایک کٹھ پتلی کے تھا جسطرف چاہا نچایا۔ تمام ملک کی زمامِ اختیار لاماؤں کے ہاتھ میں تھی، اور اُنکا سرگروہ لاما اعظم کہلاتا تھا۔ اٹھارویں صدی عیسوی تک روما کے پوپ کے اختیارات بھی اسی قسم کے تھے جو اسوقت تک لاماؤں کو حاصل ہیں۔ مگر فرق یہ ہے کہ پوپ کے محکوم لوگ مہذب اور مختلف اقوام کے تھے، جنھوں نے مختلف سلطنتیں قائم کیں اور پوپ کو دُنیاوی اختیارات سے

محروم کردیا - اور لاما اعظم کے محکوم لوگ وحشی اور جاہل ہیں، جو اب بیسویں[20] صدی کی روشنی میں بھی اُسکو خدا کا اوتار سمجھتے ہیں، اور گو اُنھوں نے جبرًا یا مصلحتًا اِسوقت عہدنامہ کو قبول کرلیا ہے لیکن دل اُنکا دھڑک رہا ہے کہ لاما اعظم کا عتاب اُنپر نازل ہوگا - اور پھر اُنکا ملک اور اُن کی قوم وحشیوں اور بندروں کی صورت میں منتقل ہوجائیگی -

تیرھویں[13] صدی تبت کی تاریخ میں ایک مشہور زمانہ ہے - ۱۲۵۲ء میں قبلہ خاں منگولیہ شہنشاہ اعظم تھا - اُسنے تبت کے لاما اعظم کو اپنی تاجپوشی اور مسند نشینی کیوقت مدعو کیا، اور اسقدر آو بھگت کی کہ اُس زمانے کے پوپ کو بھی نصیب نہیں ہوئی ہوگی - اب یہ ایک نیا حق تھا جو لاما اعظم کو حاصل ہوا تھا - مگر یہ سلسلہ عرصۂ دراز تک جاری نہیں رہا - یورپ میں زمانۂ تاریک میں پوپ کو اختیار دیا گیا تھا کہ وہ بادشاہ کے سر پر تاج رکھے، لیکن یہ عزت لاما اعظم کی تاریخ میں صرف ایک مرتبہ حاصل ہوئی، اور پھر ہمیشہ کے لئے مفقود ہوگئی - شہنشاہ نے شکرگزاری میں تبت کے شاہی خاندان کو تخت سے اُتار دیا اور لاما اعظم کو سلطنت کے اختیار دیئے لیکن یہ واقعہ بھی عجیب طور سے بیان کیا جاتا ہے اور ہم اُسکو بنظر طوالت اِس موقعہ پر تحریر نہیں کرتے -

واضح رہے کہ قبلہ خاں ایک روشن خیال حاکم تھا - اُسکے اور نیز اُسکے باپ چنگیز خاں کے حالات ایک فرنگی مارکو پولو نامی نے لکھے ہیں جو اُسکے دربار میں تھا - یہ حاکم علم دوست تھا اور اسے سچے مذہب کی تلاش تھی اور اسکے دربار میں کنگ فوزی اور عیسائی پادری موجود رہتے تھے اور مذہبی مباحثے ہوا کرتے تھے - چنانچہ ایک روز معجزہ کے متعلق بحث ہوئی اور نتیجہ یہ ہوا کہ اس بادشاہ نے بدھ مذہب اختیار کیا

جب چین میں خاندان منگولیہ کا اثر جاتا رہا اُسکے کا اہلک شاہزادے سرحد منگولیہ سے نکل سرحد سائبیریا میں داخل ہوئے، تو انکا تعلق تبت سے منقطع ہوگیا، اور اس حالت میں اُنھوں نے ایک نیا لاما اعظم منتخب کیا، جسکا مسکن جھیل کوکونور کے قریب شہر آرگا میں ہے - اور ان دنوں روسیوں کے اثر کے سامنے اُنکا اثر اور رسوخ محض نام کے لئے ہے - خاندان منگولیہ کی تباہی کیساتھ

لہاسہ کے لامار اعظم کی عظمت بھی کچھ عرصے کے لئے کم ہوگئی لیکن رفتہ رفتہ وہ عظمت پھر ترقی کرتی گئی اور ۱۶۴۱ء تک باقی رہی۔ ۱۶۴۱ء تبت کی تاریخ میں بہت مشہور ہے کیونکہ ترکستان کے وحشی باشندوں نے تبت پر حملہ کیا اور اس پرانی عقیدت کی لامائی حکومت کو تاراج کرنے کی کوشش کی۔ اسی زمانے میں بدھ مذہب کے مہنت اعظم کی ناقابلیت کو دیکھکر ایک مستعد نوجوان نے، جو ایک معزز خاندان سے تھا اور اسکے خاندان کو لاما کے ساتھ دیرینہ رقابت تھی، بلوہ کا جھنڈا بلند کیا، اور کل ملکی اختیارات اپنے رقیب سے چھین لئے، اور اپنے مربی تاتاری شہزادے غسری خان سے مدد مانگی کہ ایک مصلح فوج فوراً بھیجدے جو لاما کی رہی سہی طاقت کو بالکل توڑ دے اور ملک پر اسکا اثر قائم کرنے میں مدد دے۔ اس احسان کی شکرگزاری میں اسنے وعدہ کیا کہ غسری خاں کے لڑکے کو لہاسہ کی فوجی کمان دی جائیگی اور وہ تبت کا بادشاہ بھی کہلائیگا لیکن ساتھ اسکے یہ بھی جتلادیا کہ اصل حکومت کرنے والا وہ خود ہوگا، اسنے اپنا لقب "دلائی لاما یعنی "لاماے متبحر" رکھا۔ تبتی زبان میں لفظ "دلائی" یا "تلائی" کے معنی وسیع مثل سمندر ہیں۔ لاماؤں کے سلسلے میں یہ پہلا شخص تھا جس نے "دلائی" کا لقب اختیار کیا اور یورپ والوں میں وہ اسی لقب سے مشہور رہے۔

یہ لاما ایک بہت بڑا "پلوٹسٹ" تھا، جسکو ہم انگلستان کے کارڈنل وُلسی سے تشبیہ دیسکتے ہیں۔ اسکا اصلی نام لزانگ تھا، اور فصیح اسکا خطاب تھا۔ یہ شخص بلا کا آرٹسٹ اور اسپیکر تھا اور فطرتی طور پر پلوٹسٹ واقع ہوا تھا۔ اور تبت کی تاریخ میں اس سے بڑھ کر کوئی شخص نہیں گزرا ہے۔ مؤرخین کے نزدیک اسی شخص نے چار دانگ عالم میں مشہور کیا تھا کہ "روحِ مہربان" نے اسکے جسم میں حلول کرلیا ہے اور یہ بھی مشہور کیا کہ وہ اپنے رقیب کے مقابلے میں الہامی اور روحانی قوتیں رکھتا ہے۔ کیونکہ یاد رہے کہ اہلِ تبت بندر اور کوہستانی بھوتنی کی اولاد میں تھے۔ جنکے سامنے "روحِ مہربان" نے گیہوں کے دانے ڈال دیے تھے۔ تاکہ وہ کھائیں اور پھلیں۔ رانگسٹن گمپو پہلا مہنت تھا جسنے بانیٔ مذہب گوتم بدھ کے مانند سلطنت و دنیوی امورات کو اپنی بیوی کے انتقال کے بعد ترک کردیا تھا۔ یہ تبت کا پہلا حقیقی پوجاری تھا۔ اس بادشاہ کی بابت یہ کہا جاتا ہے کہ اسکے قلب میں "روحِ مہربان" کی جھلک

پڑی تھی لیکن لزانگ کے جسم میں وہ رُوح حلول کر گئی تھی - اِس "رُوح مہربان" کی بابت اہلِ تبت کا یہ عقیدہ ہے کہ وہ کوہستان کا دیوتا چنرازی تھا جسنے دُنیا کو ترک کر دیا تھا، اور نجات یعنی نزدان اُسے حاصل ہو گئی تھی نزدان نجات کی ایک منزل ہے جس میں انسان آوہ گون کی تکلیف سے چھوٹ جاتا ہے، اور تکلیف یا خوشی کی اُسے حس نہیں رہتی - اِس دیوتا نے بہتر سمجھا کہ وہ بہشت میں ہے اور دُنیا کے بھولے بھٹکوں کو راہِ نجات دکھلائے اور ناداروں کو مدد دیتا رہے - اسی اُصول پر نوجوان ڈلائی لاما لزانگ نے اپنے فائدے کی غرض سے اور اپنے رقیب کی مخالفت میں اپنے آباؤ اجداد کا شجرہ اس "رُوح مہربان" سے ملایا، اور اسکی تصدیق میں اپنی الہامی اور آسمانی قوت سے کتابِ مقدس کو پیش کیا جسکی بابت لوگوں کا یہ اعتقاد تھا کہ وہ ملک گمپو کی خود لکھی ہوئی تھی اور اُسکے انتقال کے بعد گم ہو گئی تھی - غرضکہ اس فریب اور دھوکے سے یا یہ کہئے کہ الہامی قوتوں کی وجہ سے اُسنے جاہل اہلِ تبت کے دلوں پر اور عقیدوں پر ایسا قبضہ کر لیا جو کسی طرح مٹنے والا نہ تھا اور نہ مٹا - اب تک اہلِ تبت ڈلائی لاما کی پیدائش کو مافوق العادت اور خاص آسمانی معجزہ سمجھتے ہیں - مخالف گروہ جو ان باتوں کو تسلیم نہیں کرتا تھا - "رُوح مہربان" کے اوتار کے ہاتھوں تہ تیغ ہوا - اور اُن کی خانقاہیں نیست و نابود کر دی گئیں - جنیرئیٹ گرب (   ) جو لہاسہ میں قریب ۱۶۵۶ء میں داخل ہوا تھا، اس بُدھ مذہب کی روح المقدس کی بابت عجیب عجیب باتیں لکھتا ہے لیکن طوالت کی وجہ سے ہم اُن کو نظر انداز کرتے ہیں -

تبت میں لہاسہ کے بعد تاسی لمپو یا شگاتسی بہت بڑا مرکزِ عبادت ہے اور یہاں بڑی بڑی خانقاہیں زرد* ٹوپ والوں کی ہیں - لزانگ نے اس خانقاہ کے بڑے پوجاری کو اپنا رفیق اور ہمدم بنالیا - اور اسے لامائے کبیر کا خطاب دیا - یورپ والے اس لاما کو تاسی لاما کے لقب سے جانتے ہیں کیونکہ اسکی سکونت ٹاشی لمپو میں ہے - ڈلائی لاما "رُوح مہربان" کا اوتار ہے، لیکن ٹاشی لاما میں کوئی آسمانی روشنی نہیں تھی - ڈلائی لاما کو پولیٹیکل کام بھی کرنے پڑتے تھے اور وہ مذہب کا پیشوا بھی تھا - ٹاشی لاما کو محض مذہب، عبادت، اور ریاضت سے سروکار تھا - اسلئے وہ تقدس اور فضل و ہنر میں

نوٹ* - لزانگ کے رقیب کی خانقاہوں کے ٹوپ سرخ تھے -

مشہور ہوا۔ قریب سو سال تک ان دو بڑے لاماؤں میں نہایت دوستی اور محبت رہی۔ ا
لاما کا جانشین گورنر جنرل وارن ہیسٹنگز کے زمانے کے سوداگر ستیاح باگلی کا بہت بڑا مربی ؛
اُسکی شرافت اور نیک نیتی کا باگلی کے دل پر نہایت عمدہ اثر ہوا تھا۔
اگرچہ لیزانگ قتل و خون سے گوتم بدھ کی سند پر بیٹھا تھا لیکن نہایت علم دوست تھ
سنے علم اور مذہبی فلسفہ کو نہایت ترقی دی۔ اُسنے اونچی پہاڑی پوٹالہ پر ایک بڑا محل بنایا جو
محل کے نام سے مشہور ہے۔ اس مکان کے متعلق عجیب و غریب معجزے نما ظہور ہوا جنکا ذ
مضمون کے خیال سے ترک کیا جاتا ہے۔ یہ عجیب و غریب شخص ۳۵ برس تک بہ حیثیت
لاما ملک میں سلطنت کرتا رہا لیکن بڑھاپے میں ایک خانقاہ میں گوشہ نشین ہوا اور اپنی گو
کے وقت ۱۷۰۶ء میں اسنے سلطنت کی باگ اپنے بیٹے ( ) سنگیاگ
کے ہاتھ میں دی، جو بطور نائب السلطنۃ حکومت کرنے لگا۔ یہ شخص پہلے درجے کا مکار دنیا
اور ڈپلومیٹسٹ تھا۔ اُسنے اپنے باپ کے مرنے کی خبر ۱۶ سال تک پوشیدہ رکھی اور اس اثنا
اُس کی قوت خوب مضبوط ہوگئی۔ پورا اقتدار حاصل ہونیکے بعد اُسنے ایک نوجوان لڑکے کو ؛
مشہور کیا۔ یہ لڑکا بہت بڑا عیاش اور حُسن پرست تھا۔ اُسنے عیاشی اسدرجہ کی کہ آخر کار لہ
باشندوں نے تنگ آکر بلوہ کیا اور نائب السلطنت کو قتل کر ڈالا لیکن تب بھی اس نوجوا
لاما کے اطوار درست نہ ہوئے اور اخیر میں اُنھوں نے شہنشاہ چین کی رضامندی سے اُ
کی سند سے اُتار کر مار ڈالا۔
اب یہ مشکل مسئلہ ہے کہ اگر اسکے جسم میں "رُوحِ مہربان" تھی تو پھر یہ حرکات ناشایستہ اُس
کیونکر سرزد ہوئے۔ بہرحال ہمکو اس مسئلہ پر بحث کی ضرورت نہیں۔ ناظرین خود اپنی عقل کو کا
نائب السلطنت کے قتل، اور ڈلائی لاما کی معزولی اور مارے جانیکے بعد ایک بے چینی
میں پھیلی، اور لوگوں کے عقیدوں میں فرق آنے لگا۔ مختصر یہ ہے کہ مہنتوں نے باتفاق را
مدرسہ طبیہ کے مہتمم لاما کو ڈلائی لاما منتخب کیا لیکن ساتھ اسکے یہ بھی مشہور کیا کہ مقتول او

رُوح معرلا مین عود کرآئی ہے اگرچہ اُس میں بُڑھاپے کے سبب رُوح مہربان" حلول نہیں کرسکتی۔ اِس نامزدگی کو شہنشاہِ چین نے بھی پسند کیا۔ مگر تھوڑے ہی عرصے میں ایک مخالف گروہ اُٹھا اور ایک طفل کم سِن کا استحقاق مذہبی مسند کی بابت جتلایا اور زور دیا کہ اس لڑکے کے جسم میں "روح مہربان" حلول کرآئی ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ فریقین میں جنگ شروع ہوئی اور تاتاریوں نے ۱۷۱۷ء میں لہاسہ پر قبضہ کرلیا اور طفل کم سِن کے حقوق پر زور دیا۔ تاتاریوں کی یورش اور لہاسہ پر قبضہ کرنے کی خبر سُنکر شہنشاہِ چین بیحد برانگیختہ ہوا اور ایک بڑی فوج لیکر اُس پاک شہر کی طرف روانہ ہوا اور تاتاریوں کو نکال باہر کیا اور اُنکے سردار کو شہر کے باہر پھانسی پر چڑھایا۔ شہر میں امن بہت جلد ہوگیا اور شہنشاہِ چین نے اہلِ شہر کی کثرتِ رائے کمسن طفل کے موافق دیکھکر ڈالائی لاما کے مسند پر اُسے بٹھایا لیکن ڈالائی لاما کے چند وسیع اختیارات چھین لیے۔ اور ایک چینی افسر کو کُل مُلکی اختیارات سُپرد کیے، مگر وہ ڈالائی لاما کے تحت تھا۔ اور دو چینی سفیر لہاسہ میں مقرر ہوئے جو اب امبان ( ) کے نام سے مشہور ہیں۔

خون کی ندیاں پھر بہنی تھیں۔ ڈالائی نے احسان فراموشی کرکے اپنے نائب السلطنت کو ۱۷۲۷ء میں مروا ڈالا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس وحشتناک خبر کو سُنکر شہنشاہِ چین نے ایک فوج کثیر لہاسہ پر بھیجی، جسنے اُسکو گرفتار کرلیا اور ہاتھ پیروں میں زنجیریں ڈال مقید کردیا۔ اور جن جن اشخاص پر سازش کا شُبہہ ہوا، اُن سبکو قتل کروا ڈالا۔ اور ایک معمر مہنت کیسری نامی کو مذہبی پیشوا منتخب کیا مگر اُسے کُل پولیٹکل اختیارات سے محروم کردیا۔ اور اس قسم کے اختیارات حاکم سوانگ کو دیے گئے۔ گو اُسے بادشاہِ تبت کا لقب بھی دیا گیا۔ اِن واقعات کی تصدیق ان عیسائی مشنریوں کی تحریرات سے ہوتی ہے جو اس زمانے میں لاسہ میں مقیم تھے۔ بدنصیب نوجوان ڈالائی لاما ابھی قید کی مصیبت بھگت رہا تھا کہ چینی امبان یعنی سفیر اور نائب السلطنت میں رنجش پیدا ہوئی، اور سفیر کے ایما سے ۱۷۴۹ء میں نائب السلطنت مارڈالا گیا۔ اب اہلِ لہاسہ سے رہا نہ گیا، اُنھوں نے بھی بلوہ کیا اور ایک ایک چینی کو چُن چُن کر تہِ تیغ کیا۔ اس واقعہ پر ایک اور بڑی بھاری فوج شہنشاہِ اعظم چان لنگ

سے نے بھیجی اور چینی قوت قائم ہونے کے بعد وہ فوج واپس چلی گئی، امبان کے اقتدار میں ترقی ہوتی گئی اور چینیوں نے نائب السلطنت کا انتخاب اپنے ہاتھ میں لے لیا، اور نئے ڈلائی لاما کے انتخاب کے متعلق بھی قواعد مرتب ہوئے۔ مگر اس بات کا پتہ نہیں چلتا کہ آیا یہ بات بھی ان قواعد میں داخل ہے یا نہیں کہ ایک میعادِ مقررہ پر ڈلائی لاما قتل یا غائب کر دیا جائے۔

اس زمانے کے بعد سے ڈلائی لاما کی تاریخ وحشتناک ہے کیونکہ وہ ہمیشہ ۱۸ یا ۱۹ سال کی عمر میں نوجوان مرتے رہے اور کبھی سن بلوغ کو پہونچنے نہ پائے۔ معلوم ہوتا ہے کہ نائب السلطنت اپنے اختیارات قائم رکھنے کی غرض سے ڈلائی لاما کو سن بلوغ کو پہونچنے پر مار ڈالا کرتے تھے اور دوسرے کمسن بچے کو ڈلائی لاما منتخب کر لیا کرتے تھے۔ موجودہ ڈلائی لاما سے پیشتر چار کی عمر ۱۱ و ۱۸ و ۱۸ و ۱۸ سال ہوئی جس سے ناظرین خود وجوہات دریافت کر سکتے ہیں۔

موجودہ ڈلائی لاما پر یہ حادثہ نہیں گذرا، اسے خوش نصیبی سمجھئے یا بدنصیبی۔ خوش نصیب تو اسلئے کہا جا سکتا ہے کہ ۱۸ برس سے زیادہ عمر ہے اور اب تک زندہ ہے، بدنصیب اس وجہ سے کہ فرنگیوں نے اپنا ناپاک قدم اس پاک شہر میں رکھا اور لوگوں کا خیال ہے کہ وہ خود نوت ہو جائیگا۔ موجودہ ڈلائی لاما کی کیفیت یہ ہے کہ اٹھارواں سال گذرنے کے بعد نوجوان قومی پارٹی نے دھوکے سے نائب السلطنت کی بڑی مُہر چھین لی اور اسے ایک خانقاہ میں بھیجدیا، جہاں وہ غالباً مقید رہا۔ تھوڑے عرصے کے بعد غالباً مار ڈالا گیا۔ اور اس نوجوان ڈلائی نے زمام اختیار اپنے ہاتھ میں لیکر چینی امبان کو بلکلیت بے اختیار کر دیا۔ دار الخلافت چین سے نائب السلطنت کے قید سے رہا کرنے اور اسکے عہدے پر بحالی کا حکم بھی آیا مگر وہ اس سے پیشتر راہیِ ملکِ عدم ہو چکا تھا۔ اور جو نیا امبان لہاسہ میں مقرر ہوا تھا اُس کی مٹھی گرم کر دی گئی تھی۔ اسلئے وہ بھی خاموش ہو گیا اور اُسنے دار السلطنت چین کو اطلاع دی کہ شاہی فرمان پر عمل درآمد ہو گیا۔

چین پر جہاں سنہ ۱۹۰۱ء میں اور مصیبتیں نازل ہوئیں ان میں ایک مصیبت یہ بھی تھی کہ اس نوجوان ڈلائی نـ

نوشت۔ ایک اور بدنصیبی یہ ہوئی کہ شہنشاہ چین نے اپنے فرمان سے ڈلائی لاما کو اسکے عہدے سے معزول کر دیا۔ یہ تازہ خبر ہے جو بذریعہ تار پہونچی ہے۔

ملک تبت میں اعلان کر دیا کہ تبت چین کے ماتحت نہیں ہے، اور کوئی فرمان شاہی بلا اجازت و منظوری ڈلائی لاما کے ملک میں مشتہر نہیں ہو سکتا۔ ۱۹۰۲ء میں چین کے مغربی صوبہ زاچوان کے وائسرائے نے پیکن کی گورنمنٹ پر نہایت زور ڈالا کہ لہاسہ پر چڑھائی کیجائے۔ اور چینی رسوخ کو بحال کیا جائے۔ لیکن موجودہ زمانے میں چینی لاسہ کو اپنا مکہ و بیت المقدس سمجھتے ہیں، اور اُن کی نظروں میں اس پاک شہر پر چڑھائی کرنا کفر میں داخل ہوتا ہے۔ اس ڈلائی لاما کو ہمالیہ سے لیکر تبت میں جھیل بیکال کے گرد و نواح میں منگولیہ میں جنوبی چین میں اور پیکن تک گوتم بدھ کا اوتار مانتے ہیں، اور پوجتے ہیں۔ افسوس ہے کہ وہ بانی مذہب جسنے بت پرستی کی کبھی اجازت نہ دی خود اسکے پیرو اس کی پرستش کریں، اور وہ اُصول زندگی جس سے نروان حاصل ہو چھوڑ کر مکاری سیکھیں، ایک نہایت عبرت کا مقام ہے۔

مجھے اپنے مضمون سے بہکنا نہیں چاہیئے۔ موجودہ ڈلائی لاما کی عمر ۳۰ سال کی ہے، اور چینی شکنجے سے چھوٹ کر وہ روسی ہتکھنڈوں میں گرفتار ہو گیا تھا اور اسکا قصہ یوں ہے کہ جسطرح مکہ و مدینہ ایک از مخفی یورپ کی نظروں میں تھا اور چند فرنگی مسلمانوں کے لباس میں ان مقدس مقامات تک پہونچے اور وہاں سکونت اختیار کی، اور اُن میں سے دو نے آنحضرتؐ کے مزار شریف کو کھود ڈالنے کی کوشش کی تھی۔ اسیطرح روسی گورنمنٹ نے ایک پولٹیکل چال چلی ہے۔ اس ڈلائی لاما کا ایک شفیق دوست لاما ڈارجیف ہے جو جھیل بیکال کے قریب کا رہنے والا ہے اور روسی نسل کا آدمی ہے لیکن لاما بنا ہوا ہے ابھی تک یہ عقدہ نہیں کھلا کہ یہ شخص کسطرح لاما بن گیا، یہ روسی لاما مختلف زبانیں جانتا ہے۔ عمر ستر سال کی ہے۔ یورپین روس میں ۳۵ سال رہچکا ہے، اور ہندوستان، اوڈیسہ اور چین کا سفر کر چکا ہے اور گذشتہ بیس سال سے اس شخص کی سکونت خانقاہ لاسہ میں ہے۔ وہ ایک سال کی سکونت کے بعد ہی اسکا تقدس اسقدر مشہور ہوا کہ ڈلائی کے دربار نے اُسے ڈلائی کا اتالیق مقرر کیا، اور معلوم ہوتا ہے کہ اُسنے اتالیقی میں ڈلائی لاما کو خوب پٹی پڑھائی تھی، کیونکہ دو سال سے انگریز ہر قسم کی دھمکی دیتے تھے لیکن اسکے کان میں یہ بات پڑی ہوئی تھی کہ انگریز اُسکے جانی دشمن ہیں اور زار روس اُسکا اصلی دوست ہے، اور انگریزوں کے خلاف ضرور مدد دیگا۔ لاسہ میں اُسنے توپ بنانیکا کارخانہ بھی کھولا،

لیکن نہ چلا۔ غرضکہ ڈلائی لاما کی ساری مُصیبتوں کا سبب یہ کمبخت روسی ڈارجیف ہے جسنے ڈلائی کو انگریزوں کیطرف سے بدظن کر دیا تھا۔ وہ اُن کی طرف سے بالکل برگشتہ ہوگیا اور نتیجہ یہ ہوا کہ مہم تبت اس پاک شہر میں پہونچی۔ ڈلائی لاما کو فرار ہونا پڑا۔ اور اُسکی عدم موجودگی میں لاماؤں کو عہد نامہ قبول کرنا پڑا۔

میں اس مہم تبت کے پولیٹیکل حیثیت کی بابت بحث نہیں کرنا چاہتا۔ مگر اپنے ناظرین کی رائے زنی کے لئے چند سوالات پیش کرتا ہوں، کیونکہ اب تاریخ تبت نئے طور سے شروع ہوگی۔

اوّل سوال یہ ہے کہ ڈلائی لاما فرار ہے، اُس کی معزولی کا فرمان بھی جاری ہو چکا۔ اور تاشی لاما قائم مقام مذہبی پیشوا ہے، اب اگر ڈلائی لاما لاسہ میں واپس آیا تو اُس کی حیثیت کیا ہوگی آیا اُسکا وہی عزّ و وقار باقی رہیگا جو سابق میں تھا۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ آیا وہ واپس بھی آئیگا یا جیسا کہ مشہور ہے شمالی تبت میں دوسرا معبد قائم کریگا۔

تیسرا سوال یہ ہے کہ اگر وہ لاسہ میں داخل ہوا تو اُسکے کل اختیارات اسنے جائینگے یا اُن میں کچھ کمی کی جائیگی، اور اُسمیں الہامی قوتیں باقی رہنگی یا نہیں۔

چوتھا سوال یہ ہے کہ آیا کوئی ڈلائی لاما اُس کی زندگی میں منتخب کیا جائیگا یا نہیں۔

یہ چاروں سوالات تاریخی حیثیت سے دلچسپ ہیں، اور زمانہ خود بتادیگا کہ اِن سکے کیا جوابات ہیں۔

عبدالحمید حسن۔

## ایجادِ ہجی

---

بسم اللہ الرحمن الرحیم ونصلی علی رسولہ الکریم

### (ایجادِ ہجی کی نسبت۔ مذہب وفلسفہ کا اختلاف)

ایجادِ ہجی کے بارہ میں علماے مذہب اور حکماے فلاسفہ کے درمیان اختلاف ہے۔ اوّل الذکر

فرقہ کا یہ قول ہے کہ ابتدائے عالمِ ارواح میں ابوالبشر آدم علیہ السّلام کی رُوح پُرفتوح یا اُن کی وسعت معلومات کو ہر ایک علم و فن اور صنعت و ہُنر کا علمی مادہ الہامِ ربّانی کے ذریعے سے سپرد ہوا تھا۔ اُسی کا ظہور بہ وقت ضرورت کسی مقدس بزرگ کے توسّط سے ہوتا گیا، ہوتا رہتا ہے اور ہوتا رہیگا۔ چنانچہ تھجّی کی ایجاد بھی حضرت شیث علیہ السّلام کیطرف منسوب کی جاتی ہے اور بعض محققین اس ہنر کا مُوجد حضرت ادریس علیہ السّلام کو ٹھیراتے ہیں۔ یہ فرقہ نصوصِ قرآنی۔ احادیثِ نبوی اور دیگر روایاتِ مذہبی سے استدلال کرتا ہے۔

ثانی الذکر گروہ یعنی حکمای فلسفہ کو یہ دعوے ہے کہ ضرورتِ انسانی ساری ایجادوں کی جڑ ہے۔ انسان کو جیسے جیسے حاجت و ضرورت محسوس ہوئی، رفعِ حاجت اور ضرورت کے لئے وقتاً فوقتاً نئے نئے علوم، فنون، صنعت، حرفت اور ہنر ایجاد کرتا گیا، اور ایجاد کردہ علم و ہنر میں بتدریج ترمیم، ترقی اور اصلاح کی۔ اسی قاعدے سے مدعا گزاری اور تدوینِ خیالات کے وسائل کی ایجاد بھی، پہلے ناقص طور پر ہوئی تھی اور بعد ازاں اُن میں اصلاح ہوئی اور ہوتی جاتی ہے۔ یہ گروہ اپنے دعوے کے ثبوت میں، آثارِ قدیمہ کی بِنا پر دلائل بدیہیہ پیش کرتا ہے۔

بنظرِ غور دیکھا جائے تو یہ صرف اختلاف ہی اختلاف ہے۔ ورنہ اس سے اصل مطلب میں کچھ نقصان عائد نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اختلاف صرف ذرائعِ تجسّس و تلاش میں ہے، اور مُراد و مقصد دونوں گروہوں کا ایک ہی ہے۔

علمائے مذہب الہامی اور وہبی طریقے سے گویا اصل مقصد و مُراد کو پا گئے ہیں، اور حکمائے فلسفہ آثارِ قدیمہ سے مراد و مطلب کا سُراغ لگانے میں سرگرداں ہیں۔ میرے نزدیک یہ اختلاف اُسی وقت تک قائم ہے، جبتک کہ فلسفہ کی بزمِ راز تک رسائی نہیں ہے۔

## ایجادِ تھجّی کے اسباب

بالفرض اگر آدمی سے ساری بُری اور بھلی صفتیں اور سب قسم کے قویٰ الگ کر لئے جائیں، تو خارج میں اُسکا وجود سوائے مفہومِ محض کے اور کیا باقی رہیگا؟ غالباً اس سوال کا جواب یہی ہوگا کہ

"کچھ نہیں"۔ پس انسان گویا جملہ اوصافِ حمیدہ و رذیلہ اور قوائے رُوحانی اور دیگر قوائے ظاہری و باطنی کا مجموعہ ہے۔ اِن اوصاف و قویٰ میں سے بعض بعض صفتیں اور قوتیں تو خاصکر انسان ہی کو عطا ہوئی ہیں، اور دوسری مخلوقات اُن میں شریک نہیں ہیں مثلاً:۔ قوتِ نُطق یعنی گویائی اور قوتِ رُوحانی۔ اور بعض بعض اوصاف و قویٰ میں گو دیگر مخلوقات کی بھی شرکت ہے۔ لیکن انسان کو اُن میں نمایاں طور پر امتیاز حاصل ہے:۔ جیسے محبتِ اولاد، ہوسِ نام و نمود، دُور بینی، مآل اندیشی اور دیگر قوائے عقلیہ وغیرہ وغیرہ

خصائلِ انسانی پر بغور لحاظ کرنے سے یہ بات بھی خاصی طرح سمجھ میں آتی ہے کہ آدمی کی فطرت میں اور دیگر اوصافِ حمیدہ کے علاوہ مفصلۂ ذیل تین صفتیں بھی بڑی پُرزور اور مؤثر ہیں یعنی:۔

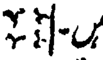
## محبتِ اولاد ۔ باہمی ہمدردی ۔ شوقِ ناموری

اِن ہی اوصاف کے اقتضاء سے انسان کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ اپنے پسندیدہ خیالات اور برگزیدہ طبعی واردات کو خوب پھیلائے، اور وسعت دے اور اپنے اہم و عمدہ کارناموں کو ہمیشہ کے لئے بہ طورِ یادگار قائم اور محفوظ رکھے۔ تاکہ معاصرین اُس کے سُودمند اور فیض رساں خیالات سے فائدے اُٹھائیں، آیندہ نسلیں اُس کے عظیم کارناموں سے اپنی ترقی و بہتری کا سبق حاصل کریں، اور باہمی جلسوں میں اپنے باپ دادوں کے کارہائے نمایاں کو فخریہ بیان کریں۔

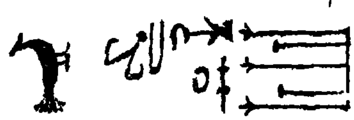
اِس دلی خواہش کے پُورا کرنے کی تدبیریں مختلف زمانوں میں مختلف طور پر سوچی گئیں۔ اور اُن میں وقتاً فوقتاً ترقی و ترمیم ہوتی رہی۔ جیسا کہ بیانِ ذیل سے واضح ہے۔

## مُدّعا گزاری کا ابتدائی ناقص طریقہ

حکمائے محققین نے (جو کارخانۂ عالم کو غور کی نگاہ سے دیکھتے اور خاص کر خصائلِ انسانی پر ہمیشہ گہری نظر ڈالتے ہیں) مختلف مُلکوں کے نہایت قدیم معبدوں، ٹوٹی پھوٹی عمارتوں، پہلی شاہی سلطنتوں کے ویرانوں، اور ویران شدہ شہروں کے کھنڈروں سے بڑی تلاش و تجسّس اور بڑی چھان بین کے بعد اِس بات کا پتہ لگایا ہے کہ اوائل میں جب انسانی تمدّن کا آغاز تھا۔ بڑے بڑے واقعات اور سوانحات

کی نامکمل، ناقص اور ادھوری تصویریں، یا کنایہ نما نقوش و علامتیں، پتھر وغیرہ دھات کی پائدار چیزوں پر کھود کر محفوظ کرلی جاتی تھیں، اور ان یادداشتوں سے صرف بھی یا کنایتی معنی لگاکر بانیانِ یادگار کے دلی مقاصد اور ارادے کسی طرح معلوم کرلئے جاتے تھے۔ چنانچہ ملکِ فارس میں بیستون پہاڑ اور تختِ جمشید کی سیڑھیوں پر (جو اصطخر قدیم دار السلطنتِ ایران میں شاہنشاہ جمشید کے وقت کی ایک پرانی عمارت ہے) اِس طرح کی پیکاں نما تصویریں بنی ہوئی ہنوز موجود ہیں۔ 

مصریانِ قدیم اپنے بزرگوں کی لاشوں، بلکہ بلی، خرگوش، گدھ، لومڑی وغیرہ، اپنے معبودوں کی لاشوں کو بھی کسی قسم کا مصالحہ لگاکر مندروں میں تبرک کار کھ چھوڑتے تھے، جن پر کنایہ نما نقوش یا تصویروں میں کچھ یادداشتیں بھی منقش ہوتی تھیں۔ چنانچہ ایک آدمی کی لاش پر مفصلہ ذیل تصویروں اور نقوش میں اسکا نام منقش تھا۔



عرب، مصر اور امریکہ کے قدیم باشندوں میں حروف تشبیہی رائج تھے۔ یعنی وہ لوگ حرفوں کی جگہ خاص خاص جانوروں اور اشیا کی تصویریں استعمال کرتے تھے۔

عرب میں وادی المکاتیب نام ایک جنگل ہے۔ وہاں ڈیڑھ کوس تک پتھر کی چٹانوں پر حروف تشبیہی یا تصویریں کندہ ہیں۔

## حروفِ تہجی کی ایجاد۔

جب آدمی کی تہذیب اور تمدن کو روز افزوں ترقی ہوئے اور اس سبب سے قابلِ یادگار واقعات کی تعداد بڑھنے لگی، اور تصویروں کے ذریعے سے اُن متعدد واقعات کا محفوظ رکھنا اور اُن تصویروں سے بانیانِ یادگار کی اصل مطلب کو سمجھنا مشکل بلکہ محال ہوگیا، تو لامحالہ مقصد گزاری کی اور اور ترکیبیں سوچی جانے لگیں۔ حروف تہجی کی بنیاد یہی سوچ اور فکر معلوم ہوتی ہے۔ مناسب سمجھا گیا کہ ایسے ایسے نقوش و علامتیں ایجاد کی جائیں، جن کے وسیلے سے صوتِ نطقی یعنی حرکاتِ زبان یا الفاظ

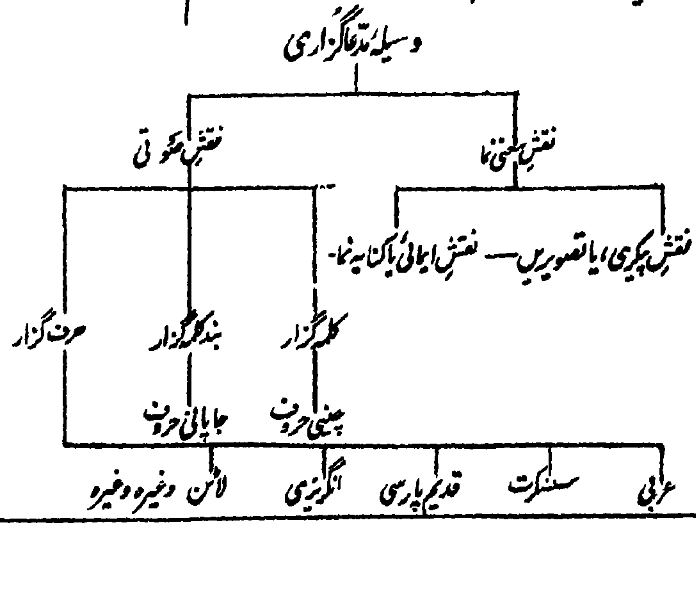
کی پوری پوری تصویریں اُتر آئیں، یعنی اُن اُن نقوش یا حروف میں آدمی کی بات چیت (جو اُس کے خیالاتِ طبعی کا آئینہ ہے) بجنسہٖ قلمبند ہو سکے۔ اب تمدّنِ انسانی بہت کچھ ترقی کر گیا تھا، اور زمین کے کثیر التعداد حصّے ایک دوسرے سے دُور دراز فاصلہ پر مختلف قوموں سے آباد ہو گئے تھے۔ یہ قومیں اگرچہ قومی اور مُلکی خصوصیات میں باہم مختلف تھیں مگر بایں ہمہ محبّتِ اولاد، باہمی ہمدردی، اور شوقِ ناموری۔ کی فطرتی اوصاف میں متحد و مشترک تھیں۔ علاوہ اسکے اوائل میں جو وسائل توسیعِ خیالات اور بقای نام و نمود کے اختیار کیے گئے تھے وہ بھی متحد تھے، اسلئے ان ہی اتحاد اور اشتراک کیوجہ سے مقصد گزاری اور مطلب نگاری کے جو ترسیم شدہ اور ترقی یافتہ ذریعے دوبارہ سوچے گئے، اُن میں بھی ایک حد تک مشابہت اور بعض بعض خصوصیات میں مشارکت پائی جاتی ہے، گو اختلافِ سرزمین، اختلافِ آب و ہوا، اختلافِ قومیت، اختلافِ خیالات اور اختلافِ زبان کے سببسے اُن نقوش، علامات یا حروف کی صورتوں میں اور اُن کے تلفظ میں فرق ہے۔

یہ امر قرینِ قیاس ہے کہ سب قومیں حروفِ تہجّی کی موجد نہیں ہوئیں، بلکہ بیشتر قوموں نے اس مفید ہنر کو غیر اقوام سے ہی سیکھا، اور حسبِ ضرورت اُس میں کوئی جدّت، اضافہ، یا ترسیم و اصلاح کرکے اُن کو اپنے کام کا بنا لیا۔

اِس صنعت کو دُنیا کی بعض بعض ہنرمند اور فیاض قوموں کی محنت و دماغ سوزی کی برکت سے حیرت انگیز ترقی نصیب ہوئی، اور برابر ہوتی جاتی ہے، چنانچہ ٹیلیگراف وغیرہ، اسی ہنر کی شاخیں، اور انھیں خیر مجسّم قوموں کے علمی و عملی کرشمے ہیں۔

اب ایک ایسی کل بھی ایجاد ہو گئی ہے جس میں انسان کی آواز بجنسہٖ بند کر لی جاتی ہے اور بوقتِ ضرورت قید سے رہائی دیکر اُس سے گذشتہ یادداشتوں کا کام لیا جاتا ہے۔ کیونکہ موجودہ وسائلِ مدعا گزاری میں باوجود ترسیم و اصلاح کے چندطرح کی دقتیں ہنوز باقی ہیں۔ منجملہ اُن کے ایک تو یہی ہے کہ انسان کے خیالات کو دماغ سے اُترنے، اور لوازماتِ تحریر کے ذریعے سے اُن کو کاغذی جامہ پہنانے میں بے شک ایک توقف ہوتا ہے، جو بعض موقعوں پر سخت

مضرت کا باعث ہوتا ہے، علاوہ اسکے کاغذات یادداشت کا مدتِ مدید تک آفاتِ ناگہانی اور اُن تحریرات کا تحریفاتِ اتفاقی سے قائم و محفوظ رہنا، اگر محال نہیں تو نہایت مشکل ہونے میں تو کوئی شک ہی نہیں۔ اس بات کا فیصلہ کرنا نہایت مشکل بلکہ محال ہے کہ کون کون قومیں حروفِ تہجی کی موجد ہوئیں، اور کون کون مقلد۔ بہرحال اوّل اوّل تین قسم کے حرف ایجاد کیے گئے۔ اور دُنیا کے سب قسم کے حروفِ تہجی اِن ہی تین قسموں میں داخل ہیں۔ پہلی قسم میں وہ حروف شامل ہیں، جنکا ہر ایک حرف پورے لفظ کے لیے کافی ہوتا ہے مثلاً چینی زبان کے حرف، کہ اُس زبان میں ہر ایک لفظ کے لیے جُداگانہ ایک ایک حرف مقرر ہے۔ دوسری قسم کے وہ حرف ہیں، جنسے لفظوں کے اجزاے قریب بولے اور لکھے جاتے ہیں، اور اجزاے قریب سے لفظوں کے ایسے ایسے ٹکڑے مُراد ہیں، جو زبان کی ایک ہی حرکت سے بولے جا سکیں۔ ایسے اجزاے الفاظ کو انگریزی میں سلیبل کہتے ہیں اور اُردو میں **بندِ کلمہ** کہہ سکتے ہیں۔ اس قسم کے حرف جزائرِ جاپان اور اُسکے آس پاس کے جزیروں میں مروج ہیں۔ تیسری قسم میں ایسے ایسے حرف شامل ہیں جن میں الفاظ کے اجزاے بسیط یعنی ٹکڑوں کے ٹکڑے قلمبند کیے جاتے ہیں یعنی الفاظ کے ٹکڑے سلیبل ہوتے ہیں، اور سلیبل کے ٹکڑے تیسری قسم کے حرف۔ اس قسم میں عربی، سنسکرت، انگریزی، وغیرہ وغیرہ ایشیا اور یورپ کی قریب قریب کُل تہجیاں شامل ہیں۔ شجرۂ ذیل سے اوپر لکھی ہوئی باتیں زیادہ تر قریب الفہم ہو جائینگی۔



میرا خیال ہے کہ مذکورہ بالا تینوں قسم کے حروف ذیل کی ایک فرضی مثال سے بآسانی سمجھ میں آجائینگے۔:-

**گیا[1] - وقت[2] - پھر[3] - ہاتھ[4] - آتا[5] - نہیں[6] -**

اس مصرعہ میں چھ لفظ ہیں، جو الگ الگ لکھے گئے ہیں، اور چھوٹوں پر ہندسے بھی دیے ہوئے ہیں۔ پس اوّل قسم کے چھ ہی حرف اس مصرعہ کی پوری تحریر کے لئے کافی ہونگے۔ دوسری قسم میں الفاظ مصرعہ کے اجزاے قریب لکھنے کیلئے چھ سے زیادہ حرف درکار ہونگے اور اُنکے ٹکڑے حسب ذیل ہوجائینگے۔

**گ[1] - یا[2] - وقت[3] - پھر[4] - ہا[5] - تھ[6] - آ[7] - تا[8] - نہ[9] - ہیں -**

دیکھو! دوسری قسم کی تہجی میں چھ لفظوں کے نو سلیبل ہوگئے اس لئے نو حرف اس کی تحریر کے لئے درکار ہونگے۔

لیکن تیسری قسم کے حرفوں میں اس مصرعہ کے اجزا بہت بڑھ جائینگے اسلئے ہر سلیبل کے ٹکڑوں کیلئے جداگانہ حرفوں کی ضرورت ہوگی، جو نیچے لکھے جاتے ہیں:-

**گ[1] - یِ[2] - آ[3] - وَ[4] - قْ[5] - ت[6] - پھ[7] - رْ[8] - ہَ[9] - ا[10] - تھ[11] - آ[12] - تَ[13] - ا[14] - نَ[15] - ہ[16] - ی[17] - ں[18] -**

یہ بھی قیاس ہوتا ہے کہ ابتدا میں ہر لفظ کے لئے جدا جدا - پھر ہر ایک بند کلمہ یعنی سلیبل کے لئے الگ الگ - اور اخیر میں بند کلمہ کے ٹکڑوں کے لئے بھی علیحدہ علیحدہ حرف ایجاد کئے گئے۔

چونکہ چینیوں کو غیر اقوام سے ہمیشہ سے نفرت رہی اسلئے باوجود فطرتی دانشمندی اور ذہانت کے وہ اس ہنر میں کچھ ترمیم و ترقی نہ کرسکے اور اُن کے حروفِ تہجی پہلی ہی حالت میں غیر متبدّل رہے۔

**جاپانیوں** نے کچھ آگے قدم بڑھایا، اور ہمسایہ قوموں کی پیروی سے مستفید ہوکر اپنے وسیلۂ مطلب گزاری کو ایک حد تک وسعت دی۔

لیکن یورپ اور ایشیا کی دیگر قوموں نے باہمی میل جول سے زیادہ فائدہ اُٹھایا۔ اور اپنی اپنی تہجیوں کو بہت وسیع کردیا۔ اور خاطرخواہ ترقی دی۔

# چینی حروف بہت مشکل ہیں

ابتدا میں یہ خیال ہوتا ہے کہ چینی تہجی آسان اور مختصر ہوگی، کیونکہ اُس زبان کا ایک ایک حرف ایک ایک لفظ کے لئے کافی ہے، لیکن تھوڑے ہی غور کے بعد یہ خیال ہَوا ہوجاتا ہے، اور طرح طرح کی مشکلات پیش نظر ہوجاتی ہیں۔ کیونکہ اور اور زبانوں کی طرح چینی زبان میں بھی علاوہ موجودہ لفظوں کے بہت سے نئے نئے لفظ داخل ہوتے جاتے ہونگے۔ پس اُن پُرانے اور نئے لفظوں کے لئے موجودہ کثیر التعداد حرفوں کے سوا بہت سے نئے نئے حروف ایجاد کرنے پڑتے ہونگے۔ چنانچہ ایک صاحب لکھتے ہیں کہ چینی حرفوں کی تعداد ستّر، اسّی ہزار تک پہنچ گئی ہے۔ یہ تو تعداد کی مشکلات ہیں، تحریری دشواریوں کا یہ حال ہے کہ اکثر حرفوں کے لکھنے میں مصوری سے کم دیدہ ریزی نہیں ہوتی۔ چنانچہ وہی صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ بعض بعض حرفوں کی لکھاوٹ میں ساٹھ ساٹھ ستّر ستّر کششیں قلم کی صرف ہوتی ہیں۔

جب اِن تحریری اور شماری دشواریوں کو خیال کیا جاتا ہے، تو طبیعت کو وحشت اور متخیلہ کو پریشانی ہوتی ہے۔ اور چینیوں کی بے پروائی اور غفلت پر افسوس آتا ہے کہ انھوں نے باوجود حکیمانہ دانشمندی کے اس خصوص میں کوئی ترقی نہ کی۔ غالباً طلبہ کی عمر کا بہت بڑا حصہ اسی ابتدائی تعلیم، یعنی تہجی آموزی اور املا نویسی ہی میں صرف ہوجاتا ہوگا۔ جو ہر زبان بچوں کے لئے بڑے افسوس کی بات ہے، کیونکہ اس قسم کی ابتدائی تعلیم ادنا اور ضروری و مفید علوم و فنون کی تحصیل کا ذریعہ ہوتی ہے۔ پس اس تعلیم کو ایسا آسان و سہل ہونا چاہیے کہ طلبہ کو اس میں جلد تر مہارت پیدا کر کے دوسرے دوسرے مفید اور بکار آمد علموں میں لیاقت اور کامیابی حاصل کرنے کا کافی وقت اور موقع مل سکے۔

دیکھو! معراج کمال کو پہنچی ہوئی قوموں نے اپنی طرزِ تحریر کو کس قدر سہل و آسان کر رکھا ہے کہ ہر ایک صاحبِ ذوقِ سلیم و ذہنِ مستقیم کو اُن کی زبان اور لوازماتِ زبان کے سیکھنے میں زیادہ محنت و مشقت اُٹھانی نہیں پڑتی۔ اُن کی فیاضی، اُن کی کشادہ دلی، اُن کی بلند حوصلگی، اُن کی عالی ہمتی، اور اُن کی انسانی ہمدردی، اُنھیں اجازت نہیں دیتی کہ علم و ہنر کے نادر و نایاب نتیجے (جو اُن کی دماغ سوزیوں، جانکاہیوں اور دل گداز یوں کے نتیجے ہوتے ہیں) اُنھیں تک یا اُن کی قوم ہی تک

محدود رہیں اور غیر قوموں کو اُن سے مستفیض ہونے کا موقع نہ دیا جائے۔ بلکہ وہ بہ دل چاہتے ہیں کہ سارے ابنائے جنس اُن کی جدّت پسندی اور سخن آفرینی سے فیض پائیں۔

یورپ میں مختصر نویسی کے ذریعے سے ممبرانِ پارلیمنٹ کی مطوّل بحثوں اور لمبی لمبی اسپیچوں کو بحث کرنیوالوں اور لیکچراروں کی زبان سے نکلتے ہی قلمبند کرلیا جاتا ہے۔ اور رات ہی کی وقت اخباروں میں چھپوایا جاتا ہے۔ اِس آسان ترکیب سے ناظرینِ اخبارات کو رات کی تقریریں علی الصّباح معلوم ہوجاتی ہیں۔ دوسری قسم یعنی جاپانی حرفوں کی نسبت میری واقفیت۔ قیاسی رای زنی کے لئے بھی کافی نہیں ہے۔ اب ہندوستان اور جاپان سے راہ ورسم پیدا ہونے لگی ہے، اِس سے اُمید پڑتی ہے کہ اب جاپانی زبان اور اُسکے حروف تہجی سے زیادہ تر واقفیت پیدا کرنے کا موقع حاصل ہوگا۔ دو ایک نوجوان وہاں سے تعلیم پاکر واپس آبھی گئے ہیں۔

تیسری قسم میں ایشیا اور یورپ کے قریب قریب کُل حروفِ تہجی داخل ہیں۔ اور اِسی قسم میں ہماری اُردو تہجی بھی شامل ہے۔ جیسا کہ اوپر لکھ آئے ہیں۔ اگر فرصت ملی تو اُردو تہجی کا مفصّل بیان آیندہ کیا جائیگا۔

## دُنیا کی زبانوں کی اصلیت

واضح ہو کہ محققانِ علم اللسان والانسان نے بڑی تحقیق و تدقیق کے بعد کُل اقوامِ دُنیا اور اُنکی مختلف زبانوں کی اصلیت صرف دو ماخذوں کو قرار دیا ہے۔ اوّل سمیا طیقی اور دوم آریوی اور کہتے ہیں کہ دُنیا کی ساری قومیں اور اُن کی مختلف زبانیں اِن ہی دو بڑے خاندانوں کی اولاد اور اولادوں کی اولاد ہیں۔ چنانچہ سمیا طیقی خاندان سے چھ زبانیں پیدا ہوئیں، یعنی:۔ عربی، عبرانی، سُریانی، آسیری، کلدی۔ اور فینیقی۔ اِن میں سے عربی زبان بڑی کثیر الاولاد ہوئی۔ اور اس کو اپنی عبرانی بہن کے ساتھ اکثر خط وخال میں بہت مشابہت ہے۔ جو نسبت عربی کو سمیا طیقی کے ساتھ ہے، بجنسہ وہی نسبت سنسکرت کو آریوی کے ساتھ ہے۔ سنسکرت بھی دُنیا کی متعدد زبانوں کی اور ہندوستان کی قریب قریب سب زبانوں کی ماں مانی گئی ہے۔ ہماری اُردو زبان کو عربی

اور سنسکرت دونوں زبانوں سے تعلق ہے۔ اوّل الذکر سے بیشتر، اور آخر الذکر سے کمتر، بیشتر اسلئے کہ عربی الفاظ کثرت سے اُردو میں آتے ہیں اور اُسکا نوشتخواند بھی عربی حرفوں ہی میں ہوتا ہی اور کمتر اسواسطے کہ اُردو میں سنسکرت کے شبد بہت تھوڑے آتے ہیں، اور اُردو کو سنسکرت بھرن مالا سے کوئی تعلق نہیں۔ ۔ راقم جو بندۂ حقیقت - ۲۶ - اگست سنہ ۱۹۰۹ء۔

# اولڈ بوائز ایسوسی ایشن

ہمکو خوشی ہے کہ ہماری اولڈ بوائز ایسوسی ایشن اب ایک با اثر جماعت بنتی جاتی ہے۔ حال میں صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب سکرٹری ایسوسی ایشن نے آنریری سکرٹری ٹرسٹیان کی خدمت میں سالانہ اجلاس میں پیش ہونے کی غرض سے ایک یادداشت بھیجی ہے کہ چونکہ کالج کے معاملات میں صحیح رای قائم کرنیکا موقع اولڈ بوائز سے زیادہ کسی کو نہیں ہے، اس لئے ضرورت ہے کہ ان معاملات میں اولڈ بوائز کی رای سے فائدہ اٹھایا جائے اور اس مقصد کیلئے ٹرسٹیان کالج اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کو اختیار دیں کہ وہ اپنے ممبروں میں سے ایک شخص کو ہر سال بطور ایسوسی ایٹ یعنی مددگار ٹرسٹی کے تین سال کے لئے منتخب کیا کرے، اس تجویز کے منظور ہونے پر اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کی تین ممبر ہمیشہ مددگار ٹرسٹی رہا کرینگے اور اولڈ بوائز کی یہ شکایت رفع ہوجائیگی کہ "ضرورت کے وقت اُن سے ہر قسم کی امداد کی توقع کی جاتی ہے مگر کالج کے معاملات میں اُنھیں کوئی دخل نہیں ہے"۔ اس تجویز کی رو سے ہر معاملے میں جو ٹرسٹیوں کے سامنے پیش ہوگا، اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے تین منتخب مددگار ٹرسٹیوں سے بھی رای لیجائیگی اور فیصلہ کے لئے اُن کی رائیں شمار ہونگی۔ ٹرسٹیوں اور ایسوسی ایٹ لوگوں میں صرف فرق یہ ہوگا کہ ٹرسٹیوں کا تقرر عمر بھر کے لئے ہوتا ہے اور ایسوسی ایٹ صرف تین سال کے لئے منتخب ہونگے۔ ہمکو توقع ہے کہ ٹرسٹی صاحبان اس عمدہ تجویز کو جس میں کالج کا سراسر نفع ہے اور اولڈ بوائز کی دلچسپی کو بڑھانیوالی ہے، ضرور منظور کرینگے، انتخاب کے لئے ایک شرط یہ بھی ہوگی کہ صرف ایسے اولڈ بوائز کے نام انتخاب کیلئے پیش ہونگے جو وقتِ انتخاب سے کم از کم تین سال پیشتر سے

اپنی آمدنی کا ایک فیصدی کالج کو دیتے رہنے سے اپنی قومی ہمدردی کا عملی ثبوت دے چکے ہوں۔

جو بیج کہ بویا جاتا ہے ابتدا میں ناچیز معلوم ہوتا ہے لیکن اگر اس میں قوت نمو ہے، تو وہی بیج ایک تناور درخت بنجاتا ہے۔ اسی طرح سے اگرچہ ہماری ایسوسی ایشن فی الحال نہایت ابتدائی حالت میں ہے مگر کیا تعجب ہے کہ ایکدن وہ نہایت باا ثر جماعت بنجائے اور نہ صرف کالج کیلئے بلکہ یونیورسٹی کیلئے اور کونسلوں کے لئے ممبر منتخب کیا کرے۔

ہم ذیل میں ان اولڈ بوائز کے نام نامی درج کرتے ہیں جو زرمی طلبی سخن درین ست کے مشکل امتحان میں کامیاب ہوئے ہیں اور اپنی آمدنی کا ایک فیصدی باقاعدہ طور سے کالج کو دیتے رہتے ہیں۔

(۱) مولوی عبدالغفار صاحب ڈپٹی کلکٹر علی گڈہ۔

(۲) عبدالکریم خاں صاحب اکسائز انسپکٹر اضلاع بدایوں و مرادآباد۔

(۳) شوکت علی خاں صاحب سب ڈپٹی اوپیم ایجنٹ بہرائچ۔

(۴) محمد علی صاحب سپرنٹنڈنٹ دفتر آبکاری و سائر سدھپور۔

(۵) محمد اطہر صاحب نائب تحصیلدار اترولی ضلع علیگڈہ۔

(۶) حاجی عبدالرشید خاں صاحب میونسپل سکرٹری مرزا پور۔

(۷) حبیب اللہ خاں صاحب تحصیلدار ہاتھرس ضلع علیگڈہ۔

(۸) حسن محمد صاحب وکیل ایٹہ۔

(۹) محمد وجیہہ صاحب تحصیلدار کنڈا ضلع پرتاب گڈہ۔

(۱۰) شیخ عبداللہ صاحب بی۔اے۔بی۔ایل وکیل علیگڈہ۔

(۱۱) صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب بیرسٹرایٹ لا علیگڈہ۔

(۱۲) صفدر علی صاحب اسسٹنٹ انجنیر کانپور ڈویزن کانپور۔

(۱۳) سید حامد حسین صاحب مہتمم بندوبست ریاست پٹیالہ۔

(۱۴) سراج احمد صاحب اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر بالاگھاٹ۔ واردھا۔

(۱۵) خواجہ غلام الثقلین صاحب وکیل میرٹھ۔

(۱۶) محمد شجاعت علی خاں صاحب محرر رجسٹری سینگا۔

(۱۷) ریاض الدین صاحب میونسپل سکرٹری سکندر آباد ضلع بلند شہر۔

(۱۸) عبد الغفار صاحب میونسپل سکرٹری انوپ شہر۔

(۱۹) سید ولایت حسین صاحب سکنڈ ماسٹر مدرستہ العلوم علیگڈھ۔

(۲۰) محمود الحسن صاحب اسسٹنٹ سکرٹری اولڈ بوائز ایسوسی ایشن و ماسٹر مدرستہ العلوم علیگڈھ۔

(۲۱) قائم حسین صاحب ماسٹر مدرستہ العلوم علیگڈھ۔

(۲۲) عبد الحمید صاحب ماسٹر مدرستہ العلوم علیگڈھ۔

(۲۳) سید انور علی صاحب کلرک دفتر رجسٹرار صاحب مدرستہ العلوم علیگڈھ۔

(۲۴) عبد القادر خاں صاحب پروفیسر مدرستہ العلوم علیگڈھ۔

(۲۵) نعیم الدین خاں صاحب ماسٹر مدرستہ العلوم علی گڈھ۔

(۲۶) سعادت علیخاں صاحب ماسٹر مدرستہ العلوم علی گڈھ۔

(۲۷) سید محمد علی صاحب جج جونپور۔

(۲۸) اکرام عالم صاحب سکنڈ ماسٹر اسٹیٹ اسکول رامپور۔

(۲۹) ظہور الحسن صاحب میونسپل سکرٹری اترولی ضلع علیگڈھ۔

(۳۰) سید جعفر حسین صاحب اسسٹنٹ انجنیر جورا ریاست گوالیار۔

(۳۱) مولوی بدر الحسن صاحب منصف کنڈا ضلع پرتابگڈھ۔

(۳۲) خواجہ عبد العلی صاحب منصف پوایاں ضلع شاہجہاں پور۔

(۳۳) عزیز الرحمٰن صاحب منصرم منصفی تلہر ضلع شاہجہانپور۔

(۳۴) محمد امین صاحب ہیڈ ماسٹر پولس ٹرننگ اسکول مرادآباد۔

(۳۵) سید عبد اللہ صاحب پرائیویٹ سکرٹری ریاست مالیر کوٹلہ۔

(۳۶) سید محمد یحییٰ صاحب انسپکٹر پولس نوگانوں۔

(۳۷) الطاف حسین صاحب مترجم دفتر پولیٹیکل ایجنٹ نوگانوں۔

(۳۸) فریدالدین احمد صاحب سررشتہ دار بندوبست نوگانوں۔

(۳۹) قمر علی صاحب وکیل بریلی۔

(۴۰) مولوی مظہر الحق صاحب بی۔ اے اکسائز انسپکٹر آگرہ۔

(۴۱) نجف علی صاحب کمپ کلرک ڈسٹرکٹ انجنیر مراد۔

(۴۲) احسان الحق صاحب بیرسٹرایٹ لا جالندر شہر

(۴۳) غلام محی الدین صاحب وکیل جالندر شہر۔

(۴۴) مصباح الشمان صاحب تحصیلدار پنجمرٹھی۔

(۴۵) علاء الحسن صاحب ڈپٹی کلکٹر ہمیرپور۔

(۴۶) زمان مهدی خاں صاحب اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر امرتسر

(۴۷) عبدالحمید خاں صاحب ریڈر عدالت ججی راے بریلی۔

(۴۸) حامد حسین خاں صاحب میرٹھ۔

(۴۹) سید عبدالباقی صاحب برسر مدرسۃ العلوم علیگڈھ۔

# توسیع یونین کلب

گو ہماری توقع کیموافق ابھی اولڈ بوائز نے اس مفید انسٹیٹوشن کی عمارت کے چندے کیطرف توجہ نہیں کی، اور انگلستان کی پبلک کیطرح لارڈ کچنر کی ایک صدا پر خرطوم کالج کیلیئے ضرورت سے زیادہ روپیہ نہیں دیا مگر غنیمت ہے کہ ہمارا سوال بالکل رد بھی نہیں ہوا اور کہیں کہیں سے لبیک کی صدائیں آتی رہتی ہیں، چنانچہ پچھلے دو مہینوں میں چودھری خوشی محمد خاں صاحب بی۔ اے۔ پرسنل اسسٹنٹ مہتمم بندوبست سری نگر نے مبلغ للعہ ؏ اور خواجہ عبدالعلی صاحب بی۔ اے منصف پوایاں نے

مبلغ سے ۵ عنایت فرمائے۔ ہم دونوں صاحبوں کے نہایت مشکور ہیں۔

## ڈیوٹی ڈیپوٹیشنز

اس سال ڈیوٹی ڈیپوٹیشنز کو سالہای گذشتہ سے زیادہ کامیابی ہوئی چنانچہ گذشتہ تعطیل میں طلبا تقریباً چھبیس ۲۶ ہزار روپیہ جمع کر کے لائے جسکی مفصل رپورٹ ماہ آیندہ میں شایع ہوگی۔

## علی گڈھ منتھلی میں انعامی مضامین

ماہ ستمبر گذشتہ کے مضامین میں خان بہادر مولوی خدا بخش خاں صاحب سی۔ آئی۔ ای سابق جج ہائی کورٹ حیدرآباد دکن کا مضمون تعلق شاعری اور اسکے اصناف قابل نذرانہ سمجھا گیا۔

## علی گڈھ میں طاعون کا شبہہ

علی گڈھ میں طاعون کی افواہ دور دور مشہور ہے، اور طلبا کے والدین کو تشویش ہوگی اُن کی اطلاع کیلئے لکھا جاتا ہی کہ شہر کے دو ایک محلوں میں مرض کا شبہہ کیا جاتا ہی، مگر اکثر لوگ جو اس مرض میں مبتلا ہوئے باہر کے آئے ہوئے تھے۔ اور مہمان نوازی کیوجہ سے بعض اہل شہر کو بھی نقصان پہونچا۔ مگر شکایت بہت خفیف ہے اور کالج چونکہ شہر سے دور اور کھلی ہوئی جگہ ہے، اسلئے ڈاکٹروں کی رای ہی کہ اگر خدانخواستہ شہر میں مرض کی زیادتی بھی ہو اس حالت میں بھی کالج اس بلا سے محفوظ رہیگا، علاوہ ازیں طلبا کو شہر جانے سے بالکل روک دیا گیا ہے اور حتی المقدور شہر سے قطع تعلق ہونے کی کوشش ہے، صفائی کا اہتمام بھی معمول سے زیادہ ہے، ڈیسیکیٹرز سے کمرے گرم کئے جاتے ہیں، غرضکہ ہر قسم کی احتیاط برتی جا رہی ہے، اور توقع ہے کہ کالج ہر طرح پر دارالاماں رہیگا؛ اسلئے والدین کو تشویش کا کوئی موقعہ نہیں ہے۔

(منیجر)

# ممیرہ اور سچے موتیوں کا سفید سرمہ

مصدقہ جناب نامی گرامی ڈاکٹر ڈبلیو آر کرائیپر صاحب بہادر۔ ایف۔ سی۔ ایس

اے۔ آر۔ ایس۔ ایم **فیلو آف دی انسٹیٹیوٹ آف کٹری لندن**

معزز ڈاکٹروں اسسٹنٹ سرجن ہسپتال اسٹنٹ نوابوں راجاؤں حکیموں گورنمنٹ کے اعلیٰ ترین عہدہ داروں انگریزی گرجوا ہوں تعلقہ داروں یورپین معزز انگریزوں کے سارٹیفکیٹ بکثرت موجود ہیں، جنکو ہم بوقت فرمایش بھیجینگے۔

ہم نے اصلی اور عمدہ **ممیرہ** بڑی تلاش سے ہندوستان کے باہر سے منگوایا ہے۔

## ہمارے سرمے کا امتحان اور اُس میں جلد کامیابی

**نگاہ ناپ** کر ہمارا سرمہ لگائیے، دو ہفتے میں روشنی آنکھ کی بہت بڑھ جائیگی۔ اور آنکھ کے جملہ نقص دور ہو جائینگے، (۲) عینک چھوٹ جائیگی (۳) دھند۔ دھلکہ۔ آنسو بہنا۔ سرخی۔ سوزش۔ کھجلی۔ آنکھ کے سامنے کا اندھیرا۔ پلکوں کے اندر کے دانے و سرخی۔ گوہانجنی (۱۲) لکھنے پڑھنے سے آنکھوں کا تکان (۱۳) درد بہت جلد بشرطیکہ رفع کرتا ہے۔ کمزور نگاہ سے سوئی میں تاگا چھوڑ لیجیے۔ پروال۔ سبل۔ جالا۔ پھلی۔ ابتدائی موتیابند۔ ناخونہ۔ گرے۔ (۲۲) آنکھوں میں سرخ ڈورے پڑ جانے کو (۲۳) پلکیں گر جانے والی بیماری کو مفید ہے (۲۴) کمزور آنکھ کو قوت دیتا ہے۔ (۲۵) آنکھوں کا سیل درد سواد صاف کرتا ہے۔ آنکھ کو جملہ امراض سے محفوظ رکھتا ہے۔ **قیمت فی تولہ تین روپیہ** (محصول ۴؍)

**المشتہر۔ رام سرن نگم۔ کانپور۔ نیا چوک** } اپنا نام و پتہ و نام ڈاکخانہ خوشخط لکھو۔

## ذیل میں چند نامی اُن صاحبان کے لکھے جاتے ہیں کہ جنکے سارٹیفکیٹ حال میں آئے ہیں

(۱) جناب ڈاکٹر۔ ای۔ وائی۔ روڈ صاحب بہادر۔ آر۔ ڈی۔ ایم۔ بی۔ ایل۔ مقام لندن

(۲) جناب ڈاکٹر ایچ۔ پی صاحب بنرجی۔ ایل۔ ایم۔ ایس اینڈ سرجن کلکتہ۔

(۳) ڈاکٹر جوگیندر ناتھ صاحب باسو ایل۔ ایم۔ ایس۔ کان پور۔

(۴) ڈاکٹر بی۔ این صاحب بنرجی۔ ایل۔ ایم۔ ایس و اسسٹنٹ سرجن میرٹھ۔

(۵) ڈاکٹر مکند لال صاحب ہاسپٹل اسسٹنٹ نواب گنج۔

(۶) ڈاکٹر الہ یار خاں صاحب ایس۔ جی سی۔ ہاسپٹل اسسٹنٹ مقام نگینہ۔

(۷) ڈاکٹر عبد الصمد خان صاحب ہاسپٹل اسسٹنٹ مقام گھبرایاں۔

(۸) جناب مولوی سید حامد حسین صاحب منصف درجہ اوّل ضلع ہمیر پور۔

(۹) جناب منشی محمد نثار علیخان صاحب تحصیلدار مقام بانسی ضلع بستی۔

(۱۰) جناب نواب محمد حامد علیخان صاحب رئیس و ممبر میونسپل بورڈ کانپور۔

(۱۱) جناب بابو بپن بہاری صاحب مکرجی۔ ایم اے۔ ایل۔ ایل۔ بی ڈسٹرکٹ و سشن جج گونڈا

(۱۲) جناب بابو نیل دھب رکم صاحب۔ بی۔ اے۔ بی۔ ایل جج خفیفہ بہادر کان پور۔

(۱۳) جناب مسٹر شنکر لال صاحب سٹی مجسٹریٹ بہادر مقام سنڈیلہ۔

(۱۴) جناب منشی دھنپت لال صاحب ڈپٹی کلکٹر بہادر ضلع بستی۔

(۱۵) جناب پنڈت بنسی دھر صاحب تحصیلدار بانڈا

(۱۶) جناب مسٹر جی۔ بی صاحب بہادر انجنیر ریلوے

(مطبوعہ ریاض ہند پریس علیگڑھ)

cise and endeavour to comply with their wishes, even at some self-sacrifice. It is then alone that happiness can reign in the family and both parties live together in the way such relationship requires.

I am, Sir,

Yours, etc ,

M. H. K. MIDHUT.

of qualification. This ideal of obedience which is due solely to narrow-mindedness and short sight is fully attained in the case of girls, though there have been a few instances in which they also have revolted to some extent.

The difficulty arises in the case of boys whose eyes have, unlike those of their superiors of the old type, been opened by education and who are capable of forming independent and unprejudiced opinion. From their point of view, the authority of parents and guardians extends only so far as the spiritual and moral well being of the children are concerned, and even in those respects only up to a certain age; beyond that they consider they are entirely free to carve their own way in the world. To them it is slavery, pure and simple, to have to yield to all the whims and fancies of their superiors and to be led by such of their opinions as fail to stand the test of reason. They think that they are, as rational creatures, entitled to have a voice at least in matters affecting their own interests and to exercise discretion before committing themselves to anything. When their parents try to coerce them in the same manner as they did in the infancy of the latter, they resist. The old-fashioned parents instead of taking the hint and proceeding accordingly persist in their old ways and sometimes take even harsh measures to enforce their wishes. The boys decline to acquiesce in those wishes and most of them, it must be allowed, act with the rashness characteristic of youth. Neither party adapts itself to circumstances. Unpleasantness, to put it mildly, is the result and it not unfrequently terminates in total separation.

The contrast in opinion being so marked, there seems little prospect of any reconciliation unless both sides moderate their conduct. The father should alter the form of his government to suit the intellectual development of his boys and give due consideration to their views and feelings. "Aim, therefore," says Herbert Spencer, "to diminish the parental government, as fast as you can substitute for it in your child's mind that self-government arising from a foresight of results. During infancy a considerable amount of absolutism is necessary. A three-year old urchin playing with an open razor, cannot be allowed to learn by this discipline of consequences; for the consequences may be too serious. But as intelligence increases, the number of peremptory interferences may be, and should be, diminished; with the view of gradually ending them as maturity is approached."

The boys should in their turn make some allowance for the conservatism of their parents and the natural dislike for any interference in the control which they are wont to exer-

[A letter from an Old Boy speaks of the "pernicious habit of extravagance" and other grievances of life in the College, which, however, we think he rather exaggerates. The evils he mentions are briefly these: Extravagance, which "lays the foundation of life-long disappointment and embarrassment"; and, secondly, the spirit of party-feeling, which he says leads to bitter animosity which spreads out and pervades a student's after-life. There is in the first complaint perhaps, and certainly in the second, a certain amount of truth. But it should be remembered that all progress in the matter of social and personal improvement means more expenditure of money—not a very great increase perhaps, but still some. Better house accommodation, better clothes, and better food cannot be had for nothing. As to the party spirit question, it is unfortunately true that honest rivalry does develop into bitterness and rancour, and young men may at times, under the pressure of temporary excitement forget the general good of the College in the misplaced zeal of faction jealousy. These things should be mended, as the writer suggests in the well-worn phrase, "Let the College authorities nip the evil in the bud." But the evil need not be magnified: some allowance must be made for youth and high spirits, and the fact that no reasonable being could expect two or three hundred young men who live together to agree in every particular. "Much indeed as the kindly Sir Roger de Coverley remarked "might be said on both sides."—Editor.]

---

## To the Editor

SIR,

The majority of Mussalman parents of the present day complain about the attitude of their English educated boys towards their superiors. It is often alleged, and plausibly too, that the boys, with one or two exceptions, grow up under the influence of English education to be presumptuous, headstrong and impatient of control. Let us inquire how far the charge is justifiable.

So far as I can think, the difference lies chiefly in the conception of "obedience." The father thinks that he has been given by God absolute authority over his children and that he may, therefore, govern them throughout their lives with unvaried strictness, regardless of the changes which time and education bring about in them.

He considers it gross impertinence on their part to put forward any suggestion, however reasonable. He holds that his orders must be carried out to the letter, without a shadow

# Correspondence.

To the Editor,

ALIGARH MONTHLY

Sir,

One frequently hears complaints—whether well-grounded or not cannot now be discussed—that the students of Aligarh are apt to become luxurious and spendthrift and that they waste a considerable amount of money on themselves. Though I do not personally think this charge is in the main justifiable, I do believe that there is need to train and teach the young how money should be spent and used, and furthermore how true charity, that is, fitting care for others' wants, and forgetfulness of self can be encouraged.

I should like to find out from competent judges some means by which we could, as a body, show that we appreciate the direction that this true charity should take, strictly in accordance with Mahommadan teaching It often strikes me that the young men at Aligarh, even the poorest among them, are far better off, that is, have more blessings to be thankful for, than they themselves may be aware of; but whether this be true or not, it is, I take it, their duty to practise acts of charity. Therefore I want to hear the advice and opinions of the experienced and the wise in this matter. How are we to discourage indiscriminate charity? How are we to help the giver to give rightly? The strong man must use his strength to guide and support the weak and the poor; whether that strength consists in this world's riches or in moral qualities, it is much the same. There is one kind of help for the innocently poor, and another kind for the guiltily poor, the poor who ought to be ashamed of themselves And how much money, pray, is wasted yearly in India on this class of guiltily poor?

"It is nothing" says a great English teacher "to give pension to the widow who has lost her son; it is nothing to give food and medicine to the workman who has broken his arm, or the decrepid woman wasting in sickness. But it is something to use your time and strength to war with the waywardness and thoughtlessness of mankind; to keep the erring workman in your service till you have made him an unerring one."

I am, Sir,

Yours, etc.,

J R. C.

tains has been borrowed, brought in and adapted to the peculiar use of these discriminating islanders, who dwell half-way between the East and West, in a separate sphere of their own, tied neither on this side nor on that, but free to take and appropriate all the good things that the outer worlds can offer.

J. R. C.

## Fragments III.

### THE STRENGTH OF THE HILLS

The pines are the shafts of the temple,
 The wild rose burns incense on high,
The wind's voice is chanting an anthem,
 The roof is the infinite sky.
Now life has grown glad for the living,
 We see them, we gain them at length,
Our help and our shelter, health-giving,
 The hills in their strength!

A respite have we from the furnace,
 A rest from the toil and the heat:
Before we return to our harness
 The calm and the coolness are sweet
Drinking deep of the pure air, redressed by
 Its peace for our manifold ills:
We are gladdened and heartened, and blessed by
 The strength of the hills.

(*Verses by a Mother and Daughter.*)

## IV.

I have not time to insist on the nature or details of Government of this kind; only I wish to plead for your consideration of this one truth, that the notion of Discipline and Interference lies at the very root of all human progress or power; that the "Let-alone" principle is, in all things which man has to do with, the principle of death; that it is ruin to him, certain and total, if he lets his land alone—if he lets his fellow-men alone—if he lets his own soul alone. That his whole life, must, if it be healthy life, be continually one of ploughing and pruning, rebuking and helping, governing and punishing, and that therefore it is only in the concession of some great principle of restraint and interference in national action that he can ever hope to find the secret of protection against national degradation.

RUSKIN.

For the last twenty-eight years education has been compulsory in Japan. Boys and girls go to school from the age of six. There are no Boarding houses except in the case of a few High Schools and Colleges in the larger towns. The influence of the home is so good that parents do not find it necessary to pay others to do their parental work for them. The fees are small. In the primary or village schools only an elementary education is provided; in the next grade, the High Schools, there is preparation for the College work, and English is compulsory. Of course the poorer classes of the people, those who do the rough hand-work, only complete the elementary stage. From the High School the student goes to a College to specialise, and there are two Universities where subjects are followed up to their highest point, the professors in which were formerly foreigners but are now almost all natives of Japan With regard to religious education, there is nothing beyond the inculcation of moral precepts, such precepts as are common to most religions and which are the essence of Shintoism, the form of religion generally accepted by the Japanese. So there are no binding ceremonies, no fasts, formalities, a want which may prove a disadvantage in the matter of making character and teaching a spirit of self-restraint. Indeed it requires a strong people to stand a great and sudden measure of national success; and in the case of the Japanese, critics are not wanting who say that the lack of a religion with strong binding forms will prove the means of a relapse as sudden as their success. However, there is no doubt they are a wonderful people and in their thoroughness and love of efficiency, which they rightly recognise to be the basis of all work, they are an object lesson to the whole world. They are artists in all that they undertake, that is, only the best possible appeals to them, in small things as well as in great. And here is a story to the point. An Englishman, on a visit to Japan, was looking at the wares in a silversmith's shop and on asking for a small match box was shown two or three specimens. "But," said the shopmaster, "You cannot have these, as each has a serious flaw in the workmanship. They will be melted down again. I will make you another."

In the matter of adapting to themselves foreign ideas and foreign methods the Japanese have in no way been blind followers. America has played a great part in moulding and fashioning the new Japan; but England has been looked to as a model in the steel and iron business, in shipbuilding, and, in a measure, in a system of constitutional government. Germany has been copied, with modifications, for military training, France for artillery and all the best the world con-

## Japan's Success

——:)o(:——

Japan's success, both in the last few years of internal development and in the last few months of the great struggle with Russia, has amazed the thinking world so much that, east and west, men are asking how and why it has come about, and whether the present high standard will be maintained.

The causes, to put them quite plainly, are, first, a complete sacrifice of self in the interests of the country, and secondly an intense craving after knowledge and thoroughness.

The young Japanese who have been and are still flocking to America to learn arts and crafts, which they cannot so well learn at home, are nearly always very poor from the point of view of possession of money Indeed, generally speaking, the Japanese cannot at all afford the expenses of what the English consider a sound modern education. That is why they have sent their sons to America rather than to England—for in the latter country the expenses of learning any science or trade or art are all but prohibitive. Want of money is no bar, however, to the enterprising Japanese They take themselves to San Francisco or some other centre, in large numbers. California has, or recently had, about 12,000 Japanese learners of various kinds Many of these, even though they come of excellent families, are compelled by their poverty to undertake rough work to gain a living and a sufficiency with which to pay their school fees. Some undertake housework, that is the work of domestic servants, for in America the domestic servant is at a premium. All they stipulate for is time to attend their classes Some get higher wages as cooks and so earn enough to pass on in due course from school to College An eager student has been seen peeling potatoes with his Geometry book propped up before him, and other similar instances go to prove that the desire for progress is a very real one, while, meantime, the discipline self-inflicted in facing all these difficulties is moulding a character more precious than all the knowledge of all the heaped-up books in the universe.

In time the student goes back to Japan, and in nearly every village there is, living and working at least one Japanese graduate of an American University. He may be a doctor, an engineer, a schoolmaster, or a mechanic; but there he is, leavening the village lump. His chief idea is rather to teach and train his fellows than to advance his private interests.

by locks and definite banks. To-day, even, a Thames tide is swift running, but in Elizabeth's day it was considerably faster. To steer a boat deftly under London Bridge was often no mean undertaking. The numerous allusions in Shakespeare to the shipping, the harbour-life, the tide and river traffic tell plainly that the Thames was to the Londoner what the Grand Canal was to the people of Venice in her palmiest days.

Another feature of the London of those times was the number of gardens and open spaces in the city, and the fact that an easy walk would bring one out into open country of field and forest and heath The gardens of the city merchants were famous, so was the Bishop of Ely's, and he lived in Holborn, practically in the city's centre So the Londoner was not cramped, nor was he ignorant of country sights and sounds, and herbs and flowers and birds. In all of these branches of knowledge Shakespeare is marvellously proficient, it being a true mark of a great mind to observe and reverence every minute thing in nature. No doubt the poet had seen and learnt things in his Warwickshire home, but it was London, the centre of all that was choicest, that was his chief teacher.

When he first came there he was very poor and unknown Rumour says he held horses while the spectators enjoyed the play acting. Anyhow he watched and listened, was a friend of the sailor-men who had seen strange lands and with men of every type who had done things. Also we know he was an early intimate of one Burbage, a famous actor, who was probably proprietor of the Shorditch theatre, near the Tower of London. According to a record preserved in the Shoreditch Church William Shakespeare rented a house near-by. It is supposed that he and Burbage had trouble with their landlord, on which they left Shoreditch and started a new theatre—the " Globe ", actually referred to in Hamlet, on the south side of the river

Play-actors and theatre-managers were not encouraged as much as one might suppose, nor was Shakespeare, at any rate, till after a long struggle with poverty, looked upon as a remarkable man. He became so, not by courting the favour of the great (they in the end came to him, never he to them) but by learning to understand his England and his London in the talk and doings of the people.

J. R. C.

*(To be continued.)*

which destroyed St. Paul's, the houses on the historic London Bridge, most of the city churches and nearly all the other buildings.

As Shakespeare saw and knew London, it was a town on a slight hill two miles and two hundred yards in circuit, situated on the north bank of the Thames. The chief features were the great Gothic Tower of St. Paul's Cathedral about the centre of the city, the Tower of London at the eastern end, and the ancient bridge on which was built a street of handsome houses and which led across to Southwark, as that part of London south of the river was called.

All these features are landmarks in history and landmarks in many a well-known scene of Shakespeare's plays. If one could have stood gazing northwards, say, on the tower of Southwark Church one would have seen immediately below, on the same bank, comfortable houses in trim gardens, the Globe Theatre and the Bear Pit and to the right, the road coming up from Kent and Surrey past the famous Inn at the Bridge end. Then the eye would have caught the Bridge gateway, bristling with traitors' heads, then the Bridge itself with its graceful arches and the tide swirling under them. Below the bridge, countless masts of ships, some at the wharves, others coming to anchor in mid-stream, ships of men who sailed with Drake or Frobisher, ships of alien nations, of every build and shape Plying up and down stream would go the barges and smaller boats, for the river was the high way on which the merchants' traffic glided past the Queen's barge or where the casual lounger took the air. Merchants on their way to the Royal Exchange, courtiers bound for Greenwich, Parliament-men coming up to Westminster, prisoners of State going down to the Tower, all rank and conditions of men—the then silver Thames bore them on their way.

Straight in front of our gazer from Southwark would stretch the view of the main city, St. Paul's towering high among the lesser steeples and pinnacles of the parish churches, the halls and gabled houses, and beyond to the north the green slopes of open Hampstead. On the left, to westward, beyon d the city gates went a long road by the river bank, lined. with stately houses and fair gardens of English noblemen That road, now the Strand, a great city thoroughfare, was then a county highway leading to the sister city of Westminster, not used greatly for general traffic, which went more easily by water. For the tide took boats up and down with little labour, the river being in those days unhampered

# SHAKESPEARE'S LONDON.

[*This is in substance, the lecture given to the College Students in June last.*]

## I.

So great is the magic in the name of Shakespeare whenever the English language is used, so great is the zeal which students of every nation give to his works and so sincerely do Indian students admire and reverence him as a Master, that an attempt to bring something of Shakespeare's method and meaning into stronger reality needs no apology or introductory explanation.

It is extremely difficult to appreciate Shakespeare's plays at all without a knowledge of what an English village is like, or of what an English town was like in Elizabeth's reign. So the object of the "present scribe" is to throw some light on the London that Shakespeare knew and to show how the poet centred his work in the city that he loved.

To gain a knowledge of the English village of his day—and this is necessary though somewhat outside our present scope—the student could not do better than read that chapter in Macaulay's History on the state of England in the days of Charles II. From this, he will see that England was a great farm, mostly pasture-land, but growing enough wheat to support its own population, which was less than that of London itself in our day There were only three large towns: London, Bristol and Norwich. The country was open, that is, the fields were not divided and marked by hedge-rows, as they now are; but there were more woods and swamps. In his trim mansion dwelt the country squire, ruling his own acres, the terror of the village evil-doer and the vagabond.

But to come to our point the consideration of Elizabethan London, let us first think of the London of to-day by way of contrast. The vast city has swollen out into considerable parts of the four counties that surround it. Its population is about five millions, its extent so wide that it is hard to say where London proper merges into Suburban London.

The heart and centre of this area is the City of London, with which we are now concerned: for this part marks the site and extent of Shakespeare's London, and contains most of the old names, many landmarks and a few actual buildings that the poet must have known. But the general aspect of the city was utterly changed by the Great Fire of 1666,

ciples of the Land Revenue System of Oudh--some History and a little Civil Law are among the subjects the author mentions.

---

In short the young Taluqdar, like every other young man, who is about to face life and work, wants something of a *special* kind of knowledge or science, and that something he cannot acquire by reading the ordinary B A course. If one may venture on a prophecy concerning the future of Indian education, it is not unlikely that the coming years will show that the demand for the B. A. course will be confined—as it should be—to those who wish to take up a really scholarly Arts line; while a good school education—taking a boy up to what we now call the F A. standard, will equip a student with a thorough foundation for his special training either as an Engineer, Architect, Surveyor, Doctor of Medicine, Journalist, or Agriculturist But mark this—the schools must be good and able to turn out young men of sufficient intelligence and general knowledge or the attempts at specialising will be a failure. "Better Schools" is India's Educational need. Let the young Taluqdar get the best school training he can and then for his specialising—he might very well join, say, a class at the Pusa Agricultural College

---

The name at the foot of the article on "Islam and Modern Ideas" in the September number of the Monthly should have been Khawja Abdul Ali, not Khawja Abdullah.

---

S. Haidar Karrar Jafri of Balrampur, Oudh, who left Aligarh to study at the Accountancy Institute, Bombay, is now a qualified Accountant

---

M. Mahfuz-ul-lah who left Aligarh to read at the Lahore Medical College, has passed the Final Examination of the Assistant Civil Surgeon Class.

---

In exercise of the powers conferred by the new Universities Act, the Chancellor has been pleased to nominate and appoint forty-five Fellows, among whom are three Aligarh representatives, namely, Messrs Aftab Ahmed Khan, J. R. Cornah, and Khan Bahadur M. Mozammil-ul-lah Khan.

The thanks of the Historical Society are due to Mr. Burn, I.C.S., who has promised to present a copy of the Coin Catalogue of the Calcutta Museum.

It has been suggested to illustrate the history of the College, which Mr. Morison compiled last year, with a dozen pictures, which would be sold as reasonably as possible along with the book. The illustrations should not be too small and should contain one or two portraits—certainly that of Sir Syed—and views of the various College buildings. Judging from an estimate obtained from Messrs. Thacker & Spink the cost of production would be rather heavy; but a sale at Rs. 2 for one set of the illustrations would mean a small margin of profit.

The facts about Japan in the article on "Japan's Success" in this number have been supplied by Major Higashi, the Japanese Attaché at Simla, who has promised to visit the College this cold weather if he can possibly manage to do so.

There is interesting account of Pusa and its Agricultural Research Institute in the "Pioneer" of September 18th. Pusa is near Waini station on the B. and N.-W. Railway, and was more than a century ago acquired as a Government stud-breeding farm. In recent years experiments in tobacco and indigo growing were tried here, until the Government realised that the place might be developed into a fully organised institution for scientific agriculture. Then came the munificent gift of the American, Mr. Phipps, £. 30,000, to be devoted to some scientific object for the good of India, and it was decided that the object should be the Research Institute at Pusa. Already arrangements have been made for a complete staff of European Professors and subordinate teachers, and the building is to be a magnificent structure 400 feet in frontage, crowned copper-covered domes. Until this is ready only out-door work can go on—practical farming, cattle-breeding, the growing of plants and trees.

An interesting, thoughtfully written pamphlet on the Education of the Taluqdars of Oudh has been prepared by Raja Ali Mahomed Khan, Khan Bahadur, of Mahmumdabad. He points out the necessity after the laying of a solid foundation in a thorough school course; and urges that this special training should be complete in itself comprising such subjects as would be useful to the Taluqdars in after-life. Practical Surveying—the Elements of Political Economy—the Prin-

# The Aligarh Monthly.

OCTOBER, 1904.

## College Notes.

More very gratifying news comes concerning the Duty deputations Muzaffer Ahmed Khan writes some details from Kathiawar, which alone contributed nearly Rs. 4,000.

The Chief of Gondal received our delegates very kindly and spoke highly in their praise, as also in Baroda did Mr. J. A. Dalal, Minister of Education and Privy Councillor who says he was "charmed with the boys that came on the mission."

The success in Baroda was, we gather, largely due to the kind efforts of Mahomed Ali and Nawab Ali, the former a well-known Old Boy and the latter an ex-master in our School. H. H. the Gaekwar gave Rs. 2,000, his brother Rs. 500 and the Rani a permanent wazifa of Rs. 15 per month; while the people of the place contributed about Rs. 1,000.

News of the other deputations is not yet forthcoming, but we trust they are meeting with the success they deserve.

Nawab Mohsin-ul-Mulk has been for a tour in Oudh.

# علیگڈھ منتھلی

| جلد ۲ | نومبر سنہ ۱۹۰۴ع | نمبر ۱۱ |
|---|---|---|


## ایک گلی کتب خانہ

انسان بھی عجیب متضاد صفات کا مجموعہ ہے ایک طرف تو یہ کیفیت ہے کہ وہ اپنی موجودہ حالت سے ہمیشہ بیزار رہتا، اور گذشتہ کی طرف آہِ سرد بھر بھر کر دیکھتا ہے، اور دوسری طرف جب خود اپنی طبعِ خداداد پر نظر ڈالتا ہے تو سر افتخار آسمان سے باتیں کرنے لگتا ہے، اور گذری ہوئی نسلوں کے بڑے بڑے کارنامے بھی اُس کو ہیچ کے گرد و غبار میں لپٹے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ گو قدمِ سعی کا ہمیشہ آگے بڑھتے رہنا زمانے کا اقتضا ہے، اور جہاں ہم پرسوں تھے وہاں کل نہ تھے، اور جہاں کل تھے وہاں آج نہیں ہیں، لیکن جسطرح کہ گھوڑدوڑ میں جیتنے کے مقام سے کوئی گھوڑا آگے اور کوئی پیچھے نکلتا ہے، اسیطرح جولانگاہِ عالم میں بعض قومیں مدارجِ ترقی بلحا

طے کرتی ہیں اور بعض بعد میں، لیکن سب کو کم وبیش ایک ہی راستہ قطع کرنا پڑتا ہے، اسمیں شک نہیں کہ زمانے کی مجموعی ترقی کے اعتبار سے متأخرین کو متقدمین پر تفوق ہوتا ہے کیونکہ ہر زمانے میں موجودہ نسل تمام گزشتہ نسلوں کی وارث ہوا کرتی ہے۔ لیکن پھر بھی بہت سی باتیں جو ہماری نظر میں جدت کا رنگ لیئے ہوئے اور بلاتکلف اپنی ہی خداداد ذہانت کا نتیجہ معلوم ہوتی ہیں، دراصل نئی نہیں ہوتیں، بلکہ اگر تاریخ عالم کے کرم خوردہ صفحوں کو ذرا بھی توجہ سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ہماری قوم میں نہ سہی مگر دوسری قوموں میں ضرور اس قسم کے مدارج ترقی سب پہلے ہی طے ہو چکے ہیں، اور حضرت سلیمانؑ کا یہ ارشاد کہ "آفتاب کے تلے کوئی چیز نئی نہیں ہے" نہایت صحیح ہے۔ کتب خانوں ہی کو دیکھیے کہ اس زمانے میں لندن میں برٹش میوزیم اور پیرس میں ببلیو تھیک نیشنیل کو دیکھکر خیال ہوتا ہے کہ کم سے کم اس بارہ میں تو کسی قوم نے زمانہ سابق میں ایسی توجہ نہ کی ہوگی لیکن ایشیا کے کھنڈر جنکو صدیوں کے گرد وغبار نے تودہ خاک بنا دیا ہے، دبی زبان سے کہتے ہیں کہ ع - ایں خیال ست ومحال ست وجنوں اور فلک شعبدہ باز بھی کبھی ہمکو نیچا دکھانے کے لیئے فراموشی کی نقاب، جو ہزاروں سال تک گرم وسرد زمانے کا مقابلہ کرتے کرتے کچھ متحجر سی ہو گئی ہے، اٹھا کر قدامت کی کچھ ایسی جھلک دکھا دیتا ہے کہ ہم دنگ ہو کر رہ جاتے ہیں۔ یہ تو کھلی ہوئی بات ہے کہ ابتدا میں عہد طفلی کی طرح انسان کا سینہ ہی اسکا کتب خانہ ہوتا ہے، لیکن جب قوم میدان ترقی میں قدم رکھتی ہے اور تمدنی ضرورتوں کی وجہ سے ترقی کے رخ مختلف اور ذخیرۂ معلومات اسقدر وسیع ہو جاتا ہے کہ نہ کوئی ایک شخص ان سب کی پیروی کر سکتا ہے اور نہ ایک شخص کا حافظہ اس کا متحمل ہو سکتا ہے اور نہ ایک یا چند اشخاص اس کی اشاعت پوری قوم میں کر سکتے ہیں تو کتابت کی ضرورت محسوس ہوتی اور کتابت کے ساتھ کتابیں اور جہاں کتابیں ایک سے دو اور دو سے تین ہوئیں، کتب خانے عالم وجود میں آتے ہیں۔ انسان جبکہ دماغی ترقی کے اس درجہ پر پہونچتا ہے تو تمدنی طور پر بھی وہ بہت سے مدارج طے کر چکتا ہے، اور باپ کو جو نسبت سابق میں اولاد سے

اور اُسکے بعد سرگروہ کو خاندان سے تھی، وُہی نسبت اب بادشاہ کو رعایا کے ساتھ ہوتی ہے
اور اسلئے دوسرے انتظامات کے ساتھ دماغی ترقی کا انصرام بھی بادشاہ ہی کے ہاتھ میں رہتا ہے۔

تاریخ عالم شاہد ہے کہ جن قوموں نے سب سے پہلے لباسِ تمدّن زیب بدن اور انسانی دماغ
کی سوئی ہوئی قوتوں کو بیدار کیا وہ مصری اور بابلی تھے، لیکن مصریوں نے جہان تک کہ
دریافت ہوسکا ہے، کوئی باقاعدہ کتبخانہ قائم نہیں کیا، اور اُس کی وجہ یہ تھی کہ اُن کے یہاں
علمی ترقی کا دارومدار پیشوایانِ مذہبی پر تھا، اور وہ اپنی گرم بازاری کے لئے ضرور سمجھتے تھے
کہ اپنے فتوحاتِ دماغی کو غیر حقیقی روشنی کے ہالے میں ایسا چھپادیں کہ دیکھنے والوں کی نگاہ
کام نہ کرے، اور اُن کو اُن میں کسی اور عالم کا جلوہ نظر آئے۔ جسکا نتیجہ یہ ہے کہ آجتک اُن کے کارنامے
دنیا کے خیال میں ایک عظیم الشان راز کی ہیبت اور وقعت رکھتے ہیں، لیکن بایں ہمہ اُن کی
اُولوالعزم بادشاہوں کے پُرشان مقابر اور اُن کے تعمیر کئے ہوئے بوالعجب چوہیل منار جو
اپنے فوق الانسان استحکام سے گرم و سرد زمانہ پر طعن مارتے ابدالآباد سے باتیں کرتے
ہوئے معلوم ہوتے ہیں، اپنے بوقلموں کتبوں سے کتبخانوں کا کام دیتے ہیں۔ لیکن برخلاف
اسکے اہل بابل نے جو قدامت میں اہل مصر سے کم نہ تھے مگر عام اثر میں اُن سے بہت بڑے
ہوئے تھے، کیونکہ دنیا کی موجودہ ترقی کی بنیاد اُنھیں کے مبارک ہاتھوں نے ڈالی تھی،
ابتدا ہی میں ترویج علوم کیطرف توجہ کی اور چونکہ ہر زمانے میں ہر قوم اپنی ضرورتیں اُنھی چیزوں
سے پوری کیا کرتی ہے، جو آسانی سے ہاتھ آسکتی ہیں، اور سرزمین بابل میں دجلہ و فرات
کی طغیانیوں کی بدولت عمدہ قسم کی چکنی مٹی بہ کثرت موجود تھی، اسلئے اُنھوں نے مٹی
کچی اینٹوں یا تختیوں کو جنھیں بعد میں پکا دیا کرتے تھے، تحفظ و ترویج علوم کا ذریعہ بنایا، اور
اس قسم کی گلی کتابوں سے بڑے بڑے کتب خانے قائم کئے۔ اگرچہ اہل بابل کے
جھلک ہم تک واسطہ در واسطہ اہالی آسیریا و فنیشیا و یونان کے ذریعے پہونچی —
لیکن افسوس ہے کہ زمانے نے اُن کے علمی ذخیروں کے ساتھ اچھا سلوک نہیں،

گو اہلِ یورپ کے محنت طلب علمی تجسس نے جستہ جستہ اُن کی گلی کتابوں کو اُن کے بھولے ہوئے شہروں کے کھنڈروں سے نکالا ہے، لیکن جو عظیم الشان کتب خانے اُنکے علم پرست بادشاہوں نے قائم کئے تھے، وہ ریگِ زمانہ میں ایسے نہیں دبے کہ نکالے سے نکل سکیں، قدیم کتبوں سے معلوم ہوتا ہے کہ بابل کیا دنیا کا سب سے پہلا کتب خانہ شاہ سارگن نے، جو حضرت عیسےٰ کی پیدایش سے تین ہزار آٹھ سو سال پیشتر گزرا ہے، قائم کیا تھا۔ اس بادشاہ نے ایک ضخیم کتاب تنویرِ بیل کے نام سے تصنیف کرائی تھی، جو بہتر جلدوں میں تھی اور جسمیں علمِ ہیئت و نجوم کے مسائل پر تفصیل سے بحث کیگئی تھی۔ بادشاہ سارگن کے کتب خانہ کے علاوہ ایک مشہور کتب خانہ سنقرہ یا لارسیا میں تھا، جسمیں خاصکر علومِ ریاضی کے متعلق کثرت سے کتابیں جمع کیگئی تھیں۔ اور ایک اور قدیم کتبخانہ پنور میں تھا، اور اسیطرح ارک اور کوتھا کے کتب خانے بھی قابلِ ذکر ہیں۔ نوبخت نصر کے زمانے میں، جو سنہ ۱۲۰ ق م میں گزرا ہے وہ عظیم الشان کتب خانے خاص بابل میں قائم ہوئے تھے، مگر ان سب کتب خانوں کا صرف نام ہی نام باقی ہے۔

اہلِ بابل کے برخلاف اہلِ اسیریا، جو اُنھیں کے ایک شاخ تھے اسبارہ میں زیادہ خوش قسمت تھے۔ چنانچہ جو کوشش نینوا کے کھنڈروں کے کھودنے میں ہوئی، وہ زیادہ بارآور ثابت ہوئی ہے، اور ایک پورا کتب خانہ جو شاہانِ اسیریا کی علم پروری کی یادگار ہے، ہاتھ آگیا ہے اگرچہ سلطنتِ اسیریا کی قدامت کا پتہ سنہ ۱۹۰۰ ق م تک لگا ہے، لیکن چونکہ علمی ترقی کیلئے استحکامِ سلطنت اور تمدنی ترقی لازم ہے اِس لئے معلوم ہوتا ہے کہ ایک عرصۂ دراز تک کسی بادشاہ کی توجہ اِس طرف نہیں ہوئی، لیکن سنہ ۷۴۵ ق م میں جبکہ تغلت پلیسر ثالث تخت نشین ہوا تو اُس نے اِتنا کیا کہ قدیم سلاطین کے کتبوں کو دستِ فنا سے محفوظ کرنے کے لئے جمع کیا، اور اُن کی نقول سے ایک کتب خانہ کی بُنیاد ڈالی، اور اُس کے بعد شاہ سارگن نے جو سنہ ۷۲۲ ق م سے لیکر سنہ ۷۰۵ ق م تک حکمراں رہا، بعض رسالے علمِ ہیئت و نجوم وغیرہ کے داخل کرکے اُس کو اور وسعت دی۔ سارگن کا بیٹا سناکرب جو سنہ ۶۸۱ ق م تک

تخت نشین رہا، تاجِ شاہی کے ساتھ ذوقِ علمی کا بھی وارث ہوا تھا اور اُس نے قوانینِ اسیریا کا مجموعہ اور چھوٹے چھوٹے تاریخی اور مختلف قسم کے علمی رسالے داخلِ کتب خانہ کئے اور اُسی نے کتب خانہ کو قلاہ سے نینوا میں بھی منتقل کیا، اُسکے بعد اُسکے خلف الرشید اشرہیدن۔ (المتوفی سنہ ۶۶۸ ق۔م) نے اُس میں سب سے تاریخی اور دیوبانی کے رسالے شریک کئے۔ اگرچہ اس خاندان کے تمام بادشاہ علمی قدردانی کے لحاظ سے آفتاب تھے، لیکن علمی دنیا کا سب سے بڑا محسن اشرہیدن کا بیٹا اور جانشین اشر بنی پال تھا، جو سنہ ۶۲۶ ق۔م۔ میں اپنا نام پردۂ عالم پر ہمیشہ کیلئے یادگار چھوڑ کر راہیِ ملکِ عدم ہوا۔ اُس کی اُلوالعزمی صرف بیرونی فتوحات اور اندرونی انتظامات ہی پر محدود نہ رہی، بلکہ اُس کے علمی ذوق نے بابل کے مٹے ہوئے علوم کو بھی حیاتِ جاوید بخشی۔ اُس کے مبارک عہد میں ہزارہا منقوش تختیاں جو تقریباً ہر علم وفن کے متعلق اور ہر مقام سے لائی گئی تھیں نینوا کے کتب خانہ میں داخل ہوئیں۔ اور اُس کے کتبوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے ایسی محنت سے جمع کرنے کی غرض صرف رفاہِ خلق اللہ تھی کہ لوگ عام طور پر اس بے نظیر علمی ذخیرہ سے فیضیاب ہوں اور رعایا میں علم کی اشاعت ہو، اشر بنی پال نے اس کتب خانے کو ایک عالیشان محل میں رکھا تھا، جو سلطنت اسیریا کی بربادی کے ساتھ تباہی کے نذر ہوا، لیکن نینوا کے عبرتناک کھنڈروں نے اُسکو کئی ہزار برس تک اپنے سینے میں امانت کیطرح محفوظ رکھا، یہاں تک کہ اہلِ یورپ کی اُلوالعزمی نے صدہا سال کے خس وخاشاک سے اِس بے بہا خزانے کو نکالا۔ یہ بھی حسنِ اتفاق یا اُن قدیم لوگوں کی خوش نیتی کا باعث ہے کہ اُنھوں نے اپنی دماغی فتوحات کی حفاظت کیلئے استمداد بھی کی، تو مادرِ گیتی سے کہ وہ آج تک گرم وسردِ زمانہ سے محفوظ ہے بقولِ شاعر ؎

امانت کی طرح رکھا زمیں نے روزِ محشر تک۔
نہ اک مُو کم ہوا اپنا نہ اک تارِ کفن بگڑا۔

برخلاف اُسکے اس زمانے میں گو ہمارا ذخیرۂ معلومات بہت کچھ بڑھ گیا ہے اور لطافت

اور نزاکت میں ترقی تمدن کیساتھ ہم کہیں سے کہیں پہونچ گئے ہیں، لیکن ہمکو بلا تامل اقرار کرنا پڑتا ہے کہ اگر ہماری کتابوں کے ساتھ بھی زمانہ ویساہی سلوک کرے جیساکہ اہلِ اسیریا کی انگڑہ گلی کتابوں کے ساتھ کیا تو اُن کا صدیوں تو کیا دو سال بھی ٹھہرنا مشکل ہے۔

اب اگر ان جواہرِ بے بہا پر ایک تفصیلی نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ جسطرح تغلت پلیسر ثالث کے تاریخی مذاق نے اس کتب خانے کی بنیاد ڈالی تھی اُسیطرح اُس کے جانشینوں نے بھی فنِ تاریخ کیطرف زیادہ توجہ کی، اور ہزاروں تختیاں آج تک شاہانِ اسیریا کی فتوحات، اُولوالعزمی، دینداری اور سرپرستی علم و ہنر کی شہادت دینے کیلئے موجود ہیں۔ ان تختیوں میں سے بعض پر قدیم سلاطین کے کتبوں کی نقول ہیں، جو اُن کے حالات پر گہری روشنی ڈالتی ہیں اور بعض پر عہدناموں، فرمانوں اور احکام شاہی کی نقول ثبت ہیں، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ صرف تحریراتِ سرکاری ہی کی حفاظت کی طرف توجہ نہیں کی گئی، بلکہ رعایا کے عرائض اور لوگوں کے باہمی خانگی خط و کتابت کا بھی بڑا ذخیرہ جمع کیا گیا تھا، جس سے اُس زمانے کی معاشرت اور تمدن کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔

جغرافیہ بھی اُس زمانے میں ایک مستقل فن کی حیثیت حاصل کرچکا تھا اور اس شاخ میں اگر کسی تختی پر شہروں، قصبوں، دریاؤں، پہاڑوں کی فہرستیں درج تھیں، تو کسی پر مختلف مقامات کے موقع اور خصوصیات اور پیداوار وغیرہ کے حالات ثبت تھے۔

کتب خانے کی ایک بڑی شاخ قوانین سے تعلق رکھتی تھی۔ اس میں بعض تختیوں پر قوانین نافذہ کی نقول تھیں اور بعض معاہدات خانگی شلاً بیعنامے، دستاویزات قرضہ کفالت نامہ جات وغیرہ کی حیثیت رکھتی تھیں۔ اس زمانے کے لوگوں کو یہ سُنکر بڑی حیرت ہوگی کہ اُس قدیم زمانے میں بھی مقدمات کے فیصلے محفوظ کئے جاتے تھے، تاکہ آیندہ بطور نظائر کے کام آئیں یا قوانینِ موجودہ کی ترمیم اور جدید قوانین کی وضع کا ذریعہ بنیں۔

ایک اہم صیغہ روایاتِ مذہبی سے متعلق تھا، جنمیں سے بہت سی روایتیں دوسری

قوموں سے لیگئی تھیں۔ ان روایات میں سب سے زیادہ ذکر کے قابل گلگامیس کا قصہ ہے، جو غالباً حضرت عیسیٰؑ کی پیدایش سے دو ہزار سال قبل مرتب ہوا تھا۔ یہ قصہ بارہ جلدوں میں تھا اور ہر جلد کا نام کسی ایک نہ ایک برج پر رکھا گیا تھا اور گیارہویں جلد میں جسکا نام دَلو تھا، طوفانِ نوحؑ کے متعلق وہ روایت درج تھی، جو اہالیِ بابل میں مشہور تھی، جس سے طوفانِ نوحؑ کے اُس قصے کی، جو عہدِ قدیم میں درج ہے، پوری تصدیق ہوتی ہے، گلگامیس غالباً وہی شخص ہے، جسکا ذکر نمرود کے نام سے عہدِ قدیم میں آیا ہے، اسی طرح بہت سی تختیوں پر مختلف قسم کی روایتیں اور حکایتیں درج تھیں، اور بعض پر بھوت پلیدوں کے قصے اور اُنکے اُتارنے کے منتر ثبت تھے

ایک شاخ دیومالائی سے تعلق رکھتی تھی اور اُس میں جو تختیاں تھیں اُن پر دیوتاؤں کی فہرستیں اور اُن کے اسما اور صفات اور مندروں کی تفصیل مندرج تھی، اور بعض تختیوں پر مختلف دیوتاؤں کی شان میں مناجاتیں اور وہ دعائیں جو مختلف درجہ اور طبقہ کے لوگوں کو خاص خاص حالتوں میں مثلاً جبکہ کوئی مصیبت نازل ہو، یا جنگ میں شریک ہونا پڑے، مانگنی چاہئیں، منقوش تھیں

اہلِ اسیریا کا علمی تجسس زمین ہی تک محدود نہ رہا، بلکہ اُن کی فکرِ بلند پرواز نے آسمان تک بھی رسائی پیدا کی تھی، چنانچہ اُن کی کتابوں کا ایک بڑا ذخیرہ علمِ ہیئت سے متعلق تھا، جنمیں اجرامِ فلکی کی اشکال اور گردشوں کی کیفیت تحریر تھی اور مختلف آثار و مناظرِ فلکی کی بھی توضیح کی گئی تھی۔ شاہانِ آسیریا نے اُس عظیم الشان قدیم تصنیف کا بھی ترجمہ اپنی زبان میں کرایا تھا، جو نور بیل کے نام سے جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا ہے۔ سارگن شاہ بابل کے زمانے میں (۷۲) جلدوں میں تصنیف ہوئی تھی اس کتاب کا ترجمہ یونانی زبان میں بھی مؤرخ بروسس نے کیا تھا لیکن افسوس ہے کہ آج نہ اصل کتاب باقی ہے اور نہ یونانی ترجمہ، لیکن خوش قسمتی سے آسیری ترجمہ کی فہرست کا ایک حصہ موجود ہے، جسکے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس میں سورج اور چاند کے قِران اور مریخ اور زہرہ کی گردشوں اور دُمدار ستاروں پر جن کی توضیح ان الفاظ میں کیگئی تھی "وہ ستارے جو پسِ پشت دُم اور پیشانی پر تاج رکھتے ہیں" مکمل رسالے تھے

چونکہ جوتش یا نجوم بھی علم ہیئت کی ایک شاخ سمجھی جاتی تھی، اسلئے اُسکے متعلق بھی بہت سی تختیاں تھیں، جنہیں ثوابت اور سیاروں کی تاثیرات پر بحث کیگئی تھی۔

ایک نہایت دلچسپ صیغہ حیوانات و نباتات و معدنیات سے متعلق تھا، جسمیں چوپایوں، پرندوں، حشرات الارض، گھاسوں اور پتھروں وغیرہ کی فہرستیں اُن کے اقسام و انواع کے لحاظ سے ضبطِ تحریر میں لائی گئی تھیں اور اُن میں سے ہر ایک کی تاثیرات پر بھی بحث کی گئی تھی۔ دھاتوں کی فہرستیں بھی بعض تختیوں پر اِس تفصیل کیساتھ کہ وہ کس کام میں آتی ہیں لکھی گئی تھیں، اور بعض پر مختلف قسم کی کھانے پینے کی چیزوں کی فہرستیں درج تھیں۔

ایک چھوٹی سی شاخ ریاضی و حساب سے تعلق رکھتی تھی اور اُس میں بعض گلی رسالے ایسے بھی تھے، جنہیں جذر مربع و مکعب نکالنے اور پیچیدہ سوالات کے حل کرنیکا طریقہ بتایا گیا تھا۔ مختلف اعداد کے مربعوں اور مکعبوں کی جدولیں آج تک موجود ہیں۔

یہ گلی کُتب خانہ جن علوم و فنون پر حاوی تھا، وہ زیادہ تر کلدانیوں اور بابلیوں کی جولانیِ طبع کا نتیجہ تھے۔ اور چونکہ وہ پہلے سے ایک اجنبی زبان اور غیر مانوس خط میں قلمبند تھے، اس لئے شاہانِ اسیریا کو اُنھیں اپنی زبان میں لانیکے لئے ترجمہ کا بھی بڑا اہتمام کرنا پڑا اور اکثر کتابوں کے نہ صرف ترجمے کرائے گئے، بلکہ بہ لحاظِ دقتِ مضامین اُن پر مبسوط شرحیں بھی لکھی گئیں۔ چنانچہ اسی ضرورت سے علمِ صرف و نحو بھی مدوّن ہوا اور لُغات کی کتابیں بھی تصنیف ہوئیں، جس میں بابلی اور آسرین دونوں زبانوں کی خصوصیات پر بحث تھی۔

یہ گلی تختیاں بڑی چھوٹی سب قسم کی ہوتی تھیں، یعنی اگر کوئی طول میں ایک فٹ ہوتی تھی، تو کوئی ایک ہی انچ اور اُن کے چاروں طرف خشک ہونے سے پہلے لوہے یا پتیل کے نوکدار قلم سے لکھتے تھے اور خشک ہونے کے بعد اُن کو آوے میں پکا لیتے تھے حروف بعض وقات اسقدر باریک ہوتے تھے کہ کلان بین سے بھی بمشکل سے نظر آسکتے ہیں اور خط وہی قدیم پیکانی تھا، جو زمانہ قدیم میں کلدانیا اور بابل اور ایران میں مروّج

(٣٠٠٠٠)
تھا اور جسکو یہ نام حروفِ ابجد کے تیر نما ہونے کی وجہ سے دیا گیا ہے، اس قسم کی تیس ہزار سے بھی زیادہ تختیاں نینوا کے کتب خانہ میں جمع کیگئی تھیں اور یہ خوشی کی بات ہے کہ اُن میں سے بہت سی برٹش میوزیم اور یورپ و امریکا کے دوسرے ملکوں کے عجائب خانوں میں آج تک دُنیا کے قدیم تمدن پر گہری روشنی ڈالنے کیلئے موجود ہیں۔

خاکسار۔ محمد عزیز مرزا۔
از بیٹر

# تواریخِ قدیمۂ اسلام

والد مرحوم کو ابن ہیجمپرز کے اور خود ہیجمپرز کو ابتدائی شعور سے اسکا شوق رہا کہ مصنفاتِ علمائی سلفِ اسلام فراہم ہوں۔ وہ طویل عمریں اِس کوشش میں گذریں، مگر پوری کامیابی نہوئی۔ اب خیال اس امر کا پیدا ہوا کہ کتب قدیم اسلام کی کیا ہوئیں، انگریزی عربی و فارسی تاریخوں کے ملاحظہ سے یہ بات معلوم ہوئی کہ مختلف دولِ اسلام میں بڑے بڑے کتابخانے قائم ہوئے۔ چنانچہ اندلس کے خلفای بنی اُمیہ نے قرطبہ میں، اور خلفاءِ بنی فاطمیوں نے القاہرہ میں، اور خلفای بنی عباس نے بغداد میں، کتابخانے ترتیب دیئے۔ اور عظیم الشان کتابخانے قائم ہوئے۔ حسن المحاضرہ میں سیوطی نے مصر کے کتابخانے کی نسبت بہت مبالغہ کیا ہے۔ اور انگریزی تاریخ جو اسپین کی لکھی گئی ہے اُس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ قرطبہ کا کتابخانہ عظیم الشان تھا۔ بغداد کا کتابخانہ قس علی ہذا، جو عہدِ عباسیوں سے فراہم ہو رہا تھا اور خلیفہ مستعصم باللہ تک قائم رہا، معمولی کتابخانہ نہ تھا۔ مگر دست بُرد زمانہ سے یہ سب کتابخانے ضائع ہوگئے۔ قرطبہ کے کتابخانے کا خون کارڈنل زمینیز کی گردن پر ہے، جسنے اس کتابخانے کو جلا دیا۔ اس کتابخانے کا نمونہ اسکوریل لائبریری میں اسپین کے موجود ہے۔ اور وہ تخمیناً چار ہزار جلدیں ہیں۔ اس کتابخانے کی فہرست زبان لاطین میں لکھی گئی ہے۔ بلاشبہ جو موجود ہیں، وہ نادر الوجود ہیں۔ مصر کا کتابخانہ سلطان صلاح الدین اعظم

کے وقت میں منتشر ہوا اور جہانتک دریافت سے معلوم ہوتا ہے اس کتابخانے کی واماندہ کتابیں دمشق کے کتابخانے میں ہیں، اور اُسکے پہلے سے بھی دمشق میں کچھ کتابیں تھیں اور وہاں ایک مدرسہ بھی تھا، جسکا علماے سلف کے احوال سے نشان ملتا ہے۔

فی زمانناوہ کتابیں جو تا قتل خلیفہ مستعصم باللہ لکھی گئیں، کمیاب ہیں۔ اور جو کتاب جس فن کی ملجاتی ہے وہ عمدہ اور اپنی قسم میں بے مثل ہے، کتابخانۂ بغداد بزمان فتنۂ ہلاکو خاں ضائع و برباد ہوگیا۔ اور بہت افسوس ہے کہ نصیر الدین طوسی جیسے عالم نے ایسے مجموعے کو ضائع ہونے دیا، خواجہ نصیر الدین طوسی کو ہلاکو خاں پر اختیار کلی تھا۔ مگر افسوس ہے کہ ان بزرگ نے کوئی کوشش ان کتابوں کے بچانے کی نہیں کی۔ بعد قتل خلیفہ مستعصم باللہ حوالی بغداد اور شام میں کتابیں جستہ جستہ منتشر ہوکر رہیں۔ اُن ہی میں سے وقتاً فوقتاً بڑی تلاش سے ایک دو ملجاتی ہیں۔ ہندوستان کے کتابخانے سنہ ۱۸۵۷ء کے غدر میں ضائع و تلف ہوگئے۔ صدہا کتابیں ہندوستان سے باہر گئیں۔ صدہا کتابیں پھٹ گئیں، اور صدہا کتابیں کیڑوں کی غذا ہوئیں۔ اب جو کتابیں ہندوستان میں باقی رہ گئی ہیں وہ غفلت سے مالکِ کتب کے تلف ہو رہی ہیں۔ اور اکثر مالک کتب ایسے ہیں جو یہ بھی نہیں جانتے کہ یہ کتابیں کیا ہیں۔ اس زمانے میں اسلامی سلطنتوں میں کتابخانہ خدیو مصر کا اور قبۂ محمودیہ کا مدینہ منورہ میں ہے، مختلف کتابخانے قسطنطنیہ میں ہیں، جنکی فہرستیں بھی چھپی ہیں۔ ہم لوگوں کے ہاتھ میں اس امر کے جاننے کیلئے کہ علماے اسلام کی کیا کیا کتابیں تھیں اور ہیں فہرست ابن ندیم، کشف الظنون، فہرست کتابخانۂ خدیویہ، قسطنطنیہ کے کتابخانوں کی فہرستیں اور یورپ کے کتابخانوں کی فہرستیں ہیں۔ اِن فہرستوں کے دیکھنے سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ کثرت سے تصانیف علماے اسلام کی تھیں۔

یہ امر قابل لحاظ کے ہے کہ اسلام میں کس زمانے سے تصانیف شروع ہوئیں۔ اسکی تحقیق بہت دشوار معلوم ہوتی ہے۔ صرف فہرست ابن ندیم ہے جو چوتھی صدی میں لکھی گئی۔ اس فہرست میں جو کتابیں مندرج ہیں، اس میں سے سو میں دس بھی دکھلائی نہیں دیتی ہیں

مگر اس فہرست ابن ندیم کے دیکھنے سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ چوتھی صدی تک کچھ کتابیں لکھی گئی تھیں - صدی اوّل اور دوم کی کوئی کتاب متداول سوای موطا امام مالکؒ کے نہیں ہے - عہدِ خلفای بنی امیہ میں اگر کتابیں کچھ لکھی گئیں، تو صرف اُنکے نام معلوم ہیں، کتابیں موجود نہیں ہیں - دولتِ عباسیہ میں تالیف اور ترجمہ بزبانِ عربی شروع ہوئے، اور اس خاندان کی سلطنت میں بڑے بڑے نامی علما ہوئے - اور انھوں نے ہر فن میں کتابیں باستعانت تراجم کتب السنہ دیگر تصنیف کیں - جیساکہ میں نے اوپر ظاہر کیا کہ باعث حرق وغرق کتبخانۂ قرطبہ بغداد کے کل کتابیں مفقود ہوگئیں -

ایک بڑی چیز کتب سِیَر و تاریخ ہے - اقدم تصنیف رسول اللہ صلعم کے احوال میں سیرت ابن ہشام ہے - جو تیسری صدی میں لکھی گئی ہے، اور وہ ایک متوسط الضخامتہ کتاب ہے، اور جو تاریخیں کہ چوتھی صدی میں لکھی گئی تھیں، ان میں سے اہل فرانس و جرمن کی مہربانی سے مروج الذہب مسعودی کی اور تاریخ ملا جریر طبری کی ہم لوگوں کو نصیب ہوئیں، ورنہ انکا بھی عنقا کیطرح سے صرف نام رہتا - تیسری کتاب طبقات الکبیر ابن سعد کی ہے، جو صحابہ و تابعین رضوان اللہ علیہم اجمعین کے احوال میں ہے، اور علمای جرمن نے چھاپنی شروع کی ہے - ابن سعد کی وفات سنہ ۲۳۰ ہجری میں ہے، چھاپہ نہونے کے باعث یہ کتابیں شاہی کتبخانوں میں رہیں، یا دستبرد زمانہ سے یورپ کے قدردانوں کے ہاتھ میں گئیں - یہاں یہ لکھنا ضرور ہے کہ جرمن کے چند کتابخانوں میں بہت نادر الوجود کتابیں عربی کی ہیں

وِلہوسن ایک جرمن عالم نے، جو زبانِ عربی سے خوب ماہر تھا، ایک کتاب لکھی ہے جسمیں اُسنے واقعاتِ مابعد رسالت پر جرح و تعدیل کی ہے - اور رطب یابس کو چھانٹ کر خلفاے اربعہ کے حالات باستناد کتب قدیم تاریخ عربی پوری تحقیقات کے ساتھ لکھے ہیں اور بہت سی باتوں کو جو اسوقت زبان زد ہیں، اپنی کتاب سے خارج کیا ہے - جب دو سو برس تک واقعات ضبطِ تحریر میں آئے، اور اگر آئے ہوں تو ایسی کوئی کتاب اُس زمانہ کی دستیاب نہیں،

ان واقعات کا علم محض اُن لوگوں کی زبانی ہوا ہے کہ جو ان واقعات کو اپنے بزرگوں سے سُنتے
چلے آتے تھے، چنانچہ یہ امر تاریخ طبری سے ثابت ہے، مؤرخ موصوف نے ہمیشہ ہر چیز کو بروایت
اپنی کتاب میں قال فلاں بن فلاں کر کے لکھا ہے - ناظرین پر یہ امر بخوبی ظاہر ہے کہ بعد وصال
رسول صلعم خلیفین اوّلین کے وقت تک اطمینان و تسلّط رہا - یعنی فرقہ اسلام میں مختلف شعبے
نہیں ہوئے - مگر آخر عہد میں خلیفہ سوم ؓ کے فتنہ و فساد شروع ہوا - ایک فریق خلیفہ سوم
کی شہادت کے بعد امیر معاویہ کے ساتھ ہوا، ایک فریق حضرت عائشہ کا ساتھی تھا، اور
ایک فریق جناب امیر علیہ السّلام کی تائید میں آمادہ حرب پیکار ہوا - اب ہر شاہد کے قول
کو باور کرنے کے قبل اسکو غور کرنا ہوگا کہ قائل میں صلاحیت کس قسم کی ہے، جو لوگ جسکے
طرفدار تھے - اُسی کی سی بات کہا کرتے تھے - ایسی حالت میں مؤرخ کو لازم ہے کہ کسی طرف
کو نہ جھکے، بلکہ جو روایت کہ پہونچی ہے، اُسکی ہو بہو بجنسہ نقل کر دے - ارباب بصیرت ہر وقت
تنقید روایت اور راوی کی حیثیت و صلاحیت - اور اسکے میلان کو دیکھ لینگے - صرف دو
کتابوں میں اس بات کا لحاظ کیا گیا ہے کہ روایت بتقید راوی لکھی جائے - اوّل طبقات ابن سعد میں
اور دوسرے طبری میں، ان دونوں کتابوں کے مصنف ابن سعد اور جریر طبری نے اپنی کوئی
رائے رواۃ کے صادق یا کاذب ہونیکی نسبت نہیں لکھی - اور اس امر کو مبصر کتب کی تفتیش پر
چھوڑا ہے - اس ہیچمیرز کا دعویٰ یہ ہے کہ ۱۳ سو برس کے بعد اسکی تفتیش میں کامیاب ہونا
بہت دشوار ہے - احوالِ رواۃ میں جو چوتھی صدی میں کتابیں لکھی گئی ہیں - اس میں کچھ شک نہیں ہے
کہ جن علمائے نے یہ کتابیں لکھی ہیں، اُنھوں نے محنتِ شاقہ کی ہے - مگر جو کچھ ہے وہ سب اخبار
سماعی پر منحصر ہے - عربوں میں اخبار نویسی اور احوالِ اعیان لکھنے کا سلیقہ اہلِ عجم سے بمدارج بہتر تھا
اس ہیچمیرز نے طبقات الکبریٰ سے بہتر کوئی کتاب احوالِ اعیان میں انگریزی زبان میں بھی
نہیں دیکھی - راویوں کے صدق و کذب کی تنقید تو بڑی چیز ہے - کتابیں بعض مصنف کے نام سے
غلط لکھ دی گئی ہیں - چنانچہ کتاب الامامۃ والسیاسۃ ابن قتیبہ کے نام سے مشہور ہے - حالانکہ کسی

طبقات یا کسی حوالِ اعیان کی کتاب میں یا فہرست تصانیف ابن قتیبہ میں یہ کتاب داخل نہیں ہے علمای جرمن کی بھی یہی تحقیقات ہے۔ دوسری کتاب اعصم کوفی کی فتوح ہے۔ اس کتاب کا ترجمہ حمداللہ مستوفی نے فارسی میں کیا ہے، مگر اعصم کوفی کی کوئی کتاب اس نام کی کہیں مذکور نہیں ہے اور اعصم کوفی کی فتوح کتبِ مجہولہ میں گنی جاتی ہے۔ بجز اسکے کہ حمداللہ مستوفی کے قول کو باور کیا جاسے اور کوئی سند اس کتاب کی نہیں ہے۔ ایسی حالت میں اِن واقعات کی تنقید جو تیرہ سو برس قبل واقع ہوئے، اور جسکے بعد سے دو سو برس تک کوئی تحریر نہیں ہوئی، کوہ کندن و کاہ بر آوردن ہے۔

فارسی میں چھٹی صدی کے بعد سے تاریخیں لکھی گئیں۔ اور ان فارسی تاریخوں میں ایک بڑا نقصان یہ ہے کہ کہیں حوالہ کسی کتاب کا نہیں ہے۔ کل فسانہ کے طور سے ہیں۔ اکثر لوگوں سے سُنا جاتا ہے کہ حبیب السیر میں، روضۃ الصفا میں اور روضۃ الاحباب میں یہ واقعات ہیں۔ مگر اس بات کا پتہ نہیں چلتا کہ اِن حضرات نے ان واقعاتِ قدیمہ کو کہاں سے اپنی کتاب میں درج کیا ہے۔ بے صحتِ راوی کے ان حضراتِ قدیم کے محاسن یا معائب کو کسی شخص کے محض سمعی بیان پر قبول کر لینا کوئی انصاف پسند جائز نہیں رکھیگا۔ فارسی تذکرہ اور تاریخوں میں صفحے کے صفحے اعیان کی تعریف میں سیاہ ہیں۔ ایسے لوگوں کی تحریر جنکا میلان اس قسم کا ہے کب قابلِ قبولِ عقلِ سلیم ہو سکتی ہے۔ ہم لوگ رہنے والے ہندوستان کے ہیں اور خاندانِ تیموریہ کے پادشاہوں کی بہت سی تاریخیں ہمارے ہاتھ میں ہیں۔ بہت سے واقعات عہدِ اکبری اور عالمگیری کے مختلف روشوں سے لکھے گئے ہیں جنکی اصلیت بے جرح و تعدیل کے دریافت نہیں کی جاسکتی ہے۔ امیر تیمور کی تاریخ کو لیجئے۔ ابن عرب شاہ نے عجائب المقدور فی احوال التیمور لکھا۔ اور امیر شرف الدین علی یزدی نے شرف نامہ تیموری لکھا۔ ارباب سیر سخت متردد ہیں کہ جو واقعات دونوں تاریخوں میں موجود ہیں۔ کیونکر باور کئے جائیں۔ ابن عرب شاہ متوسل بارگاہ الدرم بایزید تھا۔ اور شرف الدین علی یزدی امیر تیمور کے آستانے سے

منسلک ہا۔ ایک کی تحریر سے امیر تیمور کے ساتھ عداوت پائی جاتی ہے۔ اور دوسرے کی
تحریر سے خوشامد۔ آزاد مؤرخ اگر ان دونوں تاریخوں سے واقعات مستنبط کرنا چاہے
تو اُسکو یہ ضرور خیال کرنا ہوگا کہ یہ دونوں شاہد ایسے ہیں، کہ جن میں خواہش وصلاحیت راست گفتاری
کی نہیں تھی۔ ہر تاریخ لکھنے کیلئے ضرورت اسکی ہے کہ مؤرخ کو کسی جانب مخالفت یا موافقت نہ
ہو اور اگر وہ جادۂ اعتدال سے منحرف ہوا تو اُسکی کتاب ساقط عن الاعتبار ہے۔ فی زماننا منشی
نولکشور نے ایک کتاب مسمّٰی بہ ترجمۂ تاریخ طبری چھاپی کہ جو اچھی طرح سے ہندوستان میں شائع
ہوئی۔ اسکا نسخہ قلمی کتابخانہ عمومیہ موقوفہ باقی پور میں ہے۔ اس قلمی نسخے کو جب ہیچمیرز نے دیکھا
تو اس ہیچمیرز کے دل میں بڑی عظمت اس کتاب کی پیدا ہوئی۔ مگر اصل طبری کے دیکھنے کے بعد
یہ معلوم ہوا کہ یہ فارسی کتاب بالکل دوسری چیز ہے اور اسکو اصل طبری سے ملا جر بر کے
کچھ علاقہ نہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک ایرانی مؤرخ قدیم ہے۔ اور اسکی کیفیت وہی ہے
جو اور فارسی تاریخوں کی ہے۔ اسوقت اہل اسلام کی حالت یہ ہے کہ نبات النعش کیطرح
سے منتشر ہیں اور اسپر شومی قسمت نے انواع طرح کی مخالفت مذہبی پیدا کر رکھی ہے۔ دو فرقہ عظیم
ہندوستان میں موجود تھے، یعنی سُنی اور شیعہ۔ اب ان دونوں فرقوں میں بھی مختلف
شاخیں نکل آئی ہیں۔ اور اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ افراطِ تعصب سے انواع طرح کے ہنگامے برپا ہوا
کرتے ہیں۔ اور دونوں مخالف فرقوں کے لوگ پولیس کے ہاتھ سے ذلیل، اور حکام دولت
انگلشیہ کے ہاتھ سے سزایاب ہوتے ہیں۔ اور افسوس یہ ہے کہ اسپر بھی متنبہ نہیں ہوتے
ہیں۔ تیرہ سو کئی برس کے بعد حضرت اہلِ سنت ایک جانب۔ اور حضرات اثنا عشریہ دوسری
جانب تحریر کتب مناظرہ میں مشغول ہیں۔ چنانچہ جہانتک اس ہیچمیرز کو معلوم ہے۔ ایک نہایت
خوش لیاقت جوان معقول اپنی عمر گرامی کو اس قسم کی تحریروں میں صرف کر رہے ہیں۔ یہ قصہ
ساتویں صدی سے شروع ہوا ہے، اور سینکڑوں کتابیں سُنیوں نے خلاف میں شیعوں
کے اور شیعوں نے خلاف میں سُنیوں کے لکھیں۔ مگر آجتک سوا اسکے کہ اس قسم کی کتابوں

کے لکھنے والوں نے اپنی لیاقت وجودت طبع دکھائی، مذہب اسلام یا فرقہ مسلمین کو کوئی نفع نہیں پہونچایا۔ نہ کوئی مجمع سنیوں کا معقول ہو کر شیعہ ہوا اور نہ کوئی مجمع شیعوں کا سنی ہوا۔ اسوقت اہل اسلام کو آپس میں اتفاق پیدا کرکے لازم ہے کہ ایسے عنوان قائم کریں کہ اسلام کو عزت اور اہل اسلام کو ترقیاں دینی و دنیوی حاصل ہوں۔ اور جو اعتراضات اسلام پر دوسری قوموں کے ہیں، اُن کے رفع کرنے میں مشغول ہوں۔

تعجب انگیز واقعہ یہ ہے کہ جو اعتراضات پیوریٹینک لوگوں نے رسول اللہ صلعم کی ذات اور اسلام پر کئے ہیں، اُن کے جواب انگلستان کے علماء دے رہے ہیں۔ اور انکی خبر کسی سنی یا شیعہ عالم کو ہندوستان کے نہیں ہے۔ فَاعْتَبِرُوْا يَآ اُولِي الْاَبْصَارِ

بانکی پور۔ ۲۲۔ اکتوبر سنہ ۱۹۰۴ء۔ ہیچمیرز خدا بخش۔ از کتابخانہ عمومیہ بانکی پور

## روضہ ممتاز محل معروف بہ تاج محل

ہندوستان کے ساتھ جنت نشان کا لقب قدیم الایام سے لگا ہوا ہے، اسکی خوبی اور خوش اسلوبی نے نہ صرف متفرق آدمیوں کو بلکہ قوموں کو اپنا نا دیدہ مشتاق صدیوں تک بنائے رکھا، اور آج بھی ایسی قومیں موجود ہیں، جنکے مُنہ میں ہندوستان کے نام سے پانی بھر آتا ہے، آب و ہوا کا اعتدال، پانی کی کثرت، اور زمین کی سرسبزی، یہ چیزیں ایسی ہیں کہ جب کبھی کوئی باہر کا مسافر یہاں آنکلا، تو وہ اپنے گھر کو بھول گیا اور انمیں سے اکثروں نے یہیں ڈیرے ڈال دیئے۔ دُنیا کی کون سی ایسی نعمت ہے، جو کم و بیش یہاں کے کسی نہ کسی حصے میں نہ ملتی ہو، اور وہ کون سا منظر ہے، جو یہاں کے کسی نہ کسی خطے میں نظر نہ آجاتا ہو۔ جہاں خداوند جل و علا نے اسکو ہر طرح کی ارزانی و فراوانی سے مخصوص کیا ہے، اُسیطرح اور اعتبار سے بھی اپنا ظلِ عاطفت ہمیشہ اسکے حال پر شامل رکھا۔ اسکی عنانِ حکومت ہمیشہ ایسی ہی قوموں کے ہاتھ میں رکھی، جو اسکو با

ترقی کی شاہراہ پر چلاتے رہے، اور جب کبھی حکمراں قوم میں بدنیتی شروع ہوگئی اور اُسنے ترقی کی راہ میں روڑے اٹکانے شروع کئے، تو باریتعالیٰ نے فوراً اُس قوم کو مع بیخ و بن اکھاڑ پھینکا۔

قدیم باشندگانِ ہند جنگلوں میں رہا کرتے، ایک دوسرے سے لڑتے، شکار کرکے اپنا پیٹ پالتے اور زمین کی قدرتی زرخیزی سے کچھ فائدہ نہ اُٹھاتے، ملک کی بہبودی کی غرض سے خداوند تعالےٰ نے آریہ قوم کو یہاں کا راج پاٹ حوالہ کیا۔ اس قوم نے ملک سے جتنی منزلیں ترقی کی طے کرائیں اُسکو کسکا منہ ہے کہ پورے طور سے بیان کرے، مختصر یہ ہے کہ اندرپست کو ہندوستان انھیں نے بنایا، جنگل کاٹ کاٹ کر زراعت کو ترقی دی، سوُرماؤں نے راکشوں کو مار مار کر زمین کو دشمنوں سے پاک کیا، امن و امان کیساتھ سادگی کی زندگی بسر کرنے لگے، بفکری کیوجہ سے خوب دُور دُور کی سوجھنے لگی۔ علمِ الٰہی، فلسفہ، حکمت، نجوم، اور ریاضی میں کیسی کیسی ترقی کی۔ راجا سے پرجا تک سب آنند او سُکھی سے تھے، اگر کوئی عیب تھا تو یہ کہ مفتوحین کے ساتھ انکا سلوک اچھا نہ تھا، شُدر کے ذلیل نام سے اُن بیچاروں کو پکارتے، اور اپنے علوم و فنون میں کسیطرحکا حصّہ نہ لینے دیتے تھے۔

اِسکے بعد یہاں کی شاہی کا تاج مسلمانوں کے سر پر رکھا گیا۔ اُنھوں نے بھی اس باغستان کی آبیاری میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا۔ بڑے بڑے دریاؤں کو کاٹ کاٹ کر نہریں جاری کیں۔ اِس سرے سے اُس سرے تک ہر دو شہروں کے درمیان سڑکیں بنا کر وسائل آمد و رفت کو آسان کر دیا۔ سڑکوں پر دورویہ درختوں کی قطار، مناسب مناسب فاصلوں پر کوئیں اور کاروانسرائیں، منزلوں پر کھانے پینے کی چیزوں کی بہتات، غرضکہ مسافر کو سفر میں حضر کا لطف آتا تھا۔ دربارِ دُربار تک جو پہنچ جاتا اُسکا دامنِ اُمید واقعی موتیوں سے بھر جاتا۔ تہذیب اور شایستگی ایسی پھیلائی کہ جنسِ انسان میں مہذب اور وحشی اور نیم وحشی سب الگ الگ دکھائی دینے لگے۔ اور ہندوستان پر سب سے بڑا احسان یہ کیا کہ مفتوحین کے ساتھ شیر و شکر کیطرح مل جل گئے۔ مسلمان اور ہندو دونوں کو جسمِ ہندوستان کی داہنی

اور بائیں آنکھ سمجھا گئے ۔ مبارک وہ زمانہ تھا جبکہ ہندو اور مسلمان بھائی بھائی کیطرح ایکدوسرے کے رفیق حال تھے، بادشاہ کا ایک وزیر مسلمان ہوتا تو دوسرا ہندو - ایک فوج کا افسر پٹھان ہوتا تو دوسرا راجپوت - یہ اُسپر دم دیتا اور وہ اِسپر جاں نثار کرتا، جسدن سے کہ سلاطین نے ہندو اور مسلمان کی تفریق کرنی شروع کی، بس اُسی دن سے سلطنت کو گھن لگنا شروع ہو گیا، یہاں تک کہ سلطنت کی لکڑی بالکل کھوکھلی ہو گئی - کچھ دنوں تک تو اس حالت میں تھمی رہی، لیکن آخر کار منہ کے بل زمین پر گر پڑی مسلمانوں کے بعد سلطنت کا پرچم اُن ہاتھوں میں لہرایا، جو سات سمندر پار سے آ کر یہاں بیوپار کرتے پھرتے تھے، اُن کی حُسنِ تدابیر کا بیان کیا میں اور کیا میری زبان - لیکن اتنا تو سب دیکھتے ہیں کہ شیر اور بکری ایک گھاٹ پر پانی پیتے ہیں، اور سر پر وہ زبردست چرواہا نظر بھی نہیں آتا، جس نے دونوں کو بھیڑیاں بنا رکھا ہے ۔

الغرض جبتک مسلمانوں کے اقبال کا ستارا اوجِ کمال پر چمکتا رہا، مسلمان بھی ہندوستان کی بھلائی میں اپنا خون اور پسینہ ایک کرتے رہے، باوجودیکہ اُس زمانے میں علوم ریاضیہ نے وہ ترقی نہیں کی تھی، جو اسکو آج حاصل ہے، پھر بھی فنِ تعمیر میں وہ یدطولیٰ حاصل کیا تھا کہ آج کے زمانے کے ریاضی داں اور انجنیر اُس وقت کی عمارتوں کو دیکھکر دانتوں کے تلے انگلی دبائے رہجاتے ہیں، یوں تو ہندوستان کو جمالِ جہاں آرا خدا نے پہلے ہی سے ایسا دے رکھا تھا کہ اُس کے دیکھنے کی کون سی آنکھ تھی، جو مشتاق نہ تھی، اور کون سا دل تھا، جو آرزومند نہ تھا، لیکن جب سے کہ مسلمانوں نے اُسکے خال و خط کی اصلاح کی، اور عالیشان عمارات تعمیر کر کے اُسکے گلے میں موتیوں کا ہار پہنایا، تب سے تو اُسکو صرف ایک نظر دیکھ لینے کیلئے لوگ ہزاروں کوس کے فاصلے سے آنے لگے - صدیاں گذرنے کو آئیں، لیکن مشتاقوں کا تانتا ہے کہ بند ہی نہیں ہوا، خدا اُسکو چشم زخم سے بچائے، حوادث کی آنکھ نہ لگنے دے ۔

اِن گرانبہا موتیوں میں سب سے چوٹی کا موتی آگرہ کا تاج ہے - ؎

زباں پہ بارِ الٰہا یہ کس کا نام آیا ✱ کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لئے

اللہ اللہ کیا عمارت ہے، کیا صنعت ہے۔ انسان کی کاریگری ہے، یا ید قدرت کا کرشمہ ہے۔ دنیای موجود کا مکان ہے، یا بہشتِ اُخروی کا نمونہ۔ ہماری کیا بساط جو ہم اُس کی تعریف کا ارادہ کریں۔ نہ اُس کی خوبی ہماری یا کسی اَور کی تعریف کی محتاج، بڑے بڑے مبصرین نے دُنیا کے سات عجائبات میں سے اسکو تیسرے درجے پر ممتاز کیا ہے اور خود اسکی تعریف میں سوا محوِ حیرت ہوجانے کے کچھ نہ کہہ سکے۔ قصّہ گویوں کی زبانی حسین کی تعریف سُنی تھی کہ اُسکے رُعبِ حُسن کے آگے کسی کی آنکھ نہیں ٹھیرتی۔ اِن آنکھوں نے ایسا حسین انسان تو ابھی تک نہیں دیکھا۔ لیکن ہاں انسانوں کی بنائی ہوئی یہ عمارت بیشک ایسی دیکھی کہ جسکو دیکھکر گویا ازخود رفتہ ہوجانا پڑا۔ ممکن ہے کہ بعض حضرات میرے بیان کو ایشیائی شاعری سمجھیں، لیکن چونکہ واقعہ ہے اسلئے لکھتا ہوں کہ میں اِسوقت تک پانچ مرتبہ تاج کی زیارت کے لئے گیا، اور ہر مرتبہ کئی کئی گھنٹے احاطے کے اندر گذارے، لیکن پچھلی مرتبہ کے علاوہ اور دفعات میں تو میں ایسا بیخود ہوجایا کیا کہ مجھکو قبور پر فاتحہ تک پڑھنے کی نوبت نہ آئی۔ بس میں ہوتا تھا اور میرے پریشان خیالات، دریا کا کنارہ ہوتا تھا، اور میری نہ سیر ہونے والی آنکھیں۔ خدا بھلا کرے جناب مولوی سید عبداللہ صاحب جعفری مدرس آگرہ کالج کا کہ اُنھوں نے نہایت مہربانی اور مسافرنوازی سے پچھلی اگست میں مجھکو اور میرے ہمراہیوں کو تاج کی صنائع و بدائع کی بھی کچھ سیر کرائی۔

لیکن ابھی میں نے کیا دیکھا۔ نہ بھول بھلیاں میں گم ہوا۔ نہ ایک ایک سُورہای قُرانی کو ختم کیا۔ نہ مسجد میں نماز ادا کی۔ نہ تسبیح خانہ کا مسجد سے مقابلہ کیا، نہ گنبد پر چڑھا۔ نہ میناروں پر سے شہر کی کیفیت دیکھی، اور نہ شب ماہ میں اُس بقعہ نور کی زیارت کا مزہ لُوٹا۔ تاج کے متعلق یہ وہ معمولی اور سطحی چیزیں ہیں کہ جنکو ہر کس و ناکس دیکھہ سکتا ہے۔ رہا اسکی پھول پتی، بیل بُوٹے، صناعی اور کاریگری پچیکاری اور رنگ آمیزی، تناسب اور تقارب، اُن کو ہم کیا خاک دیکھینگے۔ ہر ہر قدم پر ڈر لگتا ہے کہ بیخودی میں مُنہ سے تعریف کا کلمہ نکلا اور تحسین ناشناس ہوکر مرحوم شاہجہاں کی روح کو اذیت ہوئی۔

ز فرق تا بہ قدم ہر کجا کہ سے نگرم + کرشمہ دامنِ دل میکشد کہ جا اینجاست

تاج کی زیارت کے لیے آنیوالوں کا مجمع جبتک کہ تاج قائم ہے، اور خدا اُسکو ہمیشہ قائم رکھے نہ کم ہوا ہے اور نہ کم ہوگا۔ صدہا آدمی نہ صرف اطراف وجوانب سے بلکہ دُور دراز مقامات سے آتے ہیں، اِدھر اُدھر پھرتے ہیں، اور چلے جاتے ہیں، اُن کو ایک چکاچوندسی ہو جاتی ہے اور کچھ نہیں سمجھتے کہ کیا دیکھنا چاہیے۔ مولوی محمد معین الدین صاحب اکبرآبادی جنرل سپرنٹنڈنٹ کلکٹری متھرا نے اُردو داں حضرات پر بڑا احسان کیا ہے کہ تاج اور صاحب تاج کے حالات مفصل و مشرح لکھے ہیں۔ ممتاز محل کی خاندانی حالت، تعلیمی کیفیت۔ شاہزادہ شاہجہاں کے ساتھ شادی دکن میں شاہزادہ اور بیگم کی خوش گذران زندگی، پھر نورجہاں اور اُس کے داماد شہریار کیوجہ سے شاہجہاں کا آٹھ سال تک مبتلاے آفات رہنا، بیگم کا ساتھ دینا۔ ازاں بعد تقدیر کا کروٹ بدلنا، اور شاہجہاں کو تخت سلطنت پر لا بٹھانا۔ اب بیگم کا اقتدار اور اُسکے کارہاے نمایاں یہ سب اسطور سے بیان کیا ہے کہ اُس زمانے کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے، آخر کار بیگم کو بستر مرگ پر غش پر غش آنے، شاہ سے آخری ملاقات اور وصیت، شاہجہاں کی آنکھوں کے سامنے روح کی مفارقت، بادشاہ کی گریہ وزاری اور بیقراری، اِن کو پڑھ کر توجی تڑپ اُٹھتا ہے۔ اور بغیر قطرہاے اشک کا اخراج اوسکے نہیں بن پڑتا۔ تاج محل کی طیاری۔ صناعوں کے نام اور اُن کی تنخواہیں۔ عمارت کے ایک ایک قطعے کی مفصل کیفیت۔ ہر چیز کی پیمایش۔ خرچ کا تخمینہ۔ باغ کی دلپذیر تعریف، تاج کے دیکھنے میں جن جن چیزوں کا خاص طور پر خیال رکھنا چاہیے اُسکا بیان، یہ سب شرح و بسط کے ساتھ لکھا گیا ہے۔ کسی اطالین کا نقشہ تاج محل بنانا۔ پچیکاری میں فرانسیسی کاریگر کا مشورہ دینا وغیرہ اُنکی نسبت یورپین مورخین کا خیال اور اُن پر مصنف کا محاکمہ قابل دید ہے۔ مضافات تاج محل میں جو عمارات واقع ہیں اُنکے بیان میں اُسوقت کے ناموروں کی خاصی مختصر تاریخ لکھدی ہے۔ پھر اُن کتابوں کی فہرست بھی دیدی ہے، جن سے مصنف نے اپنی تصنیف میں مدد لی ہے۔

جہاں تک مجھے معلوم ہے، اُردو میں اس سے بہتر کوئی کتاب تاج کے حالات میں

نہیں لکھی گئی، اور میری رائے ہے کہ اُن لوگوں کو جو تاج کے دیکھنے کا ارادہ رکھتے ہوں، ضروری ہے کہ اس کتاب کو جانے سے پہلے پڑھیں اور اپنے ساتھ لیجاکر ایک ایک چیز کا کتاب سے مقابلہ کریں جب جاکر تاج کی سیر کا کچھ لطف بھی حاصل ہوگا اور مصنف کو اپنی محنت وجانفشانی کی داد بھی ملیگی۔ مصنف نے کتاب میں پانچ نقشے بھی دیے ہیں، جو نہایت خوب ہیں۔ اکثر اُن یورپین سیاحین کی رایوں کا اقتباس درج کیا ہے، جو روضے کی زیارت سے مشرف ہوئے ہیں۔

تاج کے متعلق ایک پُر حسرت مسدس اور خود حضرت شاہجہاں کے اشعار بھی مرقوم ہیں، جو بس پڑھنے ہی سے تعلق رکھتے ہیں۔ نفسِ کتاب متوسط سفید کاغذ کے ۱۴۲ صفحوں میں ختم ہوئی ہے، چھپائی صاف ہے، حرف جلی ہیں، اور کتابت کی غلطیاں بھی بہت کم ہیں۔ میرے پاس کتاب غیر مجلد شکل میں پہنچی۔ صفحہ عنوان (ٹائیٹل پیج) سادہ ہے، اور نہ یقینی طور سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کتاب کا نام کیا ہے، تمہید کے پانچ صفحے علیحدہ ہیں، اُسکے بعد صفحوں کا پھر از سرِ نو نمبر شمار چلتا ہے۔ اس نئے نمبر شمار کے پہلے صفحے پر بعد بسم اللہ الرحمن الرحیم جو جلی قلم سے بطور پیشانی "روضۂ ممتاز محل معروف بہ تاج محل" لکھا ہے۔ شاید یہی اس کتاب کا نام ہو کتاب کی قیمت درج نہیں ہے۔ انگریزی میں تین صفحوں کی تمہید علیحدہ ہے۔ شاید عمارات سے دلچسپی لینے کی بنا پر لارڈ کرزن بہادر بالقابہ کا شکریہ انگریزی زبان میں بھی لکھا جانا زیادہ مناسب سمجھا گیا۔ پھر بھی اُردو کے ساتھ انگریزی کا اتنا بڑا پیوند کچھ جوڑ نہیں کھاتا۔ کتاب کے عمدہ بلکہ نہایت عمدہ ہونے میں کوئی کلام نہیں اور ہمکو تو دوسرے مکمل حصے کے طیار ہونے کا سخت انتظار ہے، جسکا وعدہ جناب مصنف نے تمہید میں فرمایا ہے۔

جلال الدین حیدر۔

۴۔ نومبر ۱۹۰۴ء

# ولایت کی تعلیم

ہر اہلِ شغل اپنے مشاغل کو دیکھ لے ÷ ہر ذی شعور اپنے وسائل کو دیکھ لے
گمراہ نقشِ پا ہی قوافل کو دیکھ لے ÷ رہرو سفر سے پہلے منازل کو دیکھ لے

کچھ عرصے سے ہمارے ہندوستان کے بزرگوں نے عام اس سے کہ وہ ہندو ہوں، یا مسلمان اس طرف توجہ شروع کر دی ہے کہ اگر وہ اپنے آپ کو اخراجات کے برداشت کرنیکے قابل سمجھلیں تو اپنی اولاد کو تعلیم کی غرض سے انگلستان بھیجدیں۔ اسکو دیکھکر ضرور خوشی ہوتی ہے کہ ان کے خیالات میں اسقدر ترقی ہوگئی کہ وہ اپنی اولاد کو نہ صرف یہاں تعلیم انگریزی دینے میں عذر نہیں کرتے، بلکہ انگلستان کی تعلیم کی ضرورت کو بھی ایک حد تک محسوس کرنے لگے ہیں، خدا اُن کو اس امر کی استطاعت دے۔ کہ وہ اور زیادہ اپنے آپکو اس قابل پائیں کہ اپنی اولاد کی اعلیٰ تعلیم میں روپیہ صرف کر سکیں، لیکن افسوس اس امر کو سنکر ضرور ہوتا ہے کہ بعض والدین کی یا اُن کے عزیزوں اور دوستوں کی وہ اُمیدیں اُن کی واپسی پر پوری نہیں ہوئیں، جو اُن نوجوانوں سے اُسوقت کیجاتی ہیں، جبکہ وہ انگلستان جانیکے واسطے رخصت کئے جاتے ہیں وہ نا اُمیدیاں غالباً دو بڑے حصوں پر تقسیم ہو سکتی ہیں۔

(۱) بعض انگلستان کے واپس شدہ تعلیم یافتوں کی نسبت اس امر کی شکایت کیجاتی ہے کہ اُن کے اخلاق خراب ہو گئے ہیں اور اُنمیں انگریزیت اسقدر جاگئی ہے کہ وہ ہندوستانیوں سے ملنا پسند نہیں کرتے اور اُن کو "نیٹو" کہتے ہیں۔ یہانتک کہ اپنے پُرانے لنگوٹیا یاروں سے بھی ایسا رکھ رکھاؤ برتاؤ کرتے ہیں کہ اُن سے پھر ملتے ہوئے لوگوں کو عام طور سے عار ہوتا ہے۔

(۲) بعض کی نسبت اس امر کی شکایت سُنی جاتی ہے کہ فلاں صاحب اتنی مدت تک انگلستان میں رہے اور اسقدر زرِ کثیر صرف کیا مگر واپسی پر اپنی قابلیت اور لیاقت کا کچھ اظہار نہ کیا۔ اور اسقدر بھی پیدا کرنے کے لائق نہوئے کہ آرام و آسایش سے

اپنی بسر اوقات کر سکیں۔ گویا کہ والدین کے روپئے کو اور اپنے وقت کو محض بیکار غارت کیا۔
میرا اس مضمون میں منشا صرف دوسرے حصّے پر بحث کرنیکا ہی، کیونکہ پہلے حصّے کو نہ میں اسقدر ضروری سمجھتا ہوں اور نہ اسوقت میرے پاس اسقدر وقت ہے۔ اگر افکار زمانہ نے فرصت دی، تو انشاء اللہ آیندہ کسی وقت پہلے حصّے پر بھی بحث کرونگا۔

پیشتر اس سے کہ میں اس مسئلے پر کچھ بحث کروں، میں ایک سوال اُن تمام والدین سی کرنا چاہتا ہوں، جو اپنی اولاد کو تعلیم کی غرض سے انگلستان بھیج چکے ہیں، یا بھیجنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ وہ یہ کہ کتنے ایسے والدین ہیں، جنھوں نے ایک منٹ کیواسطے بھی بچے کی تعلیم کے شروع زمانے میں اس امر پر غور و فکر کرنے کی تکلیف گوارا کی ہے کہ وہ اپنے لڑکے کو ہندوستان میں تعلیم ختم کرنے کے بعد کس قسم کی تعلیم کی غرض سے انگلستان بھیجینگے۔ اور جس غرض سے وہ انگلستان بھیجیں بچے کی شروع تعلیم میں وہ کیا اسکا انتظام کرتے ہیں کہ جس سے بچے کو اس خاص صیغے کیطرف توجہ اور دلچسپی پیدا ہو۔ یہ سوال خود ایسے صحیح ہیں، جنکے جواب کے بعد اس مضمون پر کسی بحث کی ضرورت باقی نہیں رہتی، کیونکہ انکا جواب صرف ایک ہی ہو سکتا ہے کہ شاذ و نادر ہی کوئی ایسے والدین ہوں، جنھوں نے اپنی اولاد کیواسطے اول سے کسی خاص صیغے میں تعلیم پانے کیواسطے انگلستان بھیجنے کا ارادہ کیا ہو اور اُسکے متعلق چھوٹی عمر سے اُس کی تعلیم کا انتظام کیا ہو، اکثر یہ دیکھنے میں آتا ہے [اس جملۂ معترضہ کی معافی چاہتا ہوں کہ انگلستان کثرت سے وہ طلبہ جاتے ہیں، جنکے والدین متوسط درجے کے لوگوں میں شمار کئے جاتے ہیں، اور جنھوں نے عموماً اپنی عمر ملازمت سرکاری میں بسر کی ہے اور زیادہ تر اسی وجہ سے اُن کو اپنی اولاد کی تعلیم و ترقی کی فکر پیدا ہوئی ہے) ] کہ جب ماں باپ کو یا کم از کم باپ کو اپنی اولاد کی تعلیم کے بعد اس امر میں نا اُمیدی ہوئی کہ اُسکو ملازمت سرکاری میں کوئی معقول جگہ بآسانی ملسکے اور جس میں آیندہ ترقی کے ذرائع بھی اچھے ہوں، تو وہ مجبوراً اور دفعتاً (بشرطیکہ اُن کے پاس کافی سرمایہ ہو، اور وہ اعلیٰ تعلیم کے فوائد اور اُس کی ضرورت سے بھی واقف ہوں)

اِس امر کا ارادہ کرتے ہیں کہ وہ اپنے لڑکے یا لڑکوں کو تعلیم کے واسطے انگلستان روانہ کردیں۔ ناانصافی ہوگی اگر میں یہ کہوں کہ وہ اسوقت بھی کسی بات کا خیال نہیں کرتے، نہیں اسوقت وہ ضرور خیال کرتے ہیں اور صرف دو باتوں کا خیال کرتے ہیں اور وہ یہ کہ اپنی اولاد کو ایسے صیغے میں تعلیم کے واسطے بھیجیں کہ جس میں وقت کم صرف ہو اور جسمیں اُنکی اولاد کامیاب ہو کر واپس آئے معاف کیجئے میں نے لفظ "کامیاب" غلط استعمال کیا۔ بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ جسمیں اُن کی اولاد امتحان پاس کرآئے، یا کم از کم سرٹفکیٹ حاصل کرلائے۔ عام حالت یہی ہے، اِلّا ماشاءاللہ بدقسمتی سے ایسا ایک صیغہ اِن کو قانونی تعلیم کا نظر آتا ہے کہ جس میں وقت بھی کم صرف ہوتا ہے اور ہندوستان میں لوگ اُسکو سہل و آسان بھی سمجھتے ہیں۔ بلکہ ہماری معلومات تو اسقدر بڑھی ہوئی ہیں کہ صرف یہ جانتے ہیں کہ دعوتیں کھلانی پڑتی ہیں اور سرٹفکیٹ ملجاتا ہے۔ (ایک زمانے میں ضرور سُنا جاتا ہے کہ امتحان برائے نام ہوتے تھے۔ مگر اب تو وہ ہی جانتے ہیں، جنکو وہ امتحان پاس کرنا پڑتے ہیں) یعنی اس واقفیت کے مطابق والدین اس ارادے سے اپنی اولاد کو نہیں بھیجتے کہ وہ تعلیم پائیں بلکہ دعوتیں کھلا کر سرٹفکیٹ حاصل کریں۔ طالب علم یونیورسٹیوں میں بھی بھیجے جاتے ہیں، مگر اُن میں کتنے ایسے ہوتے ہیں کہ جنکا مقصد تعلیم سے سوائے قانون پڑھنے کے کچھ اور ہے، اس ارادے اور خیال سے لڑکوں کو انگلستان روانہ کیا جاتا ہے اور پھر اُن کی واپسی پر اُن سے اُمیدیں کیا کیا کیجاتی ہیں؟ اُن تمام اُمیدوں کو تو یہاں بیان کرنے کے یہ معنی ہونگے کہ معلّی کا پورا پرچہ صرف اسی مضمون سے بھر جائے۔ لیکن کم از کم اسقدر اُمیدیں ضرور بیان کرونگا کہ اگر خاندان شاہی کے لوگ نہیں تو جتنے انگلستان کے لارڈ اور ڈیوک ہیں، اُن سے اور اِن سے بڑی بے تکلفی کی ملاقات تھی، جتنے علوم و فنون دُنیا میں اسوقت ہیں (کیونکہ ہم لوگوں کی معلومات کے لحاظ سے دنیا ہندوستان اور انگلستان پرختم ہے)، یا کم سے کم جسقدر علوم و فنون دنیا میں ہیں، وہ سب انگلستان ہی میں ہیں اور کہیں نہیں، سب کو پانی کر دیا ہے، تمام دنیا کے قانون اُن کو حفظ ہیں، ہندوستان میں قدم رکھتے

کی دیر ہے کہ اُنپر توڑے برسنے لگینگے، گویا اللہ میاں چھپر پھاڑ کر اُن پر روپیہ برسائینگے۔ لیکن اگر یہ اُمیدیں پُوری نہوں، تو وہ تمام اعتراضات اور الزامات جو میں نے اس بحث کی سُرخی پر لکھے ہیں، اُس بیچارے پر عائد ہوتے ہیں۔

میں یہاں ایک سوال پھر اُنھیں والدین سے کرنا چاہتا ہوں کہ صاحبو؟ آپکو کیا حق اس امر کے یقین کرنے کا ہے کہ آپکا صاحبزادہ قانون میں یا کسی اور صیغے میں ضرور خاص قابلیت پیدا کریگا۔ آپنے کتنی مرتبہ اُسکی ابتدائی عمر میں اس امر پر غور فرمایا تھا کہ بچے کی طبیعت کو کس خاص صیغے کیطرف مناسبت ہے۔ اور بغیر اس امر کا کوئی ثبوت پائے ہوئے کہ بچے کی طبیعت قانون یا کسی اور صیغے کیطرف متوجہ ہے اور اُس میں اُسکو مذاق ہے، آپ کو کیا حق ایسی اُمید کرنے کا ہے کہ آپکا بچہ اُس خاص صیغے میں اظہار قابلیت کریگا، جبکہ اُسکی طبیعت کو اُس خاص صیغے سے کوئی مناسبت ہی نہو۔

ابھی ایک حال کی مثال ڈاکٹر ضیاءالدین کی پیش کیجاسکتی ہے۔ زمانہ جانتا ہے کہ اُن کو کسقدر ریاضی سے مذاق اور اُن کی طبیعت کو اُس سے مناسبت ہے۔ کیا ہندوستان کا ہر ریاضی کا ایم۔ اے۔ یا ڈی۔ ایس۔ سی وہ امتحان اور جس صورت سے اُنھوں نے اُس کو پاس کیا ہے، پاس کر سکتا ہے۔ یہ اسقدر مشکل امتحان ہے کہ جس میں صرف سینیر رینگلرز کو (جنکا امتحان ہندوستان میں نہایت مشکل اور قابل وقعت خیال کیا جاتا ہے) شامل ہونے کی اجازت ملتی ہے۔ کے ہندوستانی ایسے ہیں کہ جنھوں نے اس امتحان کو پاس کیا ہے اُسکے صوبہ ممالک متحدہ آگرہ و اودھ میں تو کوئی بھی نہیں۔ لیکن کیا اس امر کی اُمید ہوسکتی ہے کہ اگر ڈاکٹر ضیاءالدین کو قانون یا ڈاکٹری پڑھنے کی غرض سے انگلستان بھیجا جاتا تو اُس میں بھی وہ ایسی ہی قابلیت ظاہر کر سکتے؟ ناممکن ہے۔ نہ صرف یہ کہ وہ اُن میں سے کسی میں اپنی قابلیت کا اظہار نکر سکتے بلکہ اُس خاص قابلیت کا جو اُن میں ریاضی کے متعلق تھی، خون ہوجاتا۔

پس جب والدین نہ اپنی اولاد کے شروع زمانۂ تعلیم میں اس امر کا کوئی خاص انتظام کرینگے

کہ اُن کی تعلیم اس طریقے پر کیجائے کہ اُن کو آئندہ اپنی لاگلی تعلیم میں اُس سے مدد ملے اور نہ کبھی اس امر پر غور کرتے ہیں کہ بچے کا مذاق کسطرف ہے اور جسپر توجہ نکرنے سے وہ بچے تک اُس مادے کا جو اُن میں کسی خاص صیغے میں ترقی کرنے کا موجود تھا، خون کر دیتے ہیں، اور ہندوستان کی بے ڈھنگی تعلیم کے بعد اولاد سے اس امر کی اُمید رکھتے ہیں کہ خواہ کسی صیغے کیواسطے انگلستان بھیجے جائیں عام اس سے کہ اُن کی طبیعت کو اُس سے مناسبت ہو یا نہو وہ اُس میں خاص اور غیر معمولی قابلیت پیدا کر کے آئے۔ اگر والدین اپنے بچوں کی حالت پر رحم کھاکر اسقدر تکلیف گوارا فرمایا کریں کہ وہ بچپن سے اِس امر کے سمجھنے کی کوشش کریں کہ بچے کا میلانِ طبع کسطرف ہے اور تعلیم کا انتظام اس صورت سے کریں کہ وہ آئندہ چلکر اُس کے واسطے مفید ہو تو اُمید ہو سکتی ہے کہ اِس قسم کی تمام شکایات رفع ہو جائیں۔

راقم

"م"

# نہرِ لمودری۔

※

موضع پامپور جو سرینگر علاقہ کشمیر سے کچھ تھوڑے فاصلے پر واقع ہے اپنی زعفران کے پیداوار کیوجہ سے تو مشہور تھا ہی۔ لیکن ہمارے مکرم جناب چودھری خوشی محمد خاں صاحب نے نہرِ لمودری پر طبع آزمائی کر کے اس موضع کی شہرت کے لئے ایک اور وجہ پیدا کر دی ہے۔ یہ نہر موضع مذکور کے قریب وادی لدر میں بہتی ہے۔ چودھری صاحب بغرض پڑتال اُس طرف تشریف لیگئے تھے۔ اور اس نہر کو دیکھکر اسقدر متاثر ہوئے کہ ذیل کی نظم دلکش بیساختہ طیار ہو گئی۔

اِس نظم میں جس خوبی کے ساتھ نہر کی روانی اور بہاؤ کی تطبیق شاعر کی طبیعت سے لیگئی ہے وہ محتاجِ بیان نہیں۔ ناظرین حضرت ناظر کے کلام سے بخوبی واقف ہیں۔ لہذا اسکا لکھنا گویا سورج کو چراغ دکھانا ہے۔

| | |
|---|---|
| کیا آب و تاب تجھ میں نہرِ لمودری ہے | پربت کی تو ہے دیبی یا قاف کی پری ہے |

آبِ حیات تو ہی، رُوحِ نبات تو ہے ‌ ‌ ‌ تو جانِ دل کی ٹھنڈک اور آنکھ کی تری ہے
تو کھیلتی ہے بن میں اور لوٹتی چمن میں ‌ ‌ ‌ نسرین و نسترن میں تیری معطّری ہے
گُنار[1] وہ رنگیلی، شالی[2] وہ پیلی پیلی ‌ ‌ ‌ ریحان وہ نیلی نیلی، کیا صنعِ داوری ہے
رخشندہ سنگ پارے، ہیں چاند یا ستارے ‌ ‌ ‌ تیری جو کنکری ہے، الماس سے کھری ہے
لعل و گہر کے معدن، ہیں تیری جیب و دامن ‌ ‌ ‌ اور موتیوں سے ہر دم، جھولی تری بھری ہے
چشمے ترے معطّر، ہیں جامِ جم سے بڑھ کر ‌ ‌ ‌ چیلوں[3] کی فوج سر پر، سدِّ سکندری ہے
برفاب[4] سے لبالب، ہر دم ترا ہے ساغر ‌ ‌ ‌ ساقیِ بزم تیرا، خورشیدِ خاوری ہے
حُسن و جمال تیرا، غنج و دلال تیرا ‌ ‌ ‌ ہر خط و خال تیرا، طغرائے دلبری ہے
ہے تیری دُھن نرالی، کیا دل لُبھانے والی ‌ ‌ ‌ جنگل میں کوئی جوگن، محوِ نواگری ہے

ناظر کی ہیں نظر میں، تیری ادائیں پیاری
کچھ مجھ سے ملتی جلتی، ہے داستاں تمھاری

ہم دونوں جادہ پیما، صبح و مسا رہے ہیں ‌ ‌ ‌ بے راہبر رہے ہیں، بے رہنما رہے ہیں
آفاق گرد دونوں، صحرا نورد دونوں ‌ ‌ ‌ ٹیلوں میں جنگلوں میں، چکر لگا رہے ہیں
اپنی الاپ پر ہیں، ہم دونوں مست و شیدا ‌ ‌ ‌ سر دُھن رہے ہیں خود ہی، اور خود ہی گا رہے ہیں
نے کوئی ہمزباں ہے، نے کوئی رازداں ہے ‌ ‌ ‌ پربت کی چوٹیوں کو، دُکھڑے سنا رہے ہیں
بانگِ جرس ہیں خود ہی، اور خود ہی کارواں ہیں ‌ ‌ ‌ ہم کوچ کا نقارہ، ہر دم بجا رہے ہیں

۱؎ گنار ایک قسم کے چاول کا درخت ہوتا ہے، اس کا پھول گہرے سرخ رنگ کا ہوتا ہے۔ جو سبز لہلہاتے ہوئے کھیتوں میں بہت خوشنما معلوم ہوتا ہے۔ ۲؎ شالی کشمیر میں دھان کے کھیت کو شالی کا کھیت کہتے ہیں۔ ۳؎ چیل بر وزن فیل ایک قسم کا پہاڑی درخت ہوتا ہے، جو پہاڑ کی چوٹیوں پر بکثرت ہوتا ہے۔ ۴؎ اس شعر میں یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ نہر میں پانی برف کا ہوتا ہے، جو برفدار پہاڑ کی چوٹیوں پر سے پگھل کر آتا ہے۔ ۱۲

یہ بیخودی و مستی، وہی ہے اور الستی
ہم گل کے ہم نفس ہیں، بادِ صبا کے ہمدم
اے اہلِ شہر تم سے بالکل ہوئے مکدر
گردن کشوں سے دونوں، ہم کوسوں بھاگتے ہیں
قدرت کے شاہدوں کے، فوٹو اُتارتے ہیں

روزِ ازل کے کیفی، سرخوش سدا رہے ہیں
مُرغانِ خوش نوا کے، ہم ہم نوا رہے ہیں
صحرا نوردیوں میں، ہم با صفا رہے ہیں
جانب فروتنوں کی، خود کھنچے جا رہے ہیں
جو صورتیں ہیں دیکھی سب کو دکھا رہے ہیں

آئینہ وار بر دل، نقش و نگار داریم،
ہم شورہ بُوم داریم، ہم لالہ زار داریم

ہم کو بکو پھرے ہیں، اور جا بجا رہے ہیں
اونچی تھی اپنی بستی، لیکن یہ غولِ ہستی
آفت کا سامنا ہے، یہاں سیدھی راہ چلنا
ہیں گرم رہ نوردی - گو اِس سے بیخبر ہیں
دل جس جگہ لگانا - وہاں لوٹ کر نہ آنا
جو دلکشا نظارے، نظروں سے چھپ چلے ہیں
ہے آب و تاب اپنی، اہلِ جہاں پہ ظاہر
وہ مانے یا نہ مانے، لیکن جبیں کو اپنی
اِک بحرِ بیکراں میں، اپنا نشاں کریں گم
ای ہیچ یم خدا کا تیور پہ بل نہ لانا

تحت الثریٰ رہے ہیں، فوق السما رہے ہیں
سوئے حضیضِ پستی، ہمکو گرا رہے ہیں
مُنہ آ کے پتھروں پر ہم مُنہ کی کھا رہے ہیں
آئے تھے کس طرف سے کس سمت جا رہے ہیں
کیا داغ حسرتوں کے، ہم دل پہ کھا رہے ہیں
حسرت بھری نگاہیں اُن پر اُٹھا رہے ہیں
پر زخمِ اندروں کو سب سے چھپا رہے ہیں
ہم سنگِ در پہ اُسکے ہر دم گھسا رہے ہیں
گرتے اُٹھتے چلتے پڑتے، اس دھن میں جا رہے ہیں
ہم سے کر بل تمھارے، قدموں میں آ رہے ہیں

ناظر ز منزلِ دوست، نام و نشاں ندیم
در شوق راہ پیما، دُنبالِ کاروانیم

# ڈراما پر ایک دقیق نظر

اس نام کا ایک سالہ ہمارے کرم دوست سید محمد حسین صاحب رضوی سابق طالب علم مدرستہ العلوم علیگڈھ حال سیکنڈ ماسٹر دربار ہائی اسکول جھالرا پاٹن نے ہدیتہً ہمارے پاس بھیجا ہے اس رسالے میں مولف نے اول اقسام ڈراما کو بیان کیا ہے۔ پھر ڈراما کی ایک مختصر تاریخ لکھی ہے اور بتایا ہے کہ اول یونان میں اور بعد ازاں یورپ کے بعض دیگر ممالک بالخصوص فرانس و انگلستان میں ڈراما کی کسطرح ابتدا ہوئی اور اُسنے رفتہ رفتہ کسطرح ترقی کی اور ان ممالک میں مشہور ڈراما نویس کون ہوئے اور اُن کی خوبیاں اور نقائص کیا تھے، پھر ہندوستان کے قدیم اور حال کے ڈراما کا ذکر کیا ہے، اور آخر میں ڈراما نویسوں کے لئے کچھ ہدایتیں کی ہیں، زمانہ حال کے اردو شاعروں سے درخواست کی ہے کہ وہ اس فن کی طرف توجہ کریں، یہ ان کے لئے ابھی تقریباً اچھوتا مضمون ہے اور موقعہ ہے کہ کوئی اس فن میں اعلیٰ درجہ حاصل کرکے بقائی دوام حاصل کرے۔ ہمارے دوست نے یہ دعویٰ نہیں کیا ہے کہ ڈراما کے متعلق جو کچھ اُنھوں نے لکھا ہے وہ اُنکا طبعزاد ہے بلکہ زیادہ تر انگریزی مصنفوں سے اقتباس ہے، مگر باینہمہ اس قسم کے مضموں کو، جو غالباً اول ہی مرتبہ اردو کے لباس میں آیا ہے، اس خوبی کے ساتھ لکھدینا اُن کی قابلیت اور زور قلم کی پوری شہادت ہے، اور توقع ہوتی ہے کہ وہ آیندہ اپنی اس قوت خداداد سے کام لیتے رہے تو ایک دن مصنفوں کے معزز گروہ میں جگہ پانے کے مستحق ہونگے۔

یہ رسالہ ۲۰ × ۲۶ تقطیع پر سفید عام پریس آگرہ میں خوشخط چھپا ہے، قیمت کا ہمکو علم نہیں۔

# مسلمانوں کی قوم کی بنیاد مذہب پر ہے

خان بہادر مولوی سید اکبر حسین صاحب سابق جج صوبجات متحدہ آگرہ و اودھ کے نام نامی سے پبلک بخوبی واقف ہے، اُن کی معرفی کرنا سورج کو چراغ دکھانا ہے۔ اُن کی ذہانت

اور ظرافت کے نمونے ابتدا میں اودھ پنچ میں بہت شائع ہوئے۔ بعد ازاں بلنٹ صاحب کی کتاب کے ترجمے کے ذریعے سے وہ پبلک میں آئے، اسکے علاوہ اُن کی عمدہ نظمیں ہمیشہ خصوصیت کے ساتھ دلپسند رہی ہیں۔ سرکاری ملازمت میں جس قابلیت سے کہ اُنھوں نے کام کیا، اور جو عزت کہ اُنکو حاصل ہوئی، محتاجِ بیان نہیں۔ صاحب موصوف اُن لوگوں میں سے ہیں کہ جنکی وجہ سے خود اُس صیغے کو عزت تھی، کہ جسمیں اُنھوں نے کام کیا۔ اُن کے ہر کام میں اعتدال ہے۔ اُنھوں نے خُذْ مَا صَفَا وَدَعْ مَا کَدَرَ پر عمل کیا ہے۔ اُن میں نئی روشنی نے اثر کیا ہے مگر نہ اتنا کہ جادۂ اعتدال سے گذر جائیں، اُن کی بہت سی نظمیں حال میں دوسرے رسالوں میں شائع ہوئی ہیں مگر علی گڈھ منتھلی کو یہ عزت حاصل ہونے کا پہلا موقعہ ہے، ہمکو توقع ہے کہ ہمارے مکرم ایسی ہی عنایت وقتاً فوقتاً کرتے رہینگے۔ اِس نظم میں وہ فرماتے ہیں کہ مسلمان مختلف ملکوں میں آباد ہیں۔ اکثر جگہ وہ دوسری قوموں کے ساتھ رہتے ہیں اور مختلف زبانیں بولتے ہیں، اُن کے رنگ، روپ، رسم و رواج اور طور طریقوں میں بھی اختلاف ہے، صرف مذہب ہی ایک چیز ہے، جو اُن سب میں مشترک ہے، اور اُن کو دوسری قوموں سے ممیز کرتا ہے، اگر مذہب کا شیرازہ ڈھیلا ہوگیا، تو مسلمانوں کے اجزا متفرق اور پریشان ہوجائینگے اور قومی امتیاز باقی نہ رہیگا یہ سچ ہے کہ عملاً ہر شخص مذہبی نہیں ہوتا، لیکن ترکِ عمل اور بات ہے اور انکار و شکستِ مذہب دوسری شی ہے لہذا جو شخص مذہب کو بے پروائی سے شکست کریگا وہ قوم کو توڑیگا۔ اگرچہ اسوقت ضرر محسوس نہو۔ لیکن اِس روش اور میلانِ طبع کا ضروری نتیجہ یہ ہوگا کہ قوم پر ایکدن وہ آئیگا کہ اُس کو ذاتی بیعزتی کی حس نہ رہیگی۔ جو ہونا ہے وہ رُکتا نہیں۔ لیکن دل نہیں مانتا، اور حرف خیر قلم سے ٹپک ہی پڑتا ہے۔

پیرو مرشد نے کیا قوم میں بچپن پیدا
وہ سمجھتے تھے کہ ہوجائیگا جوبن پیدا

وہ تو پیدا نہوا ہاتھ سے لڑکوں کے مگر
ہو چلے دین کی دیوار میں روزن پیدا

پستیِ قوم کے سبب آ گئے دن اے اکبر
اونچے درجے نہیں ہوتے عقل کے دشمن پیدا

دین کیا چیز ہے شیرازۂ قومی سے ہے فقط
جس سے مِلّت کی ہے اک صورتِ احسن پیدا

آج ہوتا نہیں اسکا ضرر اُن کو محسوس
ہو رہے ہیں ابھی کچھ لالہ و سوسن پیدا

بالیقین آئیگا اس باغ میں ایسا اک وقت
کہ چلینگی روِشیں نشتر و سوزن پیدا

صورتِ برگِ خزاں دیدہ بکھر جائینگے اوڑتے
نہ بہار آئیگی پھر ہوگا نہ گلشن پیدا

باپ کے خون سے ہوگی جو حمیت زائل
ہونگے اطفال بھی بےغیرت و کودن پیدا

کاہ کیطرح سے اُڑ جائینگے دینی اعمال
اختلافات کے ہو جائینگے خرمن پیدا

ظلمتِ جہل سے گھر جائینگے دل کے اطراف
سینوں میں ہو نہ سکینگے دلِ روشن پیدا

کون کہتا ہے کہ انگلش کا نہ ہو دل سے مطیع
کون کہتا ہے نہ کر الفت و لسن پیدا

کون کہتا ہے تکلف سے نہ کر زیست بسر
کون کہتا ہے نہ کر وضع میں جوبن پیدا

کون کہتا ہے کہ تو علم نہ پڑھ رزق نہ ڈھونڈھ
کون کہتا ہے نہ کر حسرتِ لندن پیدا

بس یہ کہتا ہوں کہ مِلّت کے معانی کو نہ بھول
راہِ قومی کا نہ ہو خود ہی تو رہزن پیدا

قوم قوم آٹھ پہر سنتے ہیں ہم قوم کہاں
تار باقی نہیں تو کرتا ہے دامن پیدا

کچھ گھروندا نہیں نشین کہ بنالیں لڑکے
فطرتی طور پہ خود ہوتی ہے نشیمن پیدا

مذہبی شاخ فقط ہے تری قومی ہستی
وہ جو ٹوٹی تو نہیں کوئی نشیمن پیدا

سلف رسکپٹ کا پھر یاد رہیگا نہ سبق
پھر نہیں ہونے کی یہ بحث لو و من پیدا

بزمِ تہذیب سے ہو جائینگے قطعاً خارج
حس ہی باقی نہ رہیگا کہ ہو شیون پیدا

# رسالۂ تمدن

اِس ماہواری رسالہ کے چار نمبر اسوقت تک ہماری نظر سے گذرے، پہلا نمبر مشق اوّل تھا اسلئے اُسپر بہت کچھ لوگوں نے نکتہ چینی کی، باقی تینوں نمبر عمدہ ہیں، اور کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ انکا ہر ایک مضمون کسی نہ کسی لحاظ سے عورتوں کے لئے مفید نہیں ہے

صرف بحث طلب مسئلہ یہ ہے کہ آیا ہماری عورتوں میں اسقدر قابلیت بھی ہے کہ وہ ان مضامین کو پڑھ کر مستفید ہوں۔ اسکے متعلق ہماری رای ہے کہ ابھی رسالے کے مضامین ہماری عورتوں کے عام سطح قابلیت سے بالا ہیں، مگر پہلے نمبر کے مقابلے میں دوسرے نمبروں میں کوشش کیگئی ہے کہ وہ اسکے ساتھ شکر ملائی جائے، اور مضامین کو دلچسپ اور عام فہم بنایا جائے۔ ہمکو توقع ہے کہ آیندہ بھی یہ کوشش جاری رہیگی، ہمکو اس بات سے اتفاق نہیں کہ رسالہ تہذیب نسواں کے ہوتے ہوئے خاتون کی ضرورت نہ تھی، اور ایک قسم کے متعدد رسالوں کا ہونا قوتوں کو متفرق کرنا اور روپیہ اور وقت کا ضائع کرنا ہے۔ ہمارے نزدیک جیسا کہ ہر انسان کے جدا جدا خط و خال ہیں اسیطرح ہر رسالے کی اسکے چلانے والوں کے مذاق کے موافق کچھ نہ کچھ جدا خصوصیتیں ہوتی ہیں اور وہ ان خصوصیتوں کے پسند کرنیوالے خریدار پیدا کرلیتا ہے، علاوہ ازیں خریداروں اور مضمون نگاروں کے پیدا کرنے میں کارکنان رسالے کے ذاتی اثر کو بھی دخل ہوتا ہے اس لحاظ سے نئے رسالے کے جاری ہونے سے یہ نہیں لازم آتا کہ پرانے رسالے کے خریدار اور مضمون نگار گھٹ جائینگے، بلکہ مضمون بین اور مضمون نویس دونوں کی تعداد میں اضافہ ہوجاتا ہے، یہ ممکن نہ تھا کہ جو تعداد خریداروں کی خاتون نے پیدا کرلی ہے بقدر اسکے اس رسالے کے جاری ہونے کی صورت میں تہذیب نسواں کے خریداروں میں اضافہ ہوتا، یا جو لوگ اڈیٹر خاتون کے تقاضے سے اس رسالے میں مضمون لکھتے ہیں، وہ ضرور تہذیب نسواں میں مضمون لکھتے۔ تہذیب نسواں اپنی طرح کا ایک عمدہ رسالہ ہے اور جسوقت کہ وہ جاری ہوا تھا اُسوقت اُسی قسم کا رسالہ کافی تھا، مگر ہم سمجھتے ہیں کہ اب اُس سے ایک سیڑھی اوپر چڑھنا چاہیئے اس ملک میں کچھ کروڑ مسلمان آباد ہیں، اُن میں لڑکیوں کو چھوڑ کر غالباً ایک کروڑ ایسی عورتیں ضرور ہونگی، جو سن شعور کو پہونچ چکی ہیں۔ مانا کہ زیادہ تر ان میں جاہل محض اور کچھ فقط شُد بُد رکھتی ہیں مگر پھر بھی اس تعداد کثیر میں کیا تین چار سو بھی ایسی بیبیاں نہ نکلینگی جنکی قابلیت تہذیب نسواں کی معیار سے زیادہ ہے، پس ان ہی خواتین کے لئے رسالہ خاتون جاری

کیا گیا ہی، اور اگر اسقدر تعداد خریداروں کی وہ بہم پہنچالے تو سمجھنا چاہیئے کہ کامیاب ہے۔ علاوہ ازیں صیغۂ تعلیم نسواں کو جو محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی ایک شاخ ہے اسیطرح ایک آرگن کی ضرورت تھی اور چونکہ اُسکا صدر مقام علی گڈھ ہے، اسلئے اس رسالے کا علیگڈھ ہی سے نکلنا مناسب تھا۔ مگر سب سے بڑی مشکل جو ہمارے ہر ایک کام میں پیش آتی ہی وہ یہ ہی کہ اُسکے چلانیکا کوئی مستقل بندوبست نہیں ہوتا۔ ہر ایک کام کسی خاص شخص کی ذات سے وابستہ ہوتا ہے اور جبتک وہ شخص ہی وہ کام کچھ چلتا ہی، اُس کے بعد وہ خراب ہوجاتا ہی، ہمارے ملک کے کل اخبار اور رسالے اسوقت تک اسی طور پر چل رہے ہیں اور بہت سے اخبار اور رسالے اسی طرح پر جاری ہوئے اور اپنی چند روزہ زندگی کے بعد پردۂ عدم میں چھپ گئے۔ یہی اندیشہ بلکہ اس سے کچھ زیادہ ہمکو رسالۂ خاتون کی نسبت ہے۔ یہ رسالہ زیر اڈیٹری شیخ عبد اللہ صاحب بی۔ اے۔ ایل ایل بی۔ سکرٹری تعلیم نسواں نکلا ہی۔ شیخ صاحب کو اپنے پیشے کے کاموں سے فرصت نہیں، اسلئے اُسکے چلانیکا زیادہ تر بار اُن اعیان پر ہی، جو کالج میں عارضی طور سے مقیم ہیں اور چونکہ ایسی لوگوں پر بھروسہ نہیں ہوسکتا کہ وہ کبتک کالج میں ہیں اور کسوقت اُنکو عمدہ سرکاری ملازمت ملنے یا دنیا کا کوئی دوسرا کام شروع کرنے پر کالج کو چھوڑنا پڑیگا اسلئے اس رسالے کی بقا کے متعلق ہمکو بہت اندیشہ ہے اور اگر مان لیا جائے کہ کالج میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں، وہ ہر سال نئے پرزے ڈھالتا رہتا ہی، جو پُرانوں کی جگہ لے سکتے ہیں پھر بھی اس قسم کے رسالے کیلئے ایسی گھر بدلیاں مفید نہیں ہو سکتیں وہ مثل کالج میگزین کے گھسٹتا ہوا چل سکتا ہی، دوڑ نہیں سکتا۔ اسی وجہ سے ہمنے اول اُسکو نوجوانوں کا فوری جوش سمجھکر سکوت اختیار کیا تھا، اور خیال کیا تھا کہ یہ اُبال جلد دب جائیگا مگر اب چونکہ اُس جوش کو قیام معلوم ہوتا ہی اور رسالے کے چار نمبر نکل چکے ہیں اور ہر نمبر پہلے سے بڑھ چڑھ کر ہے اسلئے ہم اپنے نوجوان دوستوں کی دل بڑھانیکو طیار ہیں۔ خدا اُنکی ارادوں میں استقلال اور ہمتوں میں برکت دی۔ اور رسالۂ خاتون دن دونی رات چوگنی ترقی کری۔ رسالے کے متعلق صرف اسقدر مشورہ دینا کافی ہی کہ حتی المقدور سلیس طور پر مفید مضامین کو بیان کیا جائے۔ زیادہ تر ایسے مضامین ہوں جو عورتوں کو اُنکی روزمرہ زندگی میں مفید ہوں اور ہر مہینے میں صرف ایک مضمون اس قسم کا کافی ہی کہ جس سے خواتین کی علمی معلومات میں ترقی ہو اور اُس مضمون میں بہت سی معلومات کو بھرا نہ جائے بلکہ صرف ایک دو باتوں کو دلچسپ طور سے پھیلا کر بیان کرنا مناسب ہے۔ ہمکو خوشی ہے کہ ہمارے دوست تقریباً اسی اصول پر کاربند ہیں۔ رسالہ ۲۰ × ۲۶ تقطیع کے سفید ولایتی کاغذ پر عمدہ چھپتا ہی، اور قیمت مبلغ تین روپیہ سالانہ ہے۔

# توسیع یونین کلب

باوجود ہماری مادر ہائیوں کے اس فنڈ کی طرف ہمارے اولڈ بوائز کی بے توجہی رہی اس مہینہ میں مولوی حبیب اللہ خانصاحب بی۔اے تحصیلدار ہاتھرس ضلع علی گڈہ نے اپنے موعودہ چندہ مبلغ عمـــہ روپیہ میں سے جو انھوں نے باقساط ادا کرنیکا وعدہ کیا تھا مبلغ عہ روپیہ اور میر ولایت حسین صاحب اکثر مدرستہ العلوم علیگڈہ نے مبلغ عہ عنایت کیئے۔ مولوی حبیب اللہ خاں صاحب ہمارے کالج کے ان برگزیدہ طلبا میں سے ہیں جنپر کالج بجا طور پر فخر کرسکتا ہی انکی پبلک اور پرائیویٹ زندگی کالج کے طلبا کے لئے نہایت عمدہ نمونہ ہی اور اگر کالج عموماً اسی قسم کے طلبا طیار کرتا رہے تو مسلمانوں کو کسی قسم کی شکایت کا موقع نہیں ہوسکتا ہی۔ وہ حق اللہ اور حق العباد دونوں کو عمدگی سے ادا کرتے ہیں ارکان مذہبی کے پورے پابند ہیں عزیزوں دوستوں اور کالج کی مدد کو ہر وقت طیار رہتے ہیں اپنے عہدہ کے کام کو اس خوبی سے ادا کرتے ہیں کہ مسٹر برانڈرک جیسے کلکٹر نے انکے متعلق لکھا کہ حبیب اللہ خاں سے بہتر تحصیلدار مینے آجتک نہیں دیکھا اور کلکٹر انکی مدد کے بغیر ہاتھرس میں کچھ نہیں کرسکتا ہی ہمارا جی چاہتا ہی کہ اپنے مکرم دوست کی خوبیوں کو دوسروں کی تشویق کے لئے پورے طور سے لکھیں مگر بدقسمتی سے منتھلی کی اشاعت میں بہت دیر ہوگئی ہی اور صرف دو صفحہ کی گنجایش ہی جس میں اور کئی باب میں ہمکو لکھنا ہی۔ ہم چاہتے ہیں کہ اگر ہمکو طلبا کالج کے واقعات زندگی معلوم ہوتے رہیں تو ہم ہر مہینہ ان میں سے دو ایک کے حالات دوسروں کی تخریص و ترغیب کے لئے لکھا کریں

# محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس

جیسا کہ پیشتر اطلاع دیجاچکی ہی کانفرنس کا آیندہ اجلاس ماہ دسمبر کی آخری تاریخوں میں بمقام لکھنؤ ہوگا اور اجلاس کے پریسیڈنٹ اس سال مسٹر ماریسن پرنسپل کالج علی گڈہ تجویز ہوئے ہیں۔ مسٹر ماریسن کو علاوہ اپنے علم و فضل کے مسلمانوں کی تعلیم سے گذشتہ پندرہ سال سے بڑا تعلق رہا ہی۔ انہوں نے اپنے تئیں ہمارے اغراض و مقاصد سے بالکل متحد کردیا تھا اور ہماری ہر قسم کی بہبودی کے لئے وہ ہمیشہ ساعی تھے اسلئے انکی رائیں ہمارے تعلیمی مسئلوں پر نہایت قابل قدر ہونگی اور انکی پریسیڈنٹی ہر پہلو سے نہایت مفید ثابت ہوگی۔ علاوہ ازیں چونکہ مسٹر ماریسن ابتدائے مارچ آیندہ میں ہم سے جدا ہونیوالے ہیں اور انکی خواہش ہی کہ اس موقعہ پر وہ اپنے مسلمان دوستوں سے جنکی

خدمت میں اُنہوں نے اپنی عمر کا بہترین حصّہ صرف کیا ہو آخری ملاقات کریں ان وجوہات سے ہمکو اُمید ہو کہ ہر حصّہ ملک سے جوق جوق مسلمان تشریف لائینگے اور اس سال کا اجلاس ہر لحاظ سے نہایت شاندار ہوگا

## مسٹر ماریسن پرنسپل محمڈن کالج علیگڈھ کی یادگار

مسٹر ماریسن کے جسقدر احسانات کہ کالج اور طلبا کالج پر ہیں وہ محتاج بیان نہیں ہیں علاوہ کالج کے کاموں کو نہایت جانفشانی سے کرنے کے انہوں نے مسلمانوں کے ہر کام کو مثل اپنے کام کے سمجھا اور اُنکی ہر قسم کی امداد کو خواہ وہ اُنکے فرض منصبی میں شامل ہو یا نہو اپنا ذاتی فرض گردانا۔ علاوہ اُن ترقیوں کے جو کالج نے مسٹر ماریسن کے عہد میں کیں اُنہوں نے ملازمت ایجنسی قائم کر کے جسقدر عہدہ کہ اپنی سفارش سے طلبا کالج کو دلائے اُس کی نظیر مسٹر بیک مرحوم کے عہد میں بھی نہ ملیگی اس بنا پر صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب و بعض دیگر طلبا کالج کا خیال ہو کہ اُنکی یادگار میں ایک نقرئی تمغہ جسکا کنارہ طلائی ہو قائم کیا جاے جو ہر سال کالج کے اُس طالب علم کو دیا جائے جو امتحان بی۔ اے میں پولیٹیکل اکانمی میں سب سے زیادہ نمبر حاصل کرے۔ اس قسم کے تمغہ کے لیئے مبلغ ایکہزار روپیہ درکار ہو۔ مگر جو بے توجہی کہ اولڈ بوائز نے توسیع یونین کلب کی امداد میں کی ہو اُس سے تو نہایت مایوسی ہوتی ہو کہ کوئی تحریک اولڈ بوائز کی مدد سے انجام کو پہونچیگی۔

## علیگڈھ منتھلی میں انعامی مضامین

ماہ گذشتہ کے مضامین میں مولوی دیانت حسین صاحب سابق ڈپٹی انسپکٹر مدارس صوبہ بہار کا مضمون حروف تہجی کی باب میں قابل نذرانہ سمجھا گیا۔

## مخزن صرف چھ آنے میں

گو یہ ہندوستان کا مشہور علمی ادبی رسالہ ملک کے تمام دیگر ماہوار رسالوں سے زیادہ چھپتا ہو تاہم ابھی بہت سے لوگ اسکے دیکھنے سے محروم ہیں۔ **اسیلئے**۔ ہم نمونہ کے طور پر صرف تین مہینے کے لیئے مخزن کو بجاے ۱۲ کے ۶ میں دینگے۔ اس عارضی خسارہ کی وجہ یہ ہو کہ یہ مخزن ہم ہر ایک باذوق شخص کے ہات تک پہنچا دینا چاہتے ہیں۔ کیونکہ ہمیں یقین ہو کہ جو شخص مخزن کو ایک دفعہ دیکھ لے وہ ضرور اسکا مستقل خریدار بنجائیگا۔ اسیلئے جو صاحب اس **غیر معمولی رعایت** سے فائدہ اُٹھانا چاہتے ہیں۔ نومبر اور ۳۱ دسمبر ۱۹۱۰ء تک **مینیجر مخزن لاہور** کے پتہ سے پہلا پرچہ ویلیو پی ایبل طلب فرمائیں۔

سردست صرف ایکہزار نئے خریداروں کی درخواستیں قبول کیجائینگی۔ اسیلئے جو صاحب فوراً درخواست نہ بھیجینگے ممکن ہو کہ وہ اس رعایت سے فائدہ نہ اُٹھاسکیں۔

## ممیرہ اور سچے موتیوں کا سفید سرمہ

مصدقہ جناب نامی گرامی ڈاکٹر ڈبلیو آر کرائیپر صاحب بہادر۔ ایف۔ سی۔ ایس۔ اے۔ آر۔ ایس۔ ایم

## فیلو آف دی انسٹیٹیوٹ آف کمسٹری لندن

معزز ڈاکٹروں اسسٹنٹ سرجن ہسپتال اسسٹنٹ و نوابوں و راجاؤں کے خلیمور، و گورنمنٹ کے اعلیٰ ترین عہدہ داروں وانگریزی گریجوایٹوں و تعلقہ داروں یورپین معزز انگریزوں کے سارٹیفکیٹ بکثرت موجود ہیں جنکو ہم بوقت فرمائش بھیجینگے

ہم نے اصلی اور عمدہ ممیرہ بڑی تلاش سے ہندوستان کے باہر سے منگوایا ہے

## ہمارے سرمہ کا امتحان اور اُس میں جلد کامیابی

نگاہ ناپ کر ہمارا سرمہ لگائیے، دو ہفتے میں روشنی آنکھ کی بہت بڑھ جائیگی۔ اور آنکھ کے جملہ نقص دور ہو جائینگے، (۲) عینک چھوٹ جائیگی (۳) دھند۔ ڈھلکہ۔ آنسو بہنا۔ سرخی۔ سوزش۔ کھجلی۔ آنکھ کے سامنے کا اندھیرا۔ پلکوں کے اندر کے دانے و سرخی۔ گوہانجنی (۱۲) لکھنے پڑھنے سے آنکھوں کا تکان (۱۳) درد بہت جلد شرطیہ رفع کرتا ہے (۱۴) کمزور نگاہ میں سوئی میں تاگا چھوڑ لیجئے۔ (۱۵) پروال۔ سبل۔ جالا۔ پھلی۔ ابتدائی موتیہ بند۔ ناخونہ۔ ککرے (۲۲) آنکھوں میں سرخ ڈورے پڑ جانیکو (۲۳) پلکیں گر جانے والی بیماری کو مفید ہے (۲۴) کمزور آنکھ کو قوت دیتا ہے (۲۵) آنکھوں کا میل اور مواد صاف کرتا ہے۔ آنکھ کو جملہ امراض سے محفوظ رکھتا ہے۔ **قیمت فی تولہ تین (۳) روپیہ** (محصول ۴ر)

**المشتہر۔ رام سرن نگم۔ کانپور۔ نیا چوک۔** اپنا نام و پتہ و نام ڈاک خانہ خوشخط لکھو۔

## ذیل میں چند نام نامی اُن اصحاب کے لکھے جاتے ہیں کہ جنکے سارٹیفکٹ حال میں آئے ہیں

(۱) جناب ڈاکٹر۔ ای۔ وائی۔ روڈر صاحب بہادر۔ آر۔ ڈی۔ ایم۔ پی۔ ایل۔ مقام لندن

(۲) جناب ڈاکٹر۔ ایچ۔ پی۔ صاحب بنرجی ایل۔ ایم۔ ایس۔ اینڈ سرجن کلکتہ

(۳) ڈاکٹر جوگیندر ناتھ صاحب باسو۔ ایل۔ ایم۔ ایس۔ کانپور

(۴) ڈاکٹر۔ پی۔ این صاحب بنرجی۔ ایل۔ ایم۔ ایس۔ اسسٹنٹ سرجن میرٹھ

(۵) ڈاکٹر مکندلال صاحب اسپتال اسسٹنٹ نواب گنج

(۶) ڈاکٹر الہ یار خاں صاحب۔ ایس۔ جی۔ سی۔ ہسپتال اسسٹنٹ مقام نگینہ

(۷) ڈاکٹر عبد الصمد خانصاحب اسپتال اسسٹنٹ مقام کھرایاں

(۸) جناب مولوی سید حامد حسین صاحب منصف درجہ اول ضلع ہمیرپور

(۹) جناب منشی محمد نثار علی خاں صاحب تحصیلدار مقام بانسی ضلع بستی

(۱۰) جناب نواب محمد واحد علی خانصاحب رئیس و ممبر میونسپل بورڈ کانپور

(۱۱) جناب بابو مہن بہاری صاحب جی۔ ایم اے۔ ایل ایل بی۔ ڈسٹرکٹ و سشن جج گونڈا

(۱۲) جناب بابو نیل وحب لے صاحب بی۔ اے۔ بی۔ ایل۔ جج خفیفہ بہادر کانپور

(۱۳) جناب مسٹر شب شنکرلال صاحب سٹی مجسٹریٹ بہادر مقام منڈلیر۔

(۱۴) جناب منشی دھنپت لال صاحب ڈپٹی کلکٹر بہادر ضلع بستی۔

(۱۵) جناب پنڈت منبی دھر صاحب تحصیلدار باندا

(۱۶) جناب مسٹر بی باگ صاحب بہادر انجنیر بلوی

*Haider.*—(*at the same time*). John Carling is the author of the novel—

*Hameed.*—(*also at the same time*). The Kathiawar Deputation has scored a big success.

*Hasan.*—Let bygones be bygones Let the past bury its dead. It was a mere trifle That ugly mango

*Sadiq.*—Bother the mango! Why don't you discuss the war with me ?

*Haider.*—Bother the war! Why don't you discuss literature with me.

*Hameed.*—Bother literature! Why don't you discuss the the Duty Deputations with me ?

*Hasan.*—Bother reconciliation, since you won't be reconciled!

*Sadiq.*—Don't you think peace is in sight ?

*Hasan.*—No. I don't The Russians——

*Haider.*—When are you going to read the "Shadow of the Czar" ?

*Hasan.*—It is a sensational novel. I don't care——

*Hameed.*—What do you think of the Deputations ?

*Hasan.*—The whole credit is due to——

*Sadiq.*—Why don't you answer *my* question ? I won't see your face again.

(Leaves the room.)

*Hameed.*—Why don't you answer *my* question ? I won't come here again.

(Leaves the room.)

*Haider.*—Hasan, why don't you answer *my* question ? I am not a fool, so I won't leave your room For I am awfully hungry. A dish of sweetmeat, quick!

ZARIF

## My Friends—II.

I.

*Hasan.*—I'm blessed with a host of friends; but I don't like them very much. They are a constant source of worry and trouble. What a nuisance! They keep quarrelling like cats and dogs, and over mere trifles To think that Haider Ali and Sadiq fell out the other day over an ugly piece of a mango! Haider contrived to have the whole of the mango to himself, while Sadiq called him a hungry, miserable pauper, a greedy vulture. Haider could not contain himself for anger and by way of revenge squeezed the mango over his silly head Meanwhile Hameed put in an appearance, burst into a fit of laughter, called them silly asses and made himself the enemy of both. I must endeavour to have them reconciled; but I am afraid they won't listen—they are so stiff-necked Let me see.

II.

*(Chance brings Haider Ali, Sadiq, and Hameed into Hasan's room almost simultaneously.)*

*Hasan (highly gratified).* Friends forgive one another. Forget everything about the unpleasant quarrel. Make it up The accursed mango——

*Sadiq*—Bother the mango and our silly quarrel! Have'nt you read the war news to-day? There has been fought in Manchuria one of the most bloody battles in the world's history. The Russians have sustained a crushing defeat and the carnage is awful, hideous!

*Hasan.*—Let us hope that the war is nearing its end But you must shake hands——

*Haider.*—Hasan, I have gone through the "Shadow of the Czar." It is a sensational novel full of exciting episodes.

*Hasan.*—We will discuss literature afterwards. First of all you must shake hands. You must be reconciled.

*Hameed.*—Hasan, do you know this is a record year for the Duty? Thirty-thousand Rupees have been collected and——

*Hasan.*—Yes I know. But I must have you reconciled. Let bygones——

*Sadiq.*—Kuropatkin highly extols the bravery of the Japanese.

English-hearted in spite of the use of foreign names of men and places; and frequently there is a direct reference to some well known contemporary event, laughing out an English jest from beneath the thin disguise of a foreign scene.

But why these foreign names at all ? Shakespeare taking his stories from foreign sources and using Italian names has disguised himself more to us than he did to his contemporaries. To them it was only a device of the times, a device of the writing of poetry and romance to which the English people had been long accustomed. The Elizabethan playgoer saw, well enough, the actual beneath the fictitious, and cared little whether the actor called himself Claudio or William Henry, though the high sounding foreign name would help to transport him more easily into the regions of romance That it was only a poet's convention is clearly seen from the work of Ben Johson, who wrote a play called "Every Man in his Humour," first printed in 1601 The scene is laid in Florence, the names are Lorenzo, Prospero Bianca and others of the regular stock type. In 1616 the same play was republished, and the names appear as "Wellbred" "Old Knowwell," "Stephen," and "Mrs. Bridget," and the scene is "London;" but the play, except for these changes, is word for word the same as in the 1601 edition. This proves that the poet wrote an essentially English play with the name of his characters, Italian in accordance with the fashion then prevailing, and in the second place it is evident that early in James' I reign this fashion was changing Shakespeare's work shows this change too, in fact he marks a transition period mingling the two fashions and employing in the same play characters with foreign names and title, and English names for such personages as Dogberry, Christopher Sly, Sir Toby Belch and many others generally of the lighter-comedy type He binds himself by no hard and fast rule: Gratiano in the "Merchant" is as truly English, in his line, as old Shallow in his. The poet presented "the very age and body of the time," and in spite of the romantic Italian names, each play was English, essentially, and the scenery was contemporary life and manners, so that a knowledge of London and Elizabethan England was all the theatrical equipment that Shakespeare's audience required. We, therefore, in this later age, if we would read aright, must be furnished with something of that knowledge also, and every aspiring student must learn to fit Shakespeare into that period of which he was the very heart, and must endeavour to gain some correct ideas of the England and the London that he loved.

J. R. C.

A lily of a day,
Is fairer far, in May,
Although it fall and die that night;
It was the plant and flower of light
In small proportions we just beauties see;
And in short measures, life may perfect be.

(BEN JONSON.)

---

## SHAKESPEARE'S LONDON

### II.

As to the structure of the Elizabethan Theatre, it was six or eight-sided, with high walls enclosing rather a narrow space, presenting the appearance of a somewhat stunted tower. Inside, the seats were ranged along the walls, the stage was in the centre, and below were the places of the "groundlings" who paid a fee of two pence for standing-room. There was no theatrical scenery The spectators had to imagine the surroundings of the dramas they saw, and had nothing more to guide them than a notice board which told them, "Venice, a public street," 'the Forum in Rome" "the Castle, Elsinore" or "the harbour, Messina." It was all much the same to them, for they brought the scenery with them, adding perhaps now and again a touch from their own imaginations But Venice and Messina, Rome and Denmark were all simply London, the London they knew, and the fanciful foreign names merely the dressing of the story. How different from our own times, when for a few weeks each year, at one or two London theatres a drama of Shakespeare is decked out to please a sensational and spectacle-loving public, in all the scenic trappings that modern mechanism can devise. Our Elizazebethan playgoer had actually before him only that notice board, but ready to his mind's eye were the various pictures of his own London life which he brought up so easily, because they were real and over present, to suit the words that the cunning play-wright had pieced together For the harbour at Messina he saw the Thames water-way with its busy shipping. For St.Mark's there was the crowning tower of St. Paul's. The Royal Exchange, so well-known to all citizens, was the Rialto; for the foreign castle and prison, what could be better than the Tower of London? And as for country scenes, there were harvest fields and pastures within easy walk, there was the moorland of Hampstead and the forest of neighbouring Epping as full of romantic wonder as Orlandos Arden. The more one studies Shakespeare, the more one finds him intensely

Last cold weather at Benares I sketched a scheme for the advanced study of Sanskrit at the Benares College. The scheme was drawn up after much consultation with those who seemed best qualified to advise, and I asked for suggestions and co-operation, I regret that I have as yet received no definite proposals. Meanwhile the College at Aligarh has cordially adopted a similar scheme for advanced studies in Arabic, and I have recommended the appointment of a European Professor and of an Indian Assistant Professor in Arabic. When this has been sanctioned the question of creating studentships in Arabic will be considered.

In a short time the senate of the University will have been finally reconstituted, and will enter on its new duties. Its resources will, I trust, be augmented. The common aim of the University and of the Government is the good of the rising generation, and past experience justifies the anticipation of harmonious working in the future. Among the members of the senate there must needs be differences of opinion, but if we start from existing conditions, form a clear idea of what we want, and never impute bad motives to those who differ from us, differences of opinion will be adjusted without difficulty. In regulating and improving collegiate education, and in making any further advance, the University will I doubt not continue to enjoy the confidence of sober and practical men of all classes of the community.

Our interest in the young men and women who have to-day been admitted to degrees will not cease with the present Convocation. It will be a pleasure to meet them in future years and to hear of the success in life which each has achieved and deserved. I doubt not that all have taken to heart the charge of the Vice-Chancellor that throughout their lives they strive to prove themselves good and worthy.

The Vice-Chancellor then declared Convocation closed. Mrs Knox was subsequently "At Home" in the College grounds, which were tastefully illuminated, and the band of the 1st Brahmans played a selection of music.

---

## Fragments—V

### The True Measure of Life.

It is not growing like a tree
In bulk doth make men better be ;
Or standing long an oak, three hundred year,
To fall a log at last, dry, bald and sear :

In Benares College an useful addition has been made to the playing fields, and the thoughtful liberality of Lord Curzon has enabled me to make grants this year of Rs 8,000 and Rs. 3,000 respectively for the libraries at Allahabad and Benares Other applications from Colleges that are anxious to make improvements will be considered on their merits with due regard to the financial position and to the advice of the University senate.

So far I have dwelt on Colleges, for the prosperity of the University is bound up in their prosperity The University motto is "Quot rami tot arbores," every branch is a tree. The affiliated colleges are not dry branches stuck in the ground, each is a growing tree with a life of its own, a tree, it I may say so, under whose shade there is a healthy habitation and the fruit of which is wholesome. But over and above the training in Colleges up to the Bachelor degree, which I look on as the culmination of a general education, there is a prevailing desire that something should be done for research, and that post-graduate study should receive encouragement as the nucleus of higher studies in connection with the idea of a teaching University. I pass over for the present the development of the Law school and the question of establishing a Medical College. I am still of the opinion which I expressed last year that the best way to begin is to create studentships on Rs 100 a month, tenable for three years, and it is the intention of Government to create such studentships and to allot them in the first instance to graduates pursuing advanced course of science, either Chemistry or Physics, at the Muir College. Much has been done to improve laboratories and scientific equipment at this Government College, and Government is ready to do what more is necessary. The students would be called on to help in the supervision of boarding houses and such other academical work as the Principal may allot to them. I believe that the advanced study of science is that which is most likely to benefit the country, and I have already expressed approval of a proposal to appoint an Assistant Professor in both Chemistry and Physics at the Muir College. But I do not forget that the Province has a great history in the past. Not only was it the centre of the Mughal empire, and the adopted home of Persian and Arabic learning, but in earlier days it was the site of the kingdoms of Hastinapur, Ajuddhia, Kannauj and Kasi. To it belong the stories of the Mahabharat and of the Ramayan: the history of Gautama Buddha and of the Gupta Kings. It is in this Province above all others that provision should be made for the advanced study of both Sanskrit and Arabic.

ment has been increased by a lakh. The Nawab of Rampur has given free of charge an admirable site, the Government has promised help towards building the College and boarding houses, help which will certainly not be less than Rs. 30,000.

I hope that the people of Meerut will follow the example of the people of Rohilkhund The Meerut College has no home of its own, it is located in a rented house now very old and decayed. The Commissioner has been told that the Government is prepared to help with a building grant if arrangements for acquiring a permanent home are made. The Agra College has decided to build a boarding house—a very necessary improvement and the Commissioner has been authorised to state that the Government will assist next year by a grant of Rs 20,000 if a similar sum be raised by the Trustees or by private liberality.

In Aligarh application for a grant towards the building of a new school has been made. The Raja of Nanpara has given a large donation towards this very necessary object, and next year the Government will, if necessary, supplement the donation There is no educational institution in the Province which has done more for itself and is more deserving of help from the local Government.

In Lucknow the large area known as the Badshah Bagh has recently been resold to Government by His Highness the Raja of Kapurthala. It is intended to build in this convenient place residences for the Professors and a good boarding house for the Canning College The Canning College belongs to the Talukdars of Oudh They are proud of it, and will I doubt not co-operate with the Government in carrying out this project. As evidence of the interest taken in education in Oudh I may instance the new High School built by the Trustees of the Husainabad Endowment and the suggestive pamphlet written by the Raja Ali Mohammad Khan, of Muhammadabad, on the course of training in the Colvin School. The Raja has discussed the question with me and many others, including the principal Talukdars, and I understand that his final proposals are now ready.

Again the question of completing and extending the Hindu and Mahommedan boarding houses at Allahabad has been under discussion since last July, and will, I hope, soon be settled.

In the Muir College the necessary increase in the teaching staff has been practically decided. A building for the classes of the Law school is an urgent want, and so are permanent residences for the professors.

"The fact most suggestive for everybody who visits the United States is the extraordinary interest taken in education by the entire population from highest to lowest, from poorest to richest. The question for them all is how to turn out the most capable and adaptable young men and women and how to train the best teachers for this purpose Education is the main point in the political creed of every adult citizen" I wish I could say that an equal zeal and enthusiasm for education exists in this province, but the interest is growing, and there are signs in many directions that an era of constructive effort is beginning. That effort will, I believe, be directed at present mainly towards the improvement of general education. The Resolution of the Government of India of March last sums up the result of a prolonged enquiry in which many minds took part, and from the principles therein laid down guidance may be obtained General education does not begin in the colleges. If students come to the colleges inadequately prepared, as is often the case, much precious time is wasted. It is essential that our schools should be improved, and the Government, the department and the managers of the schools are fully sensible that there are defects to be remedied especially in the number and the quality of the teachers and in accommodation in boarding houses and class rooms

I may mention that the budget estimate of the Department for the current year in the Province is 9½ lakhs in excess of the actuals of 1901-1902· a provisional code has recently been issued, and any reasonable and practical suggestions amending it will be very acceptable. Before long I hope that better trained students will begin to come to the colleges and the University. The most pressing needs of the colleges themselves are better teachers and better boarding house accommodation. The local Government is willing to help to the best of its ability by grants, but perhaps the highest ideal in education which any free nation can set before itself is to save the country from the pauperising curse of public charity. The Government must insist on one condition that those who ask for help should also help themselves. This is a principle that is well understood by the self-respecting and manly portions of the population of this Province.

It has led the people of Rohilkhund to save the Bareilly College from the extinction which the withdrawal of Government grant would have involved. I was accused in some quarters of harshness because I refused to allow the Bareilly College permanently to occupy as its home three rooms in the High School, and because an increase in the endowment was insisted on—what has been the result ? The endow-

quite minor importance as compared with the development of character, health and general adaptability. It is imposible to over estimate the importance of the formation of a manly, self-respecting, self-reliant character, and in this Province we owe much to the late Sir Syed Ahmad Khan who above all others clearly perceived and constantly insisted on the necessity for the formation of character.

There are constant cries nowadays for technical and commercial education as a means of making the country rich and prosperous. I pointed out last year that technical education is the sequel not the cause of industrial development Commercial education stands in precisely the same relation to commercial development. As Mr. Finlay, one of the Moseley Educational Commission puts it, "It is not the American schools that have made the people what they are, but the people being what they are have made the schools."

The Industrial greatness of the United States is due to the energy, the restless enterprise, and the capacity for stre. uous work with which the citizens are endowed. The real way to make India commercial or industrial is for its citizens individually or jointly to put money down and start industries. Legislation cannot make a people enterprising or increase their capacity for work. Nor can the Government do much except by improving communications by road, railway and sea and by spreading general education of a sound type A technical or commercial education is useless to a man who has no opportunity of applying his knowledge to the concrete problems for industry and trade. The development of industry must come first, the development of education will follow it like its shadow.

We may also learn from the example of Japan. Men have been asking themselves how it is that the Japanese have a place among the progressive peoples of the world. Certainly application to industry and to education are two of the principal causes. There has been practically no talking or political agitation, there has been much action and hard work. Every citizen of India is free to engage in any industry, trade or profession, and there are signs that thoughtful men in increasing numbers are turning away from the pursuit of political ideas and are turning towards social and sanitary reform, self-helpfulness, self-reliance and industrial hope.

I may quote another passage from the Moseley commission report where Mr. Thomas Barclay, who was President of the Paris Chamber of Commerce and who has had exceptional opportunities of observing educational tendencies in Germany, Belgium, France and England, says of America;

208 passed, and for the B.Sc., 19 candidates, of whom 14 passed. In the M.A. examination 40 candidates appeared, of whom 18 passed; and of nine candidates for 1st D Sc., six passed. Two candidates appeared for the 2nd D. Sc, in Chemistry and one for the final examination, he also passed For the LL.B. there were 112 entries, and 46 were successful.

After the conferring of degrees H. H. the Chancellor said :—

Mr. Vice-Chancellor and Members of the Senate of the Allahabad University.—

It has been truly said that the doing for the last time of an act which has become habitual is associated with a certain sadness of heart.

We have still among us some of the Fellows who witnessed the birth of this University and many who for years have shared in its beneficent work Some feeling of sadness may pass through their minds on the occasion of this the last Convocation of the University under the old constitution, but the feeling is but transient : it is absorbed in the memories of what the University has done in the past and in the hopeful anticipation of greater developments in the future.

The Act of 1904 has introduced no great change in the constitution of our University. It has indeed altered the mode of selection of Fellows. But we shall have 75 Fellows in all, and I trust that by nomination and election we shall be able to retain the services and secure the continued help of most of the existing Fellows who are interested in the development of the University. The first list of 45 names published on the 1st October was designed to give representation to the different institutions and classes of the public interested in University education. It omitted some men who have since been elected and others whom the Chancellor will subsequently appoint It was not desirable that the Chancellor should nominate the full number at first. It was necessary to wait and see who would be elected by the existing Fellows and the faculties. It will be my aim that the final list of the Senate shall give due representation to the different classes of studies and bring in men of all views who unite in a desire to spread and raise education

The problem of education has many sides, but unquestionably the first duty of the University and of its affiliated colleges is to supply a sound general education. Such an education must be the basis of all specialized training. Specialized study in short should be in addition to, not in substitution, for a sound general education The acquisition of special knowledge is easy to a trained mind, and is of

Will the doubt sink down
  If the preacher
Speak but soft things,
  Serving the time and the pleasure of fools?

If evil be rife
  In your city,
Shall the watchmen ye pay
  Cheat you and cry that the night passes well?
When evil be rife,
  Will your strength be
Even to sit,
  Ye who are called to be lords of the House?
Lords sitting as deaf,
  As of old time,
Judah sat deaf
  Though Zion groaned loud in her desolate shame,
And the Spirit of God
  In Isaiah
Flashed out the truth,
  Straight-flung of a fearless rebuker of Kings.

Ay! ever the voice
  And vain crying
Ring down the night, [with wrath.
  And the storm-clouds of Fate hang there heavy

J. R. C.

---

## Allahabad University Convocation.

### THE CHANCELLOR'S ADDRESS.

THE annual Convocation for conferring degrees was held in the Vizianagram Hall of the Muir Central College on Friday afternoon at 4-30 p.m.

The Fellows and Vice-Chancellor of the University assembled in the College Library and a procession was formed which met His Honour the Chancellor at the Hall. The Chancellor took his seat on the platform and the Convocation was declared open, after which the graduating students were presented to the Vice-Chancellor by the *Principals* of the various Collges and received their diplomas. Among the presentations were five lady graduates who were accorded loud applause by the audience as they left the rostrum. For the B. A. examination there were 320 candidates of whom

---

At the annual Convocation of the Allahabad University it is customary for a lecture to be delivered on some subject of general interest to students by a recognised authority on that subject. This year in the presence of the Chancellor, the Vice-Chancellor and a large audience, Mr. Morison lectured on "Economic Theory in Indian experience."

---

We can heartily congratulate the Duty on the amount of money collected this year by the various Deputations. It exceeds Rs 28,000. A fuller report will be published later.

---

Sajjad Haider, B. A., is, we hear doing good work as Dragoman in Bagdad under the Consul-General there.

---

Magbool Ahmad, B. A., of Muzaffarnagar, has been promoted to a Naib-Zillardarship of Canals.

---

S. Abdul Kadir is working as Superintendent of Customs at Tranquibar, Tanjore.

---

Abdul Majid Khan is now a Naib-Tehsildar in the Punjab, and is doing Boundary work.

---

At a speaking competition recently held at the Union Club the following obtained the various prizes: IV year, Ghulam Rasool; III year, Azhar Husain; II year, Asif Zaman; I year, Karim Hyder Lodi. Entrance, Abdul Rahim

---

## From the Watch Tower.

—-:):o:(:—

Why make fast the door?
  Is it timely
This barring of lips,
  The wrath driven back on the innermost soul?

Shall the spirit in man
  Be as nothing?
A dungeon-bound wretch,
  Fettered, outcast from the hearing of men?

Or if words be loosed,
  Is it smoothness
Ye ask for, and praise,
  Poured out like oil on the waters of doubt?

The
Aligarh Monthly

NOVEMBER, 1904

## College Notes.

On October 20th the College was visited by Colonel Afsarul Jung, the Commander-in-Chief of H. H. the Nizam's Forces, who was on his way back from Kashmir. Having been shown over the College buildings, the Colonel was presented with an Address by the Cricket Club, and was afterwards entertained at a garden party.

As a sequel to his visit Colonel Afsarul Jung presented the College with Rs. 500.

The Nawab S. Abu Jafar of Fyzabad has given the College Rs. 200 to be spent on Prizes. We beg to thank him most heartily. The money will be spent on books, and will be incorporated with the sum allotted to the prizes given after the Annual Examinations

Mr Gardner Brown and Mr. Towle have been elected Fellows of the University of Allahabad

Professor Abdul Hai has left the College having been appointed Sub-Assistant Superintendent in the Survey of India. He is posted at Bangalore.

M. Hamid, B.A., has also left us, having been appointed to a Deputy Colleetorship in Bengal. He will be missed in the Union and in the College generally. While wishing him every success we hope he will find time to contribute some of his excellent articles to this Magazine.

# علیگڑھ منتھلی

| جلد ۲ | دسمبر سنہ ۱۹۰۴ عیسوی | نمبر ۱۲ |
|---|---|---|


## الاسوۃ عند العرب

(نمبر ۴)

(سلسلے کیلئے مئی، جولائی اور ستمبر سنہ ۱۹۰۴ء کا "منتھلی" دیکھنا چاہیئے)

**دختر کُشی کو "نکاح خارجی" کا سبب قرار دینے سے اختلاف**

رابرٹسن اسمتھ نے عربوں میں "نکاحِ خارجی" کے رواج کی بُنیاد قتلِ بنات پر رکھی ہے، اور لینان نے بھی اُسکی راے سے اتفاق کیا ہے، لیکن یہ راے علی العموم تسلیم نہیں کیجا سکتی، اور سب سے پہلے جو اعتراض اسپر وارد ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ لڑکیوں کے زندہ دفن کر دینے سے عورتوں کی تعداد کسی طرح کم نہیں ہوتی۔

یہ اعتراض اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے کہ لینان نے اپنی راے ظاہر کرتے وقت ایسے ضروری اور قابلِ توجہ امر کو نظر انداز کر دیا کہ جو اپنی اہمیتِ عامہ کی وجہ سے قانونِ طبعی کے ہم درجہ ہے۔ وہ قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ اگرچہ لڑکوں کی سالانہ پیدایش لڑکیوں سے زیادہ بھی ہوتی ہو، تاہم لڑکیوں کی تعداد گزشتہ اور موجودہ

زمانے میں ہمیشہ لڑکوں سے زیادہ رہی ہے۔ تمام یورپ کے نقشہائے حیات و ممات اس بارہ میں متفق ہیں کہ لڑکوں کی سالانہ تعداد اموات لڑکیوں سے بحد زیادہ ہے۔ زیادتی اموات کے اسباب میں اس کو بھی اضافہ کرنا چاہئے کہ مرد اپنے عنفوانِ شباب ہی میں نہیں بلکہ اپنی زندگی کے تمام زمانوں میں، بمقابلہ عورتوں کے، بہت زیادہ خطرات و آفات میں پھنسا رہتا ہے۔ یہ تمام باتیں مل ملا کر عورتوں کی تعداد کو زیادہ اور مردوں کی شمار کو کم کرتی رہتی ہیں۔ تاریخ اور مشاہدے سے اسکا ثبوت ملتا ہے کہ اس قانونِ طبعی کا اثر بمقابلہ متمدن قوموں کے غیر متمدن قوموں میں بہت زیادہ ملتا ہے، کیونکہ وحشی قوموں کو اپنا ضروری مایحتاجِ زندگی: لباس خوراک مہیا کرنے میں جنگلی درندوں اور حشرات الارض سے ایک دائمی اور مسلسل جنگ جاری رکھنا پڑتی ہے اور اس وجہ سے اُن میں مردوں کی موت بھی بمقابلہ عورتوں کے بہت زیادہ واقع ہوتی ہے[1]۔ اور یہ بات مانی ہوئی ہے کہ دشمنوں پر حملہ کرنا، اور شکار مار کر لانا، مردوں کے فرائض میں داخل ہے

ایسی حالت میں وحشی قوموں میں عورتوں کی تعداد، بجائے کم ہونے کے، اگر مردوں سے زیادہ ہو، تو کچھ تعجب کی بات نہیں۔ اِس تحقیق سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ بعض غیر متمدن اقوام کی دختر کشی، اور جنسِ ذکور کی ہلاکت نے عورت و مرد کی مساواتِ تعدادِ نفوس پر کوئی بڑا اثر نہیں ڈالا۔ بلکہ کبھی کبھی اُسکے

[1] اِس دعوے پر بہت سی شہادتیں موجود ہیں جن میں سے چند اس جگہ بیان کی جاتی ہیں۔

مرگان شمالی امریکہ کے باشندوں کی نسبت بیان کرتا ہے کہ:۔

"ان لوگوں میں عورتوں کی تعداد عادۃً مردوں سے زیادہ ہوتی ہے۔ مردوں کی یہ کمی اُس دائمی جنگ جدل کا نتیجہ
" ہے، جس میں مرد قتل ہو جاتے ہیں۔ اس قتل و خونریزی نے بعض قبیلوں کے عورت و مرد میں ایک دو کی نسبت پیدا
" کردی ہے۔ چنانچہ برگفائی کے قبائل گوانی میں باوجود دختر کشی کے، عورتوں کی تعداد مردوں سے بہت زیادہ ہے،
" اور دونوں جنسوں کی باہمی نسبت ۱۴ اور ۱۳ ہے"

ایک دوسرے سیاح نے سوماترا کے ایک وحشی قبیلہ کو بوس کی نسبت بیان کیا ہے کہ:۔

" اس قبیلے میں عورتوں کی تعداد مردوں سے اس قدر زیادہ ہے کہ ایک مرد دو دو، تین تین، اور چار
" چار عورتوں سے شادی کرتا ہے"

برعکس بعض قبیلوں میں یہ نظر آتا ہے، کہ مردوں کی تعداد عورتوں سے زیادہ ہے، لیکن ہم نے یہ کبھی نہیں سنا کہ کسی قوم یا قبیلے میں عورتوں کی تعداد کم ہو گئی ہو۔

ان واقعات و شواہد سے صاف طور پر لنیان کی غلطی اور اُس بُنیاد کی کمزوری ثابت ہو جاتی ہے جس پر اُس نے "نکاحِ خارجی" کے بارہ میں اپنی رائے قائم کی تھی۔ باوجود اسکے اگر ہم یہ بھی تسلیم کر لیں کہ لنیان نے دختر کُشی کے رواج سے جو کچھ نتیجہ نکالا ہے وہ صحیح ہے، اب بھی صرف اکیلی دختر کشی نکاح خارجی کے پھیلنے کا سبب قرار نہیں دی جا سکتی۔ اسلئے کہ اگر بالفرض دختر کُشی کسی ایک قبیلے میں عورتوں کی تعداد کم کر کے نتیجۃً "نکاح خارجی" کی بُنیاد ڈالنے کا باعث ہوتی ہے، تو ہم ضرور یہ کہینگے کہ اس رسم کو تمام قبیلوں میں اپنا یہی اثر ظاہر کرنا چاہیئے۔ اور جب یہ نتیجہ ظاہر ہوگا، تو "نکاح خارجی" کا وجود اگر ناممکن نہیں تو کم سے کم مشکل ضرور ہو جائیگا۔ سلہ

---

سلہ۔ باستیان (BASTIAN) نے اپنی کتاب "الانسان فی التاریخ" (جلد سوم صفحہ ۲۹۹) میں عربوں کے "نکاحِ خارجی" کی نسبت لکھا ہے کہ:۔

"چینیوں میں یہ دستور ناجائز قرار دیا گیا ہے، کہ ایک قبیلہ اپنے ہی قبیلے میں شادی کر سکے۔ اس سے اُنکی غرض یہ ہے کہ اولاد عمدہ اور نجیب پیدا ہو۔ عربوں میں بھی یہ رواج ملتا ہے۔

" چنانچہ ابن نہب ( ؟ ) نے بیان کیا ہے کہ بنی ربیعہ ہمیشہ مضر میں شادی کرتے تھے، اور مضر ربیعہ میں"

علامہ تیلور نے بھی اپنی کتاب "انسان کی قدیم تاریخ" میں ایسا ہی لکھا ہے"

مشہور عرب مورخ مسعودی اپنی تاریخ "مروج الذہب" میں چین کے باشندوں کی شادی بیاہ کی نسبت لکھتا ہے کہ:۔

"چینیوں کا ایک قبیلہ اپنے ہی قبیلے میں نکاح نہیں کر سکتا" اسکی مثال میں وہ عرب کا یہ دستور پیش کرتا ہے کہ:۔

" مثلاً اگر مرد قبیلہ مضر کا ہے، تو وہ ربیعہ میں شادی کرتا ہے، اور ربیعہ کا مضر میں، قبیلہ کہلان کا مرد حمیر میں اور حمیر کا کہلان میں،

" اس رواج سے اہلِ چین کا مقصد یہ ہے کہ اولاد صحیح النسل اور قوی البنیان پیدا ہو" (جلد اوّل صفحہ ۳۰۱۔ مطبوعہ پیرس)

اس سے ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ "نکاح خارجی" عربوں میں لازمی نہیں تھا جیسا کہ بادی النظر میں اس عبارت سے ظاہر ہوتا ہے اگر باستیان نے ان ہی تاریخی واقعات پر اپنی رائے کی بُنیاد رکھی ہے تو اس صورت میں اُسکا تسلیم کرنا مشکل ہے۔

یہ تمام واقعات و دلائل، ہمیں یہ کہنے پر مجبور کرتے ہیں، کہ عرب میں "نکاحِ خارجی" کے پیچھے کر اسباب وہ نہیں ہیں جو لنیان اور رابرٹ سن آسمتھ نے بیان کئے ہیں۔ کچھ اور ہی ہیں۔

"نکاحِ خارجی کی بنیاد کس تھیوری پر پڑی۔"

ہماری رائے میں "نکاحِ خارجی" کا اصلی سبب یہ ہے، کہ عرب "نکاحِ قرابت" (ENDOGAMY) کو نہایت نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اس دعوے پر بے انتہا دلیلیں موجود ہیں، جن میں سے چند بیان کی جاتی ہیں۔

ضرب الامثال مشعر بر ترغیب "نکاحِ خارجی"۔

مشہور مستشرق گولڈ سٹکر (GOLDSTÜCKER)، رابرٹ سن کے حوالے سے لکھتا ہے کہ:—

"عمر بن کلثوم صاحبِ معلقہ نے جو حکیمانہ اقوال دنیا میں اپنی یادگار چھوڑے ہیں، اُن میں اُسکی وہ وصیت بھی موجود ہے، جس میں وہ اپنی اولاد کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ:—

"لا تتزوجوا في حيكم فانه يؤدي الى قبيح البغض" یعنی اپنے ہی قبیلے میں شادی بیاہ کرو، کیونکہ اس سے سخت دشمنی پیدا ہوتی ہے۔"[1]

اسکے بعد اسی مستشرق نے عرب کی ایک ضرب المثل نقل کی ہے، جس سے اُس سخت نفرت و کراہت کا پتہ چلتا ہے جو "نکاحِ اندرونِ قبیلہ" کی نسبت عربوں کے دل میں جاگزین تھی۔— وہ ضرب المثل یہ ہے: "النزائع لا القرائب"[2] یعنی اجنبی عورتوں سے نکاح کرو، اور رشتہ داروں سے مت کرو۔"

سب سے زیادہ قابلِ ذکر یہ امر ہے، کہ اس ضرب المثل کی تائید ایک حدیث سے بھی ہوتی ہے، جس کے الفاظ یہ ہیں:

"اغتربوا لا تضووا"[3] یعنی "دور کی رشتہ والی عورت سے نکاح کرو تاکہ کمزور اولاد پیدا نہ ہو"

[1] "شعراء النصرانیہ"۔ جلد دوم۔ صفحہ ۲۰۲۔ مطبوعہ بیروت۔

[2] یہ ضرب المثل دوسرے لفظوں میں اس طرح بیان کی جاتی ہے۔ "الغرائب لا القرائب"

[3] "ضرب الامثال" میدانی۔ جلد دوم۔ صفحہ ۲۵۔ امام غزالی نے بھی "احیاء العلوم" میں اس حدیث کو نقل کیا ہے۔ اخرجہ

اہلِ عرب کا یہ اعتقاد تھا کہ رشتہ دار عورتوں سے ضعیف و نحیف اولاد پیدا ہوتی ہے، لہٰذا جسکو نجیب اور قوی اولاد کی خواہش ہو، اُسکو غیروں میں شادی کرنا چاہیئے جسطرح عمدہ پھل حاصل کرنے کے لئے دوسرے درخت کی شاخ کا پیوند لگانے کی ضرورت ہے۔ ؎۱

**"نکاحِ خارجی" اور فقہ اسلام۔** یہ اعتقاد صرف عربِ جاہلیت ہی میں منحصر نہیں تھا، بلکہ علماء فقہ اسلام کی مصنفات میں بھی اس خیال کا وجود ملتا ہے۔

ابنِ قاسم فقیہ اپنی تصنیف "شرحِ بیجوری" میں لکھتا ہے کہ:۔۔۔

" اجنبیوں یا دُور کی رشتہ دار عورتوں سے نکاح کرنا مستحب ہے۔ رشتہ دار عورتوں کی طرف کامل
" رغبت نہ ہونے سے اُن کی اولاد ضعیف و نحیف پیدا ہوتی ہے۔" ؎۲

**معشوقہ کو "بنتِ عم" کا لقب دیا جانا "نکاحِ خارجی" کے منافی نہیں۔** عربوں کا یہ اعتقاد بظاہر اُن کے اُس قدیم اور مشہور خیال کے منافی نظر آتا ہے کہ وہ "بناتِ عم" کو غیر عورتوں پر ترجیح دیتے تھے، لیکن اگر اس مسئلے میں کامل غور کیا جائے، تو پھر کوئی تناقض نظر نہیں آتا، کیونکہ تمام عربوں کی یہ عادت تھی کہ وہ اپنی معشوقہ کو "بناتِ عم" کے لقب سے، اور اپنے خسر کو "عم" کے نام سے یاد کیا کرتے تھے، اگرچہ جانبین میں کوئی قرابت نہ ہو۔ البتہ یہ سوال حل طلب رہ جاتا ہے، کہ وہ اپنی محبوبہ اور خسر کو ان الفاظ سے کیوں تعبیر کرتے تھے؟۔ ہمارے خیال میں اس سوال کا جواب بدون اس بات کے تسلیم کرنے کے نہیں دیا جا سکتا، کہ عرب اپنے زمانۂ قدیم میں "نظامِ امومت" اور "نکاحِ خارجی" پر کاربند تھے۔

---

؎۱ ایک عرب شاعر کہتا ہے کہ:۔

" ان اردت الانجاب فانکح غریباً     وإلى الاقربین لا تتوصل"
" فانتقاء الثمار طیباً وحسناً     ثمر غصنه غریباً موصل"

" اگر نجیب اولاد چاہتے ہو، تو غیر عورتوں سے نکاح کرو، اور قریب کی رشتہ داروں سے رشتۂ مواصلت نہ جوڑو۔
" کیونکہ اعلیٰ درجہ کا پھل وہی ہوتا ہے جو دوسرے درخت کی پیوند کردہ شاخ سے حاصل ہوتا ہے۔"

؎۲ مثلاً بنتِ عم سے کمزور اولاد پیدا ہوگی۔ "شرحِ بیجوری"۔ جلد دوم صفحہ ۱۰۳

یہاں تک کہ اُن بھائیوں کی اولاد میں باہم مناکحت و مزاوجت جائز تھی، جن کی بیبیاں مختلف قبیلوں کی ہوں۔ اِس جواز کی یہ وجہ نہیں تھی، کہ اولاد اُس حالت میں اپنی ماں کے تابع ہوتی ہے بلکہ اسلئے کہ اُن میں کوئی حقیقی رشتۂ قرابت موجود نہیں ہے۔ ہم اس کو "اموسۃ" اور اُس کے نتائج کی بحث میں بیان کر آئے ہیں۔ یعنی جو قرابتِ مادری، قرابتِ پدری کے مانع ہوتی ہے، یہ بات اُسکے لوازمات میں داخل ہے، کہ اولاد باپ کے تابع نہیں ہوتی، بلکہ ماموں کے تابع ہوتی ہے جب باپ کے ساتھ اولاد کے تعلقات کی یہ حالت تھی، تو پھر "اعمام" اور "اولادِ اعمام" کے ساتھ کیا رشتہ تعلق ہو سکتا تھا۔ لہٰذا اِس دورِ قرابتِ مادری میں "ابنِ عم اور بنتِ عم" کا نکاح "نکاحِ داخلی" نہیں سمجھا جاتا تھا، اور بلاخوف نتائجِ بد کے اُس پر عمل درآمد ہوتا تھا۔[1]

لیکن جب "نظامِ اموسۃ" کے بجائے "نظامِ ابوۃ" قائم ہوا، تو اُس نکاح کے متعلق بھی عربوں کے خیالات بدل گئے اور اگرچہ "نظامِ ابوۃ" میں بھی "پسران و دختران عم" میں باہم شادی بیاہ کا سلسلہ جاری رہا، لیکن وہ اِس دور میں "نکاحِ داخلی" خیال کیا جاتا تھا۔ اس حالتِ مستبدلہ میں اگر وہ اِس نکاح کو مضر اور غیر مستحسن شمار کرنے لگے ہوں تو کچھ تعجب کی بات نہیں۔ چنانچہ ایک اعرابی کے قول سے

[1] "دورِ خؤولۃ" میں اسکے برعکس ہوتا ہے، یعنی مرد اس دور میں اپنی "بنتِ خال" سے شادی کرنا مکروہ سمجھتا ہے، اگرچہ دونوں میں کسی حقیقی قرابت کا تعلق بھی مفقود ہو۔ لیکن چونکہ وہ تعلق "خؤولۃ" کو بمقابلہ "ابوۃ" و "عموۃ" کے بہت زیادہ قریبی رشتہ سمجھتے ہیں، لہٰذا انھوں نے اس بارے میں یہ منطقی نتیجہ نکالا ہے، کہ ایک مرد اپنی "بنتِ خال" سے جس قدر قرابتِ قریبہ رکھتا ہے اُسقدر "بنتِ عم" سے نہیں رکھتا۔

عربوں کے علاوہ بعض اور قوموں میں بھی باوجود نکاحِ خارجی رائج ہونے کے "بنتِ عم" اور "بنتِ خال" سے شادی بیاہ کرنے کی رسم جاری ہے۔ مثلاً قبیلۂ تبابس (جو "نظامِ ابوۃ" پر چلتا ہے) کے مرد اپنی "بنتِ عم" سے شادی کرنے کو دوسری عورتوں پر ترجیح دیتے ہیں۔ اور اپنی "بنتِ خال" کو، اگرچہ اس سے علاقۂ زوجیت نہ ہو، "اپنی دلہن" کہتے ہیں۔ اور اس قبیلے کی عورتیں اپنے عشاق اور شوہروں کو "ابنِ عم" کا خطاب دیتی ہیں۔

---

اِسکی تائید ہوتی ہے۔ وہ اپنے دوست کی تعریف میں لکھتا ہے :۔

"لا فتی نال العلی بھمہ  لیس ابوہ بابن عم امہ"
"تری الرجال تھتدی بامہ"

یعنی "وہ جوانمرد کہ جس نے اپنی ہمت سے بلند پائگی حاصل کی، اور جس کا باپ اُس کی ماں کا ابن عم نہیں تھا۔ تو دیکھیگا کہ (اکثر) مرد اس نوجوان کی ماں کی تقلید کرتے ہیں"

حضرت عمرؓ کی نسبت بیان کیا گیا ہے، کہ ایک دن اُنھوں نے قریش کی پست قامتی کا سبب دریافت کیا، تو لوگوں نے یہ جواب دیا کہ قریش کی کوتہ قامتی اُن کی اس عادت کا نتیجہ ہے کہ وہ اپنی "بناتِ عم" سے شادی کرتے ہیں۔ حضرت عمرؓ نے یہ معلوم کر کے اس قسم کے نکاحوں کی ممانعت کر دی۔ لیکن زمانۂ حال کے بعض سیّاحوں کے بیان سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ یہ پُرانی رسم بعض قبائلِ عرب میں اس وقت تک رائج ہے۔

چنانچہ مشہور سیاح برک ہارڈ لکھتا ہے کہ :۔

" بدوی آج تک اپنی اس پُرانی رسم پر چلے آتے ہیں کہ ایک لڑکی کے ابناءِ عم میں سب سے بڑے
" بیٹے کو یہ حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ اپنی بنتِ عم سے شادی کرے۔ اگر ابنِ عم لڑکی کی پوری
" قیمت ادا کرے تو پھر لڑکی کے باپ کی یہ مجال نہیں کہ اُسکو اپنی بیٹی دینے سے انکار کر سکے۔
" ابنِ عم جو قیمت اپنے چچا کو ادا کرتا ہے، وہ اُس قیمت سے بہت کم ہوتی ہے
" جو ایک اجنبی شخص کو ادا کرنی پڑتی ہے" [1]

ایک اور مشہور سیاح برٹن (BURTON) لکھتا ہے کہ :۔

" بدوی کو اپنی دخترِ عم پر یہ حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ غیر مردوں سے پہلے اُس سے نکاح کر سکے
" اور یہی وہ بنیاد ہے جس کی بنا پر سلے العموم بیوی کو لفظ بنتِ عم سے

[1] برک ہارڈ کا سفرنامہ "بدویوں اور وہابیوں کے حالات" جلد اوّل صفحہ ۱۱۳ و ۲۷۲۔

تعبیر کرتے ہیں"۔ [1]

**بناتِ عم سے شادی کرنا "دوراسوۃ" کی یادگار ہے۔**

باوجودیکہ نکاحِ "بناتِ عم" سے آجتک بُرے نتائج پیدا ہوتے چلے آرہے ہیں، لیکن تاہم اس وقت تک وہ اُس نکاح کو عمدہ خیال کرتے، اور دوسری صورتوں پر اُسکو ترجیح دیتے ہیں۔ اِن تمام باتوں سے یہ پتہ چلتا ہے کہ یہ عادت نہایت مضبوطی سے اُن کے دلوں میں گھر کر گئی ہے، اور اسکی ابتدا بجز اسکے اور کچھ نہیں بیان کی جاسکتی کہ عربوں کی زندگی کا پہلا "دورِ نظام اسوۃ" پر قائم تھا، اور اُس وقت یہ نکاح "نکاحِ داخلی" نہیں سمجھا جاتا تھا، اور اسی لئے وہ اسکو مضر بھی نہیں خیال کرتے تھے۔ اور یہیں سے اس بات کا بھی سُراغ ملتا ہے کہ عرب اپنے "دورِ اسوۃ" میں "نکاحِ خارجی" کرتے تھے، جس سے "اولادِ اعمام" میں شادی بیاہ کی جُنیاد پڑی، اور اسکا وجود "دورِ ابوۃ" تک میں باقی رہا، مگر اتنا فرق ہوا کہ "نکاحِ خارجی" اس طرح پر "نکاحِ داخلی" کی صورت میں آگیا۔

**"نکاحِ داخلی" کا وجود اسلام سے پہلے۔**

عرب میں "نکاحِ داخلی" ( ۷۰۰-۵۵۰E ) کا رواج پیغمبر اسلام کی بعثت سے قبل موجود تھا۔ شہرستانی لکھتا ہے کہ:—

" اہلِ عرب لڑکی کی درخواست اُس کے باپ، یا بھائی، یا چچا سے کیا کرتے تھے۔۔۔، اگر یہ
" منگنی کرنے والا قریبی رشتہ دار ہوتا، تو لڑکی کی رخصت کے وقت اُسکا باپ یا بھائی لڑکی کو
" مخاطب کر کے یہ الفاظ کہتا:
" اَیْسَرْتِ، وَاَذْکَرْتِ، وَلَا اَنَّثْتِ، جَعَلَ اللّٰہُ مِنْکِ عَدَدًا، وَعِزًّا، وَخُلْدًا،
" اَحْسِنِیْ خُلُقَکِ، وَاَکْرِمِیْ زَوْجَکِ، وَلْیَکُنْ طِیْبُکِ الْمَآءَ؛ یعنی تُو فراخ دست
" رہے، بیٹے کھلائے، لڑکیاں نہ جنے، پھلے پھولے، عزت نصیب ہو، جم جم جئے، اپنے

---

[1] سفرنامہ برٹن- جلد دوم صفحہ ۴۸-

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کے نکاح سے کوئی بُرا نتیجہ نہیں نکلتا جیسا کہ عرب خیال کرتے تھے۔ چنانچہ خود برٹن اس بارہ میں لکھتا ہے:
" اس جگہ پسران و دختران عم کے باہمی شادی بیاہ سے کسی بُرے نتیجے کا اندیشہ نہیں کیا جاتا، اُن کا یہ اعتماد
" اپنے طول طویل تجربہ اور قوم کی باخبری پر مبنی ہے"۔

اخلاق و عادات اچھے رکھنا، شوہر کی عزت کرنا، صاف ستھری رہنا"۔

"اور اگر غیروں میں بیاہی جاتی، تو بوقتِ وداع یہ الفاظ کہتے:

"لا أيسرتِ، ولا أذكرتِ، فانكِ تدنين البعداء، وتلدين الاعداء، احسني خلقكِ، وتحبّبي الى احمائكِ، فان لهم عيناً ناظرة عليكِ، واذناً سامعة، وليكن طيبكِ الماء" یعنی نہ تجھے فراخ دستی نصیب ہو، نہ تیرے اولادِ ذکور پیدا ہو، کیونکہ تو غیروں کو رشتہ دار بنائیگی، اور دشمن جنیگی، اپنے خلق کو اچھا رکھنا، شوہر کے رشتہ داروں سے محبت رکھنا، کیونکہ وہ ہمیشہ تیری باتوں کو نظرِ غور اور گوشِ ہوش سے جانچتے اور سنتے رہینگے، اپنے آپ کو پاک صاف رکھنا"۔ ۱؎

**"نکاح داخلی" اور "دورِ ابوۃ"** شہرستانی کے بیان سے یہ پایا جاتا ہے، کہ "نکاحِ داخلی" عربوں کے "دورِ ابوۃ" میں عام طور پر رائج تھا۔ اور اسکی دلیل یہ ہے کہ "نظامِ ابوۃ" رکھنے والی قوموں میں اگرچہ "نکاحِ خارجی" بہت کم ہوتا ہے، لیکن بالکل بیع و شرا کی صورت میں واقع ہوتا ہے، یعنی لڑکی والے مالِ تجارت کیطرح اپنی لڑکیوں کو غیروں کے ہاتھ بیچکر قیمت وصول کرتے ہیں۔ "بخلاف "نکاحِ داخلی" کے کہ اُس میں ایسا نہیں کیا جاتا۔

**"مہر" اور "قیمت" میں فرق** اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ "نکاحِ داخلی" میں بھی "مہر" کو بہت بڑا دخل ہے، لیکن "مہر" اور "قیمت" میں یہ فرقِ عظیم ہے کہ "مہر" لڑکی کے ماں باپ یا رشتہ داروں کی ملکیت نہیں ہوتا، بلکہ خود لڑکی کی ملکیت ہوتا ہے۔

**کیا عرب جاہلیت میں نکاح بصورتِ بیع رائج تھا؟** بعض لوگوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، کہ ابتدائی حالت میں نکاح کی یہ صورت نہیں تھی، بلکہ عرب اسلام سے پہلے نکاح کو من جملہ معاملات بیع و شرا کے شمار کرتے تھے۔ اور لڑکی کے ماں باپ، یا اُن کے قائم مقام دوسری اشیاء فروختنی کیطرح لڑکی کو بیچ دیتے، اور اُسکو مجبور کرتے تھے کہ وہ جس مرد سے چاہتے ہیں اُس سے مواصلت

۱؎ "کتاب الملل والنحل" للشہرستانی۔ جلد دوم صفحہ ۴۴۱۔ مطبوعہ لندن۔ ۱۸۴۶ء۔

کرے، اور اپنی مرضی کو دخل نہ دے۔

نکاح میں نساءِ جاہلیت کی خود مختاری۔ اگرچہ بعض اوقات ایسا ہوتا تھا، لیکن علی العموم اور کلیۃً یہی رواج نہیں تھا، اسلئے کہ زمانۂ جاہلیت میں جو کچھ عورت کی حالت تھی وہ بوجوہ اس خیال کے تسلیم کرنے کے منافی اور متناقض ہے۔ چنانچہ نساءِ جاہلیت کی نسبت یہ بات مشہور ہے کہ وہ اپنے شوہر پسند کرنے میں کامل الاختیار تھیں، اور اس بارہ میں اُن کے رشتہ داروں کی طرف سے کوئی مزاحمت نہیں کی جاتی تھی۔

"نکاح متعہ"، "نکاح ذواق"، اور شوہروں کے پسند کرنے میں اُمِّ خارجہ وغیرہ کی خود مختاریاں، اسکی کھلی ہوئی مثالیں ہیں۔

حضرت خدیجہ اور دوسری عورتیں نظیراً پیش کی جاسکتی ہیں، کہ نساءِ جاہلیت جس مرد سے نکاح کرنا چاہتی تھیں، خود مختاری کیساتھ اُس کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دیدیتی تھیں۔

دوسری صدی ہجری کے ایک شاعر اسمٰعیل بن محمد معروف بہ سید الحمیری کے حوالے سے بیان کیا گیا ہے کہ
" وہ رستے میں قبیلہ بنی تمیم کی ایک عورت سے ملا، جو مذہباً اَباضیہ[1] تھی۔ عورت کے دل پر اُس کا
" اثر پڑا، اور راستے ہی میں کہنے لگی: 'میں تجھ سے شادی کرنا چاہتی ہوں'۔ اسمٰعیل نے کہا کہ
" کیا اُمِّ خارجہ کیطرح ولی اور گواہوں کے بغیر ہی نکاح ہو جائیگا؟۔
" اِس پر عورت نے ہنسکر جواب دیا کہ 'میں اس پر غور کرتی ہوں'۔ ..... پھر بولی کہ 'جب نکاح کی
" خبر مشہور ہو جائیگی تو کیا اُس کے ساتھ پوشیدہ باتیں ظاہر نہیں ہونگی؟'۔
" اسمٰعیل نے کہا 'میں ایک دوسری تدبیر بتاتا ہوں'۔ عورت نے پوچھا 'وہ کیا؟' اسمٰعیل نے جواب
" دیا کہ 'متعہ ایک ایسی چیز ہے جس سے کوئی شخص واقف نہیں ہو سکتا'۔ عورت نے کہا 'یہ تو
" زنا کے لگ بھگ ہے'۔ اسمٰعیل نے کہا 'توبہ کر! قرآن پر ایمان لانے کے بعد کفر بکتی ہے!
" خدا کہتا ہے: فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهِ مِنْهُنَّ فَآتُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ ۔ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا

[1] "اَباضیہ" خوارج کا ایک فرقہ جو ایک شخص اباض کی طرف منسوب ہے۔ انتہی۔

،، تَرَاضَیْتُمْ بِہٖ مِنْ بَعْدِ الْفَرِیْضَۃِ (سورہ نساء۔ آیت ۲۸)، عورت نے کہا کیوں نہیں خدا سے
،، طلب خیر کرتا ہ؟ اگر تو صاحب قیاس ہوا تو میں تیری تقلید کرونگی، اسمٰعیل نے کہا میں استخارہ
،، دیکھ چکا ہوں۔ اس پر عورت اُس کے ساتھ ہو لی، اور اسمٰعیل شوہر کیطرح اُس کے ساتھ
،، رہنے لگا جب عورت کے رشتہ داروں کو اُس کی خبر پہنچی، تو اُنھوں نے اُسکو قتل کی دھمکی
،، دی، اور کہا کہ تو نے ایک کافر سے نکاح کیا ہے۔ عورت نے (صاف) انکار کر دیا، اور اُن کو
،، متعہ کی خبر تک نہ ہوئی۔ جب تک اُن کی علیحدگی کا زمانہ نہ آیا، اُسوقت تک عورت اس
،، متعہ کے تعلق سے اُس کے پاس برابر آتی، اور اُس سے مواصلت کرتی رہی“۔[1]

طلاق میں نساء جاہلیت کی خود مختاری۔ نساء جاہلیت کی زندگی میں یہ بات بھی کچھ کم اہمیت نہیں رکھتی، کہ اُن کو نکاح سے زیادہ طلاق کے بارہ میں خود مختاری حاصل تھی، اُم خارجہ وغیرہ عورتوں کی مثال پر نظر ڈالنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ عورت و مرد دونوں مسئلۂ طلاق میں برابر کا حق رکھتے تھے۔ صاحب اغانی لکھتا ہے کہ:—

،، زمانۂ جاہلیت میں عورتیں اپنے مردوں کو طلاق دیدیا کرتی تھیں۔ اُن کی طلاق کی یہ صورت
،، ہوتی تھی کہ اگر وہ بالوں کے خیمے میں ہوتیں، تو اُس کا رُخ بدل دیدیتی تھیں۔ یعنی اگر خیمے کا دروازہ
،، جانب مشرق ہوتا، تو بدل کر جانب مغرب کر دیتیں، اور اگر یمن کی طرف ہوتا، تو شام کی
،، طرف بدل دیتیں۔ شوہر اس تغیر و تبدل کو دیکھکر یہ سمجھ جاتا تھا کہ اُس کی بیوی نے اُس کو
،، طلاق دے دی ہے، اور وہ پھر اُسکے پاس نہیں جاتا تھا“۔

عرب کی عورتیں اسلام کے بعد بھی ایک زمانۂ دراز تک اپنے اس حق پر عمل پیرا رہیں۔ مستشرق وان کریمر خلفاء راشدینؓ کے بیان میں لکھتا ہے کہ:—

،، عورتیں اُس زمانے میں اپنا شوہر پسند کرنے میں بالکل خود مختار تھیں۔ اس آزادی کی ایک بہت
،، بڑی مستحکم نظیر یہ ہے کہ ایک خلیفہ کی بیوی نے اپنے شوہر کے انتقال کے بعد ایک غریب مگر

[1] ”کتاب الاغانی“ تصنیف ابو الفرج اصفہانی۔ جلد ہفتم صفحہ ۱۸۰ مطبوعہ مصر۔

"شریف مرد سے نکاح کیا۔ اور وہ تمام مال و دولت جو شوہر اوّل سے اُسکو ملا تھا، سب
"اُس نئے شوہر کو دیدیا۔ لیکن جب اُسکو یہ معلوم ہوا کہ وہ میرے سوا اور باندیوں، لونڈیوں
"سے بھی تعلق رکھتا ہے، تو اُس نے اُس نئے شوہر کو طلاق دے دی"۔[1]

اِس واقعے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں عورتوں کو اس درجہ حُرّیت حاصل تھی کہ جس سے نکاح بصورت بیع کی گُنجایش باقی نہیں رہتی۔

**نسارِ جاہلیت کی خود مختاری کے استدلال پر اعتراض۔** لیکن شواہد مذکورۂ بالا سے نتیجۃً عورتوں کی خود مختاری مُستنبط کرنے پر دو اعتراض کئے گئے ہیں۔

**پہلا اعتراض۔** اعتراضِ اوّل یہ ہے کہ: نساءِ جاہلیت حقوقِ وراثت سے محروم رکھی گئی تھیں، کوئی شوہر دار عورت اپنے باپ کی وارث نہیں ہوسکتی تھی، اسلئے کہ نکاح کیوقت عورت کا بیع ہو جانا اُس کے تمام خاندانی تعلقات کو منقطع کر دیتا تھا، اور اُسکو اُن حقوق میں حصّہ لینے سے محروم کر دیتا تھا، جو ایک خاندان کے ممبروں کو حاصل ہوتے تھے۔ غرض کہ عورت کے نکاح کا ایک لازمی نتیجہ یہ ہوتا تھا، کہ وہ اپنی حُرّیت سے محروم ہو جاتی تھی، اور شوہر کیطرف سے بھی بہت کم حصّہ پاتی تھی۔

**دوسرا اعتراض۔** اعتراضِ دوم یہ ہے کہ: عورت اپنے شوہر کا ایک زر خرید مال سمجھے جانے کی وجہ سے اُس کے متروکات میں شمار کی جاتی تھی۔ چنانچہ جب کسی عورت کا شوہر مر جاتا تو وہ بھی دوسرے مال و متاع کیطرح متوفّی کے بھائی، یا چچا، یا بھتیجے، یا بھائی کے متبنّٰی وغیرہ رشتہ داروں میں سے کسی ایک کی مِلک قرار پاتی تھی۔

یہ دونوں نتیجے نکاح بصورتِ بیع سے پیدا ہوتے ہیں کہ:

(۱) عورت میراث پانے سے محروم رکھی جائے،

(۲) اور بیوہ ہونے کے بعد شوہر کے کسی ایک رشتہ دار کے پلّہ باندھ دی جائے۔ یہ دونوں دستور عرب میں رائج تھے، اور صریح اُس استدلال کے خلاف ہیں، جو ہم نے عربوں میں عورتوں

---

[1] وان کریمر کی کتاب "تاریخ التمدن فی الشرق"۔ جلد دوم صفحہ ۱۰۰۔

کی ضرورت ثابت کرنے، اور نکاح بصورت ہبہ کے عدم رواج پر قائم کیا تھا۔

**اعتراضات مذکورۂ بالا کے جواب** اب اس بات کی ضرورت معلوم ہوتی ہے، کہ اس تناقض ظاہری پر بحث کی جائے۔

**پہلے اعتراض کا جواب** قرآن میں اس بات پر صاف نص موجود ہے کہ:۔

| | |
|---|---|
| لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ، وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ أَوْ كَثُرَ نَصِيبًا مَّفْرُوضًا۔ | "ماں باپ اور رشتہ داروں کے ترکے میں، تھوڑا ہو یا بہت، مردوں کا حصّہ ہے۔ اور (اسی طرح) ماں باپ اور رشتہ داروں کے ترکے میں عورتوں کا بھی حصّہ ہے (اور یہ) معیّنہ حصّہ ہے۔" |

(سورۂ نساء۔ آیت ۸)

مفسروں نے اس آیت کی شانِ نزول یہ لکھی ہے کہ:۔[1]

"اوس بن صامت انصاری، جو اُحد کی خونریز لڑائی میں مارا گیا تھا، اُس نے ایک بیوی

---

[1] اس انصاری کے نام میں لوگوں کے مختلف اقوال ہیں، نول ڈیکی (NOLDEKE) نے اپنی تاریخ القرآن (صفحہ ۱۴۵-۱۴۶) میں یہ تمام نام بیان کئے ہیں، اور اُس کے بعد لکھا ہے کہ:۔

"خواہ اس مسئلے کی شان کچھ ہی ہو، لیکن اس میں کچھ شک نہیں کہ اس آیت کو ایک ایسے شخص سے تعلق ہے جو جنگ اُحد میں مارا گیا تھا
"یا زیادہ سے زیادہ تمام لوگوں سے۔ اگر ہم یہ بھی تسلیم کرلیں کہ اس موقع پر بعض ناموں کے بیان کرنے میں غلطی ہوگئی ہے تاہم دو یا تین
"ایسے نام باقی رہ جاتے ہیں جنکے جنگ اُحد میں مقتول ہونے سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ ان سب سے بڑھ کر یہ بات زیادہ قرین قیاس
"ہے کہ یتیموں اور حقوق وراثت کے متعلق احکام نازل ہونے کیلئے جنگ اُحد کا دن بہت مناسب تھا، کیونکہ اس روز دفعتہً تمام
"عورتیں بیوہ اور خاندان کے خاندان یتیم ہوگئے تھے، جسکی وجہ سے یتیموں اور بیواؤں میں جھگڑے، فساد پیدا ہونے
"اور اس بات کی ضرورت پڑی کہ کوئی ایسا قانون وضع کیا جائے جس کی رو سے تمام جھگڑے چکائے جاسکیں،
"یہی وہ ضرورت تھی، جو آیت مذکورۂ بالا کے نازل ہونے کا باعث ہوئی۔"

ام کحہ اور تین بیٹیاں چھوڑیں۔ اوس کے ابناء عم نے جاہلیت کے دستور کے موافق اوس کی
بیوی اور بیٹیوں کو اوس کے ترکے میں سے بالکل حصہ نہ دیا، اسلئے کہ اہلِ عرب زمانۂ جاہلیت
میں عورتوں اور بچوں کو وراثت میں کچھ حصہ نہیں دیتے تھے، اور اُن کا یہ اعتقاد تھا، کہ
وراثت کا استحقاق صرف اُسی شخص کو پہنچتا ہے، جو میدانِ جنگ میں مُلک کی حمایت کرے۔
ام کحہ یہ شکایت لیکر رسالت مآب کے پاس آئی، آپ نے اوس کے ابناء عم کو یہ کہلا کر بھیجا کہ
اوس کے مال کو ابھی تقسیم نہ کرنا۔ خدا نے اُس میں عورتوں کا حصہ بھی مقرر کیا ہے۔
لیکن جسوقت تک تصریح نص صاف صاف نہ ہوگئی، اُسوقت تک آپ نے اپنی طرف
سے کوئی مقدار معین نہیں کی۔ آیت "یُوصِیکُمُ اللّٰہُ" (نساء۔ آیت ۱۱ و ۱۲) نازل ہونے
کے بعد ام کحہ کو "ثمن" اور بیٹیوں کو "دو ثلث" دیے گئے اور باقی دونوں ابناء عم کو۔" [1]

کیا اس واقعہ سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ عورتیں عرب جاہلیت کے دستور کے مطابق میراث سے
محروم رکھی جاتی تھیں؟ اس واقعہ سے کبھی یہ نتیجہ نہیں نکالا جاسکتا۔

پہلا اعتراض اِس نفسِ واقعہ ہی پر یہ وارد ہوتا ہے کہ اگر عرب جاہلیت کے قوانین میں عورتیں
وراثت سے محروم ہوتیں، تو ام کحہ کو پیغمبر اسلام کے سامنے اپنے شوہر کے "ابناء عم" کی شکایت
کرنے کی کبھی جرأت نہ ہوتی۔ ہماری رائے کی صحت پر اس سے بھی زیادہ قوی دلیل خود وہ الفاظ
ہیں، جو ام کحہ نے شکایت کے وقت پیغمبر کے سامنے استعمال کئے تھے۔ چنانچہ واقدی نے اپنی
کتاب "مغازی الرسول" میں ام کحہ کے یہ الفاظ نقل کئے ہیں کہ:—

---

[1] اس واقعہ کو علامۂ زمخشری اور بیضاوی نے اپنی تفسیروں میں آیت مذکورۂ بالا کے تحت میں نقل کیا ہے۔ اور
نیز بیضاوی نے سورۂ نساء کی آیت (۱۳۶) کی تفسیر میں بیان کیا ہے کہ:—
"عیینہ بن حصین نے آنحضرت کے پاس آکر کہا کہ ہم کو یہ معلوم ہوا ہے کہ تم بیٹی کو بھی نصف حصہ دیتے ہو اور بہن کو بھی نصف حصہ
حالانکہ ہمارا قومی دستور یہ ہے کہ ہم اُن ہی لوگوں کو وراثت میں حصہ دیتے ہیں جو جنگ و جدل میں شریک ہوسکیں اور مالِ غنیمت لوٹ سکیں۔"
آپ نے جواب دیا کہ مجھے ایسا ہی حکم دیا گیا ہے۔"

"میرا شوہر مر گیا ہے، اُس کی میراث اُسکے بھائی پر منتقل ہوئی ہے، اور اُسکی بیٹیوں کو
"کچھ حصّہ نہیں ملا ہے، اور اب جبکہ لڑکیوں کے پاس کوئی مال نہیں ہے تو اُن سے کسطرح
"کوئی شادی کریگا"۔ ؎۱

اگر عورتوں کو میراث میں حصّہ ملنے کا دستور نہوتا، تو یہ بات بھی اُن کی مقدرت سے خارج ہوتی کہ نکاح سے قبل وہ اپنے شوہروں کو کچھ مال پیش کر سکتیں۔ حالانکہ اُمِ کحہ کے الفاظ سے اِس کے برعکس ظاہر ہوتا ہے۔

اِن واقعات کو پیشِ نظر رکھنے کے بعد مجبوراً یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ عرب جاہلیت میں عورتوں کا میراث سے محروم ہونا کوئی عام قاعدہ نہیں تھا، بلکہ اُس کے بعد اس کی بُنیاد پڑی۔

اِس پر بے انتہا دلائل موجود ہیں، جن میں سے چند اس جگہ بیان کئے جاتے ہیں۔

تاریخِ اسلام پر غور کرنے کے بعد صاف معلوم ہوتا ہے، کہ تمام واقعات ہم زبان ہو کر یہ کہہ رہے ہیں کہ عورتیں صدرِ اسلام میں کلیۃً مستقل بالذات، اور اپنی حرّیت سے متمتع تھیں، اور اسلامی سوسائٹی میں اُن کو بار حاصل تھا۔

چنانچہ بعض عورتوں کی نسبت مشہور ہے، کہ بسا اوقات اُنھوں نے اپنے روپئے اور مفید نصیحتوں سے پیغمبرِ اسلام کو اُن کی ذاتی، اور قومی ضرورتوں میں مدد دی۔ اور ہر شخص اس بات سے واقف ہے کہ خدیجہ پیغمبرِ اسلام سے نکاح کرنے کے قبل بذاتِ خود تجارت کرتی، اور بہت فائدہ اُٹھاتی تھیں۔

کیا اسکے بعد بھی یہ استدلال کرنا صحیح ہو سکتا ہے، کہ عرب عادۃً اپنی عورتوں کو میراث سے محروم رکھتے تھے؟ اس میں شک نہیں کہ بعض خاص خاص قبیلوں میں یہ دستور بھی رائج تھا، لیکن شادو

---

؎۱۔ "کتاب المغازی" مترجمۂ ولہوسن (WELHAUSEN) صفحہ ۱۸۷۔

لیکن اصل کتاب عربی میں بجائے اُمِ کحہ زوجۂ اوس بن صامت کے، زوجۂ سعد بن ربیع کا نام لکھا ہے۔ دیکھو "کتاب المغازی" (عربی) جلد ۲۔ صفحہ ۳۲۲۔ مطبوعۂ کلکتہ ۱۸۵۵ء۔ اختر۔

نادر، نہ یہ کہ تمام قبائل عرب میں علی العموم یہی رواج تھا۔

**دوسرے اعتراض کا جواب** اب دوسرے اعتراض پر بحث کرنا باقی رہ گیا ہے، جو بظاہر ہماری پہلی رایوں کے متناقض معلوم ہوتا ہے۔ وہ اعتراض یہ ہے کہ: چونکہ عورت بیوہ ہونے کے بعد اپنے متوفی شوہر کے کسی ایک رشتہ دار کے حوالہ کر دی جاتی تھی، لہٰذا وہ خود مختار نہ تھی۔

کلیۃً ہم اس سے انکار نہیں کر سکتے، کہ یہ دستور عربوں میں رائج نہیں تھا۔ قرآن سے بھی اس رواج کے وجود کا پتہ چلتا ہے، چنانچہ قرآن نے ان الفاظ میں ان کو اس عادت سے روکا ہے کہ:۔

" یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا یَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَرِثُوا النِّسَآءَ كَرْهًا[1] " (سورۂ نساء۔ آیت ۲۳)

یعنی "مسلمانو! تم کو زبردستی عورتوں کا وارث بننا جائز نہیں"

مفسرین نے اس آیت کی تفسیر میں یہ لکھا ہے کہ:۔

" زمانۂ جاہلیت میں جب کسی عورت کا شوہر مر جاتا، اور اس کے عصبۃ (یعنی بیٹے، بھائی،
" یا ایک صلب واحد کے رشتہ دار) موجود ہوتے، تو ان میں سے جو سب سے زیادہ مستحق ہوتا وہ
" کھڑا ہوتا، اور بیوہ پر اپنا ایک کپڑا ڈال دیتا[2]"

لیکن اگر ہم اس دستور کو ایک قانونِ عام تسلیم کر لیں، تو یہ سخت غلطی ہوگی، اسلئے کہ ہم کو اکثر نساءِ جاہلیت کی اس آزادی کا حال معلوم ہے، کہ وہ اپنے شوہروں کی وفات کے بعد جس طرح چاہتیں اپنی زندگی بسر کرتی تھیں، اور جس شخص سے چاہتیں دوبارہ نکاح کرتی تھیں۔ اگر کسی کو کچھ شک و شبہ ہو

---

[1] زمخشری اور بیضاوی نے اس آیت کی تفسیر میں لکھا ہے کہ:۔
" بطور وراثت عورتوں پر قبضہ مت کرو، جس طرح ترکہ پر قبضہ کرتے ہو"

[2] تفسیر بیضاوی و کشاف۔ سورۂ نساء۔ آیت ۲۳۔ اور کتاب "الملل والنحل" للشہرستانی۔ جلد دوم۔ صفحہ ۲۴۴۔ مشہور مستشرق پوکاک اپنی کتاب "نمونۂ تاریخ عرب" میں لکھتا ہے کہ:۔
" عرب جس طرح مال کے وارث ہوتے تھے اسی طرح حقِ نکاح کے بھی وراثۃً مالک ہوتے تھے"
" صفحہ ۳۲۵۔

تو وہ خدیجہ اور پیغمبر اسلام کے واقعات نکاح پر غور کرے۔ اس کے بعد یہ تسلیم کرنے میں کوئی محل شک باقی نہیں رہتا، کہ مذکورۂ بالا رواج تمام قبائل عرب میں رائج نہیں تھا، بلکہ صرف چند قبیلوں میں منحصر تھا۔[1]

مصنفین عرب کی تحریروں سے اس کا ثبوت ملتا ہے۔ چنانچہ شہرستانی لکھتا ہے کہ:—

"ایک بیوہ عورت پر اسکے شوہر متوفی کے بڑے بیٹے کو سب سے زیادہ حق حاصل ہوتا تھا"[2]

لیکن اسی جگہ شہرستانی نے یہ بھی لکھا ہے کہ:—

"عرب زمانۂ جاہلیت میں اُس شخص کو بہت بُرا سمجھتے تھے، جو اپنے باپ کی بیوہ سے نکاح کرتا، جو شخص اس نکاح کا مرتکب ہوتا اُسکو "ضیزن" کہتے تھے"[3]

[1] اِس بات کو سب جانتے ہیں کہ قرآن نے عورتوں کو بعد انقضاء عدت نکاح ثانی کی اجازت دی ہے۔ اور ترمذی کی ایک حدیث سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام سے پہلے بھی عرب میں عدت رائج تھی، جس کی مدت پورا ایک سال ہوتی تھی، شارع اسلام نے اُس مدت کو گھٹا کر چار مہینے دس روز کر دیئے، اور حاملہ کی عدت اُسکا وضع حمل قرار دی۔

ترمذی اِسی مقام پر زمانۂ جاہلیت کی عدت کو بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ:—

"جب عورت کا شوہر مر جاتا تو وہ ایک تنگ مکان میں گھس جاتی، نہایت خراب کپڑے پہنتی، نہ خوشبو لگاتی، نہ تیل کو ہاتھ لگاتی، جب ایک سال اسطرح گزر جاتا تو اُسکے پاس ایک جانور گدھا یا بکری یا پرندہ لایا جاتا، وہ اپنی شرمگاہ کو اُس جانور کے بدن سے رگڑ کر اپنی عدت توڑتی، اسکے بعد باہر نکلتی، اور اسکو اُونٹ کی ایک مینگنی دی جاتی، جسکو وہ خود اپنے ہاتھ سے پھینکتی، اور پھر خوشبو وغیرہ جو کچھ چاہتی لگاتی، اور اسطرح عدت سے نکلتی"

"اسلام میں عدت کے دس دن چار مہینے مقرر ہونیکے بعد ایک عورت اپنی بیوہ بیٹی کی عدت جلد ختم کرنیکی نسبت آنحضرت سے دریافت کرنے آئی، تو اُسوقت آپ نے بھی اپنے جواب میں زمانۂ جاہلیت کی اس رسم کیطرف ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے کہ "زمانۂ جاہلیت میں تو ایک سال گزرنے کے بعد تم میں سے کسی ایک عورت کو مینگنیاں پھینکنے کی نوبت آتی تھی، اور یہ تو صرف چار مہینے دس دن ہی ہیں"

[2] اس موقع پر شوہر کا بیٹا کہا گیا ہے اور بیوی کا بیٹا نہیں کہا گیا، اسلئے کہ زمانۂ جاہلیت میں حقیقی ماں سے جماع کرنا قطعاً ممنوع تھا، شہرستانی لکھتا ہے کہ: "عرب جاہلیت زناؤں سے نکاح کرتے تھے، اور نہ بیٹیوں اور پھوپھیوں سے" "کتاب الملل والنحل" للشہرستانی جلد دوم صفحہ ۲۴۴

[3] "کتاب الملل والنحل" صفحۂ مذکورۂ بالا، "تاریخ ابوالفداء" صفحہ ۱۸۰ مطبوعہ یورپ۔

ایک دوسرے شخص نے لکھا ہے کہ وہ اس نکاح کو "نکاح المقت" کہتے تھے۔ [له]

اگر ہم یہ تسلیم کر لیں کہ مذکورۂ بالا دستور عرب کے صرف چند قبائل میں شاذ و نادر مروج تھا، تو سب تناقض و اختلاف رفع ہو جاتا ہے، اور نکاح جاہلیت کے بارہ میں ہم نے جو کچھ لکھا ہے وہ ثابت ہو جاتا ہے۔[سه]

له پوکاک کی کتاب "نمونۂ تاریخ عرب" صفحہ ۳۲۵۔

سه برک ہارٹ نے اپنے سفرنامہ میں زمانۂ حال کے بدوؤں کی نسبت لکھا ہے کہ :۔

" جب کوئی عورت بیوہ ہو جاتی ہے تو اُسکے شوہر کا بھائی اُس سے شادی کرتا ہے۔ مگر ہاں اتنا ضرور ہے
" کہ عورت ازدواج کے اس بات پر مجبور نہیں کہ وہ اُسی مرد سے نکاح کرے، اور علی ہٰذا نہ مرد مجبور
" ہے کہ اُسی بیوہ سے نکاح کرے، اور نہ اُس کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے سوا دوسرے مرد کو اس عورت
" سے شادی کرنے دے، لیکن ایسا ہوتا بہت کم ہے کہ بیوہ اپنے متوفّٰی شوہر کے بھائی کی درخواست
" نکاح رد کر دیتی یا اُس ازدواج سے کچھ شرم کرتی ہو، اور اس سے غرض یہ ہوتی ہے کہ خاندان کا مال
" و دولت خاندان ہی میں محفوظ رہے"۔

اس بات پر ہر شخص غور کر سکتا ہے کہ اس رسم میں اور بیواؤں کا وارث بننے میں (جس کا ذکر متن میں کیا گیا ہے) کسقدر فرق عظیم ہے، اس لئے کہ بیوائیں صورت آخر الذکر میں متوفّٰی کا مال و متاع سمجھی جاتی تھیں اور جس شخص کو حقِ وراثت پہنچتا تھا وہ بلا کسی مزاحمت کے اُن کا بھی وارث ہوتا تھا۔

اس آخری بیان سے اس امر پر روشنی پڑتی ہے کہ عربوں کے رسم و رواج ہر شہر میں یکساں نہیں تھے، شہروں کے رہنے والوں کے اور اخلاق و عادات ہیں، اور باشندگانِ قریٰ و دیہات کے دوسرے، اور بلاشبہ اسی اختلافِ عادات و رسوم پر اس اختلافِ بیانی کی بنیاد ہے جو عرب جاہلیت کے بیان میں مصنفانِ عرب میں نظر آتی ہے۔

چونکہ ایک ذکر سے دوسرا ذکر چھڑ جایا کرتا ہے، لہٰذا اس جگہ اسی قسم کی ایک اور مثال لکھی جاتی ہے کہ :۔

شریعت اسلامی جمع بین الاختین کو حرام ٹھیراتی ہے، جیسا کہ سورۂ نساء کی آیت ۲۷ میں حکم دیا گیا ہے۔ اور شہرستانی کے بیان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ عرب جاہلیت بھی اس رسم کو برا سمجھتے تھے۔ اُس کے

خلاصۂ ماسبق۔ اس مضمون کے آخری صفحوں میں ہم نے جو کچھ لکھا ہے اُس کا خلاصہ یہ ہے کہ: عرب جاہلیت کے "دورِ ابوۃ" میں "نکاح خارجی" کے رواج کی وجہ سے "نکاح بصورتِ بیع" کی بنیاد پڑی۔ برخلاف اس کے "نکاح اختیاری" کی بنیاد اُسوقت پڑی جب کہ "نکاح داخلی" جانبین کی رضا و محبت سے ہوا کرتا تھا۔

الفاظ یہ ہیں کہ:۔

" وہ جمع بین الاختین کو نہایت مذموم سمجھتے تھے"

" لیکن خود شہرستانی تھوڑی دُور آگے چل کر لکھتا ہے کہ:۔

" قریش میں سب سے پہلے جس شخص نے دو بہنوں سے ایک ساتھ شادی کی وہ ابو احیحۃ سعید بن العاص

" تھا، جس نے مغیرہ بن عبداللہ بن عمرو بن مخزوم کی دونوں بیٹیوں ہندہ اور صفیہ کو ایک ہی وقت

" میں اپنی بیوی بنایا تھا"

اِس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ بزمانۂ جاہلیت تمام قبائل عرب میں یہ رسم جاری نہیں تھی۔

اسی قسم کی ایک دوسری نظیر ابو اسمٰعیل بصری کی کتاب "فتوح الشام" میں ملتی ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ:۔

" ایک اعرابی نے دو بہنوں سے شادی کی، حضرت عمرؓ کو بھی اس کی خبر پہنچی۔ اُنھوں نے اعرابی

" کو بُلا کر کہا کہ "مذہبِ اسلام تیری اس حرکت کو حرام ٹھیراتا ہے" اعرابی نے کہا "مجھے بالکل اس کی خبر

" نہیں، اور نہ یہ بات میری سمجھ میں آتی ہے کہ آپ جس چیز پر مجھے ملامت کر رہے ہیں، مذہب اُس کی

" ممانعت کرتا ہو" خلیفہ نے کہا کہ "شریعت نے اس فعل کو حرام قرار دیا ہے، جا اور اسیوقت دونوں

" میں سے ایک بیوی کو طلاق دے، ورنہ تیرا سر قلم کیا جائیگا" اعرابی نے کہا، کیا جو کچھ آپ کہتے

" ہیں وہ صحیح ہے؟" خلیفہ نے جواب دیا کہ "ہاں صحیح ہے"

" اس پر اعرابی بولا کہ "واللہ میں اُس دین کو بُرا سمجھتا ہوں جو ایسے امور کو منع کرتا ہو، اور جس سے مجھکو

" ادنیٰ فائدہ بھی نہ پہنچتا ہو" "دوزی کی "تاریخ مسلمانانِ اسپین" جلد اوّل صفحہ ۳۶ - ۳۷

جب اس قسم کے شواہد ملتے ہیں تو پھر کچھ شک باقی نہیں رہتا، کہ زمانۂ جاہلیت میں جمع بین الاختین کا رواج عام نہیں تھا، جیسا کہ خود قرآن کی اس آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ:۔

یہاں سے یہ بات بھی صاف روشن ہو جاتی ہے کہ مہر "نکاح بیع" کے علاوہ دوسری صورتوں میں بجائے قیمت کے نہیں ہوتا تھا کہ جو مرد کو بیوی کے معاوضے میں اُس کے اولیار کو دینا پڑتی ہو۔ بلکہ اُس زمانے میں مہر کی وُہی حالت تھی جیسا کہ ہم آج تک اسلام میں متعہ و نکاح میں دیکھتے ہیں۔ یعنی مہر ایک ہدیہ ہے کہ جو مرد عورت سے فائدہ اُٹھانے کے معاوضے میں اُس کو دیتا ہے۔

" حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ . . . وَاَنْ تَجْمَعُوا بَيْنَ الْاُخْتَيْنِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ "۔

" (سورۂ نسار آیت ۲۷۔) یعنی ظہورِ اسلام سے پہلے جن لوگوں نے جمع بین الاختین کیا اُن پر اس

" حکم کا کچھ اثر نہیں "

ہم نے اپنے حتّی المقدور عرب جاہلیت کے اخلاق و عادات اور رسم و رواج کے اختلاف دتبائن پر دلائل و شواہد جمع کر دیے ہیں، اسی پر ہم اکتفا کرتے ہیں۔ اور مذہبی بحث میں ہاتھ نہیں ڈالتے۔

محمد اختر۔ از حیدر آباد دکن۔

# اُردو کے چند لفظوں کا اشتقاق

آج کل یہ مسئلہ تو باعتبار بداہت اُقلیدس کے اُصولِ موضوعہ کے مرتبہ کو پہنچ گیا ہے کہ ہر ایک شائستہ قوم کو جسطرح اور علوم و فنون میں ترقی کرنا ضروری ہے اُسیطرح اپنی زبان کی تہذیب و توسیع بھی اُسکا فرض ہے، بلکہ جیسا پروفیسر میکس ملر اور دیگر ماہرانِ فلسفۂ لسان نے بدلائل و براہین ثابت کر دیا ہے۔ وُسعتِ خیال و وسعتِ زبان لازم و ملزوم ہیں، یعنی ایک کا وجود بغیر دوسرے کے ناممکن ہے۔ نہایت خوشی کی بات ہے کہ ہماری زبانِ اُردو کی درستی کا بھی اکثر روشن دماغ بہی خواہانِ قوم کو ایک عرصے سے خیال ہو گیا ہے۔ بلکہ اکثر بزرگوں نے اس خیال کے پورا کرنے کی کوشش بھی کی، اور اس میں ایک حد تک کامیابی بھی ہوئی۔ بے شک زمانۂ حال کے بعض لائق مصنفوں نے اُردو کو بہت کچھ جِلا دی ہے اور لغت کے دائرے کو وسیع کیا ہے۔ میں یہاں ان اُردو پر احسان کرنے والے اصحاب کے اسمائے گرامی تحریر کرنا مناسب نہیں سمجھتا کیونکہ میرے خیال میں اس تعریف کے

بہت ہی تھوڑے حضرات مستحق ہیں ممکن ہے کہ ناظرین کے خزانۂ ذہن میں یہ گرانمایہ گوہر زیادہ ہوں۔

مجکو اُردو کی شاعری پر محاکمہ نہیں لکھنا ہے کہ سخن آفرینانِ دہلی کو خوش گفتارانِ لکھنؤ پر، یا شیرین مقالانِ لکھنؤ کو نازک خیالانِ دہلی پر ترجیح دینے کی ضرورت ہو۔ اہلِ ہندوستان و پنجاب کے تخیل و لہجہ کی ناگوار بحث چھیڑنی پڑے یا نیچرل اور مصنوعی شاعری کی حمایت میں دلشکن اور آدابِ مناظرہ کے مخالف الفاظ لکھنے کی احتیاج ہو۔ میرا اصلی تقریر تو صرف اتنا ہے کہ گو زبانِ اُردو کو اس عصر کے ذی علم مصنفوں کی تصنیفات سے فائدہ ضرور ہوا ہے، لیکن غور سے دیکھا جائے تو دوسری زبانوں سے الفاظ عاریت لینے اور بیان کے نئے طرز ایجاد کرنے کی حد سے نہیں بڑھا ہے یا دوسرے لفظوں میں زبان کی توسیع کسیقدر ہوئی ہے مگر تہذیب کی جانب بالکل توجہ نہیں کیگئی۔ اگر کسی شخص کا مقصود ایک عالیشان عمارت بنانا ہو، اور وہ صرف لکڑی، پتھر، مصالحہ وغیرہ جمع کرتا چلا جائے۔ تو کیا محض ان چیزوں کے اجتماع سے اُس کے حسبِ منشا عمارت تیار ہو جائیگی۔ اُس کی حصولِ غرض کے لئے ان مادیات کا اجتماع جتنا ضروری ہے، اُتنا ہی بلکہ اُس سے کہیں زیادہ صورتِ عمارت کے لحاظ سے ان چیزوں کا ترتیب سے جمانا ضروری ہوگا۔ عمارتِ اُردو کیواسطے بھی ابتک ان مادیات کے اجتماع ہی کی کوشش کی گئی ہے، نہ اُن اشیا کی اصل ماہیت دریافت کرنے کا اب تک خیال ہوا ہے، نہ اُن کی تقسیم کا، نہ اُن اوضاع کا جو عمارت کا جز بننے سے پہلے اُن کو اختیار کرنی چاہئیں، یعنی نہ تو اُردو کا کوئی لُغت ہی ایسا لکھا گیا جس سے الفاظ کا اشتقاق معلوم ہو سکے۔ نہ ایسی کتابیں ہی تصنیف ہوئیں، کہ جن سے قصہ طلب لفظوں کی اور ایسے لفظوں کی تاریخ کا پتہ چلے جن کے معنی اور صورت میں زمانے کے دستِ زبردست نے وقتاً فوقتاً تغیر پیدا کرکے اُن کو کچھ کا کچھ کر دیا ہے۔ اِس سے بھی زیادہ افسوس کی بات یہ ہے کہ آج تک اُردو کے قواعد صرف و نحو بھی منضبط نہیں ہوئے۔ مجھے خوف ہے کہ میرے آخری جملے کی تردید میں ناظرین کے حافظے نے اُردو کی بہت سی کتب صرف و نحو کے نام پیش کر دیے ہونگے۔ اِس میں شک نہیں کہ اِن کتابوں کے نام تو یہی ظاہر کرتے ہیں کہ اُردو کی صرف و نحو کی کتابیں ہیں لیکن درحقیقت اِن میں

عربی و فارسی کے قواعد سند ہیں، اور انھیں زبانوں پر صادق آتے ہیں۔ اُردو کے قواعد یہ اب تک صرف اس غلطی کی وجہ سے سمجھے گئے کہ اُردو کے ساتھ ان کی کبھی غور سے تطبیق ہی نہیں کی گئی، ورنہ یہ کبھی کے دعوے کی ٹٹی ثابت ہو گئے ہوتے، اُردو گرامر کی ہم کو عربی و فارسی کی صرف و نحو سے ہرگز توقع نہ کرنی چاہیئے۔ ہماری زبان کی بنیاد پراکرت پر رکھی گئی ہے، اسلئے اُردو کی گرامر کا بھی ہم کو اُسی کی ویاکرن میں پتہ لگ سکتا ہے، یا بالواسطہ اُن زبانوں کی ویاکرن سے جو اُردو کی طرح پراکرت سے نکلی ہیں۔ اگرچہ میرے مضمون کو اُردو کی گرامر سے چنداں سروکار نہیں ہے، تاہم بیجا نہ ہوگا اگر اپنے دعوے کے ثبوت میں قواعد اُردو کی زبان اُردو کے ساتھ عدم تطبیق کی ایک مثال بیان کر دی جائے۔ عربی اور فارسی میں اسم کی تین حالتیں مانی گئی ہیں۔ رفعی یا فاعلی، نصبی یا مفعولی، جرّی یا اضافی، اُردو کے قواعد بنانیوالوں نے بھی عربی و فارسی کا تتبع کر کے یہی تین حالتیں قرار دیں۔ اب اس جملے میں کہ "زید کو بالکل فرصت نہیں ہے" ذرا غور فرمائیے کہ زید اور فرصت کی کونسی حالت ہے باعتبارِ الفاظ تو زید مفعول اور فرصت فاعل معلوم ہوتا ہے حالانکہ فعل لازمی ہے، اور باعتبارِ معنی زید فاعل اور فرصت مفعول ہے۔ اس نکتے کا حل مرہٹی کی ویاکرن میں موجود ہے۔ یہاں بخوفِ طوالت ایک ہی مثال پر اکتفا کیا جاتا ہے ورنہ ایسی مثالیں بے تعداد ہیں۔ مشتے نمونہ از خروارے

اب میں اس طولانی بحث سے قطع نظر کر کے اُردو کے چند الفاظ کا ماخذ بتلا کر علمِ اشتقاق کی دلچسپیاں دکھلانا چاہتا ہوں۔ منشا صرف اتنا ہے کہ شاید اس ذریعے سے ذی علم اشخاص کی توجہ اس طرف مبذول ہو، اور اُردو میں بھی مثل انگریزی کے لغات کے کوئی لغت مدوّن ہو جائے۔ اِن الفاظ میں سے صرف شرح طلب لفظوں کے معنی بیان ہونگے ورنہ اُن کی مختلف اشکال پر قناعت کیجائیگی۔ اور ذیل کے اشارات سے کام لیا جائیگا۔

ف سے فارسی۔ پہ سے پہلوی۔ ژ سے ژند۔ پ سے پراکرت۔ اور س سے سنسکرت مراد ہے۔

## الفاظِ اردو۔

ان- پہ آن- ژ انی- س انی (بمعنی دیگر وغیرہ)

اندر- ف در- پہ اندر- ژ انتر- س انتر-

ایک- ف یک- پہ ای وک- ژ ایو- س ایک-

اوپر- ف بر- پہ اپر- ژ اوپری- س اوپری-

بہرا- پ بہرو (مجہول)- س بدہر-

پاؤں- پہ پاد- س پد

پچاس- پہ پنجاہ- ژ پنچاست-

پیدا- پہ پذتاک- ژ پی تاک- س اُت پد-

ترسا (نصرانی) پہ ترس اک- ترس بمعنی خوف اک سفید بمعنی اسم فاعل-

تلاؤ- پ تلار (غنّہ)- ف تالار-

جواں- پ جووَن- س یووَن- ژ یوَن-

خود- پہ کہوت- ژ سووَت- س سوتن-

خندق- معرب کندہ- پہ کن (کھودنا) س کہن (کھودنا)

دس- ف دہ- ژ دس-

دشمن- پہ دشمن- ژ دش مینو (دش بمعنی بد+ مینو بمعنی دل یا دماغ)

دشنام- ژ دش بمعنی بد-

داماد- پہ داماد- ژ داتر- س داتر (ماخوذ از دا بمعنی دادن)

دیوانہ- پہ دیو (بمعنی جن)+ آنہ کلمہ نسبت-

سدیاصد- ژ ست- س شت-

سات- ف ہفت- ژ ہپت-

## الفاظ اردو۔

سوار۔ پہ اسوار۔ ژ اسوبار۔ س اسووار (اسو بمعنی اسپ اور وار کلمۂ نسبت)

سپہبد (جنرل) پہ سپہ پت۔ ژ سپادپتی (سپہ بمعنی فوج اور بد پت یا پتی بمعنی مالک جیسے لفظ سنسکرت سیناپتی میں)

سگھڑ۔ س سُ بمعنی خوب ضد کُ بمعنی بد جیسے کُڈھب میں۔

سخت۔ س شکت۔

سفید۔ س شویت (یاے مجہول)

سرشت۔ س سرشٹی (یای معروف قصیر)

سونا۔ ف زر۔ س سوورن۔

شرم۔ س شرم بمعنی تنگ آمدن ماندن

شغال۔ س شوگال (واو معروف)

شاخ۔ س شاکھا۔

شارک۔ (مینا) س شک۔

کوک۔ پہ کوتک۔ ژ کتک۔

کنیز۔ پہ کنیچ۔ ژ کنی اچ۔ س کنی (کنی بمعنی صبیہ اور اچ کلمۂ تصغیر ہے جسکو فارسی میں چہ۔ ک اور ایز سے بدلا گیا ہے)

## الفاظ اردو۔

گیس۔ (بال) ف گیسو۔

کال (قحط) س کال (وقت یا وقت بد)

ماپ۔ س ما (ناپنا۔ پیمانہ کرنا)

مکھی۔ ف مگس۔ ژ مکشی۔ س مکشی۔

ماہی۔ س متسی۔

مور۔ (طاؤس) س میُر۔

مادر۔ س ماتر۔

مرغزار۔ س مرگ بمعنی آہو۔

میغ۔ س میگہ۔

ناب۔ (خالص) پہ ان آب (ان کلمۂ نفی اور آب بمعنی ماء یعنی وہ چیز جس میں پانی کا میل نہو)

نوشیرواں۔ پہ ان اوشین واں (صاحب روح غیر ہالک)

نماز۔ س نمر (خمیدن)

نیرا۔ س نیتر۔

ہونا۔ س بھو۔ پ ہو۔ ژ بو۔

ہر ایک۔ پہ ہر۔ ژ ہورو۔ س سرو۔

ہاتھ۔ ف دست۔ س ہست۔

چونکہ الفاظ بے تعداد ہیں، اور مضمون نہایت روکھا پھیکا ہے اسلئے اب تخفیفِ تصدیع چاہتا ہوں۔ اگر ناظرین میں کسی صاحب نے دلچسپی ظاہر کی تو یہ سوکھے ٹکڑے اُن کی دعوت کے لئے بیم منتقلی کے دسترخوان پر چُن دیے جائینگے۔

نیاز مندِ ازلی۔ فدا علی۔

# کیا قومی ترقی میں علی گڈھ ہمارا رہنما ہو سکتا ہے؟

---

سید کے انتقال کے بعد جب اکابر قوم نے اُن کی یادگار قائم کرنے کے متعلق غور کرنا شروع کیا تو قریب قریب سب نے متفق الرائے ہو کر یہ فیصلہ کیا کہ مرحوم کی یادگار اس سے بہتر کوئی نہیں ہو سکتی کہ جس کام کو اُس نے شروع کیا، اور جس پر اُس نے اپنی عمر، وقت اور روپے کا بہت بڑا حصہ صرف کر دیا اُسکو درجۂ تکمیل تک پہنچا دیا جائے۔ چنانچہ محمڈن یونیورسٹی کی تجویز کا تمام ہندوستان کے مسلمانوں نے اسقدر جوش و خروش کیسا تھ خیر مقدم کیا، گویا یونیورسٹی بن گئی، اور قوم کے بچوں نے ڈگریاں اور سرٹیفکیٹ حاصل کرنے شروع کر دیے۔ مسٹر جسٹس بدرالدین سے لیکر نواب سید حسین بلگرامی تک ہر مذاق اور ہر خیال کے سر برآوردہ مسلمانوں نے محمڈن یونیورسٹی کی ضرورت اور اس تجویز کی تائید میں مضامین اور رسائل لکھ لکھ کر ایک اچھا خاصہ محمڈن یونیورسٹی لٹریچر پیدا کر دیا۔ مگر اس سے غالباً کسیکو انکار نہیں ہو سکتا کہ ان چھ برس کے عرصے میں اس خیال کی ہر دلعزیزی بلکہ پسندیدگی میں بھی ایک تغیر واقع ہوا ہے۔ کچھ عرصے سے ہم بعض مقامات سے اس خیال کی تردید بلکہ مخالفت دبی ہوئی مگر صاف آوازوں میں سن رہے ہیں۔ مسلمانوں میں ایک جماعت ایسی پیدا ہو گئی ہے، جو انصافاً یا غیر منصفانہ محمڈن یونیورسٹی کے خیال میں مسلمانوں کی بہتری اور فلاح نہیں سمجھتے۔ یہی نہیں بلکہ قومی ترقی کے معاملات میں وہ علی گڈھ کو وہ رتبہ اور درجہ نہیں دیتے جو سر سید کی عین حیات میں اس کو فی الواقعی حاصل تھا، اور سید کے انتقال کے بعد بعض لوگوں کی رائے میں اسکو اب بھی حاصل ہے۔ مثلاً اکثر لوگ جانتے ہیں کہ پولیٹکل اور سوسائٹی میں بعض مسلمانوں کو علی گڈھ والوں کے قدم بقدم

چلنے میں مائل ہے۔ بلکہ تعلیمی معاملات میں بھی ایک جماعت علیگڈھ کو رہنما تصور نہیں کرتی۔ اُن کے نزدیک علیگڈھ ممالکِ متحدہ، یا بہت سے بہت شمالی ہند کے مسلمانوں کا تعلیمگاہ ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ علیگڈھ کالج تمام ہندوستان کے مسلمانوں کی ضروریات کے لئے نہ مکتفی ہے اور نہ کبھی ہو سکتا ہے۔ اسلئے یہ لوگ چاہتے ہیں کہ علی گڈہ کالج کو زیادہ سے زیادہ شمالی ہندوستان کے لئے محدود کر کے ہر صوبہ کے مسلمان صرف اپنے مقامی تعلیمگاہوں کی مدد کریں اور اپنے تمام ذرائع کو مقامی کوششوں تک محدود رکھیں ممکن ہے کہ بعض لوگ میری تحریر کو بھی طرفداری اور خود غرضی پر محمول کریں مگر میں اپنے دلی خیالات کو ظاہر کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اِس مضمون میں، میں اُس جماعت کے خیالات کو ظاہر کرنا چاہتا ہوں، جو علیگڈھ کو مسلمانوں کی قومی ترقی کا مرکز اور ہر قسم کی اصلاح اور تجاویزِ فلاح کا منبع خیال کرتے ہیں۔ جو نہ صرف تعلیمی معاملات میں، بلکہ پولیٹیکل، سوشل، لٹریری، یہاں تک کہ مذہب میں بھی علی گڈہ کو اپنا رہنما اور ہادی تصور کرتے ہیں۔ جو ہر ایک ایسے مسئلے پر جو مسلمانوں کے متعلق ہو، اسے قائم کرنے سے پہلے علی گڈہ سے استصواب کرنا اپنا فرض خیال کرتے ہیں، جنکو نہ صرف امید بلکہ یقین ہے کہ عنقریب علی گڈہ امپیریل علی گڈہ ہو کر کم از کم ہندوستان کی اسلامی دنیا کا مرکز، ملجا و ماوی ہوگا یہ کوئی "بہ مرگش بگیر تا بہ تپ راضی شود" پالیسی نہیں، بلکہ یہ رائے موجودہ حالات، امکانات اور ہندوستان* کے دیگر مقامات کے مسلمانوں کی حالت کا مطالعہ کرنے کے بعد قائم کی گئی ہے علی گڈہ سے "تعمیم تعلیم" کی پکار سُنکے سُنتے میرا اس امر کی طرف توجہ دلانا کہ مسلمانوں کی اولی ضرورت تعلیم ہے شاید بارِ خاطر ہو مگر اول تو مسلمان مسلمان ہی ہیں (اور میرا روئے سخن بالکل مسلمانوں سے ہے) اور دوسرے اِس مضمون پر بطریقِ احسن بحث کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ناظرین کی توجہ پھر ایک مرتبہ سرسید کی اُس پالیسی کی طرف منعطف کی جائے جو اُنہے برسوں کے غور و فکر کے بعد اختیار کی تھی، اور جسکو وہ چاہتا تھا کہ جمہور مسلمان اختیار کریں، وہ پالیسی یہی تھی کہ اپنے

---

* شاید یہ لکھنا غیر مناسب نہ ہوگا کہ راقم کو ہندوستان کے مختلف حصوں میں سفر کرنے اور وہاں کے مسلمانوں کی حالت کا اندازہ کرنے کا کئی مرتبہ موقع ملا ہے۔

اپنے ادبار اپنے افلاس اور اپنی کمزوری کا خیال کر کے مسلمانوں کو لازم ہے کہ ایک عرصۂ قید از تک وہ تعلیم اور صرف تعلیم کو اپنی نجات اور فلاح کا ذریعہ خیال کریں۔ اُسنے اپنی مدت العمر کی کوششوں سے مسلمانوں پر ثابت کر دیا تھا کہ اُن کو اگر کسی چیز کی ضرورت ہے تو وہ تعلیم ہے۔ اگر کوئی چیز اُن کو پھر سرسبز اور خوشحال کر سکتی ہے تو وہ تعلیم ہے۔ اُن کے ہر مرض کی دوا تعلیم۔ اور اُن کی ہر ضرورت ہر کمی، اور ہر نقص کو پورا کرنے والی تعلیم ہے۔ الغرض یہی وہ افسوں ہے جو اُن کی موجودہ پستی اور نکبت کے طلسم کو توڑ سکتا ہے۔ سرسید کی حینِ حیات تک سب نے اسکو تسلیم کیا اور ہمکو تعجب ہو گا اگر سرسید کے انتقال کے بعد چھ برس کے اندر ہی مسلمانوں کی حالت میں اسقدر تغیر ہو گیا کہ اس پالیسی کو بدلنے یا اس میں کچھ رد و بدل کرنے کی ضرورت واقع ہو گئی ہو۔

تاہم چونکہ اس مضمون میں میں امور متعلقہ قومی ترقی پر نہایت وسعت کے ساتھ بحث کرنا چاہتا ہوں اسلئے اتمامِ حجت کے لئے میں یہ تسلیم کئے لیتا ہوں کہ صرف تعلیم قومی ترقی کے لئے کافی نہیں یعنی تعلیم کے علاوہ اور بھی بہت سی ایسی چیزیں ہیں، جنکو قومی ترقی کا جزو خیال کرنا چاہیے۔ سرسید (جو اب بھی مسلمانوں کا سب سے بڑا ریفارمر تسلیم کیا جاتا ہے) کی زندگی کے اسقدر مختلف پہلو تھے کہ امورِ متعلقۂ قومی ترقی کے اس وسیع مفہوم پر بھی ہمکو مرحوم کی رائے اور اسکی پالیسی کی طرف متوجہ ہونا پڑتا ہے۔

اب لازم ہے کہ ہم امور متعلقہ قومی ترقی کی تشریح کریں، یعنی بتائیں کہ اس زمانے میں ہماری قومی ترقی کن چیزوں پر مبنی ہے۔ وہ اجزا یا اسباب مفصلۂ ذیل ہیں:—

(۱) علوم مغربی کی تعلیم، اور اپنے علم و ادب کی حفاظت۔ (۲) پالٹیکس۔ (۳) سوسائٹی۔ (۴) مذہب۔ (۵) قومیت کا خیال۔

اب میں ثابت کرونگا کہ قومی ترقی کے لئے مسلمانانِ ہند ان پانچوں امور میں علی گڈھ کے صلاح و مشورہ، بلکہ علی گڈھ کی رہنمائی اور ہدایت کے محتاج ہیں۔

تعلیمی معاملات میں خواہ اسوجہ سے کہ سب سے اول علی گڈہ والوں نے ہی علوم مغربی کی طرف

مسلمانوں کو متوجہ کیا خواہ اس وجہ سے کہ ایک ربع صدی سے زیادہ عرصہ اُن کو اس دشت کی سیاحی کرتے گذرا اور اس میدان کے دشوار گذار رستوں اور اونچ نیچ سے واقفیت حاصل کی۔ خواہ اس وجہ سے کہ وقتاً فوقتاً پبلک اور گورنمنٹ سے اپنی کوششوں اور کامیابیوں کا اعتراف کرایا۔ الغرض خواہ کسی وجہ سے ہو، علی گڈہ کو تعلیمی معاملات میں کم و بیش وہی رتبہ حاصل ہے جو ایک وسطی انسٹیٹیوشن کو حاصل ہو سکتا ہے۔ لوگ محمڈن یونیورسٹی کی مخالفت کریں۔ نئے نئے کالج اور نئے نئے مدرسوں کی بنا ڈالیں۔ مقامی ضروریات کو امپیریل ضروریات پر ترجیح دیکر علیگڈہ کے اثر اور رسوخ کو کم کرنے کی کوشش کریں۔ باایںہمہ جو وقعت اور عزت اسوقت علی گڈہ کالج اور اسکے بورڈنگ ہوس کی قائم ہوگئی ہے، اسکو ہمارے مخالفین بھی نظرانداز نہیں کر سکتے۔ اگر کوئی شخص اپنے بچوں کو عمدہ تعلیم اور تربیت دینا چاہتا ہے، تو اپنے آپ سے علحدگی اور بچوں کی تعلیمگاہ کی دوری و درازی مسافت بھی اسکو علی گڈہ کے انتخاب کرنے سے روک نہیں سکتی۔ گو اسوقت بھی علی گڈہ کالج اور اسکول پنجاب، بنگال، بمبئی، مدراس، اور وسط ہند وغیرہ کے طلبا سے پُر ہے، تاہم کون نہیں جانتا کہ آئے دن ہم کو محض جگہ کی قلت کی وجہ سے بہت سے لڑکوں کو داخل کرنے سے انکار کرنا پڑتا ہے۔ کون نہیں کہہ سکتا کہ اگر جگہ کافی ہوتی تو علی گڈہ کالج اور اسکول کہاں سے کہاں تک پہنچ جاتا

ہم تسلیم کرتے ہیں کہ دیگر صوبجات کے مسلمان بہت سا روپیہ اکٹھا کرلینگے اور بہت سے کالجوں، اور اسکولوں کی عمارتیں کھڑی کردینگے مگر کیا تعلیم قوم کے یہی معنی ہیں، کہ مسلمانوں کے بہت سے کالج ہوں، اُن کے پاس بہت سا روپیہ ہو، اور بس قوم تعلیم یافتہ ہوگئی۔ جوناگڈہ میں جو مغربی ہندوستان کی ایک بہت بڑی اسلامی ریاست ہے، ایک کالج موسوم بہ "بہاوالدین کالج" ہے مگر کسقدر مسلمان اس عظیم الشان کالج سے تعلیم یافتہ ہوکر نکلے۔ اور بھی کئی مقامات پر مسلمانوں کے کالج ہیں یا ہو سکتے ہیں۔ مگر یہ دیکھنا چاہیے کہ قوم کی تعلیم میں انھوں نے کتنا حصہ لیا۔

کالج اور تعلیمگاہیں صرف روپیہ سے بلکہ صرف طلبا کی کثرت سے بھی قومی ترقی کا جزو نہیں

ہوسکتیں - روپیہ بڑی بڑی عالیشان عمارتیں بنا سکتا ہے - طلبا کی کثرت کالج کی آمدنی کو بڑھا سکتی ہے مگر یہ تمام جسم بغیر رُوح ہوگا جب تک کہ کالج کی آب ہوا، کالج کی زندگی الغرض اس دُنیا میں وہ چیز پیدا نہ ہو جسکو اسپرٹ ڈیمی کور کہتے ہیں - ڈگریاں حاصل کر لینے سے کوئی شخص تعلیم یافتہ (قومی ترقی کا جزو) نہیں کہلایا جا سکتا جب تک کہ اُسکے دل میں قومی محبت اور قومی ترقی کی ضرورت کا احساس نہو جو نتیجہ ہوگا نہ کلاس روم کے لکچروں کا اور نہ یونیورسٹی کی سندوں کا بلکہ رُوح کالج کے اکتساب کرنیکا اور کسی انسٹیٹیوشن میں یہ رُوح پیدا ہونا برس برس کا کام نہیں بلکہ مدتوں کی کشمکش اور تغیر و تبدل کا -

یہ خودستائی نہیں بلکہ امر واقعی کا بیان کرنا ہے کہ یہ رُوح جس طریقے سے علی گڈہ کالج کی آب ہوا میں پیدا ہو چکی اور جو مفید نتائج اس کے ظاہر ہو چکے ہیں وہ ممکن نہیں کہ مسلمانوں کی کسی دوسری درسگاہ میں (خواہ اسپر کتنا ہی روپیہ کیوں نہ خرچ کیا جائے) پیدا ہو سکے - جب تک تعلیم قومی ترقی کا جزو خیال کیجائیگی، اور جب تک مسلمان اس ضرورت کو محسوس کرینگے، تب تک علیگڈہ اس قسم کی تعلیم کا مرکز اور دیگر درسگاہوں کا معلم خیال کیا جائیگا - اور تعلیم کے خواہشمندوں کو علی گڈہ کے تجربہ، علی گڈہ کے سامان اور علی گڈہ کی رُوح کا دست نگر رہنا ہوگا -

اس ضمن میں ایک اور نہایت ضروری سوال پیدا ہوتا ہے - تعلیم سے ہمنے ابتک محض تعلیم ذکور مراد لی تھی - اب اگر علی گڈہ کو قومی تعلیم کا مرکز خیال کیا جاتا ہے اور تعلیم سے مراد صرف تعلیم ذکور ہی نہیں، بلکہ تعلیم اناث بھی لینا چاہیئے تو کیا یہ کہنا درست ہے کہ علی گڈہ ہی تعلیم نسواں کا بھی مرکز ہوگا - مجکو یاد ہے کہ گذشتہ سال جب علی گڈہ میں ایک گرل اسکول قائم کرنے کی تجویز شائع ہوئی تھی تو اکثر اصحاب نے محض اس وجہ سے اس تجویز کی مخالفت کی تھی کہ تعلیم اناث اور تعلیم ذکور کے مختلف مرکز ہونے چاہئیں - اگر علی گڈہ تعلیم ذکور کا مرکز ہے تو لاہور یا کوئی اور مقام تعلیم اناث کا مرکز ہونا چاہیئے - جہانتک میں خیال کرتا ہوں علی گڈہ میں گرل اسکول قائم ہونے کی مخالفت قریباً اس مخالفت سے ملتی ہے، جو عوام نے ۱۸۶۲ء میں مسلمانوں کے لئے ایک انگریزی سکول قائم کئے جانے پر کی تھی، مگر انگریزی سکول قائم کرنیوالا سید سا دلیر اور پکے ارادے کا آدمی تھا مجکو

یقین ہے کہ اگر کوئی بزرگ قوم ایک محمڈن گرل اسکول کی ضرورت کو سمجھ کر پکا ارادہ کرے کہ علی گڈھ میں ایک گرل اسکول قائم ہونا چاہئے تو کچھ عرصہ کے بعد اس خیال کی مخالفت بھی جاتی رہیگی۔

اگر علی گڈھ کو تعلیمی معاملات میں کچھ تجربہ حاصل ہے، اگر وہ اس پیچیدہ مسئلے کو حل کر سکتا ہے تو کیا وجہ ہے کہ علی گڈھ کو پوری طرح تعلیم مسلمانان کا مرکز نہ بنایا جائے۔ علی گڈھ والے کالج کے اندرونی حالات میں ہر موقعہ پر دخل نہیں دیتے۔ اس کارخانے کے انجنیر مختلف مشینوں کے ہر ایک کل و پرزہ کو جا کر نہیں دیکھتے، مگر انکو ہر ایک کل اور پرزہ کا استعمال اچھی طرح معلوم ہے اُن کا کام اپنے ماتحتوں کو اُن کا استعمال سکھانا اور اُن سے کام لینا ہے۔ حقیقت امر یہ ہے کہ جو تجربہ علی گڈھ کو تعلیمی امور میں حاصل ہے، جو سامان علی گڈھ والوں نے برسوں کی محنت اور کوشش سے یہاں پیدا کر لیا ہے وہ کسی اور جگہ مہیا ہونا ناممکن ہے۔ علی گڈھ اور تعلیم مترادف خیال کئے جانے لگے ہیں۔ علی گڈھ کی آب و ہوا، علی گڈھ کی سرزمین، علی گڈھ کی خاک سے بھی تعلیم، قومی تعلیم کی بو آتی ہے۔ پھر علی گڈھ کے ہوتے کونسا شہر تعلیمی معاملات میں رہنمائی کا دعوے کر سکتا ہے۔

کیا کیمبرج میں جرٹن اور نیون ہیم دو کالج تعلیم اناث کے لئے مخصوص نہیں؟ اسلئے اگر علیگڈھ میں کالج سے تین چار میل کے فاصلے پر ایک گرل سکول مع بورڈنگ ہوس قائم کیا جائے تو کونسی انوکھی بات ہوگی۔ علی گڈھ گرل سکول کی مخالفت، تعلیم نسواں کی مخالفت اور علی گڈھ گرل سکول کے قائم کرنے میں دیر کرنا مسئلۂ تعلیم اناث کو معرض تعویق میں ڈال دینا ہے۔ یہ اسکول قائم ہوگا اور ضرور ہوگا۔ اور صرف علی گڈھ ہی میں قائم ہوگا۔ اگر موجودہ نسل قائم نہیں کر سکتی تو آیندہ نسل قائم کریگی یہ بات ہو کر رہیگی۔ اگر مسلمانوں کی کنسرویٹو طبیعت اسکے قائم کئے جانیکی مزاحم ہے تو ہو۔ دس بارہ برس میں اُن کو اپنی غلطی کا اعتراف کرنا پڑیگا۔ اُسوقت کف افسوس ملینگے۔ کہ شل انگریزی تعلیم کی مخالفت کے علی گڈھ گرل سکول کی مخالفت کر کے ہمنے تعلیم نسواں میں دیر کر دی۔

رہا اپنا علم و ادب، اس کی حفاظت اور اسکا فروغ، سو اسکے متعلق بھی میں یہی کہونگا کہ اس میدان میں سب سے پہلے علی گڈھ نے قدم رکھا، اور انشاء اللہ علی گڈھ اسکول ہی اس میں قوم کی

رہنمائی کریگا۔ علم و ادب سے میری مُراد عربی و فارسی کے علم و ادب سے نہیں، بلکہ اُردو لٹریچر سے ہے۔ میں جانتا ہوں کہ بہت سے مسلمان میرے اس خیال میں مجھ سے متفق نہ ہونگے۔ مگر میری تو یہی رائے ہے کہ قومی ترقی کے لئے ہمکو عربی و فارسی لٹریچر کی اسقدر ضرورت نہیں جسقدر کہ اُردو لٹریچر کی۔ لوگ کہینگے کہ اُردو لٹریچر ہی کیا ہے جسکی حفاظت قومی ترقی کا جزو خیال کیا ہے، بیشک ہمگر میں یہ چاہتا ہوں کہ تعلیم یافتہ مسلمان اُردو کو اپنی زبان سمجھیں اور اپنی کوششوں کا ایک حصہ اسکو وسیع اور ایک کلاسیکل زبان بنانے میں صرف کریں*۔ بنگالیوں اور مرہٹوں نے اپنی اپنی زبانوں کو گذشتہ دس بیس برس کے عرصے میں بہت کچھ وسعت دیدی ہے۔ کیوں بعض مسلمان اس کو اپنی زندگی کا مقصد قرار نہیں دیتے کہ زبان اُردو کو علوم مغربی کے ذخیرے سے مملو کیا جائے۔ سرسید، نذیر احمد، شبلی، حالی، وغیرہ مصنفین نے اس کی داغ بیل ڈالدی ہے۔ اب ضرورت ہے کہ کچھ تعلیم یافتہ مسلمان بھی اسطرف متوجہ ہوں۔ علی گڈھ لٹریچر جسمیں میں ان تمام مصنفین کی تصانیف کو شامل کرتا ہوں، جنکو سرسید سے تعلق رہا ہے، ہمکو راستہ دکھا چکے ہیں، یہاں بھی جیسا کہ میں پہلے لکھ چکا ہوں، علی گڈھ نے اس عمارت کی بنیاد ڈالی، اور زمانہ دیکھیگا کہ علی گڈھ ہی اس عمارت کو درجۂ تکمیل تک پہنچائیگا۔

اب میں اس مسئلے پر بحث کرنا چاہتا ہوں جسپر مجکو خوف ہے۔ علی گڈھ کے بعض بہی خواہ بھی مجھ سے متفق نہ ہونگے، کیا علیگڈھ کو مثل تعلیمی معاملات کے پولیٹکل امور کا بھی مرکز تصور کیا جائے۔ اس سے کسیکو انکار نہیں ہوسکتا کہ پالٹیکس میں علیگڈھ ایک خاص سکول کا عرصہ بیس برس سے مرکز رہا ہے وہ سکول پالٹیکس میں مسلمانوں کو اتبک یہی سبق دیتا رہا ہے کہ "لَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ" اس تحریر میں بحث کرنا نہیں چاہتا کہ یہ پالیسی مسلمانوں کے لئے مفید ثابت ہوئی یا مضر، آیا ہمکو پالٹیکس میں شریک ہونا چاہیئے یا نہیں، بلکہ میرا مقصد صرف یہ ثابت کرنے سے ہے کہ علی گڈھ کو ایک جائز اختیار اس نازک مسئلے میں مسلمانوں کی رہنمائی کرنے کا ہے

* کیونکہ قومیت کا مفہوم بغیر ایک زبان اور اسکے لٹریچر کے پورا نہیں ہوسکتا۔

پالٹکس کا مفہوم بالکل مغربی ہے۔ ہمارا علم و ادب اور ہماری گذشتہ تاریخ پالٹکس کے موجودہ مفہوم کے متعلق ہمکو سوائے اسکے اور کچھ تعلیم نہیں دے سکتا کہ "اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَ الرَّسُوْلَ وَ اُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ" ایجیٹیشن اور اصولِ نیابت سے جو موجودہ پالٹکس کی جان ہیں، عام مسلمان اب تک ناواقف ہیں، اور اُسوقت تک ناواقف رہینگے جب تک کہ ایک کثیر جماعت ایسی نہ پیدا ہو جائے، جو آزادی کی قدر کرنیوالی، آزاد حکومت اور آزاد اطاعت کو سمجھنے والی ہو۔ اسکو تسلیم کرتے ہیں کہ ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ ہم جاہل مسلمانوں میں (جو ہماری قوم کا جزوِ اعظم ہیں) ایجیٹیشن اور اصولِ نیابت کی تعلیم دیں۔ مگر پھر اس امر کی بھی ضرورت ہے کہ ہمارے حقوق کی حفاظت کیجائے۔ بس اسی سوال کا جواب یہی ہے کہ علیگڈھ کو اپنا پولیٹیکل مرکز بناؤ۔ علی گڈھ میں ایک جماعت ایسی ہے جو دن رات قومی ترقی، قومی اصلاح اور قومی بہتری کی تجاویز پر غور کرتی رہتی ہے، کالج اس جماعت کی گوناگوں کوششوں کا صرف ایک شعبہ یا مظہر ہے۔ یہ لوگ تعلیم یافتہ ہیں، تجربہ کار ہیں، زمانے کا رنگ پہچانتے ہیں، بہتر ہے کہ مسلمان ان کو ہی اپنے پولیٹیکل حقوق کا محافظ خیال کریں۔ سیّد ہمارے حقوق کا محافظ تھا، گو سیّد مر گیا، مگر سیّد کی اسپرٹ اسوقت علی گڈھ کی چار دیواری کے اندر رہنے والوں میں سے بہت سوں کے دلوں میں موجود ہے۔ یہ تعلیم یافتہ گروہ جو علی گڈھ میں ہے، اور علی گڈھ سے پیدا ہو رہا ہے درحقیقت مجموعہ ہے بہت سے سیّدوں کا ممکن ہے کہ یہ سوال کیا جائے کہ آیا گورنمنٹ میں بھی اس جماعت کا کوئی اقتدار یا اثر ہے، تو اسکے جواب میں میں یہی کہونگا کہ اوّل تو خدا کے فضل سے اقتدار اور اثر سب کچھ موجود ہے، اور اگر اسکی کمی ہے تو اسکو چھ کروڑ مسلمانوں یا کم از کم تعلیم یافتہ جماعت کی متفق القسانی پیدا کر سکتی ہے۔ اور پالٹکس میں ظاہر ہے کہ یکجہتی اور اتفاق بہت کچھ وزن رکھتے ہیں۔

اسلئے جب ہم ایک طرف یہ دیکھتے ہیں کہ علی گڈھ میں جو خصوصیات اور امکانات اسکے پولیٹیکل مرکز بننے کے ہیں وہ کسی اور شہر یا کسی اور جماعت میں پائے نہیں جاتے اور دوسری طرف جب ہم پالٹکس ایسے مسئلے کی اہمیت اور نزاکت پر غور کرتے ہیں تو ہمکو قطعاً فیصلہ کرنا پڑتا ہے

کہ علی گڈھ اوّل تو ابھی ایک حدتک مسلمانوں کا پولیٹکل مرکز ہے، اور اگر مسلمان ترقی کریں گے تو ایک دن یہ تمام مسلمانوں کا پولیٹکل مرجع ہو کر رہیگا۔

سوسائٹی کو بھی قومی ترقی میں بہت کچھ دخل ہے، مگر سوسائٹی کی حالت قریب قریب بالکل قوم کی تعلیمی حالت پر منحصر ہے، مثلاً ہم دیکھ رہے ہیں کہ مغربی تعلیم کا ایک اثر ہم پر یہ ہوا ہے کہ ہم پرانی سوسائٹی کی قیود اور بندشوں کو توڑ دیں۔ گو ان قیود اور بندشوں کی مضبوطی کی وجہ سے ہمکو اب تک بہت کچھ کامیابی نہیں ہوئی، مگر اس بات کو ہر شخص محسوس کرتا ہے کہ مغربی تعلیم نے ہمارے نوجوانوں کے دلوں میں آزادی کی محبّت اور بیجا قیود سے نفرت ضرور پیدا کر دی ہے۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ کب ہماری سوسائٹی کو بیجا رسم و رواج اور تشدّد آمیز بندشوں سے رہائی ملیگی، تاہم یہ ظاہر ہے کہ جوں جوں قوم تعلیم یافتہ ہوتی جائیگی، سوسائٹی یکرنگی، یکجہتی اور آزادی اختیار کرتی جائیگی۔ اسلئے ہماری ترقی یافتہ قوم کی نئی سوسائٹی کے افراد تعلیم یافتہ افراد ہونگے۔ ملکوں کا بُعد بھی اس نئی سوسائٹی کے رسم و رواج میں اختلاف پیدا نہ کرسکیگا، گویا ہماری سوسائٹی ہماری تعلیم یافتہ حالت کا ایک مظہر ہوگا۔ اسلیئے جب علی گڈھ کو ہم قومی تعلیم کا مرکز تصوّر کرلیں تو پھر اسکو سوسائٹی کا رہنما مان لینے میں کچھ دقت نہیں، بلکہ یہ اسکا ایک لازمی نتیجہ ہوگا۔

مذہب کے بارے میں اگرچہ بعض کوتہ اندیش اور نافہم حضرات کا یہ خیال ہے کہ یہ قومی ترقی کا ایک ضروری جزو نہیں۔ تاہم اس مسئلے پر میں بالتشریح بحث کرنے سے قاصر ہوں۔ مذہب میں بھی ایک علی گڈھ سکول جو فرقہ نیچریہ کے نام سے پکارا جاتا ہے، پیدا ہو گیا ہے۔ جسکو ابھی تک قوم میں وہ ہر دلعزیزی نصیب نہیں ہوئی (بلکہ ایک حدتک یہ علی گڈھ کی ترقی کے مسدود کرنے کا ایک سبب ثابت ہوا ہے) جو تعلیمی معاملات میں اسکو حاصل ہو چکی ہے۔ میں نہیں خیال کرتا کہ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کے ہوتے مسلمانوں کو بحیثیت مسلمان ہونے کے کسی ریلیجس سنٹر کی ضرورت ہے۔ اور اگرچہ آئے دن نئے نئے مذہبی فرقوں کی بنیاد ڈالی جاتی ہے اور بعض آوازیں فرقہ نیچریہ کو زیادہ مستحکم کرنے کے لئے اٹھتی رہتی ہیں تاہم میں اس مؤخر الذکر فرقہ کی آئندہ حالت کی نسبت کوئی

راہ قائم نہیں کر سکتا میں نہیں کہہ سکتا کہ علیگڈھ کو مسلمانوں کے مذہبی مرکز بنانے جانے میں یہ کوششیں کہاں تک کامیاب ہونگی۔

مگر قومی ترقی کے ان چاروں اجزا کے علاوہ ایک اور بہت بڑا جزو بھی ہے اور وہ قومی اسپرٹ اور قومی یکرنگی کا خیال ہے، میں ہرگز اس شخص کو ایماندار، بلکہ مسلمان نہ سمجھونگا، جو اس امر کی واقعیت سے انکار کرے کہ قومی اسپرٹ کے خیال کا مورث علی گڈھ اور صرف علی گڈھ ہے، کون اس سے انکار کر سکتا ہے کہ پنجاب کی مختلف انجمنیں، بنگال کی اسلامی جماعتیں، مدراس کی نیشنل ایسوسی ایشن، بمبئی کی پراونشل کانفرنس اس چیخ اور پکار کا نتیجہ نہیں ہیں، جو علی گڈھ سے اٹھی اور جسکو پشاور سے لیکر راس کماری تک اور گجرات سے لیکر برہما تک سب مسلمانوں نے سنا، یہ سب کرشمے ہیں سید اور ان کے دوستوں یعنی علیگڈھ والوں کی دل ہلا دینے والی تقریروں، مدلل مضامین، اور دلسوز نظموں کے۔ اپنی پست حالت سے واقفیت اٹھنے کا خیال، اور چلنے پھرنے کی طاقت ہمکو کس کے سبب نصیب ہوئی۔

متعصب اور خود غرض لوگ انکار کریں، مگر میرا کانشنس مجکو مجبور کرتا ہے کہ میں علانیہ اس امر کا اقرار کروں کہ علی گڈھ کے سبب سے اور صرف علی گڈھ کے سبب سے۔ مجکو یقین ہے کہ ہماری قوم اسقدر احسان فراموش اور محسن کش نہیں کہ علی گڈھ کے اس احسان کو بھلا دے۔

مینے اس مضمون پر مختلف پہلوؤں سے بحث کی ہے، مجکو جو کچھ کہنا تھا میں کہہ چکا ہوں۔ اب اخیر میں میں مختصر طور پر علی گڈھ کی دیگر خصوصیات کا ذکر کرکے اس مضمون کو ختم کرتا ہوں۔

علیگڈھ کچھ کالج کیوجہ سے اسقدر مشہور نہیں جسقدر کہ اس قومی تحریک کے سبب سے جو گذشتہ ربع صدی سے بالتخصیص علی گڈھ کے نام سے منسوب ہے، اور کالج، کانفرنس، ڈیفنس ایسوسی ایشن، وغیرہ، جسکے مختلف عملی نتائج ہیں۔ اس تحریک کا ایک نتیجہ کم از کم یہ ضرور ہوا ہے کہ اسنے تمام ہندوستان کے مسلمانوں کو مجتمع اور ان کی قوتوں کو متحد کر دیا ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ علی گڈھ والے فرشتے ہیں اور ان کے کاموں میں کوئی نقص نہیں، مگر اتنا کہنا غالباً خود ستائی نہ ہوگی کہ علی گڈھ کی قومی تحریک نے مسلمانوں کی توجہ کو ایک طرف متوجہ کر دیا ہے۔ کانفرنس کے اجلاس ہندوستان کے دور دراز

مقامات میں منعقد ہو چکے ہیں، اور اسکو "آسپیریل محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس" کا خطاب دیا جا چکا ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ علی گڈھ کے طفیل مسلمانانِ ہند خود بخود ایک مرکز کی طرف کھنچے جا رہے ہیں۔ اتفاق کی ضرورت پر کوئی لکچر، کوئی اسپیچ، الغرض کوئی قوت مسلمانوں کی پراگندہ جماعت کو متحد نہیں کر سکتی تھی، وہ بکھر چکے تھے اور کوئی امید ان کے پھر ایک مرتبہ قوم بننے کی نہ تھی، علی گڈھ نے بجائے خالی وعظ و نصائح کے ایک مجسّم چیز اُن کی نظروں کے سامنے رکھی ہے جس نے اُن کو کم از کم اس قابل ضرور کر دیا کہ اگر وہ دُنیا میں ایک ذی عزت قوم بنکر رہنا چاہیں تو ان کو اب کسی ناصح کی نصیحتوں کی ضرورت نہ رہے۔ اب اگر مسلمان اس نعمتِ غیر مترقبہ کی قدر نہ کریں، تو یہ اُنکی بدقسمتی تعجب ہے اور نہایت افسوس کا مقام ہے کہ علی گڈھ والے تو یہ کہیں کہ علی گڈھ کی تحریک صوبجاتِ متحدہ تک محدود نہیں، ہم نے جو کچھ کیا ہے اور جو کچھ کر رہے ہیں، وہ تمام ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے کر رہے ہیں، اور باہر کے لوگ یہ کہیں کہ نہیں۔ ہر صوبہ کا علی گڈھ علحدہ ہونا چاہیئے۔ ہمکو سیّد کے علی گڈھ سے کچھ تعلق نہیں۔ ہم تو باہر کے لوگوں سے یہ کہیں کہ علیگڈھ اب کسی خاص صوبہ کے مسلمانوں کا علی گڈھ نہیں ہے۔ اسکو تمام ہندوستان کے مسلمانوں کے روپیہ، دماغ اور کوششوں نے طیار کیا۔ ہر ایک مسلمان کو یہ حق حاصل ہے کہ علیگڈھ والوں کو مشورہ دے۔ اُن کے کاموں کا محاکمہ کرے۔ اگر وہ اپنے فرائض کو اور اس بڑے ٹرسٹ اور امانت کو نیک نیتی اور دیانتداری سے پورا کر رہے ہیں، تو اُن کی داد دے، اُن کی حوصلہ افزائی کرے، اُن کو حتی المقدور مدد دے اور اگر اُن کے کاموں میں اُسکو کوئی نقص یا کمی نظر آئے تو اُسکا فرض ہے کہ سلطنتِ جمہوری کی رعایا کی طرح اُن کی کمزوریوں اور غلطیوں پر اعتراض اور نکتہ چینی کرے۔

ہمکو اسوقت ایک مرکز کی ضرورت ہے جسکی طرف ہم اپنی پراگندہ اور متفرق کوششوں کو مجتمع کر کے متوجہ کریں، اب میں مسلمانوں سے اپیل کرتا ہوں کہ خدا کے لئے وہ ایمانداری و صداقت کے ساتھ اپنے دلوں کو ٹٹولیں۔ اور علی گڈھ کی گذشتہ خدمات، علی گڈھ کے تجربے اور علیگڈھ کی خصوصیات کا خیال کر کے ایماندانہ فیصلہ کریں کہ اسوقت سوائے علیگڈھ کے اور کونسا مقام

ہماری قومی ترقی کا مرکز ہو سکتا ہے؟

ع تمھیں پر فیصلہ ٹھیرا تمھیں کہدو خدا لگتی۔

«لبول»

# صبحِ صادق۔

ہے صبح کا کیا سماں سہانا
گویا ہے طلسمِ جاودانا
وہ نورِ سحر کی آمد آمد
وہ مرغِ سحر کا چہچہانا
کہسار کا منظرِ دل آویز
انوارِ شفق کا رنگ لانا
وہ حسنِ ملیح سبزۂ تر
بیگانہ بھی لو ہوا یگانا
وہ گھاس کے فرشِ مخملی پر
پھولوں کا ہنسنا مسکرانا
وہ اوس کے موتیوں کی چادر
فراشِ صبا کا لا بچھانا
اشجار کا جھومنا ہوا سے
شاخوں پہ گلوں کا سر ہلانا
ہونا وہ جہاں کا بقعۂ نور
سورج کا افق سے سر اٹھانا
وہ رقصِ نسیمِ صبحگاہی
مرغانِ سحر کا وہ ترانا

از سینہ برآورد نفیرم
بر عرش رسیدہ بر صفیرم

کیا صبح بہار مسکرائی
سوئی ہوئی جاگ اٹھی خدائی
ٹوٹا وہ طلسمِ خوابِ نوشیں
گویا ہوئی موت سے رہائی
چڑیاں ہیں خوشی سے چہچہاتی
ہیں بلبلیں محوِ خوشنوائی
بستی میں ہے دھوم نامِ حق کی
چرواہے نے بن میں تان اڑائی
دیکھو کیا ابر نے بنایا
جھولا کہسار پہ ہوائی
تنتے ہیں چنار و سرو و شمشاد
دکھلاتے ہیں شانِ دلربائی

گاتے ہیں پرند، پھول ہنستے
فوّاروں نے دھوم ہے مچائی
پانی کا بھی ہے عجب نظارہ
یہ آب و تاب یہ صفائی
تالاب میں پھول ہے کنول کا
آئینۂ ذوق خود نمائی

تاروں سے بھی بڑھ کے ہیں گلِ تر
ہے ناز زمیں کو آسماں پر

منظر ہے یہ کیا ہی پیارا پیارا
دلکش، دلچسپ اور دل آرا
کہسار کی اونچی چوٹیوں پر
وہ چاند کا آخری نظارا
یہ نور عجب ہے جس کے آگے
اب چاند رہا نہ کوئی تارا
وہ شب کی سبھا ہوئی ہے رخصت
ہے نور جہاں میں محفل آرا
سورج ترے نور نے جہاں میں
ہر چیز کے روپ کو نکھارا
آکاس کا کیا چمک اٹھا بحر
بے حد بے انت بے کنارا
عالم یہ ہے بیخودی سی طاری
دیکھے جسے دید کا ہو یارا
گلشن میں پرند نعرہ زن ہیں
چشموں نے زمیں سے جوش مارا
جنگل، بن، باغ، شہر، کہسار
ایک ایک بجائے خود پکارا

از نشۂ حسن دوست مستیم
ما میکشِ بادۂ الستیم

قدرت نے تو ہے کتاب کھولی
آتی نہیں پر سمجھ یہ بولی
پھولوں کے پیام پر صبا نے
غنچوں کی گرہ زباں سے کھولی
ہیں صحنِ چمن میں گل پریشاں
کھیلی گلشن میں کس نے ہولی
دامانِ نسیم کو ٹٹولو
پھولوں سے بھری ہوئی ہے جھولی
گلبن کا ابھار پر ہے جوبن
کلیوں کی ہوئی ہے چاک چولی

شاخوں پہ پھدکتے ہیں پرندے
غنچہ نہیں شاخِ یاسمیں پر
بُلبل کی الاپ دلنشیں ہے
سُنبل نے زلف کو سنوارا

ہیں اِن کی ادائیں بھولی بھولی
ہے شاہدِ گلستاں کی ڈولی
کیا پیاری ہے عاشقوں کی بولی
نرگس حیراں نے آنکھ کھولی

یہ قابلِ دید ہے نظارا
شاہد پردے میں آشکارا

نت رُوپ نیا دکھانیوالا
جاندار کو کرنے والا بیجاں
ہر چیز سے آپ ہو کے باہر
لب تشنہ زمیں کو دیکے پانی
اس خاک کو دیکے صورتِ پاک
پھل پھول ہزار کرکے پیدا
اِک کُن میں نظام کرکے موزوں
تاروں کو سما میں کرکے روشن
ثابت ہیں تو ہیں اُسی سے قائم

نت رنگ نئے میں آنے والا
بے جان کو پھر جلانے والا
ہر چیز میں خود سمانے والا
یہ سبزہ و گل اُگانے والا
افلاک کا سر جھکانے والا
الوانِ نعم بچھانے والا
یہ بزمِ کُہن سجانے والا
انوارِ ازل دکھانے والا
سیّار تو وہ چلانے والا

ہر چیز میں ہے ظہور اُسی کا
صبحِ صادق میں نور اُسی کا

صادق - از کشمیر

# علی گڈھ منتھلی میں انعامی مضامین

ہمکو خوشی ہے کہ ماہ نومبر کے مضامین میں مولوی عزیز مرزا صاحب بی۔ اے ڈپٹی کمسنر تیر ریاست حیدر آباد کا مضمون "کلی کتب خانہ" قابلِ نذرانہ سمجھا گیا۔ ہمارا ہدیۂ ناچیز

اُن کی شان کے لائق نہیں ہے مگر چونکہ وہ کالج کے عجیب پُرانے طالب علم ہیں، ہمکو امید ہے کہ اپنے الامیڈ کے ایک مہینے کا ادنیٰ ہدیہ خوشی سے قبول کرینگے۔

## اختتام سال

خدا کا شکر ہے کہ علیگڈھ منتھلی کی عمر کا دوسرا سال بخیریت تمام ہوا، اور ہم اپنے ناظرین کی خدمت میں اس سال کا اخیر پرچہ پیش کر رہے ہیں۔ سال قریب الاختتام کی کیفیت اور آمد و خرچ ہم انشاء اللہ جنوری کے پرچے میں لکھینگے اور اُسی وقت ہم اُن محسنوں کا شکر کرینگے جنھوں نے کہ اپنے مضامین یا خریداری سے ہماری امداد کی ہے۔ اسوقت صرف اسقدر اطلاع دیتے ہیں کہ جو صاحب شروع سال سے خریدار ہیں انکا چندہ ختم ہوگیا اور ماہ جنوری کا منتھلی اُن کی خدمت میں بذریعہ ویلیو ارسال ہوگا۔ جن صاحبوں کو کہ خریداری نامنظور ہو وہ اپنی خواہش سے ہمکو ۲۵۔ جنوری تک مطلع فرمائیں، اور جو صاحب کہ سال نو کیواسطے منتھلی کے متعلق کوئی مفید مشورہ دینا چاہیں اُسکو بھی ہم شکرگزاری کے ساتھ درج رسالہ کرینگے اور اُسپر عمل کرنیکی کوشش کرینگے

## توسیع یونین کلب

ہمکو خوشی ہے کہ اس مد میں مولوی مظہر الحق صاحب بی۔اے انسپکٹر آبکاری اضلاع آگرہ و متھرا نے جو کالج کے پُرانے اور نہایت سربرآوردہ طلبا میں سے ہیں مبلغ عہ/ روپئے عنایت فرمانے کا وعدہ کیا ہے۔

## مارلین میڈل فنڈ

اس فنڈ میں مولوی حبیب اللہ خاں صاحب بی۔اے تحصیلدار ہاتھرس ضلع علیگڈھ نے جو ہمیشہ کالج میں چندہ دینے کے لئے طیار بیٹھے رہتے ہیں مبلغ عہ اور مولوی مظہر الحق صاحب

بی۔ اے انسپکٹر آبکاری نے مبلغ ۱۵ روپے چندہ دینے کا وعدہ کیا ہے اگر اسیطرح سے اور سابق طلباے کالج بھی فیاضی کو کام میں لائیں تو مارسین میڈل کے لئے مبلغ ایکہزار روپے کا جمع ہوجانا کچھ مشکل نہیں ہے۔

ہم متعدد بار لکھ چکے ہیں اور پھر اُسی کو دُہراتے ہیں کہ بڑی رقموں کا دینا ہر شخص کو مشکل ہوتا ہے اور ایک دو روپیہ کا دے ڈالنا کسی کو گراں نہیں گزرتا اور ان ریزوں سے کالج کے پاس ایک معقول رقم جمع ہوسکتی ہے، اگر ہر ایک اولڈ بواے ایک یا دو روپیہ دے تو مارسین میڈل فنڈ میں بجاے ایک ہزار کے دو چار ہزار روپیہ جمع ہوسکتا ہے۔ ہمکو امید ہے کہ کالج کے ہواخواہ اور سابق طلبا اس طرف توجہ کرینگے، اور اس فنڈ میں ضرورت سے زیادہ روپیہ مسٹر مارسین کی روانگی سے قبل جمع ہوجائیگا۔ آنریری منیجر علی گڈہ منتھلی

**اودھ اخبار** "زمانہ کے کئی نمبر ہمنے بالاستیعاب معائنہ کئے، اور اب ہماری یہ راے قائم ہوئی ہے کہ اُردو رسائل میں اسنے بہت بڑی ترقی کی ہے"

**روزانہ پیسہ اخبار** "یہ دیکھکر کمال مسرت ہوتی ہے کہ رسالہ زمانہ بریلی کا ہر نیا نمبر گزشتہ اشاعت سے بڑھا چڑھا رہتا ہے"

**ہندوستان ریویو** "زمانہ بہ حیثیتِ مجموعی ایک اعلیٰ درجے کا رسالہ ہے، اور لیاقت، عقل، اور تمیز سے نکالا جاتا ہے"

# زمانہ

## ایک قابلِ دید ماہوار رسالہ

(جسمیں)

اعلیٰ درجے کے مضامین نظم و نثر کے علاوہ ہر ماہ مشاہیر ملک کی عکسی تصاویر نذرِ ناظرین کی جاتی ہیں۔

(اور جسکو)

ملک کے تمام نامی گرامی اخبارات نے بہ لحاظِ مقاصد، خوبی مضامین، حُسن ترتیب اور ضخامت وغیرہ خصوصیات کے قابل قدر بتایا ہے

قیمت سالانہ سے، مع محصول ڈاک۔ (نمونہ) فی پرچہ ۴؍-

جحم ۵۰ صفحات۔ **فہرست مضامین "زمانہ" بابت ماہ دسمبر ۱۹۰۴ء** جحم ۵۰ صفحات

قیمت فی پرچہ ۴؍ **تصاویر لارڈ کرزن و سرہنری کاٹن** قیمت فی پرچہ ۴؍



**(حجم رسالہ علاوہ ٹائٹل پیج و اشتہارات ۵۰ صفحات)**

**نوٹ (۱)** گذشتہ نمبر میں خان بہادر شمس العلماء مولنا محمد ذکاء اللہ صاحب، منشی گنگا پرشاد صاحب ورما ایڈیٹر اخبار ایڈوکیٹ لکھنؤ، مولوی محمد عزیز مرزا صاحب، بی۔ اے فیلو رائل ایشیاٹک سوسائٹی و ڈپٹی کمشنر علاقہ نظام، منشی شیو برت لال صاحب ورمن ایم۔ اے، خان بہادر سید اکبر حسین صاحب جج پنشنر۔ قاضی عزیز الدین محمد صاحب ڈپٹی کلکٹر، خان صاحب مرزا سلطان احمد صاحب اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر منشی احمد علی صاحب بی۔ اے ایل ایل بی وغیرہ وغیرہ مشہور اہل قلم کے قابل قدر مضامین شائع ہوچکے ہیں

**نوٹ (۲)** جولائی سے دسمبر سنہ حال تک کے ششماہی پرچے جنکے قابل قدر مضامین چار سو صفحات سے زیادہ پر آئے ہیں اور جنمیں شہنشاہان روس و جاپان، پنڈت دیا ساگر، سوامی دیانند سرسوتی، لارڈ کرزن، اور سرہنری کاٹن پریسیڈنٹ نیشنل کانگرس حال کی عکسی تصاویر زیب رسالہ ہیں بلا جلد قیمت ۳؍ اور مجلد ۴؍ ہے علاوہ محصول ڈاک

**نوٹ (۳)** زمانہ کے ساتھ جو عکسی تصاویر شائع ہوئی ہیں انھیں علٰحدہ فروخت کرنیکا بھی انتظام کیا گیا ہے یہ تصویریں اس قابل ہیں کہ ہر جنٹلمین کے گھر کی زینت ہوں، موجودہ تصاویر کی قیمت حسب ذیل ہے۔

تصویر "سید احمد خاں"۔ تصویر "رتن ناتھ سرشار"۔ تصویر "مسٹر ٹاٹا"۔ تصاویر "شہنشاہان روس و جاپان"۔ تصویر "پنڈت دیا ساگر"۔ تصویر "سوامی دیانند سرستی"۔ تصویر "لارڈ کرزن"۔ تصویر "سرہنری کاٹن"

ان تصاویر کی مجموعی قیمت ۱؍ مع محصول ڈاک ہے

المشتہر

مینیجر رسالہ زمانہ قیصری پریس بریلی شہر

# Fragments—VI.

—:o:—

I want you to feel, with me, that whatever advantages we possess in the present day in the diffusion of education and literature, can only be rightly used by any of us, when we have apprehended clearly what education is to lead to, and literature to teach. I wish you to see that both well-directed moral training and well-chosen reading lead to the possession of a power over the ill-guided and illiterate which is, according to the measure of it, in the truest sense, *kingly*; conferring indeed the purest kingship that can exist among men; an inevitable and eternal kind, crowned or not; the kingship, namely, which consists in a stronger moral state, and a truer thoughtful state, than that of others, enabling you therefore to guide or to raise them.

(*RUSKIN*)

—:):(o):(:—

# Meerut.

—:o:—

| 1st Innings. | | 2nd Innings. | |
|---|---|---|---|
| Anstey, *b.* Mahmood | 9 | *b.* Shafqat ... | 0 |
| R.C Ross, *c & b.* „ | ... 66 | *l. b. w.* | 6 |
| R.C Cambell, *c & b.* „ | .. 1 | *b.* Muzaffer | 21 |
| Capt E P. Hill *b.* Shafqat | . 15 | *b.* Shafqat | 5 |
| Maj Begbie *b* Mahmood | 10 ... | *b.* Mahmood | 6 |
| Pt. Sinclair *b* Muzaffer | 6 | *b.* „ .. | 11 |
| Dadley *b* Shafqat | .. 11 .. | *c.* Muzaffer *b.* Shafqat .. | 12 |
| Brown Not out | 17 | *b* Shafqat .. | 9 |
| Shereard *c* Taqui *b* Mahmood | 1 | Not out ... | 1 |
| Nealcolen *l. b. w* (Muzaffer) | 10 ... | *c.* Saif *b.* Muzaffer . | 0 |
| Freewood *b.* Mahmood | 4 | *b.* Muzaffer . | 0 |
| Extras ... | 13 | Total .. | 76 |
| Total | 163 | | |
| Grand Total . | 239 | | |

## Aligarh.

—:o:—

| 1st Innings. | | 2nd Innings. | |
|---|---|---|---|
| Shafqut *b.* Cambell | 11 ... | *l. b. w.* Cambell | 25 |
| Muzaffer *c.* Begbie *b.* Ross | . 20 ... | „ „ ... | 48 |
| Mahmood *c.* Anstey *b.* Ross | ... 27 | *c.* Sinclair *b.* Ross | 10 |
| Aslam *l. b. w* *b.* Dadley | ... 10 ... | Run out ... | 0 |
| Ashfaque *c. & b.* Anstey | 21 ... | *b.* Ross | 5 |
| Halim *c. b.* Anstey | . 21 ... | Not out .. | 0 |
| Zahur *b.* Dadley | 1 ... | „ ... | 0 |
| Abdullah *b.* Dadley | ... 2 | Did not bat. | |
| Masood *l. b. w.* | 15 | | |
| Saif (not out) | ... 10 | | |
| Taki (*c.*) Sinclair *b.* Dadley | 1 | | |
| Extras | 6 | | |
| Total | 137 | | |
| Grand Total . | 244 | | |

## Agra College

—:)(o)(:—

| 1st Innings | | 2nd Innings | |
|---|---|---|---|
| Zahid *c.* Slamuddin | 0 | *b* Salam | 6 |
| Zainul-Ibad *c.* Yakub | 15 | *b* Yakub | 0 |
| Kazim Husain *c.* Salam | 0 | *b.* A. A. Salam | 3 |
| Janki Prasad *b.* Salam | 35 | *b.* Yakub | 10 |
| Madan Gopal *c.* Yakub | 2 | *b* Samad | 13 |
| Murtaza Husain *c* Yakub | 0 | *b* Salam | 3 |
| Inam Husain not out .. | 58 | Run out | 3 |
| Dwarka Nath *b.* Salam | 0 | *b.* Salam | 2 |
| Tajamul Husain *b.* Yakub | 12 | *c* Salam | 17 |
| Pushker Narain *l. b w.* Samad | 2 | *c.* Yakub | 0 |
| Benwari Lal *c.* Samad | 0 | not out | 5 |
| Total | 124 | Total | 62 |
| Extras | 20 | Extras | 3 |
| | 144 | | 65 |
| Grand Total | 209 | | |

## Aligarh.

—:o:—

| 1st Innings. | | 2nd Innings. | |
|---|---|---|---|
| A. Roshid *l. b. w.* Inam | 18 | *b.* Inam | 1 |
| Ishaq *b.* Inam ... | 14 | *b* „ | 0 |
| Salam run out | 26 | *b.* „ | 0 |
| Md. Bukhsh *b.* Inam | 13 | *b.* Zahid | 9 |
| Ahmed Ali *b.* Zahid | 0 | *b.* Inam | 0 |
| Samad *b.* Zahid | 6 | *l. b w.* Zahid | 0 |
| Yakub *b.* Inam | 9 | not out | 10 |
| Amir Ahmad *b.* Zahid | 9 | *st.* Zahid | 0 |
| Rashid *b.* Inam | 0 | *b.* Inam | 8 |
| Wahid not out | 21 | *b.* „ | 3 |
| Ali Hassan *b.* Zahid | 11 | *b.* „ | 9 |
| Total | 127 | Total | 40 |
| Extras | 10 | Extras | 7 |
| | 137 | | 47 |
| Grand Total ... | 184 | | |

side. Yakub Ali's was the only double figure score on our side. All got out for a very poor total of 47 runs, thus losing the match by 25.

The Second Eleven had scarcely reached Agra when another team had to be got up and sent to Meerut to play the Station Club, that put in a fairly strong team against us The home team winning the toss went in and scored a respectable total of 163. Mr Ross, when set, proved to be a dangerous bat, and showed a sound piece of batting, sending Shafqat for several fours, in all directions. Mahmud bowled very well in the 1st innings. Muzaffar's 20 and 48 were scored in splendid style The match ended in an easy win for the visitors, by 5 wickets. The scores are appended below.

## Agra Club.

| | 1ST INNINGS | | | 2ND INNINGS | |
|---|---|---|---|---|---|
| Venables | c. b. Yakub | 15 | .. | c. Samad | 0 |
| Gwyther | b. Salam | 15 | ... | c. Salam | 7 |
| Pullan | c b. Yakub | 26 | ... | c. Yakub | 12 |
| Macpherson | b. ,, | 7 | ... | b. Yakub | 11 |
| Gannon | b. ,, | 25 | .. | b. ,, | 6 |
| Jhonson stumped | | 10 | ... | b. ,, | 3 |
| Smallwood | b. Yakub | 8 | ... | b. Salam | 32 |
| Saxton | b Salam | 1 | ... | b. Samad | 6 |
| Mauser | l b. w Samad | 10 | .. | sub not out | 8 |
| Baker not out | | 0 | . | b. Yakub | 0 |
| Abid Ali | b. Yakub | 0 | .. | c. ,, | 0 |
| Extras | | 11 | ... | Extras | 12 |
| | | 128 | | | 107 |

## Aligarh College.

| | 1ST INNINGS. | | | 2ND INNINGS. | |
|---|---|---|---|---|---|
| Ishaq | b. Saxton | 11 | ... | b. Baker | 0 |
| Ahmed Ali | l. b. w. Abid | 0 | ... | b. ,, | 6 |
| A. Rashid | b. Abid | 0 | ... | l. b. w. ,, | 25 |
| Salam | not out | 64 | ... | b. ,, | 10 |
| Samad | b Pullen | 4 | ... | retired | 23 |
| M. Bux | b. Johnson | 9 | ... | b. Pullan | 4 |
| Yakub | b. Sexton | 16 | | Did not bat. | |
| Rashid | b. ,, | 3 | | | |
| Amir Admed | b. Gannon | 9 | | | |
| Wahid | b. Abid | 5 | | | |
| Razi-ud-din | b. ,, | 16 | | | |
| Extras | | 17 | | | |
| | | 145 | | | |

Roshid Mohomed Khan of X class has been appointed Captain of 2nd Eleven and Mahmud-ul-Hassan an officiating School Captain, in the absence of Ali Raza, who has not returned yet. We have been rather unfortunate in not being able to accept challenges from various teams. Having decided, at last to make our long contemplated tour through the Punjab, for which the Christmas Holidays have been put by, we could not afford to play matches away from Aligarh.

The season was opened by the 2nd XI. They played a couple of matches at Agra towards the end of November—one with the Agra Club and the other the Agra College. The game with the Club was very well contested in the 1st innings, though, quite unexpectedly, it ended in an easy victory for our boys. This was partly due to Mr. Pullan's absence for sometime, on the second day. Mr Gannon, one of their best bats, played a very careful innings of 25. Among our boys, Yakub's performance with the ball was excellent. With his steady pace, and good length he proved too good for the batsmen. Salam-ud din came off very well with the bat, defying every change in bowling, with perfect ease and confidence His 64 was very useful, when very few double figures were scored on his side. His bowling too, though less successful than it ought to have been, was quite satisfactory. Captain Smallwood, one of the oldest friends of Aligarh Cricket, was captaining the team, and was very kind and hospitable, as is usual with him. The match with the Agra College that came off on the 26th and 27th, was one of the most exciting ones that we have ever played. Dwarka Nath, one of the ex-students of the Agra College, was playing for the opposite side. Our Second XI Captain losing the toss again, had to take his men out. The game was rather slow in the beginning, till Inam Husain, their best bat, came in and put some life into it. He played a very useful, though lucky innings of 58 (not out) Another respectable figure of 35 was scored on the side, by Janki Prasad. On our side, Salam, with his 25, topped the list. Next to him was Wahid, who forced the ball all around, thus playing a useful innings of 21 not out. There was a sudden collapse in the 2nd innings on both sides ; this was mostly due to the wicket that, in the 3rd innings was worse, and in 4th, that unfortunately fell to our lot, was at its worst. Wickets fell rapidly, the entire team could not put together more than 65 runs, leaving only 73 for Aligarh to win. Our Boys were rather pleased with the result so far, and had grown confident of an easy win, failing to realise that the wicket was equally advantageous to the bowlers of the opposite

probably because, in the circumstances of the tribes, it was considered better to have more than one wife than to have servants. He thought the remarks of the lecturer as to the work the Society should undertake were deserving of careful consideration. To deserve its name Pan-Islamic Society should seek to bring the ideas and aspirations of the Mahomedan community into line with modern progress, and should seek to enlist the sympathies of the ruling classes with such aspirations. He had listened with great interest to the suggestion of the lecturer that the British Government should employ Mahomedan Ambassadors or Envoys to represent Great Britrin at Moslem Courts. He did not see any reason against it. Moslem States employed their Christian subjects in those capacities; and if the British Government followed that example, it would not be without advantage to the rulers as well as the ruled. But he was afraid the time had not arrived for such a suggestion to bear fruit

Mr. Suhraworthy, the Secretary of the Society, said he could not concur in the lecturer's views as to the alleged disadvantages of the theocratic conception of Government. That conception, whether Christian or Moslem, taught the brotherhood and equality of man and had been an all-important factor in the spread of humane sentiment and the progress of mankind Theocracy was a better basis of government than a hard Rationalism teaching the new and unlovely gospel of the survival of the fittest.

The lecturer briefly replied, and the proceedings closed.

——.o——

## Cricket.

——:(o):——

Since the opening of the College, after the summer vacation, our practice has been in full swing as usual, and owing to an unusual increase in the number of those who play at higher nets, three and sometimes four nets, instead of two, have to be run simultaneously under the 1st and 2nd Eleven Captains Of those who were lately promoted from the 3rd eleven nets, Ali Hassan and Razi-ud-din have distinguished themselves most, both with the bat and ball. Mr. Rees takes a very keen interest in the well being of the Club; this is shown, not only by his frequent appearance on the Cricket field and participation in the game, but more clearly manifested in some of the improvements recently made in the equipment of the Club, and a few slight, but useful changes in our old system of daily practice. He has still more useful plans in view.

slavery among the followers of Mahomed. His own view, which he had strongly expressed before, was that slavery in general was contrary to their sacred writings, and that if still practised by any Moslem people it was practised contrary to the rules laid down by their religion The institution existed in Mahomed's day, but he taught that it could only be applied to captives taken in lawful warfare—that was warfare waged against non-Mussulmans attacking Islam. The object of this provision was humane in a twofold sense, for it not only severely restricted the range of legal slavery, but it provided a means of departure from the then general custom of putting captives of war to death Mahomedans had certainly kept slaves not taken in "lawful warfare," but this had not been without misgiving Thus the Turcomans in Central Asia had seized and carried away Persians, and had excused their enslavement by branding them as heretics, considering that that complied with the requirements of the law. In Central Africa Moslem tribes captured slaves, but when they embraced Mahomedanism they were emancipated. Indeed Dr Beydon had stated that wherever Islam had progressed in Central Africa slavery had become extinct (cheers). As regards polygamy, the rule of Mohomedanism was against a plurality of wives and not in its favour That rule had been misunderstood, and Mahomed had been subjected to a great deal of criticism in consequence of a non-apprehension or a misapprehension of the rule he laid down. In his time polygamy prevailed without restriction, and plurality of marriages of different kinds and known by different names were common among the people The Prophet realised that it would be impossible in those days to put a stop to polygamy in so many words, and therefore made the rule that a man might have one, two, three or four wives, provided he could do equity amongst them. The Koranic definition of "equity" was not as understood by some, equality in material treatment, but equality in love and affection. But though this has been misunderstood, there was a general recognition that only men of means could be polygamists, and under these circumstances polygamy had become rarer and rarer in most Moslem countries. It had diminished rapidly in India, and probably 95 per cent of the people there were monogamists, either by conviction or because they considered that whether polygamy was allowed or not in the first instance, the time had come when it should cease. Sir Charles Macgregor had told them that polygamy was extremely rare in Persia; it was also rare in Arabia and in Turkey. If it was common in Africa, it was

principle of *wahif* or family benefection. In the Mahomedan system charity to one's own relatives and to members of one's family was regarded as an act of piety. It used to be so, he believed, in olden times in the West, but ideas in the West had altered, and charity at home was now regarded with some ridicule, and for that reason the English lawyers had adopted the fetish of the law against perpetuities. This has swayed the mind of a great many tribunals in India, and outside of India, and the Mahomedan law of family *wahifs* had been disapproved of. In consequence there had been a general impoverishment of the Mahomedan families on whom depended the support of education. To remedy this evil, their rulers might, he thought, give them their support by some means which the advisers of Government could easily devise. For example, it would not be difficult to pass an Act to validate the law of Mahomedan family *wahifs*, with such safeguards as might be necessary to protect against fraud. Reference had been made to the inelasticity of the Koranic system. In a book he published some time ago, a popular edition of which had lately appeared, he had anticipated to a great extent the criticism that had been offered and the answers these criticisms required. He had shewn that the Prophet had made the Islamic system, not inelastic but elastic to a degree. He was, indeed, the greatest reformer the world had ever produced. He had expressly declared that, although anyone who neglected in his day to perform one-tenth of his commandments was doomed, yet a time would come when any of his followers who observed a fraction of his commandments would be saved. It was upon that rule that the best reformers of the Moslem religion, not only in the present day but from the Eighth Century downwards had relied. They pointed to those words, and held that the rules and commandments which were required for the varying needs of an archaic community must change from time to time, must alter with the progress of civilisation. They had to deplore, not an inelastic system, but the unprogressive ideas of some of its professors. Islam was, unfortunately, in its Middle Ages at present. Europe had its Middle Ages, but the Renaissance came, with the admixture of the teachings of Sarascenic civilisation with Western ideas. Similarly, he thought the regeneration of Islam had begun with the contact of Western civilisation with Mahomedan ideas in India, and he thought that under the auspices of a Power like Great Britain there was more hope for Islam in India and for Islam generally than any other direction. The lecturer had referred to the institutions of polygamy and

dian Muslims. Though united together very strongly by the tie of a common faith, the Indian Muslims did not on the whole constitute a homogenous people, and they must remember when they talked of Moslem "backwardness" that there were in different parts of India different stages of development. For example, the Mahomedans of Northern India were descended chiefly from Mahomedan settlers from the West, who had brought with them to India traditions of civilisation and enlightenment, while in Eastern Bengal the Mahomedans were chiefly converts from Hinduism who still observed many Hindu customs and institutions The fact was that the culture and advancement of the Mahomedans of India varied in no small measure according to their origin, and according to the circumstances under which they had been converted from time to time. As to the neglect of English education, to which reference had been made, Mr. Ameer Ali alluded to a representation made to Lord Ripon's Government by the Central Mahomedan Association as the outcome of an article he wrote in the *Nineteenth Century* in 1883. The memorial was dealt with by a resolution of Lord Dufferin's Government issued in 1885, which is justly considered by the Mahomedans as their Magna Charta In that resolution there was a complete *résumé* of the causes which the Government regarded as having contributed to the decline of Mahomedan education and advancement, and measures were proposed for promoting such education and securing a fair employment of Mahomedans in the State service. Thereupon, the Provincial Governments took up the matter, and a great deal had since been done to promote the object Lord Dufferin's Government had in view Certainly the present Lieutenants-Governor of the United Provinces and of Bengal were most sympathetic towards all movements for the advancement of the Mussulmans of their respective Provinces. Lord Curzon also had shown great sympathy with the cause of Mahomedan education, and a strong desire to see the menbers of the community advancing along the same lines as their great Hindu fellow-countrymen One cause of their backwardness in education was to be found in the gradual impoverishment of the community The remedy for such impoverishment could partly come from themselves and partly from their rulers. The Mussulman law of intestate succession rendered it impossible for property to remain in a Mohomeden family intact for more than three generations. But although the Prophet Law-giver had, in order to remove the injustice in regard to succession which prevailed in his time, laid down that he had himself provided a remedy by introducing the

which to attack the State was to attack also the State religion. On the other hand, British civilisation embodied the extremest Protestant and Rationalistic principles—the free Church in the free State, even while still maintaining under very peculiar conditions a Church Establishment, British culture, in fact, reflected a broad catholic humanism of which Shakespeare was the representive embodiment; the persistent pursuit of secular industry and the material arts of life, of science and speculative thought, and an ordered civic and political freedom in the national constitution. In the East the British Power stood for complete religious equality, and a liberty only modified where practises existed contrary to the universal dictates of humanity He said this in no spirit of national self-appraisement, but as a statement of the essential facts of the case He thought there was a possibility of extending mutual influences of a beneficent character through the appointment in a diplomatic capacity of qualified Muslim British subjects and notables The Turkish Ambassador at the Court of St. James's was a Christian and he did not see why our Ambassadors at the chief Muslim Courts, and our agents and administrators in various Muslim countries, should not be Mohamedans. But if Mohamedanism was to be related to the problems of to-day there must be reform from within. The inherent weakness of the independent Muslim States, the backwardness of Mohamedan education in India and elsewhere, must be the subjects of candid examination by the followers of the Prophet themselves. The theocratic basis of government by which he meant the union of spiritual and temporal powers under a legal system derived from a dogmatic sacrosanct authority, was opposed to real progress, and tended to a fanatical intolerance. The community was hampered by customs and restrictions which, however convenient and necessary to the Arabs when promulgated, were grievous and unsuitable for other nations at distant periods and in distant lands

One great work before the Pan-Islamic Society was to set forth an intelligent view of what Islam stood for to-day, and how far it could be adapted to modern needs Both in London and in centres of Muslim culture these social and religious problems should be earnestly discussed in the light of modern, social and political science, between Muslims and non-Muslims, and he was gratified that the Pan-Islamic Society was leading the way in inaugurating such discussions. After a brief speech from Mr. S. H Swinney, the Chairman said that naturally the part of the valuable lecture they had heard which interested him most was that which related to the In-

element We were the successors to the rule of the Moghuls in India, and the course of history had brought a large Muslim population under the British Crown and had involved us in intimate relationship with general Muslim world. The total Mohammedan population of the world was computed at 215 millions Of this total, over 64 millions were directly subject to British rule, and 47½ millions were indirectly subjects, under varying degree, of territorial sovereignty or protectorate, principally in Egypt and other parts of Africa north of the Zambesi To give exact figures, 111,704,400 Mohammedans out of a total of 215 millions were under British direction, and of the remaining Muslims, 30 millions or so lived in States which by their geographical position, chiefly on the Indian frontier, were within the British sphere of influence. The lecturer then proceeded to deal at length with the social, moral and intellectual status of Muslims under British rule, more particularly in India, quoting various authorities in this connection, and laying stress on the fact that Mohammedan faith and practice in India has been largely influenced by its contact with Hinduism He also discussed the nature of the political and strategical relationships of separate Mohammedan countries—Turkey, Persia, Arabia and Afghanistan—to our Eastern Empire. These formed, he said, a cordon to Western aggression. While it was to the advantage of other Western Powers to see them becoming weaker and weaker Great Britain desired their progress and enhanced strength, and in her *rôle* as a Muslim trustee she desired the welfare of the Mohammden world not merely from motives of self-regarding interest. British and Moslem fortunes had become closely interwoven, and it was for the leaders of opinion on all sides to help to further a better mutual understanding, and active co-operation towards a common social and political advancenent. Our past relations with the outer Moslem States had not been satisfactory. Our policy had not been definite and continuous, but had been of the hand-to-mouth order, complicated by the double position of Britain as at once a European Christian and an Oriental Power. The circumstances of to-day presented an opportunity for a reconsideration of the whole position. It must never be forgotten that the fundamental characteristics of British Christianity and humanist culture contrasted markedly with the theocratic catholic Christianity with which was waged the great struggle with Islam in the past. Most of the early conflicts of the Islamic Empire with Christendom were with its organised theocratic form in the Eastern and Western Holy Roman Empire, in

those who sow discontent among the masses will reap the whirlwind; and that is why I refuse to look upon the Congress propaganda as nothing more serious than the chatter of a few irresponsible Babus It is often said that the *official* utterances of the Congress are not extravagant, and that it is the intemperance of their unrecognized supporters that alone deserves this criticism. Political parties are however to be judged as a whole, the good or evil which they do depends upon their average utterances, the leaders in Europe regretfully acknowledge that they must be responsible for the sayings and doings of the rank and file, and that they will be judged by the way in which their policy is commonly advocated. If the newspapers which generally support the Congress policy say much of which the official leaders of the Congress disapprove they have abdicated the first duties of leadership in not disclaiming those words. If the present propaganda has the sinister result which I am pointing out it will do little good to the country to learn that it was only tolerated and not approved by Mr Dadabhai Naoroji or Sir Pheroz Shah Mehtar; the country will suffer none the less and most of all the prosperous and law-abiding classes.

This is the serious evil for which the Congress must be held responsible and no immediate gains, such as the extension of popular representation in the Councils can be put in the balance against it.

T. MORISON.

---

## Islam and British Rule.

A lecture, under the above title, was given in London, early in November, before the Pan-Islamic Society, by Mr. H. C. Crossfield, with Mr Syed Ameer Ali in the chair.

Mr. Crossfield, who was introduced as one who had written on problems affecting the Muslim world, first remarked that considerable attention had been directed of late towards the question of consolidating the various separate aggregates of the British Empire. The discussion had, however, been chiefly confined to the relations of the Mother-country to the British colonial Commonwealths. The problems connected with that other main factor in the Imperial system, that of our tropical and sub-tropical Empire, had only incidentally been taken into consideration. But the course of events had been tending to bring these regions, in Asia and East Africa, into greater importance as the centres of world-movements. One great factor in this Oriental Empire was that presented by the Islamic or Mussulman

which is above all things to be dreaded and avoided. Whichever way the issue is decided will be a misfortune. If the Government prevailed it would be by the rigorous enforcement of all the harsher powers of administration, it would mean the prolonged duration of a strongly reactionary policy which would check all expansion of Indian privileges, and education would certainly receive a disastrous check; if the opposite party prevailed it would mean civil war No one dreams that if the present Government were overthrown, another is now ready to take its place : a new administration could only be evolved, if ever it were evolved, by two or three generations of internecine war, such as followed the break-up of the Moghul Empire. The most adventurous spirits in the Congress camp do not believe that the transition from a British to an Indian Government could be safely accomplished with violence, at least in any time which practical politicians need consider, and that is the reason why I am convinced that the Congress leaders are perfectly sincere when they say that they do not want the overthrow of British Rule The point on which I lay stress is that with very harmless intentions they are playing a dangerous game. The spread of disaffection, of discontent with the existing order, is a very dangerous game, it may kindle a conflagration in which all that they most prize, education, freedom, moral progress may be lost. Neither Muhammadans on the one side nor the Congress politicians on the other, will take the question sufficiently seriously. The Muhammadans are inclined to think that the talk of a few Babus cannot upset a powerful Government, and it is no business of theirs. The Congress politicians think that they may make the Government more attentive by rather overstating their case and enlisting the many in support of their claims; but meanwhile the fundamental danger is overlooked by both sides; what will happen if the masses come to believe absolutely what the newspaper writers tell them? No tardy counsels of moderation will then arrest the flood tide of popular fury; it is not to the point to say that the masses of the Indian people have never yet risen against their rulers; it is true indeed that Sudras have bent their backs in patience beneath the loads which the Aryans and the Muhammadans have successively laid upon them, but in what age before have the Sudras been educated and had an opinion asked of them? There *is* no anology in the former history of India, and it is in Europe or in the blood-stained republics of South America that we must look for a parallel; the lesson which those countries teach is that

the Government has become increasingly despotic and reactionary, the Universities are periodically closed in Russia and the students are frequently shot down in the streets by armed Cossacks; the party of reform has become a band of desperate assassins, and their programme now includes such wildly impractical proposals, as the abolition of marriage; and thus the Nihilists in spite of their undoubted heroism and their sufferings have lost the sympathy of liberal Europe.

I am quite willing to agree that neither the Government of India nor the politicians of the Congress are likely to imitate the example of Russia, the Government is not showing any inclination to institute a Censorship to read over and amend articles in the press before publication, nor to dragoon students who hold meetings among themselves, nor has any member of the Congress shown a disposition to walk in the footsteps of Ryssakoff, the murderer of Alexander II; but the violent extremes to which the struggle between the party of order and the party of reform has been carried in Russia, are a warning of the dangers which come from either party's adopting uncompromising attitude of hostility. The development which I forebode from the present situation is rather something like this the partizans of the Congress may continue to create ill-will against the Government, not from any intention of overthrowing it, but from a reckless habit of exaggerated speech, these ideas, gradually spreading unchecked among the people, may become universal in India, if the whole people is firmly convinced that the Government is not benevolent but hostile and oppressive, and that India is being gradually bled to death in the interest of foreigners, the peace of the country will be in imminent peril; the poor and ignorant are not likely to remember that their instructors have said, as Mr. Gokhale has said, that the moral advantages of British rule outweigh its disadvantages, they will know that they are poor—that is the lot of the majority of mankind—and they may become convinced their poverty has been brought upon them by their English rulers. In such a state of feeling any chance spark may kindle a blaze It would be the duty of any Government at such a crisis to take stern measures of repression; the safety of the State, said the old Latin adage, is the first rule of statesmanship; and I myself in such perilous times should not hesitate to say that if education, a free press and the right of public meeting endangered the stability of the State these, which are the rights of law-abiding citizens, ought to be abolished. There, anyhow, would begin the conflict between the powers of order and the party of revolution,

of the country, and it is only when one remembers that the peasant has remained the good kindly creature that he used to be, and that the bulk of the people are peasants, that one can keep any heart in one's work at all." This seems to me to be dangerously close to an avowal from one who was once famous for his love for the people that his sympathies had been estranged This in itself is a serious set off against any triumphs which the Congress may claim, the alienation of a whole generation of officials may mean the postponement for at least a generation of all enlargement of popular privileges, and what is perhaps a rather sordidly practical way of looking at the question, of a more extended employment of Indians in the higher branches of the Government service. But it is with the future tendencies that I am concerned rather than with the material prospects of this or the next generation Whither may not this estrangement of the governing classes and the educated section of the people lead us? This does not seem to me to be the path of peaceful and progressive reform. The most probable outcome of the present tendencies seems to me to be a policy of greater repression and rigorous administration on the part of Government and an increased venom of hostility on the part of the opposition If we assume it to be true, as the Congress politicians aver, that the Government is becoming every day more reactionary, must not this inevitably be followed by increased acrimony of hostility on the part of its critics? The zealous Liberal who is unable to carry out his programme by peaceful methods is apt to turn into the wild and impracticalal Revolutionary who attempts to gain his ends by bombs and assassinations; this again further confirms the Government in its resistance to such delirious schemers of change and either party becomes more firmly wedded to a pernicious policy This is no fancy picture but a bold statement of what has actually been the political history of Russia in the last half century. The Emperor Alexander II began his reign with inclinations to liberalism of which he gave signal proof by freeing the Serfs in 1861 But the extravagant demands of the Russian reformers alarmed him and his advisers and they adopted strong measures, possibily unnecessarily strong measures, to repress the growth of subversive ideas; the party of reform become exasperated and irreconcilable and adopted a revolutionary programme, and little by little reform darkened into the Nihilism and Anarchism of which the outcome was the murder of the "Liberating Tsar" by an assassin's bomb. Since then the cause of progress has been hopelessly wrecked in Russia;

ble to the people. This autocracy whose human attributes are veiled by its designation as the Government of India, is made up in the last resort of men, able men and well intentioned men no doubt, but still men with human feelings; these individuals naturally resent the torrent of unrelieved blame which is poured upon their doings. A body of men engaged in the same work are very sensitive of their collective reputation; we ourselves know in this College how keenly we resent all unjust strictures upon our administration, how angry and hostile sentiments are engendered by undeserved blame and indiscriminating opposition. If I may be allowed the comparison, the Government of India is composed of men with feelings like our own, and the ceaseless repetition of indiscriminate censure embitters and angers them, as it does us. No doubt the men composing the Government of India school themselves to bear criticism and fault-finding with patience, but I cannot feel unlimited confidence in a patience which is contrary to human nature. If opposition is irreconcilable and misinterpretation unaiding, men *will* become angry and hostile, and they will certainly be prejudiced against any proposals emanating from their critics. If men had the tempers of angels it would not be so, but human nature, even in exalted Government officials, being what it is, unreasonable fault-finding may be assumed to prejudice them against their detracters. Now surely this is an undoubted obstacle to the cause which the Congress politicians themselves have at heart; the Government of India being an autocracy, changes in that Government must depend in a large measure upon the goodwill and benevolent sympathy of those who direct it. If the Congress alienates that sympathy their chances of carrying their programme into effect are thereby sensibly diminished. This is not a merely hypothetical case. I claim the authority of every Congress organ in support of the contention that this has actually come to pass. We read every day that there is a strong reactionary movement at work in the Government of India; that the present generation of higher officials are prejudiced and hostile to the educated section of the Indian people, that sympathy for Indian aspirations is less common than it used to be among the upper classes of Government servants; you will find such sentiments, far more strongly worded, in almost any organ of the Congress which you may choose to take up. Let us concede that it is so; I have myself heard a Government servant, now very highly placed indeed, say that when one reads the Indian press diligently "it is impossible to retain one's sympathy and affection for the people

***Mrs. Smith***—I shall be delighted to answer as many questions as you like to ask on Tuesday afternoon, if that day would suit you. But now I must say Goodbye.

***A. Begum***—Good-bye, I shall be so pleased if you will come on Tuesday.

***Mre. Smith***—Thank you, it will be a great pleasure. Come Charlie, say Good-bye, and then run home quickly, for it is tea time—Good-bye.

MARGARET MORISON,

——:o —

## The Debtor side of the Congress Account.

—— o.——

In the newspapers which support the policy of the National Congress we frequently read eulogistic accounts of the work which that political party has achieved, and if some writers are obliged to confess that the positive results have not been very great, yet they contend that to have achieved anything at all is in itself a triumph and they appear to be troubled by no doubts that the success of the Congress, however moderate it may have been, has proved an absolute gain to the cause of progress in India. Let us grant, for the sake of argument that the positive achievements of the Congress are a matter for congratulation, but still the more important question remains whether they have not been counter-balanced by far more important losses. There are evils incidental to almost all forms of political agitation, and the evils incidental to the Congress propaganda must be carefully considered before we can be sure that there is a net balance of good to the credit of the Congress The political theories of the Congress are based upon the assumption that a constitutional opposition is as possible in India as in England; and it follows from this assumption that the Indian opposition may attempt to discredit the Government as the opposition does in England. It is perfectly consistent therefore for the opposition press in India to find fault with every Government measure, to put an unpopular interpretation upon the proposals of the ministry and to belittle and discredit its officers. But as the comparison between England and India is not exact this has produced evils of which I wish to make some estimate.

The present Government of India is an autocracy, an autocracy which professes to rule in the interest of the governed, but still an autocracy in the sense that it is not responsi-

*Mrs. Smith*—Well, when it was 12 o'clock she would say "bed time, come along to bed" Perhaps he would say "do let me wait till mother comes home, do you think she will be home soon ?" Then a good nurse would tell the exact truth, she would say "I don't know how far she has gone, but we must not wait for her' or "I daresay she will be back in 5 or 10 minutes, and then I am sure she will come and see you in bed,' or "no, I am sure she won t be home till tiffin But come to bed quickly and go to sleep and then when you wake up you will see mother' Whichever of these things she said, the boy would be quite sure would be, the truth and she would probably begin to tell him a fairy tale or amusing story, and he would forget his wish to wait for his mother and would get into bed quite happy

*A. Begum*—And do you think the boy would be as happy with her as with the Indian nurse ?

*Mrs Smith*—Yes, in the end I am sure he would be much happier—a child is always happier when he has learnt to be obedient and leads a regular, punctual life, than when he knows he has only to cry and kick in order to get what he wants, then he nearly always loves and respects an English nurse as some one better and cleverer than himself, but he despises his Indian nurse and looks upon her as a useful amiable slave to be bullied and tormented.

*A. Begum*—But you have not told me why more Indian babies die than English ones? I should like to know that.

*Mrs. Smith* I fear I have no time to tell you that now ; it is 10 minutes to 5 o'clock, and it takes nearly 10 minutes to get home, and Charlie has tea at 5 o clock,

*A Begum*—Abdullah's father says that English children always have meals at one time, is that so ?

*Mrs. Smith*—Yes, I think we try, as much as possible, to let them do every thing at the same time every day—we believe their health depends on punctuality.

*A. Begum*—Is that the reason your babies don't die like ours?

*Mrs. Smith*—Yes, I think that is certainly one of the most important reasons, but now, if you will excuse me I must hurry away.

*A. Begum*—I should like please to hear *all* about your customs with babies.

that will bring mother." The first time she says this, no doubt the boy will believe her and will run off to bed. But he will find that his mother does not come when he is in bed, and then he will kick and scream again, and he will think in his little mind "I shan't go to bed another day when she says that about mother coming, for it is not true." Another day the nurse will have to invent a new lie and perhaps the child will believe it, but there will soon come a day when he won't believe anything she says, and will pay no attention at all to her orders. Now look what her kindness to the child has done. It has made him discontented with his toys, naughty, spoilt, and worse than all, it has made him despise this kind woman and doubt her word, and probably it ends by making him think that most people tell lies and that he can tell them too when they are useful.

***A. Begum***—But what would your English nurse do?

***Mrs. Smith***—It would take a long time to tell all about the ways of a good English nurse, it is very difficult to explain these things quickly, but she and his mother would have taught the boy, from when he was quite a baby that if they gave an order it must be obeyed and that if they made a promise, it would be kept.

A good English nurse would probably give the child a toy to play with and would then sit down to her own work steadily for a long time, she would be watching the boy without his knowing it, but she would not get up every minute and give him new toys but would encourage him to go on playing with the same thing. If children are constantly given new toys they become restless and discontented, and so we try, in England, to teach them to be happy for a long time with one toy and to invent new ways of playing with it. Well, when the nurse had done an hour's work, I daresay she would tell the child she would have a splendid game of hide and seek with him.

***A. Begum***—What is that?

***Mrs. Smith***—One of our favourite games in England. One day I will play it with Charlie and Abdullah and show you what an amusing game it is.

***A. Begum***—Thank you very much—Please tell me more about the English nurse.

think he is apt to become spoilt and to feel himself too important It is often good to leave him with an English nurse who will let him play about alone while she works, and who won't let him think that there is no one so important in the whole world as he is Children are so quick in knowing that their mothers are their slaves.

*A. Begum*—Would you leave your children alone with an Indian nurse? They love their mistress' children very much, more than their own children sometimes

*Mrs Smith*—Yes, I think they do, and it is partly for that reason that we are not very fond of leaving our little children with them—they are *too* kind to them.

*A. Begum* But can one be too kind to children? I do not think so.

*Mrs. Smith*—Yes, I think the great kindness and devotion of an Indian nurse often makes a good child into bad one

*A Begum*—I do not think I understand what you mean.

*Mrs. Smith*—Well, I have often watched Indian nurses playing for hours with children, and when I have come away, I have admired the character of the nurse, and I have pitied the little children

*A. Begum*—But I still do not understand. I think little children are quite happy with our nurses. Do you think they are unhappy?

*Mrs. Smith*—No, not exactly unhappy at the time, because the kind Indian nurse is so unselfish that she spends every minute in trying to please the children. If the child throws away one toy because he is angry or tired she at once brings him another. If he throws that one in her face she laughs and says "Naughty Sonny Baba" and fetches him a third toy

He will give her orders and she will obey him. Sometimes she gives him an order such as to come in for his morning sleep. Then perhaps he will begin to shriek and cry and kick and declare he won't go to bed till his mother comes home from her drive. Then very likely she will say "Well Sonny Sahib, Mother can't come home till you get into bed, but directly you are in bed the horse will bring mother home and she will run up to see Sonny Sahib, so be quick and come to bed and

could persuade you to treat Abdullah as we English people treat our children.

*A. Begum*—Please tell me what you do.

*Mrs Smith*—I fear if I once began to speak on this subject it would seem as if I wanted to praise my country and my people and to criticize your country and your people. I know that English people are often impolite in that way.

*A. Begum*—Ah, but I beg you to tell me your customs with children. Is it true that English babies don't get ill and die as much as our children do?

*Mrs. Smith*—Yes, I can truthfully say that is so

*A. Begum*—But Abdullah's father says that it is not hot in England and he thinks that is the reason.

*Mrs. Smith*—Yes, the climate of England is, in many ways, excellent for children. But I was not thinking of England; I was thinking of Calcutta which is a bad climate for every one, and in Calcutta also the deaths amongst English children are much fewer than amongst Muhammadan or Hindu children. Government made careful inquiries about the mortality of babies of all classes, eight years ago. I was reading about it only yesterday, so that I remember the facts and figures correctly. They found that out of 1000 European children born in Calcutta, only 58 die before they reach the age of one year Among Hindu children 315 out of 1000 children die before they reach the age of one year, and among Muhammadan children 363 children out of 1000 die before they reach the age of one year—that was only eight years ago, and I fear there has been little improvement since then and the proportions now are likely to be much the same.

*A. Begum*—But why should it be? We never leave our children, night or day We think of them and of their needs all day long Abdullah's father says that English ladies often go to parties without their children, and that when they play games in the afternoon their children are not with them.

*Mrs. Smith*—Yes, that is quite true, but if we go out we always leave them with some one whom we have trained and whom we trust. We often think it is better for their characters and future happiness to be without us for a little time. If a child's mother is always watching him lovingly all day long, we

*Charlie*—Mayn't I go and wake Abdullah mother I should like to have a game of cricket with him

*A. Begum*—Yes, I will go and wake him up quickly.

*Mrs. Smith*—I beg you not to do so, for if he had a bad night he ought to make up in the day time for the sleep he did not get at night Run away Charlie and play until I call you.

(Here Charlie runs into the yard and whilst the two ladies are talking he is very happy trying first to bounce his ball 100 times without letting it roll on the ground and then when he has finished that game, he aims with his ball at an empty bottle which is at the other end of the yard )

*Mrs. Smith*—Why could not poor little Abdullah sleep last night ? Was he ill ?

*A. Begum*—No, but he would not go to bed till 12 o'clock.

*Mrs. Smith*—Not till 12 o'clock ! Poor child, how sleepy he must have been, and he is not more than seven years old, is he ?

*A. Begum*—No, about seven, but he did not want o go to bed till I came, and I had to finish embroidering a cap.

*Mrs. Smith*—What time does he usually go to bed ?

*A. Begum*—Oh ! never at the same time. Sometimes at 8 o'clock, sometimes at 9, sometimes at 10 or 12

*Mrs. Smith*—I now understand why he so often looks tired and weak. Charlie has to go to bed regularly every day at half past seven, and he is nearly always asleep by 8 o'clock.

*A Begum*—But Abdullah gets a great deal of sleep sometimes, for when he is sleepy in the day, he often lies down on this little charpoy here and goes to sleep.

*Mrs. Smith*—Excuse my saying that I fear these irregular sleeps won't make him grow into a strong boy. Charlie sleeps for one hour in the day also, but always at the same time—from 12 to 1 o'clock, and he has to go and lie down then whether he is sleepy or not But it is his long night sleep which I depend on for his health. Don't you think that eight or nine hours sleep at night is necessary for children ?

*A. Begum*—Yes, I wish he could go to bed earlier, but he always says he won't go till I come, so what can I do ?

*Mrs. Smith*—I think Charlie would like to say that to me too if he thought I would listen to him. I *wish* I

subject of their study, something much more valuable than the ability to pass an examination People complain, and with justice, that this College has never fostered a love of learning and the great cause of this to my mind is that there is no good library in Aligarh. Well, I ask you to give this College a good library Will you make it for several ensuing years the most prominent object of the Duty Suppose you succeed in collecting Rs. 15,000 a year for some time to come and devote that to the purchase of books you will enrich the College with what it most needs and confer upon future generations incalculable boon. I know that the keeper of the Duty is contemplating making an appeal to charitable Mohammedans generally on behalf of a good Library here, and surely there is no means better calculated to raise the community to a higher plane of thought than bringing up their young men in the company of good books. I think therefore that every public spirited Muhammedan should respond to this appeal But if the keeper will call upon you, as I do call upon you, to make the Library the grand object of your exertions, I believe that you can and will create a Library for which many succeeding generations will be grateful to you."

After three cheers for Mr and Mrs Morison the guests proceeded to enjoy tea and refreshments, which brought a very pleasant gathering to a close.

---

## A Conversation.

---

(The first of a series of conversations between Mrs Smith and Almira Begum The interviews take place in Almira Begum's house.)

---

*Mrs. Smith*—How do you. I hope you are well.

*Almira Begum*—Quite well thank you, please sit down. I am so glad you have brought your little boy with you to day

*Mrs. Smith*—Where is your Abdullah? It would be so nice if the two children might play together whilst we talk.

*A. Begum*—Abdullah is asleep, but I will call him; he had very little sleep last night.

*Mrs. Smith*—Oh then *please* don't call him. Charlie will be quite happy playing in the court yard with his ball. Run away Charlie and play.

cope with such rapidly increasing numbers. It is not only that we have not accommodation for them in the Boarding-House but that in other far more important ways the provision for education is in-sufficient The greatest need of all more important than buildings and more important than scholarships is an increase of the staff, and next but no less important, adequate provision for a Library, and for a Laboratory. Now I do not say this to discourage and dishearten you, but rather to spur you on to greater exertions for the plan which I wish you to consider will demand even greater zeal and even more successful deputations than we have seen in the past Will you not expand the aims of the Duty so as to include these objects too? The aim of the Society is after all the increase and development of the College, and as you satisfy one need you should turn your attention to other wants Now I claim that the capital funds of the Duty do already make a very adequate provision for scholarships: the task of completing the Mosque is well in hand and will no doubt soon be accomplished But the unsatisfied needs of the College are still sadly numerous. I ask you to take up one of these and satisfy it in the ample and complete way which you have satisfied the demand for scholarships. The particular need for which I appeal is a very important one; it is a need of the College for which I have appealed ever since I came here but the ears to which I have spoken have hitherto been deaf Will you the servants and associates of the Duty, listen to me? I want you to find the money for a College Library The provision of a good library is the truest charity for poor scholars. Knowledge is so vast that you cannot unfold her ample page to poor scholars unless you give them free access to a large library; I like to imagine the time when there will be in this College a large reading room well lighted every evening, to which all our students of scholarly tastes will naturally go to spend their evenings; they ought to find in that room an intelligent and learned librarian to advise them in their reading and a good catalogue which will tell them where they will find whatever has been written upon any particular subject; if they go there to prepare the subjects of their university examinations they ought to have access to all the large lexicons and commentaries and books of reference which are necessary to a scholarly mastery of their books; and when, as will certainly follow as a consequence of their visit to the library, they want to extend their reading beyond the narrow scope of their text books, they will read other larger and more serious books which will give them a love of the

parts in most praiseworthy style. Mr. Morison, after thanking the actors and expressing the pleasure Mrs. Morison and he felt in seeing the members of the Duty there went on to say: It is every year my pleasant duty to congratulate you on having beaten the record of former years, but this year you have surpassed all previous achievements in such a signal manner that I cannot any longer confine myself to barren congratulation. The sums of money now collected by the Duty are growing to be so large that no other methods of collecting money for the College is of greater importance; moreover, the income of the Duty appears to be so stable that we may now take it into account as one of the permanent resources for extending the usefulness of the College Under these circumstances we are driven to wonder whether we are making the best use we can of this important source of income, and as it has now grown, through your exertions, so very important I want to discuss the matter quite frankly and openly with you The money collected by the Duty is at present spent upon two main objects, the completion of the Mosque and Scholarships The first object is at present incompletely fulfilled, but I am confident that the Duty will soon bring it to completion, and I assure you of my heartiest sympathy in your exertions It is most fitting that the Mosque in the national College should be raised by a general collection made throughout the community, and if it is carried to completion by means of sums which are individually small it becomes thereby only more truly representative of the whole community. With regard to scholarships I have more to say. For the provision of scholarships and wazifas alone the resources of the Duty are already outstripping our wants, or to put it more accurately the ability of the Duty to provide scholarships is leaving all other progress in the College far behind. We cannot distribute all the money which the Duty possesses in this particular way. The practice hitherto followed has been for the Duty to lend the College money for certain necessary improvements or buildings, on condition that the interest upon that money shall be expended in scholarships; but take this present year alone and you will find that the interest upon this year's collection amounts to over Rs. 1,500, or Rs 125 a month. That is to say, that in one year alone we have formed a capital endowment for 18 or 20 scholarships. Now it is really impossible for us to go on increasing the number of scholarship holders at this rate every year. Not because there are not plenty of deserving young men who need scholarships to enable them to read, but because our College is not expanding sufficiently fast to

The Editor has awarded a Prize of Rs. 10 to Mohammed Zarif, B A, for a series of three contributions.

—— o· ——

Mr Rees, Head Master of the School, has become House-Master of the English House and is in residence there.

—— .o. ——

Mrs. Griffiths, the Lady Superintendent, who was obliged to resign the work owing to ill health, left Aligarh for England in the middle of November We all miss Mrs. Griffiths, and the excellent work she did in consolidating the management of the English House, will leave its mark and will be gratefully remembered

—— .o: ——

The paper by Mrs Morison, which appears in this number, was written for publication in the recently started Urdu Magazine for Mohamedan Ladies, but Mrs Morison has kindly allowed the English version to appear in the Aligarh Monthly

—— ·o· ——

The Masquers Dramatic Society has been reorganised and is now no longer a school but a College Society. Mr. Pape succeeded Mr Vines last year as President, and is President now until his departure from Aligarh at the end of this month.

—— ·o· ——

Mr Pape, who during his short time here, has taken great interest in the many phases of Aligarh life, will carry with him the best wishes of many friends

—— .o. ——

Next month we shall publish a balance sheet showing the financial state of this Magazine for the year 1904. We again ask subscribers to make their payments terminable in December, each year.

—— .o ——

## The Duty

On Saturday December 3rd Mrs Morison entertained the students who went on the various Duty deputations in the long vacation, and also those who had made individual collections. There were also present at the garden party Mrs. Twiss, Mrs. Waterfield, Miss Horst, all the members of the English staff, Mir Wilayat Husain Sahib, Professor Chakravarty and others. At 4-30 the company sat down to a very pleasing representation of "Box and Cox" given under Mr. Pape's able direction, by Professor Abdul Qadir, Syed Ain-ud-din and Ross Masud, all of whom performed their

Under his direction the Curzon Hospital is approaching completion, the Nizam's Museum is ready for use, and other buildings are progressing satisfactorily.

—.o.—

Among minor though very necessary improvements, there is a temporary village ready to accommodate a large number of College servants, built to the north of the main compound. Beyond the Kutcha Court a washing ground with the necessary water-tanks and drying house is about to be commenced; while near the Dining Hall a new and spacious Kitchen is now ready for use, airy and provided with store rooms and an office. So that a great deal has been done to make the students lives more comfortable and more healthy.

—:o:—

Among other needs and other improvements, there will shortly be a cry raised—not a new cry by any means—for the following.

(1) Quarters for private servants, who at present are an encumbrance to the College Courts,

(2) A building to contain a grain-godown, a mill and a flour-godown,

(3) An enclosure for fuel,

(4) Quarters for the Indian Staff,

(5) A good well for the supply of drinking-water only.

—o—

With regard to the mill, it would be best to build an engine-house and go to the expense of outlay for steam working. It is almost certain that the cost of labour will increase in the near future. When this happens labour-saving appliances will come into common daily use, and expenditure for saving labour will in the end prove sound economy.

—:o:—

Mr. Morison's appeal to the Duty, the full text of which is given in another column, should not be allowed to remain in the state of an appeal long. Money is urgently required and can be spent now in furnishing and forming a College Library. Money could not be better spent in the cause of Mohamedan progress than in carrying out this purpose.

—:o:—

The Nizam's Museum is to be the Library temporarily, until a really suitable room is provided. It is hoped that early in the New Year, students will be able to spend a considerable part of their evenings in a comfortable reading-place amid suitable surroundings. This in itself will be an incentive to study and advancement.

# The Aligarh Monthly

DECEMBER. 1904.

## College Notes.

——o——

The Educational Conference is to take place in Lucknow, at the usual time, commencing on December 27th, and Mr. Morison is to be President—a very fitting arrangement, which will allow him to give all who are interested in the progress of the Mohammedans, the benefit of a mature experience in Indian Educational matters.

——o——

The Central Standing Committee has been sitting regularly, making all necessary preparations.

-:o.——

The Nawab Mohsin ul Mulk has been for a tour to Rangoon.

——o.——

The following appointments have been made as a result of the recent Union Elections :—

| | |
|---|---|
| Vice-President | Abdul Hamid Khan, B. A. |
| Secretary | Tahummuz Husain, B. A. |
| Librarian | Niaz Mohammed |
| Committee | S. Aimuddin, Ali Sujjad, |

Sabiuddin (Dehli), Abdul Majid, Mohammed Ibrahim Sindhi, Ali Mohammed Faqir.

——:o:——

Operations have already begun for the building extension of the Union Club, and it is proposed that the President shall lay the Foundation Stone on the day of the Union Anniversary.

——:o:——

The College has been fortunate in securing the services of Mirza Ahmad Beg Sahib, late of Roorkee, as Overseer of Buildings.